سوغاتؔ

محمود ایاز

سوغات

۹

مُدیر

محمود ایاز

معاون مدیران

خلیل مامون

عزیز اللہ بیگ

پتہ:
۸۴۔ تھرڈ مین، ڈیفنس کالونی، اندرا نگر
بنگلور۔ ۵۶۰۰۳۸
فون: ـــــــــ ۵۲۸۱۹۸۶

ستمبر ۱۹۹۵ء

قیمت : فی شمارہ ایک سو ۱۰۰ روپے

بیرونی ممالک سے [امریکہ، کناڈا، انگلینڈ، سعودی، پاکستان]

(بذریعہ ہوائی ڈاک) بارہ ۱۲ ڈالر (امریکی) سولہ ۱۶ ڈالر (کنیڈین) دس ۱۰ پاؤنڈ (یو۔ کے)

کتابت :
حافظ لیاقت احمد قاسمی۔ بنگلور ۶
کمپیوٹر کارپوریشن۔ حیدرآباد
چودھری جیلانی جمیل۔ کرنول

طباعت : ماڈرن پبلشنگ ہاؤز ۔ ۹ گولہ مارکیٹ، دریا گنج۔ دہلی ۲

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر : محمود ایاز

فہرست

طویل نظم

غزلیں

نظمیں

افسانے

خصوصی مطالعہ

کشکول محمد علی شاہ فقیر

"... گویا دبستاں کھل گیا"

اسلام اور دورِ حاضر

جائزہ

بازگشت

نقشِ اوّل

چودھری محمد علی ردولوی کے نام اور اُن کی تحریروں سے اردو لکھنے اور پڑھنے والوں کی موجودہ نسل اگر ناواقف ہے تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ وہ تو اپنی زندگی میں بھی کم جانے پہچانے گئے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے چھتیس (۳۶) برس پہلے اُن کے بارے میں لکھتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا تھا کہ "ایسے لکھنے والے مگر گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں"۔

چوتھی دہائی میں کرشن چندر نے "نئے زاویے" میں اُن کا ایک افسانہ "تیسری جنس" شائع کیا تھا، جسے بعد میں حسن عسکری نے "میرا بہترین افسانہ" میں شامل کیا۔ اس افسانے کے تعلق سے تھوڑا بہت چرچا محمد علی ردولوی کا، اُس زمانے کے ترقی پسند رسائل میں، اِدھر اُدھر ہوا۔ افسانے کا موضوع تھا میلانِ ہم جنسی، جو "بو" اور "لحاف" کے زمانے میں ایک "ترقی پسند" موضوع تھا، لہٰذا زیادہ تر اسی تعلق سے افسانہ اور افسانہ نگار دونوں کی تعریفیں ہوئیں۔ یعنی یہاں بھی تحسینِ ناشناس ہی محمد علی ردولوی کے حصّے میں آئی۔ ایک مضمون البتّہ محمد علی ردولوی پر ایسا لکھا گیا جو اُن سے پورا پورا انصاف کرتا تھا۔ یہ مضمون، کوئی چالیس (۴۰) سال بیشتر، قرۃ العین حیدر نے "داستان طراز" کے عنوان سے تحریر کیا تھا۔ بڑی دردمندی اور دل سوزی سے لکھا ہوا مضمون۔ بہت متاثر کن۔ لیکن نہ برف پگھلی اور نہ پھر محمد علی ردولوی پر کوئی قابلِ ذکر تحریر سامنے آئی۔ "داستان طراز" کی اشاعت کے چار پانچ سال کے اندر محمد علی ردولوی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ "سوغات" کے تیسرے شمارے (دورِ اوّل) میں ایک مختصر نوٹ نکلا۔ دوسرے کچھ رسائل اور اخبارات میں بھی شاید چند سطریں آئی ہوں گی۔ اور اردو والوں کو پتہ بھی نہ چلا کہ کیسا زبردست انشا پرداز، ایک طرز اور اسلوب

کا موجد اور خاتم، تحریریں باتوں کے پھول کھلانے والا اُن کے درمیان سے اُٹھ گیا۔

قرۃ العین حیدر نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ "چودھری محمد علی ردولوی کی عظیم اور دل آویز شخصیت کے تذکرے سے لطف اندوز ہونے کے لئے اس ثقافتی ورثے اور اس پس منظر سے محبت لازمی ہے۔" بات صحیح ہے، لیکن جہاں اس ثقافتی ورثے اور پس منظر سے واقفیت تک نہ ہو وہاں محبت کہاں سے آئے گی؟ ویسے ماضی کی بازآفرینی اور حال کو معطّل کرنا بڑے فنکاروں کے لئے کوئی مشکل امر نہیں اور محمد علی ردولوی کے یہاں وہ سحر نگاری ہے جو وقت کے فاصلے کو معدوم کردیتی ہے۔ ان کے افسانے، خاکے اور خطوط آپ پڑھ چکیں گے تو پتہ چلے گا کہ وہ پورا ثقافتی پس منظر اور وہ ماضی جو اب تک آپ کے لئے اجنبی تھا، کیسے، خاموش نرم روی کے ساتھ، آپ کے ذہن و تخیّل پر اپنے نقوش اُبھار گیا ہے۔

○

تحریر کو شخصیت کا اظہار کہا جاتا ہے لیکن رُک کر سوچئے تو حیرت ہوگی کہ ہمارے کتنے کم لکھنے والوں کے بارے میں یہ بات صداقت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ محمد علی ردولوی کی پہلودار شخصیت ان کی ایک ایک سطر سے جھلکتی ہے۔ تحریر اس طرح صاحبِ تحریر کی شخصیت کا آئینہ بن جائے، ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں سے اُن کی جو شخصیت اُبھرتی ہے وہ اتنی زندہ اور توانا ہے کہ قاری انھیں اپنی نظروں کے سامنے دیکھنے لگتا ہے۔

"سوغات" میں خصوصی مطالعے کی اشاعت صرف بطور خراجِ عقیدت نہیں ہوتی۔ بلکہ، علاوہ اور باتوں کے، اس کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ نئے لکھنے والے اپنے ادبی ورثے کو پہچانیں اور دیکھیں کہ وہ آج بھی اِن "پرانوں" سے کیا کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ محمد علی ردولوی کی حسِّ مزاح، جو کہیں ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی، اور اُن کا شاداب و شگفتہ اسلوب، جو کسی موضوع سے ہار نہیں مانتا، نئے لکھنے والوں کو، اور کچھ نہیں تو، کم از کم اچھّی نثر کے ذائقے سے تو آشنا کرا سکتا ہے۔

ہمارے ہاں طنز و مزاح کے میدان میں تو خیر برسوں سے اُلّو بول رہے ہیں (ہندوستان میں) اس کا ذکر چھوڑیئے۔ عام طور پر جو نثر لکھی جارہی ہے اُس کے دو صفحے پڑھ جائیے، وہ بے کیفی اور یبوست ملے گی کہ معلوم ہوگا، ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔ وارث علوی کی شکایت بیجا نہیں تھی

کہ ہمارے لکھنے والے حسِّ مزاح سے محروم ہیں۔ محروم تو اور بہت سی چیزوں سے بھی ہیں، لیکن جن دو چار کے یہاں یہ محرومی نہیں ہے اُن کو علم کے "افراط" نے مار رکھا ہے۔ رہی سہی کسر ساختیات و پس ساختیات کے عالمانہ مباحث نے پوری کردی۔ علم، جسے کاشفِ اسرار ہونا تھا، یہاں بھی حجابِ اکبر بن کر رہ گیا۔

○

اس شمارے میں کوشش کی گئی ہے کہ محمد علی ردولوی کی جو کتابیں دسترس میں تھیں، ان کی مدد سے، ممکنہ حد تک، ایک ایسا انتخاب، دو ڈھائی سو صفحات کا مرتب ہو جائے، کہ اس داستان طراز کے اظہار و بیان اور فکر و نظر کے سب پہلو سامنے آجائیں۔ افسانوں اور مضامین میں تو انتخاب کی گنجائش نکل بھی آتی ہے لیکن ان کے خطوط نے مجھے بہت پریشان کیا۔ کوئی خط ایسا نہیں کہ نکالا جائے۔ بس چلتا تو پورا "دبستان" شامل کر لیتا۔ در اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ محمد علی ردولوی کی تحریروں کی دوبارہ اشاعت ہو۔ "میرا مذہب"، "ادارۂ تحقیقاتِ اردو" پٹنہ نے شائع کر دی ہے۔ دوسری کتابوں کی طرف بھی اگر یہی ادارہ توجہ دے تو بڑا کام ہوگا۔ سب سے پہلے تو "گویا دبستان کھل گیا" کی اشاعت ہونی چاہیے۔ ایسے بے مثال خطوط کا مجموعہ نظروں سے اوجھل ہے اور ردّی میں تُلنے کے قابل کتابیں دھڑا دھڑ چھپ رہی ہیں۔

○

حمید نسیم نقّاد کی حیثیت سے اردو کی ادبی دنیا میں نو وارد ہیں لیکن چند ہی مضامین سے انھوں نے ذہین پڑھنے والوں کو اپنی طرف متوجّہ کر لیا ہے۔ راشد اور عزیز حامد مدنی پر اُن کے مضامین عملی تنقید کے مثالی نمونے تھے اور اب میراجی پر اُن کا مضمون، جو اس شمارے میں شامل ہے، شاعری کی تحسین و تفہیم کا ایک نیا معیار قائم کر رہا ہے۔ حمید نسیم، شاعر کے کلام کا مطالعہ اس طرح کرتے ہیں جیسے وہ شاعر کے ساتھ، قدم بہ قدم، اس کے ہر سفر، ہر تجربے میں خود بھی شریک ہیں اور اس کے بعد جب مضمون لکھتے ہیں تو قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے "میں کوشش کروں گا کہ میراجی کے جہانِ تخلیق کی سیاحت قاری کی ہمراہی میں کرلوں، یوں کہ ایک نہ ایک رُخ، ہر دیدنی منظر کا، دیکھ لوں اور دکھا دوں۔" اُن کا یہ طریقۂ کار صرف

میراجی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ راشد، مدنی اور فیض پر مضامین میں بھی انھوں نے یہی کیا ہے۔ میراجی پر مضمون میں انھوں نے خود کہا ہے "میں ان تینوں (راشد، میراجی، فیض) کی وجدانی دنیا میں زائر کی طرح گھوما ہوں"۔ اس سیاحت میں وہ "سفرنامے" یا "گائڈ بکس" نہیں استعمال کرتے بلکہ بڑی سادگی سے اعتراف کرتے ہیں "میں نے گزشتہ کئی عشروں کا تنقیدی سرمایہ دیکھا ہی نہیں"۔ یہ "بے خبری" حمید نسیم کے حق میں بڑا کام کر گئی۔ اس کے بغیر Unblinkered View کی خوبیاں کہاں سے آتیں ـــــ!

○

میراجی کے فکر و فن پر جو باتیں اس مضمون میں آئی ہیں وہ عمومی نوعیت کی نہیں ہیں بلکہ میراجی کی اہم اور نمائندہ نظموں کے تفصیلی جائزے پر ان کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ یہ جائزے اتنے ہمہ جہتی ہیں کہ میراجی کی شاعری کا کوئی گوشہ نظر انداز نہیں ہوا ہے ـــــ موضوع، ہیئت صناعی، نظم کی تشکیل و تعمیر، اصوات کا توازن، موسیقی کا آہنگ، اسالیبِ بیان، خیال کی تہہ داری ـــــ ایک ایک پہلو پر مثالوں کے ساتھ تبصرہ، پڑھنے والوں کے سامنے میراجی کے کمالِ فن کی وہ تصویر پیش کرتا ہے جو اَب تک کسی ایک مضمون میں نہیں آ سکی تھی۔ حمید نسیم کے اس مضمون سے، اگر اسے توجّہ سے پڑھا گیا، تو میراجی کی بامعنی تفہیم و تحسین کے ایک نئے دور کا آغاز ہو سکتا ہے۔ بعض تجزیے اس مضمون میں ایسے ہیں جو ادبی نقّادوں کے بس کی چیز ہی نہیں۔ "کھٹور" کا ایسا تجزیہ ممکن نہیں اگر لکھنے والا موسیقی کا علم نہ رکھتا ہو اور یہ معلوم نہ ہو کہ ٹیپ کا مصرعہ "انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چندرماں" "خیالِ درباری کی استھائی" سے مستعار لیا گیا ہے۔ اسی طرح "کٹھک" پر تبصرہ، جس میں ساری بات "دیو داسی کی نرت میں دکھائی گئی ہے۔ مضمون میراجی پر ہے لیکن شاعری کے فن کو سمجھنے، سیکھنے اور برتنے کا جن لوگوں کو سچّا شوق ہو ان کے لئے بھی اس مضمون میں بہت کچھ موجود ہے۔ شرط صرف صبر و ریاضت کی ہے۔ کئی ایک باتیں اس مضمون میں ایسی بھی آگئی ہیں جن پر میراجی کی شاعری سے ہٹ کر بھی غور و فکر ہونا چاہئے۔ مثلاً میراجی کے اسالیبِ بیان پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو بولنے والی اکثریت کے Ethos اور Sensibility کی جو بات آئی ہے اس پر ہمارے ہاں بحث ہو تو کئی دلچسپ

Join eBooks Telegram

پہلو سامنے آ سکتے ہیں۔

○

اسّی سے زیادہ صفحات پر مشتمل یہ جائزہ میراجی کی شاعری کی قدر و قیمت اور جدید اردو شاعری میں میراجی کے مقام اور مرتبے کا فیصلہ کن تعیّن کرتا ہے۔ چند اقتباسات پڑھ لیجئے:

"میراجی جو Perversion کا شاعر ہے، وہ اس کلیّات میں بہت کم آیا ہے۔ کبھی کبھار (لیکن) پوری زندگی کا احاطہ کرنے والا میراجی سارے حصّۂ نظم پر محیط نظر آتا ہے۔"

"میراجی کی جنسی شاعری محض ایک Deviation ہے۔ اس کا اصل جوہر اور جینی اس زندگی کے پورے سواد کا، انسانی تجربے کی کلیّت کا ——— جس میں یہ کائناتِ زمان و مکان اپنی تمام جہتوں کے ساتھ ایک گوشے میں پڑی ہے ——— احاطہ کرتا ہے اور میراجی کا یہ کلام وہ ساز و برگ ہے جو عظیم شاعری کا اثاثہ ہوتا ہے۔ " Stuff that makes great poetry

"جدید شاعری کے تین اصحاب کبار فیض صاحب، راشد صاحب اور میراجی ہیں۔ راشد اور میراجی اپنی جگہ بڑے شاعر ہیں۔ دونوں قریب قریب ایک ہی سطح کے ہیں۔ ممکن ہے راشد کو شمّہ بھر برتری حاصل ہو جائے کہ اس نے پینتالیس برس شاعری کی ہے۔ میراجی کا کمال یہ ہے کہ اس نے پندرہ سولہ برس میں وہ سطح حاصل کر لی کہ راشد سے شاعر کی، حیثیت سے آنکھیں چار کر سکتا ہے۔ فیض کا لہجہ ان دونوں شاعروں سے زیادہ شیریں ہے مگر اُن کی فکر محدود بھی ہے اور کم تر بھی کہ وہ "کوئے یار" اور "سرِ دار" کے سوا اپنے تجربے میں اور کچھ نہیں رکھتے۔ اور یہ وہ Stuff نہیں جس سے عظیم شاعری کی تخلیق ہو سکے۔"

"مجموعی سطح پر میراجی ——— اُن کے سارے جنسی مزاج کے کلام کو چھوڑ کر ——— اردو شاعری کی تاریخ میں بیسوی صدی کے پانچ بڑے شاعروں میں سے ایک ہوں گے۔ اقبال کے بعد کی نسل میں راشد اور میراجی دو بڑے شاعر ہیں۔"

○

سرور صاحب کی کتاب "دانشور اقبال" پر انورمعظّم کا تبصرہ ایک مستقل مضمون ہے اور اسلام اور دورِ حاضر پر گفتگو کے اُسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو سوغات ۔ع۔ک میں عزیزاحمد کی کتاب "اسلامی جدیدیت" پر نثاراحمد فاروقی کے تبصرے سے شروع کیا گیا تھا۔ سرور صاحب کی دوسری کتاب "فکر روشن" کو بھی اس تبصرے میں شامل کیا جا سکتا تھا مگر کچھ مجبوریوں کی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکا۔ "فکر روشن" کے کئی مضامین کا راست تعلق اسی موضوع سے ہے۔ جیسے "جدید دنیا میں اسلام —— مسائل اور امکانات"، "ہندوستانی قومیت اور مسلمان"، "اسلامی تشخص اور قومی تشخص" وغیرہ۔ دوسرے مضامین جو "اردو کے کچھ اہم نثر نگاروں سے متعلق ہیں" ان میں بھی "دانش وری کی ایک لہر ملتی ہے" اور سرور صاحب کا ذہن ان موضوعات کی طرف بار بار لوٹتا رہتا ہے۔

انورمعظّم نے سرور صاحب کی کتاب کے بنیادی موضوعات کو سامنے رکھ کر بات کی ہے اور اس طرح یہ مضمون "دانشور اقبال" پر تبصرے کی حد سے آگے بڑھ کر اسلامی جدیدیت اور اس کے مختلف پہلوؤں پر ایک فکر انگیز بحث کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

○

انور خان کے دو خطوط اس شمارے میں (بازگشت) شامل ہیں۔ اُن کے مضمون کا مطالعہ اِن خطوط کی روشنی میں ہونا چاہئے۔ نئے لکھنے والوں سے ان کی ہمدردی مجھے متاثر کرتی ہے اور اُن کی نیک نیتی کا بھی میں قائل ہوں لیکن یہ "ماہرین" والی بات دل کو نہیں لگتی۔ چلئے "ماہرین" سے ناول کی ضخامت کو گھٹا، بڑھا لیں گے، زبان و بیان کی غلطیاں درست کرالیں گے لیکن بُری نثر کو اچھی نثر میں کیسے بدلیں گے؟ یہ کام بھی اگر "ماہرین" ہی سے کرانا ٹھہرا تو پھر پورا ناول ہی ان سے لکھوا لینے میں کیا حرج ہے؟

زبان اظہار کا بنیادی ذریعہ ہے۔ اگر یہی قابو میں نہیں ہے تو پھر افسانہ، ناول لکھنا کیا ضروری ہے؟ "چاندی کے ورق کوٹنے کا دھندا" تو آج بھی کہیں نہیں گیا —— !

محمود ایاز۔ بنگلور
ستمبر ۱۹۹۵ء

حمید نسیم

میراجی ۔ ہمارا جوگی شاعر

وہ نادر جوہر اور بے چین روح لے کر دنیا میں آیا تھا ۔ قلیل آمدنی والے گھرانے میں پیدا ہوا تھا ۔ جوانی ابھرنے لگی تھی ۔ بہت معمولی سالباس ۔ سادہ سی شکل وصورت ۔ بس آنکھوں میں روشنی ایسی تھی جیسے صبح کا ستارا دو ہو کر ان میں آن بسا ہو ۔ ایک دن سرراہ ایک سانولی سلونی کنول نین کنیا کے درشن ہوگئے ۔ وہ تو اس دید سے بت بن کر رہ گیا ۔ کنیا کی نگاہ اس کی طرف چھلتی سی اٹھی اور بے تعلق گزر گئی ۔ بس وہ نیم نگاہ قیامت ڈھا گئی ۔ کھوج لگایا تو معلوم ہوا بنگالن ہے ۔ نام میرا سین ہے ۔ اس کی نگہہ تو دل میں اترتے ہی جوالا مکھی بن گئی تھی ۔ ژولیدہ جاں ثنا اللہ کی دنیا تلپٹ ہو گئی اور وہ میراجی بن گیا ۔ روح کے کسی کونے میں چھپا تخلیقی جوہر تیز دھارا بن کر پھوٹ بہا ۔ ایک سے ایک سندر کویتا آپ ہی آپ زبان پر آنے لگی ۔ نہ اس اندر کے ہیجان نوا پر اختیار تھا نہ اپنے جی اپنے حواس پر ۔ چاہ کی چپ آگ میں جلنے والا کوی روپ بدل کر جوگی بن گیا ۔ جٹادھاری ۔ گھنی موچھیں ۔ گلے میں موٹے موٹے منکوں والی مالا ۔ اس بھیس نے آنکھوں کی ان دیکھی چمک کے ساتھ مل کر میراجی پر وہ اچنبھے کی چھاپ لگا دی کہ وہ لاہور جیسے بڑے شہر میں دنوں میں منفرد ہو گیا ۔

میراجی کی کویتائیں، اس کے گیت اس کی نظمیں ادبی جریدوں میں بڑی شان سے چھپنے لگیں اور وہ ابھی پورا جوان بھی نہیں ہوا تھا کہ لاہور میں اپنی ذات میں ایک ادارہ ایک انجمن بن گیا ۔ میں اس پتلون قمیص میں ملبوس جوگی سے زندگی میں صرف دو بار ملا تھا ۔ پہلی بار ۱۹۳۸ء میں لاہور ریڈیو اسٹیشن پر ۔ مجھے محمود نظامی مرحوم نے جو نئے نئے پروگرام اسسٹنٹ ہوئے تھے اپنے پندرہ روزہ نئے ادبی مجلے میں تازہ کلام پڑھنے کیلئے امرتسر سے بلایا تھا ۔ میں وقت مقررہ پر ریڈیو اسٹیشن پہنچا تو محمود نظامی صاحب نے میراجی سے تعارف کروایا ۔ میں "ادبی دنیا" میں ان کا کلام پڑھ چکا تھا ۔ لیکن اس کلام سے ان کے ظاہری حلیے اور ان کی شکل وصورت کا کوئی واضح تصور ذہن میں نہیں ابھرا تھا ۔ میں نے ادیبوں ، شاعروں میں اس سے پہلے اس وضع قطع کا آدمی اب تک نہیں دیکھا تھا ۔ سو اک گونہ حیرت ہوئی ۔ میراجی اس ادبی مجلے کے مدیر یا میزبان تھے ۔ مجھ سے پوچھا ۔ کیا پڑھیئے گا ۔ میں نے کہا آٹھ دس شعروں کی ایک نظم ہے ۔ فرمایا میں دیکھ سکتا ہوں ۔ میں نے بڑے ادب سے کاغذ ان کے سامنے رکھ دیا ۔ انھوں نے توجہ سے نظم پڑھی ۔ مصرعے مصرعے پر رک کر نظم پڑھ کر فرمایا ۔ بہت اچھی ہے ۔ اگر اجازت ہو تو ایک مشورہ دوں ۔ میں نے کہا ۔ ضرور ۔ فرمایا

آخری شعر کے آخر میں جو "بھادی اپنی" "مٹادی اپنی" ہے اسے "بھاڈالی ہے" ۔ "مٹاڈالی ہے" کر دیا جائے تو میرے خیال میں شعر زیادہ تیکھا ہو جائے گا ۔ میں نے کہا فاعل کا تعین ضروری ہے ۔ اگر "بھادی ہم نے" ۔ "مٹادی ہم نے" کر دیا جائے تو کیسا رہے گا ۔ فرمایا بہت مناسب ہے ۔ اس دوران میں بھی میراجی کے حلیے کا بڑے غور سے جائزہ لے رہا تھا ۔ دو ایک دفعہ نگاہ ملی تو میں لرز سا گیا ۔ وہ نگاہ برق آثار تھی ۔ راست دل تک پہنچ جاتی تھی ۔ لیکن نگاہ میں جتنی تیزی تھی ۔ باتوں میں اس سے کہیں زیادہ ، مٹھاس سچائی ، انس اور شائستگی تھی ۔ اس پہلی ملاقات میں میراجی کی شخصیت نے مجھ پر نہایت خوشگوار اور دیرپا اثر مرتب کیا ۔

میراجی بہت تیزی سے شہرت اور تخلیقی تکریم کی نردبان پر چڑھتے چلے گئے ۔ اور برس دو برس میں سارے برصغیر میں ان کی دھوم مچ گئی ۔ اس پہلی ملاقات کے کوئی برس سوا برس بعد جالندھر کے ایک مشاعرہ میں ابو الاثر حفیظ جالندھری مرحوم بھی تشریف لائے تھے ۔ مشاعرے سے فراغت تچھلے پہر کے آغاز سے ذرا پہلے ہوئی ۔ کھانے پر بیٹھے تو حفیظ صاحب نے ادبی لطیفے سنانا شروع کر دیے ۔ دوران گفتگو میں مجھ سے مخاطب ہو کر اپنی ٹھیٹھ دوآبے کی پنجابی میں فرمایا ۔ اس نئے سادھو شاعر میراجی کو دیکھو ۔ کیا سوانگ بھرے پھرتا ہے ۔ مجھے ایک دن سر راہ نظر آگیا ۔ میں نے پکار کر اسے اپنے پاس بلایا اور کہا ۔ "اوئے میراجی ۔ شاعری اتے تھوپن دی چیز نہیں ۔ کدی نہادھو کے کپڑے دی بدل لیا کر ۔ (شاعری اوپر تھوپنے کی چیز نہیں ۔ کبھی نہادھو کر اجلے کپڑے بھی پہن لیا کرو) ۔ میں نے اس بزرگ شاعر سے جو میرے باپ کا دوست تھا کہا ۔ "حفیظ صاحب میں نے میراجی کو ریڈیو اسٹیشن پر دیکھا تھا ۔ ان سے ملا بھی تھا ۔ دو گھنٹے ان کے ساتھ گزارے تھے میں نے ان کے اندر جھانگ کر دیکھا ۔ وہاں کی فضا تو بہت اجلی تھی ۔ اس میں تازہ بہار کی مہک بھی تھی ۔ "پھیکی ہنسی ہنسے اور کہا ۔ "اندر فیر دیکھیں پہلے باہر نوں تے پوری طرح دیکھ لے ۔ (اندر پھر دیکھنا ۔ پہلے اس کا باہر کا احوال تو پوری طرح دیکھ لو) ۔ حفیظ صاحب اپنی جگہ ٹھیک تھے ۔ ان کے گیتوں کی بڑی دھوم تھی ۔ اور آواز میں جادو بھی تھا ۔ مگر میراجی بھی گیت سطح کمال پر لکھتا تھا ۔ ابھی تک اور کسی شاعر نے اس صنف سخن کی طرف توجہ نہیں کی تھی ۔ تو حفیظ صاحب کو بچے تجل ۔ نئی طرز کے گہرائی رکھنے والے گیت لکھنے والا میراجی کیسے اچھا لگ سکتا تھا ۔ حفیظ صاحب کا اندر زیادہ اجلا نہیں تھا کہ مروت اور احسان کی روشنی اور خوشبو سے ہمیشہ محروم رہا ۔

دوسری بار میراجی سے ۱۹۴۴ء میں دلی کے براڈ کاسٹنگ ہاؤس میں ملاقات ہوئی ۔ میں پروگرام ایگزیکٹو کی پوسٹ کیلئے انٹرویو دینے گیا تھا ۔ میراجی نہایت تلطف سے ملے ۔ شاہد احمد دہلوی مرحوم سے بھی ملوایا ۔ اور ادیب سہارن پوری سے ان کا کلام بھی سنوایا ۔ وہاں میں نے ان کے ہاتھ میں لوہے کے گولے بھی دیکھے تھے جو اب ان کی شناخت بن چکے تھے ۔ میراجی کا

exterior پہلے سے کچھ زیادہ میلا تھا۔ مگر آنکھوں میں وہی تیز روشنی، وہی سچائی، وہی دیانت، وہی خلوص اور وہی ہمہ گیر رواحسان اور مودت کی تھی جو میں نے ۱۹۳۸ء میں دیکھی تھی۔ اک گونہ اداسی کی لو بھی اب ساتھ مل گئی تھی۔ میراجی کی صداقت اور محبت سب کے لیے تھی۔ خاک کے ذرے سے مہرو ماہ تک۔ وہ شہود کی کائنات کے سارے مناظر سے لے کر غیب تک کا احاطہ کرتی تھی۔ سو باہر کی بگڑتی ہوئی حالت مجھ تک بہت کم پہنچی۔ مجھ تک جو چیز پہنچی وہ میراجی کے باطن کا بیکراں جمال تھا۔ جس سے وجود کے فانی ہونے کا ایک خفی سا گداز ہم آمیز ہو گیا تھا۔

پھر میں اکتوبر ۱۹۴۴ء میں ریڈیو میں ملازم ہو کر پشاور چلا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد لاہور آیا تو معلوم ہوا میراجی بمبئی میں ہیں اور وہیں رہیں گے۔ جولائی ۱۹۴۸ء میں میں تبدیل ہو کر کراچی آ گیا۔ ۱۹۴۹ء میں یہ خبر اخبار میں پڑھی کہ میراجی ۳۷ برس کی عمر میں جاں سے گزر گیا۔ وہ جوالا مکھی جو ابھرتی جوانی میں دل میں جاگزیں ہو گئی تھی اس نے ایک بڑے تخلیقی جوہر کو توانائی اور جلادی۔ لو دیتے لفظوں کے تیز رو دریا کا مخزن اور منبع بن گئی۔ لیکن اس کے بلند سے بلند تر ہوتے شعلے میراجی کو اندر ہی اندر جلاتے چلے گئے۔ میراجی کی محرومیاں جن کا نشان خفی سا کہیں کہیں ان کی نظموں ان کے گیتوں میں ملتا ہے اندر دھڑ دھڑ جلنے والی آگ تھیں۔ اس آگ نے میراجی میں ایسی ان مٹ تشنگی پیدا کر دی کہ وہ اسے کم کرنے کیلئے اس سیال آگ کا عادی ہو گیا جو آدمی کو دھت کر کے چند ساعتوں کے لیے بے سدھ کر دیتی ہے۔ اس دھت کر دینے والے دارو سے وہ اپنے اندر ہمہ وقت موجود جبلی نراج کو لفظوں کا لباس پہنا کر اپنے بڑھتے ہوئے روگ کا وقتی مداوا کرتا تھا۔ میں ایک گنہ گار شخص ہوں۔ سو ایک محروم آشفتہ آوارہ روح کی اضطراری لغزشوں کو سمجھ سکتا ہوں۔ میں نے بھی بہت دکھ جھیلے بہت سے چارہ گروں سے آس بندھی کہ اندر کے گھاؤ کو رفو کر دیں گے۔ مگر وہ گھاؤ گہرا ہوتا گیا۔ جو شخص محرومی اور ناکامی کا دکھ اپنے جی سے دور نہ کر سکے وہ معمول کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ ایسا شخص حقارت کا نہیں مروت اور تلطف کا مستحق ہوتا ہے۔ نراج میراجی کے اندر تھا۔ گزند اگر اس نے کسی کو اپنی زندگی میں پہنچایا تو یہ صرف اس کی اپنی موت تھی۔ اس کا وہ فانی وجود جسے اس نے بے موت مار دیا۔ کہیں اس نے دوسرے انسانوں سے تو صرف محبت کی۔ ان کے سامنے سچ بولا۔ کبھی اپنے احساسات پر جھوٹ کی چادر نہیں ڈالی۔ میں میراجی کو اس کے مرکز ذات میں دیکھتا ہوں تو اس کی لغزشیں تقدیر کا جبر نظر آتی ہیں۔ اپنی نہاد میں وہ ایک بہت خوش نما اور خوش خو انسان نظر آتا ہے۔

میں نے میراجی کا کلام اب تک وقت نظر سے نہیں پڑھا تھا۔ اب کہ میں "چلنے ہار" ہوں جو فرض مجھ پر واجب الادا تھے انہیں ادا کرنے میں برسوں سے منہمک ہوں۔ میں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے اپنی زندگی کی شمع کو دونوں طرف سے جلا رکھا ہے اور وہ قطرہ قطرہ میری انگلیوں میں سے بہے جا رہی ہے۔ تیزی سے۔ اپنے سب بزرگوں اور دوستوں کا قرض حسب توفیق

ادا کر چکا ہوں۔ میراجی کا قرض باقی تھا اور ہے۔

اب سے کوئی دو برس پہلے میں نے اٹھارہ برس کی مکمل بیگانگی اور اجتناب کے بعد ریڈیو کے میوزک سٹوڈیو میں پھر قدم رکھا۔ اور اپنے پسندیدہ شاعروں کے منتخب کلام کی دھنیں بنا کر مقامی گلوکاروں سے گوانے لگا۔ میں نے میراجی کے تین چار گیتوں کی دھنیں محنت سے بنائیں۔ اور اس عدیم النظیر غزل کی۔ "نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا" گیتوں کی دھنیں اس لیے بنائیں کہ میراجی کے گیتوں کی دھنیں ہمارے نامور موسیقار بھی بناتے ہیں تو انہیں مشکل پیش آتی ہے۔ سو مصرعے کو لے میں لانے کے لیے کبھی کوئی لفظ حذف کر دیتے ہیں یا اپنی طرف سے بڑھا دیتے ہیں۔ جو میراجی کے مرتبے کے شاعر کے معاملے میں Sacrilege سے کم نہیں۔ بڑا سوء ادب ہے۔ تو میں نے راہ دکھانے اور مثال قائم کرنے کے لیے ایک مشکل گیت کی دھن بنائی۔ جس میں پورا مکھڑا ماترہ سنچائی کے بعد استھائی کو ایک پہلے حرف "اب" کے بغیر کہہ کر پھر سم کے بعد ایک ماترہ چھوڑ کر پوری استھائی مع لفظ اول کہو تو لے بھی بچ جاتی ہے اور پورا بول شروع کا بھی ادا ہو جاتا ہے۔ اب سے دو برس پہلے مجھے یہ آگہی نہ تھی کہ مستقبل قریب میں مجھے ادبی تنقید بھی کرنا ہوگی۔ پھر حالات یکایک ایسے ہوئے کہ فن تنقید کے بارے میں جو اشارے میں نے اپنی آپ بیتی "ناممکن کی جستجو" میں کیے تھے انہیں اساس بنا کر باقاعدہ عملی تنقید کا آغاز کرنا پڑا۔ اب میں راشد اور فیض کی شاعری پر اپنے نقطہ نظر کے مطابق سیر حاصل تنقیدی مقالے لکھ چکا ہوں۔ تو کوئی جواز "میراجی" کا حق ادا کرنے کا نہیں رہا۔ اور پھر ایک سے زیادہ دفعہ عزیز مکرم مشفق خواجہ تقاضا کر چکے ہیں کہ میں اس صاحب اسلوب جدید شاعر کے کلام کا اسلوب اور فکر ہر دو سطح پر جائزہ لکھوں۔ میں نے اب تک اپنے کسی دوست کسی عزیز کو حتیٰ کہ ضیا کو بھی نہیں بتایا تھا کہ میراجی کا سراپا جب کبھی میری آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو میں اسے ۱۹۳۸ء کے لاہور یا ۱۹۴۴ء کے دلی میں نہیں دیکھتا۔ مجھے وہ ہمیشہ تین ساڑھے تین ہزار برس پہلے کے وسطی ہند کے جنگلوں میں یا کوہ ہمالہ کے سلسلے میں کہیں دامن کوہ میں تن پر بھبوت ملے گیان دھیان میں مگن دکھائی دیتا ہے۔ یہ شاید میرے لاشعور میں چھپا جبلی آلائشوں سے منزہ ظاہر و باطن میں سچا پاک اور صاف میراجی ہے، وہ میراجی جسے میری روح نے دیکھا۔ میں سمجھتا ہوں یہی اصلی روپ تھا میراجی کا میں دیکھتا ہوں کہ اس کی آنکھوں سے تیز روشنی کی ایک لہر رات کی تاریکی میں بجلی کی تیزی سے آسمان کی طرف اٹھتی ہے اور بہت اوپر جا کر تاروں کی جھلمل میں جذب ہو جاتی ہے۔ پھر میری زبان پر بیساختہ میراجی کا وہ بہت سجل بہت ارفع سطح کا گیت آجاتا ہے۔

ایک ہی نام پکارے مورکھ جگ میں لاکھ سہارے
گھوم رہے ہیں ستارے سارے سندر سندر پیارے پیارے
ان کے بھید نہ جانے کوئی ان کے بھید ہیں نیارے

ایک ہی رنگ ہے ان میں تمہارا باقی رنگ ہمارے

میں اب کیا کہوں ۔ میں ایک تو ایک بے توفیق آدمی ہوں ۔ مگر مجھے اس گیت سے بو باس اس رت اور اس رفعت کی آتی ہے جہاں آریہ قوم کے رشیوں نے اپنے نئے جنت نظیر وطن میں رگ وید کی مناجاتیں گائی تھیں ۔ وہ بھی اوپر کے بھید جاننا چاہتے تھے ۔ جیسے ہمارا میراجی دیکھنا چاہتا ہے ۔ ان کے سینے بھی کویتا سے معمور ہو جاتے تھے ۔ اور پھر بیچ بجل سروں کی ندی بہنے لگتی تھی ۔ کبھی نرم خرام کبھی تیز رو ۔ بالکل ویسے ہی جیسے میراجی اوپر والی دنیا سے یا اس دنیا کے مالک سے کہتا ہے کہ ان ستاروں میں تمہارا تو صرف ایک رنگ ہے ۔ ان کی روشنی ۔ باقی تو ان کی ساری باتیں ہمارے جیسی ہیں ۔ وہی تنہائی ۔ وہی دائمی جدائی ۔ وہی بیکراں خلاؤں میں آوارگی ۔ وہی نارسائی ۔ دیکھو بڑا جوہر رکھنے والے شاعر نے ایک مصرعے میں کتنی بڑی بات کہہ دی ہے ۔

ایک ہی رنگ ہے ان میں تمہارا ۔ باقی رنگ ہمارے

مجھے افسوس ہے کہ ناصر کاظمی نے جو خود بہت اچھا لفظ شناس تھا اس بڑے خیال کو اپنا کر بہت چھوٹا کر دیا ہے ۔

شعلہ میں ہے ایک رنگ تیرا باقی ہیں تمام رنگ میرے ۔ اسے یہ شعر اپنے دیوان سے خارج کر دینا چاہئے تھا ۔ ناصر کاظمی نے باقی جتنے خیال پرانے بزرگوں کے کلام سے لیے انہیں پہلے سے زیادہ سنوار نکھار کر اپنا لیا ۔ اور وہ اس کے ہو گئے ۔ غالب کا بہت برتر شعر ہے ۔

نظارے نے بھی کام دیا داں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

ناصر نے اس خیال کو عجب بج دھج سے پیش کیا ۔ شعاع حسن ترے حسن کو چھپاتی تھی وہ روشنی تھی کہ صورت نظر نہ آتی تھی ۔ آرزو لکھنوی کا مصرع ہے ۔ دل ہی نہیں اداس کرتا ہے بن بھی سائیں سائیں ۔ ناصر نے اسے کیسے خوش جمال شعر میں بیان کیا ۔ دل تو میرا اداس ہے ناصر شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے ۔ علامہ اقبال اپنے فرزند جاوید اقبال کیلئے دعا کرتے ہیں حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ ۔ بیٹے کیلئے باپ کی دعا ناصر کے ہاں محبوب کے حق میں التجا بن گئی ۔ بہت ہی سادہ ہے تو اور زمانہ ہے عیار خدا کرے کہ تجھے شہر کی ہوا نہ لگے ۔ میں ایسے استفادہ کو ہر تخلیق کار کا حق سمجھتا ہوں ۔ بشرطیکہ وہ اس کا حق اسے زیادہ حسن عطا کر کے ادا کر سکے ۔ یہاں میراجی کا خیال آسمان کی بلندی پر تھا ۔ ناصر اسے اپنے اطاق میں اتار لائے ۔ میراجی کے خیال کا بیکراں نور موم بتی کی لو میں سمٹ کر رہ گیا ۔ اجالا ہیچ مایہ ہو گیا ۔

میراجی کا جوہر بہت توانا تھا اور بڑی وسعت رکھتا تھا ۔ عمر کے آخری دو تین سال تو موت سے کل وقت جنگ کی نذر ہو گئے ۔ سو تخلیقی عمل ڈیڑھ عشرے سے زیادہ عرصہ پر محیط

نہیں ۔ پھر بھی وہ کتنی نظمیں ۔کتنے گیت لکھ گیا۔ کہ دیوان ہزار اوپر پچاس صفحات پر پھیلا ہوا ہے
میراجی نے غزلیں بھی کہیں جن میں زبان رائج اسلوب غزل سے مختلف ہے ۔ نظیر اکبر آبادی کی
سادہ غزل سے بھی الگ ۔ ہاں آرزو صاحب کی " سریلی بانسری " میں شامل غزلوں کی زبان اور
میراجی کی غزلوں کی زبان بہت مماثل ہے ۔ میراجی کا مطالعہ ادب اپنے سب ہم عصر شاعروں کے
مقابلے میں وسیع تر ہے ۔ سو مجھے یقین ہے کہ انہوں نے آرزو صاحب کی فارسی سے پاک دو چار
غزلیں ضرور پڑھی ہوں گی ۔آرزو صاحب کے فلمی گیت تو میں نے بارہ تیرہ برس کی عمر میں سن لیے
تھے ۔ میراجی مجھ سے عمر میں کوئی ساڑھے آٹھ برس بڑے تھے ۔آرزو صاحب کے مقبول خاص و عام
گیت میراجی نے اس عمر میں سنے ہوں گے جب شاعری ان کی کل وقتی لگن بن رہی تھی ۔ سو میں بہ
صد ادب اتنی گزارش کی اجازت چاہتا ہوں کہ میراجی نے اپنے ہندی آمیز اسلوب میں اپنے پیش رو
آرزو لکھنوی کے لہجے سے لازماً اکتساب فیض کیا ہوگا ۔ اور یہ کوئی بری بات نہیں ۔ کسی کے چراغ
سے اپنا چراغ روشن کر لینا کوئی عیب کوئی گناہ نہیں ہے ۔ میراجی نے ہندی لہجے میں جو گیت لکھے جو
نظمیں اور غزلیں کہیں وہ خالصتاً ان کی تھیں ۔ کہ ان کا مزاج کسی پرانے یا ہم عصر شاعر کے مزاج
سے کسی طور مماثل نہیں ۔ ان کے پاس کہنے کو نئی باتوں کا ایک ختم نہ ہونے والا خزانہ تھا ۔ اپنے
مزاج کی باتوں کا ۔ سو اس کے لیے اپنے مزاج کا لہجہ ایجاد کرنا ایک مبرم تخلیقی تقاضا تھا ۔ ادب کے
سب طالب علم جانتے ہیں کہ مرزا غالب نے اپنی اردو شاعری کے آغاز میں جو ریختہ برنگ بیدل
لکھا وہ صرف " قیامت " ہی نہ تھا سراسر تصنع و قت تھا ۔ اس کلام کا بیشتر حصہ بالآخر قلمزد ہوا ۔ دو چار
نہیں ساڑھے چار ہزار ابیات پر مشتمل برا کلام کالی داس گپتا رضا نے برسوں کی محنت شاقہ اور
تحقیق کے بعد شائع کر دیا ہے ۔ اکثر اشعار پڑھ کر میں ندامت سے پسینہ پسینہ ہو گیا ۔ اس گزارش
کا مطلب یہ ہے کہ کسی سے اثر قبول کرنا بری بات اس وقت تک ہے جب تک تخلیق کار نقال
رہے ۔ لیکن اگر کسی کے چراغ کی لو سے اپنی راہ کچھ دور کے لیے روشن کر لی پھر اپنا دل روشن
ہو گیا اور سامنے فکر اور بیان کی نئی سے نئی راہیں کشادہ ہونے لگیں تو تخلیق کار ایک طباع صناع
اور تخلیق کار کی حیثیت سے لائق تعظیم و تکریم ہے ۔

میراجی نے جسم کی حد تک تو جوگ سادھ لیا مگر جوہر کی سطح پر وہ ہمیشہ مستعد ، چوکس اور
محتاط رہے ۔ اپنے باطنی احوال کی بنا پر انہیں کئی پرتوں والی دروں بیں نفسیاتی شاعری راس آئی ۔
غزل میں نفسیاتی تہہ داری اور حسن و عشق کے روابط کی نوعیت اور اس کی ظاہر اور مخفی کیفیتوں
کے تجزیے کی ابتدا تو مومن نے کر دی تھی ۔

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
کیا دل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا

لگتے ہیں اپنے آپ کو اب اجنبی سے ہم
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب ، کوئی دوسرا نہیں ہوتا

لیکن یہ نئی آگہی جبلی خواہشوں میں مخفی گن اوگن کی تلاش اور ان کا سچا کھرا بیان۔ ہماری ادبی روایت کے لیے اچنبھے کی سی بات ہے۔ اس کے لیے نہ الفاظ کا مطلوبہ ذخیرہ تھا نہ کوئی منجھا ہوا پیرایہ بیان موجود تھا۔ دنیا میں صرف دو زبانیں ایسی ہوئی ہیں جو انسانی تجربے کی تمام جہتوں کا احاطہ اب سے تین ہزار برس پہلے کرنے کے لیے لفظ اور لہجہ رکھتی تھیں۔ یونانی زبان اور سنسکرت۔ اب سے ڈھائی ہزار برس پہلے یونان میں یکایک مابعد الطبیعاتی تحقیق و تفکر کا آغاز ہوا۔ ایک سے ایک بڑا فلسفی یکے بعد دیگرے سامنے آیا۔ کسی کو اپنے ادق سے ادق مجرد سے مجرد خیال کے اظہار میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ سنسکرت میں اپنشد مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے نو سو برس پہلے رشیوں نے لکھنا شروع کئے۔ پھر بھگوت پرانٹر لکھے گئے۔ چارواکا دہریتی مکتب فلسفہ بھی پورے ولولے کے ساتھ آیا۔ مہاویر جین نے کائنات کا میکانکی تصور پیش کیا۔ مہاتما بدھ نے جیون دکھ کے دارو اور نروان پانے کی بات کی۔ منطق کا یونانی منطق سے کہیں وسیع تر نظام مرتب کیا گیا۔ چھ بڑے فلسفیانہ مکتب قائم ہوئے۔ مجرد افکار کے لیے ایک نہایت بلیغ زبان اور مفردات کی حامل فرہنگ ان سب کے خیالات کی ترجمانی کے لیے موجود تھی۔ لیکن شرق اوسط کی بیشتر زبانیں، عربی، عبرانی، ایرانی، فارسی، ترکی ساری وہ زبانیں اور ہماری مقامی بھاشائیں بیشتر بیانیہ زبانیں ہیں۔ سو اردو میں نازک اور غیر مرئی افکار کو رواں زبان میں پیش کرنے میں ہمارے محققوں، دانشوروں اور فلسفیوں کو ہمیشہ بہت مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جو باتیں میراجی کہنا چاہتا تھا، خواہش کی مختلف سطحوں کی، جبلت کی، نارمل اور abnormal حالتوں کی، ان کے لیے نظم میں کوئی فرہنگ کوئی لہجہ دستیاب نہ تھا۔ میراجی کا سب سے بڑا سب سے اہم اور فوری مسئلہ ایک نئی زبان اور نئی فرہنگ کی اختراع تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میراجی فیض صاحب اور راشد صاحب کی طرح طبعی عمر تک پہنچتا تو یقیناً ایک نہایت وسیع فرہنگ اور اسلوب نفسیاتی شاعری کے لیے ایجاد ہی نہیں مکمل کر کے دے جاتا۔ مگر اس نے تو ابھی اس راہ میں سفر آغاز کیا تھا۔ ابھی ابتدائی نوعیت کے لسانی تجربے کر رہا تھا کہ موت نے آلیا۔ پھر بھی اس نے موجود لہجے اور لفظیات کے ساتھ اپنا ہر خیال نہایت سہولت سے نہایت کامیابی سے موزوں کلام میں پیش کیا اور منزل کمال پر پہنچ گیا۔ جمیل جالبی صاحب نے اردو ادب سے وابستہ لوگوں پر بڑا احسان کیا کہ الطاف گوہر صاحب کی تحریک پر میراجی کا کلیات مرتب کر کے شائع کر دیا۔ میں نے بھی یہ گنجینہ جواہر حاصل کر لیا تھا۔ مگر اس کا بالا ستعیاب مطالعہ ابھی تک نہیں کیا تھا۔ صرف گیت اور غزلیں ایک سے زیادہ مرتبہ از اول تا آخر پڑھیں۔ میری کچھ اپنی نفسیاتی الجھنیں ہیں جن کی

وجہ سے میں گزشتہ تیس پینتیس برس سے فن ہو کہ ادب کسی ایسے میدان میں داخل نہیں ہوتا جہاں ان قدروں کی جراحت کا احتمال ہو جن کی حدوں میں میں محصور ہوں ۔ میں نے اب سے کوئی ۲۵ برس پہلے امریکہ کے ایک شہر میں ای ۔ ای کمنگز کا جو " خشمگیں نوجوانوں " کے شعری مکتب کا امام تھا مجموعہ خرید لیا تھا ۔ کراچی آکر ایک رات میں نے اس مجموعہ کو یونہی بیچ سے کھولا تو ایک مصرعہ پر نظر ٹھر گئی ۔ والٹ وہمین کے مشہور مصرعہ I love you America کو ایک لفظ بدل کر شامل نظم کر لیا گیا تھا ۔ وہمین کے مصرعہ میں love چار حروف پر مشتمل لفظ ہے ۔ اس لفظ کی جگہ چار حروف کا گندہ لفظ جو ف سے شروع ہوتا ہے رکھ دیا گیا تھا ۔ میں پسینہ میں ڈوب گیا اور کتاب بند کر دی ۔ اب جب کہ میں ان شیطانی مظاہر سے محفوظ ہو چکا ہوں میں نے دو ڈھائی برس پہلے ایک دن پھر اس شاعر کا مجموعہ نکالا اور اس کی چار چھ نظمیں بڑی توجہ سے پڑھیں ۔ اچھا شاعر ہے اس نے گالی کیوں دی تھی اس کا معتبر جواز نظموں میں مل گیا ۔ جب معاشرہ بدچلن اور استحصالی اور ہوس کار ہے تو وہ اس دشنام کا مستحق ہوتا ہے جو کمنگز نے امریکہ کو دی تھی ۔ Four letter word میں ۔ یہی اپنی عطاشدہ اندرونی محکمی پر اعتبار ہے جس نے مجھے گیت اور غزل سے ہٹ کر "میراجی" کی نظموں کا ایک طالب علم کی حیثیت سے مطالعہ کرنے کا حوصلہ دیا ۔ انہی نظموں نے میراجی کو اردو کی ادبی روایت میں ایک معتبر اور منفرد مقام عطا کیا ہے ۔

میراجی کی اہم نظموں کا تجزیہ اور ان کے سارے کلام کی قدر معین کرنے سے پہلے میں ایک بات میراجی کے " اسالیب " کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں ۔ ان کے ہاں لہجہ کا فرق تبدیل سے متاثر غالب کے اوق اسلوب اور عظیم شاعر غالب کے اپنے اسلوب کے مابین فرق سے ہزار ہا فرسنگ زیادہ وسیع ہے ۔ ایسے اسالیب نظر آئے جن میں بعد المشرقین ہے ۔ مجھے ان میں تین بڑے اور ایک دوسرے سے الگ اسلوب ملے ۔ ایک اسلوب پر ہندی کا غلبہ ہے اور مزاج اردو کی ادبی روایت سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتا ۔ دوسری انتہا پر وہ اسلوب ہے جہاں ان کے کلام میں فارسی راشد اور فیض کے اسلوب سے بھی زیادہ وافر نظر آئی اور اس category میں دو تین sub. categories ہیں ۔ فارسی اور ہندی کے باہمی تناسب کی بنا پر ۔

پہلے میں اس اسلوب کا ذکر کروں گا جس میں علامتیں ، استعارے ، کردار ، تلمیحات ایک ایسی تہذیبی اور رومانی روایت سے لی گئی ہیں جس سے اردو زبان بولنے والا شناسا نہیں اور جو برصغیر میں ۱۲ سو برس غیر مسلم آبادی کے ساتھ رہ کر بھی ہماری ادبی روحانی اور معاشرتی روایت سے دور رہے ہیں ۔ ہم نے یہاں کے پھل اور ترکاریاں یہاں کی بھجیا اور دال ساگ تو اپنا لیے ۔ ہنڈیا اور چپاتی اور چوکا بھی ہمارے ہاں آگئے ۔ مگر ہم نے نماز کو کبھی پوجا، دعا کو پرارتھنا نہیں کہا ۔ صبح کو اوشا بھی کسی مسلم روایت میں نہیں دیکھا ۔ مسلم بنگلہ زبان پر سنسکرت کا اثر نمایاں ہے

مگر وہاں بھی پانی کو پانی کہا جاتا ہے جل یا جول نہیں کہا جاتا۔ آسمان کو آسمان ہی کہا جاتا ہے آکاش یا ابر نہیں۔ جنازہ کو ارتھی بھی ہماری کسی علاقائی زبان میں نہیں کہا جاتا اور مجھے یقین ہے یہ اساطیر اور یہ الفاظ اردو زبان کا حصہ کبھی نہیں بن پائیں گے۔ جب ایک ملک تھا تو نہ بن سکے اب تو تین ملک ہیں اب انہیں اپنی sensibility میں کون سمو پائے گا۔ میراجی کی نظم یہودی دیکھئے۔ یہودی سامی النسل ہیں۔ جن کی اپنی اساطیر بہت خوبصورت ہیں۔ اب اس نظم کا لہجہ توجہ طلب ہے۔

پیچھے پیچھے لاکھ شکاری آگے ایک شکار
دھن گن۔ گیان۔ بھی کام نہ آئے
نام ہری کا جپتا جائے
اپنی سی وہ کیے جائے گا۔ کر لو اتیاچار

دھیان کی دھن میں مگن رہیں گے۔ بیڑا یو رم پار
جب جیون کا پھندا ٹوٹے
جب بیری کے جال سے چھوٹے
سامنے دور دھرتی کے دوار پر مکتی کا سنسار

مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ نظم جرمنی میں یہودیوں کی نسل کشی پر ہے۔ اور یہودیوں کی استقامت فی الدین اور قومی حمیت کو ایک خراج تحسین ہے۔ کردار میں یہودیوں ہی جیسی محکم ہندو قوم ہے جو تین ہزار سال فاتحوں سے مار کھاتی اور پھر انہیں اپنے اندر یوں جذب کر لیتی رہی کہ ان کا نام و نشاں بھی کہیں باقی نہیں رہا۔ اس قوم میں یہ اندرونی توانائی اس کے علم اس کی دانش و حکمت اور دوسروں کو اپنی ہئیت اجتماعی میں assimilate کرنے کی توفیق سے پیدا ہوئی۔ مسلمانوں کو یہ قوم اپنے اندر نہ سمیٹ سکی کہ مسلمان ایک زیادہ فعال اور مثبت تصور حیات اور نظام اقدار لائے تھے۔ جو مصر و بابل کی قدیم اساطیر سے بھی فیض یاب تھا اور پھر اس روایت وحی کے وارث بھی تھے جو ابو الانبیاء ابراہیمؑ سے شروع ہوئی اور موسیٰ، عمران، داؤد و سلیمانؑ اور مسیحیت کے مسیح مصلوب سے ہوتی ہوئی قرآن حکیم میں اپنے اتمام کو پہنچی۔ یہ نظم راشد لکھتے تو مسلمانوں کی زبوں حالی سے آشفتہ اور مسلمانوں کی روایت سے بیزار اور منحرف ہونے کے باوجود اس زبان اور ان تلمیحات میں لکھتے جو اردو بولنے اور لکھنے والے کسی دقت کے بغیر سمجھ لیتے۔

میراجی کی اس نظم میں ہندی ادق نہیں تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ شروع ہی میں ایک صوتی ہیجان پیدا کر دوں۔ میں ہندی زبان سے کاملاً بیگانہ نہیں ہوں۔ بھگت کبیر اور تلسی داس اور خان خاناں کی کویتائیں اور دوہے سمجھ لیتا ہوں لیکن "یہودی" کو سمجھنے میں مجھے خاصا وقت لگا

کیوں کہ سہل الفاظ کے باوجود اس نظم کا مزاج، اس کی فضا، اس مزاج اور فضا سے بہت مختلف ہے جو ہم نے تین سو برس پہلے کی دکھنی اردو سے لیکر اب تک ورثے میں پائی ہے۔ اب دیکھئے نظم کا عنوان ہے "اجالا"

آشا آئی۔ سارے من کے دکھ اک پل میں مجھ کو بھولے
من مندر میں سکھ سنگیت نے ایسی امنگیں آن جگائیں
جیسے کوئی ساون رت میں پھلواری میں جھولا جھولے
کومل بوندیں میرے من میں ایک انوکھی شوبھا لائیں
جیسے نیلے ساگر میں دو کونجیں اڑتی جائیں
جیسے بسنتی سماں سہانا من کو چنچل ناچ نچائے
حیرانی ہے میرے من میں ایسی باتیں کہاں سے آئیں
من سویا تھا۔ سوئے ہوئے کو کون پکارے کون جگائے؟
جیسے کوئی نوجیون کا ہرکارہ سندیسہ لائے
جس کے من میں آشا آئے۔ بس وہی تجھے وہی بتائے

جیسا کہ میں نے "یہودی" پر بات کرتے ہوئے کہا تھا۔ اس نظم میں بھی ہندی کے الفاظ مشکل نہیں ہیں۔ لیکن جب ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی اس غیر مسلم اکثریت کے علاقے میں اس مزاج کی اردو غزل کہہ رہے تھے۔

اس لب کی صفت لعل بدخشاں سے کہوں گا
جادو ہیں ترے نین غزالاں سے کہوں گا

اور

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

جب میر و مرزا دلی میں غزل سرا تھے۔ آتش و مومن ذوق اور غالب لکھنؤ اور دلی میں غزل طراز تھے اس وقت مسلمان اور غیر مسلم ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ آپس میں بھائی چارہ بھی تھا۔ ایک دوسرے کے تہواروں اور شادی بیاہ میں شرکت بھی ہوتی تھی۔ اس باہم رہن سہن کے باوصف غزل، مثنوی اور قصیدہ کسی صنف سخن میں ہمارے شاعروں نے یہ بولی نہیں لکھی تھی۔ رتن ناتھ سرشار نے فسانہ آزاد لکھا۔ دیا شنکر نسیم نے قصہ گل بکاولی نظم کیا۔ اس میں بھی خالص اردو تھی۔ یہ بولی نہیں تھی۔ خود میراجی کے دوستوں شاگردوں اور مداحوں کو دیکھو۔ مختار صدیقی نے نظموں کی حد تک منزل شب میں میراجی کے لہجے کو اپنایا جس میں ہندی اور فارسی کی آمیزش تھی یوں کہ دو انمل ملا دیے گئے۔ سو ان کی نظم کی شاعری ہماری شعری روایت میں کوئی معتبر مقام

حاصل نہ کر سکی ۔ معتبر مختار صدیقی ہوا تو سی حرفی سے ہوا ۔ جس کا لہجہ کافی مختلف تھا ۔ مختار صدیقی نے غزل میں غزل ہی کی زبان استعمال کی ۔ مگر ان کی غزل ان کے کلام کا سب سے کمتر حصہ ہے ۔ ضیاجالندھری نے گیت لکھے ۔ ظاہر ہے کہ حفیظ سے نہیں میراجی سے متاثر ہو کر ۔ مگر اس کے گیتوں کی زبان میراجی کے دیومالائی کرداروں اور اساطیری علامتوں سے منزہ ہے ۔ بہت حد تک صرف ایک جگہ کہا ہے "میں شیام نہیں" اور یہ ضیا کا ابتدائی کلام ہے ۔ ضیاصاحب اسلوب ہوا تو اپنی زمان ومکاں کا احاطہ کرنے والی نظم "موج ریگ" میں اتنا کہتا ہے ۔ کنھیا کے اشلوک ارجن کھلی آنکھوں سنتا رہا ۔ ہندی الہیات انسانی فکر کی انتہائی رفعتوں پر ہے اور اس کے Universals ساری نوع کی Sensibility میں شامل ہو چکے ہیں ۔ سو اس اساطیری حوالے کا جواز نظم فراہم کرتی ہے کیونکہ اس کے بعد اپنی وحی کی روایت سے استفادہ کیا گیا ہے ۔

مری ذات میں گم زمان ومکاں
میں قطرہ نہیں بحر ہوں
دھڑکتا ہے سینے میں میرے دو عالم کا دل

یہ سچ اسلامی تصوف کی روایت کا تعقل ہے ۔ اساسی ۔ سو دونوں تعقل ایک ساتھ آئے کہ ساری نوع کا احاطہ کر لیا جائے ۔ جو نکتہ میں بہ صراحت قاری کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ میراجی کا ہندی اساطیر اور دیومالائی حوالوں والا لہجہ اور شعری اسلوب اردو بولنے والی اکثریت کے Ethos سے میل نہیں کھاتا ۔ ہمارے فلمی گیت لکھنے والوں نے پاکستانی فلموں کی سرحد کے اس پار مانگ بڑھانے کے لیے ہندی آمیز بولی میں گیت لکھے ۔ لیکن وہ فلمی گیت ہی رہے ۔ اور مقبولیت کے چند مہینے گزار کر ہر گیت ماضی میں دفن ہو جاتا رہا ۔ دیکھیے ہمارے فلمی اداکاروں نے سنتوش کمار، درپن جیسے نام رکھے ۔ کیا ہمارے عام لوگوں نے ان کی دیکھا دیکھی اپنے بچوں کو یہ نام دیے؟ نہیں ۔ ہندی آمیز شاعری بھی یہاں کبھی قدم نہیں جما سکتی ۔ آج کل پھر وفود کے تبادلے شروع ہوئے ہیں تو کچھ ادیب اور شاعر اپنی مقبولیت کو بین الادبی سطح پر لانے کے لیے ایک غیر فطری بولی اپنا رہے ہیں ۔ اور اساطیر بھی ادھر سے درآمد کر رہے ہیں ۔ یہ ادب کچا بچہ ہے ۔ اور کچھ نہیں ۔

میراجی کی نظموں میں جو دو مثالیں میں نے اس ہندوستانی نوع کی بولی کی پیش کی ہیں ان کی کل تعداد خالص مفرس نظموں کی تعداد سے بہت کم ہے ۔ کئی نظموں کی زبان تو راشد کی انتہائی فارسی آمیز نظموں سے بھی کہیں زیادہ مفرس ہے ۔ یہ میراجی کا دوسرا اسلوب ہے ۔ لیکن اس اسلوب پر بات کرنے سے پہلے میں میراجی کی نظم "ترقی پسند ادب" کا پہلا اور آخری بند پیش کر رہا ہوں ۔ اپنی اس بات کے ثبوت میں کہ یہ اسلوب اردو کی شعری روایت اور لسانی روایت کے وارثوں میں کبھی رواج نہیں پا سکتا ۔ کہ ان کا مزاج ان کی سماعت اس کے لیے تیار نہیں ہوگی ۔

اس کو ہاتھ لگایا ہوگا ہاتھ لگانے والے نے
پھول ہے رادھا ۔ بھونرا بھونرا ۔ بونرے نے ہاں کالے نے
جمنا تٹ پر ناؤ چلائی ناؤ چلانے والے نے
دھوکا کھایا دھوکا کھایا دھوکا کھانے والے نے
سکھیاں کب تک دھوم مچائیں کچھ نہ سنی متوالے نے
کام نہ آیا ۔ بات نہ رکھی ۔ اپنے دل کے اجالے نے

دل بے چین ہوا رادھا کا کون اسے بہلائے گا
جمنا تٹ کی بات ہوئی تھی اب تو دیکھا جائے گا
چنکی ہے گی رنگ وہ سارا رادھا جو بھی سر پر آئے گا
اودھو شیام پہیلی رہتی دنیا کو سمجھائے گا
پریم کتھا کا جادو سننے والوں کے دل پہ چھائے گا
یہ تو بتاؤ کون سورما اب کے ہاتھ لگائے گا

یہاں اتنا عرض کر دوں کہ میں نے آرزو صاحب کے گیت جب سنے تھے تو مجھے بہت اچھے لگے تھے ۔ کہ اساطیری حوالوں سے بالعموم خالی تھے ۔ جگ کی لاج ۔ من کی موج دونوں کو نبھانا ۔ پیا ملن کو جانا ۔ جیسے گیت ۔ مگر میراجی کی یہ ایک نامانوس اسطور پر مبنی نظمیں باوجود اس عمیق تعلق خاطر کے جو مجھے ان سے ہے ۔ گو ملاقاتیں صرف دو ہوئی تھیں ۔ مجھے اپنی طرف نہیں کھینچ سکیں ۔ اور یقین مانئے مجھ میں رواداری حد سے سوا ہے ۔ میں کالی داس کی شکنتلا اور میگھ دوت کا ترجمہ پڑھتا ہوں تو وہ مجھے خود میں جذب کر لیتا ہے ۔ میں اس کی دنیا میں ایک سراپا شوقِ زائر کی طرح کھو کر رہ جاتا ہوں جیسے سوفوکلیز کی المیہ تماثیل پڑھ کر میں اب بھی رو دیتا ہوں ۔ مگر فارسی میں بے محل بے جواز ہر مصرعے میں عربی کلمات آنے لگیں تو میں اس کلام کو خلاف طبع اور بے رنگ پا کر اس سے دور ہٹ جاؤں گا ۔ کہ وہ تحریر مجھے فارسی زبان کی اہانت نظر آئے گی ۔ شاد عظیم آبادی مرحوم کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ جب وہ اپنی علمیت کے اظہار کے لیے اردو اشعار میں عربی کے جناتی کلمات لاتے ہیں تو مجھے بہت الجھن ہوتی ہے ۔ اگر آج کوئی اردو لکھنے والا ایسا کرنے لگے تو میں اردو زبان کے ادیبوں شاعروں دانشوروں سے گزارش کروں گا کہ اس سے ترک موالات کا اعلان کرو ۔ کہ وہ اردو زبان کی توہین کر رہا ہے اور اسے بگاڑ رہا ہے ۔ میراجی نے اہانت نہیں کی ۔ ہرگز نہیں ۔ کیونکہ وہ عمیق اور اچھوتے خیالات کیلئے ، اپنی ان سنی باطنی کیفیات کے لیے ایک موزوں پیرایہ اظہار ایجاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا ۔ اور یہ اسلوب اس کی مختلف النوع کوششوں کا ایک رخ ہے ۔ یہ نظمیں اگر ہماری ادبی Sensibility میں

نہ بھی رچ بس سکیں تو بھی تاریخی سطح پر لائق تکریم ہیں۔

دوسرا اسلوب نہایت محتشم فارسی آمیز اردو کا ہے۔ وہ کس سطح کی زبان ہے اس پر بات کچھ حوالے کچھ مثالیں دینے کے بعد کروں گا۔ راشد صاحب کے اسلوب کو فارسی آمیز کہنے والے نقاد حضرات میراجی کا یہ اسلوب دیکھیں۔ بے شمار نظمیں اس اسلوب کی کلیات میں بکھری پڑی ہیں۔ پہلی نظم نسبتاً کم فارسی آمیز ہے۔ نظم کا عنوان ہے۔ "ابوالہول"۔

بچھا ہے صحرا اور اس میں ایک ایستادہ صورت بتا رہی ہے

(یہاں ایستادہ درست نہیں کہ ابوالہول بیٹھا ہے۔ جیسے شیر بیٹھتا ہے۔ یہ مصرع یوں ہو سکتا تھا۔ بچھا ہے صحرا اور اس میں آسودہ ایک صورت بتا رہی ہے۔ لیکن شاعر اسے بطور پاسبان پیش کر رہا ہے۔ سو اس کی آسودگی کو استادگی نظم کی ضرورت کے تحت بنا دیا ہے۔ یوں بھی میراجی کو "استادہ" کا لفظ آسودہ کے مقابلے میں اپنے نفسیاتی جبر کے زیادہ مرغوب تھا)

پرانی عظمت کی یاد آج بھی ہے باقی
نہ اب وہ محفل نہ اب وہ ساقی
مگر انہی محفلوں کا اک پاسباں کھڑا ہے
فضائے ماضی میں کھو چکی داستان فردا
مگر یہ افسانہ خواں کھڑا ہے
زمانہ ایوان ہے۔ یہ اس میں سنا رہا ہے پرانے نغمے
میں ایک ناچیز و ہیچ ہستی
فضائے صحرا کے گرم و ساکن خموش لمحے
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے
ابھی وہ آجائیں گے سپاہی
وہ تند خو جیں
دلوں میں احکام بادشاہوں کے لے کے آجائیں گے افق سے

آخری بند کا بھی لہجہ اور فرہنگ ایسی ہی ہے۔ مگر یہ نظم میراجی نے ۲۴ برس کی عمر میں کہی تھی۔ سو ہو سکتا ہے ابھی نئی زبان کی ترتیب و تکمیل کا خیال دامن کش دل نہ ہوا ہو۔ اب یہ نظم دیکھیے۔ یہ اس زمانے میں کہی گئی تھی جب میراجی "حلقہ ارباب ذوق" قائم کر کے "ادب برائے ادب" کی تحریک کے روح و رواں بن گیے تھے اور اس تحریک کو تکریم کی مسند دلوانے کے لیے "لب جوئبار" جیسی نظمیں لکھ رہے تھے۔ ایک اچھا خاصا جمگھٹا شاگردوں اور مداحوں کا ان کے گرد جمع ہو چکا تھا۔ نظم کا عنوان ہے دھوبی گھاٹ۔

جس شخص کے ملبوس کی قسمت میں لکھی ہے
کرنوں کی تمازت
رشک آتا ہے مجھ کو

اس پر
کیوں صرف اچھوتا
انجان۔ انوکھا
اک خواب ہے خلوت؟
کیوں صرف تصور
بہلاتا ہے مجھ کو؟
کیوں صبح شب عیش کا جھونکا
بن کر
رخسار کی بے نام اذیت
بہلاتا ہے مجھ کو
کیوں خواب فسوں گر کی قبا چاک نہیں ہے
کیوں گیسوئے پیچیدہ و رقصاں
نمناک نہیں ہے
اشک دل خوں سے!
کیوں لمس کی حسرت کے جنوں سے
ملتی نہیں مجھ کو
بے قید رہائی

قطع طوالت کے لیے ایک بند حذف کر رہا ہوں

کیوں دھوئے نہ پیراہن آلودہ کے دھبے
مخمور مسرت؟

کرنوں کی تمازت
بن جائے نہ کیوں رنگ شب عیش کا اک عکس مسلسل
مجبور اذیت!
تو مان لے اس عکس کا منظر
دیتا ہے تجھے جام جشید کی سی لذت
کیوں سوچ رہا ہے۔ جھوٹا ہے یہ پیالہ؟
کیا آج زمانے میں کہیں دیکھی ہے تو نے
دوشیزہ مسرت؟

آخری دو مصرعے باوجود موضوع نظم کی ژولیدگی کے سطح عظمت کی شاعری ہیں۔ روانی، اصوات کا توازن اور خیال کی تہ داری، سب صفات ان دو مصرعوں میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ مگر یہاں بات شاعری کی قدر معین کرنے کی نہیں اسالیب کے تنوع اور اختلاف کے بارے میں کی جا رہی ہے۔

پھیلے ہوئے ملبوس پہ کرنوں کی تمازت
ہے زیست کے گیسو کی حرارت
اس شخص کو پیراہن آلودہ کے دھونے سے ہی روزی
ملتی ہے جہاں میں
تو اس پر نظر رکھ!

ہر ذہین قاری یہاں "پیراہن آلودہ" کے تلازمات سے آگاہ ہے۔ چار حروف والے عمل سے آلودہ پیرہن کو دھونا غریب دھوبی کی روزی ہے اور متکلم کے لیے کرنوں کی تمازت میں اس پیرہن آلودہ کے عکس کا منظر جام جشید کی لذت بہم پہنچاتا ہے۔ کیوں؟ یہ راز بھی یہاں پوری طرح آشکار ہے۔ اب ذرا زیادہ محتشم اسلوب کلام دیکھیے۔ نظم کا عنوان ہے۔ "رقص غزالیں" اللہ اللہ کیسا مرعوب کرنے والا بلاغت التزام نام ہے۔ نظم کا۔

شبانہ محفل سرود و رقص میں
گلوئے نرم و سیمگوں کی گفتگو
وہ چشم نیم وا کی مست لرزشیں
وہ سرخ ساگروں میں گرم زمزمے
وہ قصر عافیت میں تند بم نفس کا داخلہ
شکست برگ گل کی سرد داستاں (یہ دو مصرعے زفاف کا تاثر دیتے ہیں)
وہ درد بہجت حزیں

وہ دودِ نکہت رواں میں دھندلی دھندلی صورتوں کی شرم گوں خموشیاں
وہ منظر فتادہ دِ کشادہ میں حبابِ بحر کا سماں
جنوں کی چپ ملول سی روانگی
جوان راحتوں کا ابر چھا گیا
رخ حسیں پہ سلوٹیں لباس اشتیاق کی
وہ کیف مختصر کی آمد نہاں

اب مقام تکمیل زفاف کا ہے۔

وہ ردِ جذبہ عمل
اڑان طائران ہم نفس کی اب علاحدہ علاحدہ
وہ دودِ نکہت رواں ہوا نہاں
رخ حسیں پہ چھائیں تند و تیز سرد تلخیاں
گلوئے نرم کی وہ قصر عافیت سے تیرہ تر خموشیاں
وہ چشم نیم وا کی شوخ مستیاں رہیں کہاں
شکست خواب کا سماں
شبانہ محفل سرود و رقص میں

مجھے یہ نظم پڑھ کر مفاہیم کی مصرع بہ مصرع تعمیر اور نظم کی ساخت کے ارتقا سے یکایک راشد صاحب کی ایک نظم کا عنوان یاد آگیا ۔" شب زفاف بولہب " کے حصہ اول کا سارا بیان " زفاف " کا ہے ۔ مگر یہاں بات اسلوب کی ہو رہی ہے ۔ اب سوچتا ہوں تو نظر آتا ہے کہ میراجی کے مخصوص نفسیاتی جبلی موضوعات کے مکمل اظہار کے لیے وہ زبان بہت بلیغ ہے وہ لہجہ بہت موزوں ہے جو " لب جوئبارے " میں " دھوبی کا گھاٹ " میں اور اس نظم " رقص غزالیں " میں ہے اس لیے کہ ہمارے ہاں الف لیلی بھی لکھی جا چکی تھی ۔ ملا عبد الحمید کی " بہار دانش " بھی اور سینکڑوں ایسی ہی جبلت کو عفریت بنا کر سر پر سوار کر دینے والی کتابیں ۔ میراجی ناحق ٹامک ٹوئیے مارتے رہے ۔ وہ ایک Perfect ڈکشن تک ان نظموں میں پہنچ گئے تھے ۔ لیکن یہ بات پھر ہوگی ۔ یہاں تو مجھے یہ کہنا ہے کہ اس نظم میں فارسی کی بھرمار مرزا سودا مرزا غالب اور ن ۔ م ۔ راشد کے بیش از بیش فارسی آمیز کلام سے کم بلند آہنگ نہیں ۔ اس میں فارسی کا صوتی حشم اردو کی بڑی روایت شعری سے کہیں زیادہ ہے ۔" رخ حسیں پہ سلوٹیں لباس اشتیاق کی " کیا تہ دار لفظی تصویر ہے ۔ ادبی عجائب گھر میں رکھنے کے لائق ہے ۔ سرد تلخیاں از قبیل راشد لفظی تصویر ہے ۔ ایسے کلام میں وہی اصول گنتھر صاحب کے Swing of the Pendolum کا کارفرما نظر آرہا ہے ۔ جو ہماری ساری تاریخ کی اور ہمارے نفس اجتماعی کی اساس ہے ۔ جب مولانا چراغ حسن

حسرت اور مولانا عبد المجید سالک نے جو سطحِ صحافت پر کلاسیک ادبی روایت کے علمبردار اور امین تھے، میراجی کا مذاق اڑانا شروع کیا۔ اور حسرت صاحب نے ایک پیروڈی بھی اپنے جریدے "شیرازہ" میں چھاپ دی۔ یہ سڑک۔ یونہی چلی جاتی ہے لاہور سے [illegible] تک۔ اور [illegible] نظم پر پھبتیاں کہیں۔ چوم ہی لے گا بڑا آیا کہیں کا کوا۔ تو میراجی نے اردو غزل کے بڑے اساتذہ کے اسلوبِ کہن پر اپنی دسترس کلی کا ثبوت پیش کرنے کے لیے ایسی نظمیں [illegible] کر دکھا دیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے حسرت صاحب میراجی کے ناد، تخلیقی جوہر کے معترف تھے۔ بس اتنا چاہتے تھے کہ یہ اپنے نادر جوہر کو شہوت کی نذر نہ کر دے۔ اس پر شکوہ اسلوب کی ایک اور نظم "[illegible]" کے چند مصرعے دیکھیے۔

اس کا ہے ایک ہی مقصود وہ استادہ کرے
بحرِ اعصاب کی تعمیر کا اک نقشِ عجیب

(Phallic Symbol بڑی صراحت سے عیاں ہے۔)

اور مختصر لرزشیں چشم درے
ریگ کے قصر کی مانند سبکسار کرے

(یہ حربہ بھر حصار میں داخل ہو کر اسے فتح کر لینا ہے)

میراجی کی مشہور زمانہ یا بدنام زمانہ نظم "لب جوئبارے" میں بھی یہی لہجہ جاری ہے۔

آنکھ نے صرف یہ دیکھا کہ نشستہ بت ہے
دامن کوہ میں میں جا کے ستادہ ہو جاؤں
پردہ چشم نے صرف ایک نشستہ بت کو
ذہن کے دائرہ خاص میں مرکوز کیا

اچھی خاصی خوبصورت نظم "سرسراہٹ" میں ایسے بیان بھی آتے ہیں جہاں مکمل [illegible] پر تکلف مصنوعی زبان بولی جاتی ہے۔

مگر شب کی اندھیری خلوت گم نام کے پردے میں کھو کر اس کو یہ معلوم ہو جائے گا اک پل میں
اور اک لذت کے کیف مختصر میں کھو کے وہ بے ساختہ یہ بات کہہ اٹھیں گے "کیا
مجھ کو اجازت ہے
یہاں ان سلوٹوں پر ہاتھ رکھ دوں؟"

مخاطب تو سراپا انتظار ہے۔ اس اوچھی زبان میں یہ اجازت لے کر اس کی اہانت کرنے سے حاصل؟

اب ایک دو مثالیں مختصر سی اور دے کر اس طمطراق والے لہجے میں پوری قدرت سے [illegible] والے میراجی سے اجازت لوں گا۔ "جو ہو کے کنارے [illegible]" "[illegible]"

افق پہ دور۔ کشتیاں رواں۔ جہاں تہاں
کوئی قریب۔ بار نور سے عیاں تو کوئی دور کہر میں نہاں
ہر ایک ایسے جیسے ساکن و خموش پر سکون۔ ہر ایک
بادباں ہے ناتواں!
مگر ہر ایک ہے کبھی یہاں۔ کبھی وہاں
سکوں میں ایک جستجوئے نیم جاں
حیات تازہ و شگفتہ کو لیے رواں دواں
قریب شور ساحل خمیدہ ہے
ہر ایک موج یوں رمیدہ ہے
کہ جیسے آبدیدہ ہے

کہ دور افق پہ کشتیاں نہیں ہیں۔ کوئی روح پارہ پارہ۔ غم گزیدہ ہے۔

اور بہت سی ایسی ہی حیریری اردو میں لکھی ہوئی تحلیلیں آہنگ والی نظموں میں سے ایک مثال آخری۔ اس نظم کا عنوان ہے "تحلیل کے بعد"۔

نغمہ نفس کے تسلسل نے
ٹوٹ کر ذہن کو کیا بیدار
اندرونی علامتیں جاگیں
جاگ اٹھا محشر ضمیر مرا
لذت و کیف خواب رفتہ کے
بن گئے۔ ہم صفیر راہ عدم
میرے جذبات کی ضعیفی نے
رنگ برہم کیا شرابوں کا
اڑ گیا۔ اڑ گیا وہ رنگ لطیف
ہمدم لطف آتشیں میری
ناگوار نظر ہوئی مجھ کو
منظر اک آہنی خیال بنا

کچھ مصرعوں بعد نظم یوں اختتام پذیر ہوتی ہے۔
انکشاف خودی ہوا روپوش

اس طرح خلوت شبانہ کا
اختتام ایک بوسہ مبہم
بن کے رہ جائے گا نہ تھا معلوم

ایسا ہی بوسہ مبہم بے معنی" The Wasteland " میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی المیہ خاتون کردار ٹائپسٹ سے اس کا کلرک آشنا یک طرفہ جنسی آسودگی حاصل کر کے ایک بے حدت رسمی توہین آمیز بوسہ جلدی سے عطا کر کے رخصت ہو جاتا ہے۔

میں نے اپنے حواس، اپنے ضمیر، اپنے روحانی مسلک سے وابستہ اندر کے آدمی کو بالجبر قابو میں رکھا ہے اور ان نظموں کا اسلوب پیش کیا ہے۔ یہ دکھانے کے لیے کہ میراجی بڑا قادر الکلام، کلام موزوں کے مختلف پیرایوں پر یکساں مہارت رکھنے والا صناع اور تخلیق کار تھا۔ یہ نظمیں پڑھ کر قاری کو خود بہ خود معلوم ہو جائے گا کہ حلقہ ارباب ذوق "ادب برائے ادب" کو پنڈولم کی Swing کی آخری نہایت تک کیوں لے گیا تھا۔ بر تر ادب کے اجزائے ترکیبی پر اس مقالے کے آخر میں اپنے معروضات پیش کروں گا۔ فی الوقت تو اسلوبیاتی اور لفظیاتی سطح پر بات ہو رہی ہے۔ ہاں یہاں " تحلیل کے بعد " کے آخری تین مصرعوں میں علامہ اقبال کی مرکزی اہمیت کی اصطلاح " خودی " جلوہ گر ہے۔ اس لفظ کو دیکھ کر ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی اور ان کے ہم خیال کیا فرماتے تھے۔ کیا میراجی نے بھی اقبال سے اکتساب فیض کیا تھا؟

ان نظموں کو کہے ہوئے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ میں ان دنوں جب یہ نظمیں کہی گئیں ابھی جوان نہیں ہوا تھا۔ میرے شعری سفر کی بالکل ابتدا تھی۔ لیکن میں نے اس زمانے میں بھی اپنی غزل میں اتنی فارسی کبھی استعمال نہیں کی تھی۔ بہر حال اس اسلوب میں میراجی اپنی جنسی زندگی کے تجربات اور ناکردہ کاری کے پروردہ خیالات اور خواہشات کو بڑی کامیابی سے بیان کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ اسی اسلوب کو سنوارتے نکھارتے اسی کی نوک پلک درست کرتے تو یہ اسلوب میراجی بن جاتا۔ حدود روایت اردو میں رہتے ہوئے سب سے جدا لہجہ۔ جیسا کہ راشد صاحب کا ہے جیسا کہ ایک حد تک فیض صاحب کا ہے۔ لیکن رقص غزالیں کا لہجہ ہماری مرزا سودا اور مرزا غالب اور میر صاحب کی عمیق تر مفاہیم والی غزل سے کہیں زیادہ مفرس ہے۔ اضافتوں والی تراکیب کیلئے جواز صرف یہ ہے کہ خیال یا جذبہ نہایت نازک اور اینٹھے والا ہو۔ جس کے اظہار کے لیے موجود لفظیات میں موزوں الفاظ دستیاب نہ ہوں تو وہاں اضافت کا استعمال ناگزیر ہو جائے گا۔ جیسے عندلیب گلشن ناآفریدہ۔ یا عافیت کوشی آبا۔ عام " چوما چاٹی " کے جہاں کی ساری باتوں کے لیے ہماری زبان میں ان گنت الفاظ اور بندشیں موجود ہیں۔ ان میں ذرا سی ندرت پیدا کرنے سے سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ لب جو ئبارے۔ اونچا مکان دھوبی کا گھاٹ۔ ان نظموں نے ثابت کر دیا کہ ہماری لفظیات میں کوتاہی نہیں۔ میراجی کے خاص

موضوعات کی حد تک ۔

ایک بات اور ۔ اب جو میں نے Pendulum کی دونوں مہاتیں میراجی کے کلام سے قاری کے سامنے رکھ دی ہیں تو اب تیسرے اسلوب پر بات کرنے کا ہنگام آگیا ہے ۔ میں نے ان اطراف سے ہٹ کر ان نظموں کو دیکھا جو میراجی کے منفرد مقام کا تعین کرتی ہیں ۔ میں گیتوں پر بات نہیں کروں گا ۔ کہ گیتوں کی زبان آسان ہندی لہجے والی زبان ہے گو اساطیر کاشی متھرا اور بنارس سے لاتے ہیں ۔ شو شنکر اور پاروتی ۔ ادھو اور رادھا ۔ اور نند کے لال کرشن مہاراج جو بانسری بجاتے تھے تو کنواری کنیاؤں کے پستانوں سے دودھ پھوٹ بہتا تھا ۔ یہ بات میں نے بنائی ہے ۔ یہ بتانے کیلئے کہ نوخیز کنیائیں پل بھر میں ماں بننے کے قابل ہو جاتی تھیں ۔ گیتوں میں لیکھ کی لیلا اور بھاگ ابھاگ اثر پس منظر میں ایک حزنیہ سایہ سلجھا دیتے ہیں ۔ اور گیت نگار کی راتیں اکثر آنکھوں میں کٹ جاتی ہیں ۔ کبھی کبھی آس بھی بندھ جاتی ہے ۔ مگر پوری کم ہی ہوتی ہے ۔ گیتوں میں مجھے کوئی گیت دل کو چونکا دینے والا پاؤں میں والہانہ رقص کی حرکت پیدا کرنے والا نظر نہیں آیا ۔ میں تھوڑی سی موسیقی بھی جانتا ہوں ۔ گیتوں میں لے سر کی کوئی انوکھی بندش بھی نظر نہیں آئی ۔ جو چاہے ان گیتوں کو لے کر نامی گرامی موسیقاروں سے ان کی موسیقیت کے بارے میں رائے دریافت کر لے ۔ میں نے رائے علم کی سطح سے دی ہے ۔ ویسے گیت کو ایک باقاعدہ صنف سخن بنانے میں کئی اعتبار سے میراجی کو اولیت کا شرف حاصل ہے ۔ حفیظ نے گیت تو صرف ایک لکھا تھا ۔ بس درشن درشن میرا ۔ باقی جو تھا وہ گیت نما نظمیں تھی ۔ لو پھر بسنت آئی ۔ ابھی تو میں جوان ہوں ۔ جاگ سوز عشق جاگ ۔ آرزو صاحب نے گیت روزی کمانے کیلئے لکھے ۔ فلمی صنعت کے لیے ۔ زبان پر قدرت تامہ رکھتے تھے ۔ اسالیب سخن پر پوری دسترس تھی ۔ سو جب تک فلم انڈسٹری سے وابستہ رہے گیت لکھتے رہے ۔ طبعاً وہ غزل گو تھے ۔

انہی دنوں لاہور کے ایک معروف نقاد ادب نے میرے پہلے شعری مجموعے "دود تحیر" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ اسلوب کلاسیک ہے ۔ مگر نئے انداز نظر کے ساتھ ۔ مطلب یہ ہے کہ میں زبان میں میر و میرزا اور آتش و غالب کی روایت کا تابع ہوں ۔ جدید نقاد اس شعری روایت کی اتباع کو آج کے تخلیقی شعور کے تناظر میں اک گونہ خامی قرار دینے لگے ہیں ۔ اسی مکتب کے نقادوں کو راشد صاحب اور فیض صاحب کا اسلوب بھی فارسی آمیز نظر آتا ہے ۔ میری غزل میں تو خیر فارسی کی اتنی آمیزش کبھی تھی ہی نہیں ۔ میں اب کلاسیک اسلوب کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں ۔ میرے خیال میں میراجی کا خاص اسلوب اسی روایت سے وابستہ تھا ۔ اس کلام میں جو میراجی کا حاصل عمر ہے ۔ بس اس میں کبھی کہیں ہندی لفظیات کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے ۔ لیکن غالب رنگ ہماری بڑی شعری روایت کے عین مطابق ہے ۔

میر تقی میر

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا
چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم تو سمجھے تھے کہ اے میر یہ آزار گیا
یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا
پھر موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی
شاید کہ بہار آئی ۔ زنجیر نظر آئی
دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی
کیا میٹھی نیند سوتی ہے اے چشم گریہ ناک
مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا

مرزا سودا ۔

اے ساکنان کنج قفس صبح کو ہوا
سنتی ہی جائے گی سوئے گلزار کچھ کہو
سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا
دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لئے پھرتا ہوں
کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں
قاصد اشک آکے خبر کر گیا
قتل کوئی دل کا نگر کر گیا

مرزا غالب ۔

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھیرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو
منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے س

عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

میں نے اپنی فکر کے مطابق اردو کے تین عظیم شاعروں کے نمایندہ اشعار یہاں نقل کئے ہیں ۔ "رقص غزالیں" کے سامنے ان اشعار کو رکھ کر دیکھو اور پھر فیصلہ دو کہ میراجی کی زبان زیادہ فارسی آمیز ہے یا ان اشعار کا لہجہ اور ان کی لفظیات ۔ ہمارے ہاں" کا تالے دوڑی" گزشتہ نصف صدی میں ادبی روایت بن گئی ہے اور نقاد صاحبان کچھ مفروضے قائم کر کے اور انہیں ادبی صداقت عظمی مان کر عصری ادب کی قدر معین کرتے ہیں ۔ اس طرح کہ جو کچھ وہ شاعروں ، فکشن لکھنے والوں اور دوسرے تخلیق کاروں کے بارے میں کہیں وہ ان کے زاویہ نگاہ کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچائے ۔ میں نے تو گزشتہ کئی عشروں کا تنقیدی سرمایہ دیکھا ہی نہیں لیکن جہاں جہاں معتبر نقادوں اور سخن وروں کے ارشادات مجھ تک پہنچے راشد کو ثقیل فارسی آمیز اسلوب رکھنے کا ملزم ٹھیرا گیا ۔ فیض صاحب نے خواجہ حافظ شیرازی کو جس فراوانی سے اپنایا اس پر کسی تحقیق یا صریح بیان کی اطلاع مجھ تک نہیں پہنچی ۔ جو میراجی سامنے آیا وہ بھی ہندو اساطیر سے استفادہ کرنے والے ہندی لہجے کا شاعر تھا ۔ Preconcived خیالات اور نظریات کو شاعروں ، ادب تخلیق کرنے والوں پر ٹھونسنے کی یہ بہر غیر صحتمندانہ رویہ ہے ۔ کتنے نقادوں نے یہ پکی بات کہی ہے کہ میراجی کی بیشتر نظموں کی زبان اسلوب اور لفظیات اپنے ہم عصر جدید لکھنے والے شعرا سے فارسی الفاظ و تراکیب کا کم تناسب نہیں رکھتی ۔ بہرحال یہ بات میراجی کی خاص نظموں کے جو ان کی شناخت بن چکی ہیں تجزیے کے دوران میں کی جائے گی ۔ اس طرف آنے والے سے پہلے میراجی کے گیتوں کے بارے میں ایک آخری بات ابھی تک ان کہی ہے ۔

یہ تو میں عرض کر آیا ہوں کہ میراجی کے متعدد گیت گانے کے لیے نہایت اچھے ہیں لیکن انہیں خاطر خواہ جمالیاتی نفاست کے ساتھ گوانے کے لیے ضروری ہے کہ نواساز تعلیم یافتہ ہو ۔ لے پر قدرت رکھتا ہو ۔ آز کو از کی تکنیک کو حسب ضرورت سہولت سے استعمال کر سکتا ہو ۔ اگر نواساز نے موسیقی کی نازک Techniques استعمال کی ہوں اور گانے والا لے پر حاوی نہ ہو تو وہ اکثر بے تال بول اٹھائے گا ۔ گیت نمبر ۴۷ میں موسیقی کے لحاظ سے بہت امکانات ہیں ۔ پریت کی ریت امر ہے جگ میں کیسے اس کو نہ مانے کوئی ۔ اس کی دھن استاد نذر حسین بنائے اور پندرہ بیس روز کی محنت اور ریاضت کے بعد مادام نور جہاں یا کوئی اور سچے جوہر والی گلوکارہ گائے تو کرشمہ ساز ہو سکتا ہے ۔ گیت نمبر ۹۷ بھی عجب نغمگی اور لے کے عجب رنگ رکھتا ہے ۔

جگ جگ بوت جلے جیون کی۔ جوت جلے جیون کی
دیوالی ہے اپنے من کی

اس گیت کی ساخت میں تازگی ہے۔ خیال تو بالکل سامنے کا ہے جیسے عام شاعر گیت لکھتے رہے ہیں اور لکھ رہے ہیں۔ جو تہہ داری میراجی کی نظموں میں نظر آتی ہے وہ گیتوں میں شاذ ہی ملے گی۔ یہ جو مثالیں میں نے پیش کی ہیں وہ گیت ایسے ہیں کہ کوئی سحر طراز موسیقار کبھی وجدان کے تابندہ لمحے میں دھن بناکر شعلہ ایسی آواز میں صدا بند کر دے تو وہ موسیقی یادگار ہوگی۔ مگر اس میں کمال میراجی سے زیادہ اس نواساز کا اور گلوکارہ کا ہوگا۔ ایک اور بات گیتوں کے سلسلے میں کہنا دیانت کا تقاضا ہے۔ کہیں کہیں مجھے ان میں صوتی اشکال بھی نظر آیا۔ وہ گیت کاغذ پر تو شاید ٹھیک ٹھاک لگتے ہوں مگر گانے والے کے لئے بڑی آزمائش ہوں گے۔ مثال دیکھئے۔

رنگ گیت گائیں گے
جب وہ گھر کو آئیں گے ان کو ہم سنائیں گے
رنگ گیت گائیں گے

پہلا مصرعہ تو لسانی سطح پر بھی کمزور ہے۔ جب وہ گھر کو آئیں گے۔ محبوب یا مکرم مہمان کے لئے گھر آئیں گے یا گھر میں آئیں گے زیادہ مناسب ہے۔ "گھر کو آئیں گے" سے زیادہ فصیح اور شائستہ ہے۔ خیر یہ بات تو ضمناً آگئی۔ میں قاری کے سامنے اس گیت کی صوتی ثقالت کو پیش کرنا چاہتا تھا۔ راگ رنگ۔ راگ رنگ۔ رنگ گیت گائیں گے۔ یہاں "گ" کے بعد "گ" آنے سے موسیقی میں گگ بن جائے گا اور پہلے اور بعد کی اصوات اس صوت سے علیحدہ ہو جائیں گے۔ ایسی سخت Hard sounds ایک ساتھ آتی ہیں تو موسیقی کے آہنگ کا ستیاناس ہو جاتا ہے سماعت پر بھی گ کا گ سے ٹکرانا گراں گزرے گا۔

میراجی کے گیتوں پر اور مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ بیشتر گیت گوارہ ہیں۔ چند گیت اچھے ہیں بڑا گیت کوئی نہیں۔ گیتوں کا ذکر مکمل ہوا۔ اب میراجی کی نمایندہ اور بڑی نظموں پر بات کرنے سے پہلے ایک خالصتاً "ہندی" لہجے کی نظم کے بارے میں قاری کو اپنے تاثر میں شریک کرنا میراجی کے تخلیقی جوہر کی کلیت کی قدر پیش کرنے میں شاید کچھ مدد دے۔ یہ نظم خالص ہندی لہجے میں ہے مگر اجنبی اساطیر سے منزہ ہے۔ اس کے کئی مصرعے دل کو ایک عجب التہابی کیفیت عطا کرتے ہیں۔ نظم کا عنوان ہے "چنچل" میراجی نے شراب یا شراب کی بوتل کے لئے "چنچل" کا لفظ اپنے کلام میں کئی جگہ استعمال کیا ہے۔

کبھی آپ ہنسے کبھی نین ہنسیں کبھی نین کے بیچ ہنسے کجرا
کبھی سارا انگ ہنسے، کبھی انگ رکے ہنس دے گجرا
یہ سندرتا ہے یا کوتا، میٹھی میٹھی مستی لائے

اس روپ کے ہنستے ساگر میں ڈگ مگ ڈولے من کا بجرا
اب دیکھئے پہلے بہت اعلیٰ اٹھان کے بند میں جو تخلیقی ندرت اور عمق کی فضا پیدا کی تھی اسے کیسے گھسیٹ کر زمین پر لے آئے ہیں۔ میراجی جیسے چوکس صناع سے کبھی یہ بات متوقع نہیں تھی۔

یہ موہن مدھ متوالی ہے۔ یہ مدھ خانے کی چنچل ہے
یہ روپ لبھاتی ہے سب میں۔ پر آدھے منہ میں آنچل ہے
کیا ناز انوکھے اور نئے سیکھے اندر کی پریوں سے
اور ڈھنگ منوہر اور ابری سوجھے ساگر کی پریوں سے
پہلے سپنے میں آتی ہے پازیبوں کی جھنکاروں میں
آوارہ کر کے چین مرا چھپ جاتی ہے سیاروں میں

اس بند میں پہلے بند کی لفظیات کی حدود سے تجاوز کیا ہے۔ "میخانے" "آوارہ" اور "سیاروں" کے لفظ پہلے بند کی چھب سامنے رکھو تو بہت بوجھل اور گراں لگتے ہیں۔ ابتدائی مصرعوں کے سانی آہنگ سے انمل۔ میرا خیال ہے یہ چھ مصرعے میراجی نے محض کسی کمزوری کے لمحے میں "دارو" کی منقبت میں لکھ دئے۔ پہلے چار مصرعوں سے ایک خاص قسم کا جمالیاتی تاثر مکمل ہو جاتا ہے۔ ایک دل موہ لینے والا سراپا سا بن کر سامنے آجاتا ہے۔ اب بھی شائستہ ذوق اور حسن جمال رکھنے والے قاری کو، میں سمجھتا ہوں، دوسرے بند کو نظر انداز کر دینا چاہیئے۔

اب میں میراجی کی ان نظموں پر بات کروں گا جو میراجی کی شناخت ہیں اور جن کی وجہ سے وہ جدید شاعری کی پہلی نسل کی تثلیث کا تیسرا رکن ہے۔ جگہ اول، دوم یا سوم آپ جو بھی اسے دینا چاہیں۔ مگر اتنی بات برحق ہے کہ وہ فیض صاحب اور راشد صاحب کے ساتھ کھڑا ہے۔ میں نے اب جو دقت نظر سے اس کی نظمیں پڑھی ہیں تو میرے دل نے گواہی دی ہے کہ میراجی نے اردو میں جدید شاعری کے دور آغاز میں اپنی جگہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لی ہے۔ میں میراجی کی ساری اہم نظموں کا احاطہ تو نہیں کر سکوں گا۔ کہ ایسا کروں تو ایک ضخیم کتاب بن جائے گی۔ میں ان میں سے چند ایک موضوع اور ان کی تکنیک پر بات کروں گا اور کوشش کروں گا کہ میراجی کے سارے جہان تخلیق کی سیاحت قاری کی ہمراہی میں کر لوں یوں کہ ایک نہ ایک رخ ہر دیدنی منظر کا دیکھ لوں اور دکھا دوں۔ مثال مصوری کے فن سے دے رہا ہوں۔ ہماری اس صدی کا پکاسو ایک عظیم مصور گزرا ہے۔ جسے مصوری کا فن جاننے والوں نے دنیا کے بیس بائیس عظیم مصوروں میں شامل کر لیا ہے۔ میں نے ۱۹۵۵ء میں پیرس کے جدید مصوری کے عجائب گھر میں اس کی تصویروں کی نمائش دیکھی۔ پھر وہاں سے ایک فرانسیسی زبان میں چھپی ہوئی مصور کتاب بھی خرید لی۔ اس کتاب میں پکاسو کے ہر دور کے، کیوبسٹ دور کے، بلیو دور کے اور دوسرے ادوار کے ایک ایک دو دو شہپاروں کی پرنٹس شامل تھیں۔ پیرس کی نمائش میں بھی صرف وہ تصویریں

شامل تھیں جو دنیا کے عجائب گھروں سے اور امراء کی محلسراؤں سے حاصل کی گئی تھیں۔ ان سے بھی اور اس کتاب سے بھی پکاسو کی عظمت کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ میں بھی میراجی کے ہر طرز فکر سے دو دو تین تین نظمیں اقدانہ تجزیے کے لیے لوں گا۔ وہ نظمیں جنہیں میں سمجھ گیا ہوں یعنی مجھے احساس ہے کہ میں ان کے مرکزی خیال تک پہنچ گیا ہوں۔ میراجی کی شاعری میں ایسے ایسے مقامات بھی آتے ہیں جن سے میں قطعاً ناآشنا ہوں۔ پیر کہن سال ہونے کے باوجود میں نے clinical psychology کا بغور مطالعہ نہیں کیا اور جنسی خلل سے کیا کیا perversions کس کس طرح اپنا اظہار کرتی ہیں مجھے ان کا علم نہیں۔ اگر ایسی کسی نظم میں میں کہیں غلطی کر جاؤں تو قاری سے درگزر کی التجا کروں گا۔ ویسے میں اپنی طرف سے پوری یکسوئی کے ساتھ ہر نوع کے تجربے میں تخلیق کار کا ہمدم و ہم نفس ہو کر اس تجربے کی کیفیت تک پہنچنے کی پوری کوشش کروں گا۔

ابتدا میں ایک ایسی نظم سے کر رہا ہوں جس کا موضوع ساری کائنات وقت و مکاں ہے۔ وجود اور نمود دونوں کو شاعر اپنے وجدان میں بیک وقت دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ نگاہ کبھی وجود کو دیکھنا چاہتی ہے۔ کچھ لو سی کچھ سائے سے نظر آئے۔ Reality پوری طرح بے حجاب ہو کر سامنے نہیں آئی۔ Appearance یعنی نمود تو یہ ساری حواس کی پہنائی ہے۔ چاند سورج ستارے۔ پھول تتلیاں۔ روز و شب۔ صحرا اور گلزار۔ بہار اور خزاں۔ پھر وجود اور نمود کا تصور اور دید گڈمڈ ہو جاتے ہیں اور شاعر کو محسوس ہوتا ہے کہ صرف ایک آئینہ ہے اور کچھ نہیں۔ کیا وہ کوئی شاعر کی ذات سے ہٹ کر مطلق ہے۔ وقت رواں، یا شاعری وہ حقیقت ہے یا کوئی ایسی ذات جو ہر جگہ ہے اور کہیں نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ نظم سطح پر انسان اور space time کے باہمی تعلق اور interaction کو جس لفظیات میں پیش کرتی ہے وہ اسلوب ہماری ساری فارسی اردو ادبی روایت کی حد تک بالخصوص شاعری میں ایک کالا نئی اور انوکھی بات ہے۔ میر صاحب نے بھی اس اساسی موضوع پر سوچا اور شعر کہے۔ مرزا سودا نے اسے اپنے رنگ میں پیش کیا۔ غالب کے ہاں یہ مسئلہ مابعد الطبیعاتی معروضیت اور متصوفانہ جذب کی باہم آمیزی سے بڑی اونچی سطح پر سامنے آیا۔ اقبال میں وقت و مکاں سے انسانی ربط کا تعین فلسفہ و شعر کے وصال نے کیا ہے۔ راشد کے ہاں بھی یہ کائنات وجود ایک مستقل سوال ہے۔ پیچیدہ اور لاینحل۔ راشد صاحب بار بار نئے رنگ نئی سطح فکر کے ساتھ اس مسئلے کی طرف لوٹتے ہیں۔ لیکن انسانی قلب کے پیچاک، بے یقینی اور یقین کے ٹکراؤ اور گاہ گاہ باہم آمیزی سے پیدا کردہ اضطرار کو جس طرح میراجی نے پیش کیا ہے وہ کیفیت میں نے اب تک کسی شاعری میں نہیں دیکھی۔ میراجی نہ گیانی ہے نہ رشی ہے نہ عارف و صوفی ہے۔ وہ تو محض ایک شاعر ہے جو ساری حقیقت کو اس کی کلیت میں ایک جزو رہتے ہوئے اپنے اندر سمیٹ کر دیکھنا اور جاننا چاہتا ہے۔ نظم کا عنوان ہے "جزو و کل" میں

نے نظم کی معنوی کلید بتادی ہے۔ اب اس کا صرف ایک Overview پیش کروں گا۔ مصرعوں کی شرح جائز نہیں۔ نظم کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

سمجھ لو کہ جو شے نظر آئے اور یہ کہے میں کہاں ہوں
کہیں بھی نہیں ہے

گویا نمود تو ظاہر ہے کل نہیں۔ اور اگر وہ کل نہیں تو ہونے کے باوجود نہیں ہے۔

سمجھ لو کہ جو شے دکھائی دیا کرتی ہے اور دکھائی نہیں دیتی ہے
وہ یہیں ہے

نمود حقیقت کل کا عکس ہے۔ یعنی حقیقت کا عکس سا تو دید میں جھلکتا ہے۔ مگر نہ کوئی اسے سن سکتا ہے نہ چھو سکتا ہے "لیس کمثلہ شئی" جو ہم دیکھتے ہیں محسوس کرتے ہیں وہ تو "کل" نہیں ہے محض توہم ہے۔ بس یہاں تک میں نے اشارہ کر دیا ہے۔ اب نظم پر قاری کو خود غور کرنا ہوگا۔

یہیں ہے۔ مگر اب کہاں ہے؟
مگر اب کہاں ہے
یہ کیا بات ہے۔ ایسے جیسے ابھی وہ یہیں تھی
مگر اب کہاں ہے؟

یہ حرف گفتہ شاعر کا ہے۔ کوئی وِدوان۔ کوئی رشی کوئی صوفی محو کلام نہیں۔ اب یکایک حقیقت شاعر کو عورت کی شکل میں دکھائی دی۔ اس عورت کی جو شاعر کی خواہش کا مرکز ہے۔ اس کے خواب کی تعبیر یا فریب شوق کی شعبدہ کاری ہے۔ وہ بہ شکل مجاز نظر آئی اور پھر خواب سے کسی نے چونکا دیا۔ اور وہ غائب ہوگئی۔

یہیں ہے۔ مگر اب کہاں ہے
یہ کیا بات ہے۔ ایسے جیسے ابھی وہ یہاں تھی
مگر اب کہاں ہے؟
کوئی یاد ہے یا کوئی دھیان ہے۔ یا کوئی خواب؟
نہ وہ یاد ہے اور نہ وہ دھیان ہے اور نہ وہ خواب ہے
مگر پھر بھی کچھ ہے
مگر پھر بھی کچھ ہے

شاعر جزو ہے اور کل کو مختلف باطنی عالموں میں مختلف خارجی مناظر میں دیکھ رہا ہے۔ دیکھنے اور جاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ سارے توہم، ساری نمود سارا وجود صرف شاعر کی اپنی ذات اور منفرد دید کے حوالے سے ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں یہ نظم باقی ساری مشرقی شعری اور فکری روایت سے الگ ہو جاتا ہے۔ یہ مربوط لاہوتی فکر نہیں۔ شاعر کو حقیقت پل بھر کے لئے اس کے

اندر عورت کے روپ میں بھی نظر آئی سو اک گونہ جنسی عنصر بھی اس برتر سطح کے مجرد تجربے میں در آیا اور پل بھر کے لیے شاعر sexual mysticism کا آغاز کرتا ہوا دکھائی دیا۔

وہ ایک لہر ہے ہاں فقط لہر ہے
وہ اک لہر ہے۔ ایسی جیسی کسی لہر میں تو کوئی بات ہی تو نہیں ہے
اسی بات کو رو رہا ہوں
اسی بات کو رو رہا ہے زمانہ

وہ رود کل رواں ہے۔ برگساں نے دوام کو Duration یا Timelessflow کہا تھا۔ میراجی کہتا ہے یہ ایک رو ہے جو ہر دیکھی رو سے مختلف ہے۔ ایسی تو اور کوئی لہر وہم و گمان میں بھی نہیں آئی۔ شاعر کہتا ہے یہی میرا اضطرار ہے کہ میری فہم میری حد ادراک و عرفان سے وہ کل ماورا ہے اور سارے زمانے کو ساری نوع کو سب رشیوں، عالموں، عاشقوں کو یہ الجھن ہے کہ توہم کی حد کہاں تک ہے۔ اصل کل کہاں ہے۔ پھر شاعر خود کو حوصلہ دیتا ہے۔ خود کو Assert کرتا ہے۔

زمانہ اگر رو رہا ہے تو روئے
مگر میں ازل سے تبسم، ہنسی، قہقہوں ہی میں پلتا رہا ہوں
تو کیا جب زمانہ ہنسا تھا تو اس کو ہنسایا تھا میں نے؟
یہ تم کہہ رہے ہو جو روتے رہے ہو
(اگر تم یہ کہتے ہو۔ میں مانتا ہوں)

سراسر نئی موج خیال ہے۔ وقت کا ایک رخ مکانی ہے۔ space time رونے والا زمانہ انسانی وقت ہے۔ انسانی تاریخ ہے۔ وہ رخ زمان مکانی کا جو ایک کھلنڈرے دیوتا کی لیلا ہے۔ وہ اب اس نظم میں داخل ہوتا ہے۔ آخری تین مصرعے اسے اس نظم میں Usherin کر رہے ہیں اور وہ کہتا ہے کہ میں تو اپنے خالق کے قہقہوں میں پلا بڑھا ہوں۔ اور میرا کام ہنسنا اور ہنسانا ہے۔ ہمیشہ رہا ہے۔ میں کھلنڈرے دیوتا کو ہنساتا ہوں۔ وہ لطائف اس کی دید کے سامنے لا کر جو اسے ہنسا سکیں۔ تباہ ہوتے شہر۔ قتل عام۔ نسل کشی۔ آدمی زادے کی خود فریبیاں۔ نخوت و پندار۔ یک بالشتیے خداوندگان فرعون خصال۔ بجھتے ستارے۔ ٹکراتے سیارے۔ ایک شمع کی لو پر ہزاروں پروانوں کا جل مرنے کے لئے بہ شوق جمع ہو جانا۔ یہ کہہ کر وہ پوچھتا ہے کہ اگر وقت مکانی میں کوئی ایسا ہنگام آیا کہ زمانہ ہنسا ہو تو کیا اسے میں نے ہنسایا تھا؟ نسل کشی کرنے والے ہٹلر نے جب خود کو گولی سے ہلاک کیا تو زمانہ اس خداوند کو چک کے بیکراں پندار پر ہنسا تھا کہ خواب جہانگیری کے تھے اور بالآخر ایک دو پیسے کے ریزہ فولاد آتشیں نے کام تمام کر دیا۔ پھر وہ شاعر سے پوچھتا ہے کہ کیا اس ہنگام زمانے کو میں نے ہنسایا تھا؟ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہتا۔ تم تو سدا

روتے ہی رہے ہو۔ تو اب اگر تم یہ کہو کہ زمانے کو میں نے ہنسایا تھا تو میں مانے لیتا ہوں یہ بات۔
تمہارا دل رکھنے کے لئے۔

مگر جب زمانے کو رونا رلانا ملا ہے تو روتا رہے گا زمانہ
فقط میں ہنسوں گا
یہ ممکن نہیں ہے
زمانہ اگر روئے۔ رووں گا میں بھی
زمانہ ہنسے گا تو میں بھی ہنسوں گا
مگر یہ زمانے کا ہنسنا یہ رونا وہ شے ہے نظر آئے اور
یہ کہے میں کہاں ہوں۔ کہیں بھی نہیں ہوں

یہاں پردے کے پیچھے رہ کر واجب کی کارفرما قوت یہ کہہ رہی ہے کہ اس نمود کے یا ممکن کے اس متھ کلپنا کے سارے دکھ میرے دکھ ہیں۔ اس کی عارضی خوشیاں میری خوشیاں ہیں۔ مگر یہ نمود کے اضداد اگر انہیں مجھ تک لانا چاہیں مجھ سے جوڑنے کے لئے تو جان لو کہ میں باہمہ ہوں اور بے ہمہ ہوں۔ میں کہیں بھی نہیں ہوں۔ کہ کل ہر جگہ ہے اور کہیں مقیم نہیں ہے۔ سو وہ کل کی سطح پر غم و خوشی سے بے تعلق ہے۔ نہ میرے رونے پر اسے دکھ ہوتا ہے نہ میرے رقص والہانہ پر اسے خوشی ہوتی ہے۔

زمانے کا ہنسنا زمانے کا رونا وہ شے ہے
دکھائی دیا کرتی ہے اور دکھائی نہیں دیتی ہے۔ اور ہمیں ہے

یہاں پھر چھایا کی بات کی گئی ہے کہ ہے اور نہیں ہے اور حواس کی حد تک میرے اور شاعر کے لئے ہے کہ ہم اس متھ کلپنا اس secming کا حصہ ہیں اور حواس کی حد تک بہر صورت ہیں۔

میں ہنستا چلا جاؤں گا اور روتا چلا جاؤں گا۔ اور پھر بھی
زمانہ کہے گا تو روتا رہا ہے۔ تو ہنستا رہا ہے
مگر میں یہ کہتا ہوں تم سے کہ میں ہی وہ شے ہوں
جو اب بھی نظر آئے اور یہ کہے میں کہاں ہوں تو پھر بھی دکھائی
نہ دے۔ اور یہ کہے میں کہیں بھی نہیں ہوں
میں روتا رہا تھا میں ہنستا گیا ہوں
مگر تم تو ہنستے گئے تھے۔ بس اب تم ہی روؤ گے اور صرف
اک میں ہوں جو اب بھی ہنستا رہا ہوں

آخری مصرعہ وقت رواں کا نہیں شاید Cosmic Time کا کلام ہے۔ وقت رواں زمین کا وقت ہے۔ ہمارے شب و روز مہہ و سال زندگی کا وقت۔ کائناتی وقت کی تیسری

برتر سطح ہے۔ اناالدھر کے نیچے۔

اس سے پہلے مصرعے شاعر کا کلام ہیں۔ صیغہ واحد متکلم میں۔ اب قاری ان پر غور کرے ایک حساس اور بیدار دل کے اندر خارجی زندگی کے رنگا رنگ مناظر یکجا ہونا۔ سارے اجلے رنگوں کا گھل مل جانا۔ ایسے سوالات کا پیدا ہونا کہ میں کون ہوں۔ کیا ہوں۔ یہ سارا عالم وجود کیا ہے۔ کیوں ہے؟ کیا میری محبت سچی ہے کہ خود فریبی ہے۔ میرا اس ساری کارگاہ ارض و سماوات میں کیا مقام ہے۔ یہ سارے رنگ۔ یہ مناظر۔ یہ سوال یہ خیال جو تانا بانا آدمی کے شعور و احساس میں بناتے ہیں۔ اور جیسے وہ گڈمڈ ہو کر دل و جان کو گداز کرتے ہیں۔ یہ سارے تار الجھ کر ایسی گرہیں بن جاتے ہیں جنہیں کوئی ناخن وہ فلسفہ ہو۔ کہ مذہب کی یقین دہانی ہو۔ نہیں کھول سکتا۔ اس سارے ذہنی الجھاؤ اس پیچاک کو آج تک اس سچائی اور صفائی کے ساتھ کسی شاعر نے ہماری فارسی اردو کی روایت میں بیان نہیں کیا۔ ہمارے عارف تو ان گنجلک تاروں کو عبور کر کے دید کل سے بہرہ مند ہو چکے تھے۔ سو شنکر اچاریہ، ابن العربی، بایزید بسطامی اور رومی و حافظ کو اس بحث میں نہیں لانا چاہیئے۔ میں جب رومی و عطار کو پڑھتا ہوں تو ان سے میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ میرے اضطرار کو تسکین ملتی ہے۔ مگر اس نظم نے مجھ پر وہ کیفیت طاری کی کہ مجھے محسوس ہوا یہاں میراجی کا جینئس نہیں میرا اضطرار کلام کر رہا ہے۔ یہاں میراجی ایک کامل تخلیق کار ایک ماہر صناع ہے۔ ایک لفظ کہیں زاید نہیں۔ ایک لفظ آورد کا یا بھرتی کا نہیں۔ از اول تا آخر یہ نظم ایک انمول اکائی ہے۔ میں نے اس نظم کا ذکر کبھی اپنے حلقہ یاراں میں بھی نہیں سنا۔ یعنی میراجی کے راست معنوی وارثوں میں سے کسی نے اس نظم کا میرے سامنے کبھی نام تک نہیں لیا اگر کوئی برتر سطح کا مترجم جو شعر فہم ہو اور انگریزی کے شعری اسلوب پر دسترس رکھتا ہو اور اس نظم کا ترجمہ میرے حسب دلخواہ کر دے تو مجھے یقین ہے یہ نظم برتر عالمی ادب میں جگہ پالے گی۔

لیکن ہو سکتا ہے میں نے نظم کو سمجھا ہی نہ ہو۔ لفظوں کے ظاہری رویے نے جو راہ مجھے سجھائی ہے میں اسی پر چل پڑا ہوں اور اس کے اصل بین السطور معانی کو دیکھ ہی نہ پایا۔ بہرحال میں اتنی بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ بہت بڑی نظم ہے۔ اسلوبی۔ معنوی ہر سطح پر۔

میں نے میراجی کی نمایندہ شاعری کی ابتدا ایک ایسی نظم سے کی جو میراجی نے اپنی برتر سطح وجدان پر تخلیق کی۔ دیانتداری کا یہ کارفرما اصول ہے کہ تخلیق کار کو اس کی بلند ترین سطح تخلیق پر پرکھا جائے اور اس کے شاہکاروں کی سطح کے مطابق اس کا مقام اس فن کی روایت میں معین کیا جائے۔ میں کہیں کہیں دوسرے میراجی کو بھی سامنے لاؤں گا۔ کہ وہ بھی دیانت کا تقاضا ہے کہ قاری بھی اور پرکھنے والے بھی تخلیق کار کی تمام تخلیقی سطحوں اور جہتوں سے واقف ہوں۔ مگر میں توجہ بالعموم اس کلام پر مرکوز رکھوں گا جو مجھے میراجی کی شان کے شایاں نظر آئے گا۔

اب میں کلیات کی پہلی نظم "چل چلاؤ" قاری کی ہم نفسی میں ایک بار پھر دیکھوں گا۔

اس لئے کہ اکثر لوگ جب کوئی کتاب اٹھاتے ہیں تو بالعموم کتاب کے پہلے صفحہ کو ضرور دیکھتے ہیں یہ ایک Reflex action ہوتا ہے۔ جدید نفسیات نے یہ بات بڑی وضاحت و صراحت سے بتادی ہے کہ ہر صنف زندگی کا نر جنسی سطح پر تنوع اور نیا پن چاہتا ہے۔ مادہ عام طور سے Possessive ہوتی ہے اور اپنے اور اولاد کے تحفظ کے لیے ایک ہو کر رہنا چاہتی ہے۔ نر کی جبلت کا یہ جبر یعنی اس کی ندرت طلبی نوعی بقا کی ضمانت ہے۔ فطرت نے نر میں تنوع نوع کو فنا سے بچانے کے لیے رکھا۔ اب دیکھو گائے، بھیڑوں کا، بھینسوں کا ایک پورا گلہ ہوتا ہے۔ اور صرف ایک ایک نر تمام مادہ بھینسوں گایوں اور بھیڑوں کی کفالت کرتا ہے۔ مرغیاں پالنے والے جانتے ہیں کہ ایک اصیل مرغ بیس تیس مرغیوں کے لیے کافی ہوتا ہے۔ ویسے پرندوں میں نر اور مادہ ایک نسل ایک Generation کے لیے اپنی ایک فصل کیلئے گھوسلہ بنائے گا۔ یہ فرق چونکہ ہماری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔ اور مشاہدے میں آتا ہے اس لیے اسے یہاں بیان کر دینا ضروری تھا۔ مگر اس فرق سے اس کلیہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ نر میں Variety کی تمنا مادہ کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے بھی کہ صحت مند اصناف میں مادہ کی تعداد نر سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ جس صنف حیات میں نر مادہ کا تناسب نر کی طرف جھک جائے یعنی نر جانور مادہ جانور سے تعداد میں زیادہ ہوں تو جان لو کہ وہ صنف فنا پذیر ہے۔ اخلاقی ضابطے معاشرتی ضرورتیں، روحانی بندشیں مرد نر کی تہذیب کرتی ہیں اور مرد کی جنسی تنوع پسندی کو ایک حد کے اندر رکھتی ہیں۔ پھر بھی تجربہ بتاتا ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کے سوا لوگ چوری نہ بھی کریں تو ہیرا پھیری سے کم ہی باز رہتے ہیں

نظم "چل چلاؤ" کا موضوع مرد کی جنسی رغبت میں تنوع کا عنصر ہے۔ اور شاعر اس تنوع کی طرف میلان کو اگر وہ چند حدود کے اندر رہے تو برا نہیں سمجھتا۔ بلکہ اسے ایک معصوم عمل سمجھتا ہے۔ "چل چلاؤ" ترکیب سے میرا ذہن فوراً حضرت خواجہ میر درد کے جو ہمارے تصوف کے سلسلہ محمدیہ کے خلیفۂ اول تھے ایک مشہور شعر کی طرف جانکلا۔۔

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ   جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

ساغر کو سطح عرفان پر بھی چلایا جاسکتا ہے۔ کہ کشفی تجربات کیلئے دل کو ہمہ وقت یکسو رکھو تا آنکہ کوچ کی نوید آجائے۔ مگر میں اسے کارزمیں کی سطح پہ لے رہا ہوں۔ زندگی فانی ہے پھر جب تک جان میں جان ہے طمانیت قلب کے لیے ذوق و شوق کی حسن جمال کی تسکین کا جو ساز و برگ حاصل کر سکتے ہو کر لو۔ میراجی عورت مرد کے جنسی روابط پر اس اصول کو عمل پیرا دیکھتا ہے۔

بس دیکھا اور پھر بھول گئے\
جب حسن نگاہوں میں آیا\
من ساگر میں طوفان اٹھا

طوفان کو چنچل دیکھ ڈری، آکاش کی گنگا دودھ بھری
اور چاند چھپا تارے سوئے، طوفان مٹا، ہر بات گئی
دل بھول گیا پہلی پوجا۔ من مندر کی مورت ٹوٹی

یہاں پہلے بند کے تیسرے مصرع پر اس نظم کی کتھا کا پہلا حصہ ختم ہوتا ہے۔

دل میں نسوانی حسن کی کشش شعلہ خیز ہونے لگی تو نوجوان نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ پھر ایک دوشیزہ سے نگاہیں چار ہو گئیں۔ پہلا مصرع اس سارے Episode کے پہلے آغاز سے انجام تک کا بیان ہے۔ خبر مبتدا کے ساتھ ہی دے دی گئی۔

اصل بات دوسرے مصرعے سے شروع ہوتی ہے۔

جب حسن نگاہوں میں آیا۔ آنکھیں چار ہوئیں تو ایک سیلاب سا دل میں اٹھا۔ مرد میں اتنی بیتابی، اتنی وحشت و وارفتگی اور تسکین کے لیے اتنی تعجیل تھی کہ دوشیزہ جو خود بھی چنچل ہے وہ ذرا سہم سی گئی۔ یکایک آکاش میں جھلمل کی ندی میں نور کی جگہ دودھ بھر گیا۔ دودھ کو جنسی عمل کے ثمر کی طرح میراجی نے کئی نظموں میں استعمال کیا ہے۔ دودھ کا ذکر ہم اس تحریر میں پہلے بھی دیکھ آئے ہیں۔ سو چنچل کنیا کو اپنی گود میں بچہ ہمکتا اور تھنوں سے دودھ کا دریا بہتا دکھائی دینے لگا۔ یعنی وہ بھی پوری طرح آمادہ و تیار ہو گئی۔ پھر جو ہونا تھا ہوا۔ چاند نے شرم سے اپنا چہرہ بادلوں میں چھپا لیا تارے سو گئے۔ آنکھیں بند ہوئیں تو جو ہونے کا وقت قریب تھا وہ نہیں دیکھیں گے۔ کہ یہاں باقاعدہ ایک تن ہونے کی بات نہیں۔ گھر بسانے کی بات نہیں بہائم کی سطح کا عمل ہے۔ یہ بات عمل کے اختتام پہ "ہر بات گئی" نے ظاہر کر دی۔ کچھ دنوں میں مرد سانڈ بھول گیا۔ کہ ایک مٹیار کو اس نے عورت بنا دیا ہے۔

دل بھول گیا پہلی پوجا۔ من مندر کی مورت ٹوٹی

میرا دل کہتا ہے کہ یہاں علامتیں بہت پیاری ہیں سو یہ مصرع مٹیار کی کیفیت کے لیے ہے۔ آگے بات مرد کی ہو گی۔ جب نوجوان نے ادھر کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا۔ شاید بات اس کے ماں بننے کے امکان سے پہلے ہی مکمل ہو گئی۔ عجلت اور بے تابی میں۔ تو لڑکی نے اپنے من مندر میں جس دیوتا کی مورتی پوجا کے لیے رکھ دی تھی۔ وہ بات آئی گئی ہو گئی۔ مندر خالی ہو گیا۔ مورتی ناپید ہو گئی ہے۔ جیسے ہوا میں تحلیل ہو گئی ہو۔ اور وہ کنہیا اس Calflove کو بھول کر ٹھیک ٹھاک ہو گئی۔ کچھ بگڑا نہیں۔ بھگوان کی کرپا سے!

دن لایا باتیں انجانی پھر دن بھی نیا اور رات نئی
پیتم بھی نئی پریمی بھی نیا سکھ سیج نئی ہر بات نئی
اک پل کو آئی نگاہوں میں جھلمل جھلمل کرتی۔ پہلی
سندرتا اور پھر بھول گئے

مت جانو ہمیں تم ہرجائی

ان مصرعوں میں مرد کے دل میں ایک لمحے کے لیے پہلی ایک دو دن کی محبوب کی تصویر ابھر آتی ہے۔ پھر غائب ہو جاتی ہے۔ سن ۱۹۵۵ء میں سات مہینے برطانیہ میں رہا۔ پھر ۱۹۶۳ء میں چار مہینے امریکہ کی یونیورسٹی میں۔ میں نے نوجوان لڑکے لڑکیوں میں اس Calflove کے مناظر اکثر دیکھے۔ جہاں عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں محصور نہیں رکھا جائے گا وہاں یہ معصوم Calflove ہوتی رہے گی۔ اور جس عجلت سے ہوگی اس عجلت سے ختم بھی ہوتی رہے گی۔ جہاں عورتوں کو گھروں میں بند رکھا جائے گا وہاں اور زیادہ سنگین برائیاں لامحالہ جنم لیں گی یہ بات تو محل ایسا تھا سو کہہ دی۔ اصل بات آغاز ہوائی میں جوڑے بدلنے کی ہے۔ اب نظم میں عورت کا حصہ محض پس منظر میں ہے کہ نفسیات مرد کی بتائی گئی ہے۔ یہاں میراجی بھی جنسی سطح پر ایک اعتبار سے Male chauvinism میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

اب آخری مصرع کو پھر دہرا کر بات آگے بڑھاتا ہوں

مت جانو ہمیں تم ہرجائی

ہرجائی کیونکر ہرجائی! کیسے کیسے؟

کیا داد جو اک لمحے کی ہو وہ داد نہیں کہلائے گی؟

جو بات ہے دل کی آنکھوں کی

تم اس کو ہوس کیوں کہتے ہو

جتنی بھی جہاں ہو جلوہ گری اس سے دل کو گرمانے دو

بات شاعر کے دل کی کھل کر سامنے آگئی۔ ابھی کشش صرف آنکھوں اور دل تک محدود ہے۔ تو اگر کسی دوشیزہ کو دیکھا اور نگاہ نے اسے پسند کیا اس کے عارض و لب کو چوم آئی۔ اور دل میں اس کے لمس کے التہاب کی ایک رو دوڑ گئی تو لوگو بتاؤ کس نے کس کا کیا نقصان کیا" یہ دنیا فانی ہے۔ جتنی کچھ مسرت جتنا کچھ بے گناہ و اکتساب انبساط کسی سے کیا جا سکے اس پر پابندی کیوں لگاتے ہو۔ یہ دید اور سیر تو تتلی کی ہے۔ بھونرے کی نہیں۔

اب آگے وقت و مکاں کے تناظر میں انسانی ذہن اور شعور کے عوامل کا ذکر ہے۔ اور یہاں ایک جمالیاتی صداقت Aesthetic reality اور Natural response کا ذکر کیا گیا ہے۔

جب تک ہے زمیں جب تک ہیں زماں

یہ حسن و نمائش جاری ہے

اس ایک جھلک کو چنچلتی نظر سے دیکھ کے جی بھر لینے دو

بہت زیبائی سے ایک جبلی حقیقت اور اس کے معصوم اظہار کی بات کی گئی ہے۔ فن کارانہ

مہارت سے ۔ اور صداقت کی سطح پر ۔ اب فرد سے فرد کے جہاں وقت و مکاں کی طرف توجہ منتقل ہو گئی کہ ہر بیدار دل نوجوان بلوغت کے دور میں داخل ہوتے وقت راتوں کی تنہائی میں کبھی نہ کبھی خود کو اس کائناتی تناظر میں بھی دیکھتا ہے ۔ اب سے اکیاون باون برس پہلے کے لاہور میں چار دوستوں کا ایک حلقہ تھا ضیا جالندھری، اعجاز بٹالوی، الطاف گوہر اور میں ۔ میرے سوا تینوں میراجی کے مداح دوست تھے ۔ حلقہ اربابِ ذوق کے سرگرم کارکن ۔ میں صرف ان کا دوست تھا استعداد میں بھی سب سے کم ۔ ہم جب کبھی ملتے تھے تو کسی نگار گل اندام کی کشش تو کبھی ایک دو جملوں سے زیادہ گفتگو کا موضوع بنی ہی نہ تھی ۔ ہاں ہم سب اپنے آپ کو Space Time میں موجود پاتے تھے ۔ اور اس صداقت پر جو زندگی کی اساس بھی تھی اور جبر بھی اکثر دوسرے جوانی میں قدم رکھتے لڑکوں کی طرح بحث و تکرار کیا کرتے تھے ۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جدید مغربی ادب کا مطالعہ کیا ۔ نوجوان شاعروں، افسانہ نگاروں، تمثیل نگاروں کا ادب بھی پڑھا تو اس میں بھی جنسی اشتعال کے ساتھ ساتھ یہ سب کیا ہے کیوں ہے کی بات بھی سامنے آتی رہی ۔ میراجی نے درست بات کی ہے ۔ ہابیل قابیل کے زمانے سے اب تک یہی یہ ہوتا چلا آیا ہے ۔ بالکل اسی طرح اور نوع کی بقیہ عمر کے آخر تک یونہی ہوتا رہے گا ۔

ہم اس دنیا کے مسافر ہیں
اور قافلہ ہے ہر آن رواں
ہر بستی، ہر جنگل، صحرا اور روپ منوہر پربت کا
اک لمحہ من کو لبھائے گا، اک لمحہ نظر میں آئے گا

یہ بند میری روح کی پہنائی پر محیط ہو گیا ۔ چار مختصر مصرعوں میں اس کفایت الفاظ کے ساتھ بے ثباتی دنیا، انسان کی سیر جمال کا اتنا کم توفیق اور مختصر ہونا یوں اپنی کلیت میں سما گیا کہ یہ چار مصرعے بڑا ادب بن گئے ۔ کوئی ہائے نہیں ۔ کوئی شیون نہیں ۔ صرف ایک منظر کو بیان کیا گیا ہے یوں کہ تاثر صرف ایک ہے ۔ فانی زندگی ۔ ذوق و شوق بے کراں لیے ہوئے دل کی مہلت یک آن ۔ لفظوں میں تو اتنی شدت بھی نہیں جو میرے اس فقرے میں آ گئی ہے ۔ بہت تیز نشتر کا برق رفتار رکھاؤ ہے ۔ جس کا ہدف کو احساس ہی نہیں ہوتا ۔ پتہ جب چلتا ہے جب آنکھیں اک لمحے بعد پتھر ہو جاتی ہیں ۔

اب انسانی زندگی کے مختصر ہونے کا جبر شاعر نے عظمت فن کی سطح پر بیان کر دیا ہے :
بات اس تناظر میں آگے بڑھتی ہے ۔

ہر منظر، ہر انسان کی دیا اور میٹھا جادو عورت کا
اک پل کو ہمارے بس میں ہے، پل بیتا، سب مٹ جائے گا
اس ایک جھلک کو پھیلتی نظر سے دیکھ کے جی بھر لینے دو

تم اس کو ہوس کیوں کہتے ہو
کیا داد جو اک لمحے کی ہو وہ داد نہیں کہلائے گی؟

الفاظ بتا رہے ہیں کہ یہ دادیہ حسن کا سپاس دل و نظر تک محدود ہے۔ یہ جنسی Promiscuity پر منتج نہیں ہوتا۔ جیسا کہ میں نے کہا یہ پھول پھول پر تتلی کے رقص کے مانند ہے۔ تتلی کا پھول پر رقص کرنا اس کا پھول کے حسن کی بارگاہ میں ہدیہ سپاس ہے پھر یہ ہدیہ سپاس پھول پھول کو نذر کیا جاتا ہے۔ اس فطری ستائش اور دوری کی پرستش میں کوئی عیب نہیں کوئی گناہ کوئی جرم نہیں۔

اب تین آخری مصرعے پھر نظم کو اٹھا کر کائناتی وقت سے ہمکنار کر دیتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ بھی بہت بڑی نظم ہے۔ شاعر نے ہرجائی کا لفظ جو منفی ہے برائی کی نشاندہی کرتا ہے استعمال کر کے نظم کے جمالیاتی پہلو کو مستحکم کیا۔

ہے چاند فلک پر اک لمحہ
اور اک لمحہ یہ ستارے ہیں
اور عمر کا عرصہ بھی۔ سوچو اک لمحہ ہے۔

اب اس کا مقابلہ کرو ہمارے روایتی انداز بیان سے۔ فارسی میں علامہ اقبال "سرود انجم" میں اس خیال کو سطح عظمت سے بیان کرتے ہیں۔

بیش تر نزد ما گے
سال تو پیش ما دے
اے بکنار تو یے
ساختہ بہ شیمنے
ما بہ تلاش عالمے می نگریم دمی رویم

شعری بانکپن میں انسان کی محدود توفیق اور عمر یک دو نفس کا جو بیان اس بند میں ہے اس کی نظیر فارسی اور اردو شاعری میں شاذ ہی کہیں ملے گی۔ اردو میں علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

کیا عشق پایدار سے نا پایدار کا
کیا عشق ایک زندگی مستعار کا
کر پہلے مجھ کو زندگی جاوداں عطا
پھر ذوق و شوق دیکھ دل بیقرار کا

ان اشعار میں چیلنج ہے۔ جو اپنی سطح پر بہت خوب ہے۔ لیکن مجھے کوئی ان دو شعروں میں اور میراجی کے تین مصرعوں میں انتخاب کرنے کو کہے تو میں یہ تین مصرعے اپنے دل کی جھولی میں ڈال کر خوش ہو جاؤں گا۔ میراجی ان نظموں میں جس سطح پر نظر آتا ہے اگر وہ دوسری طرف نہ چل

نکلتا اور ایسے ہی مضامین اس لہجے میں موضوع تخلیق بناتا تو دنیا کے بڑے شاعروں میں سے ایک ہوتا۔

ان دونوں نظموں میں ایک حرتیہ آنچ ہے۔ ایک لو ہے دھیمی سی۔ جو عظیم تر ادب میں لامحالہ ہوتی ہے۔ میں عظیم عارفانہ شاعری کو اس وقت اس بحث میں شامل نہیں کرتا۔ رومی اور دانتے، عطار اور حافظ اور بھرتری ہری کی طمانیت اور خوشدلی صرف ادب کی بات نہیں کہ اس میں کچھ اور ان دیکھے ان جانے عناصر بھی ہیں۔

میں یہاں ایک اور نوع کی شاعری کا ذکر کر رہا ہوں۔ جس میں شاعر کا ذہن سطح آگہی پر اس کے اندر کا جائزہ لیتا رہتا ہے اور وجدان اس تجزیے سے ہر لمحہ استفادہ کرتا رہتا ہے۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ صوفی شاعر ہے۔ اس کی شاعری مسیحی تصوف کا نقطہ کمال ہے۔ لیکن اس کے تخلیقی جوہر میں ایک خفی سا عنصر حزن کا بھی ہے جو وہ اپنے باطنی تجزیے کے بعد اپنے اندر دائماً کارفرما دیکھتا ہے میراجی کو کائناتی وقت میں ایک ثانیہ نظر آیا۔ مہلت کا۔ انسانی عمر سانس کی کچی ڈوری ہے۔ موت ہمیشہ ایک سانس کے فاصلے پر ہوتی ہے۔

ان دو بہت برتر اور پائندہ نظموں کے بعد ایک نظم آتی ہے۔ "دیوداسی اور پجاری" جو کلیات میں درج تاریخوں کے مطابق دو برس میں مکمل ہوئی۔ ۳۲ء میں شروع کی گئی اور ۳۴ء میں جاکر تکمیل پذیر ہوئی۔ یعنی میراجی بیس برس کے تھے جب یہ نظم لکھنا شروع کی اور بائیس برس کے تھے جب اسے ختم کیا۔ یہ نظم بیشتر بیانیہ ہے۔ لہجہ ہندی ہے۔ مگر اساطیر سے خالی ہے۔ شاعر کو فنی اعتبار سے اس نو عمری میں بھی اسلوب پر پوری قدرت حاصل ہے۔ اور یہاں بھی وہ زوایہ نہیں جو گیتوں میں نظر آتے ہیں۔ کہیں کہیں۔ اس زمانے میں لکھی ہوئی ایک اور نظم ہے جو مجھے موضوع اور ہئیت اور صناعی تینوں سطحوں پر بہت اچھی لگی۔ عنوان ہے "کٹھور" یعنی ضدی، ہٹیلا بے رحم۔ یہاں کٹھور ضدی کے معنوں میں آیا ہے۔ اس نظم کے تین بند ہیں۔ بحر ہندی ہے۔ فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فلعن فا۔ ہر بند چار ہم قافیہ مصرعوں کا ہے اور ٹیپ کا مصرع (پانچواں) ایک پرانے خیال درباری کی استھائی سے مستعار ہے۔ انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چندرمان۔ بہت سادہ اور معصوم لہجہ ہے۔ تخلیق کار اپنے اندر جھانکتا ہے تو ہر بار دل میں ایسی خواہشیں ایسی امنگیں ایسے خواب نظر آتے ہیں جو کبھی پورے نہیں ہوئے۔ انسانی فطرت ہے کہ وہ نایافت کی تمنا کرتا ہے۔ یہی تمنا انسان کے سفر ارتقا کا اور اس کی منزل بہ منزل ترقی کا راز ہے جو موجود ہے اس سے بے پروائی، اکتاہٹ اور جو نہ مل سکے اس کی تمنا۔ یہاں ایک اور حقیقت بھی اظہار طلب ہے۔ سچے تخلیق کار کے دل سے معصوم بچہ کبھی غائب نہیں ہوتا۔ وہی حیرت وہی استعجاب۔ وہی یکایک فرط مسرت۔ وہی یکایک اداسی۔ مچل جانا۔ اور میراجی تو اپنی فطرت میں تھا ہی سادہ و معصوم۔ جب تک جیا اس کے اندر کا بچہ ہر وقت اس کے اندر آسمان کو تکتا۔ تاروں

سے باتیں کرتا۔ تتلی کی طرح روش روش پر ناچتا۔ جھولا جھولتا رہا۔ اور جب جھولا اوپر جاتا ہاتھ بڑھاتا کہ چاند کو پکڑ لے۔ اس معصوم کیفیت کے بیان میں Words-Worthian سادہ پرکاری ہے جو ایک سراسر جمال فضا کو وجود گیر کر دیتی ہے۔ یہ نظم میراجی کا اپنا باطنی مشاہدہ ہے۔ intropective View ہے۔ میں نے اس نظم کا اسی لئے انتخاب کیا ہے کہ اس میں مجھے Childlike میراجی کی روح سے اس کا استعجاب ہمکنار نظر آتا ہے۔ وہ معصومیت اور بچ جو میں نے دو ملاقاتوں میں اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

دھرتی پر پربت کے دھبے دھرتی پر دریا کے جال
گہری جھیلیں، چھوٹے ٹیلے، ندی نالے، باؤلی تال
انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چندرمان

یہ انوکھا لاڈلا میراجی کے اندر چھپا ہوا معصوم بچہ ہے جو تازیست اس کے ساتھ رہا۔ یہ ننھا بچہ دور اونچے پربت دیکھتا ہے جو دھبے سے دکھائی دیتے ہیں۔ سارا منظر بہت شاداب ہے۔ دریا ہے۔ جھیلیں ہیں۔ ندیاں نالے ہیں۔ آدمی کے بنائے ہوئے سیڑھیوں والے تالاب ہیں۔ جو امیر لوگ اپنے ایوانوں میں بناتے ہیں۔ جنگل ہیں۔ گھنے اور تاریک۔ ایسے جو معصوم دل کو دعوت سیر و تلاش دیتے ہیں۔ فطرت اپنا سارا جمال سامنے بکھیرے ہوئے ہے۔ زمین پر۔ لیکن من بالک جو دسترس میں ہے اس کا مشتاق نہیں۔ جو ہاتھ نہ آسکے اس کو مانگتا ہے۔ Ungettable کو حاصل کرنے کے لئے بضد ہے۔ انسانی فطرت میں یہی ایک معصوم طرحداری ہے جو باقی تمام اوصاف و خصائل سے زیادہ من موہن اور خوش جمال ہے۔ اس طرحداری کو کسی پرانے استاد نے راگ درباری کی اس استھائی میں بہ سطح کمال بیان کر دیا ہے۔ انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چندرمان۔

نظم میں سارے مناظر ہیں جو بچے کو بہلا سکتے ہیں۔ اب دیکھو جوان سہاگن ماں ہے۔ اس کی سکھیاں ہیں۔ جیٹھانیاں ہیں۔ دیورانیاں ہیں۔ سب بچے کو سینے سے لگاتی۔ پیار کرتی۔ لوریاں سناتی گیت گاتی ہیں۔ مگر من تو بالک ہے۔ اور بالک کو منائے منتے کسی نے دیکھا ہے؟

سندر سانولی موہن گوری گود میں لیں کاندھے سے لگائیں
میٹھی رسیلی۔ ہلکی ہلکی صدامیں لوری۔ گیت سنائیں
لیکن روئے مچلے۔ مچل مچل کر ہو ہلکان
میرے من کا بالک اننا۔ ہٹ کرتا جائے۔ ہر آن
انوکھا لاڈلا۔ کھیلن کو مانگے چندرمان
چن چن کلیاں صاف اور اجلی۔ نرم چمکتی سیج سجائیں
گلے لگائیں چومے جائیں۔ سو نازوں سے ساتھ سلائیں

سوئے نہ سونے دے اوروں کو۔ جاگے جگائے رکھے ہر آن
میرے من کا بالک الٹا۔ ہٹ کرتا جائے ہر آن
انوکھا لاڈلا۔ کھیلن کو مانگے چندرمان

یہ واقعی انوکھا بچہ ہے جو اتنی چاند سی عورتوں کے چومنے چاٹنے سے بھی نہیں مانتا۔ میں تو جاں بلب تھا۔ اسی عمر میں۔ اور ایک ادھیڑ عمر کی میران نے گود میں لے کر گانا شروع کیا تو میں سو گیا اور پھر نہ صرف سو گیا بلکہ روبصحت ہو گیا۔ چند میرے جیسے عاجز لوگ پیدا ہی عاجز اور راضی برضا ہوتے ہیں۔ اصول کی سطح پر بات وہی پچی ہے جو میراجی نے اس نظم میں کہی ہے۔ یہ نظم پہلی دو نظموں سے فنی اسلوبی اور لفظیاتی سطح پر کمتر ہے۔ مگر میراجی کی ذات کے اندر معصوم حصہ سے حجاب ذرا سا سرکاتی ہے سو میں نے اسے جائزے میں شامل کر دیا۔ میرا دل کہتا ہے اصل بات ان کہی ہے۔ من کے اندر کا انوکھا لاڈلا ساری عمر انوکھا لاڈلا ہی نہیں رہتا۔ کیا وہ بڑا ہو کر کھیلن کو چاند مانگنا چھوڑ دیتا ہے؟ کوئی ہے جو پورے وثوق سے کہہ سکے کہ میں اب چاند نہیں مانگتا اور نہ ملے تو ہٹ نہیں کرتا!

آخری دو مصرعے محل نظر ہیں۔ دونوں میں قافیہ ہر آن آیا ہے جو میراجی جیسے چوکس صناع سے موقع نہیں۔ میں اس میں کوئی متبادل تجویز نہیں کرتا۔ یہ کام جالبی صاحب یا اپنے تین دوستوں پر چھوڑتا ہوں جو میراجی سے بہت قریب تھے۔ شاید وہ اصل مصرعے سے۔ تیسرے مصرعے سے باخبر ہوں۔

دو تین نظموں کے بعد ایک نظم آتی ہے۔ "دکھ دل کا دارو" یہ نظم ایک سطح پر دیکھو تو سراسر شدید "سادیت" کی آئینہ دار ہے۔ جہاں پیار کی شوق افزا حدت نے عورت کو لب بوسی سے لمس کی لطافت سے مائل و آمادہ کرنے کے بجائے چٹکیاں لینے اور نشتر چبھونے کی بات ہے۔ پھر ذرا سنجیدگی سے غور کرو تو تیز نشتر" پارہ اسادہ" کے لئے علامت ہے۔ اور خون کی دھار زفاف کے بعد کا لازمی بہاؤ ہے۔ یہ ایک گھٹیا مضمون والی نظم ہے۔ اس میں دو اندرونی خبث مضمر ہیں۔ ایک سادیت کا شوق اور ایک Male chauvinism جہاں عورت کے رد عمل اور اس کی Response کی کوئی اہمیت نہیں۔ ہمارے کئی بزرگ ستر برس کی عمر میں ۱۴ برس کی نوخیز لڑکی سے نکاح رچا لیتے ہیں۔ باعمامہ و ریش سفید و پشت خمید اور اس بچی کو اپنے دادا شوہر کے بارے میں کسی رد عمل کے اظہار کی اجازت نہیں ہوتی۔ کرے تو گردن کٹ جاتی ہے۔ کارو کاری کی حد نافذ ہو سکتی ہے مگر ہمارے سڑاند والے فرسودہ معاشرے کے روحانی پیشواؤں کی بات نہیں یہاں تو ایک سراپا مودت و محبت تخلیق کار کی بات ہے۔ مجھے یقین ہے یہ نظم میراجی کے اپنے تجربے کا بیان نہیں۔ کسی Dramatic persona کی خود کلامی ہے۔ مگر میں ایسی خود کلامی کو بھی ادبی قدر کی نفی سمجھتا ہوں۔ ایسے گھٹیا جذبات کو لفظوں کا برجستہ اور کامیاب

لباس پہنانے سے ہونٹ سی لینا کہیں بہتر ہے۔ یہ ادب برائے ادب نہیں۔ یہ موزوں کلام میں وحشت و درندگی کا بیان ہے جس کی نہ اخلاقی حس اجازت دیتی ہے نہ جمالیاتی حس۔ میں نے ذکر کر دیا کہ ایسی Touch of the satan والی نظمیں بھی میراجی نے اپنے ادبی منشور کی تائید میں لکھی ہیں۔ ایسی نظمیں جتنی بھی ہیں ان سے قاری کو اعراض کرنا چاہیئے۔ ہماری روزمرہ کی زندگی میں ہر روز بڑی دہشتیں اور ظلم اور سفاکیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ آدمی کو کم از کم ادب میں تو ان ابلیسی تماشوں سے پناہ میسر ہونی چاہیئے۔

یہاں چلتے چلتے ایک بات کہنا جبر سا بنتا جارہا ہے۔ میں کلیات کے اوراق ان دنوں الٹتا پلٹتا رہا ہوں تو بار بار ایک صفحہ پر نظر ایک مصرعہ پر ٹھہرتی جاتی رہی ہے۔ "میری تخئیل کے پر طائر زخمی کے پروں کے مانند" میراجی طائروں کو جابجا سمبل کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

نظم "شام کے راستے پر" میں کہتے ہیں۔

میں تو اک دھیان کی کروٹ لے کر
عشق کے طائر آوارہ کا بہروپ بھروں گا پل بھر

پھر نثر کی طرح لکھی ہوئی جاریہ نظم "جاتری" میں کہتے ہیں۔ مجھ کو آہستہ آہستہ احساس ہونے لگا ہے۔ اب یہ زخمی پرندہ نہ تڑپے گا۔ لیکن میرے دل کو ہر وقت تڑپائے گا۔ اس سے ایک مصرع پہلے کہتے ہیں۔ پھڑپھڑاتے ہوئے طائر زخم خوردہ کی مانند۔ یہ میں نے دو چار منٹ کی ورق گردانی میں مصرعے نکال لیے۔ کلیات راشد میں بھی طائر جابجا علامت کے طور پر نظر آتے ہیں ان کی نظم "بیکراں رات کے سناٹے میں" سے ایک اقتباس

نیند آغاز زمستاں کے پرندے کی طرح
اپنے پر تولتی ہے چیختی ہے

نظم "خود سے ہم دور نکل آئے" میں دیکھئے۔

کبھی ارمانوں کے آوارہ۔ سراسیمہ طیور
کسی نادیدہ شکاری کی صدا سے ڈر کر
ان کی شاخوں کی اماں پاتے ہیں

"مجھے وداع کر" میں دیکھئے

شجر حجرہ وہ طائرانہ خستہ پر
ہزار سال سے جو نیچے ہال میں زمین پر
مکالموں میں جمع ہیں

کوئی محقق تحقیق کرے تو اور بہت سے مصرعے نکل آئیں گے جن میں ایک نہ ایک سطح پر طائروں اور پرندوں کا ذکر میراجی اور راشد دونوں میں ملے گا۔ ایک اور مشترک بات میراجی

اور راشد صاحب میں "سادیت" کا نظموں میں بے محابہ اظہار ہے۔ راشد صاحب کی نظم "انتقام" کا ذکر میں نے راشد صاحب پر اپنی تحریر میں کیا تھا۔ ابھی اوپر میراجی کی نہایت کراہت انگیز نظم پر بات کر چکا ہوں۔ جس میں پہلے تو چٹکیوں سے سفید بازوؤں پر نیل کے نشان چھوڑتے ہیں پھر نشتر تیز جسم کے ریشوں میں داخل کر دیتے ہیں جس سے لہو پھوٹ بہتا ہے اور سب لباس خون سے تر بتر ہو جاتا ہے۔ ایسی ہی شاعری تھی جس کی بنا پر افلاطون نے کہا تھا کہ ان تخلیق کاروں کے سر پر مشک و عنبر ملو۔ انہیں پھولوں کے ہار پہناؤ اور ملک کی سرحد سے ادھر دھکا دے کر واپس آجاؤ۔ کہ یہ شاعری تطہیر و تزئین ذات نہیں کرتی۔ یہ جزو لیست از پیغمبری کا الٹ ہے۔ شیطانی فعل ہے میں ایسی ترش زبان استعمال کرنے کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ لیکن شائستگی کے حدود سے تجاوز تو بہر حال ادب نہیں ہو سکتا۔ راشد صاحب میں اور میراجی میں اور بھی کئی مماثلتیں ہیں جن کی نشاندہی میری تحریر کے چوکھٹے سے باہر ہے۔ یہ کام کسی Thesis لکھنے والے نوجوان کو کرنا چاہیئے۔ میرا خیال ہے راشد صاحب میراجی سے اپنی باطنی پیوستگی سے باخبر تھے جبھی تو انہوں نے نظم لکھی۔ "میر ہو مرزا ہو میراجی ہو" اپنے ایک ہم عصر شاعر کو میر و مرزا کے ہم دوش لانا ن۔ م راشد جیسے "شعر نو کے خدا" کی طرف سے نایاب خراج تحسین ہے۔ اگر چہ بظاہر میراجی کو بھی بزرگ شاعروں کی طرح زمانے سے بے نیاز خود نگری میں مگن میں دکھایا ہے۔ بہت حد تک یہ بات صحیح ہے کہ میراجی کی شاعری "دروں بینی" ہے۔ ان کی ذات میں جو گرہیں پڑ گئی تھیں وہ ان کا تجزیہ کرتے رہے۔ سب کام جو وہ کرنا چاہتے تھے اور نہیں کر پائے تھے۔ ان کی توجیہ تلاش کرتے تھے اور پھر اپنے اندر انہیں enact کرتے تھے۔ دل کی سیج پر اور پھر اس منظر کو ایک ماہر صناع اور بڑے تخلیق کار کی سطح پر نظم کا لباس پہناتے تھے۔ کبھی کبھی تابندہ لمحے میں خارج اور باطن کا سنگم بھی ہو جاتا ہے۔ جیسے نظم "یگانگت" میں میراجی اپنے اندر دیکھ لیتے ہیں۔ اس نظم میں Pathos بھی بہت ہے۔ میراجی اکیلا جیا اور اکیلا مرا۔ بمبئی کے ہسپتال میں۔ ماں سے، بھائی بہنوں سے دور "حلقۂ ارباب ذوق" کے دوستوں اور شیدائیوں سے اتنا دور کہ دو کہکشائیں ایک لمحے میں مل سکتی ہیں مگر اس کے محب اور حبیب اس سے نہ مل سکے۔ لیکن وہ جی دار بھی تھا۔ ہارا نہیں۔ خود سے باہر نکلا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ سب میں ہے اور سارے مناظر اس میں ہیں۔ اس کی روح میں جو کل کا آئینہ ہے۔ اسلامی روایت ہے کہ زمانے کو برا نہ کہو۔ زمانہ خدا ہے۔ "انا الدھر" اس روایت پر حجت ہے۔ "میراجی" جس نے میرا سین کی خاطر اس کی ساری ریت اس کے اساطیر اس کے مہاراج کرشن اور بھگوان اپنا لیے۔ دیکھیئے یہ نظم کیسے شروع کرتا ہے۔

زمانے میں کوئی برائی نہیں ہے
فقط اک تسلسل کا جھولا رواں ہے
یہ میں کہہ رہا ہوں

یہاں واحد متکلم اپنی انا اپنے "میں" ہونے کا آواز کی پوری توانائی کے ساتھ اعلان کر رہا ہے۔ زمانہ تسلسل ہے۔ ایک بہاؤ ہے جو کبھی رکا نہیں اور پھر اک تسلسل میں ایک نظم ایک تواتر ایک دائمی Sequence ہے۔ پر زمستان کے بعد بہار آئے گی۔ بہار کے بعد پھر پت جھڑ آئے گی۔ اساڑھ کی لو کے بعد ساون کی برکھا آئے گی۔ کھیتوں میں ہریالی ہوگی۔ درختوں میں جھولیں پڑیں گے۔ کنیائیں دھانی دوپٹے لیے جھولا جھولیں گی۔ اپنے موسم کا راگ کھامرلی بجائے گا۔ بھینسیں زیادہ دودھ دیں گی۔ ہیر اس مرلی کی نغمگی میں کھو جائے گی۔ تن من ہار جائے گی۔ پھر جاڑے آئیں گے۔ درخت عریاں ہو جائیں گے۔ جاڑوں کی اداس چاندنی اس ویران دل کی فضا جیسی ہوگی جس میں صرف مردہ امنگوں کے خستہ مدفن ہوں۔ کوئی ہنسے گا کوئی روئے گا۔ کسی گھر میں شہنائیاں بجیں گی کسی گھر سے جنازہ اٹھ رہا ہوگا۔ یہی تسلسل چلا آرہا ہے یہی تسلسل قائم رہے گا یہ "میں" کہہ رہا ہوں۔ جس نے تنہائی کی طویل راتوں میں ان باتوں پر سوچتے راتیں آنکھوں میں کاٹ دی ہیں۔ جیسے یہ کہنے والا کوئی نہیں تھا پتر۔ سو جا۔ میری جان بہت تھک گئے ہو۔ اب سو جاؤ اور وہ تھکی آنکھوں پر اپنے نرم ہاتھ رکھ دیتی کہ ان کی نرمی سے آنکھوں کو آرام ملے اور نیند آجائے

میں کوئی برائی نہیں ہوں۔ زمانہ ہوں۔ تسلسل کا جھولا نہیں ہوں
مجھے کیا خبر کیا برائی میں ہے۔ کیا زمانے میں ہے اور پھر میں تو یہ بھی کہوں گا
کہ جو شے اکیلی ہے اس کو فنا ہی فنا ہے

متکلم نے اپنی ساری ذات ننگی کر کے قاری کے سامنے رکھ دی ہے۔ اس کو برائی کی نوعیت ہی معلوم نہیں۔ وہ برا بھی نہیں اور برائی سے واقف بھی نہیں۔ وہ زمانہ بھی نہیں جو برائی بھلائی کو وجود دیتا ہے۔ وہ تسلسل کی پینگ بھی نہیں۔ جھولا جو اوپر گیا تو دن نکل آیا نیچے آیا تو رات ہو گئی۔ جس کی حرکت میں ماہ و سال ہیں۔ وہ تو بس ایک تنہا اکیلا آدمی ہے جسے یہ آگہی ہے کہ جو اکیلا ہے وہ مطلق فنا میں چلا جائے گا کہ جو اکیلا نہیں وہ اپنی اولاد اپنے دوستوں، اپنی محبت میں بعد موت بھی زندہ رہے گا فنا نہیں ہوگا۔ فنا صرف تنہا کو ہے۔ اب دیکھو وہ بات جو صوفیا اپنی سطح پر کہتے رہے وہ ایک مسلکوں سے بے نیاز عقائد سے ماوراشاعر یوں کہتا ہے۔

برائی بھلائی، زمانہ، تسلسل، یہ باتیں بقا کے گھرانے سے آئی ہوئی ہیں

اپنشد والوں نے کہا وہ تنہا تھا۔ اس نے کہا میں کئی ہو جاؤں۔ اس نے سنسار بنا دیا۔ پوچھا کیسے۔ کہا جیسے مکڑی جالا اپنے اندر سے نکال کر بچھا دیتی ہے۔ تو یہ بقا وہ تنہا ہے جو کئی ہو گیا۔ جس کا کئی ہونا سنسار میں ظاہر ہوا۔ وہ سنسار جس کے مناظر اس نظم میں پیش کئے جائیں گے۔ شاعر کو شاید یہ معلوم نہ ہو لیکن اس توضیح کا امکان فراہم کرتی ہے۔ قرآن حکیم میں آیا۔ اللہ بدیع السموات والارض۔ اللہ باقی وہ ہے جس نے آسمان سارے کے سارے اور زمین بنائی۔ عدم

کو ہست کرکے۔ Nothingness کو Being بنادیا۔ اب پھر اسی مصرعے سے نظم شروع کرتا ہوں۔

برائی بھلائی، زمانہ تسلسل، یہ باتیں بقا کے گھرانے سے آئی ہوئی ہیں
مجھے تو کسی بھی گھرانے سے کوئی تعلق نہیں ہے
میں ہوں ایک، اور میں اکیلا ہوں، اک اجنبی ہوں
یہ بستی، یہ جنگل یہ بہتے ہوئے راستے اور دریا
یہ پربت اچانک نگاہوں میں آتی ہوئی کوئی اونچی عمارت
یہ اجڑے ہوئے مقبرے اور مرگ مسلسل کی صورت مجاور
یہ ہنستے ہوئے ننھے بچے یہ گاڑی سے ٹکرا کے مرتا ہوا اک اندھا مسافر
ہوائیں نباتات اور آسماں پر ادھر سے ادھر آتے جاتے ہوئے چند بادل
یہ کیا ہیں؟
یہی تو زمانہ ہے، یہ اک تسلسل کا جھولا رواں ہے
یہ میں کہہ رہا ہوں

ایسی دبیز اور تہہ دار شاعری نظم میں میراجی سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ یہ بند اگر مجھے اجازت دی جائے تو عرض کروں گا کہ Quintessence of sublime poetry ہے۔ اس بند کے چند مصرعوں میں میراجی نے دائم و باقی مسلسل آنے والے نظارے سامنے رہنے والے قدرتی مناظر دریا، پہاڑ، آسمان اور آسمان میں اڑتے ہوئے بادل بھی دکھائے۔ ننھے بچوں کی ہنسی ان میں ہمکتی ہوئی زندگی اور اندھے مسافر کا گاڑی سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ریشہ ریشہ ہوجانا۔ اجڑے ہوئے مقبرے اگلے زمانوں کے فانی انسانوں کے آثار عبرت اور مقبروں کے مجاور جو زندہ مردے ہیں سب یکجا دکھائے۔ ایک تصویر میں باکمال مصور کی طرح لگادئے۔ ایک Painting میں Totality of existence کو ایک وحدت کے طور پر تسلسل کی گواہی کے لیے پیش کردیا ہے۔ یہ تصویر دکھا کر کہا۔ یہی تو زمانہ ہے۔ یہ اک تسلسل کا جھولا رواں ہے۔

اور پھر اعلان کیا کہ "یہ تسلسل کا جھولا رواں ہے" سنو یہ بات میں کہہ رہا ہوں۔ یہ بقا کے گھرانے سے آئے تھے اور اب اس تنہا آدمی کی دید شنید کی توفیق سے اس میں رچ بس گئے ہیں۔ مثالیت کا فلسفہ کہتا ہے کہ یہ جو کچھ خارج میں ہے وہ میری گواہی سے ہے۔ اس لیے کہ میں اس کی گواہی دے رہا ہوں کہ وہ ہے۔ خالق نے اپنی خلاقی کی گواہی دینے کے لیے ہی تو انسان کو تخلیق کیا اور پھر "علمہ البیان" کے ذریعے سے اسے اسماء سکھا کر اور وہ سب کچھ سکھا کر جو وہ نہیں جانتا تھا کہا وہ گواہی دے۔ اب وہ تنہا اکیلا ہدف فنا متکلم کہتا ہے۔

یہ بستی یہ جنگل - یہ رستے یہ دریا یہ پربت - عمارت - مجاور - مسافر
ہوائیں نباتات اور آسماں پر ادھر سے ادھر آتے جاتے ہوئے چند بادل
یہ سب کچھ - یہ ہر شے مرے ہی گھرانے سے آئی ہوئی ہے
زمانہ ہوں میں - میرے ہی دم سے ان مٹ تسلسل کا جھولا رواں ہے
مگر مجھ میں کوئی برائی نہیں ہے
یہ کیسے کہوں میں
کہ مجھ میں فنا اور بقا دونوں آکر ملے ہیں

یہاں چوتھے مصرعے میں بات صاف ہو گئی کہ خارجی دنیا کے ہونے نہ ہونے کا انحصار Intelligent being کی گواہی پر منحصر ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میراجی نے بشپ برکلے کا فلسفہ پڑھا تھا کہ نہیں - مجھے اتنا معلوم ہے کہ وہ اپنے ہاں کی اسلامی اور ہندو لاہوت اور الہیات سے پوری طرح واقف تھا - میں مذہبی استناد ادبی تنقید میں بالا کراہ لاتا ہوں - جب اور کوئی چارہ کار نہ ہو - میں نہ ملا ہوں نہ مبلغ - ایک عاجز طالب علم ہوں - میں جدید تنقید کے سربرآوردہ عمائدین کی طعن سے بھی ڈرتا ہوں کہ دیکھو ادب کو مسلک سے وابستہ کرنے لگا ہے - ایسی کوئی بات نہیں - میں نے فیض صاحب کے بارے میں بات کرتے ہوئے کوئی بات ایسی نہیں کی جو نازک دلوں کو کھٹکے - راشد صاحب کے جائزے میں بھی میں نے بہت احتیاط کی ہے اور جہاں مجبور ہوا کہہ دیا کہ بات میرے مسلک سے مختلف ہے مگر توجہ چاہتی ہے - یہاں میراجی نے جو بات کی ہے وہ آج تک اس حسن اور اس سادگی اور بے ساختگی سے کوئی نہیں کہہ سکا - ہماری ساری ادبی روایت میں - میں نے اپنشدوں کا بھی حوالہ دیا ہے اور اسلامی روایت کا بھی - اور پھر جدید اذہان کی تسکین کے لئے کہہ دیا کہ صاحبو انگریزوں کا بڑا فلسفی Bishop Berkeley عالم وجود کی حقیقت اس لئے تسلیم کرتا ہے کہ انسانی آنکھ اور انسانی سماعت اور انسانی عقل و شعور اس کے ہونے کی گواہی دیتے ہیں - جس دن انسانی گواہی ختم ہو جائے گی Space time دونوں ہی ختم ہو جائیں گے اس Galaxy کے Backyard میں مردہ مٹی کے ڈھیر Debris کی طرح!

اور پھر دیکھو میراجی نے آخری مصرعے میں وہ بات کہی ہے جو ہماری عظیم اور رفیع ترین فکر کا نقطہ معراج ہے کہ انسان میں فنا اور بقا دونوں بہم ہیں - جسم کی خاک خاک میں مل کر فنا ہو جاتی ہے مگر روح کی اڑانیں، تخلیق کی مینا کاری، وجدان کی جست یہ جاودانی ہیں - ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما - یہاں میراجی نے جو نوع کا نمائندہ ہے یہی بات کہی ہے -

اس عظیم نظم پر بات میں نے بصد ادب اپنی توفیق کے مطابق کی - پہلے بھی دو بڑی نظمیں آچکی ہیں - ان نظموں کی لفظیات اور لہجہ اردو کی بڑی روایت سے وابستہ ہے - سر مو کوئی

فرق نہیں اور خیال میں مشرق کی مابعد الطبیعاتی اور الہیاتی فکر و وجدان کی انتہائی رفعت پر ہے۔ بر حق اور بر ملا۔ اب میں دوسرے میراجی کی ایک نظم پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ فن جمیلہ پر نظم ہے اس فن سے حقیقت باقی تک راہ بناتی ہے۔ یہ کلید تھی نظم کی جو میں نے پیش کر دی۔ میں نے اب تک میراجی کی عروض کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ میراجی کو طبیعتاً ہندی بحر فعلن فعلن اور پنگل سے علاقہ ہے۔ مگر وہ فارسی اردو کی تمام بحور پر بھی پوری قدرت رکھتے ہیں اور جب چاہتے ہیں جیسے چاہتے ہیں بحر کو مہارت نامہ سے استعمال کرتے ہیں۔ یہاں صوت بیشتر مفعول مفاعیلن فعلن دو بار کی ہے۔ رقص میں کتھک بھارت کی کلاسیکی روایت کا ایک منفرد اسلوب ہے۔ بڑے اسلوب چار ہیں۔ بھارت نٹیم، منی پوری، کتھا کلی اور کتھک۔ کتھک میں واجد علی شاہ اختر کے دربار میں اور اس سے پہلے مغل دور سلطنت میں بہت ترقی ہوئی اور مسلمان ماہرین رقص نے اسے باقی تین ہیئتوں سے بالکل الگ شکل دے دی۔ اب میراجی اپنے خیال کا اظہار ناچ کی اصطلاحات کے وسیلے سے کریں گے۔ میں اس سے زیادہ صراحت نظم کی نہیں کروں گا کہ اس کا اصل لطف اس کے رچاؤ اور اس کی چال میں ہے۔

دیوار پہ نقش مصور کے یا سنگتراش کی کاریگری
یا سرخ لبادہ سجائے ہوئے موہنی چنچل شیشے کی پری
(یہاں لازماً شراب کی بوتل نہیں۔ بلور بدن رقاصہ ہے سرخ پشواز میں)
یا بن کے پرانے مندر میں بولے جو پجاری ہری ہری
اس کے دل کی دیوداسی اک اور ہی روپ میں ناچتی ہے
اب دائیں جھکو۔ اب بائیں جھکو یوں ٹھیک۔ یونہی ایسے ایسے

رقاص دیوداسی کو کتھک کے انگ بھاؤ اور نرت اور لے میں سارے بدن کا ماتروں سے ہم آہنگ ہو جانا، آڑ کواڑ میں بدن کو سمیٹ کر یکایک بول پکڑنا اور لے اٹھاتے چلے جانا۔ چھنگلی سے لے کر سینہ بازو، گردن، سر آنکھوں کا جھکانا اٹھانا نگاہوں کی چلت پھرت۔ کبھی دائیں دیکھنا کبھی بائیں۔ کبھی کنکھیوں سے لے اور تال سے کامل ہم آہنگی کے ساتھ۔

اب راجا کے تخت چھوڑنے کی بات آتی ہے۔ کتھک میں عام طور سے مہاراج رام اور سیتاجی کی کتھا بیان ہوتی ہے۔ ہندو اساطیر میں دو راجاؤں نے تخت چھوڑا۔ دونوں اس وقت راج کمار تھے۔ شری رام چندر جی نے بن باس لیا۔ باپ کے قول ہارنے کی لاج رکھنے کو۔ اور کپل وستو کے مہاراجکمار سدھارتھ نے جو بعد میں مہاتما بدھ بنے۔ مگر مہاتما بدھ کا کتھک سے کوئی ناتا نہیں۔ سو یہ بات شری رام چندر جی مہاراج کی ہے۔

کیوں چھوڑا راج سنگھاسن راجا نے بن باس لیا۔ کیا بات ہوئی
کب سکھ کا سورج ڈوب گیا۔ کب شام ہوئی کب رات ہوئی

ساون کی رم جھم گونج اٹھی - بادل چھائے برسات ہوئی
راجا تو کہاں - پر جا پیاسی - اک اور ہی روپ میں ناچتی ہے
اب دائیں جھکو اب بائیں جھکو - یوں ٹھیک - یونہی - ایسے ایسے

یہ ساری بات جو ان مصرعوں میں کہی گئی دیوداسی کی نرت میں دکھائی ہے - سو رقاص سوامی اسے بتا رہے ہیں پاؤں ایسے رکھ - آنکھیں ایسے ہلیں - نگاہ کی سمت ایسے بدلے - لے کے ساتھ -

اب رقص ہوا - اور دیکھنے والوں نے دیکھا - بڑی سطح کے کتھک رقص کے ساتھ ایک گائیک ہوتا ہے جو کتھا گاتا بھی ہے - پکی کلاسیک راگ راگنیوں میں -

کوئی گیت سنے کوئی ناچ کر اپنے سر کو دھنے --- دیوانہ ہے -
مٹ جائے دھندلکا، دھیان آئے یہ گیت یہ ناچ بہانہ ہے
سارے گا پادھانی - بھید ہے - بھید - مگر یہ فسانہ ہے -
اس بھید کو بوجھ تھکے گیانی --- اب ندی بہتی جاتی ہے
کبھی دائیں گئی - کبھی بائیں گئی - کبھی لوٹ کے پھر سے بڑھی آگے
تو کون ہے بول - بتا - تیرا کیا نام ہے - دیس کہاں تیرا؟
کیا ایک چھلاوا ہے؟ کھو جائے تو کیسے پائیں نشاں تیرا
ہم ایک زمان و مکاں کے ہیں - اور تو - ہر ایک جہاں تیرا
تیری آواز تو الجھاتی ہے - گونج کے کہتی جاتی ہے
جو جاگ رہے تھے سو بھی چکے جو سوئے تھے چونک اٹھے - جاگے

یہ خطاب کس سے ہے - اب تک سامنے دو کردار تھے - ایک ناچنے والی دیوداسی - ایک رقص کے گنی مہاراج جو اسے رقص کے بھاؤ بتا رہے تھے - ایک آواز پیچھے گانے والے کی تھی - جو رقص کی لے قائم کرتی تھی - طبلہ اور لہرے کے ساتھ لہرا وینا پر بھی ہو سکتا ہے - سارنگی پر بھی - تو اب یہ خطاب دیوداسی سے تو نہیں - رقاص سے بھی نہیں کہ وہ تو رقص کے انگ بھاؤ قاعدے کے مطابق بتا رہے تھے - یہ آواز جو گونجتی ہے یہ گانے والے ہی کی ہو سکتی ہے - تو خطاب بھی میری سمجھ کے مطابق اسی کردار سے ہے - جو پیچھے رہ کر دیوداسی کو بھی اور رقص کی لے تال کو بھی اور طبلہ یا سارنگی اور لہرے کے ساتھ کو بھی راہ دکھا رہا ہے - وہ کردار ادا کر رہا ہے جو آج کل فلموں میں آپ مغربی آرکسٹرا کا کنڈکٹر کا دیکھتے ہیں - کہ اس کا چھوٹا سا بید سارے آرکسٹرا کو کنٹرول کرتا ہے - سروں کے امتزاج کو بھی اور لے کو بھی - تو یہاں دو لفظ کلیدی اہمیت رکھتے ہیں - دوسرے مصرعے میں چھلاوہ اور تیسرے میں "ہر ایک جہاں تیرا" باقی سارے کردار دیوداسی - رقاص - مردنگ طبلہ اور لہرے والا اور ہم اس دھرتی کے رہنے والے ہیں - پر تو چھلاوہ ہے - ابھی ہے -

ابھی نہیں ہو جائے گا۔ اور پھر یہی نہیں ہر ایک جہاں تیرا ہے۔ یہ سارا سنسار۔ یہ آکاش۔ یہ چاند سورج۔ ستارے۔ تو میراجی یہ کہتا ہے کہ یہ ہندو لاہوت کی تر مورتی کا تیسرا خداوند ہے۔ خدائے اکبر برہمن کا تیسرا روپ۔ شو شنکر۔ جو رقص کرتا ہے تو دنیا نابود ہو جاتی ہے۔ آخری مصرع اس خیال کو پوری نہیں ایک حد تک تقویت دیتا ہے سب جاگنے والے سو گئے۔ یعنی زندگی ختم ہو گئی اور جو سوئے ہوئے تھے۔ ہست کو نیست کرنیوالے آشوب وہ چونک اٹھے۔ یہ کتھک ناچ۔ شاعر کے ذہن میں شیو شنکر کا ناچ ہے۔ ناچ کی یہ جو راس رچائی گئی تھی۔ اس کے پردے میں اس سنسار کو نشٹ کرنے کے کام کا آغاز کر دیا ہے۔ یہ میرا قیاس ہے کہ اور عمیق تر اور قریب تر معانی جن تک مجھ سے بہتر علم اور وجدان والے "چھلاوا" اور "ہر جہاں تیرا ہے" کی مدد سے پہنچ سکتے ہیں وہ میری رسائی سے دور ہے کہ میرے علم کی حد تو ناچ کے حوالے سے شو شنکر تک ہی پہنچتی ہے۔ جو تر مورتی کے تیسرے خداوند ہیں۔ ناچ سے سنسار کو نیست و نابود کرنے والے۔

بہر حال یہ بہت گمبھیر مفاہیم والی سوجھ بوجھ اور مہارت سے کہی ہوئی کوتا ہے۔ اس کی ساخت میں بڑا تخلیقی جوہر بچے لفظ کے بعد سچا لفظ لاتا رہا ہے۔ اور یوں وہ آخری مصرعے تک پہنچ گیا۔ نظم کے تخیلی ناٹک کا نقطہ اتمام Climax تو آخری سے پہلے دو مصرعوں میں پہنچ گیا۔ اور پھر انت Resolution آخری مصرعے میں آگیا۔ یہ کوتا (میں اسے نظم نہیں کہوں گا کہ اس کا لہجہ اردو نظم کا نہیں اور خیال ایک جداگانہ دیومالائی اور تہذیبی روایت سے وابستہ ہے۔ جو اردو بولنے والوں کی Sensibility کا کبھی حصہ نہیں بنی) ہر اعتبار سے برتر تخلیقی سطح رکھتی ہے میں نے کئی اردو نظموں کے بعد "کتھک" کو یہاں دانستہ رکھا ہے کہ قاری دوسرے میراجی کو جو ہمارا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی میراسین کے کلچر کا نمائندہ بھی ہے۔ اپنی فکر کے سامنے رکھے اور ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی مسلسل باخبر رہے کہ اس اجنبی روایت اور دیومالا کا حصہ کلیات میں اصل میراجی کے اصل لہجے سے بہت کم ہے۔ اس کم حصہ والے اسلوب، اس کی لفظیات اس کی اساطیر میں بھی میراجی انتہائی آسودہ اور at home ہے جتنا اردو روایت سے متعلق نظموں میں نظر آتا ہے۔ دونوں لہجے میراجی میں ایک ساتھ چلتے ہیں۔ اور وجدان دو مختلف سطحوں پر بہم وقت مستعد رہتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ میراجی ایک بڑا اور نادر جوہر لے کر دنیا میں آیا تھا۔ اب کہ میں نے اس کی ساری نظموں کو پوری توجہ اور کامل ادب کے ساتھ اپنے شعور و وجدان کو بہم کر کے پڑھا ہے تو میں اس مقام یقین تک آپہنچا ہوں کہ میراجی کا جوہر اس کا innate creative potential اپنے دونوں ہم عصر شاعروں۔ راشد اور فیض صاحب کی استعداد سے بڑا تھا۔ اگر اسے بھی طبیعی عمر صحت مندی کے ساتھ ملتی تو وہ ان دونوں سے کہیں بڑا شاعر ہوتا۔ اب بھی اپنی انتہائی رفعت پر وہ راشد کے ہم دوش کھڑا ہے۔ مجھے ایک ملی میٹر قامت میں کم لگتا ہے۔ نجانے آنے والا وقت کیا فیصلہ دے۔ مگر وہ یقیناً فیض صاحب سے

کہیں بڑا شاعر ہے۔ جوہر بھی بڑا رکھتا ہے۔ اپج بھی زیادہ ہے۔ خیال میں گہرائی اور Pathos بھی کہیں بڑے شاعر کا ہے۔ گزشتہ چند ہفتوں میں میں نے جدید اردو شاعری کے ان تین امامان اول کی شاعری کا تقابلی جائزہ لیا ہے۔ ان تینوں کی وجدانی دنیا میں ایک زائر کی طرح یکے بعد دیگرے گھوما ہوں تو مجھے راشد صاحب کی متعدد نظموں میں میراجی کی گونج سنائی دیتی ہے۔ میں ابھی ابھی میراجی کے کلیات کی ورق گردانی کر رہا تھا تو صفحہ ۳۴۴ پر آخری مصرعہ یہ تھا۔ "وہ خواہش کی خوشبوؤں سے بوجھل اکثر" مجھے فوراً راشد صاحب کی ایک برتر نظم کا عنوان یاد آگیا۔ راشد صاحب کے کلیات میں صفحہ ۳۸۶ پر ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے "ہم رات کی خوشبوؤں سے بوجھل اٹھے" اس سے پہلے میں راشد صاحب اور میراجی کے ہاں "طائران خستہ پر" اور "زخمی پرندوں" کا ذکر کر چکا ہوں۔ قاری دونوں شاعروں کے کلام کا تقابلی مطالعہ کرے تو بہت سی مماثل تراکیب اور علامتیں اسے مل جائیں گی۔ میں یہاں اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جن نظموں میں راشد صاحب کے ہاں میراجی کی گونج ملتی ہے وہ میراجی کی وفات کے برسوں بعد لکھی گئی تھیں۔

اب میرے سامنے ایک بڑی پرپیچ Complex نظم ہے۔ جس میں مختلف خیالوں، جاگتی آنکھوں کے پچھلے پہر کے خوابوں، خواہشوں اور جذبوں کو نادر صنائع سے جوڑا گیا ہے۔ انہیں یوں Juxtapose کیا گیا ہے کہ اس کی مثال ہمارے ہاں موجود نہ تھی۔ ان مل اور ایک دوسرے سے بظاہر مختلف خواہشوں اور خیالوں کو غیر مماثل اجزا کو اور علامتوں کو بہم کرنا ایزرا پاونڈ اور ٹی ایس ایلیٹ کی اختراع تھا جنہوں نے اسے حد کمال تک پہنچا دیا۔ اردو شاعری میں غالب نے کہیں کہیں اتباع بیدل میں مختلف علامتوں اور بظاہر ان مل تلمیحات کو بہم کیا ہے۔ ایک شعر میں اس اختلاط میں اتنی subtlety تھی کہ اردو کے معتبر نقاد ممتاز حسین مرحوم نے ریڈیو پروگرام "دانشکدہ" میں مہمل اشعار کی مثالیں پیش کرتے وقت سب سے پہلے وہی شعر پیش کیا۔ میں ان دنوں کراچی ریڈیو سٹیشن کا ڈائرکٹر تھا۔ یہ ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ میں اپنے کمرے سے نکل کر باہر سیڑھیوں کے پاس جا کھڑا ہو گیا۔ ممتاز صاحب دوسرے شرکائے پروگرام کے ساتھ سٹوڈیو سے نیچے آئے تو میں نے سلام عرض کر کے پوچھا کہ پروفیسر صاحب آپ کس کالج میں اردو ادب پڑھاتے ہیں۔ فرمایا اسلامیہ کالج میں۔ میں نے کہا بہت افسوس ہے۔ نسل ضائع ہو گئی۔ کہنے لگے کیوں؟ میں نے عرض کیا جو معلم عظیم اشعار کو مہمل کہے وہ اپنے شاگردوں کو تباہ نہیں کرے گا تو اور کیا کرے گا۔ وہ شعر جسے اس معصوم نقاد نے مہمل کہا تھا اسے آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔

یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

یہاں غالب نے ایک عظیم صناع کی سطح پر دو مختلف شعری علامتوں کو یکجا کیا ہے۔ گزشتہ زمانوں میں آئینہ ساز اپنے قلم کو اوپر سے نیچے لاتا تھا۔ اس سیدھ سے جیسے لکھنے میں الف سیدھا ہوتا ہے۔ ساری دھات کی سطح پر دائیں سے بائیں تک یہ عمل مکمل ہوتا تھا تو وہ ایک الف ہوتا تھا۔ سات الف کے بعد آئینہ اپنی اصل آب حاصل کرتا تھا اور اس میں عکس بالکل صاف اور اصل کے عین مطابق نظر آتا تھا۔ دوسرے مصرعہ میں بات "گریباں مجھا" میں ہے۔ یہاں تلمیح قرآن حکیم کی آیت علم آدم الاسما، کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب سے اشیا کے نام سیکھے ہیں اور "گریباں" کا مطلب اور مصرف جانا ہے اسے چاک کر رہا ہوں۔ تطہیر قلب کے لیے۔ مگر اب تک الف اول بھی حاصل نہیں ہو سکا۔ تو مولا وہ دن کب آئے گا جب میں تیرا عکس اپنے دل کے آئینے میں دیکھ سکوں گا۔ دیکھو بظاہر دو ان مل جمع ہوئے سطح کمال پر تو کیسا عظیم شعر تخلیق ہوا۔ بالکل اس طرح میراجی کی نظم میں کئی باتیں جو ان مل ہیں یوں بہم ہو گئی ہیں کہ ایک نہایت نازک اور ارفع اور Complex نظم کنسٹرکٹ ہو گئی ہے۔ پہلے گلہ بان ہیں جو نسل انسانی کی ارضی زندگی کے آغاز میں تاریک راتوں میں ستاروں کے مقام سے اپنی منزل کا راستہ معین کرتے تھے۔ دسویں صدی عیسوی میں Vickings نے شمالی یورپ سے امریکہ کا طویل سمندری سفر کیا تو راتوں میں ستاروں ہی سے اپنی سمت معین کرتے تھے۔ ان کا قطب نما ستارے ہی تھے۔ دوسرے بند میں کشتی کا ذکر ہوا اور کشتی کی چڑھتی گرتی موجوں کے ساتھ ابھرنے ڈوبے سے ساحل کے اس طرف کا ارضی منظر ابھرتا ڈوبتا ڈولتا نظر آتا ہے۔ اس سے ایک دلزدہ آدمی کی زندگی کی مشابہت بیان کر دی ہے دو مصرعوں میں اور پھر تصور کی آنکھ دیکھتی ہے ایک دوشیزہ نامساعد حالات کے گرد و غبار کی دھول کو اپنی مانگ سے (وہ بھی تو ایک راہ سی ہے) سیندور سے صاف کر دیتی ہے۔ اور وہ تنہا مسافر جو دو شمعیں جلتی ہتھیلیوں پر لئے چل رہا ہوتا ہے۔ شہنائیوں کی گونج اس کی ان شمعوں کو بجھا دیتی ہے اور آخر میں شاعر کہتا ہے کہ کون کہہ سکتا ہے۔ کیا سنا۔ کیا دیکھا۔ اور کیا دیکھنے سننے کو اصل زندگی میں ملے گا۔ یہ بہت بہتہ دار بہت گہری فکر کی دھاریوں کے ایک دوسرے کو قطع کرنے، بہم ساتھ چلنے، بکھر جانے، ابھرنے پھر ناپید ہو جانے کی ایک باطنی کیفیت ہے۔ دشت شب میں گلہ بانوں کے شعر سے آخری دو مصرعوں سے پہلے تک کا سارا خارجی ماحول اندر کے مبہم خیال کی رو میں شامل کر دیا گیا ہے۔ کبھی دونوں متوازن چلتے ہیں۔ کبھی Crisscross کرتے ہوئے۔ اس نظم کی تشریح کرنا اس کے تاثر کو غارت کر دینے کے مترادف ہوگا۔ اپنے دل و دماغ کو ہر خیال سے منزہ کر کے اس نظم کو اپنی تمام تر طبیعت پر وارد ہونے دو۔ اور اس نیرنگ میں جو کہیں تاریک ہے۔ کہیں نیم ضو۔ کہیں سناٹا ہے کہیں شہنائیوں کی آواز ہے۔ ان سب دھاریوں کو ایک ساتھ اپنے اندر جذب کرو۔ پھر محسوس ہوگا۔ اگر قدرت نے ایسے ارژنگ وصول ہونے کی توفیق دی ہے۔ کہ یہ کتنی بڑی کیسی انوکھی

نظم ہے ۔ ایسی شاعری سے اردو ہی نہیں ،ہماری ساری زبانیں میراجی سے پہلے ناواقف تھیں ۔ کیا بڑا جینئس ہے ۔ کتنی سہولت سے ایک بڑے تجریدی مصور کا عظیم تجریدی نقش لفظوں میں نقشبند کر کے اردو زبان کو دے گیا ۔ ایک حرف تنبیہ کہنا یہاں ضروری ہے ۔ اکثر اوقات میراجی کو جنسی بے راہروی اور Perverism کا شاعر کہا جاتا ہے ۔ اس نظم کا عنوان "تفاوت راہ" ہے ۔ یہ عنوان جنسی زندگی میں بے راہروی کا تعین نہیں ۔ پوری زندگی کے ان گنت رنگوں اور لہروں کے باہم ہونے سے جو اک گونہ جمال اور صد رنگ اٹھاؤ پیدا ہوتے ہیں ان کو میراجی نے ایک زندہ تخلیق ایک سانس لیتی ہوئی نامیاتی اکائی بنا دیا ہے ۔ کہیں ایک حرف زائد نہیں ۔ کم سے کم لفظوں میں پوری کائنات زمان و مکان میں مرد عورت کو ان کے خوابوں اور ان کی شکستوں کے ساتھ ان کے مقام پر دکھا دیا ہے ۔ جو خواب دیکھنے اور ان خوابوں کے بکھرنے پر ان کے ریزے چننے کے مقام کے سوا کچھ نہیں ۔

اس زمانے میں کہ جنگل تھا یہ باغ

(اقبال نے خداوند سے کہا تھا ۔ تو صحرا و کہسار و راغ آفریدی خیابان و گلزار و باغ آفریدم ۔ یہاں آغاز اس زمانے کے ذکر سے ہوا جب زندگی جنگل تھی باغ نہیں بنی تھی)

گلے بانوں نے ستاروں سے لگایا تھا سراغ

بھولے رستے کا جو بے دھیانی میں کھو جاتے ہیں

ویسے ہی باغ مرا جب سے بنا ہے جنگل

(میراجی کی زندگی باغ کے مانند آراستہ پیراستہ تھی ۔ مگر ایک لمحے میں جنگل ہو گئی)

ایک اک لمحہ ستاروں ہی کا دھیان آتا ہے

ہر ستارہ مجھے لے جاتا ہے

اسی چوپال کے بے نام کنارے کی طرف

جس میں بیٹھے ہوئے انسان یونہی بے مصرف

میری ناکامی ۔ تیرے نام کی رسوائی سے

تلخ باتوں میں ہر اک رات بسر کرتے ہیں

کلید میں نے فراہم کر دی تھی ۔ اس بند میں کوئی اشکال اس کے بعد نہیں ہونا چاہئے ۔ منظر گاؤں کا دکھایا گیا ہے ۔ شاعر گاؤں کا رہنے والا ہے ۔ اپنے تصور میں ۔ اور اس کی محبوبہ بھی وہیں کی ہے ۔ تو گاؤں کے لوگوں کو ایک نیا ہیر رانجھے یا سوہنی مہیوال کا قصہ ہاتھ لگ گیا ہے ۔ وہ اس نئے جوگی کی وحشت سے لڑکی کی جو رسوائی ہوئی ہے اور اس نئے ہیرو کی زندگی جو تباہ ہو رہی ہے اس کا ذکر

کرنے میں رات گزار دیتے ہیں ۔ اس نئے جوگی کی محبت ناکام ہو گئی ۔ سو وہ کھو کر رہ گیا ہے ۔ آشفتہ سر ژولیدہ جان ہے ۔

بھولا رستہ کسی کشتی کی طرح سطح پہ اک پل میں ابھر آتا ہے
آنکھ میں اشک جھلکتے ہیں ۔ مگر اشکوں میں
وہ چمن اور وہ مکان اور وہ روزن تینوں
گھلتے رنگوں کی طرح عکس بنا دیتے ہیں
ایک انساں کا جو تقدیر کی بے راہی سے
کبھی مالی کبھی عاشق تھا کبھی دیہاتی
گلّے بانی میں جسے یاد جب آئے ماضی
بنسری اپنی بجاتے ہوئے رو دیتا ہے

کبھی آشفتگی اور وحشت کی رو پل بھر کو تھمی تو بھولا رستا اس ناکام عاشق کو جو بے راہ ہو گیا ہے ۔ یاد آجاتا ہے اور اسے اپنی زندگی کا آراستہ پیراستہ چمن اپنے سامنے دکھائی دیتا ہے ۔ اور پھر سارے رنگ معہ روزن (جہاں سے کبھی محبوبہ کو ایک نگاہ دیکھ لیتا تھا) گھل جاتے ہیں ۔ ایک تجریدی سا عکس بن جاتا ہے اور ناکام عاشق کی زندگی کے سارے مراحل گڈمڈ ہونے سے پہلے یونہی اک آن کے لئے نظر آگئے تو وہ بانسری میں کوئی دلسوز لے بجانے لگتا ہے اور بے اختیار رو دیتا ہے کہ وہ وقت کے متلاطم سمندر میں ایک چھوٹی سی کشتی کے مانند ہے ۔ اب اگلا بند ہے ۔ راہی کے ہاتھوں میں دو شمعیں ہیں ۔ اور چاندنی رات ہے ۔ یہ دو شمعیں کیوں ؟ یہ تہہ دار بات ہے ۔ جو جیسی سوچ رکھتا ہے ویسے مفاہیم اس سے اخذ کر لے ۔ ایک شمع زندگی کی ایک چاہت کی ۔ یہ بھی ایک رخ ہے ۔ پھر ایک شمع اپنی چاہت کی ۔ دوسری شمع محبوبہ کی مورتی کے آگے رکھ کر اس کے درشن کرنے اسے نذرانہ پیش کرنے کے لئے علامت ہے ۔ اب جو راہی چلا تو زمین پر تین سائے پڑے ۔ دو شمعوں نے اپنی اپنی طرف کا ہاتھ کا بازو کا جہاں تک ضو پہنچی اس کا سایہ بنایا ۔ دوسری شمع نے دوسری طرف کا ۔ اور چاند نے جو سامنے ہے اسی کے پورے ژولیدہ جسم و جاں کا

جیسے رستے میں کوئی ہاتھ میں دو شمعوں کو
لئے جاتا ہو شب ماہ کی طغیانی میں
اور زمیں سینے پہ اک شخص کے اک رہرو کے
تین سایوں سے ڈری جاتی ہو ۔ کبھی کبھی
اس کے ہر بڑھتے قدم کو دل میں
جان کر اپنی رہائی کا ثبوت

یہ مجھتی ہو ابھی دور چلا جائے گا
اور پھر خوف سے حیران نگاہوں کو فقط
چاند ہی چاند نظر آئے گا
اس طرح تو نے بھی سوچا ہو گا

یہاں زمین نہیں سوچ رہی ۔ زمین کے بدن میں شاعر کی روح اس کا کرب داخل ہو گیا ہے اور شاعر کو یوں لگتا ہے کہ ہر سوچ زمین کی ہے ۔ جس نے گلے بانوں کو تو دیکھا تھا مگر شب ماہ میں دو ہتھیلیوں پر دو شمعیں لئے کسی ژولیدہ مو سراپا وحشت زدہ کو نہیں دیکھا ۔ پھر زمین ایسی خوف میں ڈوب گئی کہ سارے وجود دھندلا گئے صرف چاند کا چہرہ رہ گیا ۔ یہاں بڑی نازک بات ہے ۔ خوف میں ایک لمحہ جب وہ برداشت کی دہلیز پار کرنے کو ہو ایسا آتا ہے ایک فطری Safety Valve کی طرح کہ سہم اور خوف کا سبب ذہن سے مٹ جاتا ہے ۔ یوں لگتا ہے کچھ تھا ہی نہیں ۔ اب شاعر محبوبہ سے مخاطب ہو کر بڑی نازک نفسیاتی پرتیں اس کیفیت کے سامنے لاتا ہے ۔

اس طرح تو نے بھی سوچا ہو گا
راہرو پاؤں سے جو دھول کے ذرے مجھ پر
پے بہ پے پھینکتے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے
انہیں سیندور کی سرخی سے مناؤں گی
اور پھر دودھ کے دریا میں نہا کر یکسر
سینۂ صاف ، کی مانند نظر آؤں گی

ظاہر ہو گیا کہ عاشق کا عشق یک طرفہ ہے ۔ اور محبوبہ پر بدنامی کی گرد ، جو یہ دلزدہ راہرو اپنی ناکام محبت کی راہ پر چلتا ازاکر اس پر پھینک رہا ہے وہ ایک دن دھل جائے گی ۔ اس کی مانگ سیندور سے بھر جائے گی تو اس کی زندگی کی راہ میں راہرو کی اڑائی ہوئی دھول نہیں اس کی مانگ کی سیندور ہوگی ۔ اور پھر وہ دودھوں نہائے گی ۔ اور وہ یوں پاک صاف اور پوتر نظر آئے گی جیسے بے کدورت سینہ ۔ اب شاعر یا متکلم پھر اپنی طرف لوٹتا ہے ۔

گلے بانوں نے ستاروں سے لگایا تھا سراغ
راستہ ملتا نہیں مجھ کو ستارے تو نظر آتے ہیں
پیرہن رنگ گل تازہ سے یاد آتا ہے
اور زر کار نقوش
اک نئی صبح حقیقت کا پتہ دیتے
کبھی دھوکے بھی تسلی کی ادا ساما دیتے ہیں

زینے کی بھول بھلیاں اسی آواز میں کھو جاتی ہیں
ہاتھ میں تھامی ہوئی شمعیں بجھی جاتی ہیں
ساتھ کے باغ کی ہر صاف روش بھولا ہوا رستہ بن جاتی ہے
اور شہنائی پھر اک سانپ نظر آتی ہے
ڈستی جاتی ہے کہے جاتی ہے
گلہ بانوں نے ستاروں سے لگایا تھا سراغ

شاعر زندگی کی تازگی اس کے سندر روپ اس کی رنگا رنگی کو تصور میں لاتا ہے۔ حقیقت زندگی نئی صبح بن کر طلوع ہو رہی ہے۔ شہنائی کی آواز کانوں تک پہنچ رہی ہے۔ شہنائی زندگی کی بقا کی علامت ہے۔ کہ دو تن ایک ہوں گے تو نئی زندگی وجود پذیر ہوگی۔ نئے جذبے۔ نئی خواہشیں نئے خواب بھی ساتھ جنم لیں گے۔ لیکن اس آواز سے متکلم کے ہاتھوں میں شمعیں یکایک بجھ جاتی ہیں اور پھر باغ کی ساری روشیں اس کے سامنے اس کا بھولا ہوا رستہ بن کر اسے گھورنے لگتی ہیں اور شہنائی کی آواز ناگن کی طرح ڈسنے لگتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ اے شکست خوردہ انسان ان ستاروں کو تو بھی دیکھ جن سے قدیم زمانوں کے سادہ دل گلہ بان راستے کا سراغ لگاتے تھے۔ تو بھی اپنا نیا راستہ ان کی مدد سے متعین کر لے۔

اب منظر بدلتا ہے۔ جس کی چاہت نے متکلم کی راہ کھوٹی کر دی اس کی مانگ سیندور سے بھرنے کو ہے۔ وہ دن قریب آرہا ہے۔ دولہا کے گھر کی لڑکیاں لڑکے کی بہنوں سے ماں سے کہتی ہیں کہ ماشاء اللہ دلہن کی آنکھیں ایسی جادو بھری ہیں ایسی فسوں کار ہیں کہ آنکھ بھر کر اسے دیکھنا ممکن نہیں۔ دولہا کی بہن کہتی ہے۔ میرے بھائی کو بہت شوق بہت چاؤ ہے۔ آرسی میں دلہن کا چہرہ دیکھنے کا۔ دوسری جواب دیتی ہے۔ لو بھئی ایسی بھی کیا بے تابی۔ اب دو چار دن کی تو بات ہے۔ دلہن شب عروسی کی سیج پر بیٹھی ہوگی۔ یہ شاعر یا متکلم تصور میں اپنے گھر کا اپنی بہنوں کی باتوں کا ذکر کر رہا تھا۔ ایک امکان یہ ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کو دوسرے دولہا کے گھر جاتا دیکھتا ہے۔ اور پھر یہ تنہا مسافر۔ یہ اکیلا زندگی کی بھولی ہوئی راہ سے ہٹ کر آشفتہ اور سرگرداں متکلم کہتا ہے۔

کس کا گھر۔ کس کی دلہن۔ کس کی بہن۔ کون کہے
میں کہے دیتا ہوں۔ میں کہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں

پہلے آزردگی سے پوچھا۔ کس کا گھر۔ کون دلہن۔ کس کی بہن۔ یہ تو محض ایک خواب تھا۔ خواب پریشاں۔ لیکن پھر وہ محکم یقین سے۔ اور یہ المیہ کا نکتہ اتمام ہے۔ کہتا ہے ہاں دلہن بھی ہے۔ دولہا بھی آئے گا۔ اسے لے جائے گا۔ اور میں کہتا ہوں کہ میں جانتا ہوں۔ وہ دولہا میں نہیں کوئی اور ہوگا۔ میری زندگی تو ناکامی اور آشفتگی کا ایک سلسلہ ہے۔

میں نے میراجی کی نظمیں کبھی نہیں پڑھی تھیں۔ بس "چوم ہی لے گا بڑا آیا کہیں کا کوا" لاہور ۱۹۴۱ء میں گیا تھا تو اس کے چند ماہ بعد کسی مجلے میں پڑھی تھی۔ میں عزیز مکرم مشفق خواجہ کا بتہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے ایسی عجائب روزگار تخلیقی دنیا کی زیارت کا شوق دلایا۔ میں نے ایک طالب علم کی حیثیت سے کلیات کے اس حصہ کو پڑھا جس سے میں بچ کر نکل جاتا رہا ہوں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ جتنا عمق، جتنی خیال کی گہرائی اور کثیر الجہتی میراجی میں ہے آج تک اردو کے کسی شاعر میں میں نے نہیں دیکھی تھی۔ میں غزل کی شاعری کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ وہ دنیا اور ہے اس کا کینوس اور اس کے آفاق اور ہیں۔ اور میری ناچیز رائے میں وہ آفاق بار بار دیکھے اور چھوئے جا چکے ہیں۔ اب شاذ ہی کوئی غزل گو میر و غالب کی، حافظ و صائب کی، بیدل کی سطح کو پہنچے گا۔ پابند نظم کی تکمیل اقبال کی شاعری کے ساتھ ہو گئی جتنا کچھ باقی رہا تھا وہ فیض صاحب کے ہاں آگیا۔ اب اردو میں بڑی اور عظیم شاعری صرف آزاد نظم کی ہئیت میں ہی ہو سکتی ہے۔ میں ان دونوں میں اپنے اندر کئی دفعہ میراجی کو سلام ادب کہہ چکا ہوں۔ میراجی جو Perversion کا شاعر ہے وہ اس کلیات میں بہت کم آیا ہے۔ کبھی کبھار پوری زندگی کا احاطہ کرنے والا میراجی سارے حصہ نظم پر محیط نظر آتا ہے۔ اور یہاں اس کا اسلوب بھی ہماری اردو کی بڑی روایت سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اس کی توسیع ہے۔ تغیر حالات کے باعث لفظیات میں جتنا تغیر و تبدل اپنی روایت سے منسلک رہ کر کرنا چاہیئے تھا اتنا ہی کیا گیا۔ راشد کی اپنی لفظیات ہے۔ فیض کی اپنی۔ اور میراجی کو عمیق باطنی تجربات کے سطح کمال پر اظہار کے لئے جو لفظیات درکار تھی اس نے نہایت کامیابی سے استعمال کر لی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اگر وہ تیس برس اور زندہ رہتا تو رلکے۔ بادلیئر۔ پشکن۔ والٹ وہٹ مین صائب اور بیدل سے ایک آدھ سینٹی میٹر زیادہ قد آور یا ہم سر تخلیق کار تسلیم نہ کیا جاتا؟

کسی نقاد کے لئے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ ایک مقالے میں کسی بڑے شاعر کی تمام برتر نظموں کا تفصیلی جائزہ لے سکے۔ ایسا کرنا بھی نہیں چاہیئے کہ پھر ذہین صاحب ذوق قاری کے لئے کچھ نہیں بچتا۔

اب میں صرف دو اور نظموں پر بات کروں گا۔ یوں تو اور بہت سی نظمیں ہیں۔ "ارتقا۔" "اجنتا کے غار"۔ "یعنی"۔ "اداکار" ان میں سے بس چند کے نام قاری کی خدمت میں پیش کئے دیتا ہوں۔ "میں" "جہالت" اور "سمندر کا بلاوا" کے مختصر سے جائزے کے بعد کچھ معروضات شاعری اور جمالیات Aesthtics of Poetry پر کروں گا اور پھر ایک بہت بڑے شاعر کی خدمت میں اپنا سلام سپاس و ادب پیش کر کے اس مقالے کو ختم کر دوں گا۔ میرا خیال ہے کہ ان دو نظموں پر بات ہو جائے گی تو اس مقالے میں میراجی کے اسلوب، ان کی لفظیات ان کے خیال کا تنوع اور اس کی آفاق گیر وسعت کا احاطہ ہو چکا ہو گا۔ میراجی کی جنسی شاعری محض ایک

Deviation ہے۔ اس کا اصل جوہر اور جینی اس زندگی کے پورے سواد کا انسانی تجربے کی کلیت کا جس میں یہ کائنات زمان و مکان اپنی تمام جہتوں کے ساتھ ایک گوشے میں پڑی ہے احاطہ کرتا ہے۔ اور میراجی کا یہ کلام وہ ساز و برگ ہے جو عظیم شاعری کا اثاثہ ہوتا ہے۔ Stuff that makes great poetry میراجی کی نظم "جہالت" پر بات کرنے سے پہلے میں اکبر الہ آبادی کا کہ وہ ہماری شعری روایت کا ایک اہم اور معتبر نام ہے۔ ایک قطعہ نقل کروں گا تاکہ قاری یہ دیکھ لے کہ اردو شاعری کہاں سے کہاں آپہنچی ہے۔ اور مجھے یہ کہنے میں کوئی ہلکی سی ہچکچاہٹ بھی محسوس نہیں ہوتی کہ یہ دو بہت بڑے شاعروں کی تخلیقی عظمت کا کرشمہ ہے راشد اور میراجی کا اور ازاں بعد ضیا جالندھری کا کہ اب پابند نظم بالعموم کام نہیں آسکے گی۔ نئے تخلیقی کرب کا ساتھ کم ہی دے سکے گی۔ اب اکثر و بیشتر آزاد نظم ہی بڑے ادب کا Vehicle ہوگی۔ اکبر الہ آبادی اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں کہتے ہیں۔

کہا منصور نے خدا ہوں میں
ڈارون بولا بوزنہ ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست
فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

اساسی طور پر میراجی اس طنز کو اپنی نظم میں لوٹا رہے ہیں یہ بتا کر کہ انسان اپنی ساری مادی ترقی، ستاروں پر کمندیں ڈالنے کی توفیق، دل اور گردہ کی پیوند کاری (یہ تو میراجی نے نہیں دیکھی تھی مگر بڑا جوہر بہت سی باتیں غیب کی بھی دیکھ لیتا ہے جو کچھ عرصہ بعد جہان شہود میں رونما ہوجاتی ہیں) کے باوصف اپنی نہاد میں اب بھی وہی بوزنہ ہے جس سے ترقی کرتے کرتے وہ انسان بن گیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں یہ بھی سطح عظمت کی نظم ہے گو یہ نوع انسانی پر ایک گہری طنز اور بے حس دماغوں میں ایک تیز سوئی چبھونے کا سا عمل ہے۔ دیکھئے نظم جہالت کا آغاز کیسے ڈرامائی انداز سے ہوتا ہے۔ نظم کی بحر ہے۔ فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن۔ جو نظم کے Action کے لئے نہایت موزوں ہے۔

جبڑا بندر کا مداری کے تماشے میں کبھی دیکھا ہے؟
کچھ بناوٹ ہی الگ ہوتی ہے۔ کچھ اس کی شرارت۔ کرتب
منہ چڑاتے ہوئے رسی کو یونہی ہاتھ میں بل دے کے جھٹکتے جانا
ڈگڈگی پر بھی مداری جو بٹھا دے تو اچھل کر اک بار
کسی بچے کی طرف ایسے لپکنا کہ اسے کاٹ ہی کھائے گا ابھی
اور پھر بچے کا بیٹھے ہوئے پیچھے کی طرف گرنا۔ تماشے میں تماشا۔ چیخیں
ہاں مگر باتیں یہ بچپن میں مزا دیتی ہیں

دیکھتے دیکھتے ہر بات بھلا دیتی ہیں

یہاں بندر کے تماشے کا حصہ ختم ہو جاتا ہے۔ ایک بات تو پہلے جو انسان کے حق میں جاتی ہے وہ کہنا مناسب ہے۔ انگریزی میں کہاوت ہے کہ سب سے سوا حسین بندر سب سے زشت رو آدمی سے کہیں زیادہ بدصورت ہوتا ہے۔ سطحی طور پر دیکھو تو بندر میں اور آدمی میں کئی چیزیں مماثلت رکھتی ہیں۔ بندر کی نقالی کی عادت Mimicry انسان کا بچہ بھی ابتدا میں بڑوں کی باتیں اور حرکتیں دیکھ کر ان کی نقل کرتا ہے اور یوں چلنا اٹھنا بیٹھنا، ہاتھ پاؤں کو استعمال کرنا سیکھتا ہے۔ کچھ لمحوں کے لئے دو چار قدم بندر آدمی کی طرح پاؤں پر کھڑا ہو کر چل بھی سکتا ہے۔ بس یہاں مماثلت ختم ہو گئی۔ آدمی نے تو خلاؤں کو مسخر کر لیا۔ علم اور گویائی کی نعمتوں کے باعث سب انواع زندگی سے برتر و اشرف ہوا۔ یہ پس منظر قاری کے ذہن میں رہنا چاہیئے۔

شاعر نے مداری کا تماشا دکھا کر جتا دیا کہ ہمارے اس بہت قریبی رشتہ دار کی حد ادراک و فہم اس تماشے میں دکھائے گئے کرتبوں تک ہے۔ ان سے صرف نظر کرو تو صرف جانور رہ جاتا ہے۔ اشتہا اور شہوات کا غلام۔ اس کی آزادی اور اختیار کی حدود تماشا تھا جو اسے مداری نے سکھایا تماشا دکھا کر وہ اپنی اصل سطح پر لوٹ آتا ہے۔ بندر اور بندریا اکٹھے بندھے ہوں۔ بندر کو آئینہ دکھا دو پھر دیکھو جانور کیا کرتا ہے۔ پھر کوئی مداری ڈگڈگی بجا کر مٹھائی کھلا کر اسے بندریا کو جنسی اشتعال میں ادھ موا کر دینے سے نہیں روک سکے گا۔

شاعر کہتا ہے یہ تماشا بندر کا ہم نے اپنے بچپن میں دیکھا تو بہت مزہ آیا تھا۔ کہ اس وقت ہم اس کی سطح سے زیادہ بلند بھی نہیں ہوئے تھے۔ پھر ہم نے علم حاصل کیا۔ تمیز سیکھی۔ شائستگی اور تہذیب و اطوار و اخلاق سے شائستہ مہذب آدمی بن گئے۔ یہ نکتہ بھی قاری کو شعور کی سطح کی دہلیز پہ رکھنا چاہیئے۔

اور اب اپنی جوانی ہے۔ امڈتا ہوا دریا ہے۔ کہ بہتی ہوئی دھارا۔ جس کو
بہہ نکلنے پہ کوئی روک نہیں سکتا ہے
انہی بل کھاتی مچلتی ہوئی لہروں کا تقاضا ہے کہ جب رات آئے
ہم بھی گھر چھوڑ کے جاتے ہیں کسی باغ کے ویران سے کونے کی طرف
موجہ باد پریشاں سے کوئی سوکھا سا پتا گر جائے
سائے کے راستے پہ ایک اکیلی۔ گہری
چاپ، ہم سے یہ کہے آئے۔ وہ آئے۔ آئے
دل کی دھڑکن یہ کہے جاتی ہے۔ ٹھہرو سنبھلو
سوکھا پتا ہے۔ کوئی اور ہے کوئی دم میں
ابھی آجاتے ہیں۔ آتے ہیں۔ ابھی آتے ہیں

اور ٹہلتے میں ذرا مڑ کے جو دیکھا تو وہی آ پہنچے
اور پھر باتیں ہی باتیں ہیں ۔ یونہی باتوں میں
چاند چھپ جاتا ہے ۔ اور تارے بھی چھپ جاتے ہیں
آنکھوں میں آنکھیں کھلی جاتی ہیں اور ہاتھ
گال پر ہاتھ جو رکھا تو کنول یاد آیا
ایسا خم ایسا گداز
ناک سے ناک لگاتے ہوئے پیشانی پہ پہنچیں جو نگاہیں تو کہا
یہی اب چاند ہے ۔ تاروں کی ضرورت ہی نہیں
تارے فرقت کی شب تار میں گننے کے لئے ہوتے ہیں
آج تم بھی ہو یہیں ۔ ہم بھی یہیں ۔ گال کا خم
ہم سے کہتا ہے ۔ خم دور زماں ہوں مجھ کو
دیکھ کر اور کوئی بات نہ یاد آئے گی!

میں نے یہ طویل اقتباس من و عن نقل کیا ہے ۔ اس کے بیان کی تلخیص نثر میں نہیں لکھی کہ میں چاہتا تھا قاری میراجی کی صناعی ، اس کی جمالیات اس کے لہجے کے کمال اس کی Perfection کو دیکھ لے ۔ پہلے پانچ مصرعے بانکے چھبیلے نوجوان کی جو پڑھا لکھا، شائستہ اور مہذب ہے ہر طرح سے Uptodate ہے جوانی کے نشے کو سامنے لاتا ہے ۔ راشد کا کردار بھی رات کو گھر سے دزدیدہ نکل آتا ہے ۔ اس الجھن کو سلجھانے کے لئے جو مزد شبانہ دے کر عورت کا ٹھنڈا بدن خریدتا ہے اور پھر سوچتا ہے کہ الجھن تو سلجھ نہیں سکی ۔ تو یہ میں نے کیا کیا ۔ یہاں ملاقات لڑکی سے مقرر ہو چکی ہے ۔ باغ کے ویران اندھیرے کونے میں گپھاؤں کے پیچھے ۔ اب ہر لمحہ انتظار ہے ۔ پتہ گرا تو لگا ملاقات کی چاپ ہے ۔ پھر معلوم ہوا کہ پتہ گرا تھا ۔ بالآخر انتظار ختم ہوا اور وہ جس کا اتنی بے چینی اتنے جبلی اضطرار میں انتظار تھا آ گئی ۔ اس کے بعد بغیر ایک پل ضائع کئے وہ عمل شروع ہو گیا جس کے لئے دونوں نے یہاں اس باغ میں ویران اندھیرے کونے میں ملنے کا طے کیا تھا ۔ پل دو پل انتہائی شوق اور چاہت کی ، انتہائی اور شدید خواہش کی باتیں ہوئیں پھر تارے چھپ گئے ۔ چاند بھی چھپ گیا ۔ رات کی روشنی نے خود کو روپوش کر لیا کہ ان دو ملنے والوں کو کوئی دھڑکا نہ رہے ۔ اور یوں بھی کہ وہ جو ہونے کو ہے اسے دیکھ کر شرمسار نہ ہوں ۔ یہاں تاثر کو شدید کرنے کے لئے ٹی ۔ ایس ایلیٹ کی نظم The Wasteland میں قدیم یونانی اسطور کے اندھے کاہن Tiresias کا بیان یاد کرو جو ٹائپسٹ لڑکی کے گھر میں اس کے کلرک تماش بین کو داخل ہوتے دیکھ کر وہ کہتا ہے ۔

I Tiresias old man with wrinkled dugs

Perceived the scene and foretold the rest

اس جنسی عمل کے اختتام پر یہ اندھا کاہن جو آدھی عمر عورت رہا آدھی عمر مرد کہتا ہے۔

And I Tiresias have foresuffered it all

Enacted on this same diwan or peed

وہاں یہ عمل ٹائپسٹ لڑکی کے اطاق میں جسے Bed . sitter کہتے ہیں ہوتا ہے اور Tiresias اسے دیکھتا تھا۔ یہاں ستارے اور چاند جو ان گنت صدیوں سے زمین کے اندھیرے گوشوں میں اس عمل کی تکرار اور اعادہ دیکھتے آئے چلے آئے ہیں اب شرم سے روپوش ہو جاتے ہیں۔ میراجی نے ستاروں اور چاند کو مقام وقوع سے غائب کر دیا۔ میں نے یہ فرق بتانے کے لیے ویسٹ لینڈ سے یہ چار مصرے دیے ہیں جو اپنی آپ بیتی میں راشد کی ایک ایسے ہی مفہوم والی نظم کا ذکر کرتے ہوئے لکھے تھے۔ وہاں اس متعلقہ حصہ کو ایلیٹ کی نظم سے نقل کیا تھا۔ میراجی ایسے عمل کو "اشرف المخلوقات" آدمی کا کار زبوں گردانتا ہے۔ اس لئے اس نے بڑے ماہر صناع کی سطح سے بات کی جہاں چاند چھپ جاتا ہے اور تارے بھی چھپ جاتے ہیں۔ یہ ایک مصرع آگے آنے والے Episode کو احساس کی اساس فراہم کرے گا۔ یہاں چند مصرعوں گیت جمالیات پر بھی غور لازم ہے کہ وہ ذہن میں رہے تو نظم مکمل ہو کر اپنا پورا تاثر دل پر محیط کرے گی۔

گال پر ہاتھ جو رکھا تو کنول یاد آیا

ایسا خم۔ ایسا گداز

کیا بھرپور نقشہ دو مختصر مصرعوں میں سامنے رکھ دیا۔ آگے دیکھئے

گال کا خم

ہم سے کہتا تھا خم دور زماں ہوں۔ مجھ کو

دیکھ کر اور کوئی بات نہ یاد آئے گی۔

یہ لوچ یہ خم ایسا ہے کہ قحط سالی کے غم کو بھی ذہن سے مٹا دیتا ہے۔ یہاں میراجی جن کے وہ بات کہتا ہے جو گہری طنز اور آزردگی سے جو سعدی نے کہی تھی۔ چناں قحط سالی شد اندر دمشق کہ یاراں فراموش کردند عشق۔ یہاں مہذب سوجھ بوجھ رکھنے والا جوان خود کو فریب دیتا ہے کہ یہ لمحہ ایسا ہے کہ اندوہ مرگ بھی سامنے آجائے تو آنکھ اسے نہ دیکھے لیکن یہ عاشق یا خواہش مند نوجوان ترا حیوان نہیں۔ وہ کلرک نہیں جو ٹائپسٹ لڑکی کے ہاں ہم نے دیکھا اور جسے Tiresias نے بھی دیکھا۔ یہاں چاند تارے شرم سے چھپ گئے۔ اور مرکزی کردار کہتا ہے کہ گال کے خم کے اس اعلان کے باوجود کہ مجھ کو

دیکھ کر اور کوئی بات نہ یاد آئے گی

بات یاد آگئی

بات یاد آئی ۔ ابھی کل ہی پڑھا تھا شاید
ڈارون کہتا ہے بندر سے ترقی کر کے
آج انسان بھی انسان بنا بیٹھا ہے
دونوں کے گالوں پہ جبڑوں پہ ذرا غور کرو
ناک بھی دیکھو ۔ یہ رفتہ رفتہ
اونچی ہوتے ہوئے اس درجہ ابھر آئی ہے
اور پیشانی تو ویسی ہی نظر آتی ہے
یہ خیال آنے پہ ہر رات کی باتیں مجھ کو
یوں ہنسا جاتی ہیں جیسے وہ لطیفہ ہوں کوئی
یہ لطیفہ ۔ کسی جنگل میں کسی ٹہنی پر
ایک بندر یہ بندریا سے کہا کرتا تھا
آج تم بھی ہو یہیں ہم بھی یہیں ۔ گال کا خم
ہم سے کہتا ہے ۔ خم دور زماں ہوں ۔ مجھ کو
دیکھ کر اور کوئی بات نہ یاد آئے گی

نظم بظاہر ایک لطیفہ پر ختم ہوئی ۔ بندر کی بندریا سے گفتگو پر ۔ جانور بقائے نسل کے لئے ایک دوسرے سے قریب آتے ہیں تو پوری طرح Rouse ہونے کے لئے کچھ دیر لمس سے باہم دیگر اشتعال دلاتے ہیں ۔ ان کی اشاروں کی لمس کی زبان بعینہ وہی بات ہوتی ہے جو یہاں دو بالغ ہوتے ہوئے لڑکے لڑکی کی جبلت کی سطح پر "چوما چاٹی" کے دوران میں کہی جاتی ہے ۔ اس نظم کے پیچھے بھی عورت مرد کے محض جنسی سطح پر تعلق سے نہایت آزردہ سطح پر اپنی برات کا اظہار کیا گیا ہے ۔ عورت مرد کا باہمی جنسی رشتہ بہت مقدس ہے ۔ اگر وہ دل کی مستقل چاہت، خیالوں، خوابوں، خواہشوں، امنگوں کی شراکت اور طویل رفاقت سے اس مقام تک آجائیں تو وہ دونوں ہمیشہ کے لئے ایک تن ہو جائیں ۔ جو دونوں کی وجود کی اساسی صداقت یہ ہو کہ جتنا ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے جائیں شوق وصال سے جتنی تسکین کرتے رہیں دل کی طلب اور وجود کی امنگ اتنی ہی بڑھتی جائے ۔ ورنہ یہ رشتہ کتیا اور کتے کے جنسی عمل سے کس لحاظ سے برتر ہے کہ وہ بھی تسکین بدن کے بعد اپنی راہ لیتے ہیں ۔ اور آج کے معاشرے میں روح کے تعلق کے بغیر جنسی خط اور وزی جانوروں کا سا عمل ہے ۔ اس لئے جو مصنوعی باتیں مرد و زن کرتے ہیں وہ اس سے کسی طور پر برتر نہیں ہوتیں جو باہم ہونے سے پہلے کتیا کتا یا بندر بندریا لمس کے ذریعے ایک دوسرے سے کہتے ہیں ۔

یہ نظم "کونسی الجھن کو سلجھاتے ہیں ہم" سے میرے نزدیک کہیں برتر نظم ہے۔ کہ اس میں کوئی مصرع کھٹکتا نہیں ہے۔ اور بات بلند آہنگ بھی نہیں۔ لہجہ Loud نہیں۔ یہاں میراجی یگانہ روزگار صناع ہے۔ حرف و بیان کی غیبی سند رکھنے والا نظر آتا ہے۔ میں اس سے بڑا خراج کسی شاعر کسی فکشن رائٹر کسی مصور کسی موسیقار کو نہیں دے سکتا۔ اور اب میں اس مختصر جائزے کی آخری نظم کے لئے قاری کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اب سے سترہ اٹھارہ برس پہلے جب ضیا کراچی میں تھا اور ہماری ملاقات ہر شام کو ہوتی تھی (جو اکثر رات گئے تک جاری رہتی تھی جس کی روحانی یگانگت اور طوالت دیکھ کر میری محبوب مہمان بار بار ایلسٹ وڈ نے ضیا کے اور شفقت بیٹی کے رخصت ہونے کے بعد کہا تھا کہ تم نے مجھے سان فرانسسکو میں نہ لندن میں یہ بتایا کہ تمہارا ایک ایسا دوست ہے کہ تم دونوں مل جاؤ تو تمہاری دنیا مکمل ہو جاتی ہے پھر تم دونوں کو کسی تیسرے وجود کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس بیچاری کو یہ پوری طرح معلوم نہیں تھا کہ ہم شاعری اور شاعروں کے بارے میں بات کریں تو دنیا ناپید ہو جاتی ہے۔ پھر وہ بات سمجھ گئی تھی اور ضیا سے اس کا جلنا ختم ہو گیا تھا) انہی دنوں ضیا نے کہا تھا کہ سمندر کا بلاوا میراجی کی سب سے اہم اور بڑی تخلیق ہے۔ اور مشورہ دیا تھا کہ میں اسے ایک بار پڑھ لوں۔ لیکن ان دنوں میں عام لوگوں کی اس بات کو شاید سچ سمجھنے لگا تھا کہ میراجی کی شاعری شدید جنسی بے راہروی کے بیان تک محدود ہے۔ کسی عزیز نے لب جوئبارے کے یہ آخری مصرعے سنا دیے تھے جو ذہن پر ایک شدید اعتراض کے طور پر ثبت ہو گئے تھے۔

جل پری آئے کہاں سے وہ اسی بستر پر
میں نے دیکھا۔ ابھی آسودہ ہوئی لیٹ گئی
لیکن افسوس کہ میں اب بھی کھڑا ہوں تنہا
ہاتھ آلودہ ہے۔ نمدار ہے دھندلی ہے نظر!
ہاتھ سے آنکھوں کے آنسو تو نہیں پونچھے تھے

میں میراجی کی روح سے شرمسار ہوں۔ اس کی ذہنی بیماری کے اسباب سے اور پھر اس بیماری کے اس کا جبر بن جانے کے وجود سے بے خبر تھا۔ اور میں آخری مصرعے کے جانسوز دکھ اس کے عمیق Pathos کو محسوس نہیں کر سکا تھا۔ اب کہ یہ دنیا دیکھ لی۔ دنیا کے سارے دکھ اور سکھ کچھ اپنے حوالے سے کچھ دوسروں کے تعلق سے جان لئے تو میں انسانی زندگی کے المیے کو پہلے سے کہیں زیادہ مروت اور آگہی کی سطح پر سمجھنے لگا تھا۔ میں بیماری اور گناہ سے اجتناب کرتا ہوں۔ لیکن بیمار اور گناہ گار کو محبت اور تالیف قلب اور خدمت کا مستحق سمجھتا ہوں۔ میں نے یہ مصرعے بھی نقل کر دیے۔ آخری مصرعے کو چھوڑ کر ساری نظم سے میں بیزار ہوں۔ لیکن انہیں نقل کر کے میں اپنی ذات کی حد تک یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے میراجی کے جو بہت نازک طبع،

حساس اور مائل بہ حزن اپنی فطرت میں تھا، جبر حالات کو سمجھ لیا ہے اور میں ان کے حق میں مسلسل دعا کرتا رہتا ہوں۔ اب کہ وہ مر چکے ہیں میں بس یہی خدمت انجام دے سکتا ہوں۔

"میں نے سمندر کا بلاوا" کو دو تین دفعہ بڑے انہماک سے پڑھا ہے ایک دفعہ ڈرامائی انداز میں ذرا بلند آواز سے پڑھا کہ میرا شعور اور تحت الشعور اس نظم کی ساخت اس کے لہجے اور اس کے بیکراں معنوی جہان سے آگاہ ہو جائے انہیں اپنے اندر جذب کر لے۔

میں نے میراجی کو جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کبھی بالاستعیاب نہیں پڑھا تھا۔ کلیات کے حصہ غزل اور گیتوں کے حصہ کو پڑھا تھا کہ میراجی کے چند گیتوں اور دو ایک غزلوں کو اچھی دھنوں میں اچھے گلوکاروں سے گوادوں۔ جب میراجی پر لکھنا طبیعت کا جبر بن گیا تو میں نے ضیا سے ایک انوکھی استدعا کی۔ چھ سات روز ہوئے میں نے اسے خط لکھا اور سولہ اٹھارہ نظموں کے عنوان لکھ بھیجے کہ ان نظموں کے مفاہیم کی کلید ایک ایک سطر میں مجھے لکھ بھیجو کہ میں میراجی کی بارے میں بات کرتے ہوئے راستے سے بھٹک نہ جاؤں۔ وہ خط شاید اسے آج ملا ہو۔ کہ محرم کی تعطیلات بیچ میں آگئیں۔ ادھر میرے دل نے کہا اردو شاعر کا کلام ہے تم شیکسپیر، پشکن، ورڈز ورتھ ورجل، رلکے، بادلیئر، ڈرائیڈن، براؤننگ جیسے مشکل یورپی شاعروں کا کلام پڑھ کر کافی حد تک سمجھ چکے ہو۔ اپنے مرشد رومی سے لے کر ملک الشعراء بہار تک سارا فارسی شعری سرمایہ چالیس برس سے بار بار دہرا رہے ہو تو میراجی کا کلام بھول بھلیاں تو نہیں ہو گا۔ اللہ کا نام لو اور شروع کر دو۔ ۹ محرم کو لکھنا شروع کیا آج گیارہ محرم ہے اور یہ مقالہ قریب قریب لکھا جا چکا ہے۔ میراجی کے لئے میرے دل میں جو انس تھا اس نے اس کے کلام کو مجھ پر آسان کر دیا۔

ضیا نے ٹھیک کہا تھا۔ میراجی نے بیسیوں بڑی نظمیں کہی ہیں۔ "سمندر کا بلاوا" ان میں سب سے بڑی نظم ہے اور میراجی کے کلام میں ہی نہیں اردو کی چند عظیم نظموں میں شامل ہو گئی ہے۔ وقت نے یہ فیصلہ دے دیا ہے کیوں کہ اسے لکھے نصف صدی گزر چکی ہے اور یہ آج بھی تازہ کھلے گلاب کی طرح ہمہ رنگ "ہمہ خوشبو ہے"۔ "سمندر" اس نظم میں Eternity ہے۔ وقت مطلق جو ساکت بھی ہے اور بجلی کی رفتار سے تیز بھی۔ ہر تیز رو سے تیز تر۔ سمندر حقیقت کبریٰ ہے۔ سمندر اپنشدوں کا برہمن ہے جو کائنات سے ماورا اور کائنات میں ساری ہے۔ Immanent - Transcendant برہمن۔ وقت مطلق خالق اکبر ہے۔ بدیع السموات۔ جو باہمہ بے ہمہ ہے۔ جو کچھ نظر آتا ہے وہ اپنی اپنی جگہ قطرہ ہے۔ سمندر میں نہ ملا تو فنا اس کا مقدر ہے۔ سمندر میں مل گیا تو لگتا ہے کہ فنا ہو گیا۔ مگر فنا ہو کر بڑے کل میں بقا پا گیا ہے۔ غالب کہتا ہے ع عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا۔ یہ پہلی سطح ہے۔ دوسری سطح یہ ہے ع خاک کا رزق ہے وہ قطرہ جو دریا نہ ہوا۔ اور تیسرا اپنی ذات میں لافنا ہونے کا مقام ہے۔ گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا۔ جس قطرے نے سارے دریا کے اضطراب کو اپنے اندر سمیٹ اور سمو لیا وہ

۔ گھر بن گیا اور گھر لا فنا ہے ۔ شعری لاہوت میں ۔ دریا یا سمندر غالب کے ہاں بھی حقیقت کل ہے ۔ جیسا کہ ساری فارسی اور اردو شاعری کی روایت میں ہمیشہ رہا ہے ۔ یہاں متکلم شاعر ہے ۔ جو مسلسل بے توقف بلاوا سن رہا ہے بقا فانی کو بلا رہی ہے ۔ اس نظم میں جو Pathos ہے وہ اردو فارسی غزل اور نظم کی شاعری میں کبھی دیکھنے میں نہیں آیا ۔ جب فانی روح تھک جاتی ہے تو وہ بلاوا خود اس کے اندر سے آتا ہے ۔ کہ بس اب تھکن کی حد ہو گئی ۔

یہ سرگوشیاں کہہ رہی ہیں ۔ اب آؤ کہ برسوں سے تم کو بلاتے بلاتے مرے
دل پہ گہری تھکن چھا رہی ہے
کبھی ایک پل کو کبھی ایک عرصہ صدائیں سنی ہیں ۔ مگر یہ انوکھی ندا آ رہی ہے
بلاتے بلاتے تو کوئی نہ اب تک تھکا ہے نہ شاید تھکے گا
"مرے پیارے بچے ۔ مجھے تم سے کتنی محبت ہے ۔ دیکھو" اگر یوں کیا تو
برا مجھ سے بڑھ کر نہ کوئی بھی ہو گا ۔ خدایا خدایا!
کبھی ایک سسکی ۔ کبھی اک تبسم ۔ کبھی صرف تیوری
مگر یہ صدائیں تو آتی رہی ہیں
انہی سے حیات دو روزہ ابد سے ملی ہے
مگر یہ انوکھی ندا ۔ جس پہ گہری تھکن چھا رہی ہے
یہ ہر ایک صدا کو مٹانے کی دھمکی دیے جا رہی ہے

پہلا بند نظم کا مکمل ہوا ۔ اس نظم کی ابتدا میں کتنی معصومیت ہے ۔ کیسی انتھاہ محبت اور اس محبت کی شاعر کے دل میں ان مٹ یاد ہے ۔ شاعر دور سے ایک ندا اپنی طرف سن رہا ہے ۔ جو اسے تھکی سی محسوس ہو رہی ہے ۔ شاعر کہتا ہے ایسی صدائیں تو میں ہمیشہ سے سنتا چلا آ رہا ہوں ۔ تھکن آوازوں کی نوع معین کر رہی ہے اور فطرت کا تقاضا بھی ۔ آدمی اپنی ماں کو کبھی نہیں بھول سکتا ۔ جب دکھ ہوتا ہے ۔ سدھ نہیں رہتی تو کہتا ہے ہائے ماں! تو یہاں شاعر کو اپنا بچپن ماضی کی دھند سے نکل کر سامنے استادہ نظر آنے لگتا ہے ۔ اس سے پہلے شاعر آواز کی تھکن پر چونکتا ہے اور کہتا ہے کہ کوئی پاس بلانے والا بلاتے ہوئے نہ کبھی تھکا ہے اور نہ کبھی شاید آئندہ تھکے گا ۔ کہ چاہت اور شوق تھکن پر ہمیشہ غالب رہے گا ۔ اس کے بعد وہ سب سے پہلی یادیں سامنے آ گئیں ۔ بچے نے کوئی شرارت کی ۔ یا کھانا کھانے سے دودھ پینے سے انکار کر دیا یا یونہی بالک ہٹ دکھا رہا ہے اور ماں سارے دن کے کام کاج سے تھک چکی ہوتی ہے ۔ تو ماں نے جو باتیں مختلف اوقات میں کہیں وہ سب یکجا ہو گئیں ۔ پہلی یاد ماں ستا کی ہے ۔ مرے پیارے ثناء اللہ / حمید نسیم ۔ ضیا جالندھری ۔ اعجاز بٹالوی ۔ قیوم نظر ۔ یوسف ظفر ۔ بابیل! میرے لاڈلے میرے پیارے بیٹے ۔ میں واری جاؤں کتنی محبت ہے تجھے اپنے چاند سے ۔ پھر یاد آیا ۔ ڈانٹا بھی تھا ۔ دیکھ اگر یوں کیا ۔ میرا کہنا نہ مانا ضد نہ

چھوڑی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔ ابو کی پٹائی بھول جاؤ گے ہاں! پھر جب بچہ ماں کے ہی نہیں دیتا تو ماں ماں ہے ٹھکائی بھی نہیں کر سکتی بے بسی کے عالم میں پکار اٹھتی ہے۔ خدایا خدایا!

یہاں شاعر کتنا معصوم ہے۔ انسانی فطرت کی سچائی سے کتنا قریب ہے۔ پھر وہ سوچتا ہے۔ کبھی ماں چپکے چپکے تھکن کی شدت اور بچے کی ضد سے ہار کے رو دیتی ہے۔ اس کی سسکی۔ کبھی بچہ مان گیا تو بے اختیار کھلتی کلی کا سا تبسم۔ کبھی صرف منع کرنے کے لئے آنکھوں سے اشارہ یا تیوری میں بل پڑ جانا۔ یہ یادیں آئیں تو دل نے کہا اے کم نصیب تیری زندگی کا یادگار زمانہ وہی تھا۔ وہ بے انت بے لوث محبت تجھے پھر کب ملی۔ اس کی یاد تو ابد تک ساتھ دے گی۔ لیکن یہ آواز ماں کی آواز جیسی تو نہیں تھی۔ یہ آواز تو بہت زیادہ تھکن کی مظہر ہے۔ اور یہ روح پر یوں چھائے جا رہی ہے کہ لگتا ہے اب سے پہلے کی ساری صداؤں کی یاد کو مٹا کر رکھ دے گی۔ کہ اسے سن کر اس کی طرف لپکا تو پھر کچھ بھی نہیں رہے گا۔

اب منظر بدل گیا ماضی کی جگہ لمحہ موجود شعور کے فوکس میں ہے۔

اب آنکھوں میں جنبش نہ چہرے پر کوئی تبسم نہ تیوری
فقط کان سنتے چلے جا رہے ہیں

یہ صدا بے چہرہ ہے۔ بدن کیا خد و خال کیا۔ کوئی عکس کوئی سایہ بھی نہیں مگر آواز مسلسل آتی چلی جا رہی ہے۔ سارے حواس میں صرف سماعت مصروف ہے۔ نہ ذائقہ۔ نہ کوئی بو۔ نہ دید نہ لمس۔ صرف آواز ہے کہ آ رہی ہے۔ تھکی ہوئی ہے۔ مگر ایسی Lauders ہے کہ دوسری کسی حس کو مرتعش نہیں کر رہی ہے۔ اب شاعر کا ذہن اس کا تصور فعال ہو گیا ہے۔

یہ اک گلستاں ہے۔ ہوا لہلہاتی ہے۔ کلیاں چٹکتی ہیں
غنچے مہکتے ہیں اور پھول کھلتے ہیں۔ کھل کھل کے مرجھا کے
گرتے ہیں۔ اک فرش مخمل بناتے ہیں جس پر
مری آرزوؤں کی پریاں عجب آن سے یوں رواں ہیں
کہ جیسے گلستاں میں اک آئینہ ہے
اسی آئینہ سے ہر اک شکل نکھری۔ سنور کر مٹی اور مٹ ہی گئی۔ پھر نہ ابھری
یہ پربت ہے۔ خاموش ساکن
کبھی کوئی چشمہ ابلتے ہوئے پوچھتا ہے کہ اس کی چٹانوں کے اس پار کیا ہے
مگر مجھ کو پربت کا دامن ہی کافی ہے۔ دامن میں وادی ہے وادی میں ندی ہے
ندی میں بہتی ہوئی ناؤ میں آئینہ ہے
اسی آئینے میں ہر اک شکل نکھری۔ سنور کر مٹی اور مٹ ہی گئی۔ پھر نہ ابھری

اب انسان کے روحانی ورثہ سے آگاہ شاعر نمود کی دنیا سجاتا ہے۔ نمود کے مظاہر بجتے ہیں۔

علامت باغ کی ہے سو کو نپلیں پھوٹتی ہیں ۔ کلیاں کھلتی ہیں ۔ کھل کر پھول بنتی ہیں اور پھر پھول اپنی بہار دکھا کر مرجھا کر شاخ سے جھڑجاتے ہیں اور اس مرجھائے ہوئے پھولوں کی سیج پر تخلیق کار کی امنگوں آرزوؤں کی پریاں، حسن کی شہ زادیاں محو خرام ہیں ۔ شاعر کہتا ہے یہ گلستان آئینہ ہے ۔ یہاں آئینہ لفظ ایک بے مثل صناع اور دانشور شاعر نے رکھا ہے ۔ ہندو لاہوت، افلاطونی نمود اور اسلامی تصوف کی مشترکہ علامت آئینہ ہے ۔ کہ یہ ساری نمود آئینہ ہے ۔ اس جمال ذات کا ۔ حقیقت کل کی قدرت کے ظہور کا آئینہ جو مختلف رنگ مختلف خدوخال دکھاتا ہے ۔ پھر جب آئینے سے کوئی صورت غائب ہو گئی تو وہ مطلق فنا کی نذر ہو گئی ۔ اب گلستان کی جگہ پربت آئینے میں نظر آیا ۔ ہمہ خلوت ۔ کاملاً بے حس و حرکت ساکن ۔ اس پربت سے یکایک کوئی چشمہ کوئی نمود ناطق ابھر کر پوچھتی ہے اس نمود کے اس پار کیا ہے ۔ جو غالب نے کہا تھا ۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب

شاعر کہتا ہے پربت سے کہ میرا پرتو ہے آئینہ ہے ۔ ایک ابلتے چشمہ نے منعکس ہو کر سوال کیا اس نمود کے اس پار اصل حقیقت کیا ہے ۔ شاعر کہتا ہے مجھے ادھر کیا ہے سے کیا لینا ۔ میرے لئے تو یہیں اسی نمود کا جمال بہت کافی ہے ۔ دیکھو کیسا سجا کر تسلسل قائم کیا ہے وحدت شہود کا ۔ مجھ کو پربت کا دامن ہی کافی ہے دامن میں وادی ہے ۔ وادی میں ندی ہے ۔ ندی میں بہتی ہوئی ناؤ ۔ یہ آئینہ ہی آئینہ ہے ۔ ازہرمابہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ ۔ اور اس آئینے میں کہ نمود ہے بہت سی شکلیں ابھریں ۔ مگر مٹنے لگیں تو ہمیشہ کے لئے ناپید ہو گئیں ۔ شاعر یہاں تک آیا ہے کہ صداؤں سے دل میں کچھ نقش ابھرے پھر آئینے سے منعکس منظر پے بہ پے نظر آئے ۔ ہاتھ لگاؤ تو نہیں نہیں ۔ عکس موجود ہے ۔ انسان کی کوشش ایسی ہے کہ ہوا میں گرہ باندھے یا اسے مٹھی میں بند کرنا چاہے ۔

اب طلسم خیال ٹوٹ جاتا ہے ۔ نمود کا آئینہ بھی سامنے سے ہٹ گیا ہے ۔ تو شاعر دیکھتا ہے کہ حقیقت زندگی یہ ہے کہ سامنے کراں تاکراں ایک سونا صحرا پھیلا ہوا ہے ۔ جہاں نہ ایک بوند پانی ہے نہ کوئی ہری پتی ہے ۔ صرف بگولے ہیں ۔ نیست کے بگولے جو لا کے نقطہ کے گرد رقصاں ہیں ۔ اب شاعر کہتا ہے کہ میں نے آنکھیں بند کر لی ہیں ۔ کہ نمود کا باطل ہونا ثابت ہو گیا اب میں آنکھیں بند کئے دل کی نگاہ کو پیڑوں کے ایک جھرمٹ پر مرتکز کئے ہوئے ہوں ۔

اب ارد گرد کوئی صحرا ہے ۔ نہ پربت نہ گلشن ۔ جس میں کلیاں چٹک کر پھول بنتی تھیں اور پھول مرجھا کے سیج بناتے تھے ۔ اب میری آنکھیں بھی ساکت ہیں ۔ نہ کوئی چہرہ باقی ہے نہ اس پر کوئی تبسم نہ تیوری کا کوئی تاثر ہے ۔ کچھ نہیں رہا ۔ اب نہ دید ہے نہ ذائقہ ہے نہ مہک ہے نہ لمس ہے ۔ صرف ایک bodyless آواز آرہی ہے Tondness اور کہہ رہی ہے کہ اے مخاطب تمہیں بلاتے بلاتے مجھ پر بہت گہری تھکن طاری ہو گئی ہے ۔ پھر شاعر سوچتا ہے کہ یہ آواز

میں تھکن کیسی۔ ہو سکتا ہے شاعر کے ذہن میں آیت الکرسی کی گونج ہو جو اس نے اپنی ماں سے سنی یا ماں نے اسے بچپن میں یاد کرادی تھی۔ یا تر مورتی کے برہمن کا خیال اسے یکایک آگیا کہ وہ تو ہر کیفیت اور کمیت سے منزہ ہے۔ اب اس پر آشکار ہوا کہ یہ نداؔ اس کی اپنی باطنی حقیقت کا آئینہ ہے۔ نداؔ میں تھکن نہیں۔ تھک وہ گیا ہے۔ شکستوں کا یہ جو بار گراں سر پر اٹھائے اور اپنی محرومیوں کو دل میں چھپائے پھرتا رہا۔ وہ خود تھک گیا ہے۔ اور اس کی تھکن کو محسوس کرتے ہوئے سمندر جو رحمت بے کراں ہے اسے بلا رہا ہے کہ آؤ مجھ میں مل کر آسودگی اور دوام پالو۔

نہ صحرا نہ پربت۔ نہ کوئی گلستاں۔ فقط اب سمندر بلاتا ہے مجھ کو

شاعر تھک کر چور ہو چکا ہے اور اس پر یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ جو ہے وہ محض نمود بے چھایا ہے تو وہ کہتا ہے کہ مجھے کل مطلق اپنی طرف بلا رہا ہے۔ کہ اس کے سوا کچھ نہیں۔ وجود صرف وہ ہے۔ مطلق اور واجب کہ ہر شے سمندر سے آئی۔ سمندر میں جا کر ملے گی۔ اب شاعر یہ نہیں کہتا کہ یہ ملاپ عشرت قطرہ ہے۔ وہ صرف تقدیر مبرم کا ذکر کر رہا ہے کہ سمندر سے نکلے تھے سمندر میں جا کر مل جانا ہے۔ اللہ باقی!

اس نظم کے مختصر سے جائزے کے بعد میراجی کی نظم اور گیت کا مطالعہ تکمیل کو پہنچا۔ میں نے میراجی کی آخری نظم میں لاہوت کو بے جواز داخل نہیں کیا۔ اس کی علامتیں۔ آئینہ اور سمندر —— دونوں ہمارے تصوف ہمارے مابعد الطبیعاتی فلسفے کی علامتیں ہیں جنہیں شاعر نے بامقصد استعمال کیا ہے۔ میں نے انہی علامتوں کے استعمال سے جو نتیجہ مرتب ہوتا تھا وہ دیانتداری سے قاری کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس مطالعہ سے مجھے امید ہے قاری نے اگر کوئی مفروضے پہلے سے صداقت کے طور پر دل میں قائم نہیں کر رکھے تھے تو اسے محسوس ہو گیا ہو گا کہ میراجی اردو شاعری کی تاریخ میں مقام تکریم ایک بڑے شاعر کے طور پر ایک دن حاصل کر کے رہے گا۔ وقت کا منصف اس کے حق میں فیصلہ دے گا۔ جدید اردو شاعری کے تین اصحاب کبار فیض صاحب۔ راشد صاحب اور میراجی میں میری ادب کے ایک کل وقتی طالب علم کی حیثیت سے یہ رائے ہے کہ راشد اور میراجی اپنی اپنی جگہ بڑے شاعر ہیں۔ دونوں قریب قریب ایک ہی سطح کے ہیں۔ ممکن ہے راشد کو شمہ بھر برتری حاصل ہو جائے کہ اس نے ۴۵ برس شاعری کی۔ میراجی کا کمال یہ ہے کہ اس نے پندرہ سولہ برس میں وہ سطح حاصل کر لی کہ راشد سے شاعر کی حیثیت سے آنکھیں چار کر سکتا ہے۔ فیض صاحب کا لہجہ ان دونوں شاعروں سے زیادہ شیریں ہے مگر ان کی فکر محدود بھی ہے اور کم تر بھی کہ وہ "کوئے یار" اور "سردار" کے سوا اپنے تجربے میں اور کچھ نہیں رکھتے۔ اور یہ وہ Stuff نہیں جس سے عظیم شاعری تخلیق ہو سکے۔

میراجی نے حلقہ ارباب ذوق قائم کیا اور اس کا نصب العین "ادب برائے ادب" معین کیا۔ جہاں تک ترقی پسند تحریک کی نعرہ بازی کا تعلق ہے میراجی کا یہ کہنا درست تھا کہ ادب نعرہ

نہیں ۔ ادب کو ادب رہنا چاہیئے ۔ میرے خیال میں اپنے اس ادبی آدرش کو تقویت پہنچانے کے لئے وہ "لب جوئبارے" جیسی نظمیں لکھتے رہے ۔ کہ دیکھو "موتری" پر نظم لکھی اور نظم ادبی سطح پر معیاری ہے ۔ اور تم انسانی مساوات کی بات کرتے ہو نعرہ بنا دیتے ہو ۔ لیکن ہوا یہ کہ میراجی اور اس کے حلقہ بگوش افراط کا شکار ہو گئے ۔ انہوں نے ادب برائے ادب کو پروانہ آزادی سمجھ لیا ۔ آج کل تو Gay گروہ بھی ہیں ۔ Lesbians بھی ہیں تو اگر بول و براز کو ان لوگوں نے ادب کے موضوع بنانا شروع کر دیا تو جو نقصان ترقی پسند تحریک نے سچے ادب کو پہنچایا اس سے کہیں زیادہ مہلک نقصان یہ بیمار نوع کا ادب برائے ادب پہنچائے گا ۔ آپ "چرکیں" اور "بولیں" پیدا کریں گے شاعر نہیں ۔ "لب جوئبارے" کسی ادبی معیار سے اچھی تخلیق نہیں ۔ تخلیقی عمل اپنی اصل میں ایک جمالیاتی عمل ہے اور تخلیق کے قابل قبول ہونے کے لئے ایک کم سے کم جمالیاتی سطح ناگزیر ہے ۔ جو تخلیق Aesthetic Acceptability نہ رکھتی ہو وہ "چرکینی" اور "بولینی" عمل ہے تخلیق نہیں ۔ سو میں میراجی کے ایک ادنیٰ مداح کی حیثیت سے یہ گزارش کروں گا کہ میراجی کا وہ کلام جس میں ان کے ذہن کی ژولیدگی کے اثرات نمایاں ہیں اس سے صرف نظر کیا جائے اور بر تر نظموں کا جو پچاس سے کم نہیں ہوں گی ، اعلیٰ گیتوں کا جو بیس سے تیس تک ہوں گے اور تین چار غزلوں کا انتخاب چھاپ دیا جائے ۔ یہ خدمت حلقہ ارباب ذوق انجام دے تو مناسب ہو گا ۔ مجھے یقین ہے وہ انتخاب بھی کلیات فیض اور کلیات راشد سے کم ضخیم نہیں ہو گا ۔

اب میں چند لفظ میراجی کی غزل کے بارے میں کہوں گا ۔ یہاں کہنے کی تو کوئی لمبی چوڑی بات نہیں کہ لہجہ بہت سادہ ہے ۔ وہ اردو ہے جو لکھنؤ کے کائستھ بولتے تھے ۔ وہ بولی جو بھگت کبیر نے اپنے دوہوں میں استعمال کی تھی ۔ بس اس میں ذرا فارسی کے شیریں اور نرم لفظ بھی موجود ہیں جن سے غزلوں کی جمالیاتی چمک اور گلتاب ہو گئی ہے ۔

میراجی کے کلیات میں پہلی غزل میراجی کی شاہکار غزل ہے ۔

نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا
کیا ہے تیرا کیا ہے میرا ۔ اپنا پرایا بھول گیا

گیارہ اشعار کی غزل ہے ۔ دیکھو میراجی اسلوبی سطح پر روایت کا کتنا پابند ہے ۔ غزل میں بالعموم طاق شعر رکھے جاتے ہیں اور بڑی غزل یعنی طویل مسلسل غزل گیارہ اشعار ہی ہو تی چلی آئی ہے ۔ میراجی کی اس غزل میں بھی گیارہ شعر ہیں ۔ سطح بہت ہموار ہے ۔ دو ایک شعر نسبتاً ذرا کم تر ہیں کہ جو بات شاعر نے کہنی چاہی وہ سچ کر پوری طرح نہیں آئی ۔ جیسے یہ شعر

ایک نظر کی ایک ہی پل کی بات ہے ڈوری سانسوں کی
ایک نظر کا نور مٹا ۔ جب اک پل بیتا بھول گیا

اس شعر میں ابہام ذرا زیادہ ہے۔ سانس کی ڈوری اور ایک نظر کا نور ہٹا۔ اگر یہ دونوں بہم ایک ہی فاعل کے لئے ہیں تو پھر بھول کون گیا۔ جیسی صراحت تمام گوشوں کی غزل کے شعر میں ہونی چاہیئے اس شعر میں نہیں۔ باقی سب شعر بہت دل افروز ہیں۔ یہ غزل اردو کی گزشتہ نصف صدی کی بہترین غزلوں میں شامل کی جا سکتی ہے۔

پانچویں غزل بھی بہت اچھی ہے۔

لب پر ہے فریاد کہ ساقی یہ کیسا مہ خانہ ہے
رنگ خون دل نہیں چمکا گردش میں پیمانہ ہے

اور یہ شعر کیسا انوکھا ہے۔

ایسی باتیں اور سے جا کر کہتے تو کچھ بات بھی ہے
اس سے کہے کیا حاصل جس کو سچ بھی تمہارا بہانہ ہے

آخری شعر بہت تہہ دار ہے۔

مے خانے کی جھلمل کرتی شمعیں دل میں کہتی ہیں
ہم وہ رند ہیں جن کو اپنی حقیقت بھی افسانہ ہے

دو تین شعر اس غزل میں بھی اچھے ہیں۔ میراجی دانا تو نہیں ہے۔ عاشق ہے سودائی ہے۔ پوری ہندی بحر آٹھ فعلن میں بھی اچھے شعر مل جاتے ہیں۔

من مورکھ مٹی کا مادھو۔ ہر سانچے میں ڈھل جاتا ہے
اس کو تم کیا دھوکہ دو گے۔ بات کی بات بدل جاتا ہے
جیسے بالک پا کے کھلونا توڑ دے اس کو اور پھر روئے
ویسے آشا کے مٹنے پر میرا دل بھی مچل جاتا ہے
سدھ بسرے پر ہنسنے والو چاہ کی راہ چلو تو جانو
اوچھا پڑتا ہے ہر داؤں جب یہ جادو چل جاتا ہے
میراجی درشن کا لوبھی۔ بن بستی جوگی کا پھیرا
دیکھ کے ہر انجانی صورت پہلا رنگ بدل جاتا ہے

ہندی غزل میں میری دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ میراجی اپنی ساری صناعی کے باوجود آرزو صاحب کی "سریلی بانسری" کی بہترین غزلوں کی سطح تک سوائے پہلی غزل کے نہیں پہنچتے۔ مجموعی سطح پر میراجی۔ ان کے سارے جنسی مزاج کے کلام کو چھوڑ کر۔ اردو زبان کی شاعری کی تاریخ میں بیسویں صدی کے پانچ بڑے شاعروں میں سے ایک ہوں۔ اقبال کے بعد کی نسل میں راشد اور میراجی دو بڑے شاعر ہیں۔

شمیم حنفی

غالب کی اردو نثر

اردو نثر و نظم کی تاریخ میں غالب کئی اعتبارات سے استثنائی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس امتیاز کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ دوسرے کسی مصنف نے اتنا کم لکھ کر ایسی مستحکم اور مستقل جگہ اپنے لئے نہیں بنائی جیسی کہ غالب نے۔ میر غلام حسنین قدر بلگرامی کے نام ایک خط میں غالب نے لکھا تھا:

> بارہ برس کی عمر سے نظم و نثر میں کاغذ مانند اپنے نامہ۔ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں۔ باسٹھ برس کی عمر ہوئی۔ پچاس برس اسی شیوے کی ورزش میں گزرے۔ اب جسم میں تاب و تواں نہیں۔ نثر فارسی لکھنی یک قلم موقوف۔ اردو، سو اس میں عبارت آرائی یک قلم متروک۔ جو زبان پر آوے اور قلم سے نکلے۔ پاؤں رکاب میں ہے اور ہاتھ باگ پر۔ کیا لکھوں؟ اور کیا کہوں۔

اور اردو نثر کا معاملہ بھی یہ ہے کہ خطوط کو الگ کر دیجئے تو باقی کیا بچتا ہے! گنتی کی چند تقریظیں، کچھ دیباچے، ایک ناتمام قصہ اور کچھ رسالے۔ ان میں نثر کی خوبی کے لحاظ سے خطوط کے بعد، حالی نے بھی مفتی میرلال کی کتاب سراج المعرفتہ پُر مرزا کے دیباچے کو قابل ذکر سمجھا ہے۔ لطائف غیبی، تیغ تیز، نامہ، غالب کی شہرت کا سبب غالب سے ان کی نسبت کے سوا اور کچھ نہیں۔

اس سلسلے میں ایک اور لائق توجہ حقیقت یہ ہے کہ شاعری غالب نے لڑکپن میں شروع کی۔ نثر بڑھاپے میں لکھی۔ ان کی ادبی زندگی کا آخری دور ان کی نثر کا دور ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے ادبی معاشرے میں شاعری کی بہ نسبت غالب کے خطوط کو قبولیت پہلے ملی۔ ہر چند کہ حالی کو زمانے سے یہی گلہ رہا کہ "مرزا کی اردو نثر کی قدر بھی جیسی کہ چاہیئے تھی، ویسی نہیں ہوئی ---- لیکن، پھر بھی، مرزا کی اردو نثر کے قدر دان بہ نسبت ناقدر دانوں کے ملک میں بہت زیادہ نکلیں گے" (یادگار غالب، ص ۱۷۵)

خط لکھنے کا جو طریقہ غالب کے زمانے میں رائج تھا۔ غالب نے اس سے ہٹ کر ایک الگ راہ نکالی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کو شعوری یا غیر شعوری سطح پر اپنی انفرادیت کے تحفظ کا بہر حال احساس تھا۔ اور ہر چند کہ وہ اپنے خطوط کی شہرت کو اپنی سخنوری کے شکوہ کے منافی سمجھتے تھے (بنام تفتہ) لیکن اپنی نثر کے اسلوب کا ایک باضابطہ تصور ضرور رکھتے تھے۔ حالی نے

خطوط کے واسطے سے غالب کی انفرادیت کا تعین تین بنیادوں پر کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ غالب لوازم نامہ نگاری سے انکار کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے ادائے مطالب کے لیے مکالماتی پیرایہ اختیار کیا۔ اور تیسرے یہ کہ ہر خط میں، غالب کوئی ایسی بات لکھنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے مکتوب الیہ خوش اور محظوظ ہو۔ یہ ظاہر یہ اوصاف غالب کی شخصیت یا ان کی خطوط نگاری کے ہیں۔ نثر کے نہیں۔ لیکن جیسا کہ آفتاب احمد نے غالب کے خطوط پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا ---"اسلوب کی بحث اگر محض لفظوں کے جوڑ توڑ، جملوں کی ساخت اور بیانہ کے ظاہری پہلوؤں کے تجزیے سے آگے نہ بڑھے، تو لازمی طور پر کچھ محدود اور بے نتیجہ سی چیز بن کر رہ جاتی ہے ---- اسلوب کی بحث صرف اسی وقت نتیجہ خیز ہو سکتی ہے جب وہ خارجی پہلوؤں یعنی لفظ و بیان کے تار و پود سے گزر کر اس داخلی کیفیت کا تجزیہ پیش کرے جو کسی مخصوص اسلوب کے لباس میں ظاہر ہوئی ہو۔ غالب کے خطوط کی طرز تحریر اور اسلوب میں بھی غالب کی ادبی شخصیت کی ایک مخصوص کیفیت جھلکتی ہے" (غالب آشفتہ نوا، صفحہ ۱۴۹)

اس سلسلے میں آفتاب احمد نے ایک بلیغ نکتہ یہ بھی پیش کیا ہے کہ غالب نے جس قسم کی نثر اپنے اردو خطوط میں لکھی ہے، ایسی نثر وہ اپنی زندگی کے آخری ادوار میں ہی لکھ سکتے تھے۔ اوائل عمری کے دور میں اس طرح کی نثر کا تصور بھی ممکن نہیں۔ یہ خطوط ایک پوری زندگی کا نقشہ سامنے لاتے ہیں۔ ایک پورے عہد کی روداد سناتے ہیں۔ ایک فرد اور ایک معاشرے کے وجود کی ایسی تصویر بناتے ہیں جو آزمائشوں کے ایک لمبے سلسلے سے گزرنے کے بعد مکمل ہوئی۔ ان خطوط کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ ان میں زبان و ادب کے آرائشی پہلوؤں کا استعمال کم سے کم کیا گیا ہے۔ ان میں بڑے ادب کا وہ حسن ملتا ہے جو ادبیت کا محتاج نہیں ہوتا۔ گویا کہ خطوط کے واسطے سے غالب کی نثر کا مطالعہ صرف زبان و بیان اور اسلوب کا مطالعہ نہیں ہے۔ شاعر غالب کی نظر میں معنی آفرینی کا جو بھی معیار رہا ہو، نثر نگار غالب کی دلچسپی خیالوں سے اتنی نہیں جتنی کہ انسانوں سے ہے۔ انسانوں سے یہ دل چسپی اس کو پہنچی ہوئی ہے کہ نثری نگار غالب کو اپنے پیرائیہ بیان میں بھی سب سے زیادہ تلاش جن عناصر کی رہتی ہے، وہ ادبی اور فنی عناصر نہیں بلکہ انسانی عناصر ہیں۔ شخصی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر، ان خطوں میں انسانی زندگی کے سینکڑوں مظاہر بکھرے پڑے ہیں۔ یہ ایک پورے عہد، ایک پورے انسان، ایک پوری روایت کی ہاؤ ہو کا نقشہ ہے۔ ان خطوں میں ہم غالب کے سوانح پڑھتے ہیں۔ ان کے عہد کی معاشرتی، سیاسی، تہذیبی تاریخ پڑھتے ہیں۔ پھر تاریخ کو بھول جاتے ہیں۔ مگر جس فرد نے اور جس معاشرے نے تاریخ کے ہر تجربے کا بوجھ اٹھایا ہے، یہ سارے عذاب جھیلے ہیں، اس تمام انسانی صورت حال کے پس پشت جو اجتماعی اور انفرادی روح کام کر رہی ہے، اسے ہم اپنے سامنے موجود پاتے ہیں اور اس کی آنچ پوری طرح محسوس کرتے ہیں۔ غالب کہتے ہیں: "میں نے آئین نامہ نگاری چھوڑ کر مطلب نویسی پر

مدارا رکھا ہے۔ جب مطلب ضروری التحریر نہ ہو تو کیا لکھوں" (بنام قاضی عبدالجمیل جنون) گویا کہ نامہ نگاری انسانی تعلقات کی تفہیم اور توسیع کا ایک وسیلہ ہے۔ اس کا مقصد نہ تو زباندانی کا اظہار ہے نہ لسانی کرتبوں میں کسی طرح کی مہارت کا اظہار۔ یہ ایک زندہ اسلوب میں ایک زندہ شخصیت اور ایک زندہ معاشرے کی تصویریں ہیں، روزمرہ زندگی کے رنگوں میں نہائی ہوئی، انسانی تجربوں کی تابناکی، ارتعاش اور حرارت سے معمور۔ یہ شخصیت کا بے ریا اور بیباکانہ اظہار ہے، ہر طرح کے تصنع، احتیاط، مصلحت سے عاری۔

اپنی شاعری کے وسیلے سے غالب مغل اشرافیہ کی ایک علامت کے طور پر ابھرے تھے۔ ان کی نثر ہندی مسلمانوں کے طرز احساس کا مرقع بن کر سامنے آتی ہے۔ یہ طرز احساس دنیا کی دو بڑی تہذیبوں، ہندو اور مسلمان کے باہمی ارتباط کا نتیجہ ہے اور اس پر عربی، ایرانی، ترکی روایات کے ساتھ ساتھ ہندی روایات کا سایہ بھی بہت گہرا ہے۔ غالب کی شاعری میں اپنی تمام تر آفاقیت اور وسعت کے باوجود ایک سوچی سمجھی علاحدگی پسندی رنگ بھی جھلکتا ہے، مقامی اور ارضی حقیقتوں کے رنگ سے مختلف۔ مگر غالب کے خطوط سے جو شخصیت ابھرتی ہے اور جو ماحول نمودار ہوتا ہے اس سے عام ہندی مسلمانوں کی تہذیبی زندگی کے نظریے مرتب ہوتے ہیں اس منظر یے میں امتیاز سے زیادہ امتزاج پر زور ہے اور یہی امتزاج خطوط کے واسطے سے غالب کی انفرادیت کا تعین کرتا ہے۔ اس انفرادیت کا سب سے نمایاں پہلو اس کے انسانی رابطے، حوالے اور وہ انسانی عنصر ہے جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں بعض اور نکات کی نشاندہی ضروری ہے۔

۱۔ غالب کی شاعری فکری رفعت و جلال کا اور ان کی نثر ایک نرم آثار انسانی سروکار کا تاثر قائم کرتی ہے۔ انسانی صداقتوں کا ادراک غالب کی نثر میں بہت پرکشش معروضی حوالوں کے ساتھ ہوا ہے۔

۲۔ غالب کی شاعری اور نثر، دونوں مل کر ایک مکمل منظر نامہ ترتیب دیتے ہیں۔ نظم کو نثر سے الگ کر کے معنی کے ایک منطقے تک ہم پہنچ تو جاتے ہیں، مگر یہ منطقہ ادھورا ہی رہتا ہے۔

۳۔ غالب کی نثر ایک فرد کی ترجمانی ہوتے ہوئے بھی ایک پورے عہد اور ایک معاشرے کی آواز ہے۔ اس کی لفظیات، لہجے، اسالیب ہمیں عام معاشرے کی حسیات سے روشناس کراتے ہیں۔

۴۔ اس نثر میں یگانگت کا عنصر نمایاں ہے۔ ہم اسے پڑھتے وقت غالب سے مرعوب نہیں ہوتے۔ عام انسانی سطح اور غالب کی انسانی سطح کے درمیان فوراً ایک ربط ڈھونڈ نکالتے ہیں۔

۵۔ غالب کی نثر ایک جمہوری مزاج اور ذائقہ رکھتی ہے۔ شاید یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ میرامن کے بعد انیسویں صدی کے کسی دوسرے نثر نگار کے یہاں زبان اور زندگی کے معمولات

میں چھپی ہوئی عظمت کا ایسا ادراک نہیں ملتا جیسا کہ غالب کے یہاں۔

۶۔ میر امن کی طرح غالب کی نثر کا رشتہ بھی زمین سے بہت گہرا ہے۔ ہر تخیلی صداقت یہاں زمینی صداقتوں کی تابع دکھائی دیتی ہے۔ عام انسانی تجربوں سے اس حد تک مالا مال دنیا ہمیں صرف فکشن لکھنے والوں کے یہاں دکھائی دیتی ہے۔ پنشن کے قضیے سے متعلق خطوں میں غالب نے جس طرح دفتری اور سرکاری سطح کی تفصیلات کا بیان کیا ہے، یا اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی ابتری، بد نظمی اور بے سمتی کا جو نقشہ کھینچا ہے، اہل محلہ، اہل شہر، اہل دربار، اہل بازار، لال قلعہ سے چاندنی چوک تک کے تماشے کی جو تصویریں لفظوں میں پیش کی ہیں، دوستوں، دشمنوں، عزیزوں، شاگردوں سے تعلق کی روداد سنائی ہے، ہر طرح کی کیفیتوں اور جذبوں ــــــ افسردگی اور ملال، دہشت اور اضطراب کے جو مرقع ترتیب دیے ہیں، چھوٹے چھوٹے غموں اور خوشیوں کا جو بیان کیا ہے، ان کے حوالے سے، ہم غالب اور ان کے عہد کے علاوہ خود اپنی زندگی اور اپنے زمانے کی بہت سی حقیقتوں سے بھی دوچار ہوتے ہیں۔ کچھ اقتباسات بھی دیکھتے چلیں:

> دھوپ میں بیٹھا ہوں۔ یوسف علی خاں اور لالہ ہیرا سنگھ بیٹھے ہیں، کھانا تیار ہے۔ خط لکھ کر، بند کرکے، آدمی کو دوں گا اور میں گھر جاؤں گا اور وہاں ایک دالان میں دھوپ ہوتی ہے، اس میں بیٹھوں گا، ہاتھ منھ دھوؤں گا، ایک روٹی کا چھلکا سالن میں بھگو کر کھاؤں گا، بیسن سے ہاتھ دھوؤں گا، باہر آؤں گا۔ پھر اس کے بعد خدا جانے کون آئے گا، کیا صحبت ہوگی؟

ــــــــــــــــــــــ

> برسات کا حال نہ پوچھو۔ خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے، میں جس مکان میں رہتا ہوں۔ عالم بیگ خاں کی کٹڑے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں
>
> (بنام میر مہدی مجروح)

ــــــــــــــــــــــ

> اے میری جان، یہ وہ دلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے ہو، یہ وہ دلی نہیں جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم نے شعبان بیگ کی حویلی سے مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں، وہ دلی نہیں جس میں اکاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہے۔ مسلمان،

اہل حرفہ، یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود۔

(بنام علاء الدین خاں علائی)

تنخواہ کی سنو، تین برس کے دو ہزار دو سو پچاس ہوئے، سو مدد خرچ کے جو پائے تھے وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو متفرقات میں اٹھ گئے۔ مختار کار دو ہزار لایا۔ چونکہ میں اس کا قرضدار ہوں، روپے اس نے اپنے گھر میں رکھے اور مجھ سے کہا میرا حساب کیجے۔ حساب کیا۔ سود مول سات کم پندرہ سو روپے ہوئے۔ میں نے کہا، میرے قرض متفرق کا حساب کر۔ کچھ اوپر گیارہ سو روپے نکلے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ گیارہ سو روپے بانٹ دے۔ نو سو بچے۔ آدھے تو لے، آدھے مجھے دے۔ وہ کہتا ہے پندرہ سو مجھے دو۔ پان سات سو تم لو۔ یہ جھگڑا مٹ جائے گا تب کچھ ہاتھ آئے گا۔

میرے حالات برابر میرے خلاف طبیعت ہیں میں یہ تو چاہتا ہوں کہ چلتا پھرتا رہوں۔ مہینہ بھر وہاں اور دو مہینے وہاں اور صورت یہ کہ گویا مشکیں بندھا پڑا ہوں کہ ہرگز جنبش نہیں کر سکتا۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ کاغذ تمام ہو گیا اور ہنوز باتیں بہت باقی ہیں

(بنام منشی نبی بخش حقیر)

میاں، میں بڑی مصیبت میں ہوں، محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈھ گیا۔ چھتیں ٹپک رہی ہیں تمہاری پھوپھی کہتی ہیں ہائے دبی ہائے مری، دیوان خانے کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا، فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔

(بنام علاء الدین خاں علائی)

گرمی کا حال کیا پوچھتے ہو۔ اس ساٹھ برس میں یہ لو اور یہ دھوپ اور یہ تپش نہیں دیکھی۔ چھٹی ساتویں رمضان کو مینھ خوب برسا۔ ایسا مینھ جیٹھ کے مہینے میں بھی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اب مینھ کھل گیا

ہے ۔ ابر گھرا رہتا ہے ۔ ہوا اگر چلتی ہے تو گرم نہیں ہوتی اور اگر
رک جاتی ہے تو قیامت آتی ہے ۔ دھوپ بہت تیز ہے ۔
(بنام منشی نبی بخش حقیر)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ خطوط نہیں بلکہ کسی سلسلہ وار انسانی تماشے کا منظر نامہ ہے ۔ غالب کی نظر ہر تجربے، ہر کیفیت، ہر واقعے، ہر صورت حال کی تمام جزئیات تک پہنچتی ہے ۔ اور ان کا بیان بھی وہ اس طرح کرتے ہیں جیسے قصہ سنا رہے ہوں، وہ بھی اس طرح کہ دوسرے کو اپنے تجربے میں شریک کرنا چاہتے ہوں ۔ یہ ایک گہرا وجودی رویہ ہے ۔ جس میں غالب کی ہستی ہر تجربے تک رسائی کا ماہر حقیقت کے ادراک کا بنیادی حوالہ بن کر سامنے آتی ہے ۔ آگہی ہو یا غفلت جو بھی ہو اپنی ہستی سے ہو اور واضح رہے کہ یہاں بھی سارا دھیان اپنی ہستی پر ہے، اس میں چھپے ہوئے امکانات پر نہیں ۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:

تم مشق سخن کر رہے ہو اور میں مشق فنا میں مستغرق ہوں ۔ بو علی سینا کے علم اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں ۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافت ہے ۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا ۔ دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گمنام جئے تو کیا ۔ کچھ وجہ معاش ہو اور کچھ صحت جسمانی، باقی سب وہم ہے، اے یار جانی ۔ ہر چند وہ بھی وہم ہے مگر میں ابھی اسی پائے پر ہوں ۔ شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے اور وجہ معیشت و راحت سے بھی گذر جاؤں ۔ عالم بیرنگی میں گذر پاؤں ۔ جس سناٹے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتا نہیں ۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں ۔

یہ روداد اپنی بھلی بری صورت حال کی ہے ۔ اسی کے اسباب کی طرف یا اس میں مخفی کسی طبیعی یا خیالی یا جذباتی امکان کی طرف غالب سرے سے توجہ نہیں دیتے ۔ اور یہی وہ عام، پکی، کھری انسانی سطح ہے جس پر دوسرے انسانوں سے رابطہ استوار کرتے ہیں ۔ صورت حال کے اس سلسلے کو جو غالب کی نثر کے توسط سے ہمارے سامنے آیا ہے ہمیں وقوعوں کی یکے بعد دیگرے بدلتی ہوئی تصویروں یا Happenings کے ایک Sequence کے طور پر دیکھنا چاہیئے ۔ ان میں کوئی رنگ اختراعی یا فرضی نہیں ۔ کوئی لکیر، کوئی تعلق زبردستی کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے ۔ غالب جس طرح جس صورت حال سے گزرتے ہیں اس صورت حال کا مشاہدہ اپنے احساسات کی

معیت میں جس جس طرح کرتے ہیں اسے بے کم و کاست ایسے بیان میں پروتے چلے جاتے ہیں۔

صاحب، ہم تمہارے اخبار نویس ہیں اور تم کو خبر دیتے ہیں کہ برخوردار میر بادشاہ آئے ہیں

(بنام تفتہ)

میاں لڑکے، کہاں پھر رہے ہو، ادھر آؤ، خبریں سنو!

(بنام میر مہدی مجروح)

سنو، اب تمہاری دلی کی باتیں ہیں (بنام مجروح)

میری جان، سنو داستان (بنام مجروح)

صاحب میری داستان سنیے (بنام علائی)

میری جان، غالب کثیر المطالب کی کہانی سن، میں اگلے زمانے کا آدمی ہوں (بنام علائی)

آؤ میرزا تفتہ، میرے گلے لگ جاؤ، بیٹھو اور میری حقیقت سنو

(بنام تفتہ)

سنو میاں، میرے ہم وطن یعنی ہندی لوگ جو وادی فارس میں دم مارتے ہیں وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں

(بنام تفتہ)

بھائی، میرا ذکر سنو

(بنام حکیم نجف خاں)

اور پھر غالب کے یہ بیانات، اپنے خطوط کے اسلوب کی بابت:

میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنادیا ہے

(بنام مرزا حاتم علی مہر)

اب میں حضرت سے باتیں کر چکا

(بنام انوار اللہ شفق)

یہ خط لکھنا نہیں ہے، باتیں کرنی ہیں

(بنام شفق)

صاحب، میاں لڑکے، سنو، میری جانی سنو داستان، آؤ مرزا تفتہ، سنو میاں، بھائی میرا ذکر سنو --- گو کہ غالب مسلسل سنائے جانا چاہتے ہیں۔ گزشتہ کو موجود، غائب کو حاضر مان کر اپنی سی کہے جاتے ہیں۔ اس طرز تخاطب میں ایک تو یہ کہ اپنائیت بہت ہے۔ دوسرے یہ کہ میاں، صاحب، سنو، آؤ، اور اس طرح کے بظاہر غیر ضروری لفظوں کی جادوئی چھڑی گھماتے ہی غالب کی نثر پڑھنے والے کو فوراً اپنے اعتماد میں لے لیتی ہے۔ یہاں دو اور نکتوں کی طرف توجہ مفید ہوگی۔ ایک تو یہ کہ میر امن کے بعد، غالب کی شخصیت انیسویں صدی کے دلی کے سب سے بڑے قصہ گو کی صورت ابھرتی ہے۔ واضح رہے کہ یہاں میرا اشارہ تقریری زبان یا قصے کہ حکائی روایت کی طرف ہے۔ یہ عناصر ہمیں یا تو میر امن کے یہاں ملتے ہیں یا پھر غالب کے بعد بہت آگے چل کر محمد حسین آزاد کے یہاں۔ مگر غالب کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے حقیقت کے بیان میں یہ زاویہ نکالا ہے غالب یا ان کے عہد کے دوسرے انسانوں کی طرح شہر دلی بھی دکھ سکھ کے کیسے کیسے موسموں سے گزرتا ہوا غالب کی نثر میں اپنا عکس چھوڑتا جاتا ہے۔

> صاحب، تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کئے۔ اسی زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوست تھے اور منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص، نہ وہ، معاملات نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔

(بنام تفتہ)

ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کاہلی، گرانجانی، رکاب میں پانو ہے، باگ پر ہاتھ ہے، بڑا سفر دور

دراز در پیش ہے۔ زاد راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں۔

(بنام تفتہ)

شہر کی امارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جائے۔ جو حکما کا حال کل لکھا ہے وہ بیان واقع ہے۔ صلحاء اور زہاد کے باب میں جو حرف مختصر میں نے لکھا ہے، اس کو بھی سوچ جانو۔

(بنام علائی)

یہ ایک کونے میں بیٹھے ہوئے بازیچہ اطفال کی طرح نیرنگ روزگار کا تماشا دیکھتے ہوئے، تھکے ہوئے، کبھی مطمئن اور مسرور، کبھی دل گرفتہ اور رنجور، بوڑھے کی باتیں ہیں اور اسے ہر حال میں اپنا مخاطب چاہیئے جس سے وہ اپنے ٹھہرے ہوئے، منظم، مربوط اور سچے سروں میں اپنی آپ بیتی سنا سکے۔ ہندی بھگتوں میں اپنے شردھالوؤں (معتقدین) سے بات چیت کی وہ جو ایک روایت ملتی ہے، اس کے اسالیب کا بیان اور اظہار کے فن کی روشنی میں بھی تجزیہ کیا جائے تو کچھ دل چسپ حقیقتیں سامنے آتی ہیں۔ ان میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ مثال کے طور پر رام کرشن پرم ہنس کے ملفوظات کو وچن مالا کا نام دیا ہے اور یہاں نہ صرف یہ کہ ایک کہنے والا اور ایک سننے والا ہے، بلکہ دونوں اپنے اپنے طور پر متحرک اور فعال بھی ہیں۔ گویا کہ یہ محض زبانی اظہارات کی رپورٹ نہیں، ایک طرح کی کہنی سننی کا قصہ ہے۔ غالب اکثر مقامات پر سامع کے رد عمل یا اشتراک کو جو اپنی تحریر کا حصہ بنا لیتے ہیں تو بے وجہ ایسا نہیں کرتے۔ ان کا مزاج قصہ نویسی یا ڈرامہ نگاری کے لیے جتنا موزوں اور مناسب تھا اس کے پیش نظر حیرت کی بات یہ ہے کہ غالب کو اپنے انتقال سے کچھ پہلے باقاعدہ قصہ لکھنے کا خیال کیوں آیا۔ میر کی طرح غالب بھی وقائع نویسی سے ایک فطری مناسبت رکھتے تھے۔ اور جس طرح اس فن میں پوری اٹھارویں صدی میر کا جواب پیش کرنے سے قاصر ہے، اسی طرح انیسویں صدی میں ہمیں غالب کا کوئی ہمسر نظر نہیں آتا۔ محمد حسن عسکری نے میر امن کے ذکر میں ایک جگہ لکھا تھا کہ درویش جب اپنی بیتی سناتے ہیں تو لگتا ہے کہ پورا آسمان کہانی سنا رہا ہے۔ اسی طرح غالب اپنی بات شروع کرتے ہی گویا کہ ہمارے سامنے ایک اسٹیج آراستہ کر دیتے ہیں۔ کبھی ایک کردار، کبھی دو کردار، کبھی ایک بھیڑ، پوری بستی، پورا شہر یہاں تک کہ پورا عہد اس اسٹیج پر آن موجود ہوتا ہے:

سنو، عالم دو ہیں: ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے لمن الملک الیوم؟ اور پھر آپ جواب دیتا ہے للہ الواحد القہار۔

آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷/ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے زنداں میں ڈال دیا۔

سال گذشتہ بیڑی کو زاویہ زنداں میں چھوڑ کر مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ، مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑ آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں گا کیا؟ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔

(بنام علائی)

ان لفظوں کو، ہم پڑھتے ہی نہیں۔ ان کے پیچھے سے ہمیں ایک خستہ و خراب حال بوڑھے کے ہانپنے کی مسلسل آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ یہ جادو الفاظ کا بھی ہے، الفاظ کو برتنے والے کا بھی اور اس کا پورا تاثر، جسے معنی کا بدل کہنا چاہیئے، اسی وقت گرفت میں آتا ہے جب ہم لفظوں سے آگے دیکھنے کا موقع کھوتے نہیں۔ جب ہم غالب کی نثر کا مطالعہ شاعر غالب، شخص غالب اور اس شاعر اور شخص کو عقبی پراہ فراہم کرنے والی کو ٹھری یا بستی یا شہر یا دور کے مجموعی حوالے کی روشنی میں کرتے ہیں۔ ایک اجڑے ہوئے معاشرے، ایک بکھری ہوئی زندگی، ایک تھکے ہوئے جسم کے ساتھ بھی غالب حلقہ، یاراں میں شمع محفل کی طرح روشن اور تابناک رہے یہ ان کی اپنی بشریت کے علاوہ، انسانی ہستی کی طرف اور کاروبار زیست کی طرف ان کے غیر معمولی رویے کا غیر معمولی اظہار ہے۔ غالب نے اپنے زمانے کے اجتماعی انحطاط کا تذکرہ جابجا، بہت افسردگی کے ساتھ کیا ہے اسی کے ساتھ ساتھ انہیں گئے دنوں کے آئین حیات کی بے اثری کا بھی احساس تھا۔ ان دونوں کیفیتوں سے مل کر زندگی کی بابت ایک مستقل کشاکش کے رویے کا ظہور ہوا ہے۔ اسی لیے غالب کی نثر جہاں اٹھلاتی اور شوخیاں کرتی ہے، وہاں بھی ان کا دل محیط گریہ دکھائی دیتا ہے۔ اور اداسی کے لمحوں میں بھی اپنے آپ سے ایک سوچی سمجھی جذباتی لاتعلقی ظاہر ہوتی ہے۔

یہاں خدا سے بھی توقع نہیں مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بھی نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔

(بنام مرزا قربان علی بیگ سالک)

ایسے موقعوں پر غالب کی بذلہ سنجی اور ظرافت بھی پڑھنے والے کے لیے افسردگی کی وہ

کیفیت پیدا کرتی ہے جسے فراق نے اپنے ایک شعر میں زندگی کی حقیقت کا ذکر کرتے ہوئے "سوچ لیں اور اداس ہو جائیں" کہہ کر ظاہر کیا ہے۔

> اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے، سو روپے رام پور کے قرض دینے والا ایک میرا مختار کار وہ سود ماہ بہ ماہ چاہیئے، مول میں قسط اس کو دینی پڑے، انکم ٹیکس جدا، چوکیدار جدا، سود جدا، مول جدا، بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ روزمرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کیا کروں؟ کہاں سے گنجائش نکالوں؟ قہر درویش بجان درویش۔ صبح کی تبرید متروک، چاشت سے گوشت ادھار، رات کی شراب و گلاب موقوف۔ بیس بائیس روپے مہینا بچا۔ روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا، تبرید و شراب کب تک نہ پیو گے کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا کہ نہ پیو گے تو کس طرح جیو گے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔
>
> (بنام مرزا غلام علاء الدین خاں علائی)

یہ بشریت کے آداب ہیں اور غالب نے انہیں جیسے سخت حالات میں جتنے سلیقے کے ساتھ برتا ہے اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ یہ دل کو موہ لینے والی ادا ہے۔ ایک یار باش آدمی کی اعلا سنجیدگی۔ اس کا تعلق ایک ایسے تہذیبی ماحول سے ہے جہاں زندگی میں واقعات تو ہوتے ہیں، مگر زندگی کی آہستہ خرامی میں فرق نہیں آتا اور ہر صورت حال میں وہ ایک وضع احتیاط کی پابند نظر آتی ہے۔ اسی لیے اپنی ہزیمتوں اور بے چارگیوں کے باوجود، یہ زندگی اپنے اندر ایک حسن، ایک وقار رکھتی ہے۔ بے شک غالب کی ہستی پر تلخیوں کا سایہ ہمیشہ قائم رہا اور ان کی زندگی مصائب کی گرفت میں رہی، لیکن خود غالب کی گرفت بھی زندگی پر اتنی ہی مضبوط تھی۔ وہ کہیں ٹوٹتے اور بکھرتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے۔ ایسی ہر صورت حال میں ان کی حقیقت پسندی اور اپنے آپ سے بے نیازی ایک ڈھال بن جاتی ہے۔ اس ڈھال کے بغیر غالب کے شعر میں نہ تو وہ مینا کاری پیدا ہو سکتی تھی اور نہ ہی نثر میں وہ ٹھہراؤ، نرم روی اور نظم و ضبط۔ جس طرح غالب نے حالی میں اپنے انہماک کے باوجود اس کی حدیں اتنی پھیلالی تھی کہ اس میں ان کا ماضی بھی سمویا جاسکے۔ اسی طرح اپنے وجدان میں بھی انہوں نے اتنی لچک اور اپنے شعور میں اتنی وسعت پیدا کرلی تھی کہ زندگی کی سرد و گرم سچائیوں کو ایک سی فراخ دلی کے ساتھ قبول کر سکیں اور اپنے آپ سے بے تعلقی کا بوجھ بھی اٹھا سکیں۔ شب و روز کے جس تماشے کو غالب نے بچوں کا کھیل کہا تھا، اسی تماشے میں ان کی اپنی ذات بھی شامل تھی۔ خطوں کی نثر میں بہت مقامات پر بجائے تحریری جملوں کے وہ جو برمحل اور بے ساختہ مکالموں کا انداز پیدا ہو گیا ہے، وہ اسی لیے کہ غالب وقائع نویسی

اور تماشا بینی کے عمل کو ایک دوسرے میں ملا دیتے ہیں۔

اسی مہینے میں اپنے آقا کے پاس جا پہنچتا ہوں۔ وہاں نہ روٹی کی فکر، نہ پانی کی پیاس، نہ جاڑے کی شدت، نہ گرمی کی حدت، نہ حاکم کا خوف نہ مخبر کا خطرہ، نہ مکان کا کرایہ دینا پڑے، نہ کپڑا بنواؤں، نہ گوشت گھی منگواؤں، نہ روٹی پکواؤں، عالم نور سراسر سرور

نہ نہ نہ کی مستقل تکرار ایک طرف زندگی کا یہ ڈرامہ ترتیب دینے والے کی مکالمہ نویسی کا اظہار ہے، تو دوسری طرف زندگی میں اپنے یقین کی پھسلتی ہوئی ڈور کو سنبھالے رکھنے کی لگاتار کوشش کا اظہار بھی ہے۔ غالب لفظوں کی کاری گری کا استعمال بھی اس مہارت کے ساتھ کرتے ہیں کہ میر انیس کی طرح صناعی تو پیچھے چلی جاتی ہے، تاثر بڑھ کر سامنے آجاتا ہے --- کچھ مثالیں۔

یہاں اغنیاء کے ازدواج و اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں؟ اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے! اب خاص اپنا درد روتا ہوں۔ ایک بیوی، دو بچے، تین چار آدمی گھر کے۔ کلا، کلیان، ایاز یہ باہر ہیں۔ مداری کے جورو بچے، بدستور گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھمن گئے آگئے، مہینہ بھر سے آئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی ہو، ایک پیسے کی آمدنی نہیں، بیس آدمی روٹی کھانے کے لیے موجود ---

----

اب جو چار کم اسی برس کی عمر ہوئی اور جانا کہ میری زندگی برسوں کیا مہینوں کی نہ رہی۔ شاید بارہ مہینے جس کو ایک برس کہتے ہیں، اور جیوں۔ ورنہ دو چار مہینے، پانچ سات ہفتے، دس بیس دن کی بات رہ گئی ہے۔

ساغرِ اوّل و دُردہ کیا دل لے کر آئے؟ کیا زبان لے کر آئے، کیا علم لے کر آئے، کیا عقل لے کر آئے اور پھر کسی روش کو برت نہیں سکے۔ کسی شیوے کی داد نہیں پائی۔

یہ تحریری عبارت نہیں، زندگی کے اسٹیج پر مختلف کیفیتوں کا اظہار کرتے ہوئے ایک کردار کی باتیں یا مکالمیں ہیں۔ غالب ہر مکالمہ اسی طرح ادا کرتے ہیں جس طرح اپنے زماں، اپنے مکاں اور اپنے عمل کے پس منظر میں اسے ادا کیا جانا چاہیے۔ کچھ اور اقتباسات:

ہائے لکھنو، کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گزری؟ اموال کیا

ہوئے؟ اشخاص کہاں گئے؟ خاندان شجاع الدولہ کے زن و مرد کا کیا ہوا؟ قبلہ و کعبہ مجتہد العصر کی سرگذشت کیا ہے؟

- - - - - - - - - - -

تصویر پہنچی، تحریر پہنچی، سنو میری عمر ستر برس کی ہے اور تمہارا دادا میرا عمر اور ہم باز تھا۔ اور میں نے اپنے نانا صاحب خواجہ غلام حسین مرحوم سے سنا کہ تمہارے پر دادا صاحب کو اپنا دوست بتاتے تھے، اور فرماتے تھے کہ میں بنسی دھر کو اپنا فرزند سمجھتا ہوں۔

- - - - - - - - - - -

برسات کا نام آگیا تو پہلے مجملاً سنو! ایک غدر کالوں کا ایک ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنہ انہدام مکانات کا، ایک آفت وبا کی ایک مصیبت کال کی۔

- - - - - - - - - - -

ایک غدر، ایک ہنگامہ، ایک فتنہ، ایک آفت، ایک مصیبت ــــ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسانی ہستی کی ہولناکیوں کا ایک سلسلہ ہے جو غالب کے عہد کو عبور کرتا ہوا ہماری زندگیوں میں داخل ہو چکا ہے اور ڈرامہ جاری ہے۔ چنانچہ غالب مراسلے میں مکالے کا انداز پیدا کرنے کی جو بات کہتے ہیں وہ صرف ایک فنی حکمت عملی کا نتیجہ نہیں ہے۔ چونکہ ڈرامہ جاری ہے اس لیے مکالے کی ضرورت کا احساس بھی باقی ہے۔ یوں مکالے اور واقعہ نگاری سے ہٹ کر بھی غالب نے اچھی نثر لکھی ہے۔ مثال کے طور پر سراج المعرفتہ کا دیباچہ جس کی طرف ہم شروع میں ہی اشارہ کر چکے ہیں:

ختم نبوت کی حقیقت اور اس معنی نما مرض کی صورت یہ ہے کہ مراتب توحید چار ہیں۔ آثاری، افعالی، صفاتی، ذاتی، انبیائے پیشیں صلوات اللہ علی نبینا و علیہم، اعلان مدارج سہ گانہ پر مامور تھے۔ خاتم الانبیا کو حکم ہوا کہ حجاب تعینات اعتباری اٹھادیں، اور حقیقت بیرنگی ذات کو صورت الآن کما کان میں دکھاویں۔ اب گنجینۂ معرفت خواص امت محمدی کا سینہ ہے، اور کلمہ لا الہ الا اللہ مفتاح باب گنجینہ ہے۔

- - - - - - - - - - -

قلم اگرچہ دیکھنے میں دو زبان ہے لیکن وحدت حقیقی کی رازدان ہے گفتگو کی توحید میں وہ لذت ہے کہ جی چاہتا ہے کوئی سو بار کہے اور سو

بار سنے ۔ نبی کی حقیقت ذو جہتین ہے ۔ ایک جہت خالق کہ جس سے
اخذ فیض کرتا ہے اور ایک جہت خلق کہ جس سے فیض پہنچاتا ہے ۔

مگر ان خطوط پر علمی نثر لکھنے کی روایت تو انیسویں صدی میں خاصی مستحکم ہو چکی تھی اور اسے مزید آگے لے جانے والے ۔۔۔۔ سرسید، نذیر احمد، آزاد، حالی، شبلی سب موجود تھے ۔ البتہ حقیقت کو کہانی بنانے اور روزمرہ زندگی کی واردات کو ایک گھنے گنجان انسانی تماشے کی سطح تک لے جانے کی استعداد کے معاملے میں غالب اپنے عہد کے سب سے بڑے نثر نگار تھے ۔

ابو الکلام قاسمی

راجندر سنگھ بیدی کے افسانے میں بیانیہ اور کردار کا رول

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں کردار کی کیا اہمیت ہے اور ان کی افسانوی تعمیر میں کردار کیا رول ادا کرتے ہیں؟ اس کا صحیح اندازہ تو ان کے نمائندہ کرداروں کے تفصیلی اور تجزیاتی جائزے سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ وضاحت آغاز گفتگو میں ہی کر دینا مناسب ہوگی کہ بیدی کی افسانوی ساخت کا بنیادی حوالہ کردار ہوتا ہے۔ جب کہ منٹو کے افسانے کے غالب عنصر کے طور پر پلاٹ، عصمت کے افسانے کے لئے زبان اور کرشن چندر کی شناخت کے طور پر فضا آفرینی کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے۔ ہر چند کہ افسانے کے فن کے نقطہ نظر سے اب یہ بات بہت مناسب نہیں تصور کی جاتی کہ کسی بھی افسانہ نگار یا اس کے افسانے کو اس فن کے کسی ایک عنصر کے ساتھ وابستہ کر دیا جائے۔ اس لئے کہ افسانوی دنیا کے کچھ اپنے ضابطے اور قاعدے ہیں اور ان ضابطوں میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ مختلف عناصر کے مابین اس تطابق اور تعامل کی تلاش کی جائے جن کی بدولت افسانہ ایک مکمل اور خود مختار اکائی کا درجہ حاصل کر سکا ہے۔ تاہم اس حقیقت کو بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ فکشن کی کلاسیکی شعریات میں جن اجزاء کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے، اب ان میں سے بیش تر کو فکشن کے لئے ناگزیر نہیں سمجھا جاتا۔ اس کے باوجود کردار اور افسانوی ڈھانچے کو ہنوز افسانے کے فنی لوازم سے منہا نہیں کیا جاسکا ہے۔ یہ بات، راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کے سلسلے میں اس وقت بڑی معنی خیز بن جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بیدی کے افسانوی ڈھانچے کا دارو مدار کردار کی مرکزیت پر ہوتا ہے۔ لیکن یہ کردار اپنے جن خارجی اور داخلی حوالوں سے تشکیل پذیر ہوتے ہیں، ہماری تنقید کی نگاہیں بالعموم ان تشکیلی عناصر میں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔

بیدی کی افسانہ نگاری پر اردو میں جو تنقید لکھی گئی ہے اور اس میں بیدی کے افسانوی

طریق کار کی جن خوبیوں کو سراہا گیا ہے، اس کے تفصیلی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ بیدی کی کردار نگاری کے بجائے، کردار کے قائم کرنے کے وسائل ہماری تنقید کا مرکز توجہ رہے ہیں، اور بیدی کے افسانوں میں کردار کے رول کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ ویسے اگر ان تنقیدی تجزیوں کو غور سے پڑھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس نوع کے بیش تر مضامین اور کتابوں میں قدرے غیرواضح انداز میں سہی، بیدی کی کردار نگاری کا مبہم اعتراف بھی موجود ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس ابہام کی وضاحت اور اس اجمال کی تفصیل کی طرف توجہ بہت کم مبذول کی گئی ہے۔ آل احمد سرور اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

> پریم چند کی آدرشی حقیقت نگاری جو کرشن چندر کے یہاں رومانی حقیقت نگاری نظر آتی ہے، بیدی کے یہاں ایک ایسی حقیقت نگاری بن جاتی ہے جو اسطور اور دیومالا کے سایوں کی وجہ کچھ بڑی اور کچھ پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے"

مگر وہ یہ نہیں بتاتے کہ اسطور اور دیومالا کا استعمال بیدی کے فن کے کس پہلو پر زیادہ اثر انداز ہوتا ہے اور یہ حقیقت نگاری جب نفسیاتی حقیقت نگاری بن جاتی ہے تو اس سے کردار نگاری میں کن ابعاد کا اضافہ ہوتا ہے۔ باقر مہدی اپنے مضمون "راجندر سنگھ بیدی: بھولا سے بیل تک" میں اس نکتہ کو جزئیات کا شاخسانہ بتاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ:۔

> ۔۔۔ معمولی بے بضاعت چیزوں، بے نام چہروں کے کردار، روزانہ کی بے کیفی اور بہ ظاہر بے معنی کشمکش کے انبار سے جزئیات کا انتخاب ایک مشکل امر ہی نہیں بلکہ جرات مندانہ کوشش ہے اور اکثر بیدی ان چیزوں کے اتصال سے خوبصورت افسانہ بنانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ اس کے لئے وہ نگاہ پر فن چاہیئے جو پتھروں میں صنم نو کی دھڑکنوں کا اندازہ لگا سکے۔ اس کے بعد بھی تلاش ختم نہیں ہوتی اس لئے کہ اصل امتحان تو اس کی تراش و خراش کا ہے۔ اس بت تراشی (تکنیک) میں اردو میں بیدی کا کوئی دوسرا ہم سر نہیں۔

تو اس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جس چیز کو باقر مہدی نے جزئیات نگاری کا نام دیا ہے وہ دراصل ان جزئیات سے عبارت ہے جو اپنے آپ میں کوئی بڑی حیثیت نہیں رکھتی اور سوائے کردار نگاری کے کسی اور فنی تکنیک سے، جس کو وہ بت تراشی کا نام دیتے ہیں، اسے وابستہ کرکے معنی خیز نہیں بنایا جاسکتا۔ ہوا دراصل یہ ہے کہ بیدی کے بارے میں حقیقت نگاری، جزئیات نگاری اور کفایت لفظی سے لے کر نفسیاتی ژرف بینی اور انسانی زندگی کے عرفان تک کی باتیں

اتنی بار دہرائی گئی ہے کہ آل احمد سرور، باقر مہدی، وارث علوی، ممتاز شیریں اور نئے نقادوں میں شمس الحق عثمانی کی تنقیدی تحریروں میں بیدی کے افسانوں کا وہ غالب اور کلیدی عنصر جسے کردار کا نام دیا جانا چاہئے، نمایاں نہیں ہو سکا ہے۔ تاہم گوپی چند نارنگ نے شاید سب سے پہلے بیدی کے فن کے استعاراتی اور اساطیری بنیادوں پر سیر حاصل بحث کی تھی۔ اس مضمون میں مثالوں اور ٹھوس اور واضح فنی شہادتوں کی روشنی میں بیدی کے افسانوں کے جن ابعاد کا ذکر کیا گیا ہے اس کے ڈانڈے کرداروں سے جا ملتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

> مشاہدے کے ظاہری پہلو میں باطنی پہلو تلاش کرنے کا یہی تخلیقی عمل رفتہ رفتہ انہیں استعارہ، کنایہ اور اشاریت کی طرف یعنی زبان کے تخلیقی امکانات کو بروئے کار لانے کی طرف لے گیا۔ ان کوششوں کے ابتدائی نقوش دانہ و دام اور گرہن کی کہانیوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایک تو گرہن چاند کا ہے اور دوسرا گرہن اس زمینی چندرما کا جسے عرف عام میں عورت کہتے ہیں، جسے مرد اپنی خود غرضی اور ہوسناکی کی وجہ سے ہمیشہ گہنانے کے درپے رہتا ہے

- - - -

وہ آگے لکھتے ہیں

> بیدی کا تخلیقی عمل چونکہ اس طرح کا ہے کہ وہ اپنے کردار اور تلمیحات کے ذریعے زندگی کے بنیادی رازوں تک پہنچنے کی جستجو کرتے ہیں۔ جبلتوں کے خود غرضانہ عمل، جسم کے تقاضوں اور روح کی تڑپ کو وہ صرف شعور کی سطح پر نہیں بلکہ لاشعوری وابستگیوں اور صدیوں کی گونج کے ساتھ سامنے لاتے ہیں"

بیدی کے افسانوں کا براہ راست مطالعہ کیجئے تو یہ عقدہ اپنے آپ آہستہ آہستہ کھلنے لگتا ہے کہ بیدی کے افسانوں میں کردار، کہانی کی پوری ساخت کی ترکیب میں کیا رول ادا کرتے ہیں؟ افسانوی کردار کا طرز وجود چونکہ حقیقی زندگی کے کرداروں سے الگ ہوتا ہے اس لئے افسانوی کردار خود کار، خود کفیل اور آزاد ہوتے ہیں۔ مگر حقیقت نگاری کا سراغ لگانے والی تنقید افسانوی کردار کو آزاد اور خود کار قرار دینے کے بجائے اس کو نمائندگی کے پیمانوں پر پرکھتی ہے اور اسی طرح فکشن کے کردار کے طرز وجود کو ثانوی انداز کی نمائندگی یا تصور نقل میں محدود کر دیتی ہے اس کا نتیجہ عموماً یہ نکلتا ہے کہ کردار کو حقیقت کا التباس سمجھنے کے بجائے خارجی زندگی کی کسی نہ کسی اصلی حقیقت اور جزئیت کا تابع سمجھ بیٹھتی ہے جس کی مثالیں بیدی پر لکھی جانے والی تنقید میں خصوصیت کے ساتھ زیادہ ملتی ہیں۔ اس قسم کی ایک مثال وارث علوی کے اس خیال

میں بھی دیکھی جاسکتی ہے جس کا اظہار ان کے ایک مضمون میں " بھولا " کے حوالے سے کیا گیا ہے۔

" بھولا کے گم ہونے اور پائے جانے میں قدیم اساطیر کی بھول ، یا خزانہ کی گم شدگی ، تلاش اور یافت کی تھیم ہے ۔ افسانے میں آر کی ٹائپ ہیں ، لیکن انہیں ٹائپ کی مانوسیت ، حقیقت نگاری اور سچائی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے "

بیدی کے افسانوں میں طنز اور مزاح کا جو عمل دخل ہے اور کردار کو نفسیاتی اور داخلی سطح پر برتنے کا جو رجحان واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے ، اس کی پہچان وارث علوی سے بہتر طور پر اور کون کر سکتا ہے ، پھر بھی جب وہ بیدی کے فن کو نفسیاتی حقیقت نگاری کے بجائے اسے خارجی حقیقت نگاری یا سچائی کا نام دیتے ہیں تو یہ بات بوالعجبی کے علاوہ کچھ اور نہیں معلوم ہوتی ۔

راجندر سنگھ بیدی ، جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ ، اپنی کہانی کا پورا ڈھانچہ ہی کرداروں کی مدد سے تیار کرتے ہیں ، اس لئے وہ کرداروں کے طرز وجود کے تعین کی بنیادیں بھی اپنے ٹھوس بیانیہ اور توضیحی طریق کار پر استوار کرتے ہیں ۔ بیانیہ میں راوی ہی دراصل دوسرے کرداروں کی شناخت اور عمل کی نوعیت متعین کرتا ہے ۔ اس لئے بیدی کے یہاں راوی کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا ۔ فکشن میں راوی تین حیثیتوں میں سے کسی ایک حیثیت کے ساتھ نمودار ہوتا ہے یا تو وہ متکلم کی حیثیت سے ہر جگہ موجود ہوگا ، یا کردار کی شکل میں حاضر راوی کے طور پر یا پھر وہ غائب راوی کی حیثیت ہماری نظروں سے مخفی ہو کر بھی ہر جگہ موجود دکھائی دے گا ۔ بیدی کے بیش تر افسانوں میں راوی کا رول غائب روای کا ہے اور معدودے چند افسانوں میں وہ واحد متکلم کی حیثیت سے سامنے آتا ہے ۔ واحد متکلم راوی کی تکنیک میں بیان ہونے والے افسانے جس حد تک راوی کی مداخلت اور تعبیری تشریحات کے خطروں سے دوچار ہوتے ہیں وہ ہماری نگاہ سے مخفی نہیں ۔ مگر بیدی اس تکنیک میں بھی واحد متکلم کو اپنی ذات کا مترادف نہیں بناتے ۔ کہنے کو تو وہ واحد متکلم ہوتا ہے لیکن اصل معنوں ایک ایسا کردار کا روپ اختیار کرلیتا ہے جو بیان کا فریضہ انجام دینے کے ساتھ ساتھ کہانی کے پورے تعامل اور تفاعل میں شریک کار کی حیثیت سے شامل ہو ۔ بیدی کے ہاں واحد متکلم کی تکنیک میں لکھے ہوئے افسانوں کی غور طلب مثالیں بھولا ، گرم کوٹ ، ہم دوش ، حجام الہ آباد کے ، صرف ایک سگریٹ اور جو گیا میں ، ان افسانوں میں بھولا کا مطالعہ زیادہ اہم ہو سکتا ہے کہ یہ ان کے پہلے مجموعے کا پہلا افسانہ بھی ہے اور فنی اعتبار سے بھی اسے ایک ممتاز افسانہ قرار دیا جاتا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ واحد متکلم راوی کی تکنیک میں لکھی جانے والی اس کہانی کا بیانیہ راوی کی تعبیری مداخلت سے محفوظ بھی ہے یا نہیں ؟ یہ کہانی اس طرح شروع ہوتی ہے ۔

"میں نے مایا کو پتھر کے ایک کوزے میں مکھن رکھتے دیکھا۔ چھاچھ کی کھٹاس کو دور کرنے کے لئے مایا نے کوزے میں پڑے ہوئے مکھن کو کنویں کے صاف پانی سے کئی بار دھویا۔ اس طرح مکھن کے جمع کرنے کی کوئی خاص وجہ تھی۔ ایسی بات عموماً مایا کے کسی عزیز کی آمد کا پتہ دیتی تھی"

اگر بیدی چاہتے تو مایا کی شخصیت کے تعارف اور کہانی میں آگے رونما ہونے والے واقعات کی فضا سازی کا سارا بوجھ کہانی کے متکلم راوی (یا بہ الفاظ دیگر اپنے کندھوں پر) پر ڈال سکتے تھے، جو بہ ظاہر آسان طریق کار بھی ہوتا اور محفوظ بھی، مگر بیدی نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے اس کے لئے قرائن کا سہارا لیا، اور یہ کہہ کر کہ "ایسی بات عموماً مایا کے کسی عزیز کی آمد کا پتہ دیتی تھی" قرائن یا صورت حال کی مدد سے کردار اور ممکنہ واقعات کے تعارف کی راہ استوار کر دی ہے۔ بیانیہ کے سلسلے میں بیدی کی احتیاط یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ آگے چل کر اس کی تصدیق کہانی کے مرکزی کردار بھولا، نام کے بچے کے ایک مکالمے: "ننھے بچے نے میرے اس خیال کی تصدیق کر دی، بابا! پرسوں ماموں جی آئیں گے نا" سے کراتے ہیں تاکہ اگر متکلم کی کسی مداخلت کا گمان بھی گزرتا ہو تو وہ بھی رفع ہو جائے۔ اس کہانی میں آگے چل کر ایک مقام پر کہانی سننے کی خاطر بھولا کے اضطراب اور بے چینی کا بیان کئی حوالوں سے سامنے آتا ہے۔ اس سلسلے میں بھی راوی کے بیان سے کام نکالا جا سکتا تھا۔ مگر یہاں بھی بیدی اپنی معروضیت برقرار رکھتے ہیں "یہ تو بھولا ہی جانتا ہوگا کہ اس نے دوپہر کے آنے کا کتنا انتظار کیا ہوگا" ---- اسی طرح جس مقام پر بھولا کی گم شدگی پر واحد متکلم (یعنی اس کے دادا) اور مایا (اس کی ماں) کے غم کے موازنے اور فرق کے اظہار کی صورت پیدا ہو گئی ہے تو اس موقع پر رشتے کی قربت اور دوری کا توازن اس حد تک برقرار رکھا گیا ہے کہ ایک مشفق بزرگ کے غم اور ایک ایسی ماں کے غم میں جس کا شوہر زندہ نہیں اور جس کی واحد آس اب بیٹا ہی ہو سکتا ہے، نمایاں فرق کو نہ صرف شدت یا قلت کے مفہوم میں بلکہ بیانیہ میں راوی کے متوازن رویے کی صورت میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

اس کہانی کے سلسلے میں اس بات کو بھی کردار نگاری کا بالواسطہ وسیلہ قرار دینا چاہئے کہ اس کا راوی باتوں باتوں میں وہ کہاوت بھی کہہ گزرتا ہے جس پر پوری کہانی کا ڈھانچہ استوار کیا گیا ہے۔ "دن کو کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں، اور اب، کوئی راستہ بھولے تو اس کے ذمہ دار تم ہو" ---- یہی کہاوت زیر بحث کہانی کی ریڑھ کی ہڈی بھی ہے اور اسی کے پس منظر میں بھولا کی معصومیت اور توہم اور ذہنی اور خارجی حقائق کے درمیان ایک ایسا ربط بھی پیدا ہو جاتا ہے جو ایک خارجی سچائی کو بھولا کے معصوم تخیل سے ہم رشتہ کرتا ہے اور اس طرح بھولا کے کردار میں ایک نئی جہت کا اضافہ کر دیتا ہے۔

بیدی کے واحد متکلم والے بیانیہ پر مبنی دوسری کہانیوں میں بھی اس احتیاط کے مختلف پیرائے دیکھے جاسکتے ہیں ۔ اور جن کہانیوں میں یہ احتیاط برقرار نہیں رکھی جاسکی ہے، ان میں دوسرے کرداروں کیساتھ خود واحد متکلم بھی ایک کردار کے طور پر موثر نہیں بن پایا ہے اور نتیجے کے طور پر کہانی کو فنی اعتبار سے وہ امتیاز نہیں مل سکا جو بیدی کا خاصہ ہے ۔ اس قسم کی کہانیوں میں حجام الہ آباد کے، اور "ہم دوش" کی مثالیں سامنے کی ہیں ۔

واحد متکلم کی تکنیک میں بیان ہونے والے معدودے چند افسانوں کے علاوہ بیدی کے زیادہ تر افسانے غائب روای کی تکنیک میں لکھے گئے ہیں ۔ جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے کہ غائب راوی کا بیانیہ اپنی تحدید کے باوجود زیادہ معتبر اور زیادہ قابل انحصار ہوتا ہے، اور کیسے نہ ہو کہ اس نوع کے راوی کے بیانات پر اعتبار کرنے کے ماسوا ہمارے لئے کوئی چارہ کار بھی تو نہیں ہوتا شاید یہی سبب ہے کہ بیدی کے نمائندہ افسانے لاجونتی، اپنے دکھ مجھے دیدو، کوارنٹین اور یوکلپٹس اپنی کردار نگاری کے وسیلے سے ہی موضوعاتی، نفسیاتی، استعاراتی اور اساطیری حوالوں کا جواز بھی فراہم کر پاتے ہیں ۔ کردار نگاری کے اس پہلو سے، اپنے دکھ مجھے دیدو اور لاجونتی کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کس طرح مرکزی کردار کے گرد بنے ہوئے تانے بانے کے ساتھ کہانی کی پوری ساخت اور اس ساخت کو تشکیل دینے والے دوسرے کردار، ایک دوسرے سے مربوط اور گتھے ہوئے ہیں ۔

اپنے دکھ مجھے دیدو، کو کسی نے عظیم، کسی نے غیر معمولی اور کسی نے بیدی کا ممتاز ترین افسانہ قرار دیا ہے، اور بجا طور پر اس افسانے کے سلسلے میں حقیقت پسندی سے لے کر اس کی اسطوری جہات تک کی نشاندہی کی گئی ہے ۔۔۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ بیدی نے اس افسانے میں دو بنیادی کرداروں اندو، اور مدن کے تعارف اور توضیح میں کیا انداز روا رکھا ہے اور بیانیہ کے نقطہ نظر سے ان کرداروں کے طرز وجود کو کس انداز میں نمایاں کیا ہے ۔ چونکہ اس کہانی کا راوی کہانی میں حاضر نہیں اس لئے غائب راوی کو حاصل آزادی کا استعمال کر کے وہ اپنے وضاحتی بیانات کا سہارا لیتا ہے، اور ایک ایسی فضا قائم کرتا ہے جس میں کردار کی مختلف صفات اور جہات کو زیادہ سے زیادہ ابھرنے کا موقع مل سکے ۔۔۔ شادی کی پہلی رات کا ذکر ہے، راوی کو مدن کے کردار اور افتاد طبع کا پہلا تعارف کراتا ہے، ایک ایسا تعارف جو اس کردار سے سرزد ہونے والے عمل اور رد عمل کو زیادہ سے زیادہ قابل قبول اور موثر بنا سکے ۔

> "سمندر کی لہروں اور عورتوں کے خون کو راستہ بتانے والا چاند ایک کھڑکی کے راستے اندر چلا آیا تھا، اور دیکھ رہا تھا کہ دروازے کے اس طرف کھڑا مدن اگلا قدم کہاں رکھتا ہے "مدن کے اپنے اندر ایک گھن گرج سی ہو رہی تھی، اور اسے اپنا آپ یوں معلوم ہو رہا تھا

> جیسے بجلی کا کھمبا ہے، جسے کان لگانے سے اندر کی سنسناہٹ سنائی دے جائے گی۔ کچھ دیر یوں ہی کھڑے رہنے کے بعد اس نے آگے بڑھ کر پلنگ کو کھینچ کر چاندنی میں کر دیا، تاکہ دلہن کا چہرہ تو دیکھ سکے۔"

اس اقتباس کا پہلا جملہ ہی چاند کو عورتوں کے خون کو راستہ بتانے والا بتا کر اور اس کے ساتھ سمندر کی لہروں میں تموج پیدا کرنے کی طرف اشارہ کر کے مدن کے بجائے اس اندو کے مثبت رد عمل اور خود سپردگی کی فضا ہموار کر دیتا ہے جس سے مدن کا سامنا اور واسطہ ہے، اور ان ہی الفاظ میں اندو کے کردار کو سمندر کی لہروں سے مماثل دکھا کر اسے ایک وسیع اور کائناتی پس منظر سے ہم آہنگ کر دیا گیا ہے۔ یہاں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ کمرے کے اندر اتر آنے والے چاند کا جو منظر پیش کیا جا رہا ہے وہ اندو کے لفظی معنی یعنی پورا چاند سے تقابل اور موازنے کی صورت پیدا کر دیتا ہے۔ اندو، اندو ہے اور باہر آسمان پر چاند اور بتایا یہ جا رہا ہے کہ "چاند ایک کھڑکی کے راستے اندر چلا آیا تھا"۔ اس طرح باہر کا خارجی حوالہ کمرے کے اندر کے معنوی حوالے سے مربوط ہو گیا ہے اور ساتھ ہی اندر کی حسی اور معنوی صورت حال اور باہر کے منظر یا خارجی مظہر کے درمیان معنوی تلازمہ خیال کا رشتہ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ مگر یہ تلازمے تو اندو سے وابستہ ہیں، پھر مدن اس فضا سے کیوں کر ہم آہنگ ہوتا ہے تو اس کی وضاحت "مدن کے اپنے اندر ایک گھن گرج سی ہو رہی تھی اور اسے اپنا آپ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے بجلی کا کھمبا ہے، جسے کان لگانے سے اندر کی سنسناہٹ سنائی دے جائے گی" سے ہو جاتی ہے۔ انسانی شخصیت پر پورے چاند کی روایتی اثر اندازی، اندو کے نام کی معنویت اور مدن کی جذباتی سنسنی خیزی، سارے عناصر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک ایسے آہنگ کو تشکیل دیتے ہیں جس میں انسان اور کائنات، داخل اور خارج اور کردار پر اثر انداز ہونے اور صورت حال کو اپنے عمل سے اثر پذیر بنانے کا عمل ایک کثیر الجہات پیکر کی صورت شامل ہو گیا ہے، اور اس طرح یہ آہنگ، یہ پیکر، اندو اور مدن کی کردار نگاری کے پورے ارتقا کا پس منظر اور جواز بھی بن گیا ہے----- لیکن یہ کہانی جوانی کے جوش اور ابال پر مبنی کہانی تو ہے نہیں----- اس لئے شادی کی پہلی رات کے پس منظر کو زیادہ طول نہیں دیا گیا اور اندو کی طرف سے مدن کے لیے "اپنے دکھ مجھے دے دو" کا دور رس اور بہت سی توقعات وابستہ کرنے والا فقرہ ادا کرا کے اندو کو ایک بہو، ایک بیوی اور ایک ایسی گھریلو عورت کے روپ میں تبدیل کر دیا گیا ہے جو اپنے دکھ مجھے دے دو، جیسے جملے سے وابستہ توقعات کی عملی تصویر بن سکے۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اندو کا کردار صرف ایک ایسے نسائی معروض کا اثبات نہیں کرتا جس کو محض گھریلو عورت کا نام دے دیا جائے بلکہ اس حساس نوخیز عورت کا بھی جس نے اپنی ازدواجی زندگی جوانی کے بھرپور طمطراق کے ساتھ شروع کرنے کے باوجود، اپنے کئے ہوئے وعدے کے ایفا کے طور پر اپنی جوانی کی پکار پر لبیک کہنے کے بجائے اپنے

فرائض کی سنگلاخ زمین پر مضبوطی سے اپنے قدم جمائے ہیں۔ مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ اس کی کردار نگاری میں اندو کی مخصوص شناخت کو کہیں گم کر دیا گیا ہو۔ دو خواہ بیوی کی حیثیت سے اپنے جذباتی اظہار کے ساتھ بار بار نمودار نہ ہوتی ہو مگر اس کے دوسرے جذبے اس کی انفرادی پہچان تو ہر موڑ اور ہر مقام پر برقرار ہیں۔ مدن کے باپ سے غیر معمولی انسیت اور محبت کے باوجود اس کے انتقال پر اندو کے غم کا اظہار اپنے شوہر کی ممکنہ موت کے غم سے بالکل مختلف ہے۔

"اندو نے منھ نوچ نوچ کر، سر اور چھاتی پیٹ پیٹ کر خود کو نیلا کر لیا۔ مدن کے سامنے وہی منظر تھا جو اس نے تصور میں اپنے مرنے پر دیکھا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اندو نے چوڑیاں توڑنے کے بجائے اتار کے رکھ دی تھیں۔ سر پر راکھ نہیں ڈالی تھی لیکن زمین پر سے مٹی لگ جانے اور بالوں کے بکھر جانے سے چہرہ بھیانک ہو گیا تھا۔ لوگو میں لٹ گئی، کی جگہ اس نے ایک دلدوز آواز میں چلانا شروع کر دیا تھا "لوگو! ہم لٹ گئے"۔۔۔

جذبے کے حوالے سے کردار نگاری کی کم و بیش یہی تفریق اور جذبات کے اظہار کا نازک اور باریک فرق جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، بیدی کے افسانے "بھولا" میں بھی ایک جگہ ملتا ہے، جہاں بھولا کا دادا اس کی ماں کو "بھولا" کے بستر سے غائب ہونے کی اطلاع دیتا ہے۔

"مایا! ہم لٹ گئے، میں نے اپنا سر پیٹتے ہوئے کہا — مایا، ماں تھی۔ اس کا کلیجہ جس طرح شق ہوا یہ کوئی اسی سے پوچھے۔ اپنے سہاگ لٹنے پر اس نے اتنے بال نہ نوچے تھے جتنے کہ اس وقت نوچے۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا اور دیوانوں کی طرح چیخیں مار رہی تھی۔۔۔۔۔ میں نے گھوم کر دیکھا، مایا بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھ اندر کی طرف مڑ گئے تھے۔ نسیں کھینچی ہوئی اور آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں"۔

اس منظر میں اندو کے غم کے برخلاف بھولا کی گمشدگی پر اس کی ماں مایا، اور اس کے دادا کے اظہار غم کے فرق کو بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

اپنے دکھ مجھے دیدو، میں اندو کے کردار کے مختلف روپ کو مکالمات، توضیحات اور بیانات کی سطحوں پر مستحکم کرنے کے بعد اس کے ان پڑھ ہونے اور غیر تکلفی انداز میں زندگی کا عرفان حاصل کرنے کا ذکر اس کہانی میں کئی مقامات پر آیا ہے۔ مگر ایسا بھی نہیں کہ بیدی اس کردار کو کسی تاثراتی اور تعبیری نقص سے بالکل ہی بچالے گئے ہوں۔ کہانی کے اختتام پر جب اندو، مدن کو اپنے نسائی جتن سے پھر ایک بار اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور اس بات کی شکایت کرتی ہے کہ "مدن نے اگر شادی کی رات اس سے اس کے سکھ مانگ لئے ہوتے تو

وہ مدن کو اپنی گرفت سے کبھی نہ نکلنے دیتی"۔

"۔۔۔ اور کچھ دیر بعد بولی، اب تو میرے پاس کچھ نہیں رہا، ۔۔۔ مدن کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ زمین میں گڑ گیا۔ یہ ان پڑھ عورت" کوئی رٹا ہوا فقرہ ۔۔۔ نہیں تو یہ تو ابھی سامنے ہی زندگی کی بھٹی سے نکلا ہے۔ ابھی تو اس پر برابر ہتھوڑے پڑ رہے ہیں اور آتشیں برادہ چاروں طرف اڑ رہا ہے"۔

ظاہری طور پر خوبصورت دکھائی دینے والا یہ تبصرہ افسانہ نگار کی تعبیری مداخلت کا وہ نمونہ ہے جو اپنی رنگینی کے باعث کردار نگاری کے متذکرہ نقص پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی جس بھٹی میں اندو تپ کر نکلتی ہے اور اپنی وجودی شرائط کے ساتھ جس طرح کا تجویہ کر کے زندگی گزار رہی ہے وہ اپنے آپ میں زندگی کی بھٹی سے نکلنے کی شہادت بن جاتی ہے۔ اس لئے یہ تبصرہ غیر ضروری اور ضرورت سے زیادہ آورش وادی ہونے کے ساتھ بیانیہ کے اعتبار سے ایک نقص بن کر رہ گیا ہے۔ کچھ اسی قسم کی مثال بیدی کے افسانے لاجونتی میں بھی ملتی ہے۔ جب لفظ لاجونتی یا چھوئی موئی کے پودے کے بارے میں پنجابی گیت کے ایک مصرع کو سرنامہ بنانے اور اس کے ہاتھ لگانے پر کمہلانے کا ذکر کرنے کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ مغویہ عورتوں کو دل میں بساؤ پروگرام کو حرکت میں لانے کے لئے سندر لال بابو کو کمیٹی کا سکریٹری چن لیا جاتا ہے۔

"محلے کے معتبر لوگوں کا خیال تھا کہ سندر لال سے زیادہ جانفشانی کے ساتھ اس کام کو کوئی اور نہ کر سکے گا۔ شاید اس لئے کہ سندر لال کی اپنی بیوی اغوا ہو چکی تھی اور اس کا نام تھا بھی لاجو۔ لاجونتی"۔

یہ آخری جملہ کہ اس کا نام تھا۔ لاجو۔ جس میں اس کا نام لاجو تھا، کے بجائے "بھی" کے لفظ کا اضافہ کر کے اس کے نام کو فطری یا اتفاقی بنانے کے بجائے کہانی کے سرنامے سے نہایت بلند آہنگ طور پر اور دانستہ طور پر وابستہ کر دیا گیا ہے، جب کہ اتفاقی طور پر اس کے لئے "لاجونتی" ہونے سے زیادہ بہتر اور غیر مداخلتی انداز میں یہ تاثر زیادہ شدید طور پر ابھر سکتا تھا ۔۔۔ افسانہ نگار سے اس کے ایک ایک لفظ کا حساب مانگنا بہت مناسب بات تو نہیں مگر جب کردار نگاری ہی کو اپنے افسانوی فن کا نعم البدل بنا کر دکھانے والے بیدی جیسے کسی غیر معمولی فن کار کا معاملہ زیر بحث ہو تو اس کی کاریگری کو متاثر کرنے والا ایک لفظ بھی خاصی اہمیت کا حامل بن جاتا ہے ۔۔۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ "لاجونتی" میں لوک گیت کے حوالے سے قائم ہونے والا یہ کردار جس طرح اپنے طرز وجود کا اثبات کہانی کی ابتدا میں کرتا ہے اس کے باعث پوری کہانی کا ایک ایک موڑ اور ایک ایک فقرہ اس کی صرف تصدیق ہی نہیں کرتا بلکہ کردار نگاری کے جوہر مزید کھولتا چلا

جاتا ہے۔

لاجو کے کردار کے وصفیہ جملوں میں تعارف کا جو انداز اختیار کیا گیا ہے اس کے ایک ایک لفظ کے انتخاب میں آگے پیش آنے والے واقعات، بحران اور جذباتی تصادم کا جواز موجود ہے:

"اور لاجو ایک پتلی شہتوت کی ڈالی کی طرح نازک سی دیہاتی لڑکی تھی۔ زیادہ دھوپ دیکھنے کی وجہ سے اس کا رنگ سنولا چکا تھا۔ طبیعت میں ایک طرح کی بے قراری تھی، اس کا اضطراب شبنم کے اس قطرے کی طرح تھا جو پارہ کر اس کے بڑے پتے پر کبھی ادھر اور کبھی ادھر لڑھکتا رہتا ہے۔"

یہ وہ لاجونتی ہے جس کی حسی اور جذباتی شناخت کو پورے افسانے کا مرکزی نکتہ بنایا گیا ہے۔ اس شناخت کی بنیاد ایک تو اس کی نزاکت ہے جس کی توضیح دھوپ سے اس کے رنگ کے سنولانے کے بیان سے اگلے ہی جملے میں کر دی گئی ہے، اور دوسری بنیاد اس کا اضطراب اور بے قراری ہے جس کی وضاحت شبنم کے قطرے کی تشبیہہ سے ہو گئی ہے۔ یہی سبب ہے کہ لاجونتی کے اس "وصفیہ" کی مزید تصدیق ذرا ہی آگے بڑھنے کے بعد اس تفصیل سے ہو جاتی ہے کہ

"بڑی سے بڑی لڑائی کے بعد سندر لال کے ایک بار مسکرا دینے پر وہ اپنی ہنسی روک نہ سکتی اور لپک کر اس کے پاس چلی آتی اور گلے میں بانہیں ڈال کہہ اٹھتی "پھر مارا تو میں تم سے نہیں بولوں گی"۔

لاجونتی کے ساتھ سندر لال کا کردار بھی ذاتی اور جذباتی اعتبار سے کچھ کم کمزور نہیں۔ سندر لال کو جب لال چند کے ذریعہ لاجونتی کا سراغ ملتا ہے تو اس موقع پر اس کا ردعمل اس کمزوری کو زیادہ نمایاں کر دیتا ہے،

"سندر لال کا سارا جسم ایک انجانے خوف، ایک انجانی محبت اور اس کی مقدس آگ میں پھنکنے لگا۔ اس نے لال چند کو پکڑ لیا اور پوچھا ---- لاجو واگہ کیسے پہنچ گئی؟"

یا یہ کہ سندر لال کے امید و بیم کے درمیان تعلق ہونے سے متعلق یہ بیان کہ:

"اور سندر لال کہیں دور دیکھنے لگا۔ شاید سوچنے لگا۔ لاجو آئی بھی پر نہ آئی، اور سندر لال کی شکل سے جان پڑتا تھا جیسے وہ بیکانیر کا صحرا پھاند کر آیا ہے، اور اب کسی درخت کی چھاؤں میں زبان نکالے ہانپ رہا ہے، منھ سے اتنا بھی نہیں نکلتا، ذرا پانی دے دو"

سندر لال کی شدت احساس اور جذباتیت کا جو اندازہ اس کے قیافہ اور قرائن سے لگایا گیا

ہے وہ کردار نگاری کے وسیلے کے طور پر ایک ایسا معروضی طریق کار بن جاتا ہے جو راوی کو کردار پر غالب ہونے کے الزام سے بھی محفوظ رکھتا ہے اور جذبات نگاری کی ساری ذمہ داری صورت حال اور چہرے بشرے سے ادا ہو جاتی ہے۔ سندر لال کی سوچ کا رخ کیا ہے؟ اس پر بھی راوی اپنا حتمی بیان دینے سے گریز کرتا ہے "اور شاید سوچنے لگا" جیسا جملہ لکھ کر کردار کی سوچ کو قطعیت کے بجائے امکانیت کے سیال پیرائے میں تبدیل کر دیتا ہے۔

اس افسانے کے نقطہ عروج کے طور پر سندر لال کی غیر فطری اور غیر متوقع انسانیت اور شرافت لاجونتی کو کیسے کیسے شبہات اور اندیشوں سے گزارتی ہے۔ اس کی ماہرانہ پیش کش ہی دراصل اس کردار کے اسم بامسمّی ہونے اور کردار نگاری کے لحاظ سے داخلی اور خارجی لوازم سے مربوط، بھرپور اور مکمل ہونے کی ضمانت بن جاتی ہے۔

> "وہ خوش تھی، بہت خوش۔ لیکن ایسی خوشی میں سرشار، جس میں ایک شک تھا اور وسوسے۔۔۔ جب بہت دن بیت گئے تو خوشی کی جگہ پورے شک نے لے لی۔ اس لئے نہیں کہ سندر لال بابو نے پھر وہی پرانی بدسلوکی شروع کر دی تھی بلکہ اس لئے کہ وہ لاجو سے بہت ہی اچھا سلوک کرنے لگا تھا۔ جس کی لاجو متوقع نہ تھی۔۔۔ وہ سندر لال کی وہی پرانی لاجو ہونا چاہتی تھی۔۔۔ سندر لال نے اسے محسوس کرا دیا جیسے وہ۔ لاجونتی۔ کانچ کی چیز ہے جو چھوتے ہی ٹوٹ جائے گی۔ اور لاجو آئینے میں اپنے سراپا کی طرف دیکھتی اور آخر اس نتیجے پر پہنچتی کہ وہ اور تو سب کچھ ہو سکتی ہے، پر لاجو نہیں ہو سکتی"

لاجونتی کی کردار نگاری کا یہ وہ بنیادی نکتہ ہے جو پنجابی گیت یا مصرع سے آغاز و اختتام پانے والی کہانی کو ایک غنائیہ میں تبدیل کر دیتا ہے۔ لاجو کے کردار کی یہ داخلی کشمکش نہیں تو اور کیا ہے کہ وہ، شوہر سے اپنے پرانے رشتے کی توثیق کبھی سندر لال کے برتاؤ سے کرنا چاہتی ہے اور کبھی آئینے سے اپنے خدوخال کی پہچان متعین کرانے کی کوشش کرتی ہے، مگر اپنے وجود کے اثبات میں سارے ظاہری اور رسمی ثبوت اور تمام شہادتوں کے باوجود اسے اپنا جذباتی حوالہ، اس کی اپنی پہچان کہیں نہیں ملتی۔ تو ظاہر ہے کہ تم، اور آپ کے لفظوں سے پکارے جانے کے فرق کو حرزِ جاں سمجھنے والی لاجونتی، لاجو یا مظلوم لاجو کے بجائے دیوی کے روحانی اور ماورائی نام اور برتاؤ سے مطمئن بھی کیوں کر ہو سکتی ہے؟ لاجونتی کے کردار کا یہ نفسیاتی تجزیہ محض نفسیاتی تجزیہ نہیں بلکہ یہ تجزیہ اپنے خارجی حوالوں کی موجودگی کے باعث تلازمہ خیال کی تکنیک کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ منطقی بیانیہ کے پیرائے کو اپنانے کے باوجود بیدی اپنے کرداروں کی تشکیل میں بالواسطہ طرزِ اظہار کے بعض وسیلوں کے استعمال سے کیوں کر نئی جہات کا اضافہ

کر دیتے ہیں ۔ اور یہی وہ طریق کار ہے جو ان کے بیانیہ کے راوی کو، خواہ وہ متکلم راوی ہو، حاضر راوی یا غائب راوی، کرداروں کی سوچ اور عمل پر غالب اور حاوی نہیں ہونے دیتا ۔

بیدی، اپنے افسانوں میں کردار کے رول کے تعین کے لئے بیانیہ کی تکنیک کو کس قدر کارآمد اور غیر جانب دار بنادیتے ہیں اس کا اندازہ تجزیئے کے عمل سے گزرنے والے ان کے چند نمائندہ کرداروں کے مطالعے سے لگایا جاسکتا ہے ۔ لیکن وہ بیانیہ کے ہنرمندانہ استعمال کے علاوہ بھی بعض دوسری نئی تدابیر اختیار کرتے ہیں ۔ ان فنی تدبیروں میں ثقافت اور تمدن کے وہ حوالے بھی شامل ہیں جن کی بدولت ان کے افسانے، ثقافتی اور تمدنی مسائل کی پیش کش بن کر نہیں رہ جاتے ۔ بلکہ روایتی اور ثقافتی محرکات سے تخلیقی عمل کے آغاز کی مثالیں پیش کرتے ہیں بیدی ۔ روایت اور ثقافت اور سماج کے اجتماعی حافظے سے آرکی ٹائپ ، اساطیر ، استعارے اور ضرب الامثال کا انتخاب کرتے ہیں اور اس ذخیرے کو کردار کے پس منظری استعارے کا متبادل بنادیتے ہیں ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو " بھولا " جیسی ممتاز کہانی صرف ایک لوک کہاوت پر قائم ہو کر فلسفیانہ اور فنی اعتبار حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوپاتی ۔ گرہن ، بقول ڈاکٹر نارنگ عورت کے مقدر کی تمثیل نہ بن جاتی اور بولکیپس اور لاجونتی اپنے ناموں کے معنوی تلازمات کی بنیاد پر کردار نگاری کے نئے ابعاد سے آشنا نہ ہوپاتی ۔

بیدی کی کہانیوں میں زبان کے غیر آرائشی استعمال کا جواز بالعموم ان کے موضوعات اور ان سے متعلق ٹھوس اور کھردری حقیقت کی ترسیل میں تلاش کیا جاتا ہے ۔ جب کہ زبان تو زبان بیدی کے کرداروں کی آواز اور لہجہ تک کردار نگاری کے عمل میں شریک رہتے ہیں اور ان کا سب سے عمدہ استعمال مکالموں کی صورت میں ہوتا ہے ۔ جس کی چند مثالیں بیانیہ میں مکالموں کی نوعیت ظاہر کرنے والے مکالمات کی شکل میں آپ کے سامنے آچکی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ بیدی اپنے کرداروں کو منفرد اور دوسرے کرداروں سے مختلف بنانے کی خاطر تقابلی طریق کار کا بھی استعمال کرتے ہیں ۔ اس طریق کار کے نمونے یوں تو ان کے متعدد افسانوں میں دیکھے جاسکتے ہیں مگر من کی من کے مادھو اور کلکارنی کے کردار اور کوارنٹین کے ڈاکٹر اور بھاگو کے کردار کی تقابلی اور قدرے مختلف اور متضاد صفات، اس تدبیر کاری کی نمائندہ مثالیں ہیں ۔

کردار کے بارے میں تعارف، ارتقا، اور نقطہ عروج کا وہ پرانا تصور جس میں حالات و واقعات کو کردار کے شخصی اور صفاتی ارتقا کا ذریعہ قرار دیا جاتا تھا، بیدی کے سیاق و سباق میں زیادہ کارآمد پیمانہ نہیں بن پاتا، اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ بیدی کے کردار اپنے آغاز سے ہی اتنے سادہ لوح نہیں ہوتے کہ ان کے دل و دماغ کی تختی پر ہر صورت حال اثر انداز ہی ہوجائے ۔ یوں تو بیدی کے افسانوں میں کرداروں پر واقعات کے اثر انداز ہونے کی مثالیں بھی یقیناً ملتی ہیں ۔ مگر ایسے افسانے بھی کم نہیں جن کے واقعات پر ان کے کردار نہ اثر انداز ہوئے

ہوں ۔ اس لئے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں ان کی کہانیوں میں کردار اور واقعات دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ بیدی کے ہاں واقعات کے پس منظر میں موجود نقطہ نظر کی ساری ندرت اور ساری بصیرت کردار کے سہارے سفر کرتی ہے ۔ اور اسی مرکزی کارکردگی کے باعث کردار نگاری بیدی کی مجموعی فنی کارکردگی کا نعم البدل بن جاتی ہے ۔

چودھری محمد علی ردولوی

کمال اور شہرت لازم و ملزوم نہیں، شہرت کے اسباب ہی کچھ اور ہوتے ہیں، کچھ داخلی اور اختیاری، کچھ خارجی اور غیر اختیاری۔ کتنے باکمال ایسے ہیں جو شہرت سے یکسر محروم ہی رہ جاتے ہیں۔ شعر و ادب کی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہیں۔ انہیں میں ایک مثال چودھری محمد علی کی ہے۔ بڑی پیاری زبان لکھنے والے، مگر گمنامی میں پڑے ہوئے۔ ایک نہیں، کئی ایک چھوٹی بڑی کتابوں کے مصنف، مگر سب گمنامی میں پڑی ہوئی۔ اتنی شستہ، سلیس، بامحاورہ نستعلیق زبان کم ہی لوگ لکھ سکتے ہیں۔

ذاتی زندگی میں بڑے ہی زندہ دل، ظریف، دل لگی باز تھے۔ روتے ہوؤں کو ہنسا دینے والے۔ ہر موضوع پر بہترین گفتگو کرنے والے تھے۔ اور انکی انشاپردازی لفاظی کے مترادف نہ تھی۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے، صاحبِ علم و معلومات تھے۔ انگریزی ادب و علوم کا مطالعہ اچھا خاصا وسیع۔ کالون تعلقدار اسکول لکھنؤ کے پڑھے لکھے ہوئے۔ لہجہ و تلفظ انگریز استادوں سے سیکھے ہوئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد صاحبِ الہلال ایک بار غالباً ۱۹۱۷ء میں لکھنؤ آئے اور غریب خانے پر کھانے تشریف لائے۔ اس وقت شہرت یہی تھی کہ ان سے گفتگو میں کوئی شخص ٹھہر نہیں سکتا اور وہ اپنے ہر مخاطب کو دبا ڈالتے ہیں، "مقابلے" کےلیے چودھری صاحب ڈھونڈ نکالے گئے، اور کھانے پر جب گفتگو چھڑی، اور لطائف و ظرافت کی بازی لڑی تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ جوڑ برابر کی ہے۔

[بشکریہ "معاصرین" مصنف: مولانا عبدالماجد دریاآبادی]

انیس اشفاق

تعبیرِ متن اور منشائے مصنف

"دوسروں کے سامنے اپنی کتاب کی تشریح سے قبل میں اس کے بارے میں خود ان کی تشریح کا انتظار کرتا ہوں۔ پہلے سے کتاب کی تشریح کر دینا اس کے مفہوم کو محدود کر دیتا ہے۔ کیوں کہ اگر ہم یہ جانتے بھی ہوں کہ ہمیں کیا کہنا ہے تو ہمیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ ہم نے صرف وہی بات کہی ہے۔ اس لیے کہ ہمیشہ اس سے کچھ زیادہ ہی کہہ دیا جاتا ہے۔ اور مجھ کو اسی بات میں دل چسپی رہتی ہے جو میں نے انجانے میں کہہ دی ہے۔ یہ تحریر کا وہ غیر شعوری عنصر ہے جسے میں منجاب اللہ کہنا پسند کروں گا۔ کتاب ایک مشارکت کا کام ہے اور اس کی قدر و قیمت جتنی بڑھتی جائے گی اتنا ہی اس میں مصنف کا عمل دخل کم ہوتا جائے گا۔ ہم فطرت کی ہر چیز سے توقع کرتے ہیں کہ وہ آپ اپنا اظہار کرے گی لہٰذا ہمیں یہ توقع کرنے دیجئے کہ ہماری کتاب قاری کے ذریعے اپنا اظہار کرائے"

آندرے ژید

مصنف کی ایک ابتدائی تحریر Paludes کے پیش لفظ سے

مفتش متن ژاک دریدا کا یہ مقولہ "متن ہی سب کچھ ہے متن کے سوا کچھ بھی نہیں" متن کی تفتیش کے لیے بے پناہ اہمیت کا حامل ہونے کے باوجود اردو میں تعبیرِ متن کی روایت کی رو سے غور طلب ہے۔ اس لیے کہ ہمارے شارحین یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کسی زمانے میں اس طرح کے مقولے کو بھی وضع کرنے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ان لوگوں نے ماسبق شعرا کی تعبیروں میں متن ہی کو اہم جانا تھا اور تشریحِ شعر میں کبھی متن سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ نکال بھی نہیں سکتے تھے اس لیے کہ متن سے باہر بقول دریدا کچھ جی نہیں ہے۔ یعنی متن ہی متن کا حوالہ ہے۔

ہوتا یہ آیا ہے کہ جب کسی طریقہ کار کو نظریے کا نام مل جاتا ہے تو طریقہ کار پس منظر میں چلا جاتا ہے، نظریہ فروغ پا جاتا ہے اور اصطلاح مشہور ہو جاتی ہے۔ گویا پیش منظر میں آجانے والی شے پس منظر میں رونما ہوتی رہنے والی شے کو فراموش کر دیتی ہے اور ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ

نظریے اور اصطلاح کے نام سے منظر عام پر آنے والی شئے ایک زمانے سے ہمارے سامنے موجود ہے اگرچہ ہم نے اسے کوئی نام نہیں دیا تھا نہ اسے کسی فلسفیانہ نظام میں ڈھالنے کی زحمت اٹھائی تھی۔ جہاں تک تعبیر شعر کا تعلق ہے اس زحمت کا اٹھانا ضروری بھی نہیں تھا اس لیے کہ یہ زحمت اٹھائے بغیر ہم بڑی حد تک وہ کام انجام دے رہے تھے جسے انجام دینے کے لیے آج ہم نے بغیر متن کے جدید فلسفے کا سہارا لیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ فلسفہ ہمارے لیے کارآمد نہیں ہے اس فلسفے نے زبان سے معنی اخذ کرنے کی سارے ممکنہ زاویوں کو روشن کیا ہے اور متن کی ماہیت پر ایک نئی اور معنی خیز گفتگو کا آغاز کیا ہے۔ اس فلسفے کی بدولت ہم شرح کے ان طریقوں کی تنظیم و ترتیب کی طرف متوجہ ہوئے ہیں جو اب تک بغیر کسی نام کے بروئے کار لائے جاتے رہے تھے۔

لفظ کی معنوی قوت کو سمجھنے اور اس کی وسعت کا احاطہ کرنے کا عمل ہمارے یہاں شروع ہی سے بہت شدید رہا ہے۔ شرح نگاروں کی بات تو الگ رہی خود شاعروں نے اس پہلو کی طرف واضح اشارے کیے ہیں:

طرفیں رکھے ہے ایک سخن چار چار میر — میر

گل کتروں ہوں سو رنگ سے میں طرز سخن میں — قائم

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے — غالب

تحقیق آنست کہ لفظ علامت است مقصود بالذات — عرفی

کیا ان قولوں میں متن کے بنیادی معنی کا انکار کرنے اور منشائے مصنف کو مسترد کرنے کا اشارہ نہیں ہے۔ راقم الحروف متن کے بنیادی معنی پر اصرار اور منشائے مصنف کی بحث کے بے حاصل ہونے پر اپنے ایک طویل مضمون بعنوان "علامت" (مطبوعہ جواز ۱۹۸۰) میں بہت پہلے تفصیل سے روشنی ڈال چکا ہے۔ متن میں ایک سے زیادہ معنی کا موجود ہونا ہی متن کے بنیادی معنی اور منشائے مصنف کو مسترد کرنے کا بدیہی ثبوت ہے۔ جب یہ فیصلہ کرنا ہی مشکل ہے کہ مصنف کا منشا کیا تھا۔ تو یہ حکم لگانا بھی بے معنی ہے کہ مصنف کا منشا یہ تھا۔ ہرمن میلول نے موبی ڈک کے سلسلے میں جب مسز ہاتھورن کے ایک خط کے جواب میں کہا تھا۔

> "spirit spout" کے لیے آپ کی تلمیح نے مجھے پہلی بار سمجھایا کہ اس میں ایک پراسرار مفہوم ہے درحالیکہ یہ میرا مدعا نہیں تھا۔ اسے لکھتے وقت میرے ذہن میں ایک بہت دھندلا خیال تھا۔

پوری کتاب اور ان کے حصوں میں تمثیلی ساخت کی گنجائش ہے لیکن مخصوص ضمنی تمثیلوں میں بہت سوں کی خصوصیت مسٹر باقورن کا خط پڑھنے کے بعد مجھ پر پہلی واضح ہوئی"

تو میلول اپنے اصل معنی کو پس پشت ڈال کر اس میں سے برآمد ہونے والے نئے معنی کا خیر مقدم کر رہا تھا۔ یعنی اپنی تصنیف میں اپنا اصل مفہوم رکھنے کے باوجود وہ دوسرے مفاہیم کو قبول کرنے کے لیے مجبور تھا اس لیے کہ یہ مفاہیم اس کی بنائی ہوئی زبان میں موجود تھے۔

تشبیہ، استعارہ، پیکر، تمثیل، علامت اور تلمیح پر مشتمل تخلیقی زبان کسی ایک معنی تک محدود رہ بھی نہیں سکتی۔ تخلیقی زبان کے اسی وقف کی بنا پر اس زبان کے عمل کو سمجھنے اور اس کے معنوی امکانات تک پہنچنے کے لیے شبلی، حالی اور مسعود حسن رضوی نے طرح طرح سے اس کی وضاحتیں کیں۔ انہیں وضاحتوں نے ہمیں تفہیم شعر کا سلیقہ عطا کیا۔ "ہماری شاعری" تک پہنچتے پہنچتے زبان کی معنویتوں کا تقریباً ہر پہلو سے احاطہ کیا جا چکا تھا۔ اچھا ہوگا کہ مسعود حسن رضوی نے اس ضمن میں ہماری شاعری کے معیار و مسائل کی بحث میں جو خاص خاص باتیں کہی ہیں انہیں ایک جگہ پر جمع کر کے دیکھ لیا جائے:

"ایک ایک لفظ انسان کے ذہن کو بے شمار خیالوں کی طرف منتقل کر سکتا ہے ---- [شاعر کا خاص رنگ] شاعر کے انداز فکر اور اسلوب بیان کا مجموعہ ہوتا ہے ---- اگر خیالات کے ایک سلسلے میں سے ایک کڑی حذف کر دی جائے تو ذہن اسے بآسانی خود فراہم کر لیتا ہے ---- شاعر کا مفہوم اس کے لفظوں سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ وہ کوئی خاص واقعہ یا حالت یا کیفیت دیکھتا ہے یا اس کا تصور کرتا ہے اور اس کے چند نمایاں پہلو ایسے لفظوں میں بیان کر دیتا ہے جو سننے والے کے ذہن کو ان تمام تفصیلوں تک پہنچا دیتے ہیں جنہیں شاعر نے چھوڑ دیا تھا ---- اردو کا ایک شعر کہاں کہاں نقل کیا جاتا ہے اور ہر جگہ ایسا ٹھیک بیٹھتا ہے گویا وہ جگہ اسی کے لیے خالی تھی یہ خوبی تمثیلی الفاظ کی بدولت حاصل ہوتی ہے"

مختلف عنوانوں کے ماتحت تقریباً ۱۴۰ شقوں پر مشتمل اس کتاب میں کسی الجھاوے اور پیچیدگی کے بغیر تعبیر شعر کے سلسلے میں جو کارآمد باتیں کہی گئی ہیں ان میں سے بعض کا خلاصہ آپ کے سامنے ہے۔

ان بیانات میں شعر میں کثرت معنی کا ہونا یعنی مصنف کے مدعا سے کوئی سروکار نہ رکھنا، موضوع بیان اور اسلوب بیان کا ایک ہونا جزو مقدور کے ذریعہ معنی محذوف کا پالینا اور تمثیلی

علامتی الفاظ کی بنا پر شعر کے اطلاقات کے دائرے کا وسیع تر ہونا شامل ہے۔ ہمارے شرح نگاروں نے تفہیم شعر کے مرحلے میں تعین قدر کا کام انجام نہیں دیا تھا یعنی انہوں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ شعر کا مفہوم یا اس کی معنوی صورت کن کن دنیاوی وقوعوں یا صورتوں پر کس کس طرح منطبق ہو سکتی ہے۔ گویا انہوں نے شعر کی تعبیر کو تنقید کی حیثیت عطا نہیں کی اور شعر کے مفہوم سے قدر کی تفہیم کا کام نہیں لیا۔ یہ کام کچھ کچھ مسعود حسن رضوی نے کیا۔ ڈاکٹر نیر مسعود پروفیسر گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمن فاروقی نے مختلف طریقوں سے اسے الگ الگ راستوں پر آگے بڑھایا۔

تعبیر متن کی اس روایت کو سامنے رکھ کر آیئے دیکھیں کہ متن سے معنی اخذ کرنے کی کیا کیا صورتیں ممکن ہیں اور شعر کے معنوی امکانات کس کس طرح منور ہو سکتے ہیں۔ ایک شعر کا مضمون کتنے معنوی تاثرات پیدا کر سکتا ہے اور ان معنوی اثرات کے قائم ہونے میں شعر کے متعلقات و متعلقات کیا کیا کردار ادا کر سکتے ہیں نیز ایک شعر کن کن معنوی اقدار کی ترجمانی کر سکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ہم آئینے سے متعلق درد کے دو شعروں تک اپنی گفتگو کو محدود رکھتے ہیں

پہلا شعر:

طلسم ہستی موہوم دل پر سخت پتھر ہے
بسان عکس آئینہ مجھے سد سکندر ہے

درد

شعر کے مطالب کو روشن کرنے کے لیے شعر میں مستعمل الفاظ اور ان کے مناسبات پر غور کیجئے۔ یہ مناسبات اس طرح ہیں: طلسم اور آئینہ، طلسم اور پتھر، ہستی موہوم اور عکس، طلسم اور سد سکندر، پتھر اور آئینہ، سد سکندر اور آئینہ، دل اور آئینہ۔ اب ہمیں ان مناسبات سے پیدا ہونے والے نکات کو دیکھنا چاہیے:

طلسم اور آئینہ: طلسم اور آئینے کا تعلق یہ ہے کہ آئینہ بھی طلسم کے لوازم میں سے ہے اور طلسمات وغیرہ میں آئینہ ناموجود اشیا کا عکس پیش کرتا ہے۔

ہستی موہوم اور عکس: کی مناسبت یہ ہے کہ عکس بھی غیر مجسم اور فرضی ہوتا ہے اور ہستی موہوم کا بھی حقیقتاً کوئی وجود نہیں ہوتا۔

طلسم اور سد سکندر: سد سکندر کو لوہے، پتھر اور تانبے کی آمیزش سے بنایا گیا تھا اور یاجوج ماجوج دن بھر اس دیوار کو چاٹتے ہیں اور جب یہ ایک کاغذ برابر باریک رہ جاتی ہے تو رات بھر میں پھر صحیح و سالم ہو جاتی ہے

پتھر اور آئینہ: دونوں میں صفت تضاد بھی ہے اور تناسب معنوی بھی۔ صفت تضاد یہ کہ آئینہ پتھر کے مقابلے میں انتہائی نازک ہوتا ہے اور

تناسب معنوی یوں کہ آئینہ پتھری سے بنتا ہے ۔ پتھر کو پگھلا کر پہلے
اس سے شیشہ اور پھر شیشے سے آئینہ بناتے ہیں ۔

سد سکندر اور آئینہ: دونوں سکندر کی ایجاد ہیں اور دونوں لوہے اور فولاد کے استعمال
سے وجود میں آئیں ۔

دل اور آئینہ: دونوں تمثال دار ، عکس نما، صاف اور شفاف ہیں اور دونوں اشیا کی
ہیئتوں کو واضح اور روشن کرتے ہیں ۔

اب ان نکات کے معنوی امکانات کیا ہو سکتے ہیں، انہیں دیکھ لیا جائے:

۱ ہستی موہوم کا طلسم کیا ہے ؟ ہستی موہوم غیر مادی یعنی محض قیاسی ہوتی ہے ۔ ہماری
ہستی کا حقیقتاً وجود نہیں ہے لیکن وہ ہمارے لیے موجود ہے اور موہوم چیز کا موجود ہونا
اور نہ صرف موجود ہونا بلکہ موجود شے کی طرح عمل کرنا ہی طلسم ہے ۔

۲ مادی آئینے کا عکس لمحاتی اور عارضی ہوتا ہے لیکن آئینۂ دل پر پڑنے والا عکس گہرا اور
دیرپا ہوتا ہے ۔

۳ آئینے میں جو ہستی ہے وہ بھی ہستی موہوم ہے ۔ ہستی واقعی یا ہستی موجود نہیں ۔ آئینہ خود
بینی کا مرکز ہے اس لیے اس میں خود سے ماورا کچھ نظر نہیں آتا ۔

۴ سد سکندر پتھر اور فولاد کی آمیزش سے بنی ہوئی وہ دیوار ہے جو ناقابل عبور ہے ۔

۵ دل پر رکھا ہوا پتھر بھی ہٹانا اتنا ہی مشکل ہے جتنا سد سکندر کا توڑنا یا عبور کرنا ۔

۶ ہستی موہوم انسان کی اپنی ہستی ہے اور ہستی واقعی ماسوائے ذات یعنی اللہ ہے ۔

اب شعر کا مفہوم یہ ہوا کہ جس طرح شخص کو آئینے میں اپنے عکس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا
اسی طرح دل کے آئینے میں، ہم صرف اپنی ہستی (ہستی موہوم) کا مشاہدہ کرتے ہیں جو عکس ہی کی
طرح قیاسی اور اعتباری ہے اور اپنی ہستی کا مشاہدہ ہماری راہ میں سد سکندر ہے ۔ جس طرح سد
سکندر ناقابل عبور ہے ۔

اسی طرح ہماری ہستی بھی ہماری راہ میں حائل ہے

اب سوال یہ ہے کہ طلسم ہستی موہوم دل پر سخت پتھر کس لیے ہے ؟ اس طلسم (موہوم
شئے کا موجود شئے کی طرح عمل کرنا) نے ہمارے دل کو باندھ رکھا ہے ۔ اگر اس طلسم کو توڑ دیا
جائے تو ہمارا دل (جو اپنی ہی ہستی میں قید ہے) آزاد ہو جائے اور ہمیں ایک وسیع تر افق مل
جائے ۔ یہ وسیع تر افق کیا ہے ؟ خدا اور کائنات کا مشاہدہ ۔ اپنی ذات میں اشیائے عالم کی نشاندہی ۔
تمام باطنی اور بیرونی اسرار کا انکشاف ۔

یعنی خود بینی ہمیں اپنی ذات میں محدود و محصور کر دیتی ہے اور ماسوائے ذات سے

ہمارے سارے رشتے منقطع کر دیتی ہے اور ہم خارج کے مشاہدے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ خارج کا مشاہدہ ہی ہستی حقیقی ہے اس لیے کہ بیرونی مظاہر ہی سے ہمیں زندگی اور ذات کو سمجھنے کا شعور ملتا ہے۔

اگر سد سکندر کی ایک اور روایت کو ملحوظ رکھا جائے تو شعر سے ایک اور مفہوم اخذ کیا جاسکتا ہے۔ سد سکندر اس ہیکل آہنی کو بھی کہتے ہیں جو آبنائے جبل الطارق کے دو پہاڑیوں پر ایک پہلوان کی شکل میں اس طرح کھڑی کر دی گئی تھی کہ اس پہلوان کی دونوں ٹانگیں دونوں پہاڑیوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ یہ شکل ان پہاڑوں کے درمیان سے گذرنے والے جہازوں کو روکنے اور متنبہ کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس لیے کہ اس ہیکل آہنی کا دوسری طرف کا سمندر نہایت خوفناک تھا جہاں سے کوئی جہاز سلامت نہیں لوٹتا تھا۔

اس روایت کی تلمیحی معنویت کے اعتبار سے سدِّ سکندر کی دوسری طرف کا سمندر ہستی حقیقی کی علامت ہے اور سد سکندر ہماری اپنی ذات ہے جو اس سمندر تک پہنچنے میں مانع ہے۔ یعنی ہمارا انتہائے مقصد اللہ کی ذات میں ضم ہو جانا ہے لیکن اللہ تک پہنچنے میں ہماری ذات مانع ہے۔

آپ نے دیکھا کہ شعر کی تشریح کے لیے پہلے ہم نے شعر میں مستعمل الفاظ اور ان کے مناسبات پر غور کیا۔ پھر ان مناسبات کے معنوی نکات کو نمایاں کیا۔ پھر ان نکات کے معنوی امکانات کا جائزہ لیا۔ ان مرحلوں سے گذرنے کے بعد ہم نے شعر کے مطالب اخذ کیے اور اخذ مطالب میں سد سکندر کی تلمیح سے پوری مدد لی۔

دوسرا شعر:

آئینۂ عدم ہی میں ہستی ہے جلوہ گر
ہے موجزن تمام یہ دریا سراب میں

پہلے شعر کی طرح یہاں بھی ہمیں سب کچھ شعر کے متن ہی سے حاصل کرنا ہے اور مفاہیم اخذ کرنے کے لیے لفظوں کے تحرک اور تفاعل ہی سے کام لینا ہے۔ اس کے لیے پہلے ہمیں آئینہ، عدم، ہستی، دریا، اور سراب کی معنویتوں پر غور کرنا ہوگا۔

پورا شعر حیات بعد الموت کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ ہستی حقیقی آئینہ، عدم میں جلوہ گر ہے اور ہستی ظاہری ہستی موہوم ہے

ولبر مارشل اربن نے علامت اور نشان کی بحث میں ایک بہت پتے کی بات کہی ہے کہ ہر علامتی تلازمہ ایک معنوی تلازمہ ہے۔ مصرعہ ثانی میں دریا۔ زندگی اور اس کے متعلقات کا معنوی تلازمہ ہے۔ یعنی ہماری زندگی، ہمارے افکار و خیالات، ہمارا تصور و تفکر سب کچھ سراب کا انداز رکھتا ہے جو مشہور ہوتے ہوئے بھی معدوم ہوتا ہے۔

درد نے اس شعر میں دریا کے سراب میں موجزن ہونے سے جو مضمون آفرینی کی ہے اس

نے شعر کو مروجہ مفہوم کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی منفرد کر دیا ہے۔

تمام، یعنی یہ دریا جتنا اور جو کچھ بھی ہے وہ سب سراب کے اندر ہے، سراب کے باہر کچھ نہیں۔ اور خود سراب جو اس دریا کا ظرف ہے، محض نظر کا دھوکا ہے جس کا حقیقی وجود نہیں ہے آئینہ بھی سراب کی طرح ہے یعنی اس میں جو تمثال نظر آتی ہے اس کا وجود حقیقی ہوتا ہے۔

عام آئینے میں پڑنے والے عکس کا وجود حقیقی نہ سہی لیکن اس عکس کی اصل کا وجود حقیقی ہونا لازم ہے۔ درد کی مضمون آفرینی یہ ہے کہ ہستی صرف آئینہ، عدم ہی میں نظر آسکتی ہے، اس آئینے کے باہر اس کا وجود نہیں ہے۔ یہ دریا سارا کا سارا سراب کے اندر موجزن ہے۔

آئینہ، عدم نفی ہے، سراب نفی ہے، ہستی اور اس کا استعارہ (دریا) بھی نفی ہیں۔ دونوں مصرعوں میں نفی نفی مل کر اثبات کی صورت پیدا کرتے ہیں۔ اور یہ اثباتی صورت وجود کی نفی کو مستحکم کرتی ہے۔

ان تعبیروں میں متن کو بنیاد بنا کر شعر کی متحرک معنویتوں (dialectical meanings) کے ذریعہ شعر کے مفاہیم میں وسعت پیدا کی گئی ہے اور شعر کے مضمون سے مختلف معنوی تاثرات (tempers) اخذ کیے گئے ہیں۔ ان تعبیروں میں ایک معنی دوسرے معنی کو مسترد بھی کر سکتے ہیں اور مستحکم بھی۔ شعر کے مفہوم کو روشن کرنے کے لیے بعض محذوف اور مقدور اجزا کو بھی کلام میں لایا گیا ہے۔ ذات کے مفہوم اور کائنات کے تصور کو سمجھنے کے لیے علامتی اور معنوی تلازموں ت میں مطابقت اور عدم مطابقت کی بھی جستجو کی گئی ہے۔

قریب قریب یہی طریقہ کار تعبیر متن کے جدید فلسفے کی اساس ہے۔ اپنے بزرگ نقادوں کی تحریروں سے استفادہ کے باوجود میں یہ اعتراف کر لینے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتا کہ متن سے متعلق نئے عالمانہ مباحث تک میرے ذہن کی رسائی نہیں ہے۔ پھر بھی متن کی تفتیش سے متعلق اپنی تعبیروں کی روشنی میں راقم الحروف اسی نکتے کا قائل ہے کہ متن ہی سب کچھ ہے، متن کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یعنی متن ہی متن کا حوالہ ہے۔

خود نوشت

اختر الایمان

"..... اس آباد خرابے میں"

چودھواں باب

شاید ان دنوں میرے پاؤں میں گردش تھی۔ افریقی ایشیائی کانفرنس سے پہلے ابھی چند ہی روز ہوئے تھے اور جو کام میں ادھورا چھوڑ گیا تھا جیسے راج کھوسلہ کی فلم "میرا سایا" جیسے وہ پریم جی کے لئے بنا رہے تھے اور لیتیش راج اور بی۔ آر کی تصویریں جنھیں دن رات ایک کر کے پورا کرنے میں لگا ہوا تھا کہ ایک نئے فلم ساز میرے پاس آئے اور کہا، وہ افریقہ کے پس منظر میں ایک فلم بنانا چاہتے ہیں اور مجھ سے لکھوانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا ضرور لکھوں گا، مگر یہ سارا پس منظر جو آپ فلم میں دکھانا چاہتے ہیں، میں نے خود کبھی نہیں دیکھا۔ اس کے علاوہ وہ کہانی کیا ہے جسے آپ افریقہ میں بنانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا: کہانی آپ لکھیں گے، پس منظر آپ کو میں دکھا دوں گا۔

اس پروڈیوسر کا نام بَخشی تھا۔ اور یہ اپنے خاندان سمیت برسوں سے افریقہ میں رہتے تھے۔ چنانچہ طے پایا کہ ان کے ساتھ میں، فلم کا ڈائرکٹر اور فوٹوگرافر جائیں گے۔ اور جہاں جہاں فلم کی شوٹنگ کرنی ہے وہ تمام جگہیں دیکھ لیں گے۔ اس کے بعد ان سے لین دین کی بات طے ہوگئی اور وہ مجھے کچھ پیشگی رقم دے کر چلے گئے۔ دو روز بعد انھوں نے ٹیلیفون پر بتایا فلم کے ڈائرکٹر دلال گوہا ہیں اور کیمرہ مین جی سنگھ۔ پروگرام کے مطابق ۳؍مارچ ۶۹ء کو صبح ۱۰ بجے ہم ایسٹ افریکن ایرویز سے روانہ ہوکر نیروبی پہنچے۔ دو ہوٹلوں میں الگ الگ جگہ ملی۔ ایک میں بخشی اور میں ٹھہرے، دوسرے میں دلال گوہا اور جی سنگھ۔ دراصل جانا تو ہمیں اروشا تھا۔ کمرے وہیں طے کئے ہوئے تھے مگر جب نیروبی پہنچے تو بارش ہو رہی تھی۔ اروشا کے لئے فوراً روانہ ہونا مصلحت کے خلاف سمجھا گیا۔ نیروبی سے اروشا کا فاصلہ ۱۷،۹ میل تھا۔ ایک بجے دن میں کراچی پہنچے تھے۔ ویزا نہ ہونے کے سبب میں وہاں عزیزوں اور دوستوں سے بھی نہیں مل سکا۔

صبح ہوتے ہی کو لمبیا ہوٹل، جہاں میں اور پنچھی ٹھہرے تھے، اسے خیرباد کہا اور "ران ورتھ" ہوٹل پہنچے۔ دلال گوپال اور رجی سنگھ وہاں تھے۔ وہاں سے ہم سب پنچھی کے بہنوئی کے یہاں گئے۔ ان سے میں ایک بار بمبئی میں مل چکا تھا۔ کچھ دیر وہاں بیٹھ کر روانہ ہو گئے اور نیروبی کے بازاروں سے گزرتے ہوئے اروشا کے لئے نکل پڑے۔ نیروبی اور اروشا دونوں تنزانیہ کی ریاست میں ہیں۔ نیروبی سے نکلنے کے بعد ہی جنگل شروع ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے لئے راستہ میں ایک ہوٹل پر رُکے اور کوکو کولا وغیرہ پیا۔ اروشا جاتے ہوئے جگہ جگہ نیل گائیں، ہرن، زیبرے اور زرافے راستہ بھر ملتے رہے۔ ۱ ½ بجے کے قریب اروشا پہنچے۔ چھوٹا سا مگر اچھا خوبصورت شہر تھا۔ ارد گرد چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں، جن میں گھری ہوئی یہ جگہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اروشا پہنچ کر ہم ہارٹلے نام کے ایک انگریز سے ملے، جس کا پیشہ چڑیا گھروں کو جنگلی جانور مہیا کرنا تھا۔ پھر ان کے ساتھ ایک سفاری کے یہاں گئے جس کا نام براؤن تھا۔ جان اس کا نائب تھا۔ ان دونوں سے سفر میں ساتھ لے جانے کا معاملہ کیا۔

ہارٹلے کا ایک بہت بڑا اصطبل یا باڑہ تھا جہاں اس کے پکڑے ہوئے یا خریدے ہوئے جانور بند تھے۔ ہارٹلے، براؤن اور جان تینوں ہی انگریز تھے اور تینوں بڑے زندہ دل قسم کے آدمی تھے، خاص طور پر براؤن۔ وہ بہت ہی کھلاڑی طبیعت کا تھا۔ جہاں اروشا میں قیام کیا اس کا نام اروشا ہوٹل تھا۔ رات اروشا ہوٹل میں گزری اور صبح ہوتے ہی ہم سب، اور جان اور براؤن اپنے سفر پر نکل گئے، افریقہ کے جنگل کی سیر اور فلم کے لئے مناظر کی تلاش میں۔ پہلی جگہ جہاں ہم اروشا سے نکل کر پہنچے، اس کا نام مینارا جھیل تھا۔ اس کے کنارے ارد گرد ۴۰ ۲ میل میں پھیلا ہوا ایک گھنا جنگل تھا جس میں کثرت سے شیر، چیتے، جنگلی بھینسے، زیبرے، نیل گائیں، ہاتھی اور طرح طرح کے جانور تھے۔ براؤن برسوں سے سفاری کے پیشے میں تھا۔ وہی جیپ چلا رہا تھا۔ جان اس کے پاس بیٹھا تھا۔ راستہ میں موٹر یا جیپ سے اتر کر پیدل چلنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس مینارا جھیل کے علاوہ راستہ میں اور بہت سی چھوٹی چھوٹی جھیلیں یا جوہڑ تھے جن میں طرح طرح کے پرندے اور آبی گھوڑے تھے۔ جنگل سے میرا بہت پرانا رشتہ رہا تھا۔ جن دنوں میگھ بستی میں رہتا تھا اور پوٹریہ کے اسکول میں پڑھتا تھا ان دنوں روز جنگل سے گزرتا تھا۔ میگھ بستی کے نکاس پر ایک بہت بڑا باغ تھا، واپسی میں اکثر وہاں بیٹھ جاتا تھا۔ باغ کے کنارے پر ایک جوہڑ تھا جہاں بھینسیں پانی میں پڑی رہتی تھیں۔ ایک بار میں نے دیکھا جوہڑ میں ایک بچہ ڈوب رہا ہے۔ میں اضطراری طور پر جوہڑ میں کود گیا۔ جب ڈوبنے لگا ایک بھینس کی دُم پکڑ لی۔ گھبرا کر بھینس باہر نکلی اور اس کے ساتھ میں اور بچہ بھی باہر آ گئے۔ مگر یہ مینارا جھیل اور اس کا جنگل تو بے پناہ چیز تھی۔ حدِ نظر تک پھیلا ہوا اور سرسبز و شاداب۔ میگھ بستی کا جنگل اور باغ اور مینارا جھیل کا گرد و پیش

سب ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئے اور مجھے یہ سب دیکھ کر بڑا لطف آ رہا تھا کہ اچانک دو بھینسے ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے پیش منظر میں آکر کھڑے ہو گئے۔ کیا حسین جانور تھے۔ دونوں کا عنفوانِ شباب تھا۔ شاید یہ ان کے وصال کا موسم بھی تھا۔ پچیس تیس منٹ بعد ایک ہاتھیوں کی قطار نے راستہ روک لیا اور تھوڑی دیر رک کر آگے نکل گئے۔ اروشا سے نکل کر دور تک ایک خوبصورت وادی اور جنگل تھا۔ راستہ میں ڈھیر سارے شتر مرغ، لکڑ بھگے، تیندوے، بھیڑیے اور گیدڑ دکھائی دئے۔

بینار جھیل کے بعد ہم انگورول انگورول پہنچے۔ یہ ایک بہت بڑی غار نما جگہ تھی۔ اس کے نشیب میں بھی ایک جھیل تھی اور ارد گرد، اونچائی پر کشادہ زمین کا ایک ٹکڑا جس پر خیمے لگے ہوئے تھے اور ایک معمولی سا ہوٹل بنا ہوا تھا۔ اس جگہ کے بارے میں ہمیں الگ الگ دو باتیں بتائی گئیں۔ پہلی یہ کہ کبھی یہاں پر ایک بہت بڑا آتش فشاں تھا جو اب سرد پڑ گیا تھا اور دوسری یہ کہ یہاں چاروں طرف کچھ آتش فشاں تھے جو پھٹ گئے تھے اور ان کا لاوا اس وادی میں پھیل گیا تھا اور اب آہستہ آہستہ ایک وسیع میدان اور جنگل بن گیا تھا۔ ہم رات کو وہیں اس ہوٹل میں قیام کرنے والے تھے۔ خیموں کے علاوہ یہاں کمرے بھی بنے ہوئے تھے جن میں ابھی بجلی نہیں آئی تھی۔ اس جگہ کا نام کیمپا کیمپ تھا۔ انگورول انگورول کے غار دو ہزار فٹ کی نیچائی میں تھے۔

براؤن بہت اچھا ڈرائیور اور سفاری تھا۔ جب ہم نیچے وادی میں پہنچے تو جگہ کے پھیلاؤ اور خوبصورتی کا اندازہ ہوا جسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ وادی کا رقبہ ہمیں ۱۲۰ مربع میل بتلایا گیا۔ وادی میں جانور بھیڑ بکریوں کی طرح بھر رہے تھے۔ ہم نے سات گینڈے، نو شیر، سینکڑوں ہرن اور طرح طرح کے جانور دیکھے۔ جیسے نیل گائیں، شتر مرغ، لکڑ بھگے، جنگلی مرغیاں اور ڈھیر سارے دوسرے پرندے۔ حکومت نے یہاں شکار کی ممانعت کر رکھی ہے۔ وادی میں پہنچ کر پہلا سامنا ایک مادہ گینڈے سے ہوا۔ اس کے ساتھ اس کا بچہ بھی تھا۔ براؤن نے تھوڑی دیر مادہ گینڈے سے چھیڑ کی۔ جیپ گاڑی جان کر اس کے قریب لے جاتا تھا اور جب وہ گاڑی پر حملہ کرتی تھی تیز بھگا کر دور لے جاتا تھا۔ براؤن نے ہمیں بعد میں بتایا کہ وہ ہمارے اوپر حملہ نہیں کر رہی تھی، اپنے بچے کی مدافعت میں ہمارے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ براؤن نے یہ بھی بتایا کہ وہ جنگل کے کم و بیش سب جانوروں کی عادتوں سے واقف تھا۔

ہم شام کے چار بجے تک وادی میں گھومتے رہے۔ ایسے سہانے مناظر، اتنے پھیلاؤ میں، فطرت کی اس گلکاری کے ساتھ، میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ وادی کی گھاس ایسی نرم تھی جیسے مخمل بچھا دی گئی ہو۔ آگے بڑھے تو کچھ

چھوٹی جھیلیں بھی دیکھیں جن میں آبی گھوڑے اور دوسرے طرح طرح کے پرندے اور جانور بھی تھے، جو وہاں کے سوا شاید اور کہیں دیکھنے کو نہیں ملیں گے۔ بیچ میں ہلکی سی بارش بھی ہوئی۔ ہم نے ایک ہوٹل میں رک کر کھانا بھی کھایا۔ اس کے بعد کا باقی وقت بھی وادی ہی میں گزارا اور شام ہوتے ہوتے واپس ہوٹل میں آگئے۔

واپس آکر، ہاتھ منہ دھوکر، چائے پی رہے تھے کہ ہوٹل میں ایک انگریز لڑکیوں کا پرا اترا۔ برٹش ایرویز کی میزبان لڑکیاں تھیں جنھیں عرف عام میں ہوسٹس کہا جاتا ہے۔ براؤن اور جان ان میں اکثر لڑکیوں سے واقف تھے۔ دنیا بھر کے سیلانی اکثر یہاں آتے رہتے ہیں۔ براؤن نے ہم سب کا تعارف ان لڑکیوں سے کرایا۔ براؤن بڑا مسخرہ تھا، نہایت زندہ دل آدمی۔ میرا تعارف SOME BLOODY PRINCE OF INDIA کہہ کر کرایا۔ ہندوستان کے بارے میں کچھ ایسا تصور عام ہے یورپ اور امریکہ کے لوگوں میں کہ وہاں یا ہاتھی بہت ہیں یا شہزادے۔

براؤن نے میرا تعارف جن دو خواتین سے کرایا، ان میں ایک ماں تھی ایک بیٹی۔ ماں ابھی اترتی عمر کی خاتون تھیں اور بیٹی شباب کی آخری منزلوں میں تھیں۔ براؤن اور جان تو اپنی اپنی لڑکیوں کو لے کر کمرے میں چلے گئے۔ براؤن نے جاتے جاتے مجھ سے کہا "HELP YOUR SELF" اس کے جانے کے بعد میں نے ان دونوں خواتین کو اپنی میزبانی کا ثبوت بھی دینا چاہا اور ان کے لئے بیئر منگائی۔ کچھ کھانے کو بھی منگایا۔ لڑکی مجھے اچھی بھی لگی تھی۔ اس سے بہت دیر تک ہندوستان کی تعریف کرتا رہا۔ اسے اپنا پتہ دیا اور اصرار کیا کہ تمہارا کبھی بمبئی جانا ہو تو آنا، بمبئی بھی بہت اچھا شہر ہے، بالکل انگلینڈ اور امریکہ کا مدّمقابل۔ سرور کم آئے یا زیادہ آتا تو بیئر سے بھی ہے۔ ہم تھوڑے بے تکلف ہو گئے۔ اسے یہ بھی بتایا، میں بہت مشہور فلم اسکرپٹ رائٹر اور شاعر بھی ہوں۔ یہ جاننے کے بعد وہ میرے بارے میں باتیں کرنے لگی۔ لڑکی کا نام لزلی تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کے کہا "لزلی تم بہت پیاری لگ رہی ہو" وہ مسکرائی، پھر کھڑی ہو گئی اور اپنے کمرے میں جاتے جاتے کہا "YOU GO WITH MY MA" مجھے بڑے زور کی ہنسی آگئی مگر میں نے دبالی اور والدہ محترمہ کا ہاتھ پکڑ کر انھیں ان کے کمرے کے دروازے پر لے جاکر یہ کہہ کر چھوڑ دیا "آپ بھی آرام کیجئے، بہت رات ہو گئی" اور اپنے بستر پر لیٹ کر بہت دیر تک ہنستا رہا۔ ہنسی کا ایسا ہی ایک اور سبب تھا۔

میں بی۔آر۔فلمز کی ایک فلم لکھ رہا تھا۔ اس فلم کے ڈائرکٹر یش راج چوپڑہ تھے۔ اس میں دو نئی ہیروئنیں تھیں۔ نئی ہیروئن ایک بنگالی لڑکی تھی۔ فلم کی شوٹنگ دلّی میں تھی۔ بی۔آر۔فلمز کے ساتھ میرا شروع

ہی سے ایک زبانی سمجھوتہ تھا کہ جہاں بھی شوٹنگ ہوگی میں یونٹ کے ساتھ جاؤں گا۔ سین میں کسی ردوبدل کی ضرورت ہوگی وہ بھی کروں گا اور آرٹسٹوں کو یہ بھی بتاؤں گا یہ مکالمہ کیسے ادا کرنا ہے۔ اسی زبانی معاہدے سے بہت مرتبہ الجھنیں پیدا ہوئیں مگر فلم کے ڈائریکٹر نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا۔ الجھن کی تفصیل آگے کسی مناسب موقعے پر بیان کروں گا۔ فی الحال اس لطیفے سے نپٹ لوں جو اس فلم میں پیش آیا۔

یہ نئی بنگالی ہیروئن ابھی پڑھی لکھی لڑکی تھی اور اس بات سے بھی واقف تھی کہ میں کون ہوں اور کون کونسی فلمیں لکھی ہیں۔ شوٹنگ شاید اشوکا ہوٹل کے احاطے میں تھی۔ ہمارا قیام بھی اشوکا ہوٹل ہی میں تھا۔ اس لڑکی کا کمرہ میرے کمرے سے پہلے یا شاید بعد میں تھا۔ صبح کو جب شوٹنگ کے لئے نکلے تو اس نے پیچھے سے آکر بڑی بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا "میں آپ کے ساتھ چلوں" لہجے میں بنگالی پن تھا۔ میں نے کہا "ضرور چلو، مگر تمہارے لہجے سے احساس ہوتا ہے کہ تمہیں بہت محنت کرنی پڑے گی۔"

"کروں گی۔ جب ہی تو پہلے آپ کا ہاتھ پکڑا ہے۔"

"سمجھ دار تو لگتی ہو۔ تمہاری بنگالی فلمیں دیکھی ہیں میں نے۔" غرض کمرے سے شوٹنگ سپاٹ تک کا راستہ ہنستے ہنساتے گزرا۔ دن بھی اچھا گزرا۔ شوٹنگ بھی خاطر خواہ ہوئی۔ میں نے اسے جگہ جگہ ٹوکا "لہجے میں بنگالی پن ہے، اس کا خیال رکھو۔ فنکار تم بہت اچھی ہو، بنگالی فلم میں بہت اچھی لگی تھیں۔"

"وہ میری زبان ہے۔ مگر کوئی بات نہیں، یہاں آپ ہیں۔"

میں دل میں یہ سوچ کر ہنسا کیسی ہوشیار لڑکی ہے، موقعہ محل دیکھ کر بات کرتی ہے۔

غرض شام ہو گئی۔ سب اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے آئے۔ وہ واپس بھی میرے ساتھ ہی آئی۔ میرے کمرے کے پاس پہنچ کر اس نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ دبایا اور بولی "YOU GO WITH MY MA" بعد میں وہ بڑی مقبول ہیروئن بن گئی تھی۔ اس وقت بھی ایک دو فلموں میں ساتھ ہوا۔ اب اس میں بڑی سنجیدگی آ گئی تھی۔ مگر اس انگریز ماما اور بنگالی ماما کا واقعہ ابھی تک میرے ذہن میں ہے اور صبح کا وہ حسرت بھرا منظر بھی جہاں لڑکی اور لڑکی کی ماما کے پچھلی رات، بیئر سے بھرے گلاس رکھے تھے اور راب ہمارے اٹھنے سے پہلے ہی برٹش ایرویز کا قافلہ اپنے مہمانوں اور میزبانوں کو لے کر اگلی اڑان پر جا چکا تھا۔ ع "خوش باش کہ وقت ما خوش کردی۔"

جب میں بیروت گیا تھا جانے کیوں پینی ترک کر دی تھی۔ روس میں بہت سخت سردی تھی، وہاں بھی نہیں پی۔ بمبئی واپس آنے کے کچھ دن بعد تک بھی ادھر دھیان نہیں گیا۔ ایک رات ایک محفل میں فیض کا ساتھ ہو گیا۔ وہ

کسی کام سے بمبئی آئے ہوئے تھے۔ محفل کے بعد کسی نے اپنے گھر مدعو کیا ہوا تھا۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو بولے "آؤ ساتھ نہیں چلو گے۔" میں نے کہا۔ "وہاں پینا پلانا ہوگا اور میں آج کل پیتا نہیں۔"

بولے۔ "آؤ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے جانا۔"

میں نے بھی عذر نہیں کیا۔ میرا ان کا بہت پرانا خاموشی کا رشتہ تھا۔ جب وہ فوج میں میجر تھے، میر دَرد روڈ پر رہتے تھے۔ اور میں علیگڑھ یونیورسٹی چلا گیا تھا۔ جب دلّی آتا تھا ان سے ضرور ملتا تھا اور ہم اکثر کناٹ پلیس پر خاموش ٹہلا کرتے تھے۔ نہ وہ کسی سے ادبی جھگڑا باول کرتے تھے، نہ میں اس کا عادی تھا۔

ہم صبح کو ڈلہتن لاج سے روانہ ہوکر ایک بجے کے قریب ڈوبٹو جھیل پہنچے، جہاں ہمیں رکنا تھا۔ یہیں وہ کیمپ تھا جہاں ہمارے ٹھہرنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ سامان کیمپ میں رکھ دیا اور ہم سرنیگٹی کا میدان دیکھنے کی نیت سے نکل گئے۔ میدان میں پہنچ کر دیکھا ہر طرف جانور ہی جانور ہیں۔ جس طرح جنگل میں بھیڑ بکریاں چرتی پھرتی ہیں، اسی طرح یہاں شیر، چیتے، ہرن اور پاڑے اور دوسرے جانور، جو ایک دوسرے کے دشمن سمجھے جاتے ہیں، ایک دوسرے سے بے خوف، اپنا پیٹ بھرنے میں لگے تھے۔ ہم نے شوق میں آکر گننے شروع کر دئے۔ ایک جگہ آٹھ شیر دکھائی دئے۔ ان کی تصویریں کھینچتے رہے۔ اس کے بعد ایک شیرنی دیکھی جو شکار کی ٹوہ میں تھی۔ کچھ دور اس کے دو بچے انتظار میں بیٹھے تھے۔ اس کے بعد جنگل اور دوسرے جانوروں کی تصویریں لیں۔ بعد میں دوپہر کا کھانا ڈوبٹو کیمپ میں کھایا اور سرونرا کیمپ چلے گئے۔ یہ جگہ ڈوبٹو کیمپ سے بھی اچھی لگی۔ رات کو وہیں ٹھہرے۔ اگلے روز پھر گردونواح کی سیر کو نکل گئے۔ شیر کہیں دکھائی نہیں دئے۔ شام کو ایک گلدار ملا۔ کیسے خوبصورت پھول تھے اس کے کوٹ پر۔ وہ ہمیں دیکھ کر کھڑا ہوگیا۔ ہم نے گاڑی روک کر اس کی بھی تصویر لی۔

سارا میدان پانی سے بھرا ہوا تھا غنیمت ہے کہیں گاڑی نہیں پھنسی، ورنہ اسی طرح دھکا دینا پڑتا جس طرح انگورولی انگورولی کریٹر کی جھیل میں دینا پڑا تھا۔ مجھے اچانک ایک امریکی فلم "ہٹاری" کا خیال آیا۔ فلم میں تو نہ کہیں پانی تھا، نہ گھاس۔ میں نے پوچھا تو پتہ چلا کہ جب یہاں گرمی پڑتی ہے تو جنگل کا ایک حصّہ سوکھ جاتا ہے، دوسری طرف ہرا رہتا ہے۔ اس موسم کو "ہجرت" کہتے ہیں۔ جنگل کے تمام جانور خشک علاقے سے سبز و شاداب علاقے کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں۔ ہجرت کے اس منظر کو دیکھنے کے لئے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔

یہاں کے بعد ہمیں اکوما جانا تھا مگر نہیں گئے۔ ہمیں بتایا گیا راستہ میں پڑنے والے دریاؤں میں پانی بھرا ہوگا اور وہ قابلِ اعتبار نہیں ہوتے۔ پانی کم زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ بھجی نے کہا اکوما اگست میں دیکھ لیں گے۔ اگست

میں شوٹنگ کا پروگرام بنایا ہے۔ اگوما دیکھنے کے شوق میں کامیڈی کہیں ٹریجڈی میں نہ بدل جائے۔ دریاؤں کا پانی بے اعتبار ہے آجکل۔

اگوما کے علاوہ شوٹنگ انگورو ول انگورو ول، سرینگیٹی، مینارا جھیل، اور نیشنل پارک میں ہونے والی تھی۔ سرونیرا کیمپ سے ہم واپس اروشا آ گئے۔ سرینگیٹی اور سرونیرا میں جو دیکھا تھا وہ اور اس کی پہنائی ابھی تک ذہن میں گھوم رہی تھی۔ آکر نہائے پھر نازہ ہوٹل میں جاکر کھانا کھایا۔ ان دنوں میں عام طور پر رات کا کھانا نہیں کھاتا تھا مگر منہ کا مزہ بدلنے کے لئے تھوڑے سے چاول شوربے سے کھا لئے۔ صبح اٹھ کر مرآنگو جانا تھا جہاں سے کلے منجارو پہاڑ کی چوٹیاں نظر آتی تھیں۔ پھر ممیلا جانا تھا۔ یہ جگہ خوبصورت مناظر اور طرح طرح کے پرندوں کے لئے مشہور تھی۔ وہاں پہنچے تو بارش ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر خفت دور کرنے کے لئے پہاڑ پر چڑھے اترے پھر ممیلا کے لئے روانہ ہو گئے۔ راستہ میں خیال آیا آج عید الاضحیٰ ہے۔ ببنجی بولے آپ پہلے بتاتے تو آپ کو عید کی مبارکباد دیتے۔ اس پر ہم دونوں ہنسے اور اسی طرح ہنستے ہنساتے ممیلا کے ڈاک بنگلہ پہنچ گئے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں امریکی فلم "ہٹاری" کی شوٹنگ ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہمارا مرچیسن آبشار دیکھنے کا ارادہ تھا مگر دلال کو بابر واپسی کا بھوت سوار ہو گیا۔ بمبئی میں ان کی کسی دوسری فلم کی شوٹنگ تھی۔ مجبوراً اروشا آنا پڑا۔

وہاں آکر معلوم ہوا اُس روز کوئی جہاز جانے والا نہیں تھا۔ اتفاق سے دارالسلام سے ایک جہاز آ گیا۔ ببنجی نے وہ اور ایک اور جہاز جو پہلے سے ہوائی اڈے پر تھا دونوں چارٹر کر لئے اور ہم نیروبی آ گئے۔ دلال گویا ایسی جلدی میں تھے کہ ایک غلط جہاز میں سوار ہو گئے جو ہانگ کانگ یا سنگاپور جا رہا تھا۔ ہم ان کے لئے اِدھر پریشان ہوتے رہے کہ وہ کہاں غائب ہو گئے۔ جب اُس جہاز کے روانہ ہونے کا اعلان ہوا تب اُتر کے بھاگے اور اسی بھاگ دوڑ میں ہم بمبئی پہنچ گئے۔

کہانی کا خاکہ میں نے ببنجی کو وہیں افریقہ میں سنا دیا تھا۔ واپس آکر منظرنامہ بھی ان کے حوالے کر دیا۔ پھر کیا ہوا مجھے نہیں معلوم۔ شاید فلم بننے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کچھ ایسا ہوا کہ ببنجی کی دھرم اندر کی بہن سے شادی ہو گئی اور تھوڑے ہی دن بعد اس لڑکی کا انتقال ہو گیا۔ اس بیچ میرے پاس ایک اور صاحب آئے نام جیتل سنگھ تھا۔ ان سے کچھ برس پہلے پہچان ہوئی تھی۔ ایک فلم بنانا چاہتے تھے "نیلی آنکھیں"۔ وہ مجھ سے لکھوائی تھی۔ اس وقت سے ان سے جان پہچان تھی۔ کبھی کبھی مل جاتے تھے۔ بڑے ہنسوڑ اور زندہ دل قسم کے آدمی تھے۔ شراب خوب پیٹ بھر کے پیتے تھے اور ایک کے بعد ایک اُبلے ہوئے انڈے کھاتے جاتے تھے۔ میں اُن کے

صرف اسی روپ سے واقف تھا۔ بہت دن بعد ایک روز آئے۔ شراب ساتھ لائے اور بہت دیر تک بیٹھے پیتے اور لطیفہ بازی کرتے رہے۔ جاتے وقت مشورہ دیا کہ میں ڈائرکیٹر بن جاؤں یا فلم ڈائریکٹ کرنے کا وعدہ کروں تو وہ فلم بنانے کے لئے تیار ہیں۔

فلم کی زندگی میں ڈائرکیٹر کا بڑا اہم مقام ہے مگر شاعری کے علاوہ میں کسی دوسرے شعبے میں سنجیدگی سے الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ ڈائرکیٹر بننے کی پیش کش مجھے اس سے پہلے بھی کئی بار ہوئی تھی۔ بی۔ آر۔ فلمز ہی میں پروڈکشن کنٹرولر سی۔ وی۔ کے۔ شاستری نے مجھے اپنی ایک فلم کی ڈائرکشن کے لئے کہا تھا مگر میں نہیں مانا تھا۔ جس پر وہ مجھ سے ناراض بھی ہو گئے تھے۔ ان کے علاوہ اور کئی ایجنٹوں نے مجھے ڈائرکیٹر بننے کی ترغیب دی تھی۔ جب پونا سے بمبئی آیا تھا تو شاعر ہونے کے ناتے لوگوں نے گانوں کی فرمائش کی تھی مگر میں نے گانے بھی نہیں لکھے۔ شاعری صرف شاعری کے لئے الگ رکھی تھی۔ ایسی شاعری جو مجھے پسند ہو۔ مگر جیپل سنگھ کے جھانسے میں آگیا اور اس کے لئے ایک فلم بنائی جس کا نام پہلے "درد" رکھا پھر جیپل سنگھ کے اصرار پر بدل کر "لہو پکارے گا" کر دیا۔ اس فلم کا انجام کیا ہوا، نہ پوچھیں تو بہتر ہے۔ جیپل سنگھ زندہ ہوتے تو مجھے الزام دیتے، میں انھیں کوس رہا ہوں۔ فلم بہت اچھی بنی تھی مگر جیپل سنگھ کی نیت میں کھوٹ تھا۔ لہو پکارے گا، جب آدھی کے قریب ہو گئی اور فلم کے خریداروں کو، دیکھ کر پسند آئی تو جیپل سنگھ نے اصرار کرنا شروع کر دیا کہ فلم کی جو شوٹنگ باقی رہ گئی ہے اسے پورا کرنے سے پہلے میں فلم کا انجام فلم کر دوں۔ پہلے میں نے انکار کیا اور اس پر اصرار کیا کہ باقی فلم بھی پوری ہو جانی چاہئے مگر جیپل سنگھ نے جب زیادہ ضد کی تو میں نے اس کی خواہش کے مطابق انجام بھی پورا کر دیا۔ مجھے یہ شبہ کبھی نہیں ہوا تھا کہ جیپل سنگھ میرے ساتھ کوئی مکاری کرے گا پھر بھی میں نے اپنے فلم کے ایڈیٹر کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ میری مرضی کے بغیر فلم ایڈیٹنگ روم سے باہر نہ جائے اور ایڈیٹر پران مہرہ نے اس کا پورا خیال رکھا مگر دل کا دورہ پڑنے سے پران مہرہ کا اچانک انتقال ہو گیا۔ میں اس وقت بمبئی سے باہر گیا ہوا تھا۔ جیپل سنگھ نے فلم اس جگہ سے نکال لی اور میرے واپس آنے سے پہلے اس میں جو ایڈیٹنگ کا کام تھا وہ کسی دوسرے ایڈیٹر سے پورا کرا کے فلم نمائش کے لئے دے دی۔ وہ فلم پوری تو ہوئی نہیں تھی، ادھوری تھی، لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی۔ نتیجہ یہ کہ فیل ہو گئی مگر اس میں جیپل سنگھ کو تیس چالیس لاکھ روپے کا فائدہ ہو گیا اور وہ دلّی جا کر بیٹھ گیا۔ میں واپس آیا تو حقیقت جان کر بڑا دکھ ہوا۔ مگر بازپرس کس سے کرتا۔ انھیں دنوں لکھنے کے لئے دو فلمیں مل گئیں "چاندی سونا" اور "ابرادھ"۔ پہلی فلم سنجے خان کی تھی، دوسری ان کے بھائی فیروز خان کی۔ "چاندی سونا" ماریشس میں بنی اور "ابرادھ" جرمنی میں۔ اس تبدیلی آب و ہوا سے

میرے ذہن پر اچھا اثر پڑا اور میں تھوڑی دیر کے لئے جیل سنگھ کی زیادتیوں کو بھول گیا۔

ماریشس اچھی خوبصورت جگہ ہے۔ مگر اس کی کوئی تفصیل میرے ذہن میں نہیں رہی سوا اس کے کہ ماریشس کے ساحل بہت خوبصورت ہیں۔ اور وہ لوگ جو بہار سے لے جاکر وہاں بسائے گئے تھے، بہاری بھوجپوری زبان کے ساتھ ساتھ فرانسیسی بھی بولتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ جزیرہ فرانسیسیوں کے قبضہ میں رہ چکا تھا۔ جب فرانسیسیوں نے ماریشس پر قبضہ کیا، اس وقت اس جزیرہ میں ایک پرندہ بڑی کثرت سے پایا جاتا تھا جس کا نام ڈوڈو تھا۔ وہ بہت اُڑ نہیں پاتا تھا۔ کچھ ہی مدت بعد وہ پرندہ دنیا سے ناپید ہوگیا۔ جزیرے کے باشندے پکڑ پکڑ کر کھا گئے۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون۔

جرمنی میں فیروز خان کی شوٹنگ میں اچھا وقت گزرا۔ شوٹنگ تو جرمنی کے مختلف شہروں اور جگہوں پر تھی جیسے نیور برگرنگ اور فرینک فرٹ۔ ایک دو جگہیں اور تھیں جن کا نام اس وقت ذہن سے نکل گیا۔ فرینک فرٹ سے کوئی تیس چالیس میل دور ایک قصبہ ہے جس کا نام مائنز ہے۔ رہنے کا بندوبست وہاں کیا گیا تھا۔ نیور برگرنگ موٹر کی دوڑ کے لئے بہت مشہور ہے۔ فیروز کی فلم میں ایک موٹروں کی دوڑ کا مقابلہ تھا۔ وہ منظر وہاں فلمایا گیا۔ شوٹنگ کے بعد ہم مائنز آجاتے تھے۔ یورپ کے کسی ملک میں بھی جائیں کھانے کا مسئلہ ضرور درپیش ہوتا ہے۔ مائنز میں بھی تھا۔ میرے ساتھ دو مشکلیں تھیں یا ہیں۔ میں شور بھی نہیں کھاتا اور بڑے کے گوشت سے بھی پرہیز کرتا ہوں۔ اور یورپ اور دوسرے ملکوں میں یہی گوشت زیادہ کھائے جاتے ہیں۔ مچھلی مرغ بھی زیادہ پسند نہیں۔ مگر کتنا ہی بچاؤ کر لیجئے آخر میں یہی پتہ چلتا ہے کہ جو رات کھایا تھا یا ایک دن پہلے نوش جان فرمایا تھا، وہ بڑے کا گوشت تھا یا دوسرے ناپسند جانور کا۔

میں ایک مہینہ کے قریب اس علاقے میں رہا۔ مائنز میں بہت جرمن لڑکے لڑکیوں سے اچھا ملنا ہو گیا۔ شوٹنگ میں آسانی کے لئے فیروز نے مقامی کالج اور یونیورسٹی کے لڑکے ملازم رکھ لئے تھے۔ جب نیور برگرنگ فرینک فرٹ اور مضافات کا کام ختم ہوگیا تو برلن چلا گیا۔ یہی میرا اور فیروز خان کا معاہدہ تھا۔ اپنی یونٹ سے رخصت کے بعد جب میں جرمن یونٹ سے ملا اور رخصت چاہی تو سامنے ہی یہ بھی کہا میں برلن جا رہا ہوں۔ ان لڑکوں میں سے ایک لڑکے کی خالہ برلن میں رہتی اور وہاں ایک مسافر خانہ چلاتی تھی۔ اس نے اپنی خالہ کا پتہ دیا اور ایک خط خالہ کے نام لکھا۔ میں برلن کے ہوائی اڈے پر اُتر کر پتہ پوچھتا ہوا سیدھا وہیں گیا۔ وہ ایک بزرگ خاتون تھیں۔ مہربان اور رحم کو فطرت کی۔ انھوں نے ہر طرح میرا خیال بھی رکھا اور برلن کی سیر کیسے کرتی

ہے، وہ بھی بتایا۔ میں نے مشرقی اور مغربی برلن بڑی تفصیل سے دیکھے اور وہ دیوار بھی جس نے جرمنی کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا اور جو اُس وقت تھی، اب نہیں ہے۔

وہ حصّہ جو روس کے قبضے میں چلا گیا تھا اور لڑائی میں برباد ہو گیا تھا، از سرِ نو تعمیر ہوا تھا اور بالکل ویسا ہی بنایا گیا تھا جیسا منہدم ہونے سے پہلے تھا۔ اس میں تمام وہی پتھر اور وہی مسالا اور مواد استعمال کیا گیا تھا جو اصل عمارت میں لگا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کبھی کوئی لڑائی ہوئی ہی نہیں تھی۔ مغربی برلن کم و بیش ویسا ہی تھا جیسا لڑائی سے پہلے ہوگا۔ کچھ دن برلن میں گزار کر میں جنیوا چلا گیا۔ جنیوا میں رہنے کا میں نے پہلے سے کوئی بندوبست نہیں کیا تھا۔ بس تن بہ تقدیر جنیوا کے ہوائی اڈے پر پہنچ گیا اور جہاز سے اُتر کر ایک ٹیکسی ڈرائیور سے کہا مجھے کسی درمیانی درجہ کے ہوٹل میں لے چلے۔ ہر جگہ ہر ہوٹل میں میرا استقبال خندہ پیشانی سے ہوتا تھا۔ اس لئے کہ میرے پاسپورٹ میں پیشہ کے خانہ میں "شاعر" درج تھا۔ جنیوا کے ہوٹل کی مالک دو تین لڑکیاں تھیں۔ شاید بہنیں۔ انھوں نے مجھے ایک اچھا سا کمرہ دیا اور جنیوا کی سیر میں مدد کی۔ جنیوا سے کئی ملکوں کی سرحدیں ملتی ہیں۔ غالباً روم، جرمنی اور فرانس کی، مگر ان سرحدوں کو پار کرنے میں کہیں کوئی قباحت نہیں ہوتی۔ اور بہت سی جگہوں اور مکانوں کے ساتھ نپولین کی محبوبہ "جوزیفائن" کا مکان بھی دیکھا۔ اپنے ماضی اور اس کی تاریخ کو سنبھال کر رکھنے کا یورپ اور امریکہ کے لوگوں کو بڑا سلیقہ ہے۔ جوزیفائن کی رہائش گاہ میں داخل ہو کر احساس ہوا جیسے وہ ابھی ابھی اٹھ کر گئی ہے۔ وہاں اتنا کچھ دیکھا مگر اور اب کوئی تفصیل یاد نہیں رہی۔

ہوٹل کے کاؤنٹر پر ایک روز ہوٹل کی میزبان یا ہوسٹس نے ایک صاحب سے ان لفظوں میں میرا تعارف کرایا۔ " اپنے دشمن سے ملئے۔"

وہ پرتگال کا رہنے والا تھا۔ اس نے میری طرف ہنستے ہوئے ہاتھ بڑھا کر کہا:

"دشمن نہیں، میں بھی دوست ہوں۔"

وہیں کاؤنٹر پر ایک روز دو ہندوستانی ملے۔ اِدھر اُدھر کی سیر کرتے ہوئے جنیوا بھی آئے تھے۔ مجھ سے مل کر انھوں نے پہلے یہ پوچھا کہ میں ہندوستانی ہوں یا کسی اور جگہ کا باشندہ۔

"ہندوستانی" میرا جواب تھا۔

پھر پوچھا، میں کھانا کہاں کھاتا ہوں۔

"سامنے کے ہوٹل میں۔"

وہ ایک چینی ریستوراں تھا۔ میں کھانا کھانے ہی جا رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ آ گئے۔ انھوں نے بتایا وہ صرف سبزی خور ہیں۔ میں نے ہوٹل کے بیرے سے کہا ان کے لئے کوئی ایسا کھانا لاؤ جس میں صرف سبزی ہو۔ ہوٹل کا مالک بڑا خوش طبع سا آدمی تھا۔ میں نے یہی بات اس سے بھی کہہ دی تھی۔ اس نے تھوڑی دیر بعد ان کے لئے مٹر پلاؤ بھیجا مگر اس میں چھوٹے چھوٹے گوشت کے ٹکڑے بھی تھے۔ میں نے وہ پلاؤ واپس کر دیا مٹر پلاؤ کی جو دوسری پلیٹ آئی اس میں انڈے کے ٹکڑے تھے۔ انھوں نے وہ بھی واپس کر دی اور ویٹر سے کہا صرف مٹر کے چاول لاؤ۔ ہوٹل کے مالک نے پریشان ہو کر کہا:

"تو کیا انھیں گھاس کھلا دوں؟"

جنیوا بہت خوبصورت اور دل لبھانے والی جگہ تھی، مگر اس خوبصورتی میں فطرت سے زیادہ انسان کا ہاتھ تھا۔ بہت بار لوگوں کو کشمیر اور سوئٹزرلینڈ کا مقابلہ کرتے سنا تھا اور انھوں نے سوئٹزرلینڈ کو فوقیت دی تھی۔ مگر جنیوا آ کر ایسا محسوس ہوا یہ خوبصورت ضرور ہے مگر اس کے پیڑوں اور ہواؤں میں وہ خوشبو نہیں جو کشمیر کے برگ و بار میں ہے۔ وہ رومان نہیں تھا جو کشمیر کے مناظر میں تھا۔ جنیوا میں کشمیر کا خیال آیا تو ایک شدید احساسِ زیاں کا بھی احساس ہوا۔ کتنے لوگ تھے جو ایک بہت بڑے خسارے کی طرح میری یاد سے لپٹے ہوئے ہیں، جن کے گھروں میں جا کر میں مکئی کی روٹی اور کرم کا ساگ بنواتا تھا۔ کشمیری کھانوں کی فرمائش کرتا تھا ایک بار ایک مشاعرہ میں جا کر کشمیر میری زندگی کا حصّہ بن گیا تھا۔ جنیوا میں جنیوا کا سب تھا، کشمیر کا کچھ نہیں تھا۔ نہ عیش مقام، نہ پہلگام، نہ گل مرگ، نہ جھیل کے مناظر اور شکارے اور نہ وہ ہوا اور فضا۔

میرا اگلا پڑاؤ روم تھا۔ دو تین دن اور جنیوا میں ٹھہر کر روم چلا گیا۔ روم اپنے عروج کے زمانے میں بہت بڑا تہذیب اور ثقافت کا مرکز رہا تھا۔ جہاں تک آب و ہوا کا تعلق تھا تھوڑی بہت ہمارے ملک کی آب و ہوا سے بھی مماثلت تھی۔ مگر میرے لئے آب و ہوا سے زیادہ اس کے ماضی کی تاریخ زیادہ اہم تھی۔ میں نے دو تین دن رُک کر اس کی تاریخی عمارتیں دیکھیں۔ بازاروں میں گھومتا رہا۔ شام کو کسی بار یا کیفے کے برآمدے میں بیٹھ کر شام کا منظر دیکھتا رہا۔ ایک روز ایک کیفے کے برآمدے میں بیٹھا تھا کہ کچھ مرا کو کے لڑکے آ گئے۔ کالجوں کے طالب علم تھے، کچھ انقلابی قسم کے۔ اکیلا دیکھ کر مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ جب معلوم ہوا میں ہندوستان سے آیا ہوں تو بے تکلف ہو گئے۔

"آیئے آپ کو روم کی سیر کرائیں۔" ایک لڑکے نے بے تکلفی سے کہا۔ میں ساتھ ہو لیا اور اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے وہ مجھے ایک جگہ لے گئے جہاں بہت سی مختلف عمروں کی لڑکیاں تھیں۔ شاید وہ لڑکے اکثر وہاں آتے رہے ہوں گے۔ ایک چھریرے بدن کی سانولی سی رومی لڑکی تھی۔ اس نے میرا نام پوچھا اور مجھے خوش کرنے کے لئے میرے نام کی گردان شروع کر دی۔ اس کی اس حرکت سے مجھے بڑی الجھن ہوئی اور میں بہانہ کر کے وہاں سے نکل آیا۔ عورت کو کسی ناگوار ماحول میں دیکھ کر مجھے بڑا افسوس اور تکلیف ہوتی ہے۔

بہت دن کی بات ہے۔ ایک روز عصمت چغتائی کا ٹیلیفون آیا۔

"اختر! عورت کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟" وہ شاید اس موضوع پر کچھ لکھ رہی تھیں۔

میں نے کہا۔ "زندگی میں توازن پیدا کرتی ہے۔"

مگر رائے اپنی جگہ پر ہے اور زندگی میں عورت کے ساتھ برتاؤ الگ چیز ہے۔ مرد اور عورت کو ایک ساتھ رہتے ہوئے قرنہا قرن گزر گئے مگر کبھی وہ خود بیچارگی کا شکار ہوتی ہے، کبھی آدمی اس کے ہاتھوں بے چارگی کا شکار ہے۔ سماج اور معاشرے میں ایک دوسرے کی ٹھیک جگہ کیا ہے، ابھی تک اس کا تعین نہیں ہوا۔ ایک دو روز روم میں رہ کر میں بمبئی واپس آ گیا۔

یُجنے کو گھوم گھام کر واپس آ تو گیا مگر سفر ختم نہیں ہوا۔ کچھ دن بعد پھر جنوبی ہند کی طرف نکل گیا۔ کچھ فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں، کچھ مشاعرے میں شرکت کی غرض سے۔ جنوبی ہند میں بننے والی دو فلمیں میرے پاس تھیں۔ ایک "آنند بھون" دوسری "آدمی"۔ آنند بھون کے لئے اوٹی اور کوڈے کینال گیا، اور آدمی کے لئے مدراس اور کوڈے کینال۔ قاضی سلیم کی دعوت پر اورنگ آباد بھی گیا۔ اور دوسری بار ایلورا، ایجنتا دیکھے۔ اس سفر میں سلطانہ بھی میرے ساتھ تھیں۔ اسی سفر میں ایجنتا جاتے ہوئے شفیق فاطمہ شعریٰ کا بھی ساتھ ہو گیا۔ شعریٰ کم گو سی ہیں مگر بات کرتی ہیں تو اچھی لگتی ہیں۔ ان کی شاعری رسائل اور کتابوں میں پڑھ چکا تھا۔ مگر آرام سے بیٹھ کر بات کرنے کا اتفاق اب ہوا تھا۔

مشاعرے کی اہمیت میری نظر میں ادبی کبھی نہیں رہی تھی، خوش فکر لوگوں کے وقت گزارنے کا ایک طریقہ تھا مگر جب شاعری رسائل اور کتابوں میں چھپی تو بلانے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ اکثر جگہ تو میں انکار ہی کر دیتا تھا اور اب تک بھی یہی روئیہ ہے۔ اس لئے کہ آج کی شاعری اگر توجہ سے اچھی طرح پڑھ نہ رکھی ہو تو سننے سے سمجھ میں نہیں آتی۔ مگر دکن میں نئے لکھنے والوں میں کچھ ایسے نوجوان آ گئے تھے جو شاعری کے بدلتے ہوئے انداز کو سراہنے

لگے تھے۔ مرکزی شہر حیدر آباد تھا۔ جن دنوں میں علیگڑھ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھا انھیں دنوں سے میرا حیدر آباد آنا جانا تھا۔ یہ نظامِ دکن کی حکومت کا زمانہ تھا۔ ان کی سواری نکلتی تھی تو شہر کے راستے بند ہو جاتے تھے اور جب تک سواری نکل نہ جائے بند رہتے تھے۔ حیدر آباد شہر مجھے پسند آیا تھا۔ بہت کُھلا کُھلا، چوڑی چوڑی سڑکیں، دکنی زبان، باشندوں کا دعا سلام کا طریقہ، بیٹھنے اٹھنے کے آداب، ڈھنگ اور ڈھب مجھے اچھا لگا تھا۔

ایک زمانے میں ادب کے دو بڑے مرکز تھے۔ لکھنؤ اور دلّی۔ بعد میں تیسرا مرکز لاہور بن گیا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ حیدر آباد نے چوتھے مرکز کی شکل اختیار کر لی تھی۔ نظامِ دکن خود بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ باقاعدہ ان کے اساتذہ مقرر تھے۔ ایک زمانے میں فانیؔ اور اس کے بعد جوشؔ بھی رہے۔ جب شاعری کے پرانے چلن اور مزاج میں تبدیلی آئی تو مجھے بھی حیدر آباد کے مشاعروں میں بلایا گیا اور بہت سے نئے پرانے شعراء سے ملاقات ہوئی جیسے شاہد صدیقی، مخدوم محی الدین، سلیمان اریب، شاذ تمکنت، عزیز قیسی، وحید اختر، بشر نواز، راشد آذر۔ ان کے علاوہ اور بہت سے نام ہیں جو اس وقت ذہن میں نہیں۔ یہاں مجھے ان شعراء کی نجی زندگی کا بہت ذکر نہیں کرنا ہے۔ البتہ جو مجھ سے زیادہ قریب ہوئے جیسے شاہد صدیقی، شاذ تمکنت، سلیمان اریب، عزیز قیسی، راشد آذر اور وحید اختر۔ ان کے بارے میں کچھ چلتے چلاتے کہنا ہے۔ وحید اختر تعلیم سے فارغ ہو کر علیگڑھ یونیورسٹی چلے گئے۔ اب وہاں فلسفہ پڑھاتے ہیں۔ ان کی شادی ایک ایرانی لڑکی سے ہوئی تھی جو شادی کے ایک زمانے بعد ایران جاتے ہوئے، ہوائی حادثے کا شکار ہو گئی۔ شاذ تمکنت فلم کے گانے لکھنا چاہتے تھے مگر میں نے اصرار کیا، پہلے تعلیم پوری کر لو۔ انھیں کچھ مالی مشکلات پیش آگئی تھیں مگر جوں توں کر کے ایم۔ اے۔ کر ہی لیا اور ایک کالج میں اردو کے استاذ ہو گئے۔ اب وہ بھی حیات نہیں، کثرتِ شراب نوشی کی نذر ہو گئے۔ عزیز قیسی فلموں کے لئے لکھنے لگے تھے۔ کینسر کے مرض سے ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ مخدوم محی الدین اور شاہد صدیقی بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ شاہد اور مخدوم دونوں بہت زندہ دل انسان تھے۔ اریبؔ بھی کثرتِ شراب نوشی کی نذر ہو گئے۔

یہ دراصل میرا پورے دکن ہی کا سفر تھا۔ اوٹی سے واپسی میں بیدل کے راستے آیا۔ ایک فلم کے گروہ کے ساتھ تھا۔ انھیں راستے میں کچھ مناظر کی شوٹنگ کرنی تھی۔ اس ضمن میں میسور اور بنگلور سے بھی گزرنا ہوا اور وہاں کے ادیبوں اور شاعروں سے بھی ملاقات ہوئی۔ زیادہ تر لکھنے والے بنگلور میں تھے۔ صمد شاہین اور ممتاز شیریں سے ملا۔ محمود ایاز سے بھی وہیں تعارف ہوا۔ عزیز اللہ بیگ اور خلیل مامون سے اب ملاقات ہوئی ہے۔ میرا پچھلے دنوں کئی بار بنگلور جانا ہوا تھا۔

نیر مسعود

میر انیس

۱۔ زندگی نامہ

۱۔ نام: سید ببر علی رضوی۔

۲۔ عرفیت: لکھنو میں "بڑے میر صاحب" بھی کہلاتے تھے۔

۳۔ تخلص: پہلے حزیں تھا، پھر شیخ ناسخ نے بدلوا کر انیس تجویز کیا۔

۴۔ ولادت: گلاب باڑی، فیض آباد ۱۸۰۳ء۔

۵۔ والد: میر مستحسن خلیق، ابنِ میر حسن، ابنِ میر ضاحک۔

۶۔ والدہ: چینگا بیگم۔

۷۔ بھائی بہن: ۱۔ میر مہر علی (انس) ۲۔ میر نواب (مونس) ۳۔ پیاری بیگم ۴۔ بندی بیگم ۵۔ آبادی بیگم ۶۔ ہرمزی بیگم (انیس سب سے بڑے تھے)۔

۸۔ اساتذہ: میر کلو، مولوی میر نجف علی فیض آبادی، مولوی حیدر علی فیض آبادی (درسیات میں) میر خلیق (غزل، مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں) شیخ ناسخ (وقتی اور رسمی طور پر غزل میں) میر امیر علی ابن میر کاظم علی سفید پوش دہلوی (سپہ گری میں)۔

۹۔ شاعری کی ابتدا: بچپن ہی سے شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ گیارہ بارہ سال کی عمر سے غزل گوئی کی تعلیم شروع ہوئی۔ جب کلام میں پختگی آگئی تو میر خلیق نے غزل گوئی سے روک کر مرثیہ و سلام کہنے میں لگا دیا۔ اس سے پہلے تیرہ چودہ سال کی عمر میں گھر کی زنانی مجلس کے لیے مرثیے کے کچھ بند اور اس سے بھی پہلے ایک سلام کہہ چکے تھے۔

۱۰۔ مرثیہ خوانی کی ابتدا: قریب انیس سال کی عمر میں فیض آباد کے رئیس مرزا محمد ابراہیم عرف مرزا سیدو کے یہاں پڑھنے پر مقرر ہوئے۔

۱۱۔ شادی: تخمیناً ۱۸۲۲ء میں۔

۱۲۔ اہلیہ اور خسر: فاطمہ بیگم، بنت میر احمد علی رسالدار۔

۱۳۔ اولاد: (بہ ترتیب ولادت) ۱۔ میر خورشید علی (نفیس) ۲۔ عباسی بیگم ۳۔ مہندی بیگم ۴۔ میر عسکری (رئیس) ۵۔ میر محمد (سلیس) ۶۔ آغائی بیگم۔

۱۴۔ فیض آباد کی قیام گاہ کا پتہ: "فیض آباد عرف بنگلہ، محلہ رائٹھ حویلی، متصل در دولت نواب شجاع الدولہ مرحوم" (ایک مرثیے کے قدیم مخطوطے سے منقول)۔

۱۵۔ لکھنو میں مرثیہ خوانی کی ابتداء: پہلی مجلس اکرام اللہ خاں کے امام باڑے، چوک میں یا مصطفی خاں کے یہاں تحسین گنج میں پڑھی۔ اس کے بعد برابر لکھنو بلائے جانے لگے۔

۱۶۔ لکھنو میں مستقل سکونت: قریب ۱۸۴۶ء سے (بہ عہد امجد علی شاہ)۔

۱۷۔ لکھنو کی قیام گاہیں: شیدیوں کا احاطہ، سبتی، نخاس، منصور نگر، پنجابی ٹولہ (راجا کی بازار) اور آخر میں سبزی منڈی (چوک)۔

۱۸۔ آخری قیام گاہ کا پتا: "شہر لکھنو، عقب چوک، بہ سبزی منڈی، محلہ آئینہ سازاں بہ مکان گھسین آئینہ ساز" (میر انیس کے نام ایک خط کے لفافے سے منقول) یہی علاقہ چوبداری محلہ بھی کہلاتا ہے۔ مکانِ انیس کو جانے والی گلی کا نام "کوچۂ میر انیس" رکھا گیا ہے۔

۱۹۔ ملازمین: ۱۔ غلام عباس ۲۔ نجف علی ۳۔ علی حسین ۴۔ راحت علی ۵۔ میر اکبر علی (داروغہ) اور ۶۔ کسیا (مالی) کے نام ملتے ہیں۔

۲۰۔ سواری: پینس۔

۲۱۔ دل چسپیاں: ۱۔ کبوتر پالنے کا شوق تھا۔ ۲۔ ایک بلی پالنے کی بھی روایت ملتی ہے ۳۔ پتنگ اڑاتے تھے مگر پیچ نہیں لڑاتے تھے ۴۔ ورزش کرتے تھے ۵۔ حقہ پینے کے عادی تھے اور فیض آباد کا تیز تمباکو پسند کرتے تھے ۶۔ عملیات سے دل چسپی تھی ۷۔ آم بہت شوق سے کھاتے تھے خصوصاً بنارس کا لنگڑا آم ۸۔ اچھی اچھی چھڑیاں جمع کرنے کا بھی شوق تھا ۹۔ کتابیں بھی جمع کرتے تھے۔ ذاتی کتب خانے میں کوئی دو ہزار کتابیں تھیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ایرانی خط میں شاہ نامہ فردوسی کا ایک باتصویر مطلا مخطوطہ بڑی قیمت (دو سو روپے) دے کر خریدا ۱۰۔ موسیقی سے بھی دل چسپی تھی۔

۲۲۔پسندیدہ شاعر: فردوسی۔

۲۳۔مرثیہ خوانی کی مجلسیں: جب تک اودھ کی سلطنت باقی رہی عشرہ محرم میں لکھنو سے باہر پڑھنے نہیں گئے۔ لکھنو میں نواب مبارک محل، دیانت الدولہ، وزیر اودھ نواب علی نقی خاں، نواب امجد علی خاں حضور، ممتاز العلما سید تقی صاحب مجتہد اور دوسرے رئیسوں اور معززین کے یہاں پڑھتے تھے۔ شاہی کے خاتمے کے بعد پٹنہ، بنارس، حیدرآباد دکن، الہ آباد، کان پور وغیرہ مجلسیں پڑھنے گئے۔

۲۴۔مرثیہ خوانی کا انداز: دیکھیے احوال۔

۲۵۔حلیہ: دیکھیے احوال۔

۲۶۔لباس: دیکھیے احوال۔

۲۷۔غذا: دیکھیے احوال۔

۲۸۔کردار اور شخصیت: دیکھیے احوال۔

۲۹۔بیماریاں: جگر کی خرابی، تپ دق کا بھی شبہ کیا جاتا تھا۔

۳۰۔آخر عمر: بہت دبلے، کم زور اور دائم المرض ہو گئے تھے۔ مرثیہ پڑھنا تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ پھر بھی بہت اصرار پر اگر تھوڑی دیر بھی پڑھتے تھے تو سننے والوں کو مسحور کر لیتے تھے۔

۳۱۔آخری مجلس: شیخ علی عباس وکیل کے یہاں (محلہ بخاری ٹولہ، لکھنو) یا آغا ابو صاحب کے یہاں (محلہ ترمنی گنج، لکھنو)۔

۳۲۔مرض الموت: ستمبر ۱۸۷۴ء سے بیماری بڑھ گئی۔ جگر پر ورم آگیا اور پھر بستر سے اٹھ نہیں سکے۔

۳۳۔وفات: ۱۰/ دسمبر ۱۸۷۴ء کو قریب شام اپنی محل سرا میں انتقال کیا۔

۳۴۔تدفین: حکومت سے اپنے باغ میں خاندان کی میتیں دفن کرنے کی اجازت پہلے ہی حاصل کر لی تھی۔ ۱۰/ اور ۱۱/ دسمبر کی درمیانی شب اسی باغ میں اپنے بنوائے ہوئے ایک کمرے میں دفن ہوئے۔ اب اس کمرے کی جگہ پر مقبرہ تعمیر ہو گیا ہے (عقب مسجد تحسین، چوک، لکھنو)۔

۳۵۔ادبی آثار: غزلیں زیادہ تر تلف کر دیں، پھر بھی کچھ غزلیہ کلام موجود ہے۔ تقریباً دو سو مرثیے، سوا سو کے قریب سلام، کوئی چھ سو رباعیاں، چند مستزاد، اور نوحے چھپ چکے ہیں۔ فارسی میں بعض قطعات

تاریخ اور کچھ خطوط محفوظ رہ گئے ہیں ۔ غیر مطبوعہ کلام باقی ہے مگر نہیں کہا جا سکتا کہ کتنا ہے ۔

۳۶ ۔ شاگرد: مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں پچاس کے قریب شاگردوں کا سراغ ملتا ہے ، ان میں سب سے نامور انیس کے بڑے بیٹے میر خورشید علی نفیس تھے جن کے بیٹے سید خورشید حسن عرف دولھا صاحب عروج پر مرثیہ خوانی کے سحر آمیز فن کا خاتمہ ہو گیا ۔

۲ ۔ احوال

۱۸۷۴ ، میر ببر علی انیس کی زندگی کا آخری سال تھا جس کے آخری مہینے میں ان کی وفات ہو گئی (۲۹ / شوال ۱۲۹۱ھ) ۔ مرض الموت میں وہ اپنے منجھلے بھائی میر مہر علی انس سے آزردہ تھے ۔ اسی زمانے میں میر انس نے انیس کے ایک عقیدت مند حکیم سید علی کو خط میں لکھا:

"میر ببر علی صاحب کی طبیعت بہت علیل ہے ۔ رجب کے مہینے سے ماندے ہیں ۔ میں نے جانے کا قصد کیا تھا لیکن فرمایا کہ اگر وہ آئیں گے تو میں چھریاں اپنے مار لوں گا ، اور میرے جنازے پر بھی آئیں گے تو جب تک وہ جانہ لیں تو اگر تین دن گذر جائیں تو میرا جنازہ نہ اٹھانا ۔ اور اس طرح بہت کلمات کہلا بھیجے ہیں ۔ میں ابھی تک نہیں گیا مگر میرا دل نہیں مانتا" (۱)

کچھ دن بعد انہیں حکیم سید علی کو میر انس نے لکھا:

"تمام ماہ رمضان میں دن بھر تو میں اپنے حال میں بہ سبب صوم گرفتار رہتا تھا اور بعد افطار کے بھائی صاحب کی علالت کی خبر سن سن کر رویا کرتا تھا اور دعائیں پڑھ پڑھ کے نصف شب کو ان کی صحت کی دعا کیا کرتا تھا ۔ اور بے تاب ہو کر میں میر نواب سے کہتا تھا کہ "بھائی اب میں گھٹ گھٹ کے ان سے پہلے مر جاؤں گا" تو وہ کہتے تھے کہ "خدا کے واسطے آپ نہ جائیے ، کس واسطے کہ وہ اپنے لڑکوں سے وصیت کر چکے ہیں کہ میر مہر علی کو میرے جنازے پر نہ آنے دینا" یہ سن کے میں چپ ہو رہتا تھا ۔ عید کے دن میر نواب میرے پاس آئے تو میں مثل بیماروں کے منھ لپیٹے پڑا تھا ۔ جب وہ آئے تو میں اٹھا اور

بھائی کا حال میں نے پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ "میں وہیں سے آتا ہوں آج نہایت غشی ہے کہ آنکھ نہیں کھولتے، اور پاؤں پر بہت ورم آگیا ہے۔" بس یہ سنتے ہی میں قریب تھا غش کھاکر گر پڑوں اور اس قدر میرا خون اونٹا کہ میں چیخیں مار مار کر رونے لگا۔ ساری گھر کی عورتیں بھی رونے لگیں۔ جب بعد دیر کے میرا دل تھما تو میں نے میر نواب سے کہا کہ "بھائی، اب مجھ کو تاب نہیں ہے۔ آج شام کے قریب میں ضرور جاؤں گا۔" الغرض چار پانچ گھڑی دن رہے میں عالم بے تابی میں اپنے گھر سے چلا تو بہ خدائے لم یزل راہ میں بھی میرے آنسو بہتے جاتے تھے۔ جب پہنچا تو میں دیوان خانے میں دم بھر بیٹھا اور خورشید علی اور عسکری کو ان کے گھروں سے بلوا بھیجا۔ جب وہ آئے تو سہمے ہوئے تھے۔ میر خورشید علی کا بھی رنگ فق ہو گیا اور عسکری کا بھی۔ میں نے پہلے کیفیت مزاج کی پوچھی تو کہا کہ "آج غشی بہت ہے۔" میں نے کہا کہ "کوئی چھپنے والا تو نہیں ہے؟" کہا کہ "فقط خالہ آپ سے چھپتی ہیں۔" میں نے کہا کہ "تم بڑھو اور ان سے فقط کہہ دو کہ ہٹ جائیں، اور کچھ اطلاع بھائی سے نہ کرنا۔" وہ اندر گئے اور میں بھی اندر گیا تو تینوں لڑکے دوسرے دالان میں مارے خوف کے چھپ گئے اور بہنیں میری بھی ہٹ گئیں۔ الگ الگ سب تھر تھر کانپتے تھے کہ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ غرض جہاں بھائی کا پلنگ تھا وہاں میں گیا تو دیکھا میں نے کہ آنکھیں بند کیے ہیں۔ میں نے سرہانے بیٹھ کر گال پر گال رکھ کے رو رو کے کہا کہ "میں اس نقاہت کے تصدق ہو گیا ہوتا اور میری آنکھیں اندھی ہو گئی ہوتیں کہ یہ حال نہ دیکھتا۔ برائے خدا آنکھیں کھولیے کہ میں مہینا بھر سے تڑپتا ہوں۔" یہ جو میں نے چلا چلا کے کہا اور عالم بے تابی میں منھ سے منھ ملا تو گو غش تھے مگر میری آواز پہچانی اور ایسا روئے کہ آنسو تکیے پر ٹپکنے لگے۔ اور میں نے رو رو کر عالم بے تابی میں کہا کہ "خداوندا، واسطہ اپنی خدائی کا، مجھ سے ان کی نقاہت کی صورت نہیں دیکھی جاتی۔ ان سے پہلے مجھ کو اٹھالے۔" تو پھوٹ پھوٹ کر خود بھی رونے لگے اور آہستہ فرمایا کہ "ارے بھائی، کیوں اپنے تئیں مارے ڈالتے ہو، میں تو اب اچھا ہوں، اور میرے سر کی قسم، سکوت کرو نہیں تو میرا دم اکھڑ

> جائے گا"۔ اس مابین میں لڑکے تینوں اور لڑکیاں اور بہنیں، سب کا ہجوم ہوا۔ بس، پھر میں چپ ہوا تو آہستہ آہستہ ساری حقیقت مجھ سے کہی، پاؤں کا ورم دکھلایا۔ دس بجے تک شب کو میں بیٹھا رہا اور باتیں رہیں۔ پھر مجھ سے کہا کہ "رات بہت آتی ہے، گھر دور ہے، اب تم جاؤ"۔ میں گھر پر آیا، عید کے دن سے میں سہ پہر کو جاتا ہوں اور دس بجے شب کو آتا ہوں۔"

اس بیان سے انیس کی نازک مزاجی کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کے اس رعب اور دبدبے کا بھی اظہار ہوتا ہے جو مرض الموت کی بے بسی میں بھی برقرار تھا۔ یہ انیس کی شخصیت کے نمایاں عناصر تھے جنہوں نے ان کے دوسرے اوصاف، خصوصاً شاعرانہ کمالات، کے ساتھ مل کر ان کو ایک بادشاہ کی سی حیثیت دے دی تھی۔ انیس کی اس شخصیت کی تعمیر فیض آباد سے شروع ہوتی ہے جہاں ۱۸۰۳ء (۱۲۱۸ھ) میں ان کی ولادت ہوئی۔

٭O٭O٭O٭O٭O٭

انیس کے والد میر مستحسن خلیق، دادا میر حسن اور پردادا میر ضاحک اردو ادب کی معروف شخصیتیں ہیں۔ میر ضاحک اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے لیکن ان کی انفرادیت یہ تھی کہ انہوں نے معیاری اور ٹکسالی اردو کو مسخ کر کے ایک مہمل نما زبان اختراع کی تھی جس میں وہ مزاحیہ اور ہجویہ شاعری کرتے تھے۔ میر حسن بہت عمدہ غزل گو اور اردو شاعروں کے ایک اہم تذکرے کے مصنف تھے لیکن ان کا شاہکار ان کی مثنوی "سحرالبیان" تھی جو آج بھی اردو کی بہترین مثنویوں میں شمار ہوتی ہے۔ میر خلیق نے غزل گو کی حیثیت سے شہرت اور استادی کا درجہ حاصل کیا۔ ان کے بہت شاگرد تھے (جن میں نواب سید محمد خاں رند اور میر علی اوسط رشک بھی شامل تھے) لیکن خلیق کے اصل جوہر مرثیہ گوئی میں کھل کر سامنے آئے۔ انہوں نے میر ضمیر، مرزا فصیح اور میاں دلگیر کے ساتھ مل کر اردو مرثیے کو ایک ادبی صنف سخن کی حیثیت سے استحکام بخشا اور مرثیے کے ان چاروں ستونوں میں خلیق کی زبان سب سے مستند سمجھی جاتی تھی۔

انیس میر خلیق کی اولاد میں سب سے بڑے تھے اور ان کی ولادت کے وقت خلیق کی عمر پینتیس چھتیس سال کی ہو چکی تھی۔ اس زمانے کو دیکھتے ہوئے، جب عموماً بیس سال کی عمر سے پہلے پہلے مردوں کی شادی اور اولاد ہو جایا کرتی تھی، یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خلیق کے لیے ان کے اس فرزند کی کتنی اہمیت تھی۔ انیس کے ابتدائی حالات پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیق نے ان کی تعلیم و تربیت کسی خاص منصوبے کے تحت اور اس ادبی، تہذیبی اور مذہبی ماحول کو پیش نظر رکھ کر کی تھی جس میں آگے چل کر انیس کو زندگی گذارنا تھی۔ اسی منصوبے کے تحت انہوں نے انیس کے لیے استادوں کا انتخاب کیا جن میں مولوی میر نجف علی مشہور شیعہ عالم

تھے اور مولوی حیدر علی اہل سنت کے جید علما میں تھے۔ شاعری کی اصلاح کے لیے خلیق نے اپنے بیٹے کو شیخ ناسخ کی خدمت میں پیش کیا۔ حالانکہ خلیق خود مصحفی کے شاگرد تھے۔ اور ناسخ کے مدمقابل خواجہ آتش بھی مصحفی کے شاگرد اور جانشین تھے، لیکن اس وقت زبان پر ناسخ کی اجارہ داری تھی، علاوہ بریں آتش فقیر منش اور گوشہ نشین قسم کے آدمی تھے اور ناسخ کو اودھ کی سرکاروں اور درباروں میں رسوخ حاصل تھا۔ انیس کو رسمی اور وقتی طور پر ناسخ کا شاگرد کرایا گیا تھا لیکن اس طرح ان کو لڑکپن ہی میں ناسخ کی پشت پناہی حاصل ہو گئی، اور مہدی حسن احسن کی روایت کے مطابق ناسخ ہی نے ان کا تخلص، جو پہلے حزیں تھا، بدل کر انیس تجویز کیا (۳)

خلیق نے انیس کو فن سپہ گری کی بھی باقاعدہ تعلیم دلوائی اور انیس نے ذاتی شوق سے اس فن میں مہارت حاصل کر لی (۴) جو ان کے مرثیوں کے رزمیہ حصوں میں بہت کام آئی۔

ابتدا میں انیس نے غزلیں کہیں لیکن جب فیض آباد کے مشاعروں میں انہیں مقبولیت حاصل ہونے لگی تو میر خلیق نے ان کو غزل گوئی سے روک کر مرثیہ گوئی میں لگا دیا۔ اب انیس نے اپنے اصل میدان میں قدم رکھا تھا۔ اس کے بعد وہ برسوں تک فیض آباد ہی میں رہ کر مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں غیر معمولی ریاض کرتے رہے اور اس عرصے میں لکھنو ان کے ادبی وجود سے قریب قریب بے خبر رہا۔

انیس کی ولادت سے اٹھائیس سال پیشتر نواب آصف الدولہ نے اودھ کا دارالحکومت فیض آباد کے بجائے لکھنو کو بنا لیا تھا جس کے بعد سے فیض آباد کی بے رونقی اور لکھنو کی رونق بڑھتی جا رہی تھی۔ فیض آباد کے بیشتر ممتاز شہری اور اہل قلم لکھنو منتقل ہو گئے تھے لیکن میر خلیق اور انیس فیض آباد ہی میں رہے، البتہ خلیق مرثیہ خوانی کے سلسلے میں برابر لکھنو جاتے رہتے تھے۔ یہ ان کا ذریعہ معاش بھی تھا، مگر ان کی آمدنی اتنی نہیں تھی کہ فراغت کے ساتھ بسر کر سکیں اس لئے کہ ان کی سات اولادیں (تین لڑکے، چار لڑکیاں) تھیں، البتہ انیس کا بار ان پر سے کم ہو گیا تھا اس لیے کہ انیس فیض آباد کے ایک رئیس مرزا محمد ابراہیم عرف مرزا سیدو کے یہاں مرثیہ خوانی پر مقرر ہو گئے تھے اور اپنی کفالت خود کر سکتے تھے (۵)

اس وقت لکھنو دنیا کے بڑے شہروں سے ہمسری کر رہا تھا۔ اور بعض غیر ملکی سیاح اسے پیرس، قسطنطنیہ اور قاہرہ پر فوقیت دیتے تھے۔ ہندوستان کے سب سے خوش حال شہر اور سب سے بڑے علمی، ادبی اور تہذیبی مرکز کی حیثیت سے لکھنو ملک بھر کے اہل کمال کو ایک مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ انیس کو بھی بالآخر لکھنو ہی کی سکونت اختیار کرنا تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس شہر کو اپنا مستقر بنانے سے پہلے اچھی طرح اپنا مشتاق بنانا چاہتے تھے۔ لکھنو عزاداری کا سب سے بڑا مرکز تھا اور مجالس عزا کے ایک اہم جز کی حیثیت سے یہاں مرثیے کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ خلیق، ضمیر، فصیح، دلگیر کے بعد کی نسل میں ضمیر کے شاگرد مرزا سلامت علی

دبیر اپنے چاروں پیش رووں سے زیادہ مقبول تھے اور انیس کے ہم عمر ہونے کے باوجود ان سے بہت پہلے لکھنو کے ادبی افق پر چھاگئے تھے۔ اس ماحول میں انیس فیض آباد سے لکھنو آتے اور مرثیہ پڑھ کر واپس چلے جاتے تھے۔ ان کی زبان کی فصاحت، کلام کی قوت اور خوانندگی کے کمال نے تیزی کے ساتھ دلوں کو تسخیر کرنا شروع کیا۔ ان کے ماننے والوں اور قدر دانوں کا حلقہ وسیع ہونے لگا۔ کئی جگہ ان کے پڑھنے کی مستقل مجلسیں مقرر ہو گئیں اور جلد ہی انہیں مرزا دبیر کا مدمقابل تسلیم کر لیا گیا بلکہ ایک طبقہ انہیں دبیر پر ترجیح دینے لگا۔ رفتہ رفتہ لکھنو میں انیس کی طلب بڑھتی گئی اور اب انہوں نے اس شہر میں مستقل سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

انیس امجد علی شاہ کے عہد سلطنت (۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۷ء) میں لکھنو آئے (۶) یہ ان کی خوش حالی کا دور تھا۔ کنور درگا پرشاد مہر سندیلوی اس زمانے میں انیس و دبیر کی مقبولیت کا حال لکھتے ہوئے بتاتے ہیں:

> "صاحب اقتدار امیر، نامدار شہزادے اور عالی خاندان نواب زادے ان دونوں حضرات کے گھروں پر جمع ہوتے اور مناسب خدمت بجا لاتے تھے۔ اس صورت میں دونوں صاحبوں کی آمدنی کی رقم ہزاروں تک پہنچ جاتی تھی۔" (فارسی سے ترجمہ) (۷)

اسی زمانے میں معرکہ انیس و دبیر بھی گرم ہوا جس میں دونوں باکمال ایک دوسرے کے مقابلے میں سخن کے جوہر دکھاتے تھے اور دونوں کے مداح اپنے اپنے ممدوح کی حمایت میں مباحثے سے لے کر مجادلے تک پر تیار رہتے تھے۔ لیکن خود انیس و دبیر کے مراسم خوشگوار تھے اور دونوں ایک دوسرے کے کمال کی قدر کرتے تھے۔ دبیر بہت منکسر المزاج اور صلح کل انسان تھے، لیکن انیس بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ان کی پیچیدہ شخصیت اور نازک مزاجی کے واقعات اور ان کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی نے انہیں افسانوی شہرت دے دی تھی اور وہ ہندوستان کے ممتاز ترین شہر کے ممتاز ترین شہریوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے یہ شعر غالباً اسی زمانے کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

کنج عزلت میں مثال آسیا ہوں گوشہ گیر　　رزق پہنچاتا ہے گھر بیٹھے خدا میرے لیے
آبرو و مال و فرزندان صالح عز و جاہ　　کس کی خاطر یہ ہوا جو کچھ ہوا میرے لیے
بھر دیا دامن کو مولا نے در مقصود سے　　زر دیا زر پر، عطا پر کی عطا میرے لیے

لیکن انیس کی فراغت کا یہ زمانہ طول نہیں کھینچ سکا۔ ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے اودھ کی سلطنت پر قبضہ کر لیا اور دیکھتے دیکھتے لکھنو کی خوش حالی رخصت ہو گئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں فتح پانے کے بعد انگریزوں نے لکھنو کی بے شمار خوبصورت عمارتوں کو مسمار کرا دیا اور پورے پورے محلے کھدوا دیے، اس طرح لکھنو کا ظاہری حسن بھی جاتا رہا۔ انیس کا مکان اور امام باڑا بھی

منہدم کر دیا گیا (۸) ۔ ان کے قدر دان رئیسوں میں کچھ موت کے گھاٹ اتر گئے، کچھ ترک وطن کر گئے اور کچھ خود محتاج ہو گئے ۔ اب انیس کو معاش کی فکر ستانے لگی ۔ شاہی کے وقت تک ان کو مرثیہ خوانی کے لیے لکھنو سے باہر جانے کی مجبوری نہیں پیش آئی تھی لیکن اب گھر بیٹھے رزق پہنچنے کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا اس لیے وہ دوسرے شہروں کے سفر پر مجبور ہوئے ۔ ۱۸۵۹ء سے انہوں نے مرثیہ خوانی کے لیے لکھنو کے باہر جانا شروع کیا اور عظیم آباد، بنارس، الہ آباد، کان پور، حیدر آباد وغیرہ میں مجلسیں پڑھیں ۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ دور دور تک لوگ ان کے کلام اور کمال سے واقف ہو کر ان کے مداح بن گئے لیکن خود انیس نے آزردہ ہو کر لکھنو میں مرثیہ پڑھنا چھوڑ دیا ، حالانکہ ان کو مرثیہ خوانی کا لطف لکھنو ہی میں آتا تھا ۔ انہیں اس بات کا ملال تھا کہ اہل لکھنو نے انہیں کسب معاش کے لیے باہر نکلنے سے روکا نہیں ، اور روایت تو یہاں تک ہے کہ انہوں نے بارہ سال تک لکھنو میں مرثیہ نہیں پڑھا ۔ ۱۸۷۰ء میں اودھ اخبار لکھنو نے لکھا:

> "ہم کو نہایت افسوس ہے کہ میر انیس صاحب نے مرثیہ پڑھنا ترک فرمایا ہے اور شاید تصنیف فرمانا بھی چھوڑ دیا ہے ۔ غیر ملکوں کے آدمی جو لکھنو میں وارد ہوتے ہیں بیشتر حسرت و افسوس سے کہتے ہیں کہ ہم نے میر صاحب کو نہیں سنا" (۹)

۱۸۷۱ء میں انیس مرثیہ خوانی کے لیے حیدر آباد گئے تھے ۔ وہاں سے ان کے ایک میزبان شریف العلما مولوی سید شریف حسین نے اپنے بھائی کو لکھا:

> "میر انیس کا پڑھنا قابل وجد ہے ۔ جو لطف اہل لکھنو کو میسر نہیں ، وہ یہاں ہوگا ۔" (۱۰)

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں انیس لکھنو میں مرثیہ پڑھنا ترک کیے ہوئے تھے ۔ اسی سال انیس حکیم سید علی کو ایک خط میں بتاتے ہیں کہ میں کئی سال بیمار رہا، مرثیہ خوانی کا شغل بالکل ترک تھا ۔ مرثیہ کہنے کی طرف بھی توجہ نہیں ہوتی تھی ۔ بعض احباب کے اصرار پر دو مرثیے کہے ہیں جو نامکمل ہیں (۱۱)

لیکن ترک کے اس زمانے میں انیس اپنے خاص قدر دانوں اور عزیزوں کی التجا پر گاہے گاہے لکھنو میں مرثیہ پڑھ دیتے تھے ۔ ایسے موقعوں پر انہیں سننے کے لیے خلقت ٹوٹ پڑتی تھی ۔ ایسی ایک مجلس کا بیان انیس کے پوتے دولھا صاحب عروج کے سوانح نگار سید حسن رضا نے اس طرح کیا ہے:

> "جیٹھ بیساکھ کا زمانہ تھا ۔ دھوپ سخت پڑ رہی تھی ۔ میدان میں تنگیروں کے نیچے مجلس تھی ۔ دھوپ تنگیروں سے چھن رہی تھی ۔ تمام شہزادگان اور روسا اور شرفا کا مجمع تھا ۔ صراحیاں پانی کی چار

جانب مجلس میں رکھوا دی تھیں ۔ پنکھے بے شمار لوگوں کے لیے
تقسیم کر دیے تھے ۔ اس پر لوگ گرمی سے بے تاب تھے ۔ میر صاحب
نے آن کر یہ رنگ دیکھا ۔ منبر پر تشریف لے جاکر فورآ رباعی نظم
فرمائی:

دھوپ آتے ہی یاں پہ زرد ہوجاتی ہے آندھی آتی ہے گردہو جاتی ہے
پنکھے آہوں کے ، آنسوؤں کا چھڑکاؤ یاں گرم ہوا بھی سرد ہوجاتی ہے

اس مجلس کا اندازہ آپ کو اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک مصرع جو میر
انیس صاحب پڑھتے تھے ، اس مصرع کو مونس صاحب درمیان مجلس
میں کھڑے تھے وہ پڑھتے تھے ، تب تمام مجلس تک آواز جاتی تھی ۔
اتنی بڑی مجلس کوئی نہیں ہوئی " (۱۲)

جس طرح انیس کا کلام سحر آمیز ہے اسی طرح ان کا پڑھنا مسحور کن تھا ۔ منبر پر پہنچ کر ان کی شخصیت بدل جاتی تھی اور وہ بوڑھے سے جوان اور بیمار سے تندرست نظر آنے لگتے تھے ۔ آواز کے زیر و بم ، لہجے کے اتار چڑھاؤ ، آنکھوں کی گردش اور ہاتھوں کی خفیف سی جنبش سے وہ اہل مجلس پر نظر بندی کا سا عالم طاری کر دیتے تھے اور جو کچھ وہ مرثیے میں بیان کرتے ، حاضرین کو وہ اپنے سامنے نظر آنے لگتا تھا ۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ تحت اللفظ خوانی کے فن کا ان سے بڑا کوئی ماہر پیدا نہیں ہوا ۔ ان کی مرثیہ خوانی کے جو متفرق بیان ہم تک پہنچے ہیں وہ ہم کو ان کے کمال فن کا تھوڑا اندازہ کرا سکتے ہیں ۔ نواب تہور جنگ کی دعوت پر انیس حیدرآباد گئے تھے لیکن وہاں پہنچ کر بیمار پڑ گئے ۔ چھ دن تک غذا ترک رہی اور رات کو تیز بخار کی وجہ سے ان پر غشی طاری ہو جاتی تھی ۔ میر مونس کے نام حیدرآباد سے انہوں نے جو خط بھیجا اس میں یہ تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" جب میں غش سے آنکھ کھولتا تو دیکھتا تھا کہ میر عسکری (رئیس)
رو رہے ہیں ۔ کہاں تک لکھوں کہ یہی حال پہلی محرم تک رہا ۔ پہلی
تاریخ قریب پانچ ہزار کا مجمع ہو گیا تھا ، تہور جنگ بہادر نے میرے
پاس آکر کہا کہ اگر آپ میں طاقت ہو تو مجلس میں شریک ہوں ، شاید
مجلس کی برکت سے مرض میں تخفیف ہو جائے ۔ میں عجب حال زار
سے مجلس میں پہنچا ۔ میر محمد (سلیس) سے پڑھنے کو کہا ۔ انہوں نے
چند بند پڑھ کر ختم کر دیا ۔ میں اسی حال میں اٹھ کر منبر پر گیا اور چند
بند آہستہ آہستہ پڑھے ۔ فقط سید الشہدا کی تائید تھی کہ مجلس کا حال

دگر گوں ہو گیا ۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ لکھنو میں پڑھ رہا ہوں ۔
پڑھنے کے بعد ساری مجلس ، جو امرا اور اہل خلاف سے مملو تھی ،
میرے قدموں پر گر پڑی ۔" (فارسی سے ترجمہ) (۱۳)

شاد عظیم آبادی بتاتے ہیں کہ عظیم آباد میں انیس کو سننے سے کچھ دن پہلے وہ ان سے ملے تھے لیکن انیس نے ان کی طرف توجہ نہیں کی تھی اس لیے شاد ان سے آزردہ تھے ۔ وہ انیس کی ابتدائی مجلسوں میں شریک بھی نہیں ہوئے ۔ لیکن چوتھی محرم کو داد و تحسین کا شور سن کر وہ مجلس میں پہنچ گئے ۔ اس وقت

"میر صاحب یہ بند پڑھ رہے تھے :

وہ دشت اور وہ خیمہ ، زنگار گوں کی شان

"وہ دشت" کو سریلی آواز سے ایسا کھینچا کہ وسعت دشت کی آنکھوں میں پھر گئی ۔ اللہ اللہ ! وہ لفظوں کا ٹھہراؤ ، وہ لب و لہجہ ، وہ سریلی دل کش آواز ، وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ ، غرض کہ کس بات کو کہوں ۔ اس وقت میر انیس کی جو بات تھی کلیجے کے اندر اتری جاتی تھی ۔ وہ میر انیس نہ تھے جن کو چند دن پہلے دیکھا تھا ۔ چوتھا مصرع

بیت العتیق ، دیں کا مدینہ ، جہاں کی جان

تو اس خوبی سے ادا کیا کہ تعریف کرتے کرتے لوگ کھڑے ہو گئے ۔۔۔۔ غرض چہرے سے لے کر صف آرائی ، رخصت ، لڑائی ، شہادت ، بین ، سب پورا پڑھا ۔ آخر پسینے سے کرتا بدن میں ، ٹوپی سر پر بھیگ کر چپک گئی ، ہاتھ تھام کر منبر سے اتارے گئے ۔ سیدھے فرود گاہ کو چلے ۔ میں بھی ننگے پاؤں حیرت زدہ ساتھ ہو لیا" (۱۴)

شمس العلما مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے الہ آباد میں انیس کو سنا تھا ۔ ان کا بیان ہے :

" جب میں اس مجلس میں پہنچا تو تمام عالی شان مکان آدمیوں سے بھر چکا تھا بلکہ سیکڑوں مشتاق فرش کے کنارے زمین پر دھوپ میں کھڑے محو سماعت تھے ۔ جب میں پہنچا تو مرثیہ شروع ہو چکا تھا اور میرا مجلس کے اندر جگہ پانا نا ممکن تھا ، اس لیے میں بھی وہیں دھوپ میں کھڑا ہو کر سننے اور دور سے ٹکٹکی باندھ کر میر انیس کی صورت اور ان کے ادائے بیان کو دیکھنے لگا ۔ میں میر انیس کی فصاحت بیانی اور ان کے طرز بیان کی دل فریب اداؤں کی تصویر نہیں کھینچ سکتا ، صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس سے پہلے کبھی ایسا خوش بیان نہیں

سنا اور نہ کسی کے ادائے بیان سے یہ مافوق العادت اثر پیدا ہوتے
مشاہدہ کیا۔ میر انیس بوڑھے ہو گئے تھے مگر ان کا طرز بیان جوانوں کو
مات کرتا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ منبر پر ایک کل کی بڑھیا بیٹھی ہوئی
لڑکوں پر جادو کر رہی ہے، جس کا دل جس طرف چاہتی ہے پھیر دیتی
ہے اور جب چاہتی ہے ہنسا دیتی ہے اور جب چاہتی ہے رلا دیتی ہے۔
میں اسی حالت میں دو گھنٹے کے قریب کھڑا رہا۔ میرے کپڑے پسینے
سے تر اور پاؤں خون اترنے سے شل ہو گئے، لیکن میں جب تک
میر انیس کی صورت دیکھتا اور ان کا مرثیہ سنتا رہا مجھ کو یہ کوئی بات
محسوس نہیں ہوئی۔"(۱۵)

انیس کے ایک ملاقاتی میر حامد علی سے آرہ ضلع شاہ آباد میں غالباً صفیر بلگرامی نے بیان کیا:

"میں کلام دبیر کا شیدائی تھا، کلام انیس کا قائل نہ تھا۔ ایک مرتبہ اتفاقاً
انیس کی ایک مجلس میں شرکت ہوئی اور میں بے دلی سے ان کو سننے
لگا، لیکن دوسرے ہی بند کی ۰۰۰۰ بیت

ساتوں جہنم آتش فرقت میں جلتے ہیں
شعلے تری تلاش میں باہر نکلتے ہیں

انہوں نے اس انداز سے پڑھی کہ مجھے شعلے بھڑکتے ہوئے دکھائی
دینے لگے اور میں ان کا پڑھنا سننے میں ایسا محو ہوا کہ تن بدن کا ہوش
نہ رہا۔ یہاں تک کہ جب ایک دوسرے شخص نے مجھے ہوشیار کیا تو
مجھے معلوم ہوا کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔"(۱۶)

آرزو لکھنوی کے والد میر ذاکر حسین یاس نے بھی انیس کو سنا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ ایک مجلس
میں انیس نے جب یہ مصرع پڑھا:

صحرا زمردی تھا پھریرے کے عکس سے

تو "مرثیے کو اس طرح ذرا سا پلٹ دیا کہ پھریرے کا لہرانا آنکھوں کے سامنے آگیا۔"(۱۷)

انہیں یاس کا یہ بھی بیان ہے کہ ایک سال میر انیس نے جو مرثیہ ایک دن پڑھا تھا وہی
مرثیہ دوسرے دن "بالکل دوسری طرح پڑھا۔"(۱۸)

انیس کو قدرت کی طرف سے مرثیہ خوانی کے لئے بہت موزوں اور مترنم آواز ملی تھی
جس پر وہ اس بند میں موسیقی کے تلازموں کے ذریعہ فخر کرتے ہیں:

ڈنکا ہو اس کلام کا کیونکر نہ جابجا ہر بات میں ہے نغمۂ جاں بخش کا مزہ
دکھلا رہی ہے طبع سخن ور نئی ادا پردے سے دل کے آتی ہے احسنت کی صدا

لہجہ سنو زبان فصاحت نواز کا
تار نفس میں سوز ہے مطرب کے ساز کا (۱۹)

شاد نے بھی اپنے بیان میں انیس کی "سریلی آواز" کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ انیس کے شاگرد سید آغا میر کے بیٹے سید محمد جعفر نے بھی انیس کو سنا تھا، ان کا کہنا تھا:

"میر انیس کی آواز میں جو دل کشی تھی وہ کسی انسان کا کیا ذکر، کسی خوش الحان پرند اور کسی باجے کی آواز میں بھی نہیں ہے"۔(۲۰)

یہاں بھی انیس کی آواز کی غنائیت پر زور دیا جارہا ہے۔ اور آواز ہی نہیں، انیس کی پوری ہئیتِ ظاہری مرثیہ خوانی کے لیے موزوں ترین معلوم ہوتی تھی۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

"ان کی آواز، ان کا قد و قامت، ان کی صورت کا انداز، غرض ہر شے اس کام کے لئے ٹھیک اور موزوں واقع ہوئی تھی"۔(۲۱)

اور حکیم شفاء الدولہ کے داماد نواب مرزا دلاور حسین کا کہنا تھا:

"مرثیہ پڑھنے کیا ذکر، انیس کی طرح منبر پر بیٹھنا کسی کو نہیں آیا۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ منبر کے اوپر تشریف فرما نہیں ہیں بلکہ منبر ہی سے اگ کر باہر نمودار ہوگئے ہیں"۔(۲۲)

بینیہ بند پڑھنے میں بھی انیس کو کمال حاصل تھا۔ مولوی سید باقر حسین جون پوری نے بنارس میں انیس کو سنا تھا، وہ ان کی مجلس کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جب جناب میر صاحب منبر پر سے اترے تو آٹھ نو آدمی فرش پر بے ہوش تھے"۔(۲۳)

شاد عظیم آبادی بھی انیس کے کچھ بینیہ بند نقل کر کے لکھتے ہیں:

"مجلسوں میں ان بندوں کے پڑھے جانے پر میں نے جیسے جیسے کہرام دیکھے ہیں ان کو کیا بیان کروں۔ روتے روتے آٹھ آٹھ آدمیوں کو غش آگئے"۔(۲۴)

فن میں محویت اور استغراق اور اپنی نازک مزاجی کی وجہ سے انیس مرثیہ خوانی کے دوران ذرا بھی بد نظمی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ مہدی حسن احسن لکھتے ہیں:

"وہ منبر پر پہنچ کر اپنے جذبات ضبط کو روک نہیں سکتے تھے۔ ان پر ایک عالم محویت طاری ہوتا تھا اور ان کا نشہ، کمال ان کو عالم قدس کی اس منزل پر پہنچا دیتا تھا جہاں سے اہل دول کی شان نہایت پست دکھائی دیتی تھی"۔(۲۵)

اس سلسلے میں احسن یہ واقعہ بھی بیان کرتے ہیں:

"دوران مرثیہ خوانی میں ایک رئیس مجلس میں تشریف لائے اور چاہا کہ کسی طرح مجمع کو طے کر کے منبر کے قریب پہنچ جائیں۔ میر صاحب ارادہ سمجھ گئے اور اپنی رعب دار آواز سے فرمایا کہ "بس، وہیں بیٹھ جاؤ، ایک قدم آگے نہ بڑھانا" رئیس صاحب نے وہیں غوطہ مارا اور جوتیوں کے پاس آرام سے بیٹھ گئے۔" (۲۶)

شاد عظیم آبادی لکھتے ہیں:

"عظیم آباد میں شیخ خیرات علی مرحوم پنکھیا ہلاتے ہلاتے زرا جھک گئے، آپ نے وہیں منبر پر سے ڈانٹا کہ "مرثیہ سنتے ہو یا سوتے ہو؟" (۲۷)

شاد ایک اور واقعہ بیان کرتے ہیں:

"چوک میں میر صاحب کی مجلس تھی۔ بعض رؤسا جو بہ سبب مجلس کے بھرے ہونے کے پائین میں بیٹھے تھے، کسی شدید ضرورت کے پیش آنے کے سبب چپکے عین اس وقت جب میر صاحب جوش میں پڑھ رہے تھے، مجلس سے اٹھ گئے، آپ نے مرثیہ روک کر کہا کہ "لکھنو میں سخن فہمی اور قدر شناسی کا مادہ نہ رہا" ہر چند اصرار ہوئے مگر پھر نہ پڑھا اور اتر آئے۔" (۲۸)

مرزا حیدر لکھنو کے ایک بڑے رئیس تھے جن کے بارے میں مولانا سید آغا مہدی لکھتے ہیں:

"مرزا حیدر صاحب امیر کبیر لکھنو تھے .... ان کے خصوصیات سے تھا کہ وہ جس محفل میں آجاتے تھے ان کا آب دار خانہ اور گلوریوں کا ساز و سامان، خاص دان ہمراہ لایا جاتا تھا اور سو ڈیڑھ سو حقے ان کے ساتھ چلتے تھے۔ اوسط طبقے کے لوگوں کو ان کے مدعو کرنے سے حقے پانی کی غیر معمولی راحت ملتی تھی"۔ (۲۹)

انہیں مرزا حیدر سے متعلق میر معصوم علی سوز خوان نے سید مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کو اپنا یہ چشم دید واقعہ سنایا:

"شہر کی کسی مجلس میں میر انیس پڑھ رہے تھے .... نواب مرزا حیدر .... تشریف لائے اور منبر کے قریب جا کر بیٹھے .... دستور کے موافق انکا بھنڈی خانہ، آب دار خانہ اور دست بقچہ وغیرہ بھی آنا شروع ہوا۔ اس میں دیر ہوئی۔ میر صاحب خاموش مگر غصے میں بیٹھے

رہے۔ اسی اثنا میں حاضرین مجلس میں سے کسی نے کہا" جناب میر صاحب، بسم اللہ، آپ مرثیہ شروع فرمائیں" انیس نے جھلا کر جواب دیا کہ "کیا شروع کروں، آپ کا جہیز تو آلے"(۳۰)۔

لیکن اس نازک مزاجی کے باوجود انیس عام آدمیوں کے ساتھ رعایت بھی کر جاتے تھے۔ سید خورشید حسین بجنوری کا بیان ہے:

"ایک مرتبہ میں دل آرام کی بارہ دری میں میر انیس کی مجلس سننے گیا۔ مرثیہ شروع ہو چکا تھا۔ مجمع اس قدر تھا کہ میں منبر سے بہت دور پڑ گیا۔ میں نے چاہا کہ مجمع میں گھستا ہوا منبر سے کسی قدر قریب ہو جاؤں، مگر مجمع نے راہ نہ دی۔ میں مرثیہ سننے کے اشتیاق میں ایسا بے چین تھا کہ بہ آواز بلند خود میر صاحب کو مخاطب کر کے میں نے کہا کہ "حضور، میں دور سے آپ کو سننے کے اشتیاق میں آیا ہوں۔ یہ لکھنو والے تو روز آپ کو سنا کرتے ہیں، مجھ کو یہ موقع کہاں نصیب ہے، مگر یہ لوگ مجھ کو جگہ نہیں دیتے کہ میں آپ سے کچھ قریب ہو جاؤں۔" یہ سن کر میر صاحب نے مرثیہ روک لیا اور مجھ سے فرمایا کہ "آئیے۔ تشریف لائیے۔" جب تک میں منبر کے قریب نہ پہنچ گیا، انہوں نے پڑھنا شروع نہ کیا"(۳۱)

○○○○○○○○○

"انیس کی مستند ترین تصویر وہ ہے جو ان کے ایک قدر دان نے کسی باکمال مصور سے ہاتھی دانت (۳۲) کی تختی پر بنوا کر ان کی خدمت میں پیش کی تھی (۳۳)۔ میر انیس کی جو تصویریں عام طور پر چھپتی رہتی ہیں وہ اسی ہاتھی دانت والی تصویر کا نقش مستعار ہیں۔ لیکن ان نقلوں میں اصل کے موقلم کی باریکیاں نہیں آسکیں۔ اصل تصویر میں میر انیس کی غلافی آنکھیں، آنکھوں کے نیچے باریک جھریاں، رخساروں کی ہڈیوں کا ہلکا سا ابھار، ذرا پھیلے ہوئے نتھنے اور بھنچے ہوئے پتلے پتلے ہونٹ مل کر ایک ایسے شخص کا تاثر پیدا کرتے ہیں جو بے حد ذکی الحس اور ارادے کا مضبوط ہے، دنیا کو ٹھکرا دینے کا نہ صرف حوصلہ رکھتا ہے بلکہ شاید ٹھکرا بھی چکا ہے۔ وہ کسی کو اپنے ساتھ زیادہ بے تکلف ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا اور کسی سے مرعوب نہیں ہو سکتا۔ اور اس کی خاموش اور بظاہر پر سکون شخصیت کی تہ میں تجربات اور تاثرات کا ایک طوفان برپا ہے۔ میر انیس کے جو حالات ملتے ہیں ان سے بھی ذہن میں بعینہٖ ایسے ہی شخص کی تصویر بنتی ہے"(۳۴)

انیس کی ذکی الحسی کبھی تو نازک مزاجی اور نازک مزاجی سے بڑھ کر غضب ناکی کی حد تک پہنچ جاتی تھی اور کبھی انہیں افسردگی، یاس، اکتاہٹ اور احساس تنہائی کے دورے میں مبتلا کر دیتی

تھی۔ ان کی کہی ہوئی منقبت کے یہ مصرعے انہیں ایسے ہی ایک دورے میں مبتلا دکھاتے ہیں:

"مبتلائے غم دل ناشاد ہے"، "ہے ہجوم حسرت و رنج و محن"، "دکھ تو یہ اور ہم نفس کوئی نہیں"، "میں تن تنہا ہوں بس، کوئی نہیں"، "بجھ گیا ہے خود بہ خود دل کا کنول"، "خود بہ خود افسردہ رہتا ہے مزاج"، "گھر نہ بھاتا ہے، نہ صحرا اور نہ باغ"، "کل نہیں اک آن دل کو آج کل"، "ان دنوں ہے دل کو رنج و اضطراب"

اسی کے ساتھ وہ یہ التجا کرتے ہیں:

"طبع کو، مولا، روانی دیجئے، طاقت رنگیں بیانی دیجئے، دل کو شوق مدح خوانی دیجئے" (۳۵)

اس منقبت کے کچھ مصرعوں میں انیس نے زمانے کی ناسازگاری کا شکوہ بھی کیا ہے لیکن جو مصرعے اوپر درج کیے گئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ احساس تنہائی اور بے دلی کی یہ کیفیت اپنے آپ پیدا ہو گئی ہے۔ اس کیفیت کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کو اپنی تخلیقی صلاحیتیں کند معلوم ہو رہی ہیں اور شاعری میں ان کا دل نہیں لگ رہا ہے، انیس کے اس بیان کا حوالہ دیا جا چکا ہے جس میں وہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے دو نامکمل مرثیے کہے ہیں۔ یکے بعد دیگرے دو نامکمل مرثیے کہنے کا مطلب ہوا ایک مرثیہ ادھورا چھوڑ کر دوسرا مرثیہ شروع کر دینا اور اس کو بھی ادھورا چھوڑ دینا۔ یہ بھی اسی بے دلی اور اپنے فن سے ناآسودگی کی علامت ہے۔ اور ناآسودگی کے اسی احساس کی ایک مثال ذیل کا بیان بھی ہے:

"میر انیس اکثر کہا کرتے تھے کہ افسوس ہے جو دل میں ہوتا ہے وہ پورے طور پر قلم سے ادا نہیں ہوتا۔ جیسا کہنا چاہتا ہوں ویسا نہیں ہوتا۔ میر حامد علی کہتے تھے کہ آپ کا کلام اس پائے کا تو ہوتا ہے، اب اس سے بہتر اور کیا ہوتا۔ مگر میر انیس پھر بھی فرماتے تھے کہ اس کو میرا دل ہی جانتا ہے کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ ٹھیک طور پر ادا نہیں ہوتا" (۳۶)

اسی ذکی الحسی نے انیس کو نازک مزاج اور مغلوب الغضب بھی بنا دیا تھا جسکی وجہ سے لوگ ان سے بہت محتاط ہو کر ملتے اور ان کے مزاج کا یہاں تک لحاظ کرتے تھے کہ احسن کے بہ قول "ان کے غصے کے وقت بڑے بڑے صاحب اقتدار لوگ آنکھیں نیچی کر لیتے تھے۔" (۳۷)

کتاب "وضع داران لکھنو" کے مصنف کا بیان ہے کہ اودھ کے وزیر اعظم نواب علی نقی خاں کی بڑی خواہش تھی کہ انیس کو اپنے یہاں پڑھوائیں، لیکن انیس ان کی ملاقات کو جانے سے بھی گریز کرتے رہے۔ آخر نواب نے انیس کے ایک معتقد داروغہ محمد خاں سے ساز باز کر کے

خود کو بیمار مشہور کر دیا۔ داروغہ محمد خاں نے انیس کو ان کی عیادت کے لیے جانے پر یہ کہہ کر آمادہ کر لیا کہ آپ تلوار ساتھ لیتے چلیں، اگر نواب صاحب آپ کی تعظیم و تکریم میں ذرا بھی کمی کریں تو اسی وقت میرا سر قلم کر دیجیے گا۔ جب انیس وہاں پہنچے تو " نواب صاحب نے بظاہر اس بیماری ہی میں میر صاحب کی سروقد تعظیم کی۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ جب میر صاحب رخصت ہونے لگے تو نواب صاحب نے مجلس پڑھنے کا وعدہ لیا۔" (۳۸)

اس کے بعد کا ایک واقعہ مہدی حسن احسن یوں بیان کرتے ہیں:

"آٹھویں محرم کو ایک مجلس میر انیس نواب علی نقی کے یہاں پڑھتے تھے۔ ایک روز حسب معمول مجلس شروع ہونے کا وقت آیا تو نواب صاحب نے وزیر خاں چیلے کے ہاتھ میر انیس کو پیغام بھیجا کہ میں اس وقت درد سر کے سبب سے نہایت بے چین ہوں، حاضری مجلس سے معاف فرمایا جاؤں، میر صاحب نے جواب دیا کہ آج میرا مزاج بھی درست نہیں۔ مناسب ہے جو مجلس موقوف رکھی جائے۔ انشاء اللہ سال آئندہ دیکھا جائے گا۔ نواب صاحب گھبرا کر باہر نکل آئے اور میر صاحب سے معافی مانگی اور اسی تکلیف مرض میں آخر مجلس تک بیٹھے رہے۔" (۳۹)

شریف العلما مولوی شریف حسین کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدر آباد میں انیس کی آمد کی خبر سن کر ریاست کے مدار المہام سر سالار جنگ مختار الملک بہادر نے انیس کے میزبان نواب تہور جنگ کو خاص طور پر تاکید کی کہ انیس بہت نازک مزاج ہیں، ان کی مہمان داری میں کوئی کسر نہ رہ جائے، نہ کوئی خلاف احتیاط بات ہونے پائے۔ اور ان کی خاطرداری کی کوشش کی جائے (۴۰)۔

اس سلسلے میں انیس کے بڑے فرزند میر خورشید علی نفیس کے ایک اردو خط کا اقتباس دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ خط لکھنو سے مرزا غلام محمد کے نام فیض آباد بھیجا گیا تھا۔ نفیس لکھتے ہیں:

" اور جناب والد ماجد آج تک تنباکو کی راہ دیکھتے ہیں اور یہاں کا تنباکو، کہ ان کے خلاف مزاج ہے، بے دلی سے پیتے ہیں۔ یقین تھا کہ قبل ماہ رمضان کے حرور بالضرور بھیجیگا۔ جب یہ مہینا بھی آخر ہوا تو مجھ سے شکایت کی اور آزردہ خاطر ہوئے کہ مرزا غلام محمد صاحب ہمیں بالکل بھول گئے۔ ان سے یہ توقع نہ تھی۔ اب کبھی ان سے نہ منگواؤں گا۔ بلکہ یہ کہا کہ اب نہ بھیجیں تو بہتر ہے۔ قریب سال بھر

کے ہوا، کب تک انتظار کروں۔ لہٰذا لازم ہے کہ اسی مہینے میں ان کا
تنباکو خشک تحفۂ مول لے کے اور اپنے سامنے بنوا کے کسی مزدور کے
ہاتھ برائے خدا بھجوائیے کہ ان کا ملال رفع ہو۔" (۴۱)

انیس بڑے پابند وضع تھے اور لکھنؤ کے سے شہر میں بھی، جہاں وضع داری تہذیب کا ایک لازمی جز تھی، انیس کی پابندی وضع کی خاص طور پر شہرت تھی اور دوسروں کو بھی ان کی وضع کا پاس کرنا پڑتا تھا۔ مثلاً ان سے ملاقات کرنے والوں کو ان کے اوقات کی پابندی کرنا ہوتی تھی۔ امجد علی اشہری لکھتے ہیں:

"میں نے جناب حامد علی خاں صاحب بیرسٹرایٹ لا اور نواب بدھن صاحب جیسے اکابر لکھنؤ سے سنا ہے کہ میر صاحب تک پہنچنے اور ان سے ہم کلام ہونے کے لیے درباری قسم کے چند قواعد کی پابندی لازم تھی۔ کوئی یوں بے تکلف سامنے نہ جا سکتا تھا جب تک میر صاحب اس کے آنے کی اجازت نہ دیں، یا ملاقات کا وقت مقرر نہ ہو جائے، روزمرہ کے آنے جانے والے بھی ایک اطلاع کے بعد باریاب ہوتے تھے۔" (۴۲)

اپنے یہاں متواتر آنے والوں کے لیے بھی انیس نے ملاقات کے وقت مقرر کر دیے تھے اور کوئی ملاقاتی اپنے لئے مقرر شدہ وقت کے سوا ان سے نہیں مل سکتا تھا۔ میر حامد علی سے ملاقات کے لیے انیس نے رات کا وقت مقرر کیا تھا۔ ایک بار انہوں نے بارہ بجے دن کو ملاقات کرنا چاہی تو انیس نے ملنے سے انکار کر دیا۔ اس پر میر حامد علی نے آزردہ ہو کر انیس سے ملنا چھوڑ دیا۔ کچھ دن بعد خود انیس بارہ بجے دوپہر کو میر حامد علی سے ملنے ان کے گھر گئے اور اب انہوں نے ملاقات کا وقت رات کے بجائے بارہ بجے دن کا مقرر کر دیا اور میر حامد علی پھر ان کے یہاں جانے لگے۔ کچھ عرصے بعد گرمیاں آ گئیں اور اب انہیں دوپہر کے وقت انیس کے یہاں جانے میں بڑی زحمت ہونے لگی۔ تب انیس نے ان سے کہا کہ میں نے رات کا وقت تمہاری ہی سہولت کی خاطر مقرر کیا تھا۔ میر حامد علی کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ انہوں نے انیس سے معافی مانگی اور پھر سے ان کے لیے رات کا وقت مقرر ہو گیا۔ (۴۳)

انیس کی نازک مزاجیوں، پابندیوں اور رعب داب کے اور بھی بہت سے واقعات ملتے ہیں۔ ان واقعات سے ذہن میں ایک ایسے شخص کا نقش بنتا ہے جس سے ملاقات بہت دل چسپ ثابت نہ ہوتی ہوگی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انیس کی شخصیت بڑی دل نواز تھی اور ان کی صحبت بہت خوشگوار ہوتی تھی جس کی وجہ سے لوگ ان کی عائد کی ہوئی پابندیوں کے باوجود ان سے ملنے کے مشتاق رہا کرتے تھے۔ وہ اپنے کلام کی طرح اپنی گفتگو سے بھی سننے والوں کو مسحور کر لیتے تھے۔

حیدر آباد میں ان کے پہنچنے کے چوتھے دن شریف العلما نے ان کی ہم نشینی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے بھائی کو لکھا:

"عرض نہیں کر سکتا ہوں کہ کیا لطف حاصل ہوتا ہے۔"(۴۴)

اور آٹھ دن بعد پھر لکھا:

"میر انیس کے پاس اکثر بیٹھتا ہوں ۰۰۰۰فی الواقع بے نظیر آدمی ہیں۔ بڑے غیور، خوش اخلاق اور نیک مزاج اور نہایت خوش تقریر ہیں کہ انسان محو ہو جاتا ہے۔ اگر کسی بات کا ذکر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بہتر کچھ نہیں ہو سکتا۔"(۴۵)

میر حامد علی کا بیان ہے:

"میر انیس نہایت خوش گفتار تھے۔ جب کسی صحبت میں وہ گفتگو کرنے لگتے تھے تو کوئی شخص کسی دوسری طرف متوجہ نہیں ہو سکتا تھا۔"(۴۶)

اور یہ واقعہ بھی انہیں میر حامد علی سے متعلق ہے:

"میر حامد علی کی شادی کے انتظام میں میر انیس بھی شریک تھے۔ جب دسترخوان بچھا اور لوگ کھانا کھانے بیٹھے تو میر صاحب نے بعض بہت باتکلف مہمانوں کے پاس جاجا کر ان کو اپنی باتوں میں ایسا محو کر لیا کہ وہ اپنا تکلف بھول گئے اور زیادہ کھانا کھا گئے، جس کا خود ان لوگوں نے اعتراف کیا۔"(۴۷)

محمد حسین آزاد بتاتے ہیں:

"میں ۵۷ء میں خود بھی ان سے ملا، اور لوگوں سے بھی سنا، کم سخن تھے، اور بولتے تو وہ فقرہ کہ موتی کی طرح ٹانکنے کے قابل۔"(۴۸)

اور امجد علی اشہری لکھتے ہیں:

"ان کی معمولی باتوں میں بھی ادائے کلام سے اعجاز فصاحت کا اثر ظاہر ہوتا تھا اور وہ معجز بیانی ان کا حصہ تھی جو دوسری جگہ نہ مل سکتی تھی اور ان پر ختم ہو گئی، جس کو ان کے دیکھنے والے آج تک یاد کرتے اور نہ دیکھنے والوں کو محو حیرت بناتے ہیں۔"(۴۹)

شاد عظیم آبادی کا بیان ہے:

"میر انیس ہرگز بدمزاج، خود پسند، بداخلاق نہ تھے۔ میں بھی پہلے یہی غلط خیال رکھتا تھا مگر جب ملا اور صحبتیں ہوئیں تو معلوم ہوا کہ ان

سے زیادہ خوش مزاج، منکسر، خوش اخلاق شاید ہی کوئی ہو ....
خندہ روئی کے ساتھ لوگوں سے جھک کر صاحب سلامت اور تعظیم
کرنا، ہاتھ جوڑ جوڑ کر جناب اور آپ اور حضور کے کلمے سے مخاطب
کرنا، اہل فن کی حرمت کرنا، بزرگوں کے نام کو تعظیم کے ساتھ لینا۔
سر مو اس میں فرق نہ آتا تھا:(۵۰)

قربان علی بیگ سالک، شریف العلماء، شاد عظیم آبادی، کلن صاحب سعید وغیرہ نے انیس کی صحبتوں کے جو تذکرے کیے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انیس کے پاس دل چسپ واقعات، مختلف النوع معلومات، اردو، فارسی، بھاشا کے اشعار وغیرہ کا نہ ختم ہونے والا خزانہ تھا اور ان سے ایک بار کا ملنے والا بھی ان کی صحبت اور گفتگو کو بھول نہیں سکتا تھا۔ آزاد نے "آب حیات" میں خواجہ آتش کی نماز کا جو دل چسپ قصہ لکھا ہے وہ انہیں انیس ہی نے سنایا تھا(۵۱) نجی صحبتوں میں انیس اپنے شعر بالعموم نہیں سناتے تھے لیکن دوسروں کے شعر اس طرح پڑھ دیتے تھے کہ سننے والوں کے سامنے مضمون کی تصویر کھنچ جاتی تھی۔ وہ اچھے شعروں سے خود بھی متاثر ہوتے تھے اور ان پر عمدہ تبصرہ بھی کرتے تھے۔ مختلف صحبتوں میں انیس نے جو شعر پڑھے اور پسند کیے ان میں سے کچھ یہ ہیں:

سانولے رنگ سے بھاگو حسن کیا اس میں تمہارا جاتا ہے
ایسے دھندلکے بیچ مسافر ظلمت میں مارا جاتا ہے (۵۲)

نہ کچھ شوخی چلی باد صبا کی
بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی (۵۳)

بھاڑ سے سر پہ چھائی ہیں بلائیں شام ہجراں کی
... شخص جبیں ہیں بال ادھر کھولے ادھر باندھے (۵۴)

آوارہ تیرے نیچے اے گردوں نہ ٹھہریگا
... چاہے کہ میں ٹھہروں نہ ٹھہرے گا (۵۵)

... میں ہم نہ چلیں اور صبا چلے
ویسا ہی خدا جو چاہے تو بندے کا کیا چلے (۵۶)

اور جب ان کے سامنے یہ شعر پڑھا گیا:

روشن ہے اس طرح دل ویراں میں داغ ایک اجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

تو میر صاحب لیٹے تھے، یہ شعر سن کر اٹھ بیٹھے، ایک اف کی اور
فرمایا کہ "میں اب بڑھاپے میں اپنے شعروں کی تاب نہیں لا سکتا، اس
سن میں ایسے تیر نہیں کھا سکتا۔" اس کے بعد حسب معمول اس شعر پر

تبصرہ ہونے لگا۔ میر صاحب نے اس کی شرح کے سلسلے میں فرمایا کہ
پرانے زمانے میں جب کسی بستی پر عتاب شاہی نازل ہوتا تھا تو وہ
بستی ویران کردی جاتی تھی اور اس میں کسی نمایاں مقام پر ایک
چراغ جلادیا جاتا تھا۔(۵۷)

○○○○○○○○○○
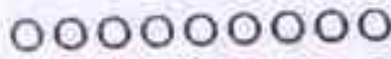
انیس کے نواسے اور میر نفیس کے داماد میر سید علی مانوس جو انیس کی زندگی کے آخری اٹھارہ سال تک ان کے ساتھ رہے، انہوں نے ادیب مرحوم کو انیس کا حسب ذیل حلیہ لکھوایا تھا:

"میر انیس کا قد میانہ، مائل بہ درازی، ورزش کی وجہ سے جسم ٹھوس، اعضا متناسب و چست، چھریرا بدن، چوڑا سینہ، صراحی دار گردن، خوبصورت کتابی چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، گیہواں رنگ، مونچھیں ذرا بڑی، ڈاڑھی اتنی باریک کترواتے تھے کہ دور سے منڈی ہوئی معلوم ہوتی تھی"۔(۵۸)

ایک اور بزرگ میر عبدالعلی، جنہوں نے انیس کو دیکھا تھا، بتاتے ہیں:

"میر انیس کا قد لمبا، میانہ سے کچھ زیادہ تھا۔ ان کا بدن چست، ٹھوس اور چھریرا تھا، اور رنگ گندمی تھا۔"(۵۹)

انیس کے لباس کے متعلق مانوس کا بیان یہ ہے:

"سر پر حباب کی شکل کی قالب پر چڑھی ہوئی ٹوپی جو گرمیوں میں سفید اور جاڑوں میں ریشمی کام کی رنگین ہوتی تھی۔ نیچا نیچا خوب گھیردار کرتا جو گھٹنوں سے کچھ نیچا اور سفید رنگ کا ہوتا تھا، جامدانی یا ململ کا۔ گرمیوں میں صرف یہی کرتا، مگر جاڑوں میں انگرکھے کی قطع کا روئی دار دگلا یا خوب گھیردار لبادہ پہنتے تھے جو پیروں کے گٹے تک پہنچتا تھا۔ گرمیوں میں ڈھیلی مہری کا سفید پائجامہ جسے عرض کا پائجامہ کہتے تھے۔ جاڑوں میں اسی وضع کا ریشمی رنگین پائجامہ جو اودے، سبز یا گلابی مشروع کا ہوتا تھا یا گل بدن کا۔ گھر میں زرد مخمل کا گھیتلا، باہر اسی وضع کا زردوزی جوتا جو اس وقت پچیس تیس روپے کا بنتا اور اکثر کاریگر کو گھر پر بلوا کر بنوایا جاتا تھا۔ ہاتھ میں چھڑی اور رومال۔ کبھی کبھی سفید ڈوپٹا بھی کندھے پر آڑا کر کے ڈال لیتے تھے"۔(۶۰)

میر نفیس کے ایک خط کے مندرجہ ذیل اقتباس سے بھی انیس کے لباس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوتی ہے:

"گل بدن کے تھانوں کا حال معلوم ہوا۔ ان کے آنے میں بڑی دیر ہو گئی۔ اکثر جناب والد ماجد مد ظلہ نے مجھ سے اس تاخیر کی شکایت کی کہ میں نے گرمیوں کے لئے منگائے تھے اور اب جاڑے آ پہنچے مگر ہنوز نہیں آئے۔ جناب والا، اگر پارچے ہوں تو ہر پارچہ سوا دو گز کا ہو اور عرض ایک گز ہو۔ اور اگر تھان ہوں تو ساڑھے چار گز سے کم نہ ہوں کیونکہ ایک تھان میں دو پائجامے مع نیفے اور مغزی کے بنتے ہیں اور جناب میر صاحب کے موافق مزاج ہوتے ہیں۔" (فارسی سے ترجمہ) (۶۱)

انیس کے نظام اوقات کے بارے میں مانوس کا بیان ہے:

"میر صاحب کے زمانہ شباب کے معمولات کا تو کوئی علم نہیں، لیکن اس کے بعد کے زمانے میں ان کا معمول یہ تھا کہ نو دس بجے رات کو دیوان خانے سے اٹھ کر زنانے مکان میں جاتے تھے اور کھانے پینے سے فراغت کر کے مرثیہ کہنے بیٹھ جاتے تھے۔ زیادہ تر دو زانو بیٹھتے تھے۔ دونوں ہاتھ رخساروں پر ہوتے تھے۔ لکھتے وقت صرف بایاں ہاتھ رخسار پر ہوتا تھا۔ سامنے کنول روشن رہتا تھا۔ پہلوؤں میں کتابیں رہتی تھیں۔ قریب قریب روزانہ ساری رات جاگتے تھے۔ نماز صبح پڑھ کر آرام کرتے تھے۔ نو بجے کے قریب سو کر اٹھتے تھے۔ دس بجے کے قریب کھانا کھاتے تھے۔ اس کے بعد اپنے چھوٹے بھائی میر مونس اور بڑے بیٹے میر نفیس اور دوسرے شاگردوں کے کلام پر اصلاح دیتے تھے۔ یہ شغل دو بجے تک جاری رہتا تھا۔ اس سے فراغت کر کے پھر سو رہتے تھے۔ عصر کے وقت اٹھ کر نماز پڑھی اور دیوان خانے میں جا بیٹھے۔ اس وقت سے نو دس بجے رات تک لوگوں سے ملنے کا وقت تھا۔" (۶۲)

مانوس کا یہ بھی بیان ہے کہ انیس غذا بہت سادی اور مقدار میں کم کھاتے تھے، اور یہ بھی کہ وہ

"پانی بھی بہت کم پیتے تھے۔ ہم لوگوں کو جب کبھی زیادہ پانی پیتے دیکھتے تھے تو ضرور منع کرتے تھے۔" (۶۳)

مرثیہ خوانی کیوقت وہ ضرورت پڑنے پر بھی پانی نہیں پیتے تھے۔ حیدر آباد کی مجلس میں

"مرثیے کے درمیان میں اگر ان کا حلق سوکھ بھی جاتا تو پانی نہیں پیتے تھے۔" (۶۴)

عظیم آباد میں انیس کی خوانندگی کا بیان کرتے ہوئے شاد لکھتے ہیں:

"درمیان میں پانی پینا، کھنکھارنا، اس کا نام نہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ دو دو گھنٹے تک گرمیوں میں شدومد سے پڑھ گئے مگر کیا مجال کہ پانی پئیں یا کھنکھاریں۔" (۶۵)

○○○○○○○○○
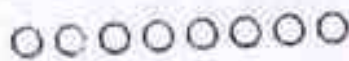
۱۸۷۴ء کا قریب قریب پورا سال انیس کو بیماریوں میں گذرا۔ یہ ہجری سال ۱۲۹۱ تھا۔ رجب کے مہینے (ستمبر ۱۸۷۴ء) سے ساڑھے تین مہینے تک وہ شدید بیمار رہے۔ رمضان کے مہینے سے ورم جگر کی صورت میں ان کا مرض الموت شروع ہوا۔ ان کے بھائی میر مہر علی انس کے جس دوسرے خط کا اقتباس شروع میں دیا گیا تھا۔ اس کے آخر کے کچھ فقرے یہ ہیں:

"حکیم میر باقر حسین، مرزا محمد علی حکیم کے شاگرد ہیں، وہ معالج ہیں۔ اور معدے سے قوت ہضم کی بالکل جاتی رہی ہے، مگر ایسا علاج کر رہے ہیں کہ سب حکیم ان کے نسخوں کو دیکھ کر مدح کرتے ہیں •••• علاج اور دعا دونوں ایسے ہو رہے ہیں کہ اگر بادشاہ بھی بیمار ہوتا تو اس کے لیے خلقت اس طرح دعا نہ کرتی •••• آگے تقدیر اللہ سے کسی کا چارہ نہیں" (۶۶)

اسی زمانے میں انیس کے ایک دوست میر آغا حسین دہلوی انہیں دیکھنے آئے۔ اس ملاقات کا حال انہوں نے شوکت بلگرامی سے اس طرح بیان کیا:

"میں ایک دفعہ حالت مرض الموت میں میر صاحب کی عیادت کو گیا تو معلوم ہوا کہ زنان خانے میں تشریف رکھتے ہیں۔ اطلاع کی تو پردہ کروا کے بلالیا۔ اندر گیا تو دیکھا کہ میر صاحب مرحوم لحاف سے منھ ڈھانپے لیٹے ہوئے ہیں اور میر نفیس مرحوم پہلو میں بیٹھے ہیں۔ میں بھی انہیں کے پاس بیٹھ گیا اور پکار کے پوچھا کہ "میر صاحب، مزاج کیسا ہے؟" اس کے جواب میں لحاف کے اندر ہی سے میر صاحب نے فرمایا کہ "کیا کہوں:

ضعف و ناطاقتی و سستی و اعضا شکنی ایک گھٹنے سے جوانی کے گھٹا کیا کیا کچھ

میں چونکہ ان کی خدمت میں گستاخ تھا اس لیے بے باکانہ عرض کیا کہ

"حضرت، یہ تو آپ میر تقی مرحوم کی زبانی اپنا حال بیان فرما رہے ہیں۔"
"یہ سن کر میر صاحب نے منھ پر سے لحاف ہٹایا، چند سکنڈ تک بہ غور میری طرف دیکھتے رہے اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کے فرمایا:
" اک جوانی کیا گئی سو درد پیدا ہوگئے
توہی اے پیری بتا ہم کیا تھے اور کیا ہوگئے "(۶۷)

انہیں شوکت بلگرامی سے انیس کے شاگرد اور خاص ملاقاتی سید علی یونس نے بیان کیا:

"انتقال کی صبح یا اس کے ایک دن پہلے کا ذکر ہے کہ میر صاحب سو کے اٹھے تو میر مونس مرحوم کو بلایا اور فرمایا کہ شب کو ایک مطلع خیال میں آیا ہے، اس کو لکھ لو۔ ہمارے بعد خواہ اس پر سلام کہنا، خواہ غزل، چونکہ میر مونس مرحوم کو میر صاحب ہمیشہ غزل گوئی سے منع کرتے تھے اس لیے غزل کہنے کا اشارہ اس غرض سے کیا کہ ہمارے بعد تم کو غزل گوئی سے کون روکے گا، اور اس کے بعد یہ مطلع، جو حقیقتاً ان کی شاعری کا مقطع تھا، پڑھا کہ
سب عزیز و اقربا ناآشنا ہوجائیں گے
قبر میں پیوند جتنے ہیں جدا ہوجائیں گے " (۶۸)

اور انہیں آخری دنوں میں میر مہر علی انس نے حکیم سید علی کو پھر ایک خط لکھا:

"اب کیفیت مزاج کی یہ ہے کہ غذا بالکل ترک ہے۔ اگر سامنے آتی ہے تو ابکائی آتی ہے۔ فقط ایک جوجہ، مرغ کہ آدھ پاؤ کا ہوتا ہے، وہ یخنی بہ جبر پلوا دیتے ہیں۔ اور کیفیت لاغری کی یہ ہے کہ پوست ہڈیوں پر لپٹا ہوا ہے، اور ورم دلہنے پاؤں کا گھٹنے تک پہنچ گیا ہے اور بائیں پاؤں کا گٹے تک ہے۔ حکیم کہتے ہیں کہ کبد (جگر) پر ورم ہے۔ تبرید اور عرق جو حکیم تجویز کرتے ہیں فوراً تیار ہوتا ہے، کوئی دوا فائدہ نہیں کرتی۔ دن رات مجھے روتے گذرتی ہے۔ گھر میں آتا ہوں تو حضرت عباس کے حال کا مرثیہ پڑھتا ہوں اور چیخیں مار مار کے روتا ہوں کہ میرے رونے سے سارا گھر چونک پڑتا ہے اور سب میرے ساتھ رونے لگتے ہیں۔ حکیم صاحب، میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ اگر بھائی کو کچھ ہوگیا تو میری زندگی نہ ہوگی، بعد ان کے میری تیاری ہوگی، اور آثار مجھے اچھے نہیں معلوم ہوتے ... شہروں شہروں دعا ان کی صحت کی ہوتی ہے، کسی کی دعا قبول نہیں ہوتی۔

حکیم بھی اپنی جان لڑائے ہوئے علاج کر رہے ہیں، مگر مشیت ایزدی
نہیں معلوم کیا ہے:"(۶۹)

مشیت ایزدی ۱۰ / دسمبر ۱۸۷۴ء کو معلوم ہو گئی۔ اس دن (پنجشنبہ ۲۹ / شوال ۱۲۹۱ھ) غروب آفتاب سے کچھ پہلے میر ببر علی انیس نے اپنی محل سرا چوبداری محلہ، چوک، لکھنؤ میں انتقال کیا۔

اودھ اخبار، لکھنؤ نے انیس کی وفات کی خبر دیتے ہوئے لکھا:

"کہتے ہیں حضرت مرزا دبیر ۰۰۰۰ ان کی نعش پر جا کر بہت روئے اور فرمایا کہ ایسے معجز بیان، فصیح اللسان اور قدر دان کے اٹھ جانے سے اب کچھ لطف نہ رہا۔"(۷۰)

۳۔ حواشی

۱۔ مکتوب میر ببر علی انس بہ نام حکیم سید علی (رمضان ۱۲۹۱ھ) ذخیرہ ادیب
۲۔ مکتوب انس بہ نام حکیم سید علی (شوال ۱۲۹۱ھ) ذخیرہ ادیب
۳۔ "واقعات انیس": مہدی حسن احسن
۴۔ "حیات انیس": امجد علی اشہری
۵۔ انیس کی ابتدائی زندگی کی تفصیلات کے لیے دیکھئے مضمون "انیس: ابتدائی دور" از نیر مسعود (دو ماہی "اکادمی" لکھنؤ، جنوری، فروری ۱۹۸۷ء و مئی جون ۱۹۸۷ء اور ماہ نامہ "دائرے" کراچی، شمارے جنوری، فروری، مارچ، اپریل ۱۹۸۸ء)
۶۔ "امجد علی شاہ": سبط محمد نقوی
۷۔ "بوستان اودھ": مہر سندیلوی
۸۔ "عروج اردو": سید خورشید حسن عرف دولھا صاحب عروج
۹۔ اودھ اخبار "لکھنؤ سہ شنبہ ۱۲ / اپریل ۱۸۷۰ء مطابق محرم ۱۲۸۷ھ (اقتباس بہ شکریہ ڈاکٹر اکبر حیدری)
۱۰۔ مضمون "میر انیس کا سفر دکن" از سید آغا حسین ارسطو جاہی (ماہنامہ "ہمایوں" لاہور نومبر ۱۹۴۰ء)
۱۱۔ مضمون "میر انیس کے نادر خطوط" از سید مسعود حسن رضوی ادیب (مشمولہ "انیسیات")

۱۲۔ سوانح عمری عروج از سید حسن رضا عرف چھمن مرثیہ خوان (مشمولہ "دولھا صاحب عروج" مرتبہ نیر مسعود)
۱۳۔ "میر انیس کے نادر خطوط"
۱۴۔ "فکر بلیغ": شاد عظیم آبادی (قلمی)
۱۵۔ "حیات انیس"
۱۶۔ مضمون "میر انیس کے ایک عقیدت مند رفیق کا بیان" از مسعود حسن رضوی ادیب (مشمولہ۔ "انیسیات")
۱۷۔ مضمون "میر انیس کی خوش آوازی، خوش بیانی اور مرثیہ خوانی" از مسعود حسن رضوی ادیب (مشمولہ۔ "انیسیات")
۱۸۔ "میر انیس کی خوش آوازی، خوش بیانی اور مرثیہ خوانی"
۱۹۔ "جدید جلد پنجم مرثیہ ہائے میر انیس صاحب" (مرثیہ "سب سے جدا روش مرے باغ سخن کی ہے")
۲۰۔ "میر انیس کی خوش آوازی، خوش بیانی اور مرثیہ خوانی"
۲۱۔ "آب حیات": محمد حسین آزاد
۲۲۔ مضمون "میر علی محمد عارف" از مرزا جعفر حسین (ماہ نامہ "نیادور" لکھنو، جمہوریت نمبر، جنوری ۱۹۷۸ء)
۲۳۔ مضمون "میر انیس اور مرزا دبیر کا بنارس میں پہلی مرتبہ ورود" (اخبار "طریقت" جون پور یکم اکتوبر ۱۹۳۴ء)
۲۴۔ "فکر بلیغ"
۲۵۔ "واقعات انیس"
۲۶۔ "واقعات انیس"
۲۷۔ "فکر بلیغ"
۲۸۔ "فکر بلیغ"
۲۹۔ "تاریخ لکھنو" (حصہ اول) زبدۃ العلما سید آغا مہدی رضوی لکھنوی
۳۰۔ بیان میر معصوم علی سوز خوان۔ ذخیرہ ادیب
۳۱۔ بیان سید خورشید حسین بجنوری۔ ذخیرہ ادیب
۳۲۔ ہاتھی دانت پر مصوری کا فن لکھنو میں دہلی سے آیا تھا۔ لکھنو میں ہاتھی دانت کے دہلوی فن کاروں کے سلسلے کے آخری باکمال مصور مرزا مغل بیگ تھے، جنھوں نے اپنے فن کی ناقدری سے مجبور ہو کر فوٹو گرافی کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ میرے سامنے والد مرحوم پروفیسر مسعود حسن رضوی

ادیب نے انہیں انیس کی مذکورہ تصویر دکھائی تھی۔ مرزا مرحوم نے اس کو فن کا اعلیٰ نمونہ بتایا اور یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ یہ تصویر انہیں کے بزرگوں میں سے کسی کی بنائی ہوئی ہے۔
(نیر مسعود)

۳۳۔ یہ تصویر میر خورشید علی نفیس کے نواسے میر علی محمد عارف کے خاندان میں موجود ہے۔ ذخیرہ ادیب میں اس تصویر سے بہت مشابہ انیس کی ایک دھندلی رنگین تصویر ہے۔ یہ اصل میں ایک مٹا مٹا سا فوٹوگراف ہے جسے کسی بدسلیقہ مصور نے رنگ پھیر کر اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاد عظیم آبادی کے بیان کے مطابق انیس کا ایک فوٹو مشکور الدولہ نے کھینچا تھا (فکر بلیغ)۔ مشکور الدولہ واجد علی شاہ کے درباری مصور تھے جنہوں نے شاہی کے خاتمے کے بعد فوٹوگرافی شروع کر دی تھی۔ وہ ہندوستان کے اولین فوٹوگرافروں میں تھے۔ ذخیرہ ادیب والی تصویر مشکور الدولہ کی کھینچی ہوئی ہو سکتی ہے۔ اس پر کچھ عبارت بھی لکھی ہوئی ہے جو قریب قریب اڑ چکی ہے لیکن اس میں انیس کا لفظ پڑھنے میں آجاتا ہے (نیر مسعود)۔

۳۴۔ "میر انیس کی شخصیت اور مزاجی کیفیت" از نیر مسعود ("نیا دور" لکھنؤ ستمبر ۱۹۷۸ء)

۳۵۔ منقبت از انیس (مشمولہ "انیس المناقب")

۳۶۔ "انیس کے ایک عقیدت مند رفیق کا بیان"

۳۷۔ "واقعات انیس"

۳۸۔ "وضع داران لکھنو": سید محمد ہادی

۳۹۔ "واقعات انیس"

۴۰۔ مضمون "میر انیس کا سفر حیدر آباد" از مسعود حسن رضوی ادیب (مشمولہ "انیسیات")

۴۱۔ مکتوب میر خورشید علی نفیس بہ نام مرزا غلام محمد، مورخہ ۲ / شوال ۱۲۸۰ھ (۱۱ / مارچ ۱۸۶۴ء) بہ شکریہ میر علی محمد واثق نبیرہ عارف

۴۲۔ "حیات انیس"

۴۳۔ "میر انیس کے ایک عقیدت مند رفیق کا بیان"

۴۴۔ مضمون "میر انیس کے سفر حیدر آباد کا روزنامچہ" از مسعود حسن رضوی ادیب (مشمولہ۔ "انیسیات")

۴۵۔ "میر انیس کے سفر حیدر آباد کا روزنامچہ"

۴۶۔ "میر انیس کے ایک عقیدت مند رفیق کا بیان"

۴۷۔ "میر انیس کے ایک عقیدت مند رفیق کا بیان"

۴۸۔ "آب حیات"

۴۹۔ "حیات انیس"

۵۰۔ "فکر بلیغ"
۵۱۔ "آب حیات" (احوال آتش)
۵۲۔ "فکر بلیغ"
۵۳۔ "حیات انیس"
۵۴۔ "حضرت رشید": سید آغا اشہر لکھنوی
۵۵۔ "دیوان ذوق" مرتبہ محمد حسین آزاد، اور "آب حیات"
۵۶۔ "میر انیس کا سفر حیدر آباد"
۵۷۔ "میر انیس کے ایک عقیدت مند رفیق کا بیان"
۵۸۔ بیان میر سید علی مانوس، ذخیرہ ادیب
۵۹۔ مضمون "میر انیس کے کچھ چشم دید حالات" از مسعود حسن رضوی ادیب (مشمولہ "انیسیات")
۶۰۔ بیان میر سید علی مانوس
۶۱۔ مکتوب میر نفیس بنام حکیم سید علی، ذخیرہ ادیب
۶۲۔ بیان میر سید علی مانوس
۶۳۔ بیان میر سید علی مانوس
۶۴۔ "دکن میں مرثیہ اور عزاداری ۱۸۵۷ء تا ۱۹۵۷ء" ڈاکٹر رشید موسوی
۶۵۔ "فکر بلیغ"
۶۶۔ مکتوب میر مہر علی انس بنام حکیم سید علی
۶۷۔ مضمون "انیس کا ابتدائی اور انتہائی کلام" از سید کاظم علی شوکت بلگرامی (مجلہ "اردوے معلیٰ" علی گڑھ جلد ۱۱ (۶) جون ۱۹۱۰ مدیر حسرت موہانی) اقتباس بہ شکریہ ڈاکٹر اکبر حیدری
۶۸۔ "انیس کا ابتدائی اور انتہائی کلام" [میر سید علی مانوس کا بیان ہے کہ انیس نے وفات سے دو تین دن پہلے ایک سلام "سب عزیز و آشنا ۰۰۰۰۰ الخ" کہا تھا، لیکن یونس کی روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کہ انیس نے صرف مطلع کہا تھا۔ انیس کے سلاموں کے مطبوعہ مجموعوں میں اس زمین میں انیس کا کوئی سلام نہیں ہے۔ اسی مطلع کے ساتھ انیس کے بھتیجے میر بادی وحید کا ایک بہت عمدہ سلام "ریحانِ غم" جلد دوم (قلمی، ذخیرہ ادیب) میں موجود ہے۔ اس میں اٹھائیس شعر ہیں۔ اس کے سولہ شعر (مع مطلع) سلاموں کے ضخیم مجموعہ "شمع تعزیت" (مرتبہ سید محمد عنایت حسین متین سامانی سہارن پوری) میں انیس کے بیٹے میر محمد سلیس کے نام سے شامل ہیں۔ میر مونس کے سلاموں کے مجموعے "دیوانِ فصاحت عنوان" میں اس زمین میں کوئی سلام نہیں ہے۔ میر علی احمد دانش نبیرہ عارف کے ذخیرے میں اس مطلع کے ساتھ گیارہ شعر کا ایک معمولی سا بے مقطع سلام

موجود ہے جس کے کچھ مصرعے وحید کے سلام سے ملتے جلتے ہیں (نیر مسعود)]۔
۶۹۔ مکتوب میر مہر علی انس بنام حکیم سید علی۔ شوال ۱۲۹۱ھ ذخیرہ ادیب
۷۰۔ مضمون "مرگِ انیس" از قاضی عبدالودود (مجلہ "معاصر" پٹنہ، شمارہ ۱۰)

انتخاب و ترتیب :-
نیّر مسعود

انیسؔ : کلام

کیا ہوگئے وہ جوہریانِ سخن اک بار
ہر وقت جو اس جنس کے رہتے تھے طلب گار
اب ہے کوئی طالب، نہ شناسا، نہ خریدار
ہے کون، دکھائیں کسے یہ گوہرِ شہوار
کس وقت یہاں چھوڑ کے ملکِ عدم آئے
جب اُٹھ گئے بازار سے گاہک تو ہم آئے

○

کیا مرتبہ سلطانِ حجازی کا ہے — کیا عزّ و شرف امامِ غازی کا ہے
سجدے کا نشاں دیکھ کے سب کہتے تھے — نیزے پہ یہ سر کسی نمازی کا ہے

السّلام اے لحدِ اقدس و اعلائے حسینؑ — مہبطِ نورِ خدا طورِ تجلّائے حسینؑ
مکّی و ہاشمی و مطّلبی و قرشی — فخرِ اقلیمِ عرب تھے جد و آبائے حسینؑ
چہرہ رُخ نے عالمِ ایجاد کو چھپانا کب کیا — جز حسنؑ اور نہ پایا کوئی ہمتائے حسینؑ
قمریاں سرو پہ کوکو کی صدا دیتی ہیں — چھپ گیا خاک میں جب سے قدِ زیبائے حسینؑ

کنعانِ محمدؐ کے حسینوں کا سفر ہے — خورشید لقا زہرہ جبینوں کا سفر ہے
چھُٹتا ہے وطن گوشہ نشینوں کا سفر ہے — اک دن کا نہیں کوچ، مہینوں کا سفر ہے

گُل رو چمنِ خُلد میں جانے کو چلے ہیں
گھر چھوڑ کے جنگل کے بسانے کو چلے ہیں

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی راہ سخت — پانی نہ منزلوں، نہ کہیں سایۂ درخت
ڈوبے ہوئے پسینے میں ہیں غازیوں کے رخت — سونلا گئے ہیں رنگِ جوانانِ نیک بخت
راکب عبائیں چاند سے چہروں پہ ڈالے ہیں
تَو نسے ہوئے سمند زبانیں نکالے ہیں

یوں دشت میں پھرتے تھے وہ اللہ کے پیارے — جس طرح کریں سیرِ شبِ تار میں تارے
ماندے ہوئے رہوار بھی سب اونٹ بھی ہارے — سادات نے وہ دوپہر آفت میں گذارے
گردش میں کٹی رات ولی ابنِ ولی کو
مقتل میں ہوئی صبح حسینؑ ابنِ علیؑ کو

یہ دشتِ ہولناک کہاں، یہ چمن کہاں — جنگل کہاں، بتولؑ کے گل پیرہن کہاں
کُنبہ کہاں نبیؐ کا، یہ دارِ محن کہاں — قبریں کہاں شکستہ دلوں کی، وطن کہاں
آئے ہیں ڈھونڈتے ہوئے اس ارضِ پاک کو
سچ ہے کہ خاک کھینچتی ہے اپنی خاک کو

اس جا نہ اُترتا ہے نہ دم لیتا ہے رہگیر — ہے شور کہ اس آب میں ہے آگ کی تاثیر
پیاسوں کے لیے اس کی ہر اک موج ہے شمشیر — اس طرح ہوا چلتی ہے جس طرح چلیں تیر
واں بجھتی نہیں پیاس کسی تشنہ گلو کی
بو آتی ہے اس نہر کے پانی میں لہو کی

پھیلی جو نکہتِ چمنِ شاہِ بحر و بر — صحرا میں لہلہا گیا سبزہ بھی سر بہ سر

جلدی ہوا نے جا کے یہ دریا کو دی خبر — آیا تری کچھار میں مختارِ خشک و تر
جب تک وہ بحرِ فیض برائے وضو بڑھے
بڑھ کر قدم تو لے کہ تری آبرو بڑھے

تھا خانۂ غم خیمۂ شاہنشہِ والا — آندھی یہ پریشاں تھی کہ دل تھے تہ و بالا
مشعل نہ ٹھہرتی تھی نہ شمعوں کا اجالا — خیمہ بھی اندھیرے میں نظر آتا تھا کالا
خاک اڑتی تھی منہ پر حرمِ شیرِ خدا کے
تھا چیں بہ جبیں فرش بھی جھونکوں سے ہوا کے

آتی تھی درندوں کی صدا گونجتے تھے شیر — سب فرش پہ آندھی سے خس و خاک کا تھا ڈھیر
گل ہونے میں شمعوں کے نہ لگتی تھی ذرا دیر — کرتی تھی اندھیرے میں ہوا اور بھی اندھیر
جب اٹھتی تھیں چوبیں تو جھکا جاتا تھا خیمہ
بھرتی تھی ہوا جب تو اڑا جاتا تھا خیمہ

گرمی کی سحر اور وہ پھولوں کا مہکنا — مرغانِ چمن کا وہ درختوں پہ چہکنا
انجم کا وہ چھپنا کبھی اور گاہ چمکنا — وہ سرد ہوا اور وہ سبزے کا لہکنا
اس دشت میں روتی تھی جو شبنم شہِ دیں پر
تھا موتیوں کا فرش زمرد کی زمیں پر

تھا بسکہ روزِ قتلِ شہِ آسماں جناب — نکلا تھا خوں ملے ہوئے چہرے پہ آفتاب
تھی نہرِ علقمہ بھی خجالت سے آب آب — روتا تھا پھوٹ پھوٹ کے دریا میں ہر حباب
پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

یک بیک طبل بجا، فوج میں گرجے بادل — کوہ تھرّائے، زمیں ہل گئی، گونجا جنگل

پھول ڈھالوں کے چمکنے لگے، تلواروں کے پھل
مرنے والوں کو نظر آنے لگی شکلِ اجل
واں کے چاؤش بڑھانے لگے دل لشکر کا
فوجِ اسلام میں نعرہ ہوا یا حیدرؑ کا

ہو گئے سُرخ شجاعت سے رُخِ آلِ نبیؐ
آئی ٹھنڈی جو ہوا بھول گئے تشنہ لبی
رن میں کڑکا ہوا بجنے لگے باجے عربی
یکہ تازوں نے کیا شورِ مبارز طلبی
اک گھٹا چھا گئی ڈھالوں سے سیہ کاروں کی
برق ہر صف میں چمکنے لگی تلواروں کی

شہنا کا شور سن کے لرزتا تھا بند بند
برچھے ہلے رسالوں میں، نیزے ہوئے بلند
صحرائے ہولناک کی دہشت ہوئی دوچند
ڈر کر کنوتیوں کو بدلنے لگے سمند
سُن کر دُہل کا شور کلیجے دہل گئے
صحرا سے دب کے شیرِ نیستاں نکل گئے

گھوڑوں کو اپنے کرتے تھے سیراب شہ سوار
آتے تھے اونٹ گھاٹ پہ باندھے ہوئے قطار
پیتے تھے آبِ نہر پرند آکے بے شمار
سقّے زمیں پہ کرتے تھے چھڑکاؤ بار بار
پانی کا دام و دد کو پلانا ثواب تھا
اک ابنِ فاطمہؑ کے لیے قحطِ آب تھا

"وہ نہر جس کو خلق میں جاری کرے الٰہ
روکی ہے تم نے ظلم کی فوجوں سے اس کی راہ
پانی پہ جنگ پیاسوں سے دریا پہ بغض واہ
یہ کس ولی کا گھر تھا جسے کر دیا تباہ
سیراب گرگ و شیر ہوں اور اسپ و خر پئیں
اولادِ فاطمہؑ نہ پیے، جانور پئیں؟!"

دی تھی جو دعا بد اسے شاہ دوسرا نے ۔۔۔ اک آگ کلیجے میں لگا دی تھی قضا نے
سقوں کے بڑے کھولے تھے مشکوں کے دہانے ۔۔۔ جلتا ہوا گھر جاتے ہیں جس طرح بجھانے
چلاتا تھا وہ "پیاس مری آہ بجھاؤ
اب خانۂ تن جلتا ہے للہ، بجھاؤ"

تھے پیاس کی گرمی سے زبس جان کے لالے ۔۔۔ ساحل پہ گرا جائے زباں منھ سے نکالے
عبرت سے کھڑے کانپتے تھے دیکھنے والے ۔۔۔ جب پانی پیا حلق میں سو پڑ گئے چھالے
ہر موج کا خم اس کے لئے ناگ ہوا تھا
پانی کا بھی اس وقت مزاج آگ ہوا تھا

آنکھوں کو نکالے تھے حبابوں کا یہ تھا حال ۔۔۔ موجوں کے طمانچوں سے ہوا جاتا تھا منھ لال
دریا اسے بڑھ بڑھ کے کیے دیتا تھا پامال ۔۔۔ مچھلی سا تڑپتا تھا کنارے وہ بد افعال
جھکتا تھا جو پینے کو تو ہٹ جاتا تھا پانی
بڑھتا تھا وہ سفاک تو گھٹ جاتا تھا پانی

حُر سے گھبرا کے یہ بولا عمرِ سعدِ شریر ۔۔۔ "یہ تو ہے صاف طرفداریِ شہہ کی تقریر
اپنے حاکم کا نہ کچھ ذکر نہ تعریفِ امیر ۔۔۔ اللہ اللہ، یہ اوصاف، یہ مدحِ شبیرؑ!
سن چکا ہوں میں کہ مضطر ہے کئی راتوں سے
الفتِ شاہ ٹپکتی ہے تری باتوں سے

نہ وہ آنکھیں، نہ وہ چتون، نہ وہ تیور، نہ مزاج ۔۔۔ سیدھی باتوں میں بگڑنا، یہ نیا طور ہے آج
تختِ بخشا ہے محمدؐ کے نواسے نے، کہ تاج؟ ۔۔۔ جن کو سمجھا ہے غنی دل میں، وہ خود ہیں محتاج
کون سا باغ تجھے شاہ نے دکھلایا ہے
کہیں کوثر کے تو چھینٹوں میں نہیں آیا ہے؟"

"علِ خیر سے بہکا نہ مجھے او ابلیس ۔۔۔ یہی کونین کا مالک ہے، یہی راس و رئیس

کیا مجھے دے گا ترا حاکمِ ملعون و خسیس
کچھ تردّد نہیں، کہہ دے کہ لکھیں پرچہ نویس
ہاں سوئے ابنِ شہنشاہِ عرب جاتا ہوں
لے ستمگر، جو نہ جاتا تھا تو اب جاتا ہوں"

اللہ اللہ، عجب فوج، عجب غازی تھے
عجب اسوار تھے بے مثل، عجب تازی تھے
لائقِ مدح و سزاوارِ سرافرازی تھے
گو بہت کم تھے یہ آمادۂ جاں بازی تھے
پیاس ایسی تھی کہ آ آ گئی جاں ہونٹوں پر
صابر ایسے تھے کہ پھیری نہ زباں ہونٹوں پر

کوئی بچے نہ رومی و رازی، جدھر گئے
بچھ بچھ گئیں صفیں، وہ نمازی جدھر گئے
غازہ لگایا فتح نے، غازی جدھر گئے
پیاسا تھے یکہ تاز، وہ تازی جدھر گئے
دھومیں وغا کی قاف سے تا قاف ہو گئیں
اللہ رے مصاف، صفیں صاف ہو گئیں

"ایسے کسے ملے ہیں رفیقانِ باوفا
پیشِ خدا جلیل ہے ان سب کا مرتبہ
ہوتے جہاں میں آج جو پیغمبرِ خدا
کرتے ہر اک شہید کا ماتم جدا جدا
شانہ بتولؑ بالوں میں کرتی نہ عمر بھر
چادر سیاہ سر سے اترتی نہ عمر بھر"

"پیاسا ہوں، یہ جائز نہیں پیشے میں ہمارے
کٹتا ہے پہاڑ، آگ ہے تیشے میں ہمارے
ہے زورِ علیؑ ہر رگ و ریشے میں ہمارے
بر آ نہیں سکتا کوئی بیشے میں ہمارے
خاطر جو کشیدہ ہو تو جھکتے نہیں غازی
گر آگ کا دریا ہو تو رکتے نہیں غازی

بے جاں ہوئے نبرد میں بیٹے جو اس کے چار
ازرق کا دل ہوا صفتِ لالہ داغ دار
جوشِ غضب سے سرخ ہوئی چشمِ نابکار
مثلِ تنور منھ سے نکلنے لگا بخار
جیبِ قبا کو مثلِ کفن پھاڑتا ہوا
نکلا پرے سے دیو سا چنگھاڑتا ہوا

نکلا یہ سن کے غیظ میں اک پہلوانِ روم
گیتی کے چار دانگ میں تھی جس شقی کی دھوم
سرہنگ و پُر غرور و سیہ قلب و نحس و شوم
لشکر سے جس کے بل گئی مقتل کی مرز بوم
مرحب تھا کفر و شرک میں، طاقت میں گیو تھا
گھوڑے پہ تھا شقی کہ پہاڑی پہ دیو تھا

"شمشیرِ شرع، فارسِ دیں، شحنۂ نجف
مفتاحِ فتح، عارفِ اسرارِ مَن عَرَف
دریائے معرفت، دُرِ یکتائے نہ صدف
ذی جاہ و ذی کرامت و ذی فیض و ذی شرف
ہر ذی حیات ان سے طلبگارِ عون ہے
جس کے یہ مرتبے ہیں حسینؑ اس کا کون ہے"

کانپے طبق زمیں کے، ہلا چرخِ لاجورد
مانندِ کہربا ہوا مٹّی کا رنگ زرد
اُڑ کر زمیں سے بیٹھ گئی زلزلے میں گرد
تیغوں کی آنچ دیکھ کے بھاگی ہوائے سرد
گرمی سے رن کی ہوش اڑے وحش و طیر کے
شیر اس طرف اُتر گئے دریا کو پیر کے

تاریک تھا چکاروں کی آنکھوں میں سب جہان
مضطر تھے شیر و گرگ نکالے ہوئے زبان
بن سے سیاہ گوش بھی بھاگے دبا کے کان
غل تھا یہ دام و دد میں کہ کیونکر بچے گی جان
تیغِ علیؑ علم تھی جو دشتِ قتال میں
چیتوں نے منھ چھپائے تھے گینڈوں کی ڈھال میں

قلب و جناح و میمنہ و میسرہ تباہ
گردن کشانِ اُمّتِ خیرالورا تباہ
جُنباں زمیں، صفیں تہ و بالا، پرا تباہ
بے جان جسم، روح مُسافر، سرا تباہ
بازار بند ہو گیا، جھنڈے اکھڑ گئے
فوجیں ہوئیں تباہ، محلّے اجڑ گئے

گھوڑوں سے گونجتا ہے وہ سب وادیٔ نبرد
گردوں میں مثلِ شیشۂ ساعت بھری ہے گرد
ہے چرخِ چارمیں پہ رُخِ آفتاب زرد
ڈر ہے گرے زمیں پہ نہ مینائے لاجورد
گرمی ہجومِ فوج سے دہ چند ہو گئی
خاک اس قدر اُڑی کہ ہوا بند ہو گئی

نخل تھرّاتے تھے سب، گونج رہا تھا جنگل
سر کی جاتی تھی زمیں رن کی، غضب تھی ہلچل
کوندجاتی تھی سروں پر جو وہ شمشیرِ اجل
منھ کے بھل گرتا تھا کوئی تو کوئی سر کے بھل
حشر برپا تھا، سواروں پہ فرس لوٹتے تھے
دو پہ چار، ایک پہ دو، پانچ پہ دس لوٹتے تھے

کٹ کٹ کے ذوالفقار سے گرتے تھے خاک پر
پہنچوں سے ہاتھ، شانوں سے بازو، تنوں سے سر
قبضے سے تیغ، بَر سے زرہ، ہاتھ سے سپَر
برچھی سے پھل، کمان سے زِہ، زین سے تبَر
ترکش کہیں پڑے تھے، نشانِ زری کہیں
پیکاں کہیں تھے، شست کہیں تھی، سری کہیں

دریا کی طرح فوج کو جنبش ہوئی اک بار
تیغوں کی اٹھی موج میانِ صفِ کفّار
ڈھالوں کا ہوا ابرِ سیہ رن میں نمودار
بدلی جو ہوا، پڑنے لگی تیروں کی بوچھار

بیٹھا وہ جری تیغ بہ کف اہلِ جفا میں
بجلی سی لگی کوندنے ڈھالوں کی گھٹا میں

چھل بل دکھائی فوج کو، دوڑا، تھما، اُڑا
صورت بنائی جست کی، سمٹا، جما، اُڑا
دیکھی زمیں کبھی، کبھی سوئے سما اُڑا
مثلِ سمندِ بادشہہ اِنّما اُڑا
جن تھا، پری تھا، سحر تھا، آہو شکار تھا
گویا ہوا کے گھوڑے پہ گھوڑا سوار تھا

چاروں طرف کمانِ کیانی کی وہ ترنگ
رہ رہ کے ابرِ شام سے وہ بارشِ خدنگ
وہ شورِ صیحۂ فرسِ ابلق و سرنگ
وہ لوں، وہ آفتاب کی تابندگی، وہ جنگ
پھنکتا تھا دشتِ کیں، کوئی دل تھا نہ چین سے
اس دن کی تاب و تب کوئی پوچھے حسینؑ سے

بس اب نہ کرو غا کی ہوس، اے حسینؑ، بس
دم لے ہوا میں چند نفس، اے حسینؑ، بس
گرمی سے ہانپتا ہے فرس، اے حسینؑ، بس
وقتِ نمازِ عصر ہے، بس، اے حسینؑ، بس
پیاسا لڑا نہیں کوئی یوں ازدہام میں
اب اہتمام چاہیے اُمّت کے کام میں

آج ہے آٹھوں بہشتوں کی نئی تیاری
نخل سرسبز ہیں فردوس میں، نہریں جاری
شب سے حوریں ہیں مکلّل بہ جواہر ساری
خانۂ دوست میں ہے دوست کی مہمان داری
پیشوائی کو رسولؐ الثقلین آتے ہیں
عرش تک شور یہی ہے کہ حسینؑ آتے ہیں

ڈھانپ کر ہاتھوں سے منھ بنتِ علیؑ چلّائی   "ذبح ہوتے ہو مرے سامنے، ہَے ہَے بھائی"
ضربِ اوّل تھی کہ تکبیر کی آواز آئی   گر پڑی خاک پہ غش کھا کے علیؑ کی جائی
آنکھ کھولی تھی کہ ہنگامۂ محشر دیکھا
سر اُٹھایا تو سرِ شہ کو سناں پر دیکھا

ملبوس بدن لے گئے سب لوٹنے والے   سینے سے مگر تیر کسی نے نہ نکالے
پہلوئے مبارک میں گڑے رہ گئے بھالے   کیوں چرخ، یہ حال اس کا جسے فاطمہؑ پالے
شبیرؑ کا سر نیزۂ خولی کی انی پر!
تف دَہر پہ اور خاک ہے دنیائے دنی پر

خورشید چھپا، گرد اڑی، زلزلہ آیا   اک ابرِ سیہ دشتِ پُر آشوب پہ چھایا
پھیلی تھی جہاں دھوپ وہاں آگیا سایہ   بجلی کو سیاہی میں چمکتا ہوا پایا
جو حشر کے آثار ہیں سارے نظر آئے
گرتے ہوئے مقتل میں ستارے نظر آئے

ہر شے سے عیاں تھا غمِ سبطِ شہِ لولاک   سر زانوئے غم پر تھے جھکائے ہوئے افلاک
دریا کا بھی موجوں سے سراسر تھا جگر چاک   اللہ رے ماتم کہ اُڑاتی تھی زمیں خاک
آوارہ پرندے تھے، مکاں خالی پڑے تھے
چوپائے چراگاہ سے منھ پھیرے کھڑے تھے

اس شکل سے صحرا میں پڑے تھے وہ دلاور   جس طرح مرقّع کہیں ہو جاتا ہے ابتر
سوتے تھے کہیں خاک پہ دو بھائی برابر   دولھا کوئی پامال تھا گھوڑوں سے سراسر
بُندے کوئی پہنے ہوئے پیارا سا پڑا تھا
ریتی پہ کوئی طفل ستارا سا پڑا تھا

سوتا تھا لبِ نہر کوئی ہاتھ کٹائے   تھا خوابِ اجل میں کوئی پھل برچھی کا کھائے
تھے جسم لہو میں عوضِ غسل نہائے   اتنا بھی نہ تھا کوئی کہ قبریں تو بنائے

دم نکلتے تھے مشکل سے کہ وہ تازہ جواں تھے
بالائے زمیں پاؤں رگڑنے کے نشاں تھے

○

جب سُنی ہند کے آنے کی خبر زینب نے
یاس سے کی سوئے افلاک نظر زینب نے
شرم سے زانو پہ نہوڑا لیا سر زینب نے
کہا ایک ایک سے بادیدۂ تر زینب نے
"خاک لے کر مرے چہرے پہ لگاؤ لوگو
ہند آتی ہے، کہیں مجھ کو چھپاؤ لوگو

اُس نے دیکھا تھا مدینے میں مرا جاہ و حشم
گھر تھا آباد، سلامت تھے شہنشاہِ امم
قید اب خانۂ زنداں میں ہوں میں کشتۂ غم
نیل بازو پہ ہیں رسّی کے اور آنکھوں پہ وَرم
چاک ماتم میں گریباں ہے، کھلے سر ہوں میں
شرم آتی ہے کہ شبیرؑ کی خواہر ہوں میں

میری مادر کا ہے مریم سے زیادہ رُتبہ
نہ کہا جائے گا مجھ سے کہ ہوں بنتِ زہراؑ
لونڈیاں اس کی کہیں گی کہ تعجب کی ہے جا
دخترِ شیرِ خدا، اور نہیں سر پہ ردا!
خاک پر بیٹھی ہے، سایہ نہیں، بستر بھی نہیں
یہ تو زہراؑ کی کنیزوں کے برابر بھی نہیں"

یہ بات سُن کے سہم گئی وہ جگر فگار
دروازے سے سر کے لگی رونے زار زار
دالان سے پکاری یہ بانوئے نامدار
"بی بی، کدھر گئیں، اِدھر آؤ، یہ ماں نثار
کھولے گا کون دَر، کیسے چلاّتی پھرتی ہو
واری کہاں اندھیرے میں ٹکراتی پھرتی ہو"

روتی ہوئی یہ کہہ کے اُٹھی بانوئے حزیں
بیٹی کو ڈھونڈھتی گئی دروازے کے قریں
روتی تھی منہ کو کُرتے سے ڈھانپے وہ مہ جبیں
پاس آکے ماں نے سر سے قدم تک بلائیں لیں
سر کو جھکا کے پہلے تو وہ پیچھے ہٹ گئی
پھر ننھے ہاتھ اُٹھا کے گلے سے لپٹ گئی

○

شفیق فاطمہ شعریٰ

حضارتِ جدید

(۱)

کسی ربیع کا کبھی گزر ہوا،
نہ اس کے رنگ زار ہیں۔
سموم بخت،
رائیگانیِ حیات ہی کے
دَور لائی پے بہ پے۔
ذرا سا وقفۂ سکون و آشتی کبھی
جو مل سکا تو اس لیے
کہ فصل ایک اور،
حلقہ حلقہ بین کرتی، نائحات سینہ کوب کی
اُگے، پلے، بڑھے۔

حضارتِ جدید
اُکھڑی ہوئی
قرانۂ یاس کی اسی چٹان پر
جہاں سے وادیِ ہبوط کی
مہیب کھائیاں

دکھائی دے رہی ہیں
پوچھتی ہوئی :
یہ دیر اور اتنی دیر کس لئے ؟
نہیں ـــــــــــــــــــ
وہ گل بکاولی امید ـــــــــ وہ نواب
جن و پری کے خانہ باغ ہی کا خواب
کہ آدمی بشر کو دے گئی خود آگہی
سلف بزرگ ایسے جھنڈ جھنڈ
جبلّتوں کی باڑیوں میں جو اُتر کے
چتر کے چُگ کے بتّی بتّی اس نہال کی
کلیلیں کرنے میں مگن

سنو وہ موٹ ، وہ رہٹ کی نورِ چشم
اسی گل مراد کے فراق میں تو گر رہی ہے بلبن
ہائے میرا پھول
میرے دل کا چین ـــــــــــــــ
بھول ! یہ نہ بھول
تیرے خارزار سینچنے میں
میری زندگی کٹی
تو کیا اسی لئے
کہ دیکھنا پڑے یہ دن
دھتورے ! تو بھی زہر کھا کے
سو رہا تھا اس سمے
زمانے ! ہائے تیرے درمیاں سے اٹھ گئی وفا
ہوا بدل گئی

کہ لا سکی نہ ڈھونڈ کر کہیں سے اس کی بو
تھمی ہوئی ہے کیسے اب نظر کے سامنے
وہ تھان سرخ رو
(گھڑی وہ ایسی جاں گداز جب
غشی کی سنسناہٹیں قرین کفر تھیں
نہ لخلخہ سنگھانے کا رواج بد عقیدگی)
سسکتی دوب نے گلے لگا یا
اور پھٹ پڑی :———
نظر کسی کی اس کو کھا گئی سکھی
کہا کسی نے اپنی چشم بد کے ساتھ
بد گہر وہ ڈوب کر مرے
کہا کسی نے حال اس کا یوں ہو
اور مآل اس کا یوں
تو الغرض
بہ اتفاق رائے
نار اور سقر کا بابِ داخلہ
پہاڑ کی چٹان ہی بنی

حضارت جدید
پہ سینہ میں پسیجی بھاپ بھاپ !
تو میں اسے سنبھالتی ہوں :———
برق خانہ سوز !
پیچ و تاب کھا رہی ہے کیوں
محجّرات میں دبی
پرانی ہڈیاں چبا رہی ہے کیوں

کہ کب کہاں ہوا تھا واقعہ یہ رونما
مبالغہ سمجھ رہی ہے خود نوشت کو
ہتھیلی طنطنہ بھری ——————
تو کھل اٹھی
کہ اس کے ڈھب کی بات تھی
وہ اب دھڑی جما رہی ہے
لپسٹک کی شوخ و شنگ۔

ہتھیلیوں پہ تتلیوں کا رنگ
ذرا سا جس نے مَل لیا
وہی اجنتۂ حیات کا
بزعمِ خویش آفریدگار
مگر حیاتیات و نفسیات و وضعیات
لگا سکے نہ قدغنِ سکوت
جھپکتے ہی رہے ملیورِ صبح و شام
جھپکتے ہی رہیں گے بے شعور
یہ صبح و شام کا لزوم بھی عجیب
کہ عقل دنگ ہے
ہزار سبقتِ وجود بخش دو انھیں
مگر نہ باز آئیں گے
یہ اس روش سے، ان کا جو پرانا ڈھنگ ہے
کہ صبح و شام کے سوا، دیا گیا، مزید وقت
دانہ دنکا چگنے میں گنوائیں گے
ہمارا مصرف اس جہاں میں بس یہی
کہ چہچہوں میں گونجتی،

پہیلیوں کو بوجھنے میں مات کھائیں، زک اٹھائیں ——
تو بارہ مان کر مجدّدِ دینِ دینِ آذری
تراشتے ہیں طاقِ دل کے شمعدان میں
اک ایسی لو
جو گل شدہ رہی ہے مدّتوں
تراشتے ہیں اک مجسّمہ عصا بدست
قوام ذرّہ ہائے نابکار سے ڈھلا
اسی کے پاس
اپنی چوکڑی میں منجمد
تلازمہ بھی ایک آہوئے رمیدہ کا ——
ادھر گیاہ و گل بکف ہوائیں
اک صلائے عام
مرے خدا
ادھر وہی قدیم دام

چبوترہ نہیں
یہ گھر کی منہدم حدود ہیں
شرورِ نفس کے بچھیرے بے لگام
جس کے سقف و بام روندکر گذر گئے
طفولیت کے خواب کہفِ خوف میں پناہ گیر
کہ آرزوئے مشاہدات
اب جڑوں پہ چل رہا ہے بے دریغ
شعورِ طفلِ شیرخوار میں گھوڑے
قیافے کیا ہیں، دیکھنا ہے،
مامتا ہے کیا

شفق کا رنگ کونپلوں میں
جن کے لاشعور نے کیا کشید
ان جڑوں کا ماجرا ہے کیا ———
یہیں سے شاخساروں کا
ہرا بھرا وہ سائباں
سروں سے اٹھ گیا
طفولیت اجیر
آجروں مہوسوں کے جال میں اسیر
ہزار حیف / الامان والعیاذ
یہ جنگلات
شحنہ و سپاہ کی شکست فاش کا محاذ

ہمارے ہاتھ کی لکیروں میں جو سانحات
پانچ گروہ کف شناس
وانسلِ اجل ہوئے
انھیں کے پے بہ پے نزول کو
بھگتنے کا یہ وقت ہے
یہیں سے وہ سرشت
جس کی بندشِ حدود میں
بندھے ہوئے تھے ذی نفس تمام
زوج زوج
بکھر رہی ہے ———
یہیں سے بے مہار خامہ کار گرمیِ سخن کا سلسلہ،
مذاکرات اور فکر و فن کے جائزے شروع ۔

ردائے گوشت پوست سے خروج کردہ
پنجروں کے ڈھیر جا بجا ———
یہ کیسی گونج پھڑپھڑاتی مقبروں کے درمیاں
یہ سرد بھٹیاں
اڑا رہی ہیں سرد راکھ کا غبار کس لئے ———
یہی وہ انبیاء کا انتباہ تھا/کہ جس کی دھار کو/
صلیب و خنجر و تبر جب آزما چکے
تو جنبشِ قلم بھی اب/ بنامِ حرّیت/
الجھ رہی ہے اس سے ڈر زرخریدہ
بنامِ حرّیت
مجسّمہ تراش جس کا دستِ ساحری
تو جنگ زرگری کے سورما
مجسّمہ فروش ———
سنائی دے رہی ہے شیطنت کے منتروں کی گونج
نشانِ نیل اپنی اپنی شہ رگوں پہ ڈھونڈنے کا دور ہے
جسے بھی ڈس گئی وہ نوکِ خامۂ سیاہ
وہ تم نہیں وہ میں نہیں وہ کوئی اور ہے

بھڑک بھڑک کے جل بجھا
الاؤ بولہب کا
صرصرِ فنا نے اس کی راکھ بھی
اڑا کے ساتویں تلی میں جھونک دی
مگر جبلّتِ نباح پھر
جو رو رہی ہے منھ اٹھائے سوئے آسماں
تو بات کیا ہے ———

کیا یہ چودھویں کی رات ہے

حضارت جدید!
باتش نا بہ بیمنت
بہ سیلِ بے پناہ نورِ لمِ یزل
بہ پرتو نگاہ کاشفِ دُرجی؟

سرودِ کلمۂ نخست

(۲)

بہاؤ ہیں وہ جاوداں سرود
سرود کے بہاؤ میں،
خلائے بے تُہی بھی ناپدید،
ملائے اتفاق بے سیاق و بے سباق بھی ——
تمام خار و خس کے ڈھیر،
دھوئیں کے شہر، راکھ کے دیار
راج کا گماں نراج کا خمار
کثیف حبس، لاعلاج ہول
سیاہ دلدلوں سے اُٹھتے ابخرات
چھپی ہوئی غبار در غبار،
دیوزاد قدروں کی قطار،
وہ ان کے ہاتھ اونچے اونچے آسنوں سے
نذر گیر
اور ہتھیلیاں لہو بھری ——
کھنڈر ثقافتوں کے

جبر کے حصار
اٹا ہوا تمام ان میں روح کا کباڑ
تن کے روگ من کا ہیر پھیر
تمام خار و خس کے ڈھیر
غرق ورطۂ فنا

سرود ـــــ زندہ رود

مہیب تودہ ہائے ریگ میں دبی
حیات کی کراہ
اپنی بند پلکوں پر جمی
تہیں سیاہ ریت کی
ہٹا کے سوچتی ہے ـــــ خواب ہے کہ واقعہ
دمک اٹھی ہیں ناگہاں جو گھاٹیاں وداع کی
کھلی فضا میں کیسے
نغمۂ طلوع بدر
گا رہی ہیں دف بجا رہی ہیں لڑکیاں
کسے خبر تھی ایک دن
یہ کونجیں پر شکستہ بے نوا
الاپتی ملیں گی
شکر جاوداں کی بے کراں الاپ

ہزار جذبے اشک اشک
راز راز جن کے نام
خروش زن نفس کے تار میں
وہ قصد پر شتاب ہیں

ان اڑتے گیسوؤں کی لمعہ لمعہ تاب ——
سوادِ چشم سی / کسی سیاہ سرزمیں کے بخت پہ
کہیں / قیامتیں گذر رہی ہیں انتظار میں
ابل ابل کے آتما کی تھاہ سے
رُندھی رُندھی پکار
یاں بھی تو ہے / وہ نالۂ ذبیح بھی /
فُدَیتُکَ کی شرح زار زار،
بلال اور صہیب کے دیار میں

صد ہزاراں آفریں برجانِ او[1]

(۳)

مُحمّدؐ ان کا نام
وہ شہسوارِ رہگذارِ نور
وہ حسنِ تام، رحمتِ عمیم
سب جہانوں کے لئے۔
نگاہ ان کی ساعتِ حساب سی
نئی پرانی داد خواہ بستیوں کی داد گر
وہ شارعِ عظیم، وہ حَکَم
سبھی زمانوں کے لئے۔
شبانِ وامی ویتیم

[1] صد ہزاراں آفریں برجانِ او — بر قدوم و دورِ فرزندانِ او
آں خلیفہ زادگانِ مقبلش — زادہ اند از عنصرِ جان و دِلش
گر ز بغداد و ہرات و وز رے اند — بے مزاجِ آب و گلِ نسلِ وے اند (رومیؔ)

فاتح رحیم
شہر یار دردمند
معلّمِ امم
انھیں کا جلوۂ مکارمِ اتم
بنا جوازِ آفرینش
آسمانوں کے لئے۔

یتیم کی ہنسی، اسیر کی رہائی،
بچوں کی شگفتگی،
کھلی فضاؤں میں طیور کی اڑان ــــ انھیں پسند

درندوں کی نگاہوں کے
شراروں سے بھرے
گھنے بنوں میں راستے تراشتے
مچانیں باندھتے جوان ــــ انھیں پسند

بیاؤ کے قریں
سوالوں کے ہجوم
بلاتے پینے میں
یگانگت کی وضع دلربا
برابری کی شان ــــ انھیں پسند

محبت ان کی چاندنی
وسیلۂ شناخت
محبت ان کی شان اور نشانِ امتیاز

مقامِ ناز جادۂ نیاز
محبّت ان کا رازِ ان کا معجزہ
محمدؐ ان کا نام

محمدؐ ان کا نام
وہ فصلِ نو بہار
پھول پھول کا اٹھائے بار
کفیلِ وحق گذارِ رنگ و نم ———
کرن کرن فدائیانِ آفتاب ،
وہ مرد و زن ،
شریک و ہم جوار و ہمقدم ،
یہ مجلسِ شرف یہ دشتِ ابتلا یہ جادۂ حرم
یہ پرتوِ مہہِ تمام خود سپار وہ تلاطمِ وجود
وہ موج موج اعتبارِ بحر!
کشاد در کشا دِ دار و لبست !
نہیں ——— !
حضارتِ قدیم !
یہ سہانے لمحوں کا بہاؤ
یہ نمودِ پرشکوہ
کسی زمانے کے لئے بھی
گاہوارۂ فتن نہیں
کسی بھی دور میں نواحِ جاں
نواحِ جاں نہیں
نوا گر میں جنّت مشام
نمود ہو گئے پیرہن نہیں ———

Join eBooks Telegram

کہاں سے آگئیں
یہ دو جہاں کے درمیاں بھی
گھاٹیاں وداع کی ــــــ
مگر یہ پھول چننے والے مانتے ہیں کب
کہ جاگتے ہیں اب بھی صبح دم
الاپتے ہوئے وہی
ترانۂ فروغِ نو بہار ــــــ

رُبعِ کشت زارِ ہاجرہؑ

(۴)

وہ رنگِ ابتسام
جس سے نام منکشف
نسب عیاں ــــــ
مہک لہک یگانگت کی جیسے معنویت وجود ہو وہی ــــــ
وہ بانیٔ حرمؑ کے وارثِ دار
بچاؤ کر رہے ہیں زمزمِ قدیم کا
جو خاطرِ عظیم کا نوشتہ زمزمہ
جو فطرتِ بشر ــــــ

یہ آندھیاں جو اٹھ رہی ہیں بار بار
یہ سنگریزوں کا پٹاؤ جا بجا
کبھی کبھی اسی میں ممکنات بھی نہاں

وبالِ مسخ کی

تو التزام ——

یا اک صاف تہہ کا التزام ——

زیرِ سطحِ آب رنگ و نشن ..

وسیلۂ بقا بھی چارۂ دفاع بھی ہے کارگر۔

وہ دامنِ صفا میں سعی و جہد، ماجرہ کی روئیداد

جو یاد آ گئی

تو دل میں چشمۂ رواں کی گنگناہٹیں جگا گئی ——

وہ مصر دیس کی حضارتِ کہن کو تیاگ کر

اسی نواح میں ہوئی تھیں خیمہ زن ——

بہت دنوں میں یادداشت سے مٹے

سنگھاسنوں کے آسرے میں

دور تک گئے ہوئے

وہ معبدوں کے سلسلے ——

ممی کے روپ میں وہ زندگی سے کٹ کے

جینے کا رواج ——

گھرانوں کی ہوا سے باختہ وہ بھاگ دوڑ

جس کا منتہا وہی حرم سرا کا راج

وہاں سے پھر کسی حرم کی سمت کوچ

تو ماجرا عجیب اس طلسم زار کا

کسی بخوردان میں مہک نہ زیورات میں کھنک

سلاسل رباب چپ

گلوئے سنگ بستہ بے صدا

ادھر انا کا افعی سیاہ

اٹھا رہا تھا اپنا پھن کہ بس ادھر وہ جنبش نگاہ منجمد
ابھی ڈھلا نہ تھا مسافت دراز کا غبار
کہ فرقت خلیل کا یہ موڑ
راستے میں آگیا ———
یہاں پہنچ کے ہجر کا بیان ہی
اثاثۂ حیات ———
یہ بحر بے کران ریگ اور اس میں ڈوبتی ہوئی
اکیلے پن کی یہ نمود ———
تبھی پکار ایک طفلِ ناتواں کی گونجتی ہے
اور ہیکل مراقبہ شکست و ریخت سے دوچار ———

کٹی دنوں سے شور آب کی بھی ضد یہی
کہ چار ہاتھ نازک و سبک سہی
مگر مجھے بھی اپنے ساتھ لیں
تو ہم سبھی مزارعینِ کشتِ بے نبات ———
بہاؤ رفتہ رفتہ تیز ہو رہا ہے شاہراہ کا
اتر رہے ہیں کوچ کر رہے ہیں قافلے ———
قریب و دور کے پنپتے نخل زار آج کل
ہمارے اس پڑاؤ کو
پکارنے لگے ہیں
میزبان زائرین و زائرات (پیار سے)
وہ کل کا طفل ناتواں
دلیر و نرم خو جوان خوبرو ہے اب (خدا رکھے)
یہاں سے ان کی سوچ کا سہانا سلسلہ
خلیلؑ کی دعا سے جا ملا

ضیا جالندھری

غزل

درد سمٹتی ہوئی صبح کی لالہ تاب لو
دل میں گزشتہ شب کی یاد آنکھ میں آتے دن کی ضَو

دل پہ سہج سہج کھلا غنچہ مثال وہ جمال
دیکھیں تو اس کی ایک چھب، سوچیں تو اسکے روپ سَو

ترکِ تعلقات سے جانچ نہ دل کی کیفیت
وہ تھا انا کا برف زار، یہ ہے لہو کی گیت رَو

خواہشِ خود فریب کا سلسلہ ٹوٹتا نہیں
پھر کہیں روشنی سی ہے، پھر کہیں پھوٹتی ہے پَو

سینے میں سیلِ پیچ و تاب سلسلۂ شکستِ خواب
سوچ، سوال، اضطراب، تازہ بہ تازہ نو بہ نو

دشت میں میرے رہنما ریت پہ سُرخ نقشِ پا
شمعیں جلا کے رکھ گئے اپنے لہو سے پیش رَو

دورِ ہوس پرست میں ڈھونڈ رہی ہے آنکھ انھیں
خوانِ شہی سے بڑھ کے ہے جن کی نظر میں نانِ جو

شام و سحر بدل گئے، قلب و نظر بدل گئے
یاد ہے مجھ کو اس کے ساتھ آئی تھی ایک تیز رَو

ضیا جالندھری

غزل

رابطے ٹوٹ گئے، رشتے فراموش ہوئے
کیا چہکتے ہوئے کوچے تھے کہ خاموش ہوئے

آخرِ شب تری آواز کا اشراق ہوا
عالمِ ہُو میں دو عالم ہمہ تن گوش ہوئے

لذّتِ تشنہ لبی دل کے سلیقے کی جزا
وہ جو کم ذوق تھے رندانِ بلا نوش ہوئے

سبھی مصروفِ تماشا تھے پہ کس نے دیکھے
دل جو افسردہ سرِ بزمِ طرب دوش ہوئے

آنکھ اُسے دیکھ کے پھر دیکھتی رہ جاتی ہے
جس کے باعث کئی خورشید سیہ پوش ہوئے

وہ عجب لمحہ تھا، اس پل کی کشش ایسی تھی
بڑھ کے ہم آپ قیامت سے ہم آغوش ہوئے

ہوش آیا تو ضیا قصّۂ پارینہ لگے
وہ کہ جو باعثِ غارت گریِ ہوش ہوئے

ضیا جالندھری

غزل

یہ زمیں صحیفۂ خاک ہے، یہ فلک صحیفۂ نور ہے
یہ کلام پڑھ کبھی غور سے، یہاں ذرّہ ذرّہ زبور ہے

یہاں برگ برگ ہے اک نوا، گل و یاسمن ہیں سخن سرا
اسے حفظ کر، اسے دل میں رکھ، یہ چمن جو تیرے حضور ہے

یہ جو چند پل ترے بس میں ہیں انھیں دُور سمجھ کے سمیٹ لے
یہ جو آگ سی ترے دل میں ہے، یہ شبیہِ شعلۂ طور ہے

ہیں خزاں سے خوفزدہ نہیں، ہیں ہوا کا دست نگر نہیں
تپِ موجِ گل مرے خوں میں ہے، مرے دل میں لحنِ طیور ہے

وہی جی گئے جو حیات کے خد و خال خوں سے سجا گئے
انھیں موت کا کوئی ڈر نہیں جنھیں زندگی کا شعور ہے

کبھی راحتوں میں بھی رو لیے، کبھی جی کو غم سے رجھا لیا
یہاں ہجر و وصل سب ایک ہیں، نہ وہ پاس تھا نہ وہ دور ہے

شب و روز دشتِ حیات کے سفرِ گراں میں گذر گئے
وہی جسم و جاں کی شکستگی، وہی آرزو کا وفور ہے

لبِ خندہ جھانک لیا نہ ہو، رخِ گریہ دیکھ لیا نہ ہو
یہ جو حد سے بڑھ کے تپاک ہے کوئی پردہ اس میں ضرور ہے

وہ غریب مجھ کو عزیز ہے، وہ فقیر میرا امام ہے
جسے خاک ہونے پہ ناز ہے، جسے چشمِ تر پہ غرور ہے

دلِ آدمی میں بھڑک اٹھی ہے یہ کیسی خواہشِ خودکشی
یہ جو شہر شہر فساد ہے، یہ جو قریہ قریہ فتور ہے

کوئی نغمہ سنج ہو کیا ضیا، یہاں کوئی بزم سجائے کیا
نہ ہوا میں پہلا خمار ہے، نہ فضا میں رقصِ سرور ہے

حمید نسیم

غزل

"مہر سے تا ذرّہ دل و دل ہے" تری جلوہ گاہ
پھر بھی ہیں کتنے جو تجھے دیکھ سکے اک نگاہ

دشتِ محبّت کے مسافر کے لئے زادِ راہ
آشفتگیٔ عقل و جنوں، مستیٔ قلب و نگاہ

جی ہمہ ممنونیت اِس شعلگیٔ جاں پہ ہے
تیرہ زمانوں میں بھی تابندہ رہی غم کی راہ

میری تجارت کو بھی دیکھ اے شہِ خوبانِ شہر
سلطنتِ واسعِ دل اور بدل اک نگاہ

تیری گدائی کے عوض ملکِ سلیماں نہ لے
جانِ جہاں ہے کہیں اس دل سا کوئی بادشاہ

رات سجی جی میں فضا تیری خود آرائی کی
جیسے بیاباں میں کھِلے تابِ مہِ نیم ماہ

عرصۂ احساس میں دیکھا ہے تجھے بے حجاب
اب قد و رُخ میں ترے دل کو نہیں کچھ اشتباہ

کس کو ملی کب یہ زخود رفتگی و ناکسی
دیکھنے لائق ہے ترے اب مرا حالِ تباہ

یہ جو مری زیست تھی اک عمر سے روزِ سیاہ
میرے حوالے سے ہے اب مطلعِ صد مہر و ماہ

حمید نسیم

غزل

غیب سے آئی بو پھٹے، روشن و عنبریں ہوا
جی کی فضا نکھر گئی، عرصۂ جاں مہک اٹھا

دیکھے تو مدتیں ہوئیں، تازہ ہے آج بھی وہ دید
رات کا آسمان تھا جلتے دیوں کی جھیل سا

حق ہے یہ دشتِ کائنات اور یہ مسافتِ حیات
جان سکو تو مرگِ تن موڑ ہے ایک راہ کا

کتنے جُگوں سے نارسا راہ پہ چل رہے ہیں ہم
کس کو خبر سفر ہے یہ، اور ابھی کتنی دور کا

وقتِ رواں سے ماورا عشق کے مرحلے ہیں کیا
کیا ہے اُدھر کا بندوبست، کون یہ بھید پا سکا

اُس کی ہر اک نگہ کا ہے لہجہ نیا اور اجنبی
عمر گزر گئی پہ وہ آنکھ ہوئی نہ آشنا

سادہ سی بات چاہ کی، ہو گئی کتنی گنجلک
ہم نے نہ جانے کیا کہا، اس نے نہ جانے کیا سُنا

دورِ ہوس میں دل کو ہم سمجھے تھے امن کا حصار
ایک ذرا سی ٹھیس اور آئنہ چُور چُور تھا

ابرِ سیہ کی اوٹ سے چاند نے شب یہ دی ندا
مشعلِ جاں جلا کے چل، تیرہ ہے تیرا راستا

اے مرے خوش نگاہ دل، کب سے فسردہ ہے فضا
حرف کی لَو کہاں گئی، کیا ہوا شعلۂ نوا

شفیق فاطمہ شعریٰ

غزل

جھرمٹوں میں جا بجا سورج مکھی درشن لگن
اور کرنوں کے جھاکوں سے اٹا نیلا گگن

جوڑ کر گاگر سے گاگر کھل اٹھیں کس بات پر
چشمۂ خورشید کی پنہاریاں، شیریں بچن

یاد آئیں گے یہ پتھریلی ڈگر کے پیچ و خم
اور یہ قدموں سے لپٹی بے بہا شیریں تھکن

ہے مقدم ہفت خواں کی داستاں یا وہ خبر
قاصدا! جس کو چھپانے پر مُصر چرخِ کہن

انکھڑیوں پر اپنی کچھ پڑھوا کے دم کرتے رہو
اے سیہ چشمانِ رمنہ اے غزالانِ سخن

نادہندانہ اٹھایا قرضِ چشمِ نم کا بار
اس پہ چشمک زن ہے نرموہی یہ بزمِ ما و من

پھر کسی سائیں سے مانگے بندشیِ احوالِ ما
کل کشادہ اندر کشادہ اک حریرِ دیدۂ فتن

خواستم نادیدہ از چشمِ زمانہ قلبِ زار
ناصبوری ہا بہ طرزِ خوش دمیہا کا یہ فن

دریا سا بہتا ہے مجھ میں
سا نہیں اِک دریا ہے مجھ میں
گو یہ خزانے سب تیرے ہیں
دروازہ کھلتا ہے مجھ میں
کھنک، چمک سب اُس سے پیدا
پھیلا ہوا جو نغما، ہے مجھ میں
جادو کا اِک نگر ہو جیسے
کچھ بھی ہو سکتا ہے مجھ میں
بھیج اِدھر بھی اِک گوریّا
ایک شجر پھیلا ہے مجھ میں
کیا میں اور کیا میری ذات
جب وہ در آتا ہے مجھ میں
کس کی چاپ سُنا کرتا ہوں
کون چلا کرتا ہے مجھ میں
اپنے اندھیرے روشن کر لے
ایک دیا جلتا ہے مجھ میں
جیسے آوازوں کا جنگل
ایسا سنّاٹا ہے مجھ میں

عتیق اللہ

غزلیں

اندھیرا میرے باطن میں پڑا تھا
کوئی مجھ کو پکارے جا رہا تھا
ہم اپنے آسمانوں میں کہیں تھے
ہمارے پیچھے کوئی آ رہا تھا
افق سنسان ہوتے جا رہے تھے
سکوتِ وصل کا منظر بھی کیا تھا
چمک کیسی بدن سے پھوٹ نکلی
ہمارے ہاتھ میں کس کا سرا تھا
سرِ لمسِ بدن جو لذّتیں تھیں
خطا کے بطن میں جو کیف سا تھا
ہیں صدیوں اُس طرف تھا اور وہ مجھ کو
مری موجودگی میں دیکھتا تھا
کوئی شب ڈھونڈتی تھی مجھ کو اور میں
تری نیندوں میں جا کر سو گیا تھا
اُسی نے ظلمتیں پھیلا رکھی ہیں
اساسِ خواب پر جس کو رکھا تھا

عتیق اللہ

غزلیں

رنج کر رنج سہلِ جاں کے لئے
سارے اندیشے ہیں زیاں کے لئے

قلب گہہ کے چراغ روشن رکھ
یہ ستارے ہیں آسماں کے لئے

خوابِ آئندگاں رقم کر لوں
یہ مقدّر ہے رفتگاں کے لئے

اِک قدم اِس جہاں پہ رکھتا ہوں
دوسرا، دوسرے جہاں کے لئے

ایک دن تجھ کو، تجھ میں دیکھا تھا
سانحہ تھا، وہ میری جاں کے لئے

کس خزانے کی تھی تلاش ہمیں
اور پھر قصد تھا کہاں کے لئے

ایک پل بھی بچا نہیں رکھا
مہلتِ عرصۂ رواں کے لئے

چند دن اور یوں بسر کرتے
پھر ترا رنج عمر بھر کرتے

ساعتِ وصل آنکھ میں ہوتی
رات کچھ اور مختصر کرتے

اک تسلسل میں دیکھتے تجھ کو
تیرے باطن میں اپنا گھر کرتے

اِس کی ٹہنی پہ کاٹ دیتے دن
رات پھر اُس مچان پر کرتے

کتنی حیران کُن گھڑی ہوتی
وہ تماشہ بھی ہم اگر کرتے

وصل سے ہجر کاٹ دیتے اور
بے تماشہ گذر بسر کرتے

انیس اشفاق

غزل

کارِ ہنر میں دل زخمی ہے عرضِ ہنر میں جاں کا زیاں ہے
چھوڑ یہ پیشہ، اس پیشے میں پہلی سی وہ بات کہاں ہے

چار طرف جو آگ لگی ہے میں ہی اُس میں سلگ رہا ہوں
اٹھتا ہے جو سب کے گھروں سے یہ میرے ہی دل کا دھواں ہے

تیرے لمس کے مہتابوں سے میرا سارا جسم ہے روشن
کل تک جو تاریک بہت تھا اب وہ قریہ نور نشاں ہے

ایک چراغ اور ایک چٹائی اس سے زیادہ کچھ نہیں بھائی
ہم سا خوش آموزِ قناعت رکھتا بھی کچھ اور کہاں ہے

دور طلسموں کے منظر اور اُن کے پیچھے ایک خزانہ
سانپ ہواؤں میں اڑتے ہیں اور زمیں پہ خون رواں ہے

تیرے چمن میں رات کو ہم نے ایک عجب آواز سنی ہے
اب کے شاید کوئی پرندہ خانۂ گُل میں گریہ کناں ہے

ظفر اقبال ظفر

غزل

دے کے شیشے کا بدن پتھر کا گھر مجھ کو دیا
لمحہ لمحہ ٹوٹتے رہنے کا ڈر مجھ کو دیا

کشتیاں، پتوار، ساحل، بادباں سب لے گئے
موجِ طوفاں سے گزرنے کا ہنر مجھ کو دیا

آندھیوں کے شہر میں رہنا تھا شاید اس لئے
بے در و دیوار کا رہنے کو گھر مجھ کو دیا

یاس و نومیدی کو پہلے کفر ٹھہرایا گیا
پھر گھنے تاریک جنگل کا سفر مجھ کو دیا

میری قسمت میں شہادت کا اجالا تھا ظفر
تھا سبک دوشی کا طالب اُس نے سر مجھ کو دیا

غزلیں

زبیرؔ شفائی

تدبیر کی گرفت میں تقدیر کس کی ہے
یعنی خطِ کشیدہ میں تحریر کس کی ہے

قاتل بھی سر بریدہ ہے مقتولوں کی طرح
یہ زندگی کے ہاتھ میں شمشیر کس کی ہے

یہ بار بار کس کی طرف بڑھ رہی ہے لَو
ظلمت شکن چراغ میں تنویر کس کی ہے

دن ڈوبتے ہی جیسے مجھے کھینچتا ہے گھر
یہ صرف ایک پاؤں میں زنجیر کس کی ہے

صحرا میں گھومتا ہوں بگولوں کے ساتھ میں
میرے تصرّفات میں جاگیر کس کی ہے

یہ آرٹ گیلری نہیں بڈروم ہے زبیرؔ
یہ مختصر لباس میں تصویر کس کی ہے

غنچۂ سرخ کی پوشاک ہری ہے دیکھو
رنگ سے روپ کی ایجادگری ہے دیکھو

کون ہم رقص تھا، گردن میں تھیں کس کی بانہیں
جشن کے بعد کہاں لال پری ہے دیکھو

میرا نغمہ، کہیں آواز کا چھالا تو نہیں
پیراہن پیراہن آنسو کی تری ہے دیکھو

ناتراشیدہ بت آہنگِ سخن جان گئے
دست کاری نہیں، تخلیق کھری ہے دیکھو

شہر و صحرا کو ہوادار بنائے رکھنا
میرے دامن میں بہت راکھ بھری ہے دیکھو

زیبؔ آجاؤ کہ اب روح سے خالی ہے زبیرؔ
سامنے آتشِ سیال دھری ہے دیکھو

زبیر شفائی

غزلیں

بساطِ خاک سے باہر نشانِ اوّل ہوں
میں ارتقائے سفر کا جہانِ اوّل ہوں

میں گھومتا ہوں بگولے میں بند ہو کر بھی
غبارِ دشت نہیں آسمانِ اوّل ہوں

یہ کشف وہ ہے جو مجھ پر کبھی نہیں کھلتا
دعائے آخرِ شب یا فغانِ اوّل ہوں

ڈھکے ہے گوشۂ صحرا کو میری پرچھائی
میں ابر پارہ نہیں سائبانِ اوّل ہوں

کمالِ حاضر و غائب ہے کائنات مری
مکانِ بعد میں ہوں لا مکانِ اوّل ہوں

زبیرؔ ازل سے تلاشِ ابد گزیدہ ہے
میں کہکشاں کی طرح کاروانِ اوّل ہوں

رقص موسیقی خورشِ الحانی ہے استقبال میں
میرا مستقبل کہ داخل ہو رہا ہے حال میں

بند کر لیتا ہوں آنکھیں آئینے کے سامنے
پھر میں خود کو دیکھتا ہوں مختلف اشکال میں

کیا تضادِ ذات ہے تشکیل سے تکمیل تک
روح میری آسماں پر جسم ہے پاتال میں

چیخنے والا بھی میں ہوں سننے والا بھی ہوں میں
اپنے گھر کی روزمرّہ زندگی کے جال میں

کون صرفِ رائیگاں سے روک سکتا ہے مجھے
جسم سے جاں تک تمام اشیا ہیں استعمال میں

رات دن آتی ہیں پُراسرار آوازیں زبیرؔ
رخنۂ دیوار ہے زندانِ ماہ و سال میں

کامل اختر

غزلیں

بہت ہوا بے قرار اِک دن
بکھر گیا اختیار اِک دن

اک آئینہ پاش پاش دیکھا
میں عکس تھا بے شمار اِک دن

ہوا کی چوکھٹ پہ گر پڑا پھر
اٹھا نہیں شہسوار اِک دن

کسی طرف سے کبھی صدا دے
کہیں سے مجھ کو پکار اِک دن

اُجاڑ سی دوپہر میں نکلے
اداس رہگذار اِک دن

شجر کو ہے انتظار، اترے
نئے پرندوں کی ڈار اِک دن

ریت کے ڈھیر تھے طوفاں سے ڈرتے کم تھے
اِک زمانہ تھا کہ ہم لوگ بکھرتے کم تھے

اِک دھنک تیرتی رہتی تھی لہو میں ہر دم
آنکھ کے دشت میں جگنو تھے کہ مرتے کم تھے

ایک طوفان ہمیشہ ہی اُمڈتا رہتا
تیز رفتار تھے دریا کہ اُترتے کم تھے

حادثے جاں کے نواحوں پہ گذرتے لیکن
شیشہ و سنگ اثر جسم پہ کرتے کم تھے

گوش و لب اُن سے بھی مانوس ہوئے جاتے ہیں
زندگی — لفظ جو ہم نے کبھی برتے کم تھے

شاہد کلیم

غزل

کیوں کہتے ہو پاؤں نہیں گھر چلتا ہے
ایسی ہی باتوں پر خنجر چلتا ہے

آسودہ ہے کون تماشا بینی سے
آنکھیں تھک جاتی ہیں منظر چلتا ہے

رات گئے سب آپس میں مل جاتے ہیں
خوابوں کی دنیا میں بستر چلتا ہے

شیشے کا گھر اچھا لگتا ہے لیکن
شیشے کے گھر پر ہی پتھر چلتا ہے

پیاس بجھانا ساحل ساحل جا کر کیا
خود آئے گا خوب سمندر چلتا ہے

باہر باہر یونہی نہیں ہیں بے ترتیب
تیز ہوا کا جھونکا اندر چلتا ہے

شاہد وہ منظر کیسا ہوتا ہے جب
پگڈنڈی پر چاند اتر کر چلتا ہے

ضیا جالندھری

شوریدہ

وہ لفظ پھول، لفظ برگ سے
ہوا میں صَوت و رنگ اچھالتا رہا
وہ جوششِ نوا کو پالتا رہا
وہ اپنا بے پناہ اضطراب
لمحہ لمحہ حرف کی نمو میں ڈھالتا رہا

وہ بولتا رہا
وہ حبسِ جاں گُسل میں دل دریچے کھولتا رہا

وہ پے بہ پے سوال پوچھتا رہا
گمان و وہم کی گرانیوں سے نیم جاں نڈھال پوچھتا رہا
وہ حال کے حوالے سے مآل پوچھتا رہا

جواب اک طویل خامشی
مہیب محبسوں کی سرد سنگدل فصیلِ خامشی
ثقیل خامشی

وہ پھر بھی شورشِ نوا کو پالتا چلا گیا
خموشیوں میں رخنے ڈالتا چلا گیا

سو دائمی سکون کے لئے
ازالۂ خروش کر دیا گیا
وہ جس کے شور سے فضاؤں میں فتور تھا
اُسے خموش کر دیا گیا

وہ چپ ہوا تو پھول پھول پات پات
اس کے بول بولنے لگا
سکوں کا تخت ڈولنے لگا۔

عرفان صدّیقی

جنگل میں ایک رات

مالا کے بن میں رتجگے کرتی ہوئی ہریالیاں
جگنو جلاتے مشعلیں، پتّے بجاتے تالیاں

اندر کہیں مردنگ سا بجتا ہوا سنّاٹا
باہر کوئی آسیب سا گاتا ہوا قوّالیاں

آنکھوں سے اوجھل سرحدیں گہرے گھنیرے ڈھاک کی
اک دائرے میں گھومتی پیچاک راہیں کالیاں

رم خوردگاں سنتے ہوئے پیکِ اجل کی آہٹیں
ہاریں کمندیں بازیاں، جنبشِ زقندیں پالیاں

دھمال کرتی چھال میں چالاک تھارو زادیاں
گھنگھروں میں تارے آئنے، کانوں میں چندا بالیاں

جنگل میں پڑتی ہے بھرن، چاہے تو بھر لے جان و تن
یہ کھیتیاں ہیں سوکھیاں، یہ جھولیاں ہیں خالیاں

اس جنّتِ سفّاک میں اے جان، دونوں ہیچ ہیں
میری پریشاں حالیاں، تیری بلند اقبالیاں

محمد علوی

"بے چارا چاند"

رات نے جلدی جلدی
تارے سمیٹے
اندھیرے لپیٹے
اور تیز تیز دوڑتی
افق کے اُس پار اتر گئی!
باوری جلدی میں
چاند یہیں چھوڑ گئی!
بے چارا چاند
سورج سے آنکھ ملا کے
روشنی کھو رہا ہے!
اندھا ہو رہا ہے!!

"فوٹوگرافر"

رات بھر بارش ہوتی رہی!
صبح لوگوں نے دیکھا
سورج بار بار
اپنی چمکیلی آنکھ
کھول رہا تھا
میچ رہا تھا!
پانی گلیوں میں
سڑکوں پر
میدانوں میں کھڑا
ارد گرد کے
فوٹو کھینچ رہا تھا!!

شفیق فاطمہ شعریٰ

سلسلے

یا ہوا مہندی کے پھولوں سے گزر کر آئی ہے
یا مہکتے ہیں کہیں پیلے کنیر
یا خود اپنے شادماں دیوانہ پن کی موج ہے
دھوپ اور سایہ کی سیماؤں سے دور

تب نہ سمجھے تھے کہ کیا کہتی ہے
سرگوشی ہوا کی
بے سبب سرگشتگی کے سلسلے سے ۔
تب نہ سمجھے تھے کہ آخر
وہ کشش کیسی ہے جس نے
اس ڈگر سے باندھ رکھا ہے ہمیں

ہم سے بت بھی بولتے
پیڑ پودے موڑ ٹیلے
حال کیا ہے پوچھتے
ابر پارے کھولتے
اجلے ورق
پہچان کے

تب نہ سمجھے تھے کہ وہ
خوشبوئے پیراہن ہی تھی
رشتے سبھی اپنائیوں کے
بخشش و کرم
جس سے جڑے تھے
اور وہی تھا واسطہ
شہ پر و پرواز و پہنائے فضا کے درمیان

عتیق اللہ

ایک خیال

ایک خیال
صرف اور صرف تمہارا چہرہ دیکھتا ہے
از سرتاپا تمہارا چہرہ

ایک خیال
صرف اور صرف تمہاری آنکھ دیکھتا ہے
کہ تم ایک جسم نہیں سرتاپا ایک آنکھ ہو

ایک خیال
نہیں، تمہاری نرم اور پور پور سے چمکتی اور کھنکتی
آواز میں دیکھتا ہے
کہ تم صرف اور صرف ایک آواز ہو
جو کبھی اِس افق سے پھوٹتی ہے
کبھی اُس افق سے
اور کبھی افق تا افق بہتی ہوئی دکھائی دیتی ہے
میں اُسے سُن سکتا ہوں، دیکھ سکتا ہوں، چھو سکتا ہوں

ایک خیال
نہیں، تمہارے پورے بدن میں دیکھتا ہے
تمہاری سانسوں کو سونگھتا ہے
تمہارے پسینے کی بساند میں گھل جاتا ہے
اور یہ
تمہارے مساموں میں اپنے مسام پرو دیتا ہے

صادق

اِس ناٹک میں: چار نظمیں

(۱)

پسِ منظر سے اُبھرے
سامنے آئے

اپنے اپنے رول نبھائے
اور پھر
پسِ منظر میں ڈوب گئے
کچھ زشت
مگر کچھ خوب گئے
اِس ناٹک میں

(۲)

اک بار کبھی
جو ایسا ہو
ناٹک آگے بڑھتے بڑھتے
اک موڑ پہ آ کے رُک جائے
کردار اداکاری نہ کریں
اور تن جائیں
جو اصل میں ہوں
وہ بن جائیں

اِس ناٹک میں

(۳)

کچھ اَن چاہے، کچھ پیارے ہیں
جو روپ ہیں سارے نیارے ہیں
جو جسم نظر آتے ہیں
وہ سب سائے ہیں
جو لفظ سنائی دیتے ہیں
بے شک وہ لغت سے آئے ہیں
لیکن ان لفظوں کے اندر
کچھ اصل ہے اور کچھ سپنے ہیں
جو تجربے دیکھ رہے ہو تم
کچھ بیگانے کچھ اپنے ہیں
اِس ناٹک میں

(۴)

اس ناٹک میں
طالب ہے اگر
مطلوب بھی ہے
حاکم ہے اگر
محکوم بھی ہے
ظالم ہے اگر
مظلوم بھی ہے
بتلاؤ ذرا
تم کس کی حمایت کرتے رہو؟

مشاہد میر

"زی ٹی وی/ اسٹار ٹی وی کے نام"

کچھ کرنے کا وقت نہیں ہے
سب کچھ دیکھتے رہنا ہے
آنسو، نغمے، طوفاں، تنکے
بنتی قدریں، مٹتے شجرے
دھواں دھواں بارود کی لمحے
سب کچھ دیکھتے رہنا ہے

روٹی ہوٹل سے آئے گی
جھاڑو برتن چولا چکّی سب
آیا کے ذمّے ہے
صاحب کی فائل بھی اب تو
بند رہے گی

تہواروں کی
گہما گہمی مند رہے گی
کچھ کرنے کا وقت نہیں ہے
سب کچھ دیکھتے رہنا ہے

شاہد میر

نظم

دو موقعے ایسے ہیں
جن پر سب آتے ہیں
دور دراز کے دیس سے چل کر
چہرے کا ہر نقش بدل کر
رائج احساسات میں ڈھل کر
سب آتے ہیں
کہیں کوئی اک غنچہ مہکے
ننھی سی کلکاری گونجے
تب آتے ہیں
دور دراز کے شہر سے چل کر
سب آتے ہیں
کہیں کوئی اک گل مرجھائے
شاخ سے اک پتا گر جائے
تب آتے ہیں
دور دراز کے شہر سے چل کر
سب آتے ہیں
رنج و خوشی کے ان لمحوں کے
بیچ میں کیا ہوتا رہتا ہے
تیز ہوا کے جھونکے کیا سازش کرتے ہیں
بادل غیر ضروری سی بارش کرتے ہیں
دل کے نوحے سرد زباں پر جب آتے ہیں
دیکھنے والے کب آتے ہیں!؟

شاہد میر

نظم

کتابی چہرہ نہیں ہے اُس کا
وہ اک مکمل کتاب سی ہے
گھنیری زلفیں غزال آنکھیں
لبوں کی تحریر خواب سی ہے
وہ سرو قد ہے مگر شباہت
کسی شگفتہ گلاب سی ہے
وہ اک مکمل کتاب سی ہے

کئی زمانے گزر گئے ہیں
اُسے مسلسل میں پڑھ رہا ہوں
ورق ورق لفظ لفظ زینے
بہت سنبھل کر میں چڑھ رہا ہوں
پر اُس کی تصویر بن نہ پائی

ابھی تلک اس کا اصل چہرہ
چھپا ہوا سو حجاب میں ہے
نہ جانے کیا اگلے باب میں ہے

شاہد میر

نظم

آتما اک ندی ہے
صاف شفّاف پانی کی بہتی ندی
زخم خوردہ سسکتی زمینوں کو
سیراب کرتی ہوئی
آتما اک ندی ہے

ٹھنڈے جل اُجلی اُجلی ہری گھاس اور
خوب رو مچھلیوں کو سمیٹے ہوئے
آتما اک ندی ہے

"مکت پرواہ" سے بہنے والی ندی
جو "پرم آتما" کے سمندر سے ملنے چلی
کچی مٹی کے یہ بھُر بھُرے جسم جب بھی کبھی راہ میں آئیں گے
آتما کی ندی ان کو پی جائے گی

آتما اک ندی ہے
"مکت پرواہ" سے بہنے والی ندی!

شاہد میر

دو نظمیں

(۱)

سرد رُتوں کا
ردِّ عمل کیا خوب ہوا ہے

گرم لحافوں میں چھپ جانا
غزلیں پڑھنا
گرجا دیوی کے کیسٹ سے
بھیگی کجری ٹھمری سننا
سر کو دُھننا!
سپنے بُننا!
سپنوں میں اک چہرہ چُننا!

سرد رُتوں کا ردِّ عمل کیا خوب ہوا ہے
تنہا رہنا پھر ہم کو محبوب ہوا ہے

(۲)

اُدھر پیپل
اِدھر پنکھا
ہوا کا زور دونوں میں
ہوا کا شور دونوں میں
اِدھر برقی توانائی
اُدھر دھرتی کی انگڑائی

کھُلی کھڑکی سے آنکھوں تک
یہ منظر چل کے آتا ہے
گھُٹن اس چار دیواری میں
بکھر کم ہونے لگتی ہے
مسلسل لو کی شدّت
آپ مدّھم ہونے لگتی ہے

رؤوف خیر

ہولوکاسٹ میوزیم

(حال ہی میں واشنگٹن (امریکہ) میں ایک عجائب گھر قائم کیا گیا ہے۔ اس کا نام "ہولوکاسٹ میوزیم" (HOLOCAUST MUSEUM) رکھا گیا ہے جس کے معنی ہیں "قتلِ عام" —— یہ عجائب گھر اُن یہودیوں کی یاد میں قائم کیا گیا ہے جنھیں دوسری جنگِ عظیم کے دوران نازیوں نے قتل کر دیا تھا)

پاؤں

یہ ہے اُس نوجوان لڑکی کا وہ پاؤں
جو پاگل پور میں کاٹا گیا تھا
جلا تھا جس کے آگے گاؤں کا گاؤں

یہ ہے اُس نوجوان لڑکی کا وہ پاؤں
کنارِ دریا دم سادھے جو بے چھاؤں
جوانوں کی ہوس کا آئینہ تھا

یہ ہے اُس نوجوان لڑکی کا وہ پاؤں
جو پاگل پور میں کاٹا گیا تھا

ہاتھ

یہ ہاتھ برف زار سے لایا ہوا سا ہے
جس ہاتھ میں کتاب کے بدلے مشین گن
آنکھیں ہیں خواب خواب مگر اُن میں بجھنے ہی بجھنے

یہ ہاتھ برف زار سے لایا ہوا سا ہے
مٹھی سے ریت بن کے پھسلتا ہوا سمے
اک بم کی طرح پھوٹ بھی سکتا ہے دفعتاً

یہ ہاتھ برف زار سے لایا ہوا سا ہے
جس ہاتھ میں کتاب کے بدلے مشین گن

انتظار حسین

صبح ہونے تک

"شاہ صاحب! گاڑی ابھی تک آئی نہیں۔" تقی نے ایک مرتبہ پھر بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"آتی ہی ہوگی۔" شاہ نے بھی پھر اسی ڈھارس بندھانے کے لہجے میں کہا۔ "آنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ پھر رستے بھی تو سارے مخدوش ہیں۔ پتہ نہیں کتنے پھیر کھا کر آ رہا ہوگا۔ ویسے گل ماہر ڈرائیور ہے۔"

"ہاں! گل ماہر ڈرائیور تو ہے۔ مگر،" مرزا نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ "حالات بہت خراب ہیں۔"

"اور خراب ہوتے ہی چلے جا رہے ہیں۔" تقی نے مرزا کے بیان میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہی تو میں کہہ رہا تھا کہ اس سے پہلے کہ زیادہ خراب ہوں اور رستے بالکل بند ہو جائیں، ہمیں یہاں سے نکل لینا چاہئے۔"

زین کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی جسے مرزا کی تیز نظروں نے دیکھ لیا۔ "کیوں میاں! تم کیوں مسکرا رہے ہو؟"

"سوچ رہا ہوں کہ تقی بھائی کچھ زیادہ ہی گھبرا گئے ہیں۔"

تقی نے برہمی سے زین کو دیکھا۔ "تمہیں حالات کی سنگینی کا احساس ہوتا تو تم بھی اتنے ہی گھبرائے ہوئے ہوتے۔"

"تقی بھائی! وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر ہم لوگوں کو تو ایسی کسی بھی صورت حال کے لئے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہئے۔"

غنی نے جو دیر سے خاموش بیٹھا تھا، زہر خند کیا۔ "عجیب بات ہے۔ ہم یہاں ان لوگوں کی خدمت کرنے آئے تھے۔"

"اور مبتلا ہو گئے اپنے غم میں۔" زین نے ٹکڑا لگایا۔

"ٹھیک کہتے ہو۔" شاہ نے شرمندگی کے لہجے میں کہا۔ "واقعی یہ دردناک بات ہے۔ کیا مقصد لے کر چلے تھے اور کس چکر میں پڑ گئے۔"

"مقصد۔" غنی منہ ہی میں بڑبڑایا۔

زین خاموشی سے اٹھا اور رسٹک گیا۔ تقی نے جیسے سنا ہی نہیں کہ غنی نے کیا کہا اور شاہ نے اس پر

کس ردّ عمل کا اظہار کیا۔ اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ مرزا نے البتہ اس کا نوٹس لیا اور صفائی پیش کی۔ "اگر کام کرنے کی ذرا بھی گنجائش ہوتی تو ہم یہاں پڑے رہتے۔ لیکن ٹھہر کے کیا کریں گے۔" رُکا، پھر بولا۔ "بلکہ ان حالات میں ٹھہرے رہنے سے تو ہم یہاں کے لوگوں کی نظروں میں مشکوک بن جائیں گے۔ سوچیں گے کہ یہ کون لوگ ہیں، اور اس وقت یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟"

"گویا اب مشکوک نہیں ہیں۔" غنی نے ٹکڑا لگایا۔

تقی نے جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو، اس کا دھیان تو کہیں اور تھا۔ "شاہ صاحب! فون کر کے معلوم تو کیجئے۔"

"ملاؤ پھر۔"

تقی نے ڈائل کیا۔ اور فوراً ہی ریسیور رکھ کر مایوسی سے کہا "فون تو ڈیڈ ہو گیا۔"

"ڈیڈ ہو گیا؟" مرزا پہ جیسے بجلی گر گئی ہو۔

غنی نے سکون سے بے خبر سنی اور آہستہ سے کہا "باہر کی دنیا سے یہ ہمارا آخری رشتہ تھا۔"

"جو ٹوٹ گیا۔" تقی نے ٹکڑا لگایا۔

"اور جو انشاء اللہ جلدی جڑ جائے گا۔" شاہ نے ریسیور کو کان سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ "ہیلڈ ہو گیا ہے۔ شاید تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جائے۔"

"اگر ٹھیک نہ ہوا تو۔" مرزا نے مایوسانہ کہا۔ "تو پھر کیا ہوگا؟"

شاہ کچھ کہنے لگا تھا کہ ہارن کی آواز سنائی دی۔ ایک دم سے سب چونک اٹھے۔ "گاڑی آ گئی!" ایک دم سے سب کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ تقی لپک کر دروازے کی طرف گیا۔

شاہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ "میں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ رستوں کے مخدوش ہونے کی وجہ سے تاخیر تو ہو سکتی ہے۔ مگر گاڑی آئے گی ضرور۔ گل بہت ذمہ دار قسم کا ڈرائیور ہے۔"

"شکر ہے۔" مرزا بولے۔ "مجھے تو یوں لگ رہا تھا کہ قید خانے میں بند بیٹھا ہوں۔"

"بس فوراً ہی نکل چلنا چاہئے۔" شاہ نے کہا۔

"یہی میرا خیال ہے۔ دیر کرنے سے خرابی پیدا ہو سکتی ہے۔" مرزا نے ٹکڑا لگایا۔

تقی منہ لٹکائے واپس آیا۔

"کیوں؟" مرزا نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"کوئی اور گاڑی تھی۔"

"اچھا!" مرزا نے افسردگی سے آہستہ سے کہا۔

خاموشی چھا گئی۔ سب پر جیسے اوس پڑ گئی ہو۔

مگر شاہ زیادہ دیر تک مایوسی کا شکار نہیں رہ سکتا تھا۔ جلدی ہی اس نے اس میں سے خیر کا پہلو نکال لیا۔ "چلو، اس سے ایک بات کا تو پتہ چلا کہ رستے بالکل بند نہیں ہیں۔"

"پھر تو اسے آجانا چاہیئے تھا۔" تقی بولا۔

"پتہ نہیں غریب پہ کیا افتاد پڑی ہے؟" مرزا کہنے لگا۔ "فون ہی ڈیڈ ہو گیا، ورنہ سنٹر والوں سے پوچھا تو جاتا۔"

"مجھے ایک اور شک ہو رہا ہے۔" تقی کہنے لگا۔

"کیا؟"

"رستے میں وہ کہیں نرغے میں آگیا۔"

"نہیں۔" شاہ نے پورے اعتماد سے کہا۔ "اس سے بڑی آفتیں بھی اس دوران آئی ہیں۔ ہماری گاڑی کو کبھی روکا نہیں گیا۔ ہمارے آرگنائزیشن کی ایک ساکھ ہے۔ سب کو پتہ ہے کہ ہمارا کسی سیاسی گروہ سے، کسی نسلی، لسانی تنظیم سے، کسی فرقہ وارانہ گروپ سے تعلق نہیں ہے۔ ہم انسانی بنیادوں پر کام کرتے ہیں۔"

"انسانی بنیادوں پر۔" غنی تلخ سے انداز میں بڑبڑایا۔

شاہ نے اسے گھور کے دیکھا۔ "کیوں؟ تمہیں اس میں شک ہے؟"

اسی گھڑی زرینہ چائے کی پیالیوں سے سجی ایک ٹرے کے ساتھ نمودار ہوا۔ "تقی بھائی! چائے سے آپ اپنا غم غلط کریں۔"

تقی کی باچھیں کھل گئیں۔ "یہ تو کمال ہو گیا۔ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ دودھ ختم ہو گیا۔ اب چائے کے بغیر ہی وقت گزرے گا۔"

"نسرین نے یہ کمال دکھایا ہے۔ دودھ بھی دیکھو اس نے کہیں سے برآمد کر ہی لیا۔"

"چلو، اس بی بی کے ساتھ ہونے کا یہ فائدہ تو ہے۔ ابھی تک کسی نہ کسی طور ہمارے لئے چائے کا اہتمام کئے جا رہی ہے۔" مرزا نے کہا۔

غنی مسکرایا۔ "اصلی سوشل ورکر ہے۔"

"اس وقت تو اس نے واقعی بہت بڑی سماجی خدمت انجام دی ہے۔" تقی کی طبیعت بھی چائے

کے گھونٹوں کے ساتھ بحال ہو چلی تھی۔ سب ہی کے موڈ میں ایک خوش گوار تبدیلی آگئی تھی۔ چائے کے ساتھ سب ہی کی ذہنی صحت بحال ہوتی نظر آرہی تھی۔ گفتگو کا موضوع ہی بدل گیا۔ اب وہ گاڑی کے آنے، نہ آنے کے مسئلے کو بھول کر ادھر ادھر باتیں کر رہے تھے۔

"چائے اس وقت اچھی بنی ہے۔" تقی نے کہا۔

"ہماری روحانی ضرورت کو بھی تو اس چائے نے پورا کیا ہے۔ ابھی تو لگنی ہی تھی۔" غنی نے ٹکڑا لگایا۔

"چائے تو نسرین نے پلادی۔ سگریٹ کون پلائے گا؟" مرزا نے سوال اٹھایا۔

"خاموش!" تقی نے اچانک اٹھتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ کیا بات ہے؟"

"کوئی گاڑی ہمارے دروازے پر رکی ہے۔" یہ کہتے کہتے لپک کر دروازے کی طرف گیا۔

ایک دفعہ پھر وہ سب آس و یاس کے دوراہے پر آکھڑے ہوئے۔ انتظار کے وہ چند لمحے ان پر کتنے بھاری گزرے۔

"شاید گاڑی آگئی ہے۔" مرزا نے کسی قدر آس بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں شاید۔" شاہ نے اب کے محتاط لہجہ اختیار کرنا مناسب سمجھا۔

خیر انھیں زیادہ قیاس آرائی نہیں کرنی پڑی۔ تقی جلدی ہی واپس آگیا۔ مگر آکر اس نے دوسری ہی بات کی۔ "یارو! اندر تو وقت کا پتہ ہی نہیں چل رہا۔ اب تو شام ہونے لگی ہے۔"

"مگر وہ جو گاڑی......؟"

"ہاں وہ گاڑی" تقی کی آواز جیسے ڈھے گئی ہو۔ "آگے چلی گئی۔ ہماری نہیں تھی۔"

"شاہ صاحب!" مرزا کا رخ شاہ کی طرف ہو گیا "انتظار کچھ لمبا ہی ہو گیا۔ گاڑی آئے گی بھی؟"

"آئے گی۔ سنٹر والے ذمہ دار لوگ ہیں۔ غلط اطلاع تو نہیں دے سکتے۔"

"مگر کب آئے گی؟" تقی نے بے چینی کے لہجے میں کہا۔ "یہاں بیٹھے ہوئے ہمیں وقت کا پتہ نہیں رہا۔ اب شام ہونے لگی ہے۔"

"گاڑی اسی وقت آگئی تو آگئی۔ شام کے بعد تو......" مرزا کہتے کہتے رک گیا۔

"ہاں شام کے بعد تو......" تقی نے اپنی اسی ڈھتی ہوئی آواز میں کہا۔

زین آہستہ سے پھر وہاں سے سٹک گیا۔ غنی نے اٹھ کر ریسیور اٹھایا۔ کان سے لگایا۔ "شاہ صاحب! فون ٹھیک ہو گیا۔"

"اچھا!" ایک دفعہ پھر سب کی جان میں جان آ گئی۔

"لو شاہ صاحب، شگون تو اچھا ہوا ہے۔" مرزا نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

شاہ نے اٹھ کر ریسیور اٹھایا، اور رڈائل گھمایا۔ ایک دفعہ، دو دفعہ، تین دفعہ۔ "ہیلو... ہیلو... سنٹر؟ کون بول رہا ہے؟ اچھا، اچھا بیگ صاحب ہیں۔ بیگ صاحب، وہ گاڑی کہاں بہک گئی؟ ... ہم یہاں بیٹھے انتظار میں سوکھ رہے ہیں .... کیا کہا؟ .... آواز سنائی نہیں دے رہی ہے ... اچھا... اچھا ... ہاں ... ہاں ... اچھا۔ خیر یہ تو اس نے اچھا کیا۔ ہمیں تو یہاں کچھ پتہ نہیں کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ بس مقید بیٹھے ہیں... اچھا... اچھا! (گھبرا کر) صبح کو؟ ..... رات کو ہم کیا کریں گے .... ہاں ... مگر بیگ صاحب! رات کیسے کٹے گی اِدھر، جبکہ حالات ...... ہاں (مری ہوئی آواز میں) اچھا ...."

فون بند کر کے شاہ صاحب چُپ سے ہو گئے۔

"کیا کہتے ہیں بیگ صاحب؟"

"کہتے ہیں کہ کل آدھے رستے سے پلٹ آیا۔ آگے بہت ہنگامہ تھا۔ بتاتے ہیں کہ گولی سے بال بال بچا ہے۔"

"اچھا؟ پھر۔"

"پھر یہ کہ رات کو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم گاڑی بھیجنے کا رِسک (Risk) نہیں لے سکتے۔ صبح کو گاڑی لازماً پہنچے گی۔"

"اور رات کو ہم کیا کریں گے؟" مرزا نے تلخی کے لہجے میں پوچھا۔

"یہی میں نے پوچھا تھا۔ مگر ان کی بھی مجبوری ہے۔"

"کیا مجبوری ہے؟" تقی غصّے سے چلّانے لگا۔ "کوئی مجبوری نہیں ہے۔ یہ سازش ہے۔ بیگ ایک نمبر کا سازشی آدمی ہے۔"

"میرے دوست تھوڑا آہستہ بولو۔ یہ غصّہ کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ٹھنڈے دل سے ہمیں سوچنا چاہیئے کہ ہمیں رات کس طرح گزارنی ہے۔"

"رات گزارنی تو بہت مشکل ہے۔ پچھلی رات کا تجربہ ہمارے سامنے ہے۔" مرزا نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

"آخر وہ رات بھی گزاری ہی تھی۔ آج کی رات بھی گزار سکتے ہیں۔"

مرزا سوچ میں پڑ گیا۔ تامّل سے بولا۔ "ابھی دن ہے۔ اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے اگر ہم یہاں سے نکل لیں....."

"نکل لیں!" شاہ نے حیرت سے مرزا کو دیکھا۔"کیسے نکل لیں؟"

"مرزا صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔" تقی نے زور دے کر کہا۔"ہمیں بہرحال شام سے پہلے پہلے یہاں سے نکل لینا چاہئے۔"

"نکل کر اس غیر وقت میں ہم جائیں گے کہاں؟" غنی نے آہستہ سے کہا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو۔

یہ سن کر سب ہی سناٹے میں آگئے۔ جائیں گے کہاں۔ یہ تو ابھی تک کسی نے سوچا ہی نہیں تھا۔ واقعی، یہاں سے نکل بھی لئے تو جائیں گے کہاں۔ جیسے سارے رستے، سارے دروازے ان پر بند ہو چکے ہوں۔

"بُرے پھنسے۔" غنی نے آہستہ سے کہا۔

"اصل میں ہم آئے ہی غلط تھے۔" تقی نے جواباً اونچی آواز میں کہا۔ جب کسی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تو وہ خود ہی شروع ہو گیا۔"میں نے تو شاہ صاحب کو خبردار کر دیا تھا۔ پوچھ لیں۔ میں نے ان سے کہا تھا یا نہیں کہ جانے سے پہلے سوچ لیں۔ اس علاقے میں حالات اچھے نہیں ہیں۔"

سب کی نظریں شاہ پر مرکوز ہو گئیں۔ شاہ نے تامل کیا۔ پھر کہا۔"میرے بھائی! حالات کی تو یہ ہے کہ اب اچھے حالات ہیں کہاں۔ اور ہم تو یہ دیکھ کر ہی اپنا پروگرام بناتے ہیں کہ فلاں جگہ حالات اچھے نہیں ہیں۔ وہاں حالات کو اچھا بنانا ہے۔ مگر ہمیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ ہمارے آتے ہی حالات یہاں اتنے خراب ہو جائیں گے کہ ہم اپنا پروگرام شروع ہی نہ کر سکیں گے۔"

"اندازہ کیسے نہیں تھا؟" تقی نے فوراً جواب دیا۔"وارداتیں یہاں شروع ہو چکی تھیں۔ اخباروں میں خبریں آرہی تھیں۔ شاہ صاحب! اصل میں آپ بیگ کے بھرّے میں آگئے۔ اس پروگرام کا محرک تو اصل میں وہ ہے۔"

"مگر پروگرام تو کتنے دنوں پہلے بنا تھا۔ اس وقت بیگ صاحب کو آنے والے حالات کا کیسے اندازہ ہو سکتا تھا؟"

"شاہ صاحب! آپ بھولے آدمی ہیں۔ بیگ کو آپ نہیں جانتے، میں جانتا ہوں۔ جو نظر آتا ہے، وہ نہیں ہے۔"

شاہ نے اپنی بدمزگی کو اپنے تک رکھا اور بڑے تحمل سے جواب میں اتنا کہا۔"بھائی! ہم تو بے خبر آدمی ہیں۔ لیکن اگر تم جانتے ہو بتا دو۔"

تقی رکا۔ چاروں طرف دیکھا۔ پھر آہستہ سے بولا۔"ایسے کیسے بتا دوں۔ آخر مجھے بھی زندہ رہنا ہے۔" رکا۔ کہا۔"بہت خطرناک آدمی ہے۔"

تقی نے ویسے تو کچھ نہیں بتایا تھا۔ پھر بھی سب نے یہ سمجھا۔ جیسے اس نے بہت کچھ بتا دیا ہے۔ مرزا پر اس کی بات کا زیادہ اثر ہوا۔ کہنے لگا۔"عجب زمانہ آیا ہے۔ آدمی کس پر اعتبار کرے۔"

"مرزا صاحب!" تقی نے گرم لہجے میں کہا۔ "کس پر اعتبار کرو گے۔ سب نے نقاب اوڑھ رکھا ہے"

"نقاب پوش۔" غنی نے آہستہ سے ایک طنزیہ لہجے میں کہا اور چپ ہو گیا۔

"غنی صاحب!" تقی نے غصّے سے غنی کی طرف دیکھا۔ "آپ اس بات کو دل لگی سمجھ رہے ہیں۔"

"بالکل نہیں۔" غنی نے جواب دیا۔ تامّل کیا پھر بولا "کبھی کبھی مجھ پہ دورہ سا پڑتا ہے۔ جی میں آتا ہے کہ سنیاس لے لوں یا پھر دہشت گرد بن جاؤں۔"

"دہشت گرد۔" زین نے قہقہہ لگایا۔ بہت دیر بعد اُسے ہنسنے اور اپنے البیلے انداز میں بات کرنے کا موقعہ ہاتھ آیا تھا۔ "غنی بھائی آپ دہشت گرد بنیں گے؟"

"ہاں یہ بات سن کر تمہیں ہنسنا ہی چاہئے۔ ایک بزدل آدمی سے کون ایسی توقع رکھ سکتا ہے۔ اصل میں ہم جو گنے چُنے شرفا بچے رہ گئے ہیں تو بس اپنی بزدلی کی وجہ سے بچے رہ گئے ہیں۔"

"ہاں۔" زین پھر ہنسا۔ "گویا ہماری بزدلی ہماری شرافت کی ضمانت ہے۔"

تقی کو زین کا یہ رویّہ پسند نہیں آیا۔ گرما کر بولا۔ "زین میاں! یہ دل لگی کا وقت نہیں ہے۔ سنجیدگی سے سوچو۔"

"کس بارے میں؟"

"اس بارے میں کہ ہم یہاں سے نکلیں کیسے؟"

"تقی بھائی! یہ سوال تو صبح کے لئے اٹھا رکھئے۔ رات تو جیسا کہ طے ہے یہیں بسر کرنی ہے۔"

"کیسے بسر کرنی ہے؟" تقی نے جھنجھلا کر کہا۔

"ہاں یہ ایک جائز سوال ہے کہ کیسے بسر کرنی ہے۔ نسرین سے جا کر پوچھتا ہوں کہ چائے کا کیا بندوبست ہے۔ پتّی اور دودھ اتنا ہے کہ ہم اطمینان سے رتجگا کر سکیں؟" یہ کہتے ہوئے زین اٹھا اور ان کے بیچ میں سے سرک گیا۔

تقی اٹھ کر دریچے تک گیا۔ دریچہ کھول کر باہر نظر ڈالی۔ واپس آیا۔ بولا۔ "اچھا خاصا اندھیرا پھیل گیا ہے۔ لائٹ وائٹ بھی نہیں ہے۔ ہُو حق کا عالم ہے۔"

"ہم نے وقت ضائع کر دیا۔" مرزا کہنے لگا۔ "تھوڑا حوصلہ کرتے تو نکل سکتے تھے۔"

"یہی تو میں کہہ رہا تھا کہ ابھی وقت ہے، ہم نکل سکتے ہیں۔ کسی نے میری سنی ہی نہیں۔"

"اب پوری رات ہے اور ہم ہیں۔" غنی بڑبڑایا۔

"میں کہتا ہوں۔" تقی نے جھجکتے جھجکتے کہا۔" ابھی ایسی رات نہیں ہوئی ہے۔ اب بھی نکل سکتے ہیں۔"

شاہ نے برہمی سے تقی کو دیکھا۔" تقی تم ہوش میں ہو؟"

"بھائی! اب تو صبح کا انتظار کرو۔" مرزا نے گویا شاہ کی تائید میں کہا۔

"مگر صبح تو بہت دور ہے۔" تقی نے بے چینی سے کہا۔

"زین، دیکھیں کیا جواب لاتا ہے۔" غنی نے کہا۔" چلئے کا بندوبست ہو سکے تو پھر صبح کا انتظار اطمینان سے کیا جا سکتا ہے۔"

"اچھا تو تم زین کے جواب کا انتظار کر رہے ہو۔" تقی طنزیہ بولا۔" وہ اپنی مار میں ہے۔"

"یار! تم نے خوب تاڑا۔" مرزا مسکرایا۔" زین کی نقل و حرکت پہ ماتھا تو میرا بھی ٹھنکا تھا۔ اور نسرین کو دیکھو اس نے ہم سے الگ بیٹھنے کا کیا بہانہ نکالا ہے۔"

"مرزا!" غنی مسکراتے ہوئے بولا۔" دو دل مل رہے ہیں تو مل لینے دو۔ کیوں کھنڈت ڈالتے ہو؟"

"میں نے کوئی کھنڈت نہیں ڈالی۔"

"تو گویا۔" تقی بولا۔" ہم یہاں دو دلوں کے ملنے کا بندوبست کرنے کے لئے آئے تھے۔ اصل پروگرام یہ تھا۔ کیوں شاہ صاحب؟"

شاہ نے اپنی چھدری داڑھی کو کھجایا۔ جواب کوئی نہیں دیا۔ مگر تقی ابھی تھمنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے تامل کیا۔ پھر معنی خیز لہجے میں بولا۔" اس چکر کے سوا بھی کوئی چکر ہے۔"

"اچھا؟" مرزا نے سوالیہ نظروں سے تقی کو دیکھا۔

"میں بیگ کے بارے میں بات کر رہا تھا تو کتنے دھیان سے سن رہا تھا۔ جب ہی تو میں چپ ہو گیا۔"

"اچھا!" مرزا نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"جی مرزا صاحب! مجھے لگتا ہے کہ دونوں ہی اپنے چکر کے ساتھ ساتھ کسی بڑے چکر میں ہیں۔ آخر ہیں تو دونوں بیگ ہی کے لائے ہوئے۔"

"شاہ صاحب!" مرزا شاہ سے مخاطب ہوا۔" یہ ہمارے اردگرد کیا چکر چل رہا ہے۔ ہم کسی چکر میں تو نہیں آجائیں گے؟"

"ابھی شک ہے آپ کو۔" تقی فوراً بولا۔" حضور ہم چکر میں آچکے ہیں۔ چکر میں نہ آئے ہوتے تو ....

اچھا خیر......" کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

شاہ نے اب آنکھیں موندلی تھیں۔ غنی مسکرایا، بولا۔ "تقی کی باتیں سن کر مجھے دنیا بہت بھید بھری نظر آنے لگتی ہے۔ اچھا خیر اگر زرین نہیں آتا تو میں جا کر دیکھتا ہوں کہ چائے کا کوئی بندوبست ہے یا نہیں؟" یہ کہتے کہتے غنی اٹھا اور برابر کے کمرے میں جہاں آگے زرین گیا تھا، چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد مرزا نے کسی قدر تامل کیا پھر کہنے لگا۔ "غنی کو زرین اور نسرین سے بہت ہمدردی ہے۔"

تقی نے مرزا کو گھور کے دیکھا۔ "مرزا، غنی بہت گہرا آدمی ہے۔"

"یہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ گھنا آدمی ہے۔ اپنی کم کہتا ہے، دوسروں کی زیادہ سنتا ہے۔"

"مگر ایک فقرے سے چغلی کھا گیا۔ کہتا ہے کہ جی چاہتا ہے دہشت گرد بن جاؤں۔"

"تم نے ٹھیک پکڑا تقی۔ اس فقرے پہ میں بھی چونک پڑا تھا۔"

"بس یہیں سے پکڑا گیا۔ ویسے شک مجھے پہلے بھی تھا۔"

"شاہ صاحب! سن رہے ہو۔ تقی کیا کہہ رہا ہے؟"

"سن رہا ہوں۔" آخر شاہ نے زبان کھولی۔ "تقی! دوستوں، رفیقوں پر تھوڑا اعتبار کرنا چاہئے۔"

"ہاں! اعتبار بھی کرنا چاہئے اور چوکنا بھی رہنا چاہئے۔ اس وقت جو حالات ہیں ان کا تقاضا تو یہی ہے۔"

"شاہ صاحب!" مرزا نے ٹکڑا لگایا۔ "تقی کی بات میں بہت وزن ہے۔ حالات اس وقت بہت خراب ہیں۔"

"میرے دوست! حالات اچھے کب تھے؟" شاہ چپ ہوا، اپنی چھدری داڑھی کو کھجایا۔ پھر کہنے لگا۔ "اصل میں ہم نے جس مشن سے اپنے آپ کو وابستہ کیا ہے، اس کے کچھ تقاضے ہیں۔ ایک تو یہ کہ......"

عین اسی گھڑی زرین چائے سے سجی ٹرے لے کر برآمد ہوا۔ پیچھے پیچھے غنی اور نسرین بھی چلے آرہے تھے۔ شاہ کی بات بیچ ہی میں رہ گئی۔ چائے کو دیکھ کر جیسے سوکھے دھانوں پہ پانی پڑ گیا۔

مرزا نے بے ساختہ داد دی۔ "بھئی! یہ تو آپ لوگوں نے بہت ثواب کا کام کیا ہے۔"

"آج سارا ثواب نسرین لوٹ رہی ہے۔" غنی نے ٹکڑا لگایا۔

"نسرین!" شاہ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم یہاں ہماری خدمت گار بن کر تو نہیں آئی ہو۔ اب تم یہیں ہمارے ساتھ بیٹھو گی۔ اس کے بعد جیسے چائے کی حاجت ہو خود بنائے۔"

نسرین نے خاموشی سے بیٹھ کر چائے بنانی شروع کر دی۔

"ہاں شاہ صاحب! آپ کچھ کہہ رہے تھے۔" مرزا کو چائے کے پہلے گھونٹ کے ساتھ ساتھ یاد آیا کہ شاہ کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔

"میں یہ کہہ رہا تھا۔" شاہ نے اطمینان سے سب پر نظر ڈالی۔ "چلو اچھا ہے یہ لوگ بھی آگئے۔ ہاں میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہم نے جس مشن سے اپنے آپ کو وابستہ کیا ہے اس کے کچھ تقاضے ہیں۔ ایک تو کہ کیسے ہی حالات ہوں ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ خراب حالات ہی تو ہمارے لئے چیلنج بنتے ہیں، ہمیں کام کرنے پر اکساتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ لوگوں پر ہمارا اعتبار قائم رہنا چاہئے۔ ظاہر پرمت جاؤ۔ جو بُرا آدمی ہے وہ بھی اندر سے اچھا آدمی ہوتا ہے۔ آدمی کا آدمی پر سے اعتبار اٹھ جائے تو رہ کیا جاتا ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہا۔" مرزا بولا۔ "آدمی کا آدمی پر سے اعتبار اٹھ جائے تو باقی کیا رہ جاتا ہے۔"

نسرین نے چائے بنا کر پیالی آہستہ سے شاہ کے سامنے رکھ دی۔ شاہ جیسے اپنی بات کہہ کر ہلکا ہوگیا ہو۔ کتنے اطمینان کے ساتھ چائے پی رہا تھا۔

مرزا نے چائے پیتے پیتے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ کھول کر دیکھا تو خالی تھی۔ "مارے گئے۔"

"مرزا صاحب! فکر نہ کریں۔" زین نے جیب سے سگریٹ کا بھرا پیکٹ نکال کر سامنے میز پہ رکھ دیا۔

"یار زین! تم تو بہت اچھے آدمی ہو۔ لوگ خواہ مخواہ......" اتنے میں اس نے منہ میں سگریٹ رکھ کر سلگایا۔ پھر وہ فقرہ بیچ میں ہی رہ گیا۔ اب بات کہنے کے لئے زبان کھولی تو دوسری ہی بات کہی۔ سگریٹ کا لمبا کش لیا اور کہا۔ "اگر میرے سامنے چائے کی پیالی ہو اور انگلیوں کے بیچ سگریٹ ہو تو رات بے شک لمبی کھنچ جائے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

"تو گویا" زین نے سگریٹ کی ڈبیا تقی کے سامنے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اب ہم صبح کا اطمینان سے انتظار کر سکتے ہیں۔"

تقی نے سگریٹ لے کر زین کا شکریہ ادا کیا اور خاموشی سے سگریٹ سلگا کر چائے پینے لگا۔

"کتنی سناٹے کی رات ہے؟" غنی چائے پیتے پیتے بولا۔ "کسی قسم کی کوئی آواز ہی نہیں ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے۔" شاہ نے اس میں سے بھی خیر کا پہلو نکال لیا۔ "کہ اب کچھ نہیں ہو رہا۔ دن کے ہنگامے کے بعد اب سکون ہے۔"

"مگر مجھے سناٹے کی رات زیادہ ڈراتی ہے۔" غنی بولا۔

"مگر کیا واقعی ہمارے ارد گرد کہیں کچھ نہیں ہو رہا۔" زین سوچتے ہوئے بولا۔ "یہ کیسے مان لیا جائے؟"

"یہ عجیب بات ہے۔" غنی کہنے لگا۔ "کہ ہم ہنگامے کے بیچ بیٹھے ہیں۔ مگر ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ ہمارے ارد گرد، دور یا قریب، کیا ہو رہا ہے۔"

"اور آبادی کے بیچ بیٹھے ہیں۔" مرزا نے غنی کی بات میں اضافہ کیا۔ "مگر لگ یوں رہا ہے کہ سنسان صحرا میں بیٹھے ہیں۔"

"کاش! ہم کسی سنسان صحرا میں بیٹھے ہوتے۔" آخر تقی نے بھی زبان کھولی۔ "یہاں بند بیٹھے بیٹھے میرا تو دم گھٹ رہا ہے۔ لگ رہا ہے کہ سالہا سال سے کسی بندی خانے میں پڑے ہیں۔"

"میرے بھائی!" شاہ نے اسے ٹوکا۔ "ان لوگوں کو دھیان میں لاؤ جن کے یہاں سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ تمہیں تو یہاں اب خالی ایک رات کاٹنی ہے۔ صبح ہوتے ہی گاڑی میں بیٹھو گے اور یہاں سے نکل لو گے۔"

"بشرطیکہ گاڑی آ جائے۔" تقی نے آہستہ سے کہا۔

"کیوں نہیں آئے گی؟ یقیناً آئے گی۔"

"ہاں توقع تو ہمیں یہی رکھنی چاہیئے۔ دنیا آخر امید ہی پہ قائم ہے۔"

زین تقی کی باتوں سے بیزار دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ایک لمبی جماہی لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ٹہلتا ہوا دریچے کے پاس گیا اور باہر نظر ڈالی۔

"کھڑکی کھولنا مت۔" شاہ نے بیٹھے بیٹھے اونچی آواز میں بول کر اُسے خبردار کیا۔

زین نے شیشے ہی میں سے باہر کا مشاہدہ کیا اور واپس آ کر پھر اپنی جگہ پہ بیٹھ گیا۔

"کیا دیکھا؟" غنی نے پوچھا۔

"اندھیرا اور سناٹا۔" تامل کیا۔ پھر کہا۔ "لگتا ہے کہ اب جتنی بھی روشنی ہے بس یہی ہمارے بیچ ہے۔ باقی جیسے ساری کائنات میں اندھیرا ہی اندھیرا ہو۔"

غنی تلخ ہنسی ہنسا۔ "یعنی یہ موم بتی کی روشنی جس میں ہم ایک دوسرے کی صورت بھی صاف نہیں دیکھ سکتے۔ جس میں لگتا ہے کہ آدمی نہیں بھوت بیٹھے ہیں۔"

زین ہنسا۔ "غنی بھائی! تو گویا اس روشنی نے ہمیں بھوت بنا دیا ہے۔"

"نہیں۔ بھوت تو شاید ہم پہلے ہی بن چکے تھے۔" تھوڑا رک کر۔ "عجب زمانہ آیا ہے۔ آدمیوں میں

کوئی آدمی کی صورت نظر نہیں آتی۔ ہم آدمی نہیں رہے ہیں، بھوت بن گئے"۔

تقی نے زہریلے لہجے میں کہا۔" اپنا انفرادی تجربہ باقیوں پر کیوں مسلط کر رہے ہو"۔

"چلو یوں ہی سہی۔ میں بن گیا ہوں"۔

"کیا؟" تقی نے اسی زہریلے لہجے میں پوچھا۔ بھوت یا دہشت گرد؟"

زین زور سے ہنسا اور غنی کے بولنے سے پہلے ہی بول پڑا۔" تقی بھائی! اچھا سوال کیا"۔

تقی کی تلخی میں اس قہقہہ سے کوئی فرق نہیں آیا۔ ایک بیزاری کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا، بڑبڑاتا ہوا۔" ہم بھوتوں اور دہشت گردوں کے درمیان سانس لے رہے ہیں"۔ چلتے ہوئے زین سے مخاطب ہوا۔" پانی تو آرہا ہے نا؟"

"ہاں! صرف بجلی گئی ہے۔ پانی تو آرہا ہے۔ تقی بھائی! پانی کے چھپاکے منہ پر ڈال لیجئے۔ نیند غائب ہو جائیگی"۔

تقی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ باتھ روم کی طرف چلا گیا۔

غنی مرزا سے مخاطب ہوا۔" مرزا، میرے جانے کے بعد شاید کچھ ہوا ہے۔ تقی بہت جلا بھنکا نظر آرہا ہے"۔

"کیا ہونا تھا۔ کچھ بھی نہیں ہوا"۔

"نہیں، ضرور کچھ بات ہوئی ہے"۔

"یار غنی! تقی تو شکی آدمی ہے ہی۔ تمہیں چھینک بھی آئے گی تو شک کرے گا کہ کیوں آئی۔ تم تو ویسے نہ بنو"۔

"اچھا نہیں بنتا۔" غنی ہنس کر چپ ہو گیا۔

شاہ نے آنکھیں موندلی تھیں اور آہستہ آہستہ اپنی چھدری داڑھی کھجا رہا تھا۔ زین اطمینان سے سگریٹ پی رہا تھا۔

"عجیب آدمی ہے۔" مرزا بڑبڑانے لگا۔" سب پہ شک کرتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ اسے سب کے خفیہ چکروں کا پتہ ہے۔ اور جیسے اس کے چکّر کا کسی کو پتہ نہیں ہے"۔

"تقی بھائی بھی" زین دھوئیں کے مرغولے بناتے ہوئے ہنسا۔" خوب شئے ہیں"۔

"چلو اگر کوئی اس طرح سوچ کر خوش رہ سکتا ہے تو اُسے خوش ہو لینے دو"۔ غنی نے ٹکڑا لگایا۔

"خوش پھر بھی نہیں ہے"۔ مرزا ہنسا

"ویسے یہ ایسا ظالم زمانہ ہے" غنی کہنے لگا۔" کسی کی کوئی بات چھپی نہیں رہتی۔ اور دامن، ہم ہوئے

تم ہو گئے، سب ہی کے آلودہ ہیں۔"

تقی واپس آگیا۔ غنی کا آخری فقرہ اس نے کچھ سنا اور کچھ نہ سنا، اور ٹھٹک گیا۔ ایک ایک کے چہرے کو غور سے دیکھا "میرے بارے میں کچھ کہا جا رہا ہے۔"

"نہیں بھئی! تمہارا کوئی ذکر نہیں تھا۔" مرزا نے فوراً صفائی پیش کی "عمومی بات ہو رہی تھی۔"

"مرزا!" تقی نے مرزا کو خشمگیں نظروں سے دیکھا "تمہارے چکّر کو میں خوب سمجھتا ہوں۔ مگر خیر پہلے میں غنی سے بات کر لوں۔ ہاں، یہ تم کس کے دامن کی بات کر رہے تھے۔ کس کا دامن آلودہ ہے؟"

"میرا خیال ہے۔" غنی نے سکون کے لہجے میں کہا "مجھے تمہارے فائدے کے لئے اپنے بیان کو دہرا دینا چاہئے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ ایسا ظالم زمانہ ہے کہ کسی کی کوئی بات چھپی نہیں رہتی۔ اور دامن، ہم ہو گئے تم ہو گئے، سب ہی کے آلودہ ہیں۔"

"غنی! یہ جو تمہاری تکنیک ہے کہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی شریکِ جرم کر لیتے ہو۔ استاد، یہ تکنیک....."

"تقی!" شاہ نے سختی سے ٹوکا۔ اور تقی فوراً ہی خاموش ہو گیا۔

"شاید ہم یہ بھول گئے ہیں کہ ہم یہاں کس لئے آئے تھے۔" شاہ نے بات کسی قدر تلخ لہجے میں شروع کی تھی۔ مگر فوراً ہی اپنے اسی نرم شفقت بھرے لہجے پر آ گیا "میں حیران ہوں کہ ہم شروع میں جب اکٹھے ہوئے تھے تو ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے مگر لگتا تھا کہ جانتے ہیں۔ اب ساتھ کام کرتے کرتے ایک دوسرے کو جان گئے ہیں تو لگتا ہے کہ ایک دوسرے کو جانتے ہی نہیں۔"

"شاہ صاحب! گستاخی معاف۔" غنی بیچ میں بول پڑا۔ "ہم ایک دوسرے کو جاننے کے بعد ہی تو یہ جان پاتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے بھی ہیں یا نہیں..... یا یہ کہ کتنا جانتے ہیں؟"

"شاید اب جا کر ہم نے ایک دوسرے کو جانا ہے۔" زین نے اپنے اسی ہلکے پھلکے انداز میں ایک فقرہ لڑھکا دیا۔

شاہ نے تامّل کیا۔ پھر کہنے لگا۔ "بہرحال، مجھے یہ بات عجیب نظر آتی ہے کہ جب ہم ابھی ایک دوسرے سے زیادہ قریب نہیں آئے تھے تو ایک دوسرے سے قریب محسوس کرتے تھے۔ اور اب جب کہ آپس میں اتنے قریب ہیں کہ یہ لمبی کالی رات اکٹھے بسر کر رہے ہیں تو ایک دوسرے سے دور ہو گئے ہیں۔"

"زیادہ قرب بھی تو دوری پیدا کر دیتا ہے۔" زین نے پھر ایک فقرہ جڑ دیا۔

"اب ہم ایک دوسرے کی نظروں میں مشکوک ہیں۔" شاہ نے تامل کیا۔ پھر آہستہ سے کہا۔ "شاید میں ابھی بچا ہوں۔ مگر حیران ہوں کہ ابھی تک مجھ پر انگلی کیوں نہیں اٹھی۔"

"شاہ صاحب! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ پر کون شک کر سکتا ہے۔" مرزا نے فوراً صفائی پیش کی۔

"میرے دوست!" شاہ نے مرزا کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "جہاں سب مشکوک ہوں وہاں اگر کوئی ایک مشکوک نہیں ہے تو پھر وہ مشکوک نہ ہونے کی وجہ سے ہی مشکوک ہو جاتا ہے۔ تو آپ لوگ مروت میں یہ بات کہیں یا نہ کہیں مجھے یہ اعتراف کر لینے میں پس وپیش نہیں ہونا چاہئے کہ......"

اسی دم دروازے پر ایک گاڑی جھٹکے کے ساتھ رکی اور ہارن کی تیز آواز آئی۔

"گاڑی آگئی۔" کئی زبانوں سے بیک وقت یہ مسرت بھرا جملہ نکلا۔

"اس وقت؟" شاہ نے کلائی پر لگی گھڑی پر نظر ڈالی۔ "ابھی تو رات باقی ہے۔ اتنی جلدی کیسے آگیا؟" شاہ کے لہجے میں شک کی ایک رمق تھی۔ اسی سے اشارہ لے کر تقی نے اپنے شک کا اعلان کر ڈالا

"کل ہی ہے یا کوئی اور......"

"یہی میں سوچ رہا ہوں۔" شاہ نے رکتے رکتے کہا۔

زرین فوراً ہی کھڑا ہو گیا۔ "میں جا کر دیکھتا ہوں۔"

"ٹھہرو!" شاہ نے فوراً ٹوکا۔ پھر فوراً ہی سوچ میں پڑ گیا۔ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔ "پروگرام یہ بتایا گیا تھا کہ کل صبح کو پہنچے گا۔ رات کو گاڑی بھیجنے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔ مگر ابھی رات باقی ہے اور گاڑی آگئی ہے۔ یہ کیا چکر ہے۔"

"شاہ صاحب! اس میں کوئی چکر ہے۔" تقی نے فوراً گرہ لگائی۔

"میرا خیال ہے۔" مرزا سوچتے ہوئے بولا۔ "کسی کو ہمارے یہاں ہونے کا پتہ چل گیا ہے۔"

"کس کو؟"

"یہ کیا کہا جا سکتا ہے۔"

"ہاں یہ کیا کہا جا سکتا ہے۔" شاہ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔ "اس وقت تو دوست اور دشمن کی تمیز ہی مشکل ہو رہی ہے۔ تو کیا کہا جا سکتا ہے۔"

تقی سوچتے ہوئے بولا۔ "میں قیاس کر سکتا ہوں کہ یہ کون لوگ ہیں۔ جب ہم یہاں پہ آئے تھے تب ہی سے

مجھے شک ہے کہ ہم ان کی نظروں میں تھے۔"

"کون لوگ؟" مرزا نے بے چینی سے پوچھا۔

"اصل میں یہ وہ گروپ ...."

اسی آن ایک بار پھر ہارن کی تیز آواز آئی۔

"شاہ صاحب!" غنی بول پڑا۔ "دیکھنا تو چاہیئے کہ آخر کون ہے؟"

"نہیں!" تقی نے قطعی انداز میں کہا۔

شاہ متذبذب نظر آرہا تھا۔ متذبذب لہجے میں کہا۔ "دیکھنا تو چاہیئے کہ آخر ہے کون۔ مگر اس میں خطرہ ہے۔"

ہارن ایک مرتبہ پھر سنائی دیا۔ آواز اب کے پہلے سے بھی زیادہ تیز تھی۔ اور اب کے کوئی کچھ نہیں بولا۔ جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ چہرے جیسے خوف سے لمبے لمبے ہوگئے ہوں۔ سانس اوپر کا اوپر نیچے کا نیچے۔ ایک دفعہ پھر ہارن کی آواز آئی۔ اور اس کے فوراً بعد گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی۔ گاڑی تیزی سے اسٹارٹ ہوئی اور تیزی سے روانہ ہوگئی ـــــــ تھوڑا وقت یہ اطمینان کرنے میں لگا کہ گاڑی چلی گئی ہے۔ جب پہلے والا سناٹا واپس آگیا اور گاڑی کے چلے جانے کا یقین ہوگیا تو انھوں نے ایک لمبا اطمینان کا سانس لیا ـــــــ "شکر ہے۔"

"بس انھوں نے یہ سمجھا کہ ہم چلے گئے ہیں۔" تقی نے کہا۔

"جو بھی سمجھا ہو۔ بہرحال خیریت گزری۔" مرزا بولا۔

"اگر ذرا بھی شک ہوجاتا کہ اندر ہم ہیں تو پھر......" نہ جانے تقی کیا کہنا چاہتا تھا۔ فقرہ بیچ ہی میں چھوڑ کر چپ ہوگیا ـــــــ شاہ نے نسرین کی طرف دیکھا جو ابھی تک اسی طرح دم بخود بیٹھی تھی۔ "نسرین! ارے تم تو بہت خوفزدہ نظر آرہی ہو۔"

"بالکل نہیں، سر!"

"تم سر کہہ کر مجھے بہت شرمندہ کرتی ہو۔ خیر، دیکھو بی بی، ہم دفتر کے محفوظ گوشے میں بیٹھ کر کام کرنے والے لوگ تو ہیں نہیں۔ فیلڈ ورکر ہیں۔ فیلڈ ورک میں یہی ہوتا ہے۔ خطروں کے مقامات پر بھی جانا پڑتا ہے۔ اور پتہ نہیں کہاں، کب، کن حالات سے دوچار ہونا پڑ جائے۔ تو ہمیں ذہنی طور پر ایسی صورتحال کیلئے تیار رہنا چاہیئے۔"

"جی سر۔"

"شاہ صاحب!" تقی سوچتے سوچتے اچانک بولا۔ "مجھے ایک اور شک ہو رہا ہے۔"

"کیا؟" شاہ نے غور سے تقی کو دیکھا۔

"کہیں آگے جا کر انھیں شک گزرے اور پھر واپس آئیں۔"

"ہاں ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے مگر بہتر یہ ہے کہ ہم اب کسی وہم میں نہ پڑیں۔" شاہ نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔

"مگر مجھے دوسرا شک ہے۔" غنی سوچتے ہوئے بولا۔

"برادر! تمہیں کیا شک ہے؟" شاہ نے اب غنی کی طرف رخ کیا۔

غنی رکا۔ پھر بولا۔ "کیا ہم اطمینان سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ گاڑی وہ نہیں تھی۔"

"کون سی؟"

"جس کا ہمیں انتظار تھا۔"

"نہیں۔" تقی نے برہمی سے غنی کو دیکھا اور قطعی لہجے میں درشتی سے کہا۔

"نہیں؟ تم تو ایسے یقین سے کہہ رہے ہو جیسے تم نے جا کر دیکھا ہو کہ آنے والا کون ہے۔" غنی کے اس فقرے نے تقی کو لاجواب کر دیا۔ غنی نے تامل کیا پھر آہستہ سے بولا۔ "جا کر دیکھ لیتے تو اچھا ہوتا۔ کیا خبر ہے گل ہی ہو؟"

سب سٹپٹا سے گئے۔ جیسے ان سے کوئی بھاری چوک ہو گئی ہو۔

نسرین اچانک بولی۔ "مجھے بھی شک ہوا تھا۔ ہارن بجانے کا انداز تو گل والا ہی تھا۔"

تقی نے غصے سے اسے دیکھا۔ "یہ بات تھی تو اس وقت کیوں نہیں کہا؟"

"اس وقت تو میں ایسی بوکھلا گئی کہ کچھ سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا۔"

نسرین کے بیان نے عجب اثر کیا۔ سب گم سم ہو گئے۔ کتنی ہی دیر تک گم سم بیٹھے رہے۔ اُن کا الگ الگ وجود جیسے ختم ہو گیا ہو۔ سب مل کر جیسے خاموشی کا ایک تودہ بن گئے ہوں۔ آخر زرین کسمسایا اور بولا۔ "اگر وہ وہی تھا تو وہ تو آ کر چلا گیا۔ اب ہم کس کا انتظار کر رہے ہیں؟"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" غنی کسی قدر تامل کے بعد بولا۔ "کیا مطلب ہے۔ گویا اب صبح کا انتظار بے سود ہے؟"

سب غنی کا منہ تکنے لگے۔ چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ تقی نے پریشان ہو کر شاہ کی طرف دیکھا۔

"شاہ صاحب! سن رہے ہیں۔ غنی کیا کہہ رہا ہے؟"

سب کی نظریں شاہ کے چہرے پہ جم گئیں۔ شاہ جیسے کسی دبدا میں پڑ گیا ہو۔ جیسے سارا اعتماد

بقیہ صفحہ ۲۷۹ پر ملاحظہ فرمائیے۔

حسن منظر

روکنگ چیئر
(ROCKING CHAIR)

صبح ہونے والی تھی اور یلدہ رات کے گیارہ بارہ بجے سے، یعنی جب گھر مبارکباد دینے کے لیے آنے والوں سے خالی ہوا تھا اور ابن حسن اس کے کمرے میں آیا تھا، ابھی تک جاگ رہی تھی

کمرے میں ہلکی روشنی تھی، بستر کے اوپر نجانے کس نے رنگین کاغذ کی پتیوں کا شامیانہ سا بنایا تھا، پردے نئے تھے، بستر نیا تھا، ہوا میں نئے فرنیچر اور پھولوں کی خوشبو تھی اور کمرے کے باہر دو مکانوں کے بیچ میں چھوڑی ہوئی گلی نما جگہ میں گیارہویں کے چاند کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔
ساری رات بستر پر بیٹھی وہ اپنے پیر کے انگوٹھوں سے بے دھیانی میں کھیلتی رہی تھی جس طرح پلنگ پر بیٹھ کر پڑھتے میں کسی زمانے میں کیا کرتی تھی۔ اس کا دماغ بار بار کہنا چاہتا تھا: جب شروعات ایسی ہے تو اختتام کیسا ہوگا۔ لیکن اس سے آگے اس کے خیالات بڑھ کر ہی نہیں دیتے تھے کیونکہ عقیدت کی ایک عجیب مالا اس کے گلے میں پڑی ہوئی تھی جسے اتار پھینکنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

برسوں کا ساتھ ہونے کے باوجود اسے آج پہلی بار معلوم ہوا تھا کہ ابن حسن سوتے میں خراٹے لیتا ہے۔ اس کی ناک شاید ہاکی کھیلتے میں کبھی ٹوٹ گئی تھی اور بیچ میں سے تھوڑی سے مڑی ہوئی تھی۔ اس کے برابر لیٹا ہوا وہ اور دنوں سے زیادہ معصوم نظر آرہا تھا کچھ کچھ اپنے بچپن کی شبیہہ اس وقت اس میں نہ روٹھنے کی سکت تھی، نہ شبہہ اور شک اس کے چہرے سے ہویدا تھے اور اس کے روٹھے جانے اور شک کرنے ہی کے ڈر سے وہ اندازاً پچھلے پانچ سالوں سے اس کا ہر کیا پورا کرتی آئی تھی۔

ہمیشہ سے وہ گھر سے میلوں دور کسی مقررہ جگہ پر، خواہ یلدہ کتنا ہی ملنا ناممکن ہوگا، کہے فلاں تاریخ کو اتنے بجے پہنچ جانا کہہ کر چل دیتا تھا۔ اس سے ابن حسن کو سروکار نہیں تھا کہ آج نانا بیمار ہیں، یعنی جب وہ زندہ تھے، اور یلدہ کو اس تاریخ پر انہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے۔ نہ ہی وہ اس دن یلدہ کے گھر پر ہونے والی کسی میٹنگ کو خاطر میں لاتا تھا جس میں باجی کے ملنے والے ادیب، جرنلسٹ اور پڑھے لکھے دوست شریک ہوتے تھے اور جن کی آؤ بھگت یلدہ نے اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ بلکہ کبھی کبھی اس بات پر وہ جھلا کر کہتا تھا، وہ خود یہ کام نہیں کر سکتی ہیں؟
"وہ بے چاری تو اپنا سب کام خود کرتی ہیں"۔

"پھر تمہیں شوق ہے ان لوگوں میں بیٹھنے کا یا باجی کو شوق ہے تمہیں ان کے بیچ میں بٹھانے کا؟"

ایسی گفتگو شروع ہو جانے پر یلدہ کو خاموش ہونا پڑتا تھا ورنہ بات اتنی بڑھ جاتی کہ ابن حسن قسم کھانے لگتا اب جو تم سے ملے۔۔۔

ہر ملاقات کے بعد، خواہ یلدہ کی ہوئی ہوئی دکھ رہی ہو وہ نہ سننے سے پہلے ہی اگلی ملاقات کے لیے جگہ اور وقت کا تعین کر کے وہاں سے چل کھڑا ہوتا تھا۔ اس کے بعد کچھ دیر وہ وہاں بو کھلائی ہوئی سی اکیلی کھڑی رہتی تھی جیسے کہ سمجھ نہ پا رہی ہو کہ اب کدھر جانا ہے۔ پھر اس طرف چل پڑتی تھی جہاں دونوں کے گھر آمنے سامنے تھے مگر جن میں اتنا فاصلہ تھا کہ برسوں سے آنا جانا نہیں ہوا تھا۔

اس نے کبھی رخصت ہوتے ہوئے بھی ابن حسن سے نہیں پوچھا تھا وہ یہاں سے کہاں جائے گا، لیکن وہ ہر ملاقات پر شروع ہی میں باتوں باتوں میں پوچھنے کی کوشش کرتا تھا۔

"بس سے آئی ہو؟"

وہ کہتی تھی "کسی سے لفٹ نہیں لی"

اس پر ابن حسن جھنجھلا کر کہتا "لفٹ کا ذکر کس نے کیا ہے"

"کسی نے نہیں" وہ مردہ دلی سے کہتی تھی اور اندھیری گلی میں یا سینما ہال کی سب سے پچھلی سیٹوں سے ادھر ادھر دیکھتی رہتی تھی کہ کوئی آ تو نہیں رہا ہے۔ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ سورج ڈوب جانے کے بعد کی ہلکی روشنی میں باغ کے اندھیرے کونے سے۔۔ جس کا انتخاب ابن حسن نے مصلحتاً کیا ہوتا تھا۔۔۔ وہ بچوں کو گھاس کے قطعوں پر لوٹیں لگاتے، ڈھالوں پر لڑھکتے، ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دیکھتی تھی۔ ان کے ماں باپ انہیں گھر چلنے کے لیے بلا رہے ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ پارک سونا ہونے لگتا تھا اور ساری ملاقات میں انہی لمحات کا ابن حسن کو انتظار رہتا تھا۔ اس وقت دل صرف ایک تیزی سے دھڑک رہا ہوتا تھا۔ یلدہ کا۔ ابن حسن کا سینہ ایک ایسا ٹرانزسٹر ریڈیو تھا جو باوجود اون ہونے کے دل سے عاری تھا۔ دھڑکتا کیا۔ رخصت ہونے سے پہلے ابن حسن باتوں باتوں میں ایک بار پھر اندازہ کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ واپس گھر وہ رستے میں کہیں رکتی ہوئی جائے گی یا سیدھی اور اگر سیدھی جائے گی تو بس سے یا رکشا لے کر؟

خود ابن حسن اپنے گھر کب پہنچے گا اسکے جاننے کی ضرورت کبھی یلدہ کو نہیں پڑی تھی۔ کیونکہ رات کو ابن حسن کے گھر دیر سے لوٹنے پر کار کے رکنے اور ہورن کی آواز آتی تھی۔ اور کار نہ ہونے کی صورت میں دروازے کی گھنٹی بجنے اور لوہے کے دروازے کے کھڑکھڑا کر کھلنے کی رات بھر گھر سے غائب رہنے کی صورت میں پہلے اس بڑے مکان کے ایک کونے کے کمرے سے دبی دبی سی آوازیں اٹھتی تھیں جیسے کوئی اپنے غصے کو ضبط کرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔ پھر مکان

کے کسی دوسرے حصے سے ابن حسن کے اپنی ماں سے زور زور سے بولنے کی آواز سنائی دیتی تھی جیسے وہ اس دوسرے شخص کو اپنی بات سنانی چاہتا۔ ہو پہلی آواز اسکے باپ کی ہوتی تھی جو کبھی یلدہ کو جب وہ چھوٹی تھی بیٹی کہہ کر پاس بلاتے تھے اور اب اگر دونوں کا سڑک پر آمنا سامنا ہو جاتا تھا تو یا تو یلدہ سہم کر راستہ بدل دیتی تھی یا اگر مڈبھیڑ بہت ہی نزدیک سے اچانک ہوتی تھی تو وہ سر اٹھائے، اس کی طرف دیکھے بغیر، پاس سے گذر جاتے تھے۔ یلدہ کا انہیں دیکھ کر پھرتی سے ڈھکا ہوا سر نیچے جھک جاتا تھا اور ایسی بن جاتی تھی جیسے اس نے انہیں دیکھا ہی نہیں ہے۔ جیسے وہ مجرم ہو۔

کبھی کبھی گھر سے رات بھر غائب رہنے والی صبح کو وہ ابن حسن کے چھوٹے بھائیوں کو سڑک پر اپنے مکان کے ارد گرد منڈلاتے دیکھتی تھی جیسے اندر کا بھید بھاؤ جاننے کی ٹوہ میں ہوں۔ وہ کھڑکیوں میں موقع ملتے ہی اندر جھانکنے کی کوشش بھی کرتے تھے جیسے وہ وہاں چھپا بیٹھا ہو۔ پھر ابن حسن کے گھر میں آنے کا شور مچتا تھا اور جب ابا بڑبڑاتے ہوئے گھر سے باہر نکل جاتے تھے تو وہ غصے میں کہتا "تم دیکھنا اماں، میں ایک دن گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ واہ قیدی سمجھ رکھا ہے مجھے"

اس کے بعد دروازہ زور سے بند ہوتا تھا اور اگر کار موجود ہوتی تھی تو اتنی ہی آواز سے اس کا دروازہ بھی۔ وہ کھڑکی کے پردے کی اوٹ لے کر ابن حسن کو غصے میں کہیں جاتے دیکھتی تھی۔

ایسے موقعوں پر -- یا جب وہ یلدہ سے روٹھ کر کہیں غائب ہو جاتا تھا کہ وہ وقت پر جگہ پر کیوں نہیں پہنچی -- ابن حسن کو ڈھونڈھ کر نکالنے کی تمام تر ذمہ داری یلدہ کی ہوتی تھی۔ وہ اس کے ملنے والوں کے ذریعے اسے مختلف قسم کے پیغام بھیجتی تھی۔ مثلاً یہ کہ اس سے کہئے گا کہ باجی اس کی کتاب لائبریری سے لے آئی ہیں -- " جو ہمیشہ اس قبیلے کی ہوتی تھی جسے باجی (گوبر) Turd کہتی تھیں یا یہ کہ "جس کام کے لیے اس نے کہا تھا ہو جائے گا" کبھی کبھی وہ باجی سے جب وہ کالج جا رہی ہوتی تھیں ابن حسن کو فون کرنے کے لیے کہتی تھی۔ مگر مشکل یہ تھی اس کا فون نمبر نوکریوں کے ساتھ ساتھ برابر تبدیل ہوتا رہتا تھا۔

اکثر باجی جھنجھلا کر کہتی تھیں

. Why can.t you get rid of him silly girl, and live a more purposeful life?.

("بیوقوف کہیں کی اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتی اور زندگی کو زیادہ بامقصد طریقے سے بسر کرتی؟")

وہ سسکیاں لینے لگتی تھی اور باجی مصنوعی خفگی سے کہتی تھیں " O.K . I will ، لیکن بنو تمہیں ٹھیک سے معلوم ہے اب بھی اس کا یہی نمبر ہے"؟

وہ ہاں میں سر ہلاتی تھی اور باجی کے چلے جانے کے بعد سوچتی تھی وہ خود ان کی طرح

کیوں نہیں ہو سکتی ہے۔ باجی کا کہنا صحیح تھا: اس کی بی۔ایس۔سی۔کی ڈگری کس کام کی تھی جب وہ ابن حسن کی خفگی کے ڈر سے کہیں سروس بھی نہیں کر سکتی تھی۔ جاتے ہوئے کہا ہوا ان کا آخری جملہ ایک نہ ایک دن تم اس سے بھر پاؤ گی اور اس سے تمہیں نجات حاصل کرنی پڑے گی اس کے کانوں میں دیر تک گونجتا رہتا تھا۔

باجی خود ابن حسن کے باپ کے سامنے سے ڈھٹائی سے سر کھولے گذر جاتی تھیں اور راستہ بھی نہیں بدلتی تھیں۔ اور اگر غلطی سے بڑے میاں کی نظر ان پر پڑ جاتی تھی تو آداب کہنے سے بھی نہیں چوکتی تھیں، جس پر وہ ہمیشہ اچھل پڑتے تھے اور پھر دوسری طرف کو دیکھتے ہوئے منھ پھلائے پاس سے نکل جاتے تھے۔ جیسے باجی نے انہیں ڈنک مارا ہو۔

باجی کہتی تھیں "ہٹو ابن کے ابا جب سے میں بڑی ہوئی ہوں مجھ سے پردہ کرنے لگے ہیں۔ تم مجھے ان کی سمدھن بنانا چاہتی ہو! بھلا ان کی میری نبھے گی!"

یلدہ مسخرے پن سے کہتی تھی "باجی ضروری تو نہیں کہ ایک سمدھن کی اپنے سمدھی سے نبھے بھی"

"اچھا تو تم اپنی کہو، تم سسر بہو کی نبھے گی؟" باجی کہتی تھیں "ان کے کہے پر اپنی ہونے والی جٹھانی کی طرح برقع پہن کر باہر نکلا کرو گی؟ ہو سکتا ہے وہ تمہارا پردہ مجھ سے بھی کرا دیں، میں بھی تو آدھی مرد ہوں"

اس پر یلدہ افسردگی سے کہتی تھی "اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی"

"پھر تم کیوں نہیں اس سے چھٹکارہ حاصل کر لیتیں؟" یہ ان کا ٹیپ کا بند ہوتا تھا۔

"تم حبیب صاحب سے چھٹکارہ حاصل کر سکتی ہو؟" ایک دن یلدہ نے اپنے دماغ میں ڈرتے ڈرتے کہا۔ ڈرتے ڈرتے اس لیے کہ وہ باجی کا دل نہیں دکھانا چاہتی تھی اور نہ ہی حبیب صاحب سے اسے کوئی بیر تھا۔

"چھٹکارے کی بات تو جب ہو جب وہ مجھے اپنی زر خرید لونڈی یا ملکیت سمجھتے ہوں" پھر انھوں نے بغیر حجاب کے کہا "نہ ہی میں انہیں اپنی ملکیت سمجھتی ہوں۔ بس دو جگری دوستوں کا ساتھ ہے"۔

باجی کے الفاظ سنجیدہ اور پر وقار تھے اور ان پر صرف کوئی تنگ نظر ہی ہنس سکتا تھا جس کا اپنا دل گناہ کا پالنا ہو۔

"پھر بھی باجی تمہارا کیس تو مجھ سے بھی زیادہ ہوپ لیس ہے"۔ یلدہ نے مصنوعی مسخرے پن سے کہا۔

"نہ انہوں نے کسی ہوپ پر تعلقات کی بنیاد رکھی ہے نہ میں نے، پھر ہوپ لیس ہونے کے کیا معنی!"

"مذہب کا فرق - پھر وہ شادی شدہ ہیں -"

"اس میں سے دوسری بات تو خارج کر دو" باجی نے کہا "ان کی شادی ذہنی طور پر تو کب کی ختم ہو چکی ہے - اور پہلے فرق کے بارے میں، ہم دونوں نے کبھی غور نہیں کیا" -

پھر باجی نے کچھ سوچ کر کہا "شاید یہی وجہ ہم دونوں کے ایک دوسرے سے ذہنی طور سے نزدیک ہونے کی ہے: ایک جیسی فکر کی نہج - باقی سب احمقانہ تخیلات ہیں: ہم مذہب ہونا، ہم عمر ہونا، کنوارا یا کنواری ہونا، گورا ہونا سانولا ہونا - ذہنی طلاق کے بعد ان میں سے کوئی چیز کام آتی ہے؟ چاہے برسوں ساتھ رہتے رہو" -

یلدہ حبیب صاحب کے بارے میں سوچ رہی تھی جن کی اس کے دل میں بڑی عزت تھی - نانا کے انتقال کے بعد جب باجی تقریباً تنہا رہ گئی تھیں تو انھوں نے سدا انکی ہمت بڑھائی تھی - انہی کے کہنے سے باجی نے اپنی مشکلات کو بھلا کر اردگرد کی دنیا میں دلچسپی لینی شروع کی تھی اور حبیب صاحب کے ملنے والے اس گھر میں ہفتے میں ایک بار جمع ہونے لگے تھے - اس دن کا باجی اور یلدہ کو انتظار رہتا تھا اور اب ایک سال سے جب باجی کے سر کا پرانا درد بڑھ گیا تھا تو انھوں نے ہی سرجن کے مشورے پر باجی کو آپریشن کروا لینے کی ہمت بندھائی تھی اور یلدہ کے لیے کہا تھا "اس کا کیا ہے لتنے دن اس کی دیکھ بھال میں کر لونگا" -

اس پر یلدہ نے فوراً کہا تھا "واہ میں کیا بچہ ہوں جس کی دیکھ بھال کی کسی کو ضرورت ہو" لیکن باجی آپریشن کے لیے تیار نہیں ہوئیں - بعض سرجنز کا خیال تھا ان کے سر میں ٹائم بم رکھا ہوا ہے جو کبھی بھی پھٹ سکتا تھا - پھر بھی وہ اپنی ضد پر قائم رہیں - "میں اسے اکیلا چھوڑ کر مرنے کے لیے خود اپنے پیروں سے چل کر نہیں جاؤں گی - اس کی شادی ہو جائے پھر دیکھا جائے گا" -

چنانچہ سر کا درد اپنی جگہ پر قائم رہا جیسے اندر ہی اندر کوئی چیز پک رہی ہو - ان کے بیگ میں مختلف قسم کی گولیاں رہتی تھیں جنہیں وہ دوسروں سے چھپا کر کھاتی تھیں، کولج میں بھی اور اپنے گھر پر ہونے والی نشستوں میں بھی جب کبھی یلدہ انہیں گولی کھاتے پکڑ لیتی تھی تو وہ بڑی معصومیت سے کہتی تھیں "رات سوتے میں ہوا لگ گئی - سارے جسم میں درد ہے" -

گھر ہونے والی یہ نشستیں عرصہ سے ملنے جلنے کا واحد موقع ہو کر رہ گئی تھیں کیونکہ ابن حسن کے گھر والوں کے کہنے پر محلے والے اور رشتے دار کب کے دونوں بہنوں سے میل ملاقات ترک کر چکے تھے اور ان نشستوں کو جن میں عورتوں سے زیادہ مرد آتے تھے دونوں کی آنکھوں کے پانی کا مر جانا سمجھتے تھے -

ابن حسن کو ان میٹنگز سے چڑھ تھی - ملاقات ہونے پر وہ بتاتا تھا کہ اس کے گھر والوں میں سے کس نے کیا کہا ہے وہاں آنے والوں میں سے ایک ایک کے حلیئے کے بارے میں - "اگر

باجی کا بچہ نہ ہوتا تو میں یہی کہتا تم بھی ان میں شریک مت ہوا کرو" یہ بات جب ان نشستوں میں آنے والوں کی گفتگو سنتے ہوئے یا کسی کو کچھ پڑھ کر سناتے وقت اس کے ذہن میں آتی تھی تو اسے تعجب ہوتا تھا وہ ابن حسن کے سامنے کچھ اور ہی بن جاتی ہے۔ اس کی ہر بات کو خاموشی سے سن لیتی ہے۔ پھر اسے باجی کی بات یاد آجاتی تھی تم نے اپنے آپ کو اس کا قیدی بنا رکھا ہے۔

کبھی کبھی وہ بھی وہاں پڑھی جانے والی چیز پر، ہمت کر کے اپنی رائے کا اظہار کر دیتی تھی اور اس کے رائے کو بھی بڑی توجہ سے سنا جاتا تھا۔

اکثر جب خود باجی کسی میٹنگ یا فنکشن سے رات کو دیر سے گھر لوٹتی تھیں اور آتے ہی خالی پیٹ پر سر درد کی گولی کھا کر اپنا پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتیں اور اونگنے لگتی تھیں۔ یلدہ ان کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہتی "تم نے پھر وہاں خالی پیٹ پر چائے پی ہوگی۔ کتنی دفعہ کہا پرس میں بسکٹ ہی رکھ کر لے جایا کرو۔ مجھ سے کہو میں روز رکھ دیا کروں۔ پر تم مانو تب نا۔

ابن حسن کے چھوٹے بھائی اور ان کے دوست کبھی کبھی جب سب میٹنگ میں بڑی توجہ سے کسی کو کچھ پڑھتے سن رہے ہوتے تھے کھڑکی کے باہر سے کچھ کہتے ہوئے تیزی سے گذر جاتے تھے۔ باجی نے ان کو سڑک پر یلدہ کو اکیلے دیکھ کر جملے کستے ہوئے بھی سنا تھا، لیکن خود ان پر جملے کسنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی۔ یہ وہی لڑکے تھے جن کے ساتھ سامنے کے میدان میں سالوں پہلے وہ یلدہ کو کھیلتے دیکھا کرتی تھیں۔ لیکن یہ بات جب کی تھی جب یلدہ کی ماں زندہ تھیں اور دونوں گھروں میں آنا جانا تھا۔

پھر لڑکوں کے پاس سائیکلیں آگئیں اور انھوں نے اپنے چھوٹے بھائیوں سے اور یلدہ سے شروع میں سائیکلوں کو تھام کر کھڑا رکھنے کا کام لیا تاکہ خود گدی پر بیٹھ سکیں۔ لیکن جب وہ کرتب دکھانے کے لائق ہوگئے تو بہت جلد اپنے سے چھوٹوں سے اوبنے لگے کیونکہ انہیں بائسیکل پر بٹھا کر محلے کے لڑکوں سے ریسیں نہیں لگائی جا سکتی تھیں۔ یلدہ کے رونے پر اس کے لیے نانا نے بھی سائیکل لا دی۔ انہیں اپنی بڑی نواسی سے زیادہ چھوٹی میں اپنی مرحومہ بیٹی کی جھلک نظر آتی تھی اور اس کی کوئی بات وہ ٹالتے نہیں تھے۔ جب شروع میں لڑکے یلدہ کے لیے سائیکل پکڑ کر کھڑے ہونے کو تیار نہیں ہوئے اور وہ روتی ہوئی گھر آئی تو بڑے میاں خود اس کے ساتھ چل کر گھر کے سامنے کے میدان میں گئے اور سائیکل پکڑ کر کھڑے ہوئے اور جب یلدہ نے سائیکل پر بیٹھ کر پیر چلانے شروع کیے اور دو چار بار گرنے کے بعد ہینڈل بیلینس کرنے لگی تو نانا نے پیچھے دوڑتے ہوئے کہا" چھوڑوں" یلدہ نے کہا"جی" اور اس سارے میدان کا چکر لگایا۔ نانا پھولی ہوئی سانس کے ساتھ اپنی جگہ پر کھڑے رہے، اور جب ان کے پاس سے گذرتے ہوئے یلدہ نے کہا "نانا پکڑیئے" تو انھوں نے سائیکل کو پیچھے سے تھام کر روک لیا اور یلدہ اتر گئی۔ محلے والے اس سین کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے لیکن کسی نے مدد کی پیش کش نہیں کی۔

عورتیں بھی کھڑکیوں میں سے اس سین کو دیکھتی تھیں اور دو تین دن بعد جب یلدہ کو خود چڑھنا اترنا آگیا تو محلے میں اس بات کا بڑا چرچا ہوا کہ لڑکوں کے ساتھ کھیلتی خود لڑکا بنتی جارہی ہے۔

جب وہ ذرا بڑی ہوئی اور ایک شام میدان میں کھڑی اپنی سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑی کر کے اس کی چین چڑھارہی تھی ابن حسن اس کے پاس اپنی پتلون کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے ٹہلتا ہوا آیا اور ظاہراً بے تعلقی سے بولا "کیا ہوا؟"

یلدہ نے اپنے سیاہ گریس لگے ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کچھ نہیں، اس کی چین گھڑی گھڑی اتر جاتی ہے۔"

ابن حسن نے سائیکل کو ادھر ادھر سے ہلا کر دیکھا، پیڈل کو سیدھا اور الٹا گھمایا اور بولا "اسے اوور ہولنگ کی ضرورت ہے" یلدہ کو دنیا میں دو ہی چیزوں سے عشق تھا ایک اپنی سائیکل سے جسے وہ ہر وقت صاف ستھرا رکھتی تھی دوسرا روکنگ چیئر سے۔ سائیکل اسے مل چکی تھی۔ روکنگ چیئر برسوں اس کی آرزو رہی۔ اس نے پہلی روکنگ چیئر جب وہ پانچویں یا چھٹی کلاس میں تھی ایک صاحب کے گھر دیکھی تھی جو گملوں کے پاس برآمدے میں رکھی تھی اور جس پر وہ بیٹھے ہوئے آہستہ آہستہ جھولتے ہوئے کوئی موٹی سی کتاب پڑھ رہے تھے۔

دوسرے بچوں کی آوازیں کسی دور کے کمرے سے آرہی تھیں۔ یلدہ یوں ہی خالی سجے ہوئے کمروں کا جائزہ لیتی ہوئی برآمدے میں آنکلی اور ان صاحب اور ان کی کرسی نے جیسے اسے مسحور کر لیا۔ وہ کھڑی انہیں دلچسپی سے دیکھتی رہی۔ انھوں نے ایک بار سر اٹھا کر اس کا نام پوچھا اور یہ کہ کس کے گھر سے آئی ہے۔ اور مطمئن ہو کر پھر ہل ہل کر کتاب پڑھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے روکنگ چیئر میں اس کی دلچسپی کو دیکھ کر پوچھا "تم بیٹھو گی اس پر؟"

اس نے شرماتے ہوئے کہا "جی"

ان صاحب نے برابر میں رکھی ہوئی چھوٹی میز پر اپنی کتاب کھلے ہوئے صفحے پر الٹی رکھتے ہوئے کہا "لو بیٹھو"

یلدہ بیٹھ گئی۔ انھوں نے پوچھا "کبھی بیٹھی ہو روکنگ چیئر پر؟"

یلدہ نے کہا "نہیں" اور شرماتے ہوئے کہا "میں نے تو دیکھی ہی آج پہلی دفعہ ہے"۔

دونوں میں گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یلدہ نے پوچھا "یہ کرسی آپ کے پڑھنے کی کرسی ہے؟" انھوں نے کہا "ہاں"۔ "مگر آپ اس پر بیٹھ کر لکھ تو نہیں سکتے"۔ وہ صاحب یلدہ کی اس بات پر بے ساختہ ہنسے اور ہنستے ہوئے ہی بولے "مگر اس پر بیٹھ کر جب پڑھ نہ رہا ہوں تو مزے مزے کی باتیں سوچ سکتا ہوں"۔

"اس پر بیٹھ کر مزے مزے کی باتیں آپ سوچتے ہیں؟"

"نہیں وہ خود سے بھی ذہن میں آتی رہتی ہیں"۔

یلدہ کو کرسی کا یہ کلام سب سے زیادہ پسند آیا۔ وہ سوچنے لگی میں بھی نانا سے کہہ کر ایسی کرسی منگواؤنگی۔ اور اس پر بیٹھ کر کہانیوں کی کتابیں پڑھا کرونگی، مزے دار باتیں سوچا کرونگی اور نانا سے اس پر جھول جھول کر مزے مزے کی باتیں کیا کرونگی۔

اس کا چند لمحے کا یہ خواب ٹوٹ گیا جب ان صاحب نے کہا "اب ہم اس پر بیٹھ کر اپنی کتاب پڑھیں گے یلدہ نے کہا "جی" "جھول چکیں" "بس؟" ۔ "جی" یلدہ نے پیار سے کرسی کے ہتھوں پر اپنے دونوں ہاتھ پھیرے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر تھینک یو کر کے اس برآمدے سے باہر چلی گئی جس میں اس نے کرسی کو زندگی میں پہلی بار اس روپ میں دیکھا تھا۔

لیکن نانا اس کی کرسی کی فرمائش پوری نہیں کر سکے۔ سالوں بعد مرنے سے چند دن پہلے بھی انھوں نے یلدہ کو پیار کرتے ہوئے کہا تھا "تیری ایک خواہش پوری نہیں کر سکا" ۔ پھر آنکھوں میں بے اختیار ابل آنے والے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے انھوں نے کہا تھا۔ "اس کا بھی قلق ساتھ لے کر جا رہا ہوں"۔

یلدہ ان کی بات جانتی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ ان کے منھ پر رکھدیا تھا اور سینے سے لگ کر روئی تھی۔

اپنے پہلے عشق سائیکل کے بارے میں ابن حسن سے "اسے اوور ھولنگ کی ضرورت ہے"۔ سن کر اس کا دل بیٹھ گیا۔ یہ لفظ اس نے لڑکوں سے سنا تھا کہ اس کے بغیر سائیکل بے کار ہو جاتی ہے اور زیادہ دن نہیں چل سکتی"۔

"وہ کیسے ہوتی ہے؟" یلدہ نے گھبرا کر کہا۔

"ہوتی نہیں کرائی جاتی ہے"۔

"کہاں؟" یلدہ نے سوچ میں پڑ کر کہا۔

"سائیکلوں کی دکان پر اور اس کے لیے وہاں سارا دن بیٹھنا پڑتا ہے"۔

یلدہ بددل ہو گئی۔ دو ایک بار نانا اس کے لیے پنکچر جڑوا کر لائے تھے۔ لیکن اتنا بڑا کام وہ ان سے نہیں کرانا چاہتی تھی۔ بے چارے چلتے میں ہانپ جاتے تھے اور اب عرصہ سے باجی نے ان سے گوشت سبزی بھی نہیں منگوائی تھی۔ اس نے عاجزی بھرے لہجے میں ابن حسن سے کہا "تم کرا دو"۔

ابن حسن نے اس کے منھ کے پاس منھ لا کر کہا "اس کے لیے تمہیں رشوت دینی پڑے گی۔ پھر میں کل تمہاری سائیکل کی اوور ھولنگ کرا دونگا"۔ اس کے منھ سے سگریٹ کی بو آرہی تھی۔

"کیسی رشوت؟" یلدہ نے پوچھا۔

"ایک پیار۔۔ہونٹوں پر" ابن حسن نے بغیر جھجکے ہوئے کہا۔

یلدہ خاموش رہی۔ وہ نوجوانی اور بچپن کی دھلیز پر کھڑی تھی اور اس بات کا مطلب جانتی تھی۔ "سوچ لو۔ اوور ھولنگ ہر مہینے چاہیئے ہوگی ورنہ اس کے بغیر سائیکل کھنڈارہ ہوجائیگی"۔

ابن حسن اسے ناپسند نہیں تھا۔ شرم سے سرخ ہوتے ہوئے یلدہ نے کہا" کہاں؟"

"مغرب کے بعد تمہارے کمرے کے پیچھے کی گلی میں"۔

لیکن رات کو جب وہ ابن حسن کے باہر بولنے کی آواز سن کر پیچھے کی گلی میں گئی اور ابن حسن نے رشوت وصول لی تو وہ صاف مکر گیا" میں اوور ھولنگ کراکے نہیں دونگا۔ تم نے رشوت پوری نہیں دی ہے"۔

یلدہ نے کھس پس کی آواز میں پوچھا" کیسی پوری رشوت؟"

ابن حسن نے کہا" اب تم مجھے پیار کرو۔ یہ آدھی رشوت تھی"۔

یلدہ نے اس دن زندگی میں پہلی بار محسوس کیا تھا کہ وہ ابن حسن کے بس میں آچکی ہے اور شاید ہمیشہ کے لیے۔ زندگی کی اس نئی طرح کی خوشی میں تاسف کا شائبہ بھی تھا۔

جن دنوں وہ میدان میں سائیکل چلانے لگی تھی اور اس کی بڑی بہن کو لوگوں نے بے پردہ کالج آتے جاتے دیکھا تو ابن حسن کی بڑی بہن اور ماں نے کہنا شروع کر دیا کہ دونوں بہنیں بگڑ رہی ہیں اور یہ کہ یلدہ لڑکوں کی طرح سڑک پر گھومتی ہے اور لڑکوں ہی کی عادتیں سیکھ رہی ہے۔

ان کی اس رائے سے محلے کی اور عورتیں بھی آسانی سے متفق ہوتی چلی گئیں کیونکہ اس چھوٹی سی سڑک پر سب سے بااثر گھرانا ابن حسن ہی کا تھا اور اس کے گھر پر ہونے والی مجلسوں میں عورتیں دور دور سے آکر شریک ہوتی تھیں۔

ان لوگوں کے لیے یلدہ پہلے بیٹی سے صرف یلدہ ہوئی اور پھر وہ لڑکی ہو کر رہ گئی۔

لیکن جب نانا کا انتقال ہوگیا اور وہ اسکول کی آخری کلاسوں میں تھی اور محرم کی شروع کی تاریخوں میں بھی اس کی باجی کو لوگوں نے ایک غیر مذہب والے حبیب صاحب کے ساتھ گھومتے دیکھا۔ حتیٰ کہ یوم عاشورا کو بھی تو ان لوگوں کا کھچڑے پر بلانا بھی موقوف ہوگیا جو ابن حسن کے گھرانے کی ریت تھی اور جس میں ہر جاننے والا مدعو کیا جاتا تھا۔

اب یلدہ کے گھرانے کے حوالے سے بھی گھر میں کوئی بات نہیں کی جاتی تھی۔ سوائے دن کے جب ابن حسن دیر تک گھر سے غائب رہتا تھا۔ تب اماں کہتی تھیں" دیکھنا ان کلموہیوں کے گھر تو نہیں بیٹھا ہے"۔

اور لڑکے آکر کہتے تھے" نہیں وہاں تو خاموشی ہے"۔ یا اگر ابن حسن کی یہ ڈھنڈیا سرشام پڑجاتی تھی تو کبھی کبھی خبر لاتے تھے کہ" وہاں تو بابا ہو رہی ہے۔ لوگ بیٹھے ہیں اور باتیں ہو رہی

ہیں، یا کوئی کچھ پڑھ رہا ہے" اور اگر کبھی میٹنگ میں غزل یا نظم پڑھی جارہی ہوتی تھی تو جا کر ماں سے لگاتے تھے کہ، وہاں تو فلموں کا ماحول ہے۔ لوگ ان دونوں بہنوں کی شان میں گیت پڑھ رہے ہیں۔"

ان ہی دنوں جب یلدہ کالج میں تھی ابن حسن نے ایک ملاقات پر اس سے کہا" اس طرح ملنے میں مزہ نہیں آتا۔ یہ کیا کہ ایک منٹ کے لیے ملے اور جدا ہو گئے، نہ تم مجھ سے کھل کر بات کر پاتیں نہ میں تم سے"۔

"پھر؟"

"پھر یہ کہیں اور ملا جائے۔ تم باجی سے بہانا کر کے آجاؤ۔ میں وہاں پہلے سے موجود رہونگا

"کہاں"

ابن حسن نے اس کے ہاتھ میں ایک پرچہ دیتے ہوئے کہا" اس میں سب کچھ لکھا ہے۔ بس اسی طرح تمہیں کرنا ہے"۔

گھر آکر اس نے پرچے کو پڑھا۔ اس میں لکھا تھا" یہ بڑا بیک ورڈ ملک ہے۔ لڑکے لڑکیاں چوروں کی طرح چھپ کر ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ فلاں نمبر کی بس سے ڈھائی بجے فلاں جگہ پہنچ جانا۔ کل۔ بس سے اتر کر پیچھے کو بیس قدم چلنا۔ میں بس اسٹوپ سے اس گلی تک کا فاصلہ ناپ چکا ہوں جہاں میں تمہیں کھڑا ہوا نظر آؤنگا۔ کہیں بس میں آگے نکلی مت چلی جانا۔ تمہیں دیکھ کر میں اس گلی میں چل پڑونگا اور تم میرے پیچھے پیچھے میرے دوست کے فلیٹ تک چلی آنا جو اس وقت وہاں موجود نہیں ہو گا۔ اس کے فلیٹ کی چابی میرے پاس ہے۔۔ہم وہاں گھنٹہ بھر رہ سکتے ہیں۔ دل کھول کر باتیں ہونگی۔ گھر سے نکلنے کا بہانا ڈھونڈنا تمہاری ذمے داری ہے۔ ملاقات کے بعد تم گھر چلی آنا۔ میں اپنے گھر مغرب کے بعد لوٹونگا۔"

جب ساڑھے چار بجے یلدہ گھر پہنچی تو وہ حواس باختہ تھی۔ اسے لگ رہا تھا روح اس کے جسم کو چھوڑ گئی تھی۔ باجی گھر میں نہیں تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر اوندھے منھ گر پڑی۔ اس نے رونے کی کوشش کی کہ شاید دماغ ہلکا ہو سکے لیکن ابھی تک جیسے اس پر ٹونا ہوا ہوا تھا۔ رونا اس کے بس میں نہیں تھا، کیونکہ چلنے سے کچھ پہلے ابن حسن نے کہا تھا" خوش ہونا؟" وہ چپ رہی تھی۔ پھر ابن حسن کمرے کی بالکنی پر جا کھڑا ہوا اور منھ میں سگریٹ دبا کے تیسری منزل کے نیچے گذرتے ہوئے ٹریفک کو دیکھتا رہا۔ جب یلدہ نے اپنے ادھ بنے خیالات سے رہائی پانے کے لیے اس کے پاس آکر کھڑا ہونا چاہا تو اس نے ہاتھ سے اسے اندر ہی رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا" یہاں نہیں نیچے سے کوئی ہمیں ایک ساتھ دیکھ سکتا ہے"۔ پھر وہ تیزی سے اس کی طرف آیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے کولھوں کے اوپر کے حصوں کو تھام کر بولا" مسکراتی ہوئی گھر

جاؤ۔ یہ دن تمہیں ہمیشہ یاد رہے گا"۔

"اور تمہیں؟" یلدہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ اس کے جذبات سن تھے جس کا تجربہ اسے زندگی میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

"میری یادداشت بہت زبردست ہے"۔ ابن حسن نے کہا" مجھے آج تک کوئی آدمی مجھ سے بہتر یادداشت والا نہیں ملا۔ میں کس طرح اس دن کو بھول سکتا ہوں۔ اور، اب تم یہاں سے سدھارو"۔

"اور تم؟ تم یہیں ڈیرہ ڈال کر بیٹھے رہو گے؟" یلدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ابن حسن کے الفاظ نے اس پر جادو کر دیا تھا۔ واقعی بڑے ہونے کے بعد سے ان میں کبھی اتنی دیر کھل کر بات نہیں ہوئی تھی۔

"میں ابھی ایک سگریٹ اور پیونگا۔ اتنی دیر میں تم بس لے کر گھر جاچکی ہوگی۔ پھر میں کہاں جاؤنگا اس کا فیصلہ میں نے ابھی نہیں کیا ہے"۔

لیکن اس اپنے گھر کی تنہائی میں وہ سحر جیسے اس کا ساتھ چھوڑتا جارہا تھا۔ پھر بھی اس کی حالت ایک اؤٹومیٹن سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے بے خیالی میں اٹھ کر چائے کے لیے پانی چولھے پر رکھ دیا اور بے خیالی ہی میں نہانے چلی گئی۔

جب باجی گھر میں داخل ہوئیں تو یلدہ کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی چائے پی رہی تھی۔ ادھ بنے خیالات اب مکمل ہو کر اس پر ابن حسن کی مسلط کی ہوئی خوشی کو ایک نئی شکل دینے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی جو کچھ ہوا تھا بے ارادہ تھا۔ اور اس نئے خیال نے اس کے جسم کی کھنچاوٹ تھوڑی کم کر دی۔

باجی نے اس کی شکل کو دیکھ کر چونک کر کہا" کیا ہوا؟"

یلدہ بھی چونک پڑی اور کہتی ہوئی بولی" کچھ نہیں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہی تھی"۔

باجی نے اطمینان کی سانس لیا اور بولیں" میرے ہوتے ہوئے تمہیں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔

"Give me a cup of tea, I am too tired"

یلدہ چائے دینے کے لیے اٹھی۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن آج کے دن نے عقاب کی طرح اپنے پنجے یلدہ کی دماغ میں ہمیشہ کے لیے گاڑھ دیئے اور وہ اب جہاں چاہتا اسے اڑا لے جاتا۔

ایک زمانہ تھا جب ابن حسن کے بڑے بھائی کے بارے میں بھی جو ڈاکٹر بننے والے تھے لوگوں کو شبہہ ہوا تھا کہ انہیں یلدہ کی بڑی بہن میں دلچسپی ہے۔ لیکن افواہ افواہ ہی ثابت ہوئی۔

اس طرح تو ان دنوں لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ وہ نرسوں سے فلرٹ کرتے ہیں ۔ لیکن ان سب باتوں کو لوگ بھول چکے تھے اور بھولے رہتے اگر ابن حسن ایک دن اپنے خلاف گفتگو سن کر ماں سے غصے میں نہ کہتا کہ "ابا بنتے ہیں ۔ وہ دن بھول گئے جب بڑے بھیا نرسوں کے ساتھ فلمیں دیکھا کرتے تھے اور باجی میں انہیں کم دلچسپی تھی ؟ وہ تو ان کے برقع نہ پہننے نے انہیں اس گھر سے بچا لیا کیونکہ ابا بے پردہ بہو کے قائل نہیں تھے ورنہ آج کو وہ بھی اس گھر کی قیدی ہوتیں ، اور بھیا دوسرے شہروں میں گل چھرے اڑایا کرتے ۔"

اماں نے کہا "ہائیں ہائیں کیا کہتے ہو! تمہاری بھابی سن لینگی تو کیا ہوگا"

لیکن ابن حسن نے ان کے ساتھ اپنا حملہ جاری رکھا "کیا کچھ انہوں نے اپنی زندگی میں نہیں کیا ہے بس ابا کی رضامندی کے لیے ایک برقع پہننے والی لڑکی سے شادی کر کے وہ ہمیشہ کے لیے پارسا بن گئے اور میں ۔۔"

اماں نے ابن حسن کے منھ پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا "تم اپنے آپے میں نہیں ہو ۔ نہ بڑا دیکھتے ہو نہ چھوٹا ۔ دیکھو چھوٹے بہن بھائی تمہاری باتوں کو کتنی دلچسپی سے سن رہے ہیں ۔ لعنت ہے تم پر "۔

"لعنت ہے ان پر اور ان کی بیوی پر " ابن حسن نے کہا ۔

پھر اندر سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی اور سب ادھر کو لپکے ۔

رات کو جب ابن حسن کو ابا کے کمرے میں لے جایا گیا تو انھوں نے اس کی طرف سے منھ پھیر لیا اور لیٹے لیٹے تبسم کرتے رہے ۔ باہر سرد ہوا چل رہی تھی ۔ کسی نے کہا "ابا کے سینے میں درد ہے "۔

ابن حسن نے اطمینان کا سانس لیا ۔ وہ خوف ٹل چکا تھا کہ اگر اس وقت بڑے میاں چل بسے تو بعد میں شاید ساری زندگی اسے یہی سننا ہوگا کہ انہیں ابن کی زبان درازی سے دل کا دورہ پڑا تھا ۔

وہ کچھ دیر چپ چاپ کھڑا رہا ، پھر اماں کے رونے اور بہن بھائیوں کے مجبور کرنے پر بالآخر ابن حسن نے تھوڑے فاصلے پر کھڑے کھڑے کہا ۔

"ابا معاف کر دیجئے "۔

اس کے کئی بار اس جملے کو دہرانے پر بھی جب بڑے میاں نہیں بولے تو اماں نے کہا "ابن اپنے کو بدلو ۔ اپنی عاقبت خراب مت کرو ۔ باپ ہیں ، تمہارے دشمن نہیں ہیں" ۔

ابن حسن بازوؤں کو ہاتھوں میں تھامے لاتعلق سا کھڑا تھا ۔

اماں نے کہا "جاؤ ۔ انھوں نے معاف کر دیا ۔ جاکے سو رہو" ۔

یہ ایک طرح سے جنگ بندی کا اعلان تھا ۔ اور اسی طرح سینے پر بانہوں کو ایک دوسری

پرسے گذارے جب وہ کمرے سے باہر نکل آیا تو اسے بڑے میاں کی آواز سنائی دی "اجی وہ نہیں بدلے گا"۔

اس نے اپنے قدم سست کر دیئے۔

پھر اسے سنائی دیا "تم کمبخت ہو وہ دونوں جب تک اس محلے میں ہیں وہ نہیں بدلے گا۔ میں کہتا ہوں وہ محلہ تو کیا اگر شہر اور ملک بھی بدل لیں تو بھی تمہارا یہ لڑکا وہیں پہنچے گا۔

اس واقعے کے کچھ دن بعد ابن حسن انگلینڈ چلا گیا۔ ایرپورٹ چھوڑنے جانے والوں میں اس کے دوست بھی تھے اور چھوٹے بھائی بھی۔ ڈپارچر لاؤنج کے ایک کونے میں یلدہ اپنی باجی کے ساتھ علیحدہ ایک کاؤچ پر غمزدہ سی بیٹھی تھی۔

باقر اور علی جواد نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کے دماغ میں ایک ہی بات تھی اچھا تو یہ محترمائیں یہاں بھی موجود ہیں۔

اس کے بعد ان لڑکوں کی توجہ ابن حسن کی طرف سے ہٹ گئی اور جتنی دیر ایرپورٹ پر رہے اس تاک میں تھے کہ دیکھیں کب یہ دونوں اس سے آنکھیں ملاتی ہیں اور رخصت ہوتے وقت کیا کرتی ہیں۔ انکا خیال تھا جب ابن بھائی لاؤنج سے باہر نکلینگے اور لوگ شیشوں میں سے اپنے باہر جانے والوں کو ہاتھ ہلا ہلا کر خدا حافظ کرنے لگینگے تو یہ دونوں عورتیں بھی۔۔ جن میں سے بڑی کو کسی زمانے میں وہ باجی کہا کرتے تھے۔۔۔ سب سے نظریں چرا کر آہستہ سے اسے ہاتھ ہلائینگی۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔

رخصتی کا اعلان ہونے پر یلدہ آگے بڑھی۔ خلاف توقع اس کی چال چوروں والی نہیں تھی اس میں وقار تھا۔ اس کی باجی اس سے کچھ فاصلے پر رک گئیں۔ ان دونوں کی اس متانت نے ابن حسن میں اتنا حوصلہ پیدا کر دیا کہ وہ بھی اپنے بھائیوں کا ساتھ چھوڑ کر یلدہ کی طرف بڑھا۔

ایک بار پھر دونوں لڑکوں نے پر معنی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

باہر مسافر اپنے بیگ اٹھائے بچوں کے ہاتھ پکڑے گینگ وے پر چڑھ رہے تھے جہاں ان کا استقبال ایرہوسٹسز کر رہی تھیں۔

یلدہ رو رہی تھیں۔ ابن حسن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ اس کھلی جگہ پر سب کے سامنے اس سے کیا کہے۔

پھر باجی نے آگے بڑھ کر ابن حسن کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "گڈ لک۔ خدا حافظ۔ اور یلدہ کو لے کر لاونج سے باہر نکل گئیں۔

ابن حسن کے بھائی گھر پہنچنے کی جلدی میں تھے تاکہ ڈھٹائی اور بے حیائی کے اس سر عام مظاہرے کا نقشہ اماں، بھائی اور بہنوں کے سامنے کھینچ سکیں۔

ان دو سالوں میں جو ابن حسن نے بیڈفورڈ میں گذارے مختلف قسم کی چیزیں دونوں

گھروں میں آتی رہیں۔ کچھ کے لیے وہ خود ذمے دار تھا کیونکہ اپنے شب و روز کا ذکر جیسے دوسروں کو چڑھانے کے لیے ہی وہ اپنے خطوں میں کرتا تھا۔ کچھ خبریں انگلینڈ سے آنے والی ان دونوں گھروں میں پہنچاتے تھے۔ مثلاً یہ کہ وہ بنگو کھیلنے جاتا ہے اور ڈانس بھی کرنے لگا ہے۔ اس کا زیادہ تر وقت شراب خانوں میں گذرتا ہے جنہیں وہاں پبز Pubs کہا جاتا ہے۔

کسی نے کہا وہ ہر اتوار کو کسی نہ کسی انگریز لڑکی کے ساتھ انڈین فلم دیکھتا ہوا نظر آتا ہے۔

کسی نے کہا وہ اکثر اپنی طرف کی لڑکیوں کے ساتھ انگریزی فلمیں دیکھتا ہے۔ یہ اپنی طرف کی لڑکیوں والی بات ابن حسن کی ماں کو زیادہ کھٹکتی تھی کیونکہ اس میں اس کے وہیں ٹک رہنے کا امکان زیادہ تھا۔ انگریز لڑکیاں جب ان کے بڑے بیٹے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھیں تو ابن حسن کا کیا بگاڑ لیتیں۔ اپنی طرف کی لڑکیاں اس معاملے میں زیادہ سخت جان مشہور تھیں جن سے ایک بار پھنس جانے کے بعد پیچھا چھڑانا مشکل ہوتا ہے۔ انگریز لڑکی زیادہ سے زیادہ دل کا بہلاوہ ہی تو ہوتی ہے مانو اس میں کیا ہوا!!

پھر سننے میں آیا جو کورس وہ کرنے گیا تھا شاید نہیں کر پایا اور کسی فرم میں ملازمت کر لیا ہے۔

اس نے کسی انگریز عورت سے شادی بھی کر لی ہے جو عمر میں اس سے بڑی ہے اور یہ کہ وہ مختلف قسم کے نشے کرنے لگا ہے۔ یہ بات بہت سوں نے کہی۔

یلدہ کے پاس اس کے خط آنے پہلے کم ہوتے گئے اور پھر جب دوبارہ ایک کے بعد ایک آنے شروع ہوئے تو ان کا مضمون اتنا بے ربط ہونے لگا کہ اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنی مشکل ہو گئی۔ سوائے اس کے کہ وہ یہاں سے زیادہ وہاں ذہنی طور سے پریشان تھا۔ "میں واپس نہیں آؤنگا۔ سنا ہے تم اپنی بی۔ ایس۔ سی کو کام میں لا رہی ہو یعنی کسی فرم میں نوکری کر لی ہے۔"

"سنا ہے باجی نے حبیب صاحب سے شادی کر لی ہے۔"

"کسی نے مجھے بتایا اب تم بھی ان میٹنگز میں حصہ لینے لگی ہو بلکہ گل حسن سے پتہ چلا اس نے تمہیں کسی اور کے گھر بھی اس قسم کی میٹنگ میں دیکھا تھا۔ تمہیں معلوم ہے میں اندر سے مذہبی آدمی ہوں deeply religious اور ان میٹنگز میں عورتوں کی شرکت کے خلاف ہوں جن میں مرد بھی شریک ہوتے ہوں"۔

"تم نے میرے خطوں کا جواب دینا بند کر دیا ہے۔ کیا کوئی نئی دوستی کر لی ہے؟ تم ضرورت سے زیادہ آزاد ہو، اماں تمہیں بہو کی حیثیت سے کبھی قبول نہیں کرینگی۔ میری طرف سے لکھ لو۔ اس بھروسے پر مت رہنا کہ ان سے بگاڑ کر کے میں تم سے شادی کرونگا۔ لیکن انہیں

منانے کے گر مجھے آتے ہیں۔"

"میں نشے کا عادی نہیں ہوں۔ صرف اعتماد پیدا کرنے کی ایک گولی لیتا ہوں۔

The confidence pill, courage pill

جس طرح تم اپنی روزانہ ایک والی گولی لیتی ہو۔ ابھی بھی لے رہی ہو وہ گولیاں؟ برا مت مانتا، یہ بات مذاق میں لکھی ہے۔"

"آج کل میں ڈگز digs میں رہ رہا ہوں (ایک طرح کی کھولی سمجھو) اور کھانا اکثر ریسٹورینٹ میں کھاتا ہوں اور جب نامہ ختم ہونے لگے خود بھی پکانے لگتا ہوں۔ کبھی کبھی میری کوئی انگریز گرل فرینڈ بھی پکا دیتی ہے۔ پیکٹ کا پاؤڈر سوپ جسے بس پانی میں گھول کر ابالنا ہوتا ہے اور اوملیٹ اور mashed potatoes یعنی مسلے ہوئے آلو جنہیں میں پھیکا بھرتا کہتا ہوں۔ مجھے یہ کھانا اپنے یہاں کے بھاری کھانوں سے بدرجہا بہتر لگتا ہے۔

"کبھی کبھی میں سوچتا ہوں تم اچھی بیوی ثابت نہیں ہوگی خواہ کوئی بھی تم سے شادی کرے"

"میں کئی کئی دن کچھ نہیں کھاتا ہوں اور آج کل کام پر بھی نہیں جا رہا ہوں۔ میری نیند بالکل اڑ گئی ہے۔

"ان سسری گوری لڑکیوں کو سوائے ابلی ہوئی ترکاریوں اور اوملیٹ کے اور پکانا ہی کیا آتا ہے"۔

پھر تقریباً دو ماہ کی خاموشی کے بعد اس نے لکھا:

"میں کل صبح ہی ہسپتال سے لوٹا ہوں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ میں نے خودکشی کی کوشش کی تھی لیکن مجھے کچھ یاد نہیں پڑتا۔ باہر نکلتے میں میرے پیر کانپتے ہیں۔ اس لیے سارے دن بستر پر پڑا رہتا ہوں، یلدہ مائی ڈیئر۔ باجی سے کہو مجھے کسی طرح واپسی کا کرایہ بھجوائیں ورنہ اگر یہاں زیادہ دن رہا تو کسی کا قتل کر بیٹھونگا۔ میں اس بے حیائی کے ماحول میں خود کو بالکل ایڈجسٹ نہیں کر پایا ہوں۔ حبیب صاحب جرنلسٹ ہیں اور مجھے معلوم ہے ان کی دوستی بڑے بڑے لوگوں سے ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح ایر ٹکٹ کا انتظام کر سکتے ہیں۔ تم جانتی ہو میری انگلش پر کمانڈ کی وجہ سے کوئی بھی اوٹو فرم مجھے لینے کے لیے تیار ہو جائیگی اور باجی کی رقم میں اپنی پہلی ہی تنخواہ میں انہیں لوٹا سکتا ہوں۔ اس کے بعد میں تم سے شادی کر لونگا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے"۔

لیکن جب وہ لوٹا اور یلدہ اور اس کی باجی اسے ایر پورٹ لینے گئیں تو اس کی باتیں بھی اپنے خطوں کی طرح بے ربط تھیں اور اس نے دونوں سے ملتے ہی کہا "میں جا کے سب سے پہلے ابا کے پیروں پر گر کر معافی مانگنا چاہتا ہوں۔

Because he is a great man"

پھر اس نے باجی کے کندھوں پر دونوں ہاتھ جما کر کہا دو آپ نہیں جانتیں ان میں امیر

المومنین علی ابن ابی طالب کی روح ہے۔

He is his reincarnation

اس کی آنکھیں سرخ تھیں، چہرہ وحشت زدہ اور منھ سے آنے والے بھبکوں میں عجیب طرح کی میٹھی سی بدبو تھی۔ وہ بہت پھرتی میں تھا اور کئی بار مسافروں اور ایر پورٹ کے عملے سے ٹکرا بھی گیا۔ دو ایک بار اس نے سیٹی بھی بجائی جس کی دھن نہ مشرقی تھی نہ مغربی۔ اپنا سامان چیک کراتے ہوئے اس نے کسٹم آفیسر سے کہا" دیکھئے اچھی طرح دیکھئے شاید اس جنک Junk میں کوئی سالی چیز آپ کو بھی پسند آجائے۔"

یلدہ اس ڈرامے کو اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے کوئی پتھر کی مورتی مندر میں آنے والوں کو تک رہی ہو۔ اس کی آنکھیں بمشکل اپنی جگہ سے ہلی تھیں۔ باجی نے سے ترس بھری نظروں سے دیکھا لیکن یلدہ کو اس کی خبر تک نہیں ہوئی۔

باہر نکل کر ابن حسن نے ایک ٹیکسی ٹھہرائی اور اس میں اپنا سامان رکھنے لگا۔ باجی ایسے دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں جیسے وہ ان کی دنیا سے باہر کا کوئی فرد تھا اور اس کی کوئی حرکت انکے دل کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتی تھی۔

بغیر ان دونوں سے کچھ کہے وہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی چند گز ہی آگے بڑھی ہوگی کہ اس نے ڈرائیور کی گردن پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا" ٹھہرو"۔

کار کے اندر سے ڈرائیور کے اسے گالی دینے کی آواز سنائی دی جو خاصی دبنگ قسم کی تھی باجی نے کہا" اچھی چڑ چار کی ہے"۔ وہ باجی کے پاس پہنچ کر بولا" معاف کیجئے گا میں آپ کا اور آپ کے دوست کا شکریہ ادا کرنا بھول گیا۔ پہلی تنخواہ میں پوری کی پوری آپ کے حوالے کر دونگا اور اگر کمی رہ گئی تو دوسری بھی"۔

کار کے چلے جانے کے بعد یلدہ کی ٹھہری ہوئی آنکھوں سے پانی بہہ کر گالوں پر پھیل گیا۔ اس نے رندھے ہوئے گلے سے کہا" باجی مجھے معاف کر دو"۔

اس کے بعد محلے میں خبریں اڑتی رہیں کہ ابن حسن پر دونوں بہنوں نے جادو کروایا ہے اور انہی کے اشارے پر وہ انگلینڈ سے بغیر تعلیم مکمل کئے لوٹا ہے۔ بے شرمی کی انتہا تھی کہ اس کی تعلیم چھڑوانے کے لیے انھوں نے واپسی کا کرایہ تک بھیجا تھا۔ ان کے گھر آنے والوں کا تعلق یا تو سفلی علم جاننے والوں کی جماعت سے تھا یا پھر یہ پیسہ انہی کا تھا، اور اگر انہی کا تھا تو کہاں سے آیا تھا

ابن حسن کے چھوٹے بھائی اب کھلم کھلا یلدہ سے دوشمناگی پر اتر آئے تھے۔ کوئی پاس سے ہنستا ہوا گذر جاتا تھا" ایک دن یہ چہرہ ہی نہیں رہے گا جس پہ ناز ہے" اور باجی اور یلدہ جانتی تھیں ایسا ہو سکتا تھا، وہ اس کے چہرے کو بگاڑ سکتے تھے اور لوگ ایسی حرکت کرنے والے کو مجرم نہیں سمجھتے تھے۔ اس قماش کے لوگوں کو معاشرے میں خوددار اور غیرت مند سمجھا جاتا تھا اور ان

کے سراہنے والوں کی بھی کمی نہیں تھی۔

جب ابن حسن نے سوتے میں بولنا شروع کیا تو وہ چونکی جیسے رات بھر سینما کی جو ریل وہ دیکھتی رہی تھی ایک دم اچانک اٹک کر ٹوٹ گئی ہو۔ اسے یلدہ کا خواب نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ اس میں نہ خوابوں کی بے ترتیبی تھی نہ ادھورا پن۔

باہر ابھی اندھیرا تھا مگر صبح کی پہلی چڑیوں نے بولنا شروع کر دیا تھا۔ ابن حسن بستر پر ہاتھ پیر پٹخنے لگا جیسے کوئی اس کا گلا دبا رہا ہو۔ "بنو بکواس بند کرو۔ بنو بکواس بند کرو، میں تمہیں شوٹ کر دونگا، میں تمہیں۔ میں تمہیں"۔

یلدہ نے اسے ہلاتے ہوئے کہا "کیا ہے؟ کیا ہے؟ یہاں بنو کہاں سے آگیا"۔

ابن حسن نے جسم کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے آہستہ آہستہ کہا "قبلتک۔ لنفسی۔ علے المہر المعلوم" جیسے لفظ اس کی زبان سے ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے ہوں۔

وہ پسینے پسینے ہو رہا تھا اور کبھی کبھی خدا کے لیے بنو سے بکواس بند کرنے کے لیے کہتا تھا کبھی "قبلتک لنفسی" کی گردان کرنے لگتا تھا۔ پھر وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگا "خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ، چپ کرو"

جب اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا یلدہ اسے بٹھا کر پانی پلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ آہستہ آہستہ اس کا ہانپنا اور دل کا تیز چلنا کم ہوتا گیا۔ پھر اس نے کمزور سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا

"تم کہاں؟"

"تم نے یہاں بلایا تھا" یلدہ کی آواز میں مجروح سی ہنسی تھی۔

"ہمیشہ کی طرح؟" تھوڑے توقف کے بعد ابن حسن نے کہا

"نہیں نکاح میں قبول کر کے" یلدہ نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "اور اس کا اقرار تم ابھی سوتے میں بھی کر رہے تھے۔"

"اچھا تو وہ گھڑی آکے جا بھی چکی ہے۔" ابن حسن نے آنکھیں مسلتے ہوئے کہا۔

نیند سے بھاری سر کو یلدہ نے اثبات میں ہلایا۔

پھر ابن حسن نے سگریٹ کو لائٹر کی لو دکھائی اور سوچ سوچ کر بولا "میں تمہارے اور اپنے وکیل کے درمیان بیٹھا تھا اور تمہارا وکیل جب بھی میرے وکیل سے موکلتی موکلت، والا سوال کرتا تھا تو بنو بیچ میں بول اٹھتا تھا"۔ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

یلدہ خاموش بیٹھی رہی۔

پھر ابن حسن نے کہا "وہ تو شادی کی تیاریوں میں بھی شریک نہیں ہوا تھا۔ یہ پھول پتیاں تو جواد اور باقر اور میرے دوستوں نے لگائی ہیں۔ پھر وہ خواب میں کہاں سے آگیا تھا۔

میرے سامنے سب وہ لوگ بیٹھے تھے جو وہاں رات موجود تھے۔ تمہاری سہیلیاں، باجی

کے ملنے والے، میرے دوست اور رشتہ داروں کی کمی پوری کرنے کے لیے جو دوستوں کے دوست بلائے گئے تھے، اور نجانے کون کون۔ شاید ان میں سے دوچار وہ بھی تھے جو مر چکے ہیں"۔

یلدہ نے بے ساختہ "یا علی" کہا۔

"ایک تو وہ سجاد تھا جو میرے ساتھ انجینئرنگ میں تھا اور شاید آخری سال میں تھا جب اپنے کمرے میں مرا ہوا پایا گیا تھا۔ اور ہاں ان میں ہمارے دادا بھی تھے جو ایک طرف کو خاموش بیٹھے تھے، کچھ کچھ وہ تمہارے نانا جیسے بھی لگ رہے تھے"۔

یلدہ نے پرخوف سے "یا علی" کہا

"میں نے باجی کو بھی اسی بھیڑ میں دیکھا۔ وہ برابر عورتوں والے حصے سے مردوں کے میں اور مردوں والے سے عورتوں کے حصے میں آجارہی تھیں۔ پھر جب نکاح ہونے لگا تو نجانے کہاں سے آکے بنو میرے وکیل کی پیٹھ پر بیٹھ گیا اور ہر بار جب تمہارا وکیل سوال کرتا تھا تو وہ وہی ایک لفظ کہتا تھا۔

یلدہ خاموش رہی۔

ابن حسن نے کہا "تم پوچھو گی نہیں وہ کیا کہہ رہا تھا؟"

یلدہ کو آنسو اپنے گلے میں پھنستے ہوئے محسوس ہوئے۔ پھر وہ بولی "مجھے معلوم ہے۔ وہ تمہارے ہاں کرنے سے پہلے تمہیں یاد دلا رہا تھا کہ تم ایسی عورت سے شادی کر رہے ہو جس سے تمہاری اماں پردہ کرینگی۔ لیکن وہ تمہیں تو کچھ نہیں کہہ رہا تھا"۔

ابن حسن نے ہمت کر کے پوچھا "تم بھی یہی خواب دیکھ رہی تھیں"۔

"میں سوئی ہی کب تھی" یلدہ نے کہا "لیکن وہ لفظ تو میں تمہاری دو سال کی غیر حاضری میں بھی سنتی آئی ہوں اور اس محلے کے سب لوگوں کو شاید اب میرا ایک ہی نام آتا ہے"۔

پھر اس نے اٹھتے ہوئے کہا "رنڈی۔ یہی نا؟"

ابن حسن خاموش لیٹا رہا۔ اس نے دیکھا یلدہ کھڑکی کی گرل Grill میں سر ٹکا کر آسمان کو دیکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ آسمان میں کچھ کچھ سرخی آچکی تھی۔ یلدہ صحن میں چلی گئی۔

ابن حسن بستر میں پڑا پڑا ذہن میں پچھلے چند ہفتوں کے واقعات کو دہرانے لگا۔ بیماری کے دنوں میں کتنی بار ابا اسکے کمرے میں آئے تھے؟ اور وہ بھی کھڑے کھڑے۔ بھابی اور اماں البتہ باقاعدگی سے آتی رہی تھیں۔ دونوں ہی دعائیں پڑھ کر دم کرنے میں ماہر ہیں۔ بڑے بھیا صرف چوبیس گھنٹے کے لیے گھر آئے تھے، مگر اس کے کمرے میں انھوں نے کتنے گھنٹے گذارے تھے؟ چند منٹ؟ جن میں وہ لاتعلق سے بیٹھے رہے تھے اور جاتے جاتے چوٹ کر گئے تھے کہ "تعلیم مکمل کرنے کے لیے انگلینڈ جانے کا ارادہ ابھی ہے؟" "کیا خیال ہے ان کا؟ بس وہ باہر کی ڈگری لا سکتے تھے دوسرے نہیں؟ بڑی سوچ بچار کے بعد خاندان کے ایک کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی کے لیے اس کا

پیغام بڑی تمکنت کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ لیکن جب وہاں سے بچر بچر ہوئی کہ لڑکا دو سال انگلینڈ میں کیا کرتا رہا اور ان خبروں کی کیا حقیقت تھی کہ اس نے کسی انگریز عورت سے وہاں شادی کی تھی تو بڑے میاں کو ایسا لگا جیسے خود ان میں کسی نے فی نکالی ہو۔

اس کے بعد گھر میں جو خوشی کی رمق آچکی تھی تیزی سے مٹنے لگی۔ ابن حسن نے دن دن بھر گھر سے باہر رہنا اور رات گئے واپس لوٹنا پھر سے شروع کر دیا۔ جس پر ایک دن بڑے میاں نے سنا کر کہا "اجی بس اب گھوڑا تھان پر پہنچنے ہی والا ہے" ابن حسن نے اس کے جواب میں ماں سے کہا "انسان تھا آخر کب تک ڈنگروں کے ہسپتال میں رہتا"۔ اسے امید تھی یہ سن کر بڑے میاں جلبلا اٹھینگے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پر ماں نے پوچھا "یہاں ڈنگروں کے ہسپتال کا ذکر کہاں سے آگیا؟"

"پر تھان پر تو پہنچنے کا تھا؟ یا کہہ دو نہیں تھا۔ میں تو جھوٹا ہوں ہی"

دوسرے کمرے سے بڑے میاں کی آواز آئی "جی جناب یہ ڈنگروں کا ہسپتال ہے۔ انسانوں کے رہنے کی جگہ نہیں"۔

ابن حسن خاموش رہا۔

پھر بڑے میاں نے اپنے کھردرے لہجے میں کہا "اگر یہ ڈنگروں کا ہسپتال ہے تو انسان یہاں کیوں رہیں۔ انکا یہاں کیا کام ہے؟"

پھر اچانک بڑے بھیا اس ماحول سے اپنے بچوں کو دور لے جانے کے لیے ایک دن گھر پہنچے اور انہیں دیکھ کر اماں نے پوچھا "دلہن نے تمہیں چوری سے خط ڈلوایا تھا؟"

"کچھ بھی ہو اماں، مجھ سے کالے چور نے کہا ہو لیکن کچھ دن کے لیے میں بچوں کو یہاں سے لے جانا چاہتا ہوں۔ آپ چاہیں تو آپ اور ابا بھی چلے چلیں"۔

اماں نے کہا "تینوں بچوں کو؟"

"جی"

"بڑے دونوں کی تو پڑھائی کا نقصان ہوگا"

"لیکن انہیں یہاں غلط تعلیم جو مل رہی ہے۔"

اماں خفت سے چپ ہو گئیں۔

گھر پر خاموشی چھا گئی۔ بچوں سے زیادہ، بھابھی کے جانے کا سب کو قلق تھا کیونکہ وہ سگھڑ تھیں، شوہر کو براہ راست خط نہیں لکھتی تھیں، خط کسی بچے کی طرف سے ہوتا تھا جو پوسٹ کیے جانے سے پہلے ساس کو پڑھ کر سنایا جاتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مجلسیں منعقد کراتی تھیں اور سوز خوانی میں بے مثل تھیں۔ ان کے چلے جانے کا الزام بھی ان دونوں بہنوں اور ان کی وجہ سے ابن پر ہی آتا تھا جو گھر کو اجاڑنے پر تلا ہوا تھا۔ جاتے وقت بھابھی اسے دیکھنے تک نہیں

آئیں اور بتول نے آکر کہا" منجھلے بھیا، بھابھی اور بڑے بھیا چلے گئے"۔ جب ابن حسن نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولی" مجھے لگ رہا ہے دونوں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ گھر چھوڑ کر گئے ہیں مع بچوں کے"۔

اس پر ابن حسن نے چیخ کر کہا" تو میں کون سا یہاں بیٹھا رہوں گا۔ جاؤ انہیں بلالو۔ اب گھر کا ماحول ٹھیک ہو جائیگا ابا اور بھیا کی پسند کا"۔ پھر اس نے آواز اونچی کرتے ہوئے کہا" میں یلدہ سے شادی کر رہا ہوں۔ جس کو آنا ہو شادی میں آئے جس کو نہ آنا ہو نہ آئے"۔

تعجب ہے اس اعلان پر نہ گھر میں زلزلہ آیا نہ قیامت ٹوٹی اور جس کونے میں ابا رہتے تھے وہاں سے بجائے کسی قسم کے دورہ پڑنے کی آواز کے سنائی اسے دیا" اجی وہ تو یہاں اسے بیماری لے آئی تھی۔ قسم ہے جناب امیر اگر مجھے ذرا بھی اپنی بیوی کے چال چلن پر شبہہ ہوتا تو میں کہتا کہ ابن ---"

اس پر اماں نے انہیں گھر کر خاموش کر دیا کہ "اپنے آپے میں نہیں ہو"

"شادی وادی کچھ نہیں"۔ ابا بولے" لوٹ کے پھر یہیں آئے گا"۔

(ابن حسن پھیکی سی ہنسی ہنسا)

اسکے بعد دوستوں کے گھر اور ہوٹل میں بسر کی ہوئی راتیں تھیں اور بالآخر اپنے محلے سے دور کے اس محلے میں کرایے پر گھر لینا۔۔۔ جو یلدہ کی واحد شرط تھی۔ اور دوستوں اور دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ اسے آراستہ کرنا جو پتہ نہیں کس کے کہے پر شادی کی تیاریوں میں اس کا ساتھ دے رہے تھے، ابا یا اماں کے؟ تاکہ کچھ تو تعلق رہے ہی۔

گھر چھوڑنے کے بعد جواد بہت جلد اس کے اور اماں کے درمیان رابطہ بن گیا تھا اور مکان سجانے میں بیچ بیچ میں اسے بتاتا جاتا تھا" اماں رو بھی رہی تھیں اور خوش بھی ہیں۔ انھوں نے مجھ سے رازداری کے لہجے میں کہا تھا۔

" آخر میں سب ٹھیک ہو جائیگا"۔

ابن حسن کو معلوم تھا اماں روز ناد علی پڑھتی ہیں اور اب اس کے لیے مولا علی مشکل کشا سے دعا مانگتی ہونگی۔ پہلے ان کی دعا ہوگی یہ لڑکی اس کے دل سے اتر جائے، اب کہتی ہونگی یہ شادی کامیاب رہے اور لڑکا سدھر جائے"۔

اس سب کے باوجود بھی گھر میں سے کوئی شادی میں شریک نہیں ہوا تھا۔ علی جواد اور بنو بھی جو اس کے قدرے مانوس تھے اس کے دولہا بننے کے بعد کہیں غائب ہو گئے تھے۔

شادی کے بعد جب وہ اس کو جو اب اس کی بیوی تھی گھر لے کر آیا تھا تو کچھ دیر تک یلدہ کی کالج کے زمانے کی دوست لڑکیاں گھیرے رہی تھیں اور خود وہ باہر دوستوں میں بہت دیر تک بیٹھا رہا تھا کیونکہ اسے اندر جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ یلدہ اس کے لیے نئی نہیں تھی۔

پھر اس نے اپنے دفتر کے ملازم سے جو نکاح کے وقت گھر پہ پہرا دیتا رہا تھا چائے بنانے کو کہا تھا تاکہ آرام سے بیٹھ کر دن بھر کی تھکن اتار سکے۔

اسی اثنا میں باجی تھوڑی دیر کے لیے آئی تھیں اور یلدہ کے پاس بیٹھی رہی تھیں۔ جاتے وقت انہوں نے ابن حسن سے کہا تھا "اب میں خود دماغ میں ٹک ٹک سننے لگی ہوں اور بم کے پھٹنے سے پہلے ہی چاہتی ہوں اسے ڈی فیوز کرا دوں"۔ پھر باہر جاتے ہوئے انہوں نے ابن حسن کو "گڈ لک" کہا تھا اور باہر سے انکے "خدا حافظ" کی آواز آئی تھی۔

آخری مہمان کے چلے جانے کے بعد اس نے دفتر کے ملازم سے پوچھا تھا "تم کیا کرو گے"۔

"سو رہونگا"۔

"کہاں"؟

"یہیں"

"یہاں تو نہ زاہد بسترا ہے نہ پلنگ۔ گھر جاؤ۔ آرام کرو"۔

اس پر نوکر کے چہرے پر بدمعاشی کی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی اور ابن حسن نے اسے ایک نوٹ دیتے ہوئے کہا تھا۔

"میں دن چڑھے تک سوؤنگا۔ تم دس گیارہ بجے تک آکر بیگم صاحب سے پوچھ لینا کیا منگائینگی۔"

نوکر کے جانے کے گھنٹہ بھر بعد وہ مرے قدموں سے اس کمرے میں آیا تھا جہاں یلدہ ڈبل بیڈ پر دلہن بنی بیٹھی تھی اور اسے دیکھ کر ابن حسن کو ہنسی آگئی تھی اور اس نے کہا تھا "اچھا تو دلہن بن کر تم ایسی نظر آتی ہو"

لیکن جملہ یلدہ نے جیسے سوتے میں سنا اور پوری طرح اس وقت جاگی جب ابن حسن نے ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول کو پیر سے کھینچ کر باہر نکالا تھا۔

جب سر کو جھٹک کر خود کو ہوشیار کر رہی تھی تو ابن حسن نے ٹائی کھولتے ہوئے کہا تھا "تھک نہیں گئیں؟"

"نہیں۔ دماغ ہلکا محسوس ہو رہا ہے"۔ یلدہ نے کہا

"جیسا وقت پر ملنے کی جگہ پر پہنچ جانے پر محسوس ہوتا تھا؟" ابن حسن نے یلدہ ہی کے جملے کو اسے چڑھانے والے لہجے میں کہا تھا۔

یلدہ نے کہا "نہیں دماغ ہلکا اس لیے محسوس ہو رہا ہے کہ وقت پر ملنے کی جگہ پر اب پہنچنا نہیں پڑا کرے گا۔ گھر تم وقت پر آیا کرو گے"

پھر ابن حسن کو قمیص اتارتے دیکھ کر یلدہ نے پوچھا تھا "میں نکال دوں رات کے کپڑے؟"

"تمہیں معلوم ہے کہاں ہیں؟"

اس پر یلدہ نے کہا تھا "میں گھر کی ایک ایک چیز دیکھ چکی ہوں۔ یہ بھی معلوم ہے صبح کی چائے کے لیے پتی، شکر اور دودھ کہاں ہیں"۔

زندگی کے اس بے ہنگم پنے پہ کہ نئی دلہن شادی کی پہلی ہی رات گھر کا کونا کونا دیکھ چکی ہے ابن حسن کو ہنسی آگئی تھی۔ پھر وہ باورچی خانے سے پانی لینے گیا تھا اور جب اپنی گولی کھانے کو تھا تو یلدہ نے پوچھا "کیا کھا رہے ہو؟"

"خود اعتمادی کی گولی" اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

" My Courage pill"

"اب اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"تم کیا جانو ضرورت ہے یا نہیں" ابن حسن نے درشتی کے ساتھ کہا تھا "اپنی ضرورت میں خود سمجھتا ہوں"۔

"اس پر یلدہ نے کہا "اب میں تمہارے ساتھ ہوں"۔

"تم تو ہمیشہ میرے ساتھ بلکہ آس پاس ہو۔ آج کونسی نئی بات ہو گئی" پھر اس نے تلخی سے کہا "میرے لیے تمہارے ساتھ زندگی گذارنے میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ کچھ نیا نہیں ہے۔ تم جانتی ہو شادی کا فیصلہ حقیقت میں کس نے کیا ہے؟"

یلدہ اس کے چہرے کو تکتی رہی۔

"مجھے تم سے شادی کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ ہم ایک دوسرے سے خاصے باقاعدگی سے مل رہے تھے۔

It was a good, simple, carefree easy life.

جیسے پچھلے پانچ چھ سال سے ہوتا چلا آیا ہے آئندہ بھی ہوتا رہتا۔ کبھی ادھوری ملاقاتیں، کبھی پوری، دوستوں کے فلیٹ یا مکان جب ان کے گھر والے نہ ہوں تو ہوتے کس لیے ہیں۔ وہ نہیں تو اگر جیب میں پیسے ہوں تو ہوٹلوں کے کمرے"۔

پھر اس نے ہنستے ہوئے کہا "یہاں کوئی نہیں پوچھتا، آپ میاں بیوی ہیں اور کمرہ کتنی دیر کو چاہیئے؟ بس لباس ٹھیک ہونا چاہیئے اور انگریزی۔ دیسی بولی اور دیسی کپڑوں پر ہوٹل والے بدک جاتے ہیں"۔ اپنی باتوں پر وہ دیر تک ہنستا رہا یہاں تک کہ یلدہ نے پوچھا۔

"تو شادی کا فیصلہ حقیقت میں کس نے کیا تھا؟"

ابن حسن نے اچانک جوش میں آتے ہوئے کہا "یہ شادی ابا کی blessings سے ہو رہی ہے۔ انھوں نے کروائی ہے۔ ان کے اس کہنے نے کہ، اچی شادی وادی کچھ نہیں۔ دونوں بہنیں اسے ساری زندگی لوٹتی رہینگی۔ اس کی کمائی کھائینگی"۔ پھر اس نے چیخ کر کہا "یعنی میں ان کے نزدیک اتنا بڑا گدھا ہوں کہ مجھے کوئی لوٹ سکتا ہے اور وہ بھی زندگی بھر۔ اب ساری بات

سمجھ میں آئی ؟"

یلدہ اسے غور سے دیکھتی رہی ۔ گولی کھاکر ابن حسن نے کہا" تم کپڑے نہیں بدلوگی ؟ بہت رات جاچکی ہے ۔ یہ زیور دیور اتارو اور سو جاؤ ۔ بس بہت دیر دلہن بن لیں" ۔

یہاں تک اسے یاد تھا اور پلنگ تک جانا لیکن اسکے بعد کیا ہوا تھا وہ بالکل بھول چکا تھا ۔

" کیسی عجیب رات تھی" ابن حسن سوچ کر مسکرایا ، اسی کو یار لوگ اتنا بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں! اپنی تو سو کر گذری ؟

اسے دوبارہ نیند آتی جارہی تھی لیکن ڈر رہا تھا دوبارہ وہی خواب نہ شروع ہو جائے جس میں اسے اپنی بے عزتی محسوس ہوئی تھی ۔ سب کے سامنے بنو کا وہ لفظ اس کی بیوی کے لیے ۔ اور کیا بنو وغیرہ اب آپس کی گفتگو میں یلدہ کا ذکر رنڈی بھابھی کہہ کر کیا کرینگے ۔ رنڈی تو وہ اسے پکارتے ہی ہیں ۔ "اگر ایسا ہوا تو سالوں کو شوٹ کر دونگا" ۔

ایک بار جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا یلدہ ہاتھ اٹھائے ٹھیک اماں کی طرح دعائے قنوت پڑھ رہی تھی پھر اس نے اسے رکوع اور سجدے میں جاتے دیکھا اور دوبارہ سو گیا ۔ عورت کا یہ روپ اسے منظور تھا ، اس میں عورت کے ہاتھ سے نکل جانے کا خطرہ نہیں ہوتا ۔

نماز کے بعد یلدہ کھڑکی کے پاس اپنی روکنگ چیئر رکھ کر بیٹھ گئی اور دیر تک اس کے ہتھوں پر پیار بھرے ہاتھ پھیرتی رہی ۔

پھر ایک کھٹکا ہوا اور وہ دروازہ کھولنے چلی گئی ۔ ایک لڑکا جو اس کے پرانے محلے سے تھا ایک تھیلہ لے کر آیا تھا ۔ یلدہ نے پوچھا" کیا ہے ؟"

تھیلہ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے لڑکے نے کہا" آپ کے لیے انھوں کی امی نے بھیجا ہے "

" کس کی ؟" اپنی سماعت کا یقین نہ کرتے ہوئے یلدہ نے پوچھا ۔

" ابن بھائی کی امی نے" ۔

اس نے لڑکے کو اندر بلا لیا ۔ تھیلے میں ناشتے کا سامان تھا ۔ پوریاں ، آلو ، حلوہ اور ایک چھوٹی تھیلی میں خاک شفا کی سجدہ گاہ اور تسبیح اور ایک سالانہ مجلس عزا کا کارڈ جو کسی اور گھرانے کی طرف سے تھا اور جس کے آخر میں مومنین سے پابندی وقت کی درخواست کی گئی تھی ۔ الداعی کو وہ نہیں جانتی تھی ۔ کارڈ یلدہ کے لیے نہیں تھا لیکن اسے بھیج کر زینب بوا نے ایک طرح سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا کہ اگر یلدہ بھی وہاں پہنچ جائے تو وہ اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھ سکتی تھیں ۔

اندر سے ابن حسن نے پوچھا" کون ہے ؟"

" پرانے محلے کا ایک لڑکا"

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا کہ یلدہ کس سے باتیں کر رہی ہے ۔ پھر لڑکے کو دیکھ کر واپس اندر

چلا گیا۔

لڑکے نے کہا "آپ نے پورا گھر دیکھ لیا؟"

یلدہ نے کہا "ہاں"

پھر وہ بولا "آپ کے گھر کی چھت کو بھی رستہ جاتا ہے۔"

یلدہ نے کہا "مجھے معلوم نہیں"

لڑکے نے کہا "مجھے معلوم ہے۔ تب ہی تو کہہ رہا ہوں۔ میں نے ابن بھائی کا سامان لانے میں ہاتھ بٹایا تھا اور یہ مٹکا اور گملے تو میں ہی لایا تھا"۔

جب وہ چائے بنا کر اندر لائی تو ابن حسن نے اٹھ کر گولی نکالنی چاہی۔

یلدہ نے شیشی ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا "تمہاری خود اعتمادی کی گولی؟"

ابن حسن نے "ہاں" میں سر ہلایا۔

یلدہ نے گہری سوچ والے لہجے میں کہا "ان کی ضرورت اب بھی ہے؟"

ابن حسن کی تیوری پر بل پڑ گئے لیکن خاموش رہا۔

"تمہارے اندر اس شادی سے کوئی تبدیلی نہیں آئی؟"

"کیسی تبدیلی؟" ابن حسن نے بھنا کر کہا۔

"جیسی میں محسوس کر رہی ہوں۔ نئی زندگی کے شروع ہونے کی"

"تمہارا خیال ہے تمہاری یہ نئی زندگی ہے؟" ابن حسن نے تلخی سے کہا۔ "نئی زندگی تو تم کب کی شروع کر چکی ہو" یلدہ کو لگا اس پر بجلی گری ہے۔ پھر بجلی گرنے کے بعد کا سناٹا اس کے دماغ اور جسم پر چھا گیا۔

ابن حسن چائے پینے لگا۔ پھر پیالی ہاتھ سے رکھ کر اس نے رات سے پہلی بار یلدہ سے نزدیک ہوتے ہوئے اس کے ایک کندھے کو کس کر پکڑ لیا اور بستر پر گراتے ہوئے بولا "پہلے جو تھوڑی بہت ملنے کی خواہش رہتی تھی شادی نے اس کو بھی ختم کر دیا۔ بس یہ تبدیلی آئی ہے مجھ میں اور کچھ سننا ہے؟"

لیکن یلدہ کا دماغ کہیں اور تھا۔ اس نے ابن حسن کے ایک ہاتھ کو اپنے پیٹ پر اترتے ہوئے دیکھا جیسے وہاں وہ کچھ تلاش کر رہا ہو۔ پھر سیڑھیاں اترنے کی آواز آئی اور وہ ابن حسن کو دھکا دے کر اٹھ بیٹھی۔ لڑکا صحن میں کھڑا اسے بلا رہا تھا۔ یلدہ نے وہیں سے پوچھا۔

"جا رہے ہو؟"

"ہاں۔ دروازہ بند کر لو" لڑکے نے کہا۔

"ٹھہرو میں آتی ہوں"۔

اپنے پرس کو کھکھوڑتی ہوئی وہ باہر نکل آئی۔ صحن میں لڑکا کھڑا تھا۔ وہ بہت خوش تھا

کیونکہ اس کے ہاتھ میں تار پر سے چھٹائی ہوئی پتنگ تھی۔ یلدہ نے اسے پانچ کا نوٹ دیا اور بولی "ان کی اماں سے میرا آداب کہنا"۔ لڑکے نے نوٹ اس کی طرف کرتے ہوئے پوچھا "یہ کاہے کے لیے ہیں؟"

"تمہارا انعام ہے کل کے کام کا"۔

لڑکے کے جانے کے بعد وہ چائے کے برتن اٹھاکر باورچی خانے میں لے گئی اور انہیں دھونے لگی۔ وہ کیا سوچ رہی تھی اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا ابن حسن کہاں ہے۔ سونے کے کمرے میں؟ غسل خانے میں؟ یا باہر کہیں گھومنے گیا ہے؟

اندر ابن حسن نے نئی سگریٹ سلگالی تھی اور گھٹنے پر ٹانگ چڑھائے لیٹا اسے پھونک رہا تھا۔ اس کے پاس یلدہ سے کہنے کے لیے کوئی بات نہ تھی۔

یلدہ کا دماغ بھی خالی تھا جیسے ساری تگ و دو اس کے لیے ختم ہو چکی تھی۔

دفعتاً یلدہ کو ایسا لگا جیسے باورچی خانے کی دیواریں غائب ہو گئی ہیں اور وہ کھلی ہوا میں کھڑی برتن دھو رہی ہے۔ دونوں مکانوں کے بیچ کی جگہ میں بچے کھیل رہے ہیں اور دور میدان سے پرے کوئی بیل گاڑی میں بیٹھا جا رہا ہے۔ کسی راہ گیر نے اسے دیکھ کر ہوا میں ہاتھ ہلایا۔ جواب میں یلدہ نے بھی ہاتھ ہلایا۔ پھر ایک آواز آئی "کھڑکیاں بند کرلو ہوا میں مٹی ہے"۔ یلدہ نے کہا "کھڑکیاں ہیں ہی کہاں جو انہیں بند کروں"۔ "یہ تو اور بھی اچھا ہوا" اسی آدمی نے کہا "ساری مٹی ہوا میں آکر گذر جائے گی"۔ یلدہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

لیکن دوسرے ہی لمحے پیچھے گھومنے پر وہ چونک پڑی کیونکہ ابن حسن دروازے میں کھڑا اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

ابن حسن نے پوچھا "ہنسی کیوں تھیں؟"

یلدہ نے بغیر جواب دیئے اس کے پاس سے نکل جانا چاہا لیکن ابن حسن نے دروازہ گھیرتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارے گھر سے کوئی لینے کے لیے نہیں آئے گا؟"

"گھر میں ہیں ہی کتنے آدمی جو مجھے لینے آئینگے۔ باجی تھکی ہاری سو رہی ہونگی"۔

"پھر ان باقی رسموں کا کیا ہوگا؟ میکے نہیں جاؤ گی؟"

پتہ نہیں ابن حسن کا ان الفاظ کے کہنے سے کیا مقصد تھا۔ حقیقت میں وہ چاہتا تھا کہ اس ایک رات کی بیاہی دلہن کو کوئی اس کے میکے سے لینے آئے یا یہ بھی اس شادی پر طنز تھا جیسے "بس بہت دیر دلہن بن لیں"۔ یلدہ کو لگا ابن حسن نے ایک بار پھر اس پر اپنا پھن مارا ہے اور یہ وہی پھن تھا جس کے اوپر ابھری ہوئی موٹی موٹی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے سے وہ لڑکپن سے اب تک اپنے آپ کو ڈسوانے کے لیے بے بس ہو جاتی رہی تھی۔ اسے خیال آیا، اور شاید ابھی تک

اس بے بسی کے کھیل کو جاری رکھنے کو تیار ہوں،

لیکن وہ خاموش رہی۔

ابن حسن نے باورچی خانے کی کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر باہر ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ دونوں مکانوں کے بیچ کی آبچک نما گلی خاموش پڑی تھی۔ صرف دیوار پر پھیلی ہوئی بیلیں آپس میں رگس کھا کر ہلکی ہلکی آوازیں پیدا کر رہی تھیں پھر یلدہ کسے دیکھ کے ہنسی تھی؟ اسے خیال آیا۔ پھر "کسی کو نہیں"۔ پھر اپنے آپ سے مطمئن ہو کر وہ اسٹول پر بیٹھتے ہوئے بولا "میرا تو خیال ہے دس گیارہ بجے تک اگر خود باجی کو تمہیں تھوڑی دیر کے لیے گھر لے جانا چاہیے"

"تاکہ سسرال والے ٹیکسی سے اترتے ہوئے اپنی بہو کو دیکھ لیں؟" یلدہ نے چوٹ کی

"نہیں میرا خیال ہے شاید یہ بھی کوئی رسم ہوتی ہے۔ میکے جانے کی۔ شادی کے دوسرے یا تیسرے دن"۔

"ہنھ" یلدہ نے چائے کی پتی کو ڈسٹ بن میں ڈالتے ہوئے کہا۔

دونوں ابھی تک ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر تھے اور نزدیک آنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے تھے۔

ابن حسن نے کہا "تم کچھ کھوئی کھوئی سی ہو۔ کیا سوچ رہی ہو؟"

یلدہ نے کچھ نہیں کہا اور سونے کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ ابن حسن دیر تک وہیں باورچی خانے میں بیٹھا رہا۔ بعض لحاظ سے اس کے لیے بھی یہ زندگی نئی تھی اور انوکھی بھی۔ اب اسے ایک اور ہستی کا خیال رکھنا پڑے گا۔ کام کرنے والے لگانے پڑینگے۔ جیسے دھوبی، جمادار، بازار سے سودا لانے والا۔ اور گھر کا خرچہ۔ کیا علت مول لے لی میں نے اس نے ہنستے ہوئے نئی سگریٹ سلگائی۔

بستر میں پڑے پڑے یلدہ کو یہ خیال آیا "آخر یہ میں نے کیا کیا؟ اسے وفاشعاری تو نہیں کہہ سکتے ہیں۔ پھر جانتے بوجھتے کہ وہ کس مزاج کا آدمی ہے میں نے اس کے ایک بار پوچھنے پر اس کے ساتھ زندگی گذارنے کا فیصلہ کیسے کر لیا۔ یہ ٹھیک ہے اس سے پہلے بھی بارہا اس نے کہا تھا جب ہماری شادی ہو جائیگی۔ لیکن یہ بات اس نے کبھی سنجیدگی سے نہیں کہی تھی اور اس دفعہ باپ سے لڑ کر گھر چھوڑ آنے پر اس نے پہلی بار اس کی موجودگی میں باجی سے کہا تھا" میں یلدہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میری طرف سے اور کوئی پیغام دینے والا نہیں ہے اس لیے خود دے رہا ہوں۔ بولیئے آپ کو منظور ہے؟"

باجی کی آنکھیں کچھ دیر کو چچ گئیں۔ پھر انھوں نے یلدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم بولو۔ سوال حقیقت میں تم سے ہے"

اس نے آہستہ سے کہا "جی"

یلدہ کو اپنی اس "جی" پر ہنسی آگئی میں بھی کتنی عقائد میں ڈوبی ہوئی ہوں۔ جی کہتے ہوئے میرے دماغ میں وہی پرانا ایک سوال تھا کہ اگر یہ شادی نہ ہوئی تو ساری زندگی خود کو کبھی معاف نہ کر سکونگی۔ جیسے جو کچھ کھویا تھا اس کے پانے کا یہی ایک ذریعہ تھا۔ ایک مستقل ہارتے ہوئے جواری کا آخری داؤں جس میں اسے امید ہوتی ہے جو کچھ کھویا ہے سب واپس مل جائے گا۔ میں بھی جواری ہوں۔ لگتا ہے آخری داؤں میں بچی کچھی پونجی بھی گنوا بیٹھی۔ باجی سے اگر یہی بات کہونگی تو وہ کہینگی تمہارا یہ عقیدہ بھی روحانیت سے زیادہ مادہ پرستی میں ڈوبا ہوا ہے۔ دنیا کی نظروں میں کچھ سے کچھ بننے کے لیے خود پر سے ایک لیبل چھٹا کر دوسرا لگالیا خود جو بننا چاہتی تھیں۔ اس کے بارے میں تم نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ ابھی بھی کیا بگڑا ہے۔ اب سوچ لو۔ آخری خیال اس کے کان اور دماغ میں باقاعدہ باجی کی آواز میں گونجا۔

اسے سر پر سے بوجھ ہٹتا ہوا محسوس ہوا۔

جب وہ نیند میں ڈوبتی جارہی تھی تو ابن حسن کی آواز آئی "سوگئیں؟"

"نہیں" یلدہ نے تھکی ہوئی آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے بعد میں تو ساری زندگی تمہیں کھانا پکانا ہی ہے، آج کیوں نہ دوپہر کا کھانا چائنیز میں کھایا جائے"

"دن دہاڑے؟"

"کیوں کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔ ہوا تو کچھ نہیں" یلدہ نے کہا اور عجیب سا لگے گا، یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور بالوں کا جوڑا بناتی ہوئی بولی "مجھے تو تم سے بس اندھیری گلیوں، تھرڈ کلاس ریستورانوں اور سنیما ہال کی سب سے پیچھے کی سیٹوں یا بوکس میں ملنے کی عادت ہے"۔

ابن حسن نے ہنستے ہوئے کہا "بابا ملنے کے لیے کون کہہ رہا ہے تم تو میرے ساتھ چلوگی"۔

یلدہ نے کہا "ساتھ جانے کا بھی تجربہ ہے۔ اب بھی جب کبھی وہ جگہ یاد آجاتی ہے۔ تمہارے باپ کا مطب۔ جہاں باہر دروازے پر تالہ لگاتے ہوئے بھی لوگوں کو شبہ ہو گیا تھا اور وہ دروازہ دھڑ دھڑا رہے تھے کہ اندر کوئی ہے تو میری روح کانپنے لگتی ہے۔ پھر کسی نے کہا تھا میں نے محمد نقی صاحب کے لڑکے کو کسی کے ساتھ پچھلے دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا وہ" کسی کو "میں تھی جس کا دل سینے میں دھاڑ دھاڑ کر رہا تھا اور ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ تمہیں یہ سب کچھ یاد ہے؟"

ابن حسن نے سر ہلا کر "نہیں" کہا۔ اس کے ایک دوسرے سے پیوستہ ہونٹ خفگی سے آگے کو نکل آئے۔

"مجھے یاد ہے۔ اس رات کا ایک ایک لمحہ۔ انھوں نے زنگ لگے ہوئے پچھلے چھوٹے

دروازے کو زور زور سے جھنجوڑا اور پھر اس حالت میں بھی جیسے خدا نے میری دعا سن لی۔ کسی بوڑھے آدمی کی آواز آئی "تمہیں مغالطہ ہوا ہوگا۔ یہاں اتنا تو اندھیرا ہے"۔ پھر لوگوں نے کہا "اگر نقی صاحب کے گھر کا کوئی ہوتا تو سامنے سے تالہ کھول کر آتا" اس نوجوان کی بات اب کوئی نہیں سن رہا تھا "میں ان کے منجھلے لڑکے کو پہچانتا ہوں، مغالطہ نہیں" پھر اسی رحمت کے فرشتے نے کہا "چلو چلو" اور ان کے واپس جانے کی آوازیں زمین پر پڑے ہوئے ٹین اور لکڑی کے ٹکڑوں پر دور ہوتی چلی گئیں۔ تمہیں کچھ یاد نہیں؟"

"نہیں" ابن حسن نے جھلا کر کہا

"اور ان کے جانے کے کچھ دیر بعد تم نے مجھے وہاں سے نکالا تھا اور خود اندر چھپے رہے تھے مجھے یہیں، لکڑی اور شیشوں کے ٹکڑوں پر چلتے ہوئے اپنے جوتوں کی آوازیں اتنی زور سے آرہی تھیں جیسے انہیں سن کر سب ابھی واپس یہاں آجائینگے۔ لیکن اگر آ بھی جاتے تو کیا ہوتا۔ میں وہاں ایک Faded brown برقع پہنے ہوئے منہ ڈھکی عورت ہوتی جو وہاں ہونے کا کوئی بھی کامیاب بہانا بنادیتی۔ تم اندر محفوظ تھے۔ مجھے اس رات تمہارے تین بجے دروازے کی کھٹکھٹانے اور پھاٹک کو پیٹنے کی آواز آئی تھی۔ تمہارا ہر کام کتنا ویل پلانڈ ہوتا ہے" لیکن اس نے اچانک غصے میں آتے ہوئے کہا "تمہاری یادداشت کتنی کمزور ہے۔ اس رات اگر ان لوگوں کے ہتھے چڑھ گئے ہوتے تو آج ہر بات یاد ہوتی"۔

اس غیر متوقع جملے سے ابن حسن بوکھلا گیا۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کہا "پھر اگر چائنیز یا کسی اور ریستوران میں کھانے کا ارادہ نہیں ہے تو کھانا پکانے میں مصروف ہوجاؤ نوکر آتا ہوگا۔ پوچھے گا کہ بیگم صاحب کیا چاہئیے۔ ورنہ بازار سے گوشت ترکاری میں لے آتا ہوں۔ پکانا آتا ہے یا تم بھی ان سسری انگلستان والیوں کی طرح ہو؟"

یلدہ چپ بیٹھی رہی جیسے کسی گہری سوچ میں ہو۔

ابن حسن نے کہا "لیکن میرا خیال ہے باجی تمہیں لے جانے آئینگی۔ انہیں اس رسم کا تم سے زیادہ پتہ ہوگا اور دوپہر کا کھانا ہم دونوں وہیں۔۔۔؟"

یلدہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "یہ رسم تو جب ادا ہونی چاہئیے تھی جب تمہارے کہنے کے مطابق میں نے نئی زندگی سالوں پہلے شروع کی تھی۔ کچھ ایسے ہی حقارت میں ڈوبے ہوئے الفاظ تھے۔ لیکن افسوس وہ مجھے تمہارے دوست کے فلیٹ سے گھر لے جانے نہ آسکیں۔ اگر انہیں فلیٹ کا پتہ دے دیتے تو وہ شاید یہ بھی کر گذرتیں اور ان کی ملاقات تمہارے دوست کے گھر والوں سے بھی ہوجاتی"۔ آخری بات اس نے ابن حسن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہی تھی۔

ابن حسن کو یلدہ کے لہجے پر تعجب تھا اور اس سے زیادہ اس کے نظروں سے نظریں ملا کر بات کرنے پر۔ بالآخر اس نے صرف اتنا کہا "تمہارے خیالات میں بڑا انقلاب آگیا ہے"۔

دونوں کچھ دیر خاموش رہے۔ یلدہ نے اٹھ کر بند ڈبے میں نئی استری نکالی اور بے ضرورت کپڑوں پر استری کرنے لگی۔ ابن حسن کے پاس کچھ کہنے کو تھا ہی نہیں۔ یلدہ کے دماغ میں جیسے خیالات کی باڑھ آگئی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کون سی بات پہلے کہے۔ پھر اس نے استری کو کھڑا کیا، سوئچ اوف کیا اور نچنت سی ہو کر بولی "میرا خیال تھا اتنے دن تک ملاقات نہ ہونے کی وجہ سے تم ملنے کے لیے بیتاب ہو گے لیکن پتہ چلا اس قسم کی بیتابی صرف میرے اندر تھی۔"

ابن حسن نے بے حیائی سے ہنستے ہوئے کہا

" What was new in you for me to be بیتاب about? تھک گیا تھا۔ سہاگ رات کو پڑ کر سو گیا"

"جیسے انگلینڈ میں digs میں سوتے تھے؟" یلدہ نے مسہری پر بیٹھتے ہوئے کہا

ابن حسن نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "ادھر آو۔ بتاؤں انگلینڈ میں کیسے سوتا تھا"۔

یلدہ تھوڑا کھسک کر پرے ہو گئی۔

"روٹھ گئیں میری رانی۔ صورت مت بناؤ۔ بری لگتی ہو"

"تمہارے یہ comments میرے کام آئینگے" یلدہ نے اور دور کھسکتے ہوئے کہا

"کون سے؟"

"یہی، بری لگنے کے"

" Don,t be silly"

" I am silly, rather I was silly جو یہاں آج بیٹھی ہوں"

ابن حسن نے سگرٹ سے سگرٹ سلگاتے ہوئے کہا "آج یہاں نہ بیٹھی ہوتیں تو میں تمہیں وفادار نہیں سمجھتا" پھر اس نے جھپٹ کر یلدہ کی گردن کو پکڑنا چاہا، جس طرح اندھیری گلیوں میں اسے پکڑ کر اس کے چہرے کو اپنے چہرے کے مقابل لے آتا تھا۔

یلدہ اٹھ کھڑی ہوئی اور نفرت سے بولی "بہت سوں کے لیے وفا شعاری ایک physical concept ہے۔ جسم سے وابستہ کوئی چیز یا بات۔ مجھے لگ رہا ہے، ہم جیسوں کی شادی بھی چھو منتر کی شادی ہوتی ہے۔ ہوتے ہی سارا پچھلا احساس گناہ غائب۔ اس کی جگہ پاک قسم کی گھر دار بیوی لے لیتی ہے۔ جیسے لوگ گھبراہٹ میں اپنی لڑکیوں کی شادیاں کر بیٹھتے ہیں۔ میرا خیال ہے ویسی ہی شادی میں بھی کر بیٹھی ہوں" پھر اس نے ایک ادھورا قہقہہ لگایا اور بولی "۔ اور میں اتنے سال یہی سمجھتی رہی یہ میری وفاشعاری ہے جو تمہارے لیے بیٹھی ہوں۔ کسی مرد سے کبھی ہاتھ تک نہیں ملایا"

ابن حسن نے بندر کی طرح خوخیا کے کہا

" I hate you, I have always hated you, you are a bitch. One day I will kill you"

یلدہ نے بغیر ڈرے ہوئے کہا "اس کے لیے بھی تمہیں courage pill لینی پڑے گی۔ اس کے بغیر تم کچھ بھی نہیں ہو"۔

"میں گولی کسی اور وجہ سے لیتا ہوں"۔

"اس لیے کہ دوبارہ باپ کے سایہ عاطفت میں نہ پہنچ جاؤ"

ابن حسن نے ہانپتے ہوئے کہا "مجھے provoke مت کرو"

"provoke ہو کر ہی تو تم نے شادی کی ہے۔ باپ کو دکھانے کے لیے کہ تم اتنے بڑے گدھے نہیں ہو جتنا وہ سمجھتے ہیں"۔

ابن حسن جلبلا کر رہ گیا۔

یلدہ نے اٹھ کر ٹھنڈی استری پھر اٹھالی اور اسے اپنے دوپٹے پر پھیرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی "تمہاری شادی کیا ہے خود مختاری کا اعلان۔ وہ تم کر چکے۔ اب آزاد ہو۔ میری طرف سے بھی آزاد۔ میں بھی یہ تجربہ کر چکی لیکن احساس گناہ ختم کرنے کے لیے آزادی جیسی متاعِ گراں گروی رکھنی پڑے گی۔ یہ مجھے معلوم نہیں تھا" اس کی آواز بھرا گئی۔

ابن حسن نے بے وقوفی سے کہا "احساس گناہ کیسا، شادی سے پہلے بھی تم میری تھیں، شادی کے بعد بھی میری ہو، بس یہ کہ انگلینڈ سے لوٹنے کے بعد تم سے ملنا دشوار ہو گیا تھا، غالباً اس کی وجہ باجی ہو نگی۔ ان پر میرا ایر پورٹ والا امپریشن میرا خیال ہے کچھ اچھا نہیں پڑا تھا"۔

یلدہ نے بغیر اس کی طرف دیکھے کہا "تم ابھی کہہ چکے ہو تمہیں مجھ سے محبت و جبت کچھ نہیں ہے۔ تم نے مجھے سڑک کی کتیا کا رتبہ دیا۔ میرا خیال ہے تمہیں بلکہ ہمیں ایک طرح سے ملتے رہنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ دو افیونیوں کی طرح جو نشہ کرتے وقت ایک دوسرے کا ساتھ ڈھونڈتے ہیں اور پھر خاموش پاس پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ گھر جانے کا وقت آجائے۔ بہر حال یہ عادت کبھی نہ کبھی تو ختم ہوتی ہی۔ کیا فرق ہے نکاح سے پہلے یا بعد۔ اس وقت مجھے ایسا لگ رہا ہے اتنے دنوں اس کھیل میں تم نے مجھے اندھا بھینسا بنائے رکھا تھا۔ آج جو تم اندر سے ہوا سے چھو لینے پر میری آنکھوں پر سے پٹی اتری ہے اور اب میں اپنا راستہ خود دیکھ سکتی ہوں۔ مجھے خوشی ہے دوسری عورتوں کی طرح میں جل جل کر شادی کا بھرم ساری زندگی قائم نہیں رکھونگی

"تم احمق ہو"

"نہیں حقیقت پسند۔ شادی کے بعد ہی سہی آج اتنی بات تو میری سمجھ میں آگئی نا اور میں نے اسے مان لیا"

ابن حسن نے خفگی سے کہا "یہ خود سری شادی کے بعد مہنگی پڑتی ہے"۔

یلدہ نے کہا "اور اگر میں اس خود سری کو نہ چھوڑوں"۔

"تو میں تمہیں ۔۔۔"

"طلاق دے سکتے ہو ۔ تم جیسوں کے لیے وہ بھی ایک جسمانی چیز ہے جس کا روح سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے ۔ تمہیں کسی چیز کے ہاتھ سے نکل جانے کا قلق تو ہو سکتا ہے، زندگی میں کسی چیز کے گم ہو جانے کا ملال نہیں ہوتا ۔ لیکن میں طلاق کے لیے بھی تیار ہوں ۔ ہاں تمہیں اس کے لیے اپنی courage pill درکار ہوگی اور دوبارہ اپنے باپ کے سایہ عاطفت میں جانے کے لیے بھی ۔ لیکن کیا حرج ہے ۔ ہزار بار گھر چھوڑ کر واپس آ گئے ، ایک بار اور سہی ۔ بہت سے گھرانوں کے بچے اسی طرح روٹھتے مَنتے رہتے ہیں ۔"

ابن حسن رونے لگا ۔ لیکن رونے میں اسے خلاف توقع یلدہ اپنے سے نزدیک ہوتی ہوئی محسوس نہیں ہوئی جیسا ماں باپ سے جھگڑنے کے بعد ملنے پر ہوتا تھا ۔ نہ ہی جس طرح اسے ابن حسن نے ٹریں کیا تھا اس نے اس کے سر کو اٹھاتے ہوئے اس کی آنکھوں کو پونچھا، پیار کیا ۔

دفعتاً صحن میں ایک ربر کی گیند آن کر گری اور اس کے ساتھ ہی بچوں کے دروازے کو دھڑ دھڑا کر پکارنے کی آوازیں آئیں "ہماری گیند آ گئی ہے ۔ دے دو"

یلدہ نے استری کو واپس ڈبے میں رکھتے ہوئے کہا "ابن اٹھو ۔ بچوں کو گیند دے دو"

"یہ کام تم نہیں کر سکتیں ۔ کھڑی ہو"

"کر سکتی ہوں ۔ لیکن تم بھی بیٹھے سے کھڑے ہو سکتے ہو" یلدہ نے مسہری پر ابن حسن سے پرے بیٹھتے ہوئے کہا ۔

ابن حسن نے کہا "مجھے اشتعال مت دلاؤ نہیں تو ۔۔۔ میں کچھ کر لونگا"

"اور اسکے لیے بھی مجھے کوئی رسم ادا کرنی پڑے گی ۔"

ابن حسن کا رونا ایک دم رک گیا اور اس نے سر اٹھاتے ہوئے پوچھا "کیسی رسم؟"

بچے ابھی تک دروازہ پیٹ رہے تھے ۔ یلدہ نے کہا "پہلے گیند پھینک آؤ پھر بتاتی ہوں"۔

ناچار ابن حسن کو اٹھنا پڑا ۔ اس نے زیر لب یلدہ کو کتیا کہا ، باہر جا کر دروازہ کھول کر بچوں کو گیند دی اور یلدہ نے اسے سختی سے اونچی آواز میں کہتے سنا "اب گیند ادھر نہیں آئے"۔ بچے جی اچھا کہتے ہوئے بھاگ گئے ۔

اندر کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے یلدہ سے دوبارہ پوچھا "کیسی رسم؟"

"ہر موقع کے لیے رسمیں ہوتی ہیں نا ، چوڑیاں توڑنا ، سفید کپڑے ، عدت وغیرہ ، اگر ہندو ہوتی تو تمہارے ساتھ ستی ہو جاتی ۔ لیکن کیا بال بال بچی ہوں ۔ تمہارے ساتھ تو بار بار ستی ہونا پڑتا ۔ یہ سب شادی کی آخری رسومات میں سے ہوتی ہیں ۔ کچھ شادی کی شروع کی رسومات کے بارے میں بھی سننا ہے؟"

ابن حسن نے درشت لہجے میں کہا "نہیں ۔ میں تم سے بھر پایا"

"لیکن میں ابھی تم سے بھر نہیں پائی ہوں ۔ تمہیں میرا سہاگ دن یاد ہے؟"

"نہیں" ابن حسن کے ہونٹ پھر اونٹ کے ہونٹوں کی طرح سامنے کو نکل آئے۔
"وہ جگہ یاد ہے جہاں مجھے تم سے ملنے آنا پڑا تھا؟"
"نہیں" ابن حسن نے کتے کی طرح بھونک کر کہا
"اور تم تو کہتے تھے تم نے اپنے سے بہتر یادداشت والا کوئی شخص زندگی میں نہیں دیکھا۔ اور اب تمہیں وہ سب پلے تنگ اور پروگرام بھی یاد نہیں ہے جس کے لیے میرا خیال تھا تم نے اپنے عقل سے پر دماغ کو کئی روز تھکایا ہوگا۔ لیکن یہ مجھے بعد میں پتہ چلا سب چھپ کر ملنے والے اسی طرح کیا کرتے ہیں۔
"اس کے بعد اندھیری گلیاں، سورج ڈوبنے کے بعد پارکوں کے کونے، سنیما ہال کے بوکس اور گھٹیا قسم کے ہوٹل۔ اور ادھوری اور غیر ادھوری ملاقاتیں"
پھر یلدہ نے جیسے ایک خواب کی الجھی ہوئی تفصیل سے چونک کر ابن حسن کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا
"لاؤ۔ ایک سگریٹ پلاؤ"
ابن حسن نے پھولی مرغی کی طرح کہا "تم سگریٹ نہیں پیو گی۔ کم سے کم میرے سامنے نہیں"
"چھوڑو ابن۔ یہ بھی ہمارے ہاں کی ایک خرافات ہے کہ تم سگریٹ پی سکتے ہو میں نہیں پتہ ہے سگریٹ پیتے ہوئے تم کوئلے سے چلنے والا ریل کا انجن لگتے ہو۔ ہمیشہ سے۔ لیکن یہ بات آج سے پہلے میں تم سے کہتی "شادی بھی بڑے مزے کی چیز ہے آج میں اپنے وہ ہمت پا رہی ہوں جو پہلے مجھ میں نہیں تھی۔ یا تھی تو مجھے اس کا پتہ ہی نہیں تھا۔"
اپنی باجی کی ریس کر رہی ہو" ابن حسن نے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر پکڑاتے ہوئے کہا اور اسی بہانے اس کے پاس آکر بیٹھنا چاہا۔ یلدہ نے کہا "دور سے" اور بڑے اطمینان سے سگرٹ سلگائی۔ ابن حسن کو تعجب ہوا اسے نہ دھسکا لگا نہ اس نے دھوئیں سے آنکھیں پچکائیں۔ ایک بار اس کی دل کی وہی کیفیت ہوئی جب وہ اس سے پوچھتا تھا میٹنگ میں کون کون تھا۔ تم کہاں بیٹھی تھی؟ باجی پورے وقت موجود رہی تھیں یا نہیں؟ اس کی زبان پر ایک سوال آتے آتے رہ گیا پہلے کس کے ساتھ سگرٹ پیتی رہی ہو"
یلدہ کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے دھوئیں کو ہوا میں چھوڑتے ہوئے کہا" ابھی تم اگر نہ آتے تو میں کچھ دیر اور سولیتی۔ پھر بھی اس جھپکی سے خود کو فریش محسوس کر رہی ہوں"
پھر اس نے سر پیچھے کو جھٹکتے ہوئے کہا" کل تک میں تم سے ڈرتی تھی کہ میری ذرا سی غلطی پر تم بیک آؤٹ کر جاؤ گے۔ اب مطلق ڈر نہیں لگ رہا ہے۔ تمہارے سامنے بیٹھی سگریٹ پی رہی ہوں۔ اگر جناب تاج العلماء اور نجانے ان کے نام کے ساتھ کیا کچھ لگنا چاہیئے۔ سید محمد تقی مد ظلہ عالیہ اور تمہاری والدہ اس وقت یہاں ہوتیں تو بھی میں ان کے سامنے اسی طرح ٹانگیں

پھیلائے ایک پر ایک رکھے، ننگے سر سگرٹ پی رہی ہوتی"

ابن حسن نے ایک بار پھر جوش میں آتے ہوئے کہا" مجھے غصہ مت دلاؤ نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا"

یلدہ نے ایش ٹرے میں راکھ جھاڑتے ہوئے کہا" یوں بھی تم سے برا کون ہے"

ابن حسن نے کہا" مجھے provoke مت کرو"

"پھر وہی بات، نہیں تو کیا کرو گے؟"

"سب کچھ کر سکتا ہوں"

"اپنی اماں کے پاس چلے جاؤ گے۔ یہی نا۔" ابن حسن خاموش رہا

"اپنے ابا کے چوٹ کرنے پر تم نے مجھ سے شادی کر کے دکھا دی۔ تم جیت گئے، میری رائے ہے اب گھر لوٹ جاؤ" ابن حسن نے ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگایا۔

یلدہ نے کہا" سنو ابن تم بالکل اپنے باپ پر پڑے ہو۔ انہی کی طرح شکی، ان ہی کی طرح بدمزاج، یہ دوسری بات ہے کہ پھر بھی وہ تمہیں پسند نہیں کرتے۔ میرا خیال ہے انہیں خود سے نفرت ہو گی جو اپنے جیسے سے ان کی نہیں بنتی۔ تمہارے بڑے بھیا سے ان کی خوب پٹتی ہے۔ سنا ہے جوانی میں مجلس حسینؑ یا غم سن کر ان کا دماغی توازن بگڑ جاتا تھا"

ابن حسن نے سنبھالا لیتے ہوئے کہا" میرے باپ کو بیچ میں مت لاؤ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا" یہ کہہ کر وہ شرمندہ ہو گیا۔ یلدہ بولی" کہا نا تم سے برا اور کون ہو گا"

ابن حسن فرش پر پیر پٹخنے لگا۔

رات سے پہلی بار بلکہ جب سے اس کی کور، اس اولین رشوت کے بعد، ابن حسن سے دینے لگی تھی یلدہ نے جوش میں آتے ہوئے کہا" اس وقت باورچی خانے میں کھڑکی سے باہر کیا دیکھ رہے تھے؟"

ابن حسن نے کہا" کس کھڑکی سے؟"

"بنو مت" یلدہ نے پھنکار والے لہجے میں کہا" اور ابھی پیٹ میں کیا ٹٹول رہے تھے؟"

"کس کے"

"میرے اور کس کے"

"کچھ نہیں۔ بس تمہارے پیٹ پر ہاتھ پھیرنا اچھا لگتا ہے"

"جھوٹ مت بولو" یلدہ نے چیخ کر کہا" میرا پیٹ ٹٹولنے کی تمہاری عادت ہے اور میں اسے ہر بار برداشت کرتی رہی ہوں"

ابن حسن سٹپٹا گیا اور بولا" آہستہ بولو۔ پڑوسی کیا کہیں گے۔ کل شادی ہوئی ہے اور آج یہ میاں بیوی چیخ چیخ کر لڑ رہے ہیں"۔

"تم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے کتیا کہا تھا۔ تم نے کتیا کو رات بھر بھونکتے کبھی سنا ہے؟"

معلوم ہے کتنے گھروں میں اس کی آواز جاتی ہے؟"

ابن حسن تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگا۔ یلدہ خاموشی سے سگرٹ پیتی رہی۔
لیکن ابن حسن کا رونا مختصر تھا جیسا پاگلوں کا ہوتا ہے۔ اس نے تکیے سے سر اٹھا کر یلدہ کو دیکھا اور بولا "آج میرے سر کو تھام کر اوپر نہیں اٹھاؤ گی؟"

یلدہ خاموش رہی۔ ابن حسن نے جھنجھلائے ہوئے بچے کی طرح جس کے رونے کو اس کی ماں نہ سن رہی ہو کہا

"اس سے بہتر تو وہ ملاقاتیں تھیں جن میں تم مجھے مناتی تھیں۔ اگر مجھ میں divination کی پاور ہوتی تو ساری زندگی تم سے شادی نہیں کرتا اور تم سدا میرے سیٹی بجانے پر بھاگی آتیں۔ میرا خیال ہے نکاح میں ہاں کر کے میں نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی۔ رشتہ ٹوٹ جانے کا تمہارا وہ خوف ختم ہو گیا جس نے اتنے سال تمہیں میرا وفادار بنائے رکھا تھا۔"

خلاف توقع یلدہ اس پر بھی خاموش رہی۔

ابن حسن کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ اپنی صفائی پیش کرنے لگا: "اس میں نیا کیا ہے والی بات میں نے یوں ہی کہہ دی تھی: تھکا ہوا تھا۔ اصل میں بات یہ ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو اتنے قریب سے دیکھتے رہے ہیں کہ میں نے سوچا جلدی کیا ہے۔ کوئی پبلک پلیس تو ہے نہیں۔۔۔" یہ کہتے کہتے وہ رک گیا۔ کیا وہ اسی بات کو جس نے یلدہ کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی دوسرے الفاظ میں نہیں دہرا رہا تھا!

یلدہ کی مستقل خاموشی سے اوب کر اس نے کہا Come on. let us patch it up آؤ سہاگ رات منائیں۔ یا بقول تمہارے سہاگ دن"

یلدہ کو احساس ہوا ابن حسن کا دماغ بنجر زمین ہے جس میں صرف ایک ہی طرح کی جھاڑیاں اگتی ہے۔ تھوہر کی۔ سہاگ رات کا تصور اس مرد کے نزدیک وہی تھا جو جاہلوں کا وہ سنتی آئی تھی، چند جسمانی حرکتوں کا، جس کے علاوہ نہ وہاں بات کرنے کو کچھ ہوتا ہے نہ مستقبل کے بارے میں ایک دوسرے کی آرزوؤں کو جاننے کی خواہش۔ اور جیسی سہاگ راتوں کا ذکر اس نے جاہل طبقے کی عورتوں سے سنا تھا جن میں سے کھاتے پیتے گھرانوں کی بھی ہوتی تھیں اور گھر کام کرنے آنے والی ماسی کی بیٹی جیسی بھی۔

ماسی کی بیٹی تو پہلے بہت روئی تھی کہ اب واپس نہیں جاؤں گی وہ تو جانور ہے اور خود کو مصروف رکھنے کے لیے شادی سے پہلے کی طرح ماں کا ہاتھ بٹانے کے لیے یلدہ کے گھر آنے لگی تھی۔

ایک دن یلدہ نے اس سے پوچھا "پسند نہیں ہے"

لڑکی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے ہاتھ کا کام رکھ دیا اور کرسی کے پاس یلدہ کے پیروں میں بیٹھ گئی۔ پھر اس نے اپنا سر یلدہ کی رانوں پر رکھ دیا اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

یلدہ نے دوبارہ پوچھا "پسند نہیں ہے؟"

لڑکی نے سر دائیں بائیں ہلایا۔

یلدہ نے پوچھا "کیسا ہے؟"

لڑکی کار وناررک گیا۔ اس نے سر اٹھاکر یلدہ کی آنکھوں میں دیکھا اور بے ساختہ ہنسی سے بولی "بھینسے جیسا" اور شرماکر دوبارہ سر یلدہ کی گود میں چھپالیا۔ یلدہ کو بھی ہنسی آگئی۔

"کالا ہے؟"

لڑکی نے ہاں میں سر ہلایا۔ یلدہ نے کچھ سوچ کر کہا "خیر وہ تو کوئی حرج نہیں ہے۔ کالوں گوروں دونوں ہی میں بدمعاش ہوتے ہیں"

یہ کہتے ہوئے اس کے دماغ میں ایک خیال اٹھا یہ میں اپنی حسن کے لیے کہہ رہی ہوں۔ وہ اور اس کے گھر والے سب کھلتی ہوئی رنگت کے ہیں۔ سب کی آنکھیں نیلی مائل سبز ہیں۔

خیال کو جھٹک کر اس نے کہا "بہت موٹا ہے؟"

لڑکی نے کہا "ہاں" اور پہلے سے بھی زیادہ کھلکھلاکر ہنسی۔

رازداری کے عالم میں یلدہ نے اس سے پوچھا "پہلی رات کیا باتیں ہوئیں؟"

لڑکی نے سر اٹھاکر حیرت سے اس کی آنکھوں میں دیکھا جیسے یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو "باتیں؟ کیسی باتیں"

"جو پہلی رات ہوتی ہیں۔ پیار محبت کی"

لڑکی کے چہرے پر خفگی کے آثار ابھر آئے۔ اس نے درشت لہجے میں کہا "وہ تو جانور ہے جانور۔ جانور کیا بات کرتا"

"سلام دعا بھی نہیں" یلدہ نے پوچھا

"کیسی باتیں کرتی ہیں یلدہ بی بی آپ بھی۔ کبھی سڑکوں پر گائے بھینسوں کا گلا جاتے دیکھا ہے آپ نے؟ انہی میں کا ہے ایک وہ بھی"

یلدہ سوچ میں پڑ گئی۔ جو زبیدہ کہہ رہی تھی سچ لگا۔ خود اس کی حالت کیا ایک خاموشی سے راہ چلتی ہوئی گائے سے بہتر تھی؟

بات ختم ہو چکی تھی۔ لڑکی اپنے کام میں لگ گئی۔

ہفتے بھر بعد اس نے ماسی کو باجی سے کہتے سنا "زبیدہ اپنے گھر چلی گئی" پھر وہ کپڑے نچوڑ کر انہیں الگنی پر ٹانگتے ہوئے جیسے خود سے بولنے لگی "پہلے لڑکا منانے آیا دو تین دفعہ۔ پھر ساس سسر آئے۔ پھر زبیدہ کا باپ اسے ساتھ لوا کے لے گیا۔ وہ بھی سمجھ گئی کون سے ماں باپ ساری زندگی کھلائینگے"

یلدہ کو پہلے زبیدہ پر غصہ آیا۔ پھر اس کی بے بسی پر ترس۔ پھر اپنی بے چارگی پر وہ رونے لگی۔ باجی نے پاس سے گذرتے ہوئے کہا "اس سوسائٹی میں جو لڑکی اپنے پاؤں پر نہیں

کھڑی ہے اس کا بھی حشر ہے۔ تم کیوں روتی ہو۔ آخر اسے وہاں جانا ہی تھا"
زبیدہ کے اور اس کے درمیان کیا باتیں ہوئی تھیں یلدہ اس دن انہیں بتا چکی تھی اور دولہا کی تشریح پر باجی جی کھول کر ہنسی تھیں۔

۱۱ بجے کے قریب دروازے کی گھنٹی بجی۔ ابن حسن کا رونا دھونا ختم ہو چکا تھا۔ دونوں دیر سے خاموش بیٹھے تھے۔ یلدہ کو اپنی جگہ سے ہلتے نہ دیکھ کر وہ بے زاری سے اٹھا۔ تھوڑی دیر میں اسے صحن میں سے ابن حسن کی مصنوعی خوشی کی آواز سنائی دی "باجی آئی ہیں"
وہ ان کے ساتھ ہنستا ہوا کمرے میں داخل ہوا جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے وہاں کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ باجی کے لیے اس نے پنکھے کے عین نیچے ایک کرسی رکھ دی اور ہنس کر یلدہ سے بولا "میں کہہ رہا تھا باجی آئینگی، اور تم کہہ رہی تھیں نہیں"۔ پھر باجی کی طرف سگرٹ کا پیکٹ اور لائٹر بڑھاتے ہوئے اس نے کہا "ہم دونوں شادی کی رسومات کا ذکر کر رہے تھے۔ میں کہہ رہا تھا شادی کی ایک رسم یہ بھی ہوتی ہے کہ دلہن کو اگلی صبح اس کے میکے والے لینے آتے ہیں اور یلدہ کہہ رہی تھی میرے میکے میں باجی کے سوا اور ہے ہی کون اور وہاں بے چاری تھک کر سو رہی ہونگی"
باجی یلدہ کے چہرے کو غور سے دیکھ رہی تھیں جس میں اور ابن حسن کی باتوں میں کوئی مطابقت نہیں تھی۔
یلدہ کی خاموشی سے سٹ پٹا کر ابن حسن نے باجی سے پوچھا "چائے پیئنگی یا کوئی سوفٹ ڈرنک چلے گا"
باجی نے خشک لہجے میں کہا "کچھ نہیں"۔ ابن حسن کی سگرٹ کو وہ پہلے ہی رد کر چکی تھیں

یکایک یلدہ کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے جنہیں ابن حسن نے دیکھا۔ اپنے ناٹک کی ناکامی پر وہ خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔
باجی یلدہ کے پاس آ بیٹھیں اور اس سے بغیر ایک جملہ سنے خود بھی رونے لگیں۔ انہوں نے یلدہ کو سینے سے لگا لیا جیسے رات کی ساری پتا ان کی سمجھ میں آگئی ہو۔ یلدہ پہلے تو ہچکیاں لے لے کر روتی رہی پھر جب اس کا رونا تھما تو باجی نے پوچھا "آخر ہوا کیا؟ وہی روٹھنا، اکڑنا اور تمہارا امنانا؟"
یلدہ نے سر اٹھا کر انکی آنکھوں میں دیکھا اور بولی "باجی مجھے معاف کر دو۔ کاش تمہارا کہنا میں نے سالوں پہلے سن لیا ہوتا۔"
باجی نے کہا "وہ تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ اس نے تمہیں ہپنوٹائز کر رکھا ہے۔ آج سے نہیں بچپن سے اور تم اس کے اشارے پر ناچتی رہی ہو۔ پہلے اپنے اور اس کے گھر اور محلے میں اور بڑے ہو جانے پر جب محلے والوں نے ہمیں نکو بنا دیا تو یہاں وہاں اس نے تمہیں پورے شہر میں دوڑائے رکھا: آج اس لائبریری میں ملو، کل فلاں بک اسٹال پر یا کلب میں۔ کتنے کام اس نے تم

سے لیے ہیں ان کا کوئی حساب ہے۔ اس کے کہنے پر تم نے اپنی ڈگری سے فائدہ نہیں اٹھایا نہیں تو کچھ کر رہی ہوتیں۔ اس کے کہے سے، میں کہتی رہی، اور تم نے ایم۔ ایس۔ سی نہیں کیا ورنہ اس آئی کیو۔ پر تم کہیں لیکچرر لگی ہوتیں۔ وہ ماں باپ سے لڑتا تھا، روٹھتا تھا اور اسے منانے کا کام تمہارا تھا"

یلدہ ان کی گود میں سر رکھے ان کی باتیں سنتی رہی۔ پھر باجی نے گلوگیر آواز میں کہا" وہ لندن سے واپسی پر اس کا ایر پورٹ کا سین یاد ہے؟ تم بیچ میں نہ ہوتیں تو میں اس دن بھی جس دن وہ شادی کا پیغام لے کر آیا تھا اسے اپنے گھر میں نہ گھسنے دیتی۔ بیچارے حبیب صاحب۔ میں آج تک ان کی مقروض ہوں"

یلدہ نے گود سے اٹھتے ہوئے کہا" سچ؟۔ آپ نے مجھے نہیں بتایا"

" بتاتی کیا؟ یہ کہ ایک نہایت mediocre انسان کو جو انگلینڈ میں دو سال رہ کر کوئی تیر نہیں مار پایا اور جو وہاں ہر طرح کی عیاشی میں گھرا ہوا ہے تم میرے خرچے پر وہاں سے واپس بلا رہی ہو۔ یہ سب باتیں تمہیں پتہ تھیں اور یہ بھی کہ ان دنوں میرے پاس اتنے روپے نہیں تھے اور حبیب صاحب سے مدد مانگنی پڑی تھی۔ میرے لیے وہ، وہ نہیں ہیں، جو تمہارے لیے ابن حسن ہے لیکن ہیرہ آدمی ہیں۔ آج تک میری لاکھ التجا کے باوجود وہ اس رقم کو واپس لینے کو تیار نہیں۔

"اور ادھر ابن حسن ہے جس نے شاید تمہیں آج تک ایک پیتل کی انگوٹھی بھی نہیں دی وہ صرف تمہیں دوڑا تا رہا ہے۔ میرا خیال نہیں اسے تم سے محبت ہے۔ تم اس کی شاید کوئی نفسیاتی ضرورت پوری کر رہی ہو"۔

"نفسیاتی نہیں" یلدہ نے بڑی ہمت سے کام لے کر کہا "نفسانی"۔

باجی کا منہ پھٹنے کا پھٹا رہ گیا۔ یہ خطرہ انہیں یلدہ کی ذات سے نہیں تھا۔ یلدہ پھر بلک بلک کر رونے لگی" مجھ پر اس کا خوف اس زمانے سے طاری ہے جب میں نے سائیکل چلانی سیکھی تھی"

باجی نے اپنے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہا" معافی مجھے تم سے مانگنی چاہیئے۔ میں نے اپنے کاموں میں پڑ کر تمہیں گائیڈ کرنے میں کوتاہی برتی"

آنسوؤں کے بیچ وہ باجی کو اس طلسم کے ٹکڑے ادھر ادھر سے ایک ایک دو دو لفظوں میں سناتی رہی۔ ان ادھورے جملوں کو سمجھنا باجی کے لیے دشوار نہ تھا۔ انہوں نے اپنے اور یلدہ کے آنسو پونچھتے ہوئے دو ایک بار بیچ میں کہا۔

" you poor girl"

جتنی دیر یلدہ اپنی داستان غم سناتی رہی وہ پرانی یلدہ تھی: سدا خوف زدہ، کم گو، حزن کی تصویر، لیکن یکایک اس کے اندر وہ ہمت، وہ غصہ اور وہ بے باکی لوٹ آئی جو وہ صبح سے اپنے اندر

محسوس کر رہی تھی ۔ وہ اٹھ کر باجی کے کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھ گئی اور اپنی چوٹی کا جوڑا باندھتے ہوئے مضبوط آواز سے بولی ۔

" لیکن یہ طلسم اب ٹوٹ چکا ہے ۔ خود میرا اس میں اعتقاد تھا کہ پاکیزگی ایک کھال کے ٹکڑے کا نام ہے اور جب کوئی اس سے ہاتھ دھو بیٹھے تو اس کے لیے دوسری سب سے بہتر بات شاید پاکیزگی کو دوبارہ حاصل کرنے کی یہی رہ جاتی ہے کہ اپنی زندگی اس کے سپرد کر دے جس نے اسے deflorate کیا ہے ۔ اس لیے مجھے بھی اس ابتلا سے گذرنا پڑا یہ جانتے ہوئے بھی کہ جو وہ ہے ، ہے ۔ تمہیں معلوم ہے یہاں رات کیا ہوا ہے ؟"

باجی اب تک سامنے کی ننگی دیوار کو دیکھ رہی تھیں ۔ انہوں نے گردن گھما کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا ۔

" وہ تمہارے سب کے چلے جانے کے بہت دیر بعد تھکے تھکے قدموں سے کمرے میں اس طرح داخل ہوا جیسے حجلہ عروسی میں نہیں جوا کھیل کر اور شراب پی کر اپنی اندھیری کوٹھری میں جھلنگے پلنگ پر گر کر سونے جا رہا ہو "

" اس نے تم سے کچھ کہا نہیں ؟"

" ہاں کہا تھا " یلدہ نے تازہ یادداشت کے جوش سے کہا " اچھا تو تم دلہن بن کر ایسی نظر آتی ہو " اور پھر اپنی نیند کی گولی کھا کر کہا تھا " تم کپڑے نہیں بدلو گی ، بہت رات جا چکی ہے ۔ یہ زیور پورا اتار دو اور سو جاؤ ۔ بس بہت دیر دلہن بن لیں ۔ "

" اس کے سو جانے کے بعد میں نے قل ھو اللہ پڑھ کر پنجتن پاک اور بارہ اماموں کے نام لے کر بیٹھے بیٹھے سونا چاہا کیونکہ وہ پلنگ پر ترچھا پڑا ہوا تھا اور میرے لیٹنے کو کوئی جگہ نہیں چھوڑی تھی ۔ لیکن نیند آنکھوں سے دور تھی ۔ میں نے رات دعائیں مانگتے گذاری ان تمام الفاظ میں جو بچپن میں اماں اور بعد میں نانا سے سنتی آئی تھی ۔ خدا کو رسول اور بارہ اماموں اور چودہ معصوموں کا واسطہ دے کر کہ میری نئی زندگی کامیاب رہے ۔ ابن بدل جائے اور میں اگر شادی سے پہلے خود کو اپنی نظروں میں گرا چکی تھی تو اوروں کے لیے نہ سہی خود اپنی نظروں میں میرا وقار بحال ہو جائے ۔ جس نے مجھے تاخت و تاراج کیا تھا اسی واحد شخص کی میں آج عزت ہوں ۔ میں سمجھوں میں نے کسی کی زندگی بنا دی ۔ نعوذ باللہ " اس نے کانوں کی لوؤں کو پکڑتے ہوئے کہا " کسی کی زندگی کو بنانے میں ایک اہم کردار کا رول ادا کیا "

باجی خاموش بیٹھی اس کی باتیں سنتی رہیں ۔

دونوں کو معلوم تھا ابن حسن برآمدے میں کھڑا ان کی باتیں سن رہا ہو گا جو اس کی پرانی عادت تھی ۔ لیکن باجی کے آواز کو دھیما کرنے کے اشارے پر یلدہ نے اچانک اپنی آواز اور بلند کر دی " اب میری سمجھ میں آیا لوگ ٹوٹ جانے پر چپل کے اوپر کے اسٹریپ کو کیوں اتنی اہمیت دیتے ہیں ۔ اس لیے نہیں کہ اس کے بغیر چپل پیر میں ٹکے گی ہی نہیں بلکہ اس لیے کہ سب چپل کو

پیر کی انگلیوں سے گھسیٹ کر چلنے والے کی طرف دیکھنے لگتے ہیں کہ اس کے پاس چپل ہے تو۔ حالانکہ اس کا آسان علاج یہ ہے کہ آدمی ننگے پیر ہو جائے"

" you are a funny girl" ۔ باجی نے کہا" تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں"

ابن حسن کمرے میں داخل ہو کر پنکھے کے نیچے رکھی ہوئی کرسی پر اس طرح اکڑ کر بیٹھ گیا جیسے کہہ رہا ہو" اب بولو کیا کہہ رہی تھیں۔"

باجی مسہری کے سرہانے کی لکڑی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں اور یلدہ ان کے بالمقابل پائنتی کی ٹیک سے۔

" باجی تمہیں چنبیلی بوا یاد ہیں جو ہر بات پنجتن کے صدقے سے کرتی تھیں اور جن سے ایک بار جب وہ اپنے رینٹ بیتے ہوئے لڑکے کو پاس بلا رہی تھیں کہ آکر ناک پونچھوا لے، اور وہ سن نہیں رہا تھا، میں نے کہا تھا" چنبیلی بوا کہو پنجتن کے صدقے میں"

باجی ہنس پڑیں" ان کا ذکر یہاں کیسے آگیا؟"

" وہ ایسے" یلدہ نے ابن حسن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا" کہ رات جب ابن پلنگ پر گر کر سو گیا تو مجھے خیال آیا جب چنبیلی بوا کا میاں جو سنا تھا ہمیشہ جیل میں رہتا ہے پہلی رات حجلہ عروسی میں آیا ہو گا گلے میں موتیا کے گنٹھے ڈالے، کلائیوں میں موتیا کی پہنچیاں تھنے اور آکر ان کے پاس ڈھیر ہو گیا ہو گا تو انہوں نے کیا کہا ہو گا، مجھ سے تو وہ ہمیشہ کہتی تھیں سونے سے پہلے قل ھو اللہ پڑھا کرو اور پنجتن پاک اور بارہ اماموں کے نام ۔ ۔ ۔ ۔"

ابن حسن نے خفگی سے کہا" تو صبح صبح نماز پڑھنے کا یہ سب ڈھونگ تھا۔ باجی نے تمہیں بھی دہریا بنا دیا ہے" ۔

" تمہارے لیے ڈھونگ ہو سکتا ہے، تمہیں ایسا کہنے کا اختیار ہے لیکن میری رات کی دعائیں قبول ہوئی ہیں۔ میرے لیے صبح تازگی لے کر آئی ہے۔ اس نے میرے اندر کی پاکیزگی کو جگا دیا ہے۔ میں پہلے ایک واہمے میں گرفتار تھی کہ میرا نصیب یہ ہے کہ تم سے شادی کروں، تمہارے ساتھ رہوں اور بھول جاؤں کہ تم سے سوا بھی کوئی دنیا ہے۔ شادی نے مجھے آزاد کر دیا ہے اور دعا کی قبولیت کسے کہتے ہیں!"

پھر اس نے باجی کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا" مجھے لگتا ہے کہ اتنے سال میں گرفتاری دینے کی تیاری کر رہی تھی جیسے لوگ سیاست میں کرتے ہیں۔ پھر گرفتاری ہوئی جس میں یہ تصور پنہاں ہوتا ہے کہ عافیت اسی قید میں ہے۔ یہیں عمر بھر رہو۔ دل کا کیا ہے لگے نہ لگے لیکن آج خود کو جسمانی طور سے گرفتار کرانے کے بعد ایسا لگ رہا ہے میں ذہنی طور سے آزاد ہوئی ہوں"۔

باجی خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہیں آخر اس کی گفتگو کا یہ انداز اسے لیے کہاں جا رہا تھا۔ کیا وہ ۔ ۔ ۔ ۔؟"

یلدہ جیسے خود سے بول رہی تھی" وہ کیفیت جو نکاح کے ہاں کے بعد ہمیں اپنی گرفت میں لے لیتی ہے کہ اب کچھ ممکن نہیں۔ پرانی زندگی گئی یہ ایک کٹ آوف پوائنٹ ہے، اس کے بعد جو زندگی ہے وہ نئی طرح کی ہے۔۔۔ اس وقت تک جب آدمی اس نرک کو جھیلے، پھر روٹھے، گھر جا بیٹھے، لڑنا، منانا، منایا جانا، لوگوں کا بیچ میں پڑنا، علیحدگی، طلاق، جہیز اور مہر کے لیے مقدمہ اور بالآخر یہ فیصلہ کہ اس نئی زندگی سے رہائی ناممکن ہے۔ یہی عناصر ہیں ناشادی شدہ زندگی کے؟" اچانک اس نے باجی سے سوال کیا۔"

"میں تمہاری باتیں سن رہی ہوں"۔ وہ سوچ رہی تھیں کیا یلدہ کسی نتیجے پر پہنچ چکی ہے۔ شاید، مکمل طور سے نہیں۔ تب ہی وہ اپنے فیصلے کی دفاع میں دلیلوں کے پرے کے پرے لے کر آرہی ہے۔ جس طرح لوگ اپنے اور ادھ بنے فیصلوں پر خود یقین لے آنے کے لیے اپنی بات کو بار بار دہراتے ہیں۔

لیکن باجی کے جواب کا انتظار کئے بغیر یلدہ نے کہا" لیکن میں تو آج جاگی ہوں۔ کٹ آف پوائنٹ تو یہ ہے۔ وہ چیز جسے میں وفاداری سمجھ کر نباہ رہی تھی میری نیند تھی"

ابن حسن کبھی دونوں بہنوں میں سے ایک کو دیکھتا تھا، کبھی دوسری کو، اسے لگ رہا تھا دونوں مل کر اس کے خلاف کوئی سازش کر رہی ہیں۔ اس کا سارا کیا چٹھا یلدہ باجی کے سامنے رکھ چکی تھی۔

یلدہ نے میز پر رکھا ہوا سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا اور اس سے کھیلتی ہوئی بولی۔

"پھر میں آج جاگ اٹھی۔ وہ وفاداری نہیں تھی ہماری سوسائٹی کا وہ hypocritic norm تھا۔ جھوٹا عقیدہ۔ جیسے کسی گھر کے بارے میں مشہور ہو جاتا ہے کہ وہ کیلا ہوا ہے، اس میں کیلیں گاڑھی گئی ہیں، جس میں چولھے سے تعویذ نکلتے ہیں جس میں بدروحیں بستی ہیں، جہاں لوگ نافیں ملواتے ہیں اور لوگ ان باتوں پر ایمان کی حد تک یقین رکھتے ہیں۔ میں بھی ایسے ہی ایک عقیدے کی لپیٹ میں آگئی تھی۔ جیسے مجھ پر بھی اوپرا اثر ہو۔ آج برتن دھوتے ہوئے جب میں نے کھڑکی کھول کر دیکھا تو مجھے وہ گلیاں جن میں میں سر جھکائے چلتی تھی بڑی کھلی لگیں۔ میں نے ایک گاڑی بان کو ہاتھ ہلایا۔ جواب میں اس نے بھی ہاتھ ہلایا، دن کی روشنی میں۔۔۔،

"تمہیں کسی غیر مرد کو ہاتھ ہلانے کا اختیار نہیں تھا" ابن حسن بڑبڑایا

"میں نے اس سے پوچھا کہاں جا رہے ہو؟"۔ اس نے کہا ادھورے ہی۔ پرے نہیں؟، میں نے ہنس کر کہا محض بات کو جاری رکھنے کی خاطر۔ لیکن وہ آگے بڑھ چکا تھا"

ابن حسن کو ایک دم پسینہ چھوٹنے لگا۔ اس کا چہرہ اور سرخ ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ باورچی خانے میں تو ایسی کوئی کھڑکی یا دروازہ نہیں تھا جو سڑک پر کھلتا ہو۔ صرف وہی ایک کھڑکی تھی جو دو مکانوں کے درمیان کی پتلی گلی میں کھلتی ہے جس میں دو فربہ آدمی کندھے سے کندھا ملا کر نہیں چل سکتے۔ اس میں بیل گاڑی کیسے گذرنے لگی۔ کیا اس کا دماغ صحیح کام کر رہا تھا؟

یا دونوں بہنیں مل کر اسے پاگل بنارہی تھیں۔

ابن حسن کی غیر ہوتی ہوئی حالت سے بے خبر یلدہ نے اپنی بات جاری رکھی " پھر ایک اور گاڑی بان میرے سامنے سے گذرا۔ میں نے اس سے بھی ہاتھ ہلا کر پوچھنا چاہا کہاں جارہے ہو؟ لیکن وہ بیلوں کو اپنی راہ پر چلتا چھوڑ کر گاڑی سے کود کر اترا اور بھاگتا ہوا کچن کی کھڑکی تک آیا۔ اس کے ہاتھ میں مٹی کی چھوٹی چلم تھی جسے کچھ لوگ سلفی کہتے ہیں۔ اس نے کہا

" اماں تھوڑی آگ ملے گی "

" میں نے کہا، یہاں آگ کہاں "

تمہارے گھر کھانا نہیں پکتا؟ "

" نہیں پک تو سکتا ہے " میں نے اس کے تجسس اور تعجب کو بھڑکانے کے لیے کہا

" کیوں پکتا نہیں ہے؟ "

" نہیں پکا کر تا شاید "

وہ خاموش کھڑا مجھے دیکھتا رہا۔ جتنی دیر اس نے مجھ سے بات کی تھی اتنی دیر وہ چلم میں سے جمی ہوئی کلوںچ اور راکھ کو کھرچتا رہا تھا۔

" میں نے کہا " نہیں۔ شاید پکا کرتا لیکن گیس یا بجلی کے چولھے پر "

" اب نہیں پکے گا؟ "

" نہیں "

باجی کے دماغ میں وہی خیال پھر سے آیا: یلدہ اپنے فیصلے کو تقویت پہنچا رہی ہے۔

" پھر تم کب کھاؤگی؟ " اس نے چلم کو منھ میں سے پھونک مار کر دھول کو اڑایا۔ میں خاموش رہی۔ پھر اس نے چلم کے منھ کو منھ میں لے کر دو تین پھونکیں ماریں۔ ابھی میں اس کے سوال کا جواب سوچ رہی تھی کہ وہ بغیر کچھ کہے سنے وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بیل کافی آگے نکل گئے تھے۔ میرے ہاتھ چلتے چلتے رک گئے تھے "

ابن حسن باہر برآمدے میں جا کر اتنی دور بیٹھ گیا کہ یلدہ کی آواز اس تک نہ پہنچے اور سگریٹ پھونکنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ہوش میں نہیں ہے یا یلدہ ہوش و حواس کھو بیٹھی ہے۔ اس کے کپڑے پسینے سے بھیگ گئے تھے، جیسا کبھی کبھی زیادہ خود اعتمادی کی گولیاں لینے پر ہوا کرتا تھا۔ لیکن جہاں وہ بیٹھا تھا وہاں بھی دونوں بہنوں کی باتیں اسے کچھ کچھ سنائی دے رہی تھیں، اب یلدہ سے زیادہ باجی بول رہی تھیں۔ یہ نہیں کہ انہوں نے آواز کو دھیما کر لیا تھا بس یہ تھا کہ وہ ان کی باتوں کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

پھر اس نے باجی کو کمرے کے دروازے سے باہر نکلتے دیکھا اور بغیر ارادہ سر اٹھا کر کہا

" آپ یلدہ کو لینے نہیں آئی ہیں؟ "

" کیوں؟ "

"رسم ہوتی ہے نا"

"ڈیم دی رسم" باجی نے کھرے لہجے میں کہا۔ پھر پلٹ کر دروازے میں کھڑے کھڑے سر ادھر کو گھما کر جدھر مسہری پر یلدہ بیٹھی تھی کہا "give it a good thought" اور پرس کو سینے سے لگائے، ابن حسن سے بغیر ایک لفظ کہے، گھر سے نکل گئیں۔

باجی کے جانے کے بعد گھر پر قبرستان کا سا سناٹا چھا گیا۔ ابن حسن نے پیر پھیلانے کے لیے اپنے سامنے برآمدے میں ایک کرسی رکھ لی تھی اور وقفے وقفے سے سگریٹ پھونک رہا تھا۔ یلدہ اندر مسہری پر پیر پر پیر چڑھائے لیٹی تھی۔ ابن حسن کو بھوک لگنی شروع ہوئی کیونکہ صبح کا حلوہ اور پوریاں کب کے ہضم ہو چکے تھے۔ وہ چاہ رہا تھا یلدہ خود آکر اس سے کہیں چلنے کے لیے کہے یا کم سے کم اتنا ہی کہدے بازار سے انڈے اور ڈبل روٹی لے آؤ میں سینڈوچ بنالونگی، اگر وہ اتنا کہہ دے تو میں کہونگا شام کو کہیں باہر کھائینگے۔ اس کے خیال میں یلدہ کے دماغ میں آیا ہوا طوفان باجی کے چلے جانے پر تھم گیا تھا ورنہ وہ جاتے وقت Give it a good thought والی بات کہہ کر کیوں جاتیں۔

آخر ش جب اسے خالی پیٹ پر سگریٹ بری لگنے لگی اور بھوک اس پر غالب آگئی تو اس سے یلدہ کے پاس جائے بنا نہیں رہا گیا۔ مسہری سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر اس نے کہا "کسی ریستوران چلنے کا ارادہ نہیں ہے؟ بھوک تو تمہیں بھی ستا رہی ہوگی" یلدہ کی خاموشی نہیں ٹوٹی۔ ابن حسن نے کہا "میرا تو برا حال ہے"

"میرا نہیں۔ میں کچھ اور سوچ رہی ہوں"

"کیا؟" ابن حسن کو لگا اس کے دل کی دھڑکنوں میں سے ایک غائب ہوئی اور پھر دل تیزی سے چلنے لگا۔

"تمہارا میرا تھوڑی دیر کا اور ساتھ ہے کیوں نہ ہم دو باتیں سکون سے کر لیں"

"ساتھ تو زندگی بھر کا ہے۔ پہلے کھانا ہو جائے پھر باتیں سکون سے کر لینا"

یلدہ نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولی "مغرب میں میں نے سنا ہے اور پڑھا بھی ہے ہونے والے میاں بیوی شادی کے لیے کہتے ہیں" اسے ایک موقع دے کر دیکھینگے" محبت میں گرفتار لڑکی اپنے دل میں کہتی ہے۔

I will give it a try اور لڑکے کے دل میں بھی یہی ہوتا ہے کیونکہ دونوں ایک دوسرے پر مکمل اعتماد نہیں کر سکتے ہیں۔ ان باتوں کو تو تم مجھ سے زیادہ جانتے ہوگے کیونکہ وہاں رہے ہو اور اگر کسی انگریز عورت سے جو عمر میں تم سے بڑی تھی تم نے شادی کی تھی تو اس کا ذاتی تجربہ بھی ہوگا"

ابن حسن نے یلدہ کا بات کاٹتے ہوئے کہا" جس کی چاہے قسم لے لو میں نے کسی انگریز عورت سے شادی نہیں کی تھی ۔ تم پہلی عورت ہو"

یلدہ نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا" مشرق میں پیغام کا دیا جانا اور اس پر ہاں کر لینا ایک ایسا فعل ہے جس کی تکمیل ہو چکی ہو fait accompli ۔ جس پر مزید بحث نہیں کی جا سکتی ۔ ایک نئے خاندان کو مکمل طور سے قبول کر لینا، اس کا ایک حصہ بن جانا، شوہر اور بچوں کے لیے جینا ۔ کون صحیح ہے مغرب یا مشرق یہ میں نہیں جانتی لیکن میں وہ نہیں بن پاؤں گی جو تمہاری ماں ہیں، بھابھی ہیں، بڑی بہن ہیں" اس نے گھر پر چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے کہا" کیا شادی ہمیں ایک دوسرے سے نزدیک لے آئی ہے؟ اور اگر نزدیک لے آئی ہے تو کتنا؟"

وہ خالی الذہن نظر آ رہا تھا ۔ کچھ کچھ آخری بڑے داؤں کے بعد کے ہارے ہوئے جواری جیسا

" دو دلوں کو ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے انتہائی نزدیک لے آنے کے لیے جس طرح ایک لمبی تنہائی درکار ہوتی ہے جس میں کسی کے آنے کا کھٹکا نہ ہو اسی طرح دو دلوں کو ایک دوسرے سے ذہنی طور پر سے ہمیشہ کے لیے دور کر دینے کے لیے ایک لمبی تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے جس میں کسی چیز کی فکر نہ ہو ۔ کسی کے آنے کا کھٹکا نہ ہو ۔ اتنے قریب سے میں نے تمہیں آج پہلی بار دیکھا ہے"

" تمہاری ساری خفگی اس گلے ہے کہ میں سہاگ رات کو پڑ کر سو گیا" ابن حسن نے احمق پنے سے کہا" لیکن بابا یہ باتیں تو کھانے کے بعد بھی ہو سکتی ہیں"

" وہ جب نا جب میں یہاں تکوں گی" یلدہ نے خفگی سے کہا

" کیا مطلب ہے تمہارا ۔ میری مرضی کے بغیر تم کہیں نہیں جا سکتیں" ابن حسن نے پرانے جوش سے کہا" حتیٰ کہ اپنے میکے بھی نہیں" پھر اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا" ابا صحیح کہتے ہیں گربہ کشتن روز اول ۔ اتنی فارسی تم بھی سمجھتی ہوگی ۔ بیوی بھی بلی ہی کی طرح ہوتی ہے ۔ اسے بھی پہلی ہی رات ۔ ۔ ۔"

غصے سے یلدہ کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا ۔ اس نے مسہری پر بیٹھتے ہوئے کہا" تمہارے لیے سہاگ رات کا مطلب صرف جنس ہے"

"ہاں میں نے یہی سنا تھا ۔ اور شادی ہے کس چیز کا نام"

اس ننگے جواب نے یلدہ کو تھوڑی دیر کے لیے لاجواب کر دیا ۔

یہ اچانک وہ کہاں نکل آئی تھی ۔ چل تو وہ اس راستے پر عرصہ سے رہی تھی اور اپنے ہمراہ سے بھی واقف تھی لیکن سب کچھ جانتے ہوئے انجان بنی رہی اور اب جب منزل آگئی تھی تو اسے احساس ہوا کہ ہمراہ کی اسے ضرورت نہیں تھی ۔ اور ابن حسن جو اب وہ کہاں جائے گا ۔ اسی اپنے پرانے راستے پر واپس ۔ اور وہاں سے کسی اور کے ساتھ نئے سفر پر ۔ پھر اسے خیال آیا، خود میں

کہاں جاؤ نگی۔ کسی نئی منزل کی طرف۔ بغیر کسی ہمراہ کے۔ کیا اپنے اندر کی سوئی ہوئی عورت کو جگانے کے لیے ہی میں اتنے دن ابن کے ساتھ چپکی رہی"

اچانک اس نے فیصلہ کن آواز میں کہا" ابن میں واپس جارہی ہوں۔"

"مجھے آج پہلی بار لگ رہا ہے کہ میں آزاد ہوئی ہوں"

"لیکن تمہاری مجھ سے شادی ہو چکی ہے اور بغیر میری مرضی کے تم کہیں نہیں آجا سکتیں"

یلدہ نے اطمینان سے ایک سگرٹ سلگائی۔ اس کے دو کش لیے اور ایش ٹرے میں رکھتی ہوئی بولی" ہم دونوں کی زندگی میں دو جملوں نے بڑا اہم رول پلے کیا ہے"

ابن حسن نے مکمل طور سے لٹے ہوئے جواری کی سی مری ہوئی آواز میں پوچھا" کون سے دو جملے؟"

ایک تمہارے باپ کا جملہ کہ ابھی وہ شادی وادی نہیں کرے گا۔ اور تم نے تاؤ میں آکر شادی کے تالاب میں چھلانگ لگادی بغیر یہ سوچے ہوئے کہ تمہیں تیرنا آتا ہے یا نہیں اور یہ تالاب کتنا گہرا ہوتا ہے"

"دوسرا؟" ابن حسن نے اور بھی مری ہوئی آواز میں کہا

"تمہارا یہ جملہ کہ شادی کی رات کو تمہارے لیے مجھ میں نیا کیا تھا۔ اس لیے تم سو گئے۔ تمہارے اس ایک جملے نے میری کایا پلٹ دی۔ میں سمجھا کرتی تھی شادی کے بعد نئی چیز نئی زندگی ہوتی ہے۔ پتہ چلا نہیں، نیا جسم ہوتا ہے، وہی چیز جس کے لیے لوگ سوسائٹی کی مظلوم ترین لڑکیوں کی نتھ اتارتے ہیں اور پھر عمر بھر شیخی مارتے ہیں اس کی نتھ تو میں نے اتاری تھی ان میں اور تم میں کیا فرق ہے! مجھے افسوس ہے مسٹر ابن حسن سن آوف سید محمد نقی تم نے جلدی میں جس تالاب میں میرا ہاتھ پکڑ کر چھلانگ لگائی تھی وہ سڑے ہوئے پانی کی تلیا ہے"۔ یلدہ نے اٹھاکر سگرٹ کا ایک کش لیا اور اسے واپس ایش ٹرے میں رکھ دیا۔

"کہاں چلیں؟" ابن حسن نے اسے دو چار چیزیں سمیٹتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"اپنی نئی زندگی شروع کرنے"

وہ تو شروع ہو چکی ہے"۔ پھر اس نے یلدہ کے چھوڑے ہوئے سگریٹ کا ایک کش لگاتے ہوئے کہا" اس وقت سے جب میں نے تمہیں اور تم نے مجھ اتنے بہت سارے آدمیوں کے سامنے نکاح میں قبول کیا تھا"۔

"تم اپنے کو دھوکا دے سکتے ہو زینب بوا کے جگر گوشے، مجھے دھوکا دینے کی کوشش مت کرو۔ تمہارے لیے مجھ میں نیا کیا ہے اور جو ہے اس تک تم کبھی نہیں پہنچ سکو گے۔ تم نے کچھ محسوس نہیں کیا کیونکہ تمہاری زندگی کو جہاں تک پھیلنا تھا پھیل چکی ہے۔ برسات گذر جانے پر اس میں بچا ہوا پانی stagnate ہو کر سڑے گا۔ میری زندگی بہتا ہوا دریا ہے، اس گھر میں آکر ختم نہیں ہوئی۔ میں جانتی ہوں کیا نیا ہے"

یلدہ نے روکنگ چیئر کی پشت پر ٹھوڑی ٹیک کر کہا" میں اب وہ بہت سے کام کرونگی ،کی تم سے شادی ہو جانے کے بعد تمام زندگی آرزو ہی رہتی"۔

"مثلاً؟"

"مثلاً روکنگ چیئر پر آہستہ آہستہ ڈولتے ہوئے گھنٹوں اپنی پسند کی کتابیں پڑھنا"۔ اس ے ذہن میں اس کی بڑھاپے کو پہنچی ہوئی زواؤلوجی کی پروفیسر کی تصویر آئی جنہیں اس نے پہلی بار ہیں ان کے گھر میں اس طرح دیکھا تھا کہ سینے پر پار کر اور بیویل کی کھلی ہوئی کتاب رکھی تھی ور گھٹنے پر رکھے ہوئے کاغذ کے شیٹس پر وہ ڈایاگرام بنا رہی تھیں۔ لیکن یہ تصویر دوسرے ہی لمحے غائب ہو گئی کیونکہ "لیکن شادی تو ہو چکی ہے" ابن حسن نے بچے کھچے رعب سے کہا۔

"تو طلاق بھجدینا۔ میری اپنی بے وقوفیوں اور تمہارے باپ کے ایک جملے نے مجھے عمر قید کی سزا دلوائی تھی۔ تمہارے ایک جملے نے اسے تا بر خواست عدالت میں بدل دیا۔ عدالت بر خواست اور میں آزاد"

ابن حسن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا یلدہ واقعی جارہی ہے یا یہ محض دھمکی ہے۔ اس نے یلدہ کے ہاتھ سے سمٹی ہوئی چیزیں لیتے ہوئے کہا" کہاں جاؤگی؟"

"وہی پرانا سوال" یلدہ نے طنزیہ لہجے میں کہا" کہیں بھی۔ لیکن آج پوچھو گے نہیں یہاں سے گھر یا جہاں بھی جارہی ہوں کیسے جاؤنگی؟ بس سے یا رکشا سے؟ اور راستے میں کہیں ٹھہرونگی تو نہیں؟ کسی سے بات تو نہیں کرونگی؟"

ابن حسن چپ رہا۔

یلدہ نے دبنگ انداز سے کہا" لیکن آج کے بعد وہ وقت نہیں آئے گا کہ تم میرے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر دیکھو کہ اس میں کیا ہے؟

خواہ میں تمہیں شہر میں کہیں بھی نظر آؤں اکیلی یا کسی غیر محرم کے ساتھ اس کے بارے میں تم کوئی سوال مجھ سے نہیں کر سکوگے"۔

ابن حسن لاجواب ہو کر رہ گیا۔ اسے لگا اسکی بھوک مر چکی ہے اور بھوک کی جگہ سگریٹ کے دھوئیں کا مارا محض اس کا گلا رہ گیا ہے۔ یلدہ وہ بے سینگ کی گائے جس کے ساتھ اس نے بچپن، لڑکپن اور نوجوانی بتائے تھے ایک رات میں کیا سے کیا ہو گئی ہے۔ وہ خود ایسی نہیں ہے یقیناً اس کے پیچھے اس کی باجی اور ان کے گھر آنے والے مہمان بول رہے ہیں۔ اس نے زیر لب کہا میں ان سب سسروں کو دیکھ لونگا اور وقت آنے پر یلدہ کو بھی۔ بیوی کو کبھی کبھی پٹائی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے بھی اس کی ضرورت ہے۔

اندر ہی اندر اس کا غصہ بڑھتا جارہا تھا۔ پھر اس نے اچانک چیخ کر کہا" میں کام سے باہر جارہا ہوں اور تم جانتی ہو کس کام سے، اور جب تک واپس لوٹ کر نہ آجاؤں گھر سے باہر نکلنے کی ہمت مت کرنا۔ قانوناً اور شرعاً تم میری بیوی ہو اور تمہیں بغیر میری اجازت کے گھر سے باہر نکلنے

کی اجازت نہیں ہے ورنہ یاد رکھو مرد کے کچھ اور حقوق بھی ہوتے ہیں"
"مثلاً؟" ہکابکا کھڑی ہوئی یلدہ نے کہا
"ضرورت پڑی تو پتہ چل جائیگا" ۔ یہ کہتا ہوا وہ تیزی سے باہر نکلا جیسے یلدہ کو اگلا جملہ کہنے کا موقع نہ دینا چاہتا ہو ۔ پھر یلدہ نے اس کے زور سے دروازہ بند کرنے کی آواز سنی ۔
چند لمحوں بعد یلدہ کو ابن حسن کی آخری دھمکی کا مطلب سمجھ میں آیا لیکن بجائے سراسیمہ ہونے کے ہنس پڑی ۔ اگر کھلے الفاظ میں اس نے یہ دھمکی دی ہوتی تو میرا جواب کیا ہوتا؟ یہی کہ پہلے اپنی courage pill لے لو، اور شاید اس کے لیے پانی بھی لے آتی ۔

ابن حسن کے خفگی میں گھر سے نکل جانے کے بعد یلدہ نے اپنی ضروری چیزیں اکھٹا کرنی شروع کیں ۔ یوں بھی ایک رات اور آدھے دن میں وہ کون سی گھر بھر میں پھیل گئی تھیں ۔ جہیز کا سامان؟ اس کے لیے وہ ابن حسن سے لڑنے کو تو کیا بات کرنے کو بھی تیار نہیں تھی ۔ ایک صوفہ سیٹ، ڈریسنگ ٹیبل، کھانے کی میز اور کرسیاں اور روکنگ چیئر جس پر جھول جھول کر پڑھنے کی خواہش یلدہ کو ہمیشہ سے رہی تھی اور جسے شادی کے لیے ڈھونڈ ڈھانڈ کر باجی نے کہیں سے خریدا تھا اور جو اس وقت اس کھڑکی کی طرف رخ کئے کھڑی تھی جس کے پاس کھڑے ہو کر صبح نماز کے بعد اس نے آسمان کی گلابی رنگت کو دیکھا تھا ۔
اگر یہ شادی دو چاہنے والے دلوں کی ہوتی، اس کے دماغ میں آیا، اور ناشتے کے بعد جانے سے پہلے مجھے خود سے چمٹا کر پیار کر کے ابن حسن کام پر گیا ہوتا تو اس وقت میں اس کرسی پر بیٹھی جھول جھول کر کوئی کلاسک پڑھ رہی ہوتی ۔
خواب، خواب ۔ خواب اس نے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا یہ خواب ہی انسان کی جان لے لیتے ہیں ۔ خوابوں میں ناممکن کو ممکن بنانے کی طاقت ہوتی ہے اور میں تو اتنے سال جاگتے میں بھی خواب دیکھتی رہی ہوں ۔ کیا مجھے نہیں معلوم تھا وہ گیہوں رنگت کا کھال اور چھریرے جسم کا ایک بیل ہے اور اس میں اور ایک انتہائی موٹے اور کالے بھینسے میں کوئی فرق نہیں ہے ۔ سوال یہ ہے، اسے خود پر غصہ آیا
میں کیوں اتنے سال ایک بے زبان گائے بنی رہی ۔ تھیل وداٹ، نومور،
اسے احساس ہوا ۔ اس کے پیچھے کوئی کھڑا ہے ۔ تیہے میں گھر سے باہر جاتے ہوئے ابن حسن نے اس سے دروازہ اندر سے بند کرنے کو نہیں کہا تھا اور نہ ہی اس کا اسے خیال آیا تھا ۔
اس نے پلٹ کر دیکھا ۔ بنو کمرے کے دروازے پر کھڑا اسے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا ۔
"بلیوں کی طرح چلنا کب سے سیکھے؟" یلدہ نے طنز سے کہا ۔ وہ جانتی تھی بنو کی نظر میں وہ ایک بری عورت تھی ۔ لڑکی نہیں ۔ وہ اس سے نفرت کرتا تھا اور سڑک پر اگر آمنا سامنا ہو جائے تو اس پر للچائی ہوئی نظریں ڈالنے سے بھی نہیں چوکتا تھا ۔ یلدہ اس کی اور اس کے

بھائیوں کی آوازوں کو الگ الگ پہچانتی تھی اور جانتی تھی کس مکان کی اوٹ سے سر نکال کر اس نے اسے رنڈی پکارا ہے۔

"تم بھی تو بلی کی طرح چلتی ہو" بنو نے معنی خیز لہجے میں کہا

کل سے یہ معلوم ہو کر کہ جواد اور باقر نے اس کا نیا گھر سجایا تھا۔ یلدہ کے دماغ نے سب کچھ بھول بھال کر انہیں دیور کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ اگر وہ یہ فیصلہ نہ کر چکی ہوتی کہ وہ اس اجڑی سسرال کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے ابن حسن کی دنیا سے باہر جا رہی ہے تو اس وقت وہ بنو کو پیار سے بیٹھنے کو کہتی۔ اس کے لیے چائے بنا کر لاتی۔ لیکن بنو کے جواب پر اس کے جسم میں چیکے لگ گئے۔ اس نے چاہا کہے ابھی گھر سے نکل جاؤ لیکن ایک اپنے رول میں ڈوبے ہوئے ڈرامہ آرٹسٹ کی طرح اگلا جملہ اس کے منھ سے بے ارادہ نکلا" بیٹھو بنو"

بنو بیٹھ گیا اور اس کے چہرے کو دیکھتا رہا

"اماں ٹھیک ہیں؟"

"ہاں" بنو نے اسے تکتے ہوئے کہا

"اور ابا؟"

"وہ بھی" بنو نے اپنی آنکھیں اس کے جسم میں گڑھوتے ہوئے کہا۔

یہ وہ نظریں تھیں جنہیں ناتجربہ کار سے ناتجربہ کار لڑکی بھی پرکھ لیتی ہے۔

"چائے پیو گے؟" اس نے اس کی نظروں سے لاپرواہی ظاہر کرنے کے لیے کہا۔

"کیوں نہیں۔ تمہارے ہاتھ کی چائے کون کمبخت منع کرے گا"

"مزاج ٹھکانے ہیں" یلدہ نے شیرنی کی طرح بپھرتے ہوئے کہا" میں اتنی دیر سے تمہیں دیور سمجھتے ہوئے بات کر رہی تھی اور تم شاید بیٹھ کر کچھ اور اندازہ لگا رہے تھے"۔

بنو جو چھپ کر اس کے لیے نعرہ لگانے اور دوستوں کی ٹولی میں کھڑا ہو کر اسے موہ بھری نظروں سے دیکھنے کا شیر تھا اس حملے سے ایک دم بوکھلا گیا۔ اس کا خیال تھا وہ آسان شکار ثابت ہوگی۔

"میں نے کیا کہا؟" اس نے ہکلاتے ہوئے کہا

"جو چاہو تو تم اپنی بہنوں کے لیے بھی کہہ سکتے ہو" یلدہ پورے طور سے دونوں کولھوں پر ہاتھ رکھ کے اس کے سامنے کھڑی ہو گئی

پھر بولی" لو، دیکھ لو، جی بھر کر دیکھو اور جا کر ایسی ہی نظروں سے اپنی بہنوں کو بھی دیکھنا بلکہ اپنی اماں کو بھی"۔

بنو نے ہوش میں آتے ہوئے کہا" مجھے غصہ مت دلاؤ۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا"

"حرف بحرف تمہارے بھائی کا جملہ۔ واقعی تم سے برا اور کون ہو گا"

"مجھے شادی سے پہلے کی رتی رتی کی خبر ہے"

"مثلاً؟"

"مثلاً سینما ہول کا باکس۔ ریکسی۔ فلم کا نام یاد ہے؟" اس میں ہمت واپس آتی جا رہی تھی "تمہیں کہاں یاد ہوگا۔ تم تو دوسرے کام میں لگی تھیں۔ مارنی۔ اب یاد آیا؟ اندھیرا ہوتے ہی تم دونوں کے سر سامنے کی دیوار کے نیچے چلے گئے تھے۔ میں بوکس کے آگے کی سب سے پچھلی رو میں بیٹھا تھا اور میں نے کرسی پر کھڑے ہو کر سارا اسین دیکھا تھا۔ اچھی فلم چنی تھی تم دونوں نے۔ سارا سینما حال خالی تھا"۔

یلدہ کے ہاتھ کولھوں سے نیچے گر گئے۔ اسے ایک بار پھر اس بے ہمتی کا احساس ہوا جو اتنے سالوں اس پر چھائی رہی تھی۔

اس کی آنکھیں جھک گئیں۔

ادھر بنو میں کا ڈرپوک شیر جاگتا جا رہا تھا۔ اس نے ڈھٹائی سے کہا "ابھی ابن بھائی نہیں آئینگے۔ وہ مجھے راستے میں ملے تھے اور کہہ گئے ہیں جاؤ اپنی بھابھی کو مناؤ۔ ان کے سر پر گھر جانے کا بھوت سوار ہے۔ وہ خود کہیں ڈیڑھ گھنٹے بیٹھ کر اپنی nerves کو ٹھیک کرنے گئے ہیں"

"معنی؟" یلدہ نے کہا

"کچھ چڑھانے۔ میرا خیال ہے وہسکی"

"تو تم مجھے ابن کے کہنے سے منانے آئے ہو" یلدہ نے روکنگ چیئر پر بیٹھ کر اس کا رخ بنو کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ وہ ایکدم تھک گئی تھی۔

"ہاں۔ بھابھی" بنو نے بھابی پر لوبھ بھرے لہجے میں زور دیتے ہوئے کہا۔

یلدہ چپ رہی۔ آنسو اس کی پلکوں میں اٹک کر رہ گئے تھے اور حلق میں کوئی چیز پھنسی ہوئی تھی۔

بنو نے ہمت کر کے کہا "کیا ہم دونوں وہ سین جو میں نے بوکس میں دیکھا تھا پھر سے کر سکتے ہیں؟ بس ایک ایکٹر بدل جائے گا جیسے اسٹیج پر جب اچانک ایک ایکٹر بیمار پڑ جائے تو اس کی جگہ دوسرے کو کھڑا کر دیتے ہیں"

اچانک سالوں کی بے ہمتی۔ کم مائیگی اور تھکن کا خول انڈے کے چھلکے کی طرح یلدہ کے دماغ اور جسم پر سے چیخ کر ادھر ادھر گر پڑا۔

اس نے برابر کی میز پر رکھے ہوئے لمبے عورت کی شکل کے شیشے کے شفاف ٹھوس گلدان کو اٹھا کر بنو کی طرف بڑھتے ہوئے کہا

"ایک بار پھر کہو یہ جملہ"

اپنی دفاع میں اپنی دونوں بانہوں سے چہرے اور ہاتھوں سے سر کو چھپاتے ہوئے بنو نے کہا "بھابھی۔ بھابھی میں تو۔۔۔

مذاق کر رہا تھا" یلدہ نے جملہ پورا کیا "حرامزادے کمین کے۔ نکل جاؤ میرے گھر سے

اور اب کبھی ادھر کا رخ کیا تو یاد رکھنا یہ سر تمہاری گردن پر جھول رہا ہوگا'

بنو مٹنے کو تیار ہو' اس کے پیر کانپ رہے تھے۔

یلدہ نے سوچا۔ میں کیا کہہ گئی "میرا گھر"۔ اگر کبھی ادھر کا رخ کیا، اس نے اٹھتے ہوئے بنو سے کہا "بیٹھے رہو۔ تو میں تمہارے لیے easy prey تھی؟"

"نہیں، نہیں" بنو نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔

"جھوٹ مت بولو۔ سچ کہو" یلدہ نے شیشے کا لمبا عورت کی شکل اور جسم کا گلدان بنو پر تانتے ہوئے کہا۔

"ایسا ہی تھا۔ میری ذہنیت گندی ہے" بنو نے روتے ہوئے کہا "مگر آپ مولا علی کے لیے اس بات کا ذکر ابن بھائی سے مت کیجئے گا۔ آپ کو پنجتن کا واسطہ، نہیں تو ساری بات پورے خاندان کو وہ چیخ چیخ کر سنائینگے"

"پوری بات کہو: اگر نہیں کہونگی تو خدا اور رسول اور بارہ امام اور چودہ معصوم مجھے اس کا اجر دینگے، تمہارے لیے، تم جیسوں کے لیے" پھر اس نے کڑک کر کہا "لیکن میں چاہتی ہوں ابن یہی ایک نیک کام زندگی میں کرلے تاکہ سب کو پتہ چل جائے تم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو، تمہارے بڑے بھیا، باقر، علی جواد، تنو حتی کہ تمہارے باپ بھی"

"مولا علی کے لیے ابا کا ذکر بیچ میں مت لائیے"

یلدہ ہنس پڑی اور بولی "مجھے کوئی اجر دجر نہیں چاہئیے۔ میں یہ گھر چھوڑ کر جارہی ہوں اور چابی تمہیں دے کر جاونگی"

"کتنی دیر کے لیے؟"

"عمر بھر کے لیے" یلدہ نے شیشے کے گلدان کا بچاؤ غیر ضروری سمجھتے ہوئے اسے میز پر رکھ کر کہا "ہاں عمر بھر کے لیے اور تم دو کام کروگے"

"کیا؟" بنو نے احسانمندی کے لہجے میں کہا کیونکہ اس سے کوئی کام لے کر یلدہ اس کا جرم معاف کررہی تھی۔

"ایک: آئندہ سے تمہاری اور تمہارے بھائیوں کی زبان میرے اور باجی کے لیے بند رہنی چاہئیے ورنہ یاد رکھو میرے قبضے میں وہ بھونپو ہے جو تمہارا کچا چٹھا دنیا کے سامنے کھول کر رکھ دے گا۔ مجھے صرف اسے ایک بار اپنے گھر بلا کر یہ کہنا ہوگا کہ میں نے گھر اس لیے چھوڑا ہے کہ تم دو سگے بھائی بیک وقت ایک عورت سے بیوی کا کام لینا چاہتے ہو"

"مولا علی کے لیے" بنو نے کراہتے ہوئے کہا۔

اور دوسرے یہ کہ باہر جاؤ اور دو رکشائیں لے کے آؤ"

"دو؟ وہ کس لیے؟"

"ایک میں میں اور میرا چھوٹا موٹا سامان جائے گا اور دوسرے میں بڑی چیزیں اور یہ

روکنگ چیئر ۔ میری مستقبل کا دوست ۔ اور ہاں یاد رہے جب تک تمہارا ابن بھائی نہ آجائے تمہیں یہاں رہنا ہے ۔ کنجیاں میں تمہارے پاس چھوڑ کر جا رہی ہوں"

رکشاؤں کے روانہ ہونے کے بعد ،وہ دروازے پر کھڑا اپنے ہاتھ جھاڑ رہا تھا ۔ لگ رہا تھا کھلاڑی پن کی جگہ ساری دنیا کی افسردگی اور شکستگی اس کے نصیب میں آگئی ہے ۔

چھٹی کا دن تھا اور باجی گھر پر تھیں ۔ نہ بھی ہوتیں تو کیا فرق پڑتا ۔ جاتے ہوئے وہ یلدہ کو دوسری چابی دوبارہ دے آئی تھیں جو شادی سے پہلے اس کے قبضے میں رہا کرتی تھی ۔ اور چابی دیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا" اسے تمہارے پاس رہنا چاہئے

یلدہ کو دیکھ کر انہوں نے خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات سے کہا "آگئیں ؟"

اور سامان کو اندر لائے جاتے دیکھ کر بولیں "I was expecting it"

رکشا والے کو پیسے اور انعام دیتے ہوئے ، جس پر وہ کچھ متعجب ہوا ، یلدہ نے باجی کے گلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا

"لیکن اس طرح نہیں جس طرح آپ سمجھ رہی ہیں"

"پھر کس طرح ؟"

"ہمیشہ کے لیے " یلدہ نے روکنگ چیئر پر بیٹھتے ہوئے اور سینڈلوں سے پیروں کو آزاد کر کے ٹھنڈے فرش پر رکھتے ہوئے کہا ۔

باجی اس سے مزید کچھ سننے کے لیے کھڑی تھی لیکن یلدہ کی آنکھیں اسی مکان میں جس میں وہ بچپن سے کل تک رہی تھی چاروں طرف اس طرح پھر رہی تھیں جیسے وہ اسے سالوں بعد دیکھ رہی ہو ۔ برسوں کسی دوسرے ملک میں رہنے کے بعد آج گھر لوٹ کر آئی ہو ۔ اس کی سائیکل جس کے ٹائر بیٹھ چکے تھے دھول سے اٹی زینے کے نیچے کھڑی تھی ۔ وہ پلنگ جس پر نانا کا انتقال ہوا تھا اپنی جگہ پر تھا جس پر مرنے سے چند دن پہلے انہوں نے یلدہ کو " تیری ایک فرمائش پوری نہیں کر سکا اس کا قلق رہے گا" کہتے ہوئے سینے سے لگالیا تھا ۔ یلدہ نے پیار سے کرسی کے ہتھوں پر ہاتھ پھیرا ۔ باجی اب بھی اس سے کچھ سننے کی منتظر کھڑی تھیں ۔

یلدہ کرسی پر جھولتے ہوئے بولی "آگے کیا کہوں کہ آزاد ہوں ۔ ؟ پرندوں کی طرح آزاد" ایک غلام کی طرح جسے کسی نے آزادی خرید کر دی ہو یا اس کے مالک نے اس کی محنت اور وفاداری کا صلہ اسے اس شکل میں دیا ہو ؟"

پھر وہ ہنستی ہوئے بولی "میں ایک وہم کی غلامی میں اتنے سال جی ہوں کہ اگر ایک بار غلطی ہو جائے تو اس کی معافی کی ایک ہی صورت ہے کہ اسے زندگی بھر جیئے جاؤ" پتہ نہیں یہ وہم کس نے ایجاد کیا تھا

"جس کسی نے بھی کیا ہو ، تھا ہوشیار آدمی" باجی نے ہنس کر کہا ۔ پھر جھک کر انہوں نے

یلدہ کو پیار کیا اور کہا "آزادی مبارک، میں تمہارے لیے کوفی بنا کر لاتی ہوں۔ خود میں نے ابھی نہیں پی ہے۔ جیسے میں جانتی تھی تم آؤ گی تو تمہارے ساتھ پیونگی۔ اتنی دیر میں تم کچھ کھالو"

لیکن جب وہ کچن سے دونوں پیالیاں ہاتھ میں تھامے باہر آئیں تو انہوں نے دیکھا یلدہ غافل سو رہی ہے۔ اس کا چہرہ اس معصوم بچے کا سا تھا جو کھیل کھیل کر تھک کر چور ہو کے سو گیا ہو

۱۔ مُطالعۂ فیض: یورپ میں ——— اشفاق حسین

اشفاق حسین نے اردو کے سوادِ اعظم سے ہزاروں میل دور رہتے ہوئے بھی پچھلے دس بارہ برسوں میں اتنا نام پیدا کر لیا ہے کہ ان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اردو دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ وہ ایک تازہ کار اور خوش فکر شاعر تو ہیں ہی، جن کے تین مجموعے اردو، انگریزی اور پنجابی میں شائع ہو چکے ہیں۔ اشفاق حسین کا نام اس لحاظ سے فیض شناسی میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے کہ فیض کے حوالے سے ان کی تین کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ "فیض کے مغربی حوالے" لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ اب نظرِ ثانی اور ترمیم و اضافے کے ساتھ دہلی سے دو جلدوں میں شائع کی گئی ہے۔ "مطالعۂ فیض یورپ میں" اس کی پہلی جلد ہے جس میں یورپ سے متعلق مضامین و دستاویزات ہیں۔

صفحات: ۵۶۰ — قیمت: ۲۵۰ روپے

۲۔ مُطالعۂ فیض: امریکہ و کناڈا میں ——— اشفاق حسین

شمالی امریکہ کے تمام مراکز میں فیض صاحب کی پذیرائی سب سے زیادہ ٹورنٹو میں ہوئی۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا خاصا حصہ خود اختیار کردہ جلاوطنی میں مغربی دنیا میں گزارا اور ان کی شاعری کا ایک حصہ اسی ذہنی جلاوطنی کے عالم میں لکھا گیا۔ ایسا تمام کلام اس کتاب میں محفوظ کر دیا ہے۔ فیضیات میں یہ کتاب بہت اہمیت رکھتی ہے۔

صفحات: ۵۱۲ — قیمت: ۲۰۰ روپے

خالد جاوید

عکس ناآفریدہ

بس اسٹینڈ پر اندھیرا اتر رہا تھا۔ ابھی ابھی آخری بس اسے یہاں چھوڑ کر واپس چلی گئی تھی اس کی کالونی سامنے ہی تھی۔ ابھی یہ علاقہ پوری طرح آباد نہیں ہوا تھا۔ کچھ سال پیشتر یہ جگہ شاید سارے شہر کا کوڑا گھر تھی، ابھی تک یہاں نہ تو بجلی آئی تھی اور نہ ہی سڑکیں تعمیر ہو سکی تھیں لیکن کام چل رہا تھا۔

اس نے کاندھے پر لٹکے کپڑے کے تھیلے کو احتیاط سے اتار کر ہاتھ میں لے لیا اور گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کا ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا جس سے وہ بس کے ٹکٹ کو مسلتا جا رہا تھا اچھی خاصی سردی ہونے کے باوجود اس کے پیروں میں پسینہ آ رہا تھا اور اس کے موزے جوتوں کے اندر چپک کر رہ گئے تھے، اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ اور وہ بے حد تھک گیا تھا۔ سامنے مزدوروں کے خیموں میں چولہوں کی آگ روشن ہو گئی تھی، آس پاس پھیلی ہوئی تاریکی میں اس روشنی کا دم غنیمت تھا۔ ٹھیک اسی وقت جب وہ ان روشنیوں کے قریب سے گذر رہا تھا ایک بے حد مانوس اور اشتہا انگیز خوشبو اس کے نتھنوں کو مہکانے لگی، وہ بے اختیار رک گیا۔ کہیں چاول ابالے جا رہے تھے، مزدوروں نے اس کو دیکھ کر باتیں کرنا بند کر دیں، وہ وہیں کھڑا ہو کر قمیض کی اوپری جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالنے لگا، ایک سگریٹ کو ہونٹوں میں دباتے ہوئے اس سے بس کے مڑے تڑے ٹکٹ کو پتلون کی جیب سے باہر نکالا اور ایک چولہے میں روشن آگ پر جھکتے ہوئے اسے جلا لیا۔ اپنا سگریٹ سلگاتے ہوئے وہ پھر آگے بڑھنے لگا۔ جس وقت وہ چولھے پر جھکا تھا ابلتے ہوئے چاولوں کی خوشبو اس کے پورے وجود کو سیراب کر گئی تھی مگر اب وہ آہستہ آہستہ فضا سے غائب ہوتی جا رہی تھی، تھوڑا آگے بڑھ کر اس نے سگریٹ پھینک دیا••• آس پاس خاموشی تھی لیکن کہیں دور مزدوروں کے کسی خیمے میں ٹرانسسٹر پر کوئی بوسیدہ سا فلمی گیت بج رہا تھا۔

اس کالونی کا کچھ حصہ ایک بڑے تالاب کو پاٹ کر بنایا گیا تھا جس کی وجہ سے اس کے مکان کے سامنے دلدل سی بن گئی تھی، اپنے گھر کی جانب بڑھتے ہوئے اس کے قدم دلدل میں دھنسنے لگے۔ اس کے قدموں کے نیچے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے جنگلی پھول اور پکے ہوئے گولر کچلے جا رہے تھے۔ گولر کا ایک پیڑ اس کے گھر میں ہی لگا تھا جس کی آدھی سے زیادہ شاخیں دیوار کے اوپر سے باہر کی طرف جھک آئی تھیں۔ وہ دروازے پر آکر رک گیا۔ گھر کے اندر خاموشی تھی، اس کے

عقب میں کسی مکان کی اوپری منزل پر کیروسین لیمپ جل رہا تھا جس کی دھندلی روشنی میں اس نے اپنا کمزور سا ہیولہ گھر کے دروازے پر کپکپاتا ہوا پایا۔

اس نے آہستہ سے دستک دی، ایک بندر دیوار کی دوسری طرف کود گیا۔ اس پورے علاقے میں بندروں کی بہتات تھی۔

چپر چپر کرتی وہ گھسٹتی ہوئی چلی آرہی تھی۔ آج بھی شاید اس نے میری ہی چپلیں پہن رکھی ہیں اس نے سوچا، اسے محسوس ہوا جیسے وہ ٹھیک سے چل بھی نہیں پارہی ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ صرف دکھاوے کے لیے ہی اس طرح گھسٹتی ہوئی چلی آرہی ہو۔

دروازہ کھل گیا۔ وہ ہاتھ میں مٹی کے تیل کا ایک چھوٹا سا لیمپ لیے کھڑی تھی، دروازے کھلنے کے ساتھ تیز ہوا کا ایک جھونکا چلا آیا اور وہ لیمپ کو بجھنے سے بچانے کے لئے اس کی چمنی کو ہاتھ سے ڈھکنے لگی۔

"آج پھر تم نے بہت دیر کر دی" وہ کراہتے ہوئے بولی

وہ بغیر کوئی جواب دیئے اندر آگیا۔ وہ چاہتا تو جواب میں کچھ کہہ سکتا تھا لیکن اس کی یہ کراہتی ہوئی آواز بے حد بناوٹی محسوس ہوئی تھی ••••• کمرے میں پہنچ کر کاندھے پر لٹکا تھیلا اس نے فرش پر بے دلی سے ڈال دیا اور خود پلنگ پر بیٹھ گیا۔ پیچھے پیچھے وہ بھی آگئی۔

اتنی دیر کر دیتے ہو لوٹنے میں، مجھے ڈر لگتا ہے" اس نے کہا

وہ غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا اس نے سرخ رنگ کا سوتی نائٹ گاؤن پہن رکھا تھا، اس ڈھیلے ڈھالے گاؤن میں بھی اس کا پھولا ہوا پیٹ کافی نمایاں تھا وہ چاروں طرف سے گول مٹول ہو رہی تھی جس کی وجہ سے اس کا اچھا خاصہ لمبا قد ٹھگنا نظر آرہا تھا۔

وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی اس کے سر کے بالوں سے ناریل کے تیل کی مہک آرہی تھی اس کا جی متلانے لگا

"تم نے آج پھر ناریل کا تیل لگایا ہے"

وہ ہنسنے لگی

"کل صبح ہی سر دھو لونگی میں جانتی ہوں تمہیں اس کی مہک کس قدر ناگوار لگتی ہے"

وہ بالوں کو ہاتھوں سے ٹھیک کرنے لگی لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ بالوں کو ٹھیک کرنے کے بہانے دراصل سر کھجانا چاہتی ہے۔ جہاں کچھ عرصہ سے جوئیں پڑ گئی تھیں۔

"کل سے جلدی آجایا کرو" وہ بالوں کی ایک لٹ انگلی میں لپیٹتے ہوئے بولی "کیسے جلدی آجایا کروں۔ پانچ بجے فیکٹری سے چھٹی ہوتی ہے اور یہ علاقہ شہر سے کتنی دور ہے یہ تو تمہیں پتہ ہی ہے اور اس روٹ پر ایک ہی بس ہے دوسری کوئی بس بھی نہیں"

"تمیں بھی کہیں اور رہنے کو گھر نہ ملا" وہ تنکی سے بولی

"شکر کرو کہ مل گیا ورنہ اتنی معمولی سی نوکری میں اس شہر میں سر چھپانے کو بھی جگہ نہیں ملتی۔ کل کو یہی جگہ ایک بھرے پرے رونق افزا علاقے میں تبدیل ہو جائے گی"

"پتہ نہیں کب ہوگی۔ دن بھر کمبخت مارے بندر چھت پر کودتے رہتے ہیں دروازہ کھول کر باہر دیکھنے پر سوائے مزدروں کے غل غپاڑے، دھول غبار اور کوؤں کے کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا"

دروازہ کھول کر دیکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے"؟

"اچھا ---- اپڑے پڑے بولا جاتی ہوں۔ آپ کو پتہ ہے یہاں تو کوئی پڑوس بھی میسر نہیں۔" وہ تیزی سے بولی

"خیر خیر۔ ذرا ہٹو۔ مجھے جوتے موزے اتارنے دو" اس نے بے دلی سے کہا۔ پیروں سے موزے نکالتے ہی ایک ناگوار قسم کی بدبو کمرے میں پھیل گئی۔

"اوہ فوہ ---- تمہارے تو پیر بے حد پکتے ہیں۔ اب انہیں صابن سے دھوکر آنا ورنہ سارے کمبل میں بدبو بس جائے" اس نے ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔ وہ اٹھ گیا اور فرش پر ننگے پیر کھڑا ہو کر اپنی چپلیں ڈھونڈنے لگا۔ کمرے کی مدھم روشنی میں اسے اپنے پیر بے حد کالے اور بدنما نظر آئے۔

"میری چپلیں" وہ بڑبڑایا

"یہ لو اپنی چپلیں۔ میں پہنے ہوئی تھی"

"آخر تم اپنی کیوں نہیں پہنتی ہو" وہ ناخوشگوار لہجے میں بولا

"دیکھ رہے ہو۔ پیروں میں کتنی سوجن ہے" وہ اس کی چپلیں اپنے پیروں سے نکالتے ہوئے مسکرائی۔

"آٹھواں مہینہ چل رہا ہے۔ اس مہینے میں پیر بہت سوج جاتے ہیں۔ میری تو کوئی چپل پاؤں میں آتی ہی نہیں۔ تمہارا پیر بڑا ہے اس لیے تمہاری پہن لیتی ہو"

وہ ننگے پیر فرش پر کھڑی تھیں۔

"ادھر دیکھو ٹخنے تو بالکل چھپ کر ہی رہ گئے ہیں" اس نے گاؤن کو ٹخنوں کے اوپر تک اٹھا دیا۔

"مگر میرے پیر سو بہت خوبصورت گئے ہیں دیکھو!"

وہ اٹھلائی اس نے دیکھا واقعی اس کے پیر بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ سوجن کی وجہ سے بھرے بھرے اور گورے گورے جن پر معمولی سی سرخی بھی نمایاں تھی۔ وہ اس کے پیروں سے نظریں اٹھا کر چہرے کی جانب دیکھنے لگا چہرہ بالکل ستا ہوا تھا۔ اس پر کسی قسم کی رونق کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ تیل لگا کر سختی سے چوٹی باندھ لینے کے باعث چہرا کچھ سیاہی مائل ہو کر کمزور سا

دکھائی دیتا تھا، ویسے بھی اس کے جسم کی ساری کھال ہی خشک اور کھردری قسم کی تھی۔ اس جسم اور اس چہرے پر بھرے بھرے یہ خوبصورت پاؤں اسے بے حد اجنبی محسوس ہوئے

"تم چائے لاؤ" وہ بے دلی سے بولا

"لاتی ہوں جب تک تم پیر دھو لو" وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی لیکن اس مسکراہٹ کے باوجود اس کے چہرے کی بدرونقی ایک پل کو بھی کم نہ ہو سکی۔

کائی اور زنگ لگے ہینڈ پمپ کے نیچے اپنے پیروں کو رگڑ رگڑ کر صاف کرتے ہوئے اس نے سوچا۔۔۔۔ یقیناً اس کے پیٹ میں لڑکا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب عورت کے پیٹ میں لڑکا ہوتا ہے تو اس کے چہرے کی رونق بالکل ہی غائب ہو جاتی ہے اور منھ بالکل ستّ کر رہ جاتا ہے۔ اس کا چہرہ روز بروز بدرونق ہوتا جا رہا تھا"

لڑکا ہونے کے قوی امکان نے اسے پریشان کر دیا۔ تب اس نے جھک کر اپنے پیروں کو سونگھا۔

"اب تو نہیں آ رہی ہے بو۔ خود اس کے ناریل کے تیل لگے بالوں سے کیسی سڑاندھ آتی ہے، تکیہ کیسا تیل سے چکٹ گیا ہے"

پیر دھو کر وہ کمرے میں واپس آگیا۔ اتنی دیر میں وہ چائے کا ایک کپ لا کر اسٹول پر رکھ چکی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور چائے کے گھونٹ لینے لگا

"اس تھیلے کو تو خالی کر دو" اس نے فرش پر پڑے تھیلے کی جانب اشارہ کیا

"کیا کیا لے آئے"

"کچھ نہیں۔ صبح کے لیے سبزی ہے تمہارے لیے وٹامن بی کیپسول اور آئرن والے ٹانک ہیں"

"سیب اور ناریل آج بھی نہیں لائے" وہ شکایتی لہجے میں بولی

"کل لیتا آؤں گا" اسکی آواز کمزور پڑ گئی۔

وہ فرش پر کراہتے ہوئے بیٹھ گئی اور تھیلے میں سے سامان باہر نکالنے لگی"

اب تو آسانی سے اٹھا بیٹھا بھی نہیں جاتا" اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ اس ڈھنگ سے بیٹھنے میں اس کا دم پھول رہا تھا۔

لیکن وہ صرف سیب اور ناریل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

شاید دوسرا مہینہ چل رہا تھا جب وہ اسے پہلی بار ڈاکٹر کے یہاں لیکر گیا تھا۔

ڈاکٹر نے تمام ہدایات اور نسخوں کے ساتھ سیب اور ناریل کا استعمال بکثرت کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ عام خیال ہے کہ سیب اور ناریل کو کثرت سے کھانے سے پیٹ میں پل رہے بچے کا رنگ گورا ہو جاتا ہے وہ اور اس کی بیوی دونوں ہی سانولے رنگ کے تھے۔ اس کی بیوی چاہتی

تھی کہ بچہ خوب صاف رنگ کا پیدا ہو۔ لیکن اس تمام عرصے میں اس نے مشکل سے ایک دو بار ہی اسے سیب اور ناریل لاکر دیئے تھے۔ دراصل وہ خود یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بچہ گورے رنگ کا ہو۔ وہ خود اپنے آپ بھی ایک بے حد معمولی صورت شکل کا شخص تھا۔ آنکھیں بے حد چھوٹی چھوٹی اور حلقوں کے اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ ناک بالکل بیٹھی ہوئی اور سر کے بال آدھے سے زیادہ صاف ہو چکے تھے۔ عرصہ سے کچھ بیماریوں کے باعث اس کے جسم پر زیادہ تر ہڈیاں ہی دکھائی پڑتی تھیں۔

اس کی بیوی ایک ڈکار لیتی ہوئی فرش پر سے اٹھ گئی۔

"میں کھانا تیار کرتی ہوں تم جب تک آرام کرو"

"یہ تم آج کل اس طرح ڈکاریں کیوں لیتی رہتی ہو، تمہیں گندا نہیں لگتا؟"

"پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ پیٹ ہر وقت پھولا رہتا ہے اور گیس سی بنتی رہتی ہے" اس نے پھر ڈکار لی

"آج پکایا کیا ہے" اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا

دال۔ سبزی اور رائتہ"

"چاول؟"

"تھوڑے سے پکائے ہیں۔ اپنے لیے"

"میں تو چاولوں کی خوشبو کو ترس گیا" وہ جھنجھلا کر بولا۔ لیکن بیوی کمرے سے باہر جا چکی تھی۔

پورے سات ماہ سے اس نے چاول نہیں کھائے تھے۔ وہ چاولوں کا بچپن سے ہی بہت شوقین رہا تھا۔ اس کی ماں اس کے باپ سے نظریں بچا بچا کر اس کے لیے چاول پکا کر رکھا کرتی تھی۔ مگر اب چاول اس کے لیے بے حد مضر ہو گئے تھے۔ اسے نئی طرح کی بیماریاں لگ گئی تھیں۔ گردے میں پتھری ہو گئی تھی اور اس پر سوجن رہتی تھی۔ روزانہ اجابت میں کافی مقدار میں خون آتا تھا اور وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپتا تھا۔ پیشاب میں شکر آنے لگی تھی۔ اب وہ صرف پرہیز کا روکھا پھیکا کھانا کھا سکتا تھا، چاول اور دیگر بادی اشیاء اسے سختی سے منع تھیں۔

کمرے سے ملحق باورچی خانے میں اسٹوو جل رہا تھا، گھر میں پھیلے ہوئے سناٹے میں اسے اس اسٹوو کی آواز بے حد بوسیدہ اور کئی پھٹی سی لگی دھیان بٹانے کے لیے کمرے میں جلتے ہوئے لیمپ کی مدھم روشنی میں اس نے آس پاس کا جائزہ لیا۔ پلنگ کی چادر بے حد میلی ہو رہی تھی۔ تکیے کے سفید غلاف میل سے بالکل سیاہ ہو گئے تھے۔ بیوی کی سنگھار میز پر اس کی لپ اسٹک اور کریم کی شیشیاں بے ترتیبی سے بکھری پڑی تھیں۔ پلنگ کے سرہانے اس کی بیوی کا گندا سا کنگھا رکھا ہوا تھا جس میں اس کے بالوں کے لمبے لمبے گچھے پھنسے ہوئے تھے۔ اس کے قریب ہی داد مٹانے

کے مرہم کی ایک شیشی آدھی کھلی پڑی تھی ۔ سامنے دیوار پر کھڑکی کے اوپر ایک گول مٹول اور خوبصورت بچے کی تصویر آویزاں تھی ۔ ایک پل کو اس کی نگاہیں بچے کی تصویر میں اٹک گئیں ۔

" نہیں یہ میرا بچہ نہیں ہے " اس نے سوچا اور اکتا کر کمرے کے دروازے کی طرف دیکھنے لگا ۔

کواڑ میں لگی ایک کیل میں بیوی کے ہرے رنگ کی ایک میلی سی شلوار لٹک رہی تھی جس کے پائینچوں پر سنہرے رنگ کی کڑھائی کی ہوئی تھی ۔ اسے یاد آیا شادی کے شروع کے دنوں میں اسے یہ شلوار کتنی پسند تھی لیکن اس وقت اس میلی اور گندی ہوئی شلوار پر بے اختیار اسے گھن آگئی ۔

تب وہ یہی شلوار پہنے تھی اور اسی رنگ کا فراک ۔

شادی کو صرف ایک ہی مہینہ ہوا تھا اس کی چھٹیاں ختم نہیں ہوئیں تھیں اور وہ اپنی ماں کے ساتھ اپنے آبائی مکان میں مقیم تھا ۔

وہ دونوں ایک دوست کے یہاں سے دعوت میں سے آئے تھے ۔ راستے میں رک کر اس نے ایک حلوائی کی دکان سے ربڑی خریدی تھی ۔ کمرے میں آتے ہی اس نے بیوی کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا تھا ۔

" آج بہت اچھی لگ رہی ہو " اس نے گرم گرم سانسوں کے درمیان کہا

" اچھا جی تو " اس زمانے میں وہ اسے " آپ " کہکر مخاطب کرتی تھی لیکن اس نے اپنے بازوؤں کی گرفت اور مضبوط کر دی ۔

" ربڑی کھاؤ گی " اس نے بیوی کے کان میں ارمان بھری سرگوشی کی

" ہٹئے ـــــ پہلے مجھے کپڑے تو بدلنے دیجئے " بیوی نے پیار سے اس کے گال پر تھپکی دی اس رات جب ٹین کی چھت پر ٹپ ٹپ کر کے بوندیں گر رہی تھیں ۔ بیوی کی گود میں سر رکھے وہ بے حد سرشار ہو گیا تھا ۔ اس عالم سرشاری میں اچانک بےحد لاڈ میں آکر اس نے یہ سوال کر دیا تھا ۔

" اچھا ـــــ یہ بتاؤ تمہیں شادی سے پہلے بھی کوئی مرد اچھا لگا تھا " ؟

سوال کے ساتھ ہی اسے اپنے لہجے کے بچکانہ پن پر افسوس بھی ہوا تھا ۔ بیوی کی آنکھیں نہ جانے کہاں ڈوب گئیں ۔ اس کا چہرہ جیسے ہر قسم کے تاثرات سے عاری ہو گیا ۔ اس نے سوچا شاید وہ بن رہی ہے اور ابھی زور سے ہنس پڑے گی مگر جب کافی دیر گذر جانے کے بعد بھی اس کے رویہ میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی ۔

تو اس کا دل دھک سے ہو گیا ۔ اس نے اپنا سر بیوی کی گود سے ہٹا کر اس کے سینے سے لگا دیا اور ایک ہاتھ سے اس کا کان آہستہ آہستہ سہلانے لگا ۔ جب وہ اس طرح اس کا کان سہلاتا تھا تو

بیوی کی سانسیں گرم ہونے لگتی تھیں اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی تھی۔

"بتاؤ؟" اس بار اس کی آواز کانپ گئی۔ ٹین کی چھت پر ایک بار بوندیں بہت تیزی سے گریں۔

"کیا؟" بیوی کے لہجے کی اجنبیت اس کی روح میں اترنے لگی۔ اسے یہ آواز وقت کے نہ جانے کتنے میلوں کے عقب سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ شادی کے بعد اتنے دنوں میں اس نے پہلی بار اپنی بیوی کی یہ آواز سنی تھی۔ اس کے دل کو ایک انجانے سے خدشے نے گھیر لیا، وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تمہیں میری قسم۔ بتاؤ" شدید قسم کی بے چینی کے عالم میں بھی اس کے اندر ایک مکار اور کمینے مرد نے سر ابھارا۔

آپ سچ سن سکیں گے نا" ---- انا رانس تو نہیں ہو نگے ---- "مجھے ڈر لگتا ہے"

بیوی نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی جس کی وجہ سے اس کا چہرہ اور بگڑ گیا۔

"نہیں ---- بالکل نہیں، دراصل ہم دونوں کی زندگی آپس میں ایک کھلی کتاب کی طرح ہونا چاہیے" ---- اس نے اپنے اندر ایک جھوٹی اخلاقی جرات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک رٹا رٹایا سا جملہ دہرایا۔

ایک سایہ سا آکر بیوی کے چہرے پر رینگنے لگا۔ اب اس کا چہرے بالکل ہی بدل گیا

"ہاں! کالج میں ایک پروفیسر تھے" اس بے حد ادا سی سے کہا۔

"تمہیں اچھے لگتے تھے؟" اس نے بیوی کا کان چھوڑ دیا۔

"ہاں بہت زیادہ۔ وہ تھے بھی بے حد خوب رو۔ سرخ و سپید رنگ، گھونگرالے بال، اسمارٹ اور بے حد ذہین" اس کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ پھیل گئی جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔

"تمہارے اور ان کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟" اس نے بہت نرمی سے سوال کیا۔ شاید وہ اس سوال کو گرج کر پوچھنا چاہتا تھا۔

"میں انہیں دل ہی دل میں چاہتی تھی" لیکن شاید یہ اس کے سوال کا جواب نہیں تھا اور وہ صرف اپنے ماضی کو دہرانا چاہتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ابھی بھی وہی خوابناک مسکراہٹ روشن تھی۔

وہ یونہی اس کی طرف دیکھتا رہا جو صرف چھت کو خالی خالی نظروں سے تکے جارہی تھی۔ وہ جیسے کہیں ڈوبنے سا لگا۔

پھر اس نے کچھ اس طرح آنکھیں ملیں جیسے گہری نیند سے اٹھا ہو۔

"خیر... اب تو تم صرف مجھے ہی چاہتی ہو نا!؟"

یہ جملہ کہتے وقت وہ مسکرانا چاہتا تھا لیکن اس کے بجائے اس کی باچھیں پھیل کر رہ گئیں اور چوہے کی طرح سفید اور چھوٹے چھوٹے دانت باہر جھانکنے لگے ۔۔۔۔ شاید یہ اس کا کمترین اور حقیر ترین پوز تھا اور ایک مضحکہ خیز قسم کے احساس کمتری سے مالامال بھی ۔

اس کی بیوی نے اس کی طرف رحم اور ترس کے ساتھ دیکھا ۔

"ہاں آپ کو اور صرف آپ کو" اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیتے ہوئے اس کا سر اپنے سینے میں بھینچ لیا اور اس کے بالوں میں انگلیاں کرنے لگی ۔

وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی بیوی کے سینے کا اتار چڑھاؤ آج غیر معمولی تھا تب ہی اسے لگا جیسے اس کی انگلیاں اس کے سر میں صرف بھٹک سی رہی ہیں ۔ جیسے وہ وہاں کسی گمشدہ حصے کو تلاش کر رہی ہوں ۔ اس کے سر میں گھنے بال نہیں تھے اور درمیان سے سر گنجا ہوتا جا رہا تھا لیکن یہ انگلیاں تو گھنگھرالے بالوں کے کسی گچھے میں الجھ جانے کو بے چین تھیں ۔ ٹین کی چھت پر بارش کی ٹپ ٹپ اب بہت ہلکی ہو گئی تھی ۔ اسے محسوس ہوا جیسے کوئی سڑے ہوئے جوہڑ میں کنکریاں پھینک رہا تھا ۔

کوئی چھچھوندر صوفے کے نیچے کھڑ بڑ کر رہی تھی ، دیوار پر لگی گھڑی کی ٹک ٹک اچانک تیز ہو گئی تھی ۔ پلنگ کے سرہانے رکھے ربڑی کے پیالے کو دیکھ کر اس کا جی متلانے لگا ۔

وہ کافی دیر تک ایسے ہی لیٹے رہے ، پھر اس کی بیوی گہری گہری سانسیں لینے لگی اور اس کی انگلیاں بے جان چھپکلیوں کی طرح اس کے سر سے ڈھلک گئیں ، وہ شاید سو گئی تھی ۔ اس نے آہستہ سے بیوی کے سینے سے اپنا سر ہٹایا اور اس کا چہرہ غور سے دیکھنے لگا ۔۔۔ ٹھیک اسی وقت شاید پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ اس کے چہرے کے خدوخال سے ایک ناقابل بیان قسم کی اداسی پھوٹتی رہی ہے اور نیند میں یہ اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے ۔ اب اسے اپنے آس پاس ایک شدید قسم کی تنہائی کا احساس ہوا ۔ یہ تنہائی جیسے گھر کے ہر کونے سے نکل نکل کر ان کے بستر پر سرسرا رہی تھی

باہر بارش تیز ہو گئی تھی اور آنگن میں لگا پام کا پودا جھکڑ سے لہرا رہا تھا ۔ وہ رات تو بیت گئی تھی لیکن اس کی بیکران تنہائی شاید کبھی نہ رخصت ہونے کے لئے وہیں ٹھہر گئی تھی ۔۔۔۔ اب اسے اکثر محسوس ہوتا جیسے وہ ہمیشہ اداس رہتی تھی اور بات کرتے کرتے اچانک کہیں گم ہو کر خلا میں تکنے لگتی ۔ جسمانی قربت اور ہم بستری کے لمحات میں بھی یہ اداسی برقرار رہتی ۔ اس کے منہ سے جو لذت آمیز سسکاریاں باہر آتیں تو اسے ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ دردناک آواز میں کسی کا نام لیکر بڑبڑا رہی ہو ۔ بارہا اس نے اپنے کان لگا کر اس بڑبڑاہٹ کو بہت دھیان سے سننا چاہا لیکن ہانپتی پھولتی سانسوں کے درمیان وہ کبھی اسے صاف صاف سن پانے میں کامیاب نہ ہو سکا ۔۔۔ یوں تو وہ اس رات کے بعد ہی سے بیوی کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرنے سے خوف سا محسوس

کرنے لگا تھا۔ لیکن اب تو اسے آہستہ آہستہ اس فعل سے نفرت سی ہوتی جارہی تھی۔ مگر شاید ایک دوسرے کی تنہائی کو اور بھی یقینی بنانے کے لیے یہ فعل لازم تھا۔

پھر ایک دن اس نے بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے یہ بتاتے وقت خوشی اس کے چہرے سے پھوٹی پڑتی تھی۔ وہ خاموشی سے اس کی شکل دیکھتا رہا۔

"دیکھو کیا ہوتا ہے۔ لڑکا یا لڑکی" وہ بے خیالی میں بولی

"سنئیے آپ مجھے خوبصورت خوبصورت بچوں کی تصویریں لا دیجئے۔ خوبصورت چہروں کو دیکھنے سے بچے کے چہرے کے خدوخال دلکش بننے لگتے ہیں۔ میں تو آج کل ہر وقت خوبصورتی کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں"

اس کا دل بے اختیار گھبرانے لگا، یہ کونسے خوبصورت چہروں کے بارے میں سوچتی ہوگی ... اس کا جی چاہا وہ اسے ستیم، شوم، سندرم کے فلسفہ کے بارے میں سمجھائے اور بتائے کہ دیکھو حسن دراصل وہی ہے جو صداقت یا نیکی ہے اور یہ دنیاوی حسن تو صرف زاویہ نگاہ کی بات ہے اور جو حقیقت مطلق نہیں، اضافی نوعیت کا ایک التباس ہے۔ لیکن تب ہی اسے خیال آیا کہ ایک معمولی سی گھریلو عورت کو یہ سب بتانا تو اپنے آپ میں اور بھی زیادہ بھونڈی اور مضحکہ خیز بات ہوگی۔

تب یکبارگی اس کے دل میں یہ خواہش اپنی پوری شدت کے ساتھ جاگزیں ہوئی ----

"کاش اس کے پیٹ میں لڑکی ہو۔ لڑکا نہ ہو یا خدا لڑکا نہ ہو لڑکی اپنی نسوانی ساخت کی بنا پر اس کا کچھ بھرم رکھ لیگی۔ لیکن لڑکا اگر ہوبہو اس کی طرح نہ ہوا تو اس کی زندگی کس قدر پر آسیب ہو جائے گی۔ نجانے کیوں اسے محسوس ہو رہا تھا کہ بیوی کے پیٹ میں پلنے والا یہ بچہ محض اسی کا نہیں ہے۔ یہ بچہ خالص اس کا نہیں ہے۔ بلکہ اس میں بیوی کی تمام ناکام آرزوئیں اور خواہشات بھی شامل ہیں۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس بچے میں اس کے نطفے کے ماورا بھی کچھ ہے۔ کچھ ایسا جس کے تصور سے ہی اسے دہشت ہونے لگی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں لگ بھگ گڑگڑا کر دعا مانگی "کاش یہ بچہ کالا پیدا ہو، کالا اور بدصورت، میری طرح بالکل میری طرح۔" سامنے دیوار پر ایک بے حد خوبصورت اور گورے چٹے بچے کی تصویر والا کلینڈر ہوا کے جھونکے ساتھ ڈولنے لگا تھا "نہیں یہ بچہ میرا نہیں ہے" اس نے سوچا

اس خیال کے ساتھ ہی اب اسے ایک نیا مشغلہ ہاتھ آگیا تھا۔ وہ دن دن بھر چھٹی لیکر گھر میں پڑا رہتا اور بار بار بیوی کے سامنے آتا رہتا۔ بات کرتے وقت وہ مضحکہ خیز حد تک اپنے چہرے کو اس کی آنکھوں کے سامنے لے آتا۔ اکثر جب اس کی بیوی کروٹ سے لیٹی ہوتی تو وہ اس کا شانہ پکڑ پکڑ کر اپنی طرف کرلیتا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بے ربط سی باتیں کرنے لگتا ... ان دنوں بیوی بہت سست اور کاہل ہو گئی تھی اس کی آنکھوں میں ہر وقت نیند سی بھری

ہوتی وہ اسکی نیند بھری آنکھوں کے سامنے اپنے چہرے کو لے آتا اور وہ کبھی کبھی جھنجھلا کر کہتی
"سونے بھی نہیں دیتے ۔۔۔ بہت زور کی نیند آرہی ہے ۔"
ان دنوں سوتے وقت اس کے ہونٹ آپس میں کچھ اس طرح جڑ جاتے جس سے اس کے چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ کا گمان ہوتا لیکن اس کے چہرے کی رونق دن بہ دن کم ہوتی جارہی تھی ۔

"یہ تمہارا چہرہ کتنا ست گیا ہے" ایک دن اس نے پوچھا تھا ۔
"یہ تو اچھی بات ہے ۔۔۔ لڑکا ہوگا" اس کے جواب میں فخر تھا ۔
"کیا بیکار سی باتیں کرتی ہو ۔ اس بات سے لڑکا ہونے کا کیا تعلق! کیا تم خدا کا گھر دیکھ کر آئی ہو "؟

"بڑے بوڑھے کہتے آئے ہیں" بیوی نے صاف دلی سے سمجھانے والے لہجے میں کہنا شروع کیا ۔

کہتے ہیں اگر لڑکی پیٹ میں ہو تو چہرے پر بہت رونق آجاتی ہے اور پیٹ کی گولائی بہت خوبصورت ہوتی ہے جبکہ لڑکے میں چہرہ بالکل کمزور ہوجاتا ہے اور اس پر کوئی رونق نہیں ہوتی ۔ پیٹ کچھ بے ڈھنگے پن سے گول ہوجاتا ہے اور لڑکے کی پیدائش ماں پر بہت سخت گزرتی ہے ۔
"سنو ۔۔۔ خوابوں کی تعبیریں کیا واقعی الٹی ہوتی ہیں؟" ۔۔۔ وہ خاموش ہوگئی اور خلاء میں گھورنے لگی ۔

"ہاں کہتے تو یہی ہیں" وہ لاپرواہی سے بولا
وہ کچھ دیر تک اسی طرح خلاء میں گھورتی رہی ۔۔۔ پھر بولی ۔
"دو، تین دن سے میں لگاتار رات کے پچھلے پہر میں ایک خواب دیکھ رہی ہوں"
"کیسا خواب"
وہ اس کے قریب آگئی اس کی آواز کپکپا رہی تھی ۔
میں دیکھتی ہوں کہ میرے لڑکا پیدا ہوا ہے ۔ اماں نے اسے لاکر میری گود میں ڈالدیا ہے مگر وہ بچہ بے حد مہیب ہے بالکل سیاہ اور بہت بھاری بھرکم ۔ اس کے سارے جسم پر کپڑے کے بنائے ہوئے بھاری بھاری تعویذ لٹک رہے ہیں ان تعویذوں سے اس کا سارا جسم ڈھک گیا ہے اس کے چہرے پر بزرگوں جیسی سفید داڑھی ہے جو اس کی ناف تک آتی ہے اور سر پر ایک بھی بال نہیں ہے ، ایک موٹے سے فریم کا چشمہ لگائے وہ نوزائیدہ بچہ ایک گھناؤنی بدروح معلوم دے رہا ہے ۔ پھر اماں زور سے چلاتی ہیں ۔ ہٹا دے" ۔۔۔ اسے پھینک دے ۔۔۔ میرا کہنا مان اسے کہیں پھینک دے ۔ بس اس کے بعد میری آنکھ کھل جاتی ہے ۔" اس کی آواز اور بھی زیادہ کانپنے لگی ۔

اسے بھی یہ خواب سن کر کچھ وحشت سی ہونے لگی، وہ دھیرے سے کھنکارا۔
"خوابوں کی تعبیریں ہمیشہ الٹی ہوتی ہیں یہ صرف تمہارا ذہنی انتشار ہے اور کچھ نہیں"
اس نے اسے دلاسہ دیا۔
"ہاں یہی میرا بھی خیال ہے" اس نے بے خیالی میں جواب دیا پھر اچانک وہ اس طرح ہنس پڑی جیسے اس کے کسی نے گدگدی کی ہو
"کیا ہوا" وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا
اس نے اپنا قمیص پیٹ کے اوپر تک اٹھا دیا اور بولی
"کبھی تیرتا ہوا ادھر جاتا ہے کبھی ادھر، ایسا لگتا ہے جیسے پیٹ کے اندر کسی چوہے نے ہلکے سے کترا ہو۔ اوہ دیکھو پھر ہوئی کتر کتر۔۔۔" بڑا اچھا لگتا ہے" پھر وہ مسکراتے ہوئے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگی
اچانک اس کی آواز میں تمام جہاں کی ممتا سمٹ آئی۔
"میرا بچہ" اس نے لگ بھگ تتلا کر کہا۔
"یہ سو فیصدی لڑکا ہے۔۔۔ لڑکے بہت چنچل ہوتے ہیں پیٹ میں گھومتے رہتے ہیں۔"
اسے یاد آیا کہ شادی کے بعد جب گود بھرائی کی رسم میں استعمال ہونے والا ناریل توڑا گیا تھا تو اندر سے کیسا بھرا بھرا نکلا تھا۔ اس موقعہ پر گھر پر موجود عورتوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ ماشاءاللہ لڑکا ہوگا" جھنڈولا" کیا بھرا بھرا نکلا ہے۔
"مگر لڑکی بھی ہو سکتی ہے" اس نے تھوڑے توقف سے کہا۔
اس کے پھولے ہوئے سفید پیٹ پر ناف سے شروع ہو کر کالے رنگ کی ایک پتلی سی لکیر بنتی جا رہی تھی۔
وہ اس لکیر پر انگلی پھیرنے لگا۔
"یہ لکیر کیسی ہے؟"

"بن جاتی ہے اسے بالکل سیدھا ہونا چاہئے ورنہ کہتے ہیں کہ یہ ایک زہریلا سانپ بن کر پیٹ کو جکڑ لیتی ہے اور بچے کو ڈس لیتی ہے۔۔۔ دیکھنا بالکل سیدھی بن رہی ہے نا"!
وہ گھٹنے پھیلاتے ہوئے بولی۔
"ہاں بالکل سیدھی بن رہی ہے" وہ آہستہ سے بولا اور اس کے پیٹ کو قمیص سے ڈھانک دیا۔۔۔۔ تب اس کی بیوی کا شاید چھٹا مہینہ چل رہا تھا جب اسے تبادلے کے سلسلے میں اپنا چھوٹا سا قصبہ چھوڑ کر اس بڑے شہر میں آنا پڑا۔ جب وہ دونوں اپنے گھر سے رخصت ہو رہے تھے تو اس کی ماں نے کہا تھا۔

" بیٹیا پردیس میں دلہن کا خیال رکھنا اور کوئی بھی بات ہو تو فوراً مجھے اطلاع کرنا۔" لیکن حقیقت یہ تھی کہ بیوی کا روز بہ روز بڑھتا ہوا پیٹ اسے شدت سے دہشت زدہ کرتا جارہا تھا ۔۔۔ اب وہ اسے بالکل اچھی نہیں لگتی تھی۔ اس کی ساری کشش نہ جانے کہاں چلی گئی تھی، اب وہ اسے گندی، گندی سی نظر آتی، اکثر اسے بیوی کے قرب سے کراہیت سی محسوس ہوتی۔ یہ تو بہرحال حقیقت تھی کہ وہ کچھ پھوہڑ سی ہو گئی تھی اور سلیقہ بالکل بھولتی جارہی تھی۔ اس کے کھانے پینے کے انداز سے بھی نفاست غائب ہو گئی تھی۔ وہ اکثر رکابی میں بڑے بڑے نوالے توڑتی اور اس کا منھ ان نوالوں سے بھر کر بہت بھدے انداز میں پھول جایا کرتا۔ کھانا کھاتے وقت وہ بے خیالی میں تیل سے چکٹے اپنے بالوں کو کھجاتی جاتی اور اس کے منھ سے طرح طرح کی آوازیں نکلتیں، اکثر اس کے منھ کے لعاب کے ساتھ مل کر گیلے ہوئے لقموں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بڑی بے ترتیبی کے ساتھ اس کی باچھوں پر چپک جایا کرتے۔ اس کے میلے سے جمپر کے اوپری بٹن زیادہ تر کھلے رہتے جس کی وجہ سے اس کی روز بہ روز بھاری ہوتی ہوئی چھاتیوں کا اوپری حصہ جھانکتا رہتا اور ان کے اوپر گلے میں پڑا ہوا کالے رنگ کے کپڑے کا ایک میلا تعویذ ڈولتا رہتا۔ اس لیے یہ سب بہت برا لگتا تھا۔ وہ خود کو اس ماحول اور اس صورت حال سے کہیں بھی جڑتا ہوا محسوس نہیں کرپاتا تھا۔ بیوی سے باتیں کرنے میں بھی اسے اکتاہٹ سی محسوس ہوتی، لیکن آج بھی احمقوں کی طرح وہ بیوی کے سامنے زیادہ سے زیادہ رہنے کی کوشش کیا کرتا اور اس کی آنکھوں میں اپنی تصویر تلاش کرتا رہتا، اس کی سب سے بڑی کوشش یہی ہوتی کہ بیوی کا دھیان اس کے علاوہ کہیں اور نہ لگنے پائے، اس کا یہ متضاد رویہ اسے شدید قسم کے اعصابی تناؤ میں مبتلا کرتا جارہا تھا۔

"آؤ کھانا لے آئی"

وہ چونک پڑا۔ وہ ہاتھ میں ایک بڑی سی ٹرے لیے ہوئے کمرے میں داخل ہو رہی تھی، وہ کرسی سے اٹھ کر بستر پر آگیا۔ وہ دونوں پلنگ پر بستر لگا کر ہی کھانا کھاتے تھے،

"آج کل مجھے قبض بہت ہونے لگا ہے" اچانک کھانے کے درمیان وہ بول اٹھی۔ "صبح ٹوائیلٹ میں پسینہ پسینہ ہو گئی، اتنی تکلیف ہوئی کہ کیا بتاؤں" اسکو ابکائی سی آنے لگی مگر وہ برداشت کر گیا۔ وہ کہے جارہی تھی۔

"ڈاکٹر کو بتایا ہے بھئی۔ پیشاب میں بہت جلن ہوتی ہے، کل تو تمام دن پیشاب ہی نہیں آیا، اور رات کو آیا بھی تو بالکل پیلا اور جیسے جلا ہوا سا"

"کم از کم کھانا کھاتے تو ایسی باتیں نہ کرو" اس نے جھنجھلا کر نوالہ رکھدیا۔

"کیسی باتیں؟" بیوی کی تیوری پر بھی بل پڑ گئے۔

"میں خوب سمجھتی ہوں تم مجھ سے اکتا رہے ہو، ان باتوں سے گھن آرہی ہے تو پھر شادی

کیوں کی تھی ؟ یہ وقت تو سب کے لیے آتا ہے ۔ کل کو بچے کا پیشاب پاخانہ کیسے برداشت کرو گے ؟

"میرا یہ مطلب نہیں ہے ۔ میرا مطلب ہے کہ کھانا کھانے کے درمیان تم قبض وغیرہ کا تذکرہ لیکر بیٹھ گئیں ۔ طبیعت کو اچھا سا نہیں لگا"

شاید آگے بھی وہ کچھ کہتا لیکن اچانک اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ اسے کچھ عجیب نظروں سے دیکھ رہی ہے ۔ ان نظروں میں اسے اپنے لیے سخت قسم کی حقارت اور تضحیک نظر آئی ----

وہ خاموش ہو کر دیوار کی طرف دیکھنے لگا جہاں کھانا کھانے کے انداز میں پالتھی مار کر بیٹھی ہوئی اس کی پرچھائیں بے حد بھدی اور گھناؤنی سی نظر آرہی تھی ۔

اسی رات سونے سے پہلے اس نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا

انتہائی مکروہ اور سیاہ چہرہ ، بڑھی ہوئی ڈاڑھی کے بیچ میں سے بے جان سفید بال پیپ بھری پھنسیوں کی طرح جھانک رہے تھے ، وہ اس وقت بے حد اداس تھا ۔ لیکن یہ اداسی اس کے چہرے کو کوئی رومانی یا نرم پہلو بخشنے میں ناکام تھی ۔ نہ جانے کیوں اسے اپنا چہرہ ایک ایسے عمر رسیدہ گناہگار کا سا نظر آیا جس کے ماضی کے سارے گناہ رینگ رینگ کر اس کے چہرے پر چپک گئے ہوں ۔ اس نے سوچا کہ کل وہ شیو ضرور کرے گا ۔

"سنو !" اس کی بیوی کہہ رہی تھی

وہ خاموشی سے اس کے پاس آکر بیٹھ گیا

"مجھے گھر چھوڑ آؤ مجھے ساتویں مہینے میں پیر بدلنے میکے جانا چاہیے تھا مگر تم نے بھیجا ہی نہیں"

اس کے لہجے میں شکایت تھی ۔

" پتہ ہے عورت پر یہ کیا وقت ہوتا ہے " وہ ویران نظروں سے چھت کی کڑیوں کو گھورتے ہوئے کہہ رہی تھی ۔ کڑیوں میں مکڑی کے بڑے بڑے جالے لٹک رہے تھے ۔

" بچے کی پیدائش کے وقت فرشتے عورت کے پلنگ کے چاروں پائے تھامے کھڑے رہتے ہیں ، یہ بہت نازک وقت ہوتا ہے ۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تم میرے بچے کا خیال رکھو گے نا ؟"

اس کا گلا رندھنے لگا

" تم کیسی باتیں کررہی ہو " وہ کمزور سے لہجے میں بولا اور بیوی کے ماتھے پر اپنا کھردرا ہاتھ رکھدیا ۔

" مجھے یہاں اس کالونی میں بہت ڈر لگتا ہے ۔ ۔ ۔ شام کے جھٹپٹے میں کالونی میں لگے ہوئے یہ بغیر تاروں کے بجلی کے کھمبے مجھے بہت خوفزدہ کرتے ہیں جیسے کوئی دیواروں کے اوپر سے گھر کے اندر جھانک رہا ہو ۔ تم بہت دیر سے آتے ہو ۔ آج بھی تم نے آنے میں بہت دیر کردی " بیوی نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں سختی سے دبالیا ۔ اور نہ جانے کیوں سسک پڑی ۔

"اب جلدی آجایا کروں گا۔ تم سو جاؤ"

"چند دنوں سے مجھے وہ خواب پھر دکھائی دینے لگا ہے، دن میں بھی جب کبھی میری آنکھ لگ جاتی ہے تو جانے کہاں سے وہی ڈراونا خواب چلا آتا ہے۔ وہی مہیب سا بچہ ----بھاری بھاری تعویذوں سے ڈھکا ہوا"----!

"چپ ہو جاؤ۔ بار بار خواب دہراتے نہیں ہیں" اس نے جھک کر بیوی کے ماتھے کو چوم لیا

بیوی کے ہونٹوں پر ایک بہت اجلی مسکراہٹ پھیل گئی اور اس کی آنکھیں دوبارہ بھر آئیں۔

"آج تم نے کتنے دنوں بعد مجھے اس طرح پیار کیا ہے۔" اس نے سرگوشی کی۔ ورنہ تم ہمیشہ مجھے کچھ اس طرح دیکھتے رہتے ہو جیسے میں ہر وقت تمہاری کوئی چوری کر رہی ہوں---- تمہارے ہاتھ جل رہے ہیں۔ شاید تمہیں بخار ہے"

"ہو سکتا ہے۔ میں آج بہت تھک گیا ہوں" وہ آہستہ سے بولا

"باہر کچھ الٹا سیدھا تو نہیں کھاتے نا"۔ دیکھو چاول کا پرہیز مت توڑنا۔ اتنی کم عمری میں تمہیں ایسی بیماریاں لگ گئیں۔ پتہ نہیں خدا کو کیا منظور ہے۔ میں دعا کرتی ہوں کہ میرا بچہ خیریت کے ساتھ پیدا ہو اور تمام بیماریوں سے دور رہے۔ مجھے بیماریوں سے بہت خوف آتا ہے!"

وہ کچھ دیر تک اسے ایسے ہی دیکھتی رہی پھر اس کی پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔ اسے شاید نیند آرہی تھی۔ وہ بستر سے اٹھ گیا اور کھڑکی کا پٹ کھول کر باہر تاریکی میں گھورنے لگا۔ دور ایک شاہراہ پر روشنیوں کے دھبے گزر رہے تھے، باہر سے کہیں کائی لگے پانی کی بساندھ آرہی تھی۔

"فرشتے پلنگ کے چاروں پائے تھامے کھڑے ہیں" کسی نے اس کے اندر سرگوشی کی اسے اپنی زندگی اچانک بالکل بے معنی نظر آنے لگی، وہ ضائع ہو رہا ہے، جسم بیماریوں کی پوٹ بنا پڑا تھا۔۔۔اور روح بھی جسم کے ساتھ ہی دیمک زدہ ہو کر گلتی جارہی تھی۔ کہیں پر کچھ نہ تھا۔ اس نے اپنے آپ کو باہر پھیلے ہوئے اس بیکراں سناٹے کا ایک حصہ محسوس کیا۔ نہ جانے کہاں سے ایک صدیوں پرانی تھکن آکر اس پر حاوی ہونے لگی جیسے وہ بالکل بوڑھا ہو گیا ہو۔ اس کے پیر کپکپانے لگے۔ وہ اکیلا تھا۔ بالکل اکیلا۔

باہر ایک جھینگر لگاتار بولے جارہا تھا۔ اپنی جلد ہی واقع ہونے والی موت کے احساس سے یکسر عاری جھینگر کی یہ آواز اسے بڑی بے تکی سی محسوس ہوئی۔ انتہائی لاچاری کے عالم میں اس کا دل چاہا کہ وہ دوبارہ پیدا ہو جائے، کہیں بھی، کسی بھی روپ میں، کیسی بھی شکل لیکر اور کوئی بھی رنگت لیے ہوئے۔ کھڑکی کھول لینے پر باہر کا سناٹا اندر آکر کمرے کے فرش پر لوٹنے لگا تھا۔

"ادھر اس طرف پکے ہوئے گولر اب بھی دلدل پر گر رہے ہونگے" اس نے سوچا۔۔۔

دور شاہراہ پر اب بالکل تاریکی تھی۔ اس نے کھڑکی بند کر دی۔

اس نے دیکھا اس کی بیوی بے خبر سو رہی تھی۔ شاید وہ بھی بالکل اکیلی ہے اور بالکل بے قصور بھی ۔۔۔! قصور صرف آس پاس پھیلی ہوئی اس زندگی کا ہے۔ زندہ انسانوں کو ان کے گناہوں کے لیے معاف کرنا پڑے گا۔ اس نے سوچا۔

ہلکی ہلکی روشنی میں اسے اپنی بیوی کا چہرے بے حد پاکیزہ نظر آیا۔ ایک ایسے معصوم بچے کے چہرے کی طرح جو اپنا کھلونا ہاتھ میں لیے لیے سو گیا ہو۔ اس نے دیکھا اس کے رخساروں پر دو آنسو بہہ کر جم سے گئے تھے۔

پہلی بار اسے بیوی کے پھولے ہوئے پیٹ کی گولائی بہت حسین اور دلفریب نظر آئی۔

یہیں سے وہ دوبارہ جنم لے گا۔ اس نے سوچا۔

اور اب اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کس روپ میں اور کتنا خالص اور کتنا اصل سب کچھ فانی ہے۔ اور کسی بھی خواہش یا آرزو کے معنی ہی کیا ہیں؟ ہم صرف اپنے گناہوں کا اقرار کر سکتے اور کچھ بھی نہیں۔!

ایک پل کے لئے وہ یہ سوچ کر افسردہ ہو گیا کہ اس کے پیٹ میں چین کی نیند سونے والا جب باہر آئے گا تو زندگی اپنی تمام مضحکہ خیزیوں اور ستم ظریفیوں سمیت اس کے خیر مقدم کو تیار کھڑی ہوگی۔ "لیکن کون جانتا ہے۔ یہ بھی کون جانتا ہے" شدید قسم کی اداسی کے ساتھ اس نے سوچا پھر وہ آہستہ سے پلنگ پر بیٹھ گیا اور جھک کر بیوی کے ابھرے ہوئے پیٹ پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

دور شاہراہ پر کسی ٹرک کے گذرنے کی آواز مغرب سے آنے والی ہواؤں کے ساتھ مل کر اور بھی طویل ہوتی جا رہی تھی۔

اسی طرح ہونٹ رکھے رکھے اس نے اپنے کان پیٹ میں ہونے والی تمام آہٹوں پر مرکوز کر دیئے۔

باہر سناٹے میں کسی بھولے بھٹکے راہرو کے قدموں کی چاپ ابھری پھر معدوم ہو گئی۔

صـ۲۱۳ کا بقیہ:

اس کے یہاں سے رخصت ہو گیا ہو۔ کتنی ہی دیر سوچ میں پڑے رہنے کے بعد متذبذب لہجے میں بولا۔ "ہاں شاید۔ میرا مطلب ہے کہ اگر وہ واقعی وہی تھا تو پھر تو صبح کا انتظار، میرا مطلب ہے کہ بقول غنی صبح کا انتظار بے سود ہی ہے۔ مگر۔" رُکا۔ پھر بے یقینی کے لہجے میں رکتے رکتے بولا۔ "مگر پھر بھی ..... کیا خبر ہے کہ ......" کچھ کہتے کہتے رکا اور پھر سوچ میں پڑ گیا۔

خورشید اکرم

جابین(۱)

"جابین" ؟

یہ لفظ میرا جانا ہوا ۔ یہ آواز میری پہچانی ہوئی ۔ افق کی فیڈ ہوتی لالی اور اترتی شام کی سرمئی رنگت میں ہگلی کا پانی پگھلتے ہوئے تانبے کی طرح نظر آرہا تھا ۔ سامنے وشال ہوڑہ پل ۔ پیچھے بام مچھلی جیسا چھریرا ہگلی برج ۔ کھلا آسمان ، میٹھی ہوا ۔ برسوں بعد آج یہ ہوا جیسے مجھے نیا لطف دے رہی ہے ۔ پچھلے آٹھ برسوں میں کوئی شام ایسی نہیں آئی جس میں مجھے اس فضا، اس ہوا کا آنند ملا ہو ۔ اتنے برسوں بعد کلکتہ لوٹا ہوں تو لگتا ہے اس ہوا کے لیے ہی میں اتنا ناسٹلجک ہو جاتا تھا ۔ کوئی نہیں میرے ساتھ ۔ کوئی نہیں ۔ یار دوست سب اپنے اپنے کام میں ۔ اس طرح دیکھا جائے تو میں اکیلا ۔ مگر نہیں ۔ اس شہر میں میں کبھی اکیلا نہیں ۔ یہاں کی ہوا سے میری شناسائی ہے ۔ یہاں کی دھول گرد میرے اپنے ہیں ۔ اس کے راستوں سے میری دوستی ہے ۔ کسی بھی وقت کسی بھی جگہ میں رہوں ۔ ہر جگہ ایک اپنائیت ہے ۔ ہر شئے سے ایک انسیت ہے ۔ ہو سکتا ہے شیام بازار کی کسی گلی میں میں پہلی بار جاؤں لیکن دیکھتے ہی مجھے لگے گا یہ تو وہی ـــــ مٹیا برج میں ایک بس کنڈکٹر کو دیکھ کر خیال آئے گا اسے تو کہیں دیکھا ہے ۔ کون سی چیز ہے جس سے میں واقف نہیں ۔ کسی ڈبل ڈیکر بس کو پیچھے سے دیکھ کر بتا سکتا ہوں یہ خضر پور جارہی ہے کہ گول پارک ۔ رابندر سدن میں کوئی پروگرام چل رہا ہو ، میں وہاں آئے لوگوں کو دیکھ کر بتا سکتا ہوں یہ تھئیٹر دیکھنے آئے ہیں کہ پینٹنگز کی نمائش دیکھنے ۔ سارا کلکتہ میری ہتھیلی پر گلوب کی طرح رکھا ہوا ہے ۔ بلکہ یہ کہا جائے کہ میرے ہاتھ کی لکیروں کی طرح بالکل میرے سامنے ہے ۔ پچھلے آٹھ برس میں یہاں سے دور رہا ۔ مگر اس سے کیا ۔ میں یہاں کے پرندوں کو پہچانتا ہوں ۔ ہر آواز کو جانتا ہوں ۔ آنکھ بند کرکے بتا سکتا ہوں تماشائیوں کا یہ شور موہن بگان گراؤنڈ میں ہو رہا ہے کہ محمڈن گراؤنڈ میں ۔ یہاں کا سارا ہوئے ہُلّا ، ساری ہل چل ، ساری آوازیں ، ہر لہجہ ، ہر لفظ میرا جانا ہوا ہے ۔ یہ جو "جابین" کا لفظ ابھی میں نے سنا ہے یہ اس سے پہلے ان گنت بار سن چکا ہوں ۔ کلکتہ میدان میں

---

(۱) "جابین" کے معنی جائیں گے اور "بوشبین" کے معنی بیٹھیں گے ۔ لیکن کلکتہ کی کسبیوں کے یہاں یہ دونوں الفاظ خالص کاروباری معنوں میں استعمال ہوتے ہیں (خ ۔ ا)

وکٹوریہ کے پیچھے، میٹرو ریل کے راستے کے اوپر، کرزن پارک میں، گورنر ہاؤس کی دیوار کے سائے میں۔ جہاں جہاں کارپوریشن کی طرف سے روشنی کا معقول انتظام نہیں۔ جہاں جہاں اندھیرا، وہاں وہاں تلچٹے کے اڑنے کی گھرر گھرر جیسی یہ آواز سُنی ہے۔ اٹھارہ سال کی نوعمری میں جب پہلی بار یہ آواز سنی تھی تب کیسا سہر گیا تھا میں جیسے بچے تلچٹے کو دیکھ کر، گھن سے کہ ڈر سے، کیا جانے کیوں سہر جاتے ہیں۔ یہ کیا بھئی! لوگ آجا رہے ہیں۔ اسی میں کھلم کھلا دھندا چل رہا ہے بھاگو، یہاں سے جلدی بھاگو۔ کسی جان پہچان والے نے دیکھ لیا تو؟! تقریباً دوڑتا ہوا میں اس اندھیرے سے روشنی میں آیا۔ تو بھی جیسے ڈر نہیں جاتا۔ سامنے گرینڈ آرکیڈ کی دکانیں روشنی میں نہائی ہوئی تھیں۔ لوگوں کی بھیڑ، اس بھیڑ میں بھی لگ رہا تھا جیسے میں اکیلا ہوں۔ مجھے بچاؤ، اتنی روشنی میں بھی اپنے پر یقین نہیں آرہا تھا، جیسے میرا وجود اس اندھیرے میں ہی چھوٹ گیا ہے۔ جلدی سے ایک ریسٹورنٹ میں گھس گیا۔ غٹ غٹ دو گلاس پانی پی گیا۔۔۔۔ اور پانی لاؤ بھئی میرا گلا سوکھ کے ٹھانٹھ ہو رہا ہے۔ مگر اس کے بعد آہستہ آہستہ سب بدل گیا تھا۔ شہر اور عمر دونوں نے مل کر مجھے بہت کچھ سکھایا۔ مثلاً یہ کہ ایسی باتوں سے گھبراتے نہیں۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو بالکل عام ہے۔ اس اندھیرے میدان کے بیچ سے ایک شارٹ کٹ راستہ ہے۔ لوگوں کے چلنے سے سبز گھاس کے اس میدان میں ایک پگڈنڈی سی بن گئی ہے۔ اندھیرے میں وہ پگڈنڈی درگاماں کی مانگ کی طرح صاف نظر آتی ہے۔ پاؤں رکھتے ہی پگڈنڈی خود دو ہاتھ آگے آگے چل کر راستہ دکھاتی جاتی ہے۔ سو جو جانا چاہتا ہے جائے، برا کچھ بھی نہیں۔ مگر اس کے دونوں جانب اندھیرا۔ اندھیرے میں "جا بین"۔ پھر اس بات پر کتنی ہنسی آتی تھی یہی دیکھ کر میں اتنا ڈر گیا تھا۔ اس میں کیا دھرا ہے۔ کوئی کوئی نڈر بچہ تلچٹے کی دونوں ایریل نما مونچھوں کو پکڑ کر اٹھا لیتا ہے تو ساتھ کے لڑکے سوچتے ہیں۔ ارے ہاں! اس سے کیا ڈرنا۔ یہ تو کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ یہ کاٹتا نہیں، ڈستا نہیں، ہوا میں ٹنگا ہوا تلچٹا صرف بچنا چاہتا ہے۔ چھوڑ دینے پر جھٹ سے کسی اندھیرے کونے میں جا دبکتا ہے۔ جان بچی، ویسے ہی نڈر ہو گئے تھے ہم لوگ۔ مفت کی آوارگی جب سوجھتی تو ہم دوست کلکتہ کے کسی اندھیرے میں چلے جاتے۔ جا بین۔۔۔ بو شبین

"ہاں۔ بیٹھیں گے۔ سنو ذرا پاس آؤ۔ کیا نام ہے۔ عمر کتنی؟"

"عمر کا کیا کرنا ہے۔ شادی کرنا ہے؟" بیٹھنے آئے ہو۔ بیٹھو"

"واہ! دیکھیں گے نہیں۔ دیکھیں ذرا ایک چما تو دو۔ میٹھا ہے؟"

"۔۔۔۔ تو بیٹھ کر لو۔"

"اچھا لیکن یہ تمہاری پیٹھ پر اتنا پسینہ کیوں ہے۔"

"۔۔۔۔ ہٹاؤ ہٹاؤ ہاتھ ہٹاؤ۔ پیسہ دیے بنا ہاتھ نہ لگانا"

"اچھا اچھا! یہ بتاؤ کیا لوگی۔ عمر نہیں بتا کم سے کم ریٹ تو بتاؤ۔" ہاتھ مگر پیٹھ سے نہیں

ہٹایا۔

"ایک ایک آدمی پندرہ روپیہ کرکے لگے گا"

"اورے بابا! اس عمر میں اتنا دام، تین روپیہ کرکے دیں گے"۔

ہاتھ جھٹک کر چیخی "اپنی ماں کی ----- لے گا تین روپیہ میں۔ حرامی کا بچہ لوگ۔ روزگار کا ٹائم میں ٹھٹھا کرنے آیا ہے رنڈی کا لڑکا سب۔"

وہ گالیوں سے گندھاتی رہتی۔ ہم ہنستے۔ ہنستے ہنستے ہمارے پیٹ میں بل پڑجاتا۔ آج اتنے برسوں بعد اس سنی ہوئی آواز پر بھی ایک لمحے کو ٹھٹھک گیا۔ آؤٹ رام گھاٹ کے سامنے، فورٹ ولیم میدان سے لگے فٹ پاتھ پر ایسے وقت میں ایسی آواز کوئی بات حیرانی کی بہت نہیں ہے۔ رک کر دیکھا۔ درخت کی آڑ میں کھڑی ایک کمسن لڑکی میری طرف تاک رہی ہے۔ یہی کوئی پندرہ سولہ سال کی ہوگی۔ آس پاس اور بھی کئی درخت اور ہر درخت کی آڑ میں ایک ایک ----- آسمان میں پرندوں کے ڈار اپنے ٹھکانوں کو لوٹ رہے تھے۔ سامنے سرکلر ریل کے چھوٹے سے اسٹیشن پر آفس سے گھر لوٹنے کے لیے ٹرین کا انتظار کرتے ہوئے بابو لوگ کھڑے تھے۔ ٹھیک اس وقت جبکہ شہر کی کام کاجو زندگی کی چادر سمٹتی جارہی ہے، شہر کا ایک اور طبقہ اپنی دکان لگانا شروع کررہا ہے۔ اندھیرے میں" جابین" ؟ اس کمسن لڑکی کو دیکھ کر دل بیٹھ گیا۔ کون لے آیا ہے اسے اس اندھیرے میں۔ سوچا اس سے جاکر پوچھوں، ماں! اس اجلی عمر میں کون تمہیں اس اندھیرے میں لے آیا۔ جاؤ اپنے گھر جاؤ۔ یہ سب خراب۔ خراب وہ کیا نہیں جانتی۔ وہ جو یہاں آکھڑی ہوئی ہے تو اچھا برا ضرور جانتی ہوگی۔ وہ اگر گھر میں ہوتی تو اس وقت اس کا باپ اسے پکار کر کہتا ماں! اندھیرا ہورہا ہے۔ بتی جلادے۔ گھر میں ہوتی تو وہ صرف اچھا جانتی۔ اس عمر میں ہر لڑکی اچھا میٹھا جانتی ہے مگر وہ جب یہاں ہے تو ضرور جان گئی ہے کہ خراب کیا ہے۔ سوچتے سوچتے خیال آیا اس سے جاکر پوچھوں۔ ماں! برا تو جان لیا۔ اچھا میٹھا کیا ہوتا ہے یہ سواد تمہیں یاد ہے؟

کچھ کہے بغیر میں مڑگیا۔ اگرچہ وہ ایک ذرا سا مڑنا بھی بہت بھاری لگا۔ چند ہی قدم چلنے کے بعد محسوس ہوا جیسے ہوا رک گئی ہے اور مجھے سانس لینا دشوار ہورہا ہے۔ ہوا ضرور کم ہوگئی ہوگی۔ میرے پھیپھڑے اتنے کمزور نہیں کہ یہ چند قدم چلنے پر ہانپ جاؤں۔ ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔ تیس برس۔ ایک سانس میں ہوڑہ پل چھو کر آسکتا ہوں۔ بیریج میں جس طرح پانی کو باندھ کر رکھا جاتا ہے ٹھیک ویسے ہی ہوا بندھی ہوئی تھی۔ اچانک کوئی شئے میرے بالوں کو چھوکر گزری۔ بیاکل ہوا جیسے میرے چہرے کو چومنے کے لیے بے چین تھی۔ میرے سینے میں اترنے کو بے تاب تھی۔ میں نے زور سے سانس لے کر اپنے آپ کو تازہ کیا۔ آہ! یہ وہی کلکتے کی شام کی ہوا۔ یہ ہوا، یہ آسمان، یہ دریا۔ یہی تو مجھے اتنا ناسٹلجک کردیتے ہیں۔

پیدل چلنا اچھا لگ رہا تھا۔ آج آٹھ برس کے بعد یہاں اس راستے پر چل رہا ہوں۔ کتنا سچ

ہے یہ ۔ جیسے روز گھر سے آفس، آفس سے گھر جاتے ہوئے ذرا بھی سوچنا نہیں پڑتا، جتنی آسانی سے میں اپنے مکان کی سیڑھیاں چڑھتا ہوں ۔ یہاں کیا مجھے کسی سے پوچھنا پڑے گا، واہ! آکاش وانی اسی طرف ہے نا؟ ، ایڈن گارڈن اسٹیڈیم کی فلڈ لائٹ سے جیسے دن کا سماں ہو رہا تھا ۔ اسٹیڈیم میں ڈے اینڈ نائٹ کرکٹ میچ کھیلا جا رہا ہے ۔ بنگال کرکٹ ایسوسی ایشن کی صد سالہ یادگار چیمپئن شپ سنا ہے انڈین بیٹسمین ساؤتھ افریقن باولروں کو خوب پیٹ رہے ہیں ۔ یہ سیمی فائنل جیتنے پر فائنل میں ، فائنل میں بھارت کو کون ہرا سکتا ہے ایک صرف پاکستان کو چھوڑ کر ۔ خیر سے وہ اس ٹورنامنٹ میں نہیں ہے ۔ ہوتا بھی تو کیا ۔ بیٹا کراچی اور شارجہ میں جیت لیتے ہیں وہاں ان کا ہولڈ ہے ۔ یہاں جیت کر دکھائیں ۔ یہ کلکتہ ہے کلکتہ ۔ ایک لاکھ تماشائیوں کی چیخوں سے عمران خاں کی ریڑھ میں درد ہونے لگا تھا ۔ جانتے نہیں یہ کلکتہ میدان ہے --- تماشائیوں کی الماس بھری چیخ اٹھی ۔ ضرور چھکا لگا ہوگا ۔ جیت چاہئے جیت، بھارت کی جئے ، جئے ہند ۔

ادھر موہن بگان کلب میں اندر سے باہر تک قمقمے جل رہے ہیں اس سال موہن بگان کی جیت کا کوئی انت ہی نہیں ۔ لیگ چیمپئن تو ہوا ہی ۔ شیلڈ بھی جیتا ۔ اس کے بعد ڈی سی ایم پھر رووَرس کپ اور اب فیڈریشن کپ بھی ۔ مطلب یہ کہ بھارت کا چیمپئن فٹ بال کلب ایک سال کے لیے موہن بگان ۔ موہن بگان کی جئے ۔ سارے ہندوستان میں یہ کلکتہ فٹ بال کی جیت ہے ۔ کہنا چاہئے یہ بنگال کی جیت ہے ۔ جئے بانگلا ۔

آکاش وانی ، گورنر ہاؤس ، اسمبلی ہاؤس ، نیتاجی کا تیس فٹا مجسمہ ۔ سب جیسے اس روشنی میں چمک رہے ہیں ۔ بس جہاں ٹھہرتی ہے یا رک جاتی ہے ۔ مطلب یہ کہ اسٹاپ پر بھی اور ٹریفک سگنلوں پر بھی ۔ ایسی تمام جگہوں پر گھر واپس لوٹنے کے لیے لوگ بسوں کا انتظار کر رہے ہیں ۔ یہ ایک وچتر چیز ہے کلکتہ کی ۔ یہاں کے ڈرائیور ٹریفک رول سے نہیں چلتے ۔ یہاں کے لوگ سڑک کو محلے کی گلی سے زیادہ نہیں سمجھتے ۔ یہ اتنا چالو راستہ مگر کوئی رکتا نہیں ۔ جسے سڑک پار کرنا ہے وہ ادھر سے آرہی گاڑیوں کو ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کر کے پار ہو جاتا ہے ۔ جیسے یہ صرف ڈرائیور کا کام ہے لوگوں کو دیکھ کر گاڑی چلائے ۔ وچتر، مگر یہی اس کا چرتر ہے ۔ یہ سب کسی دوسرے بڑے شہر میں نہیں دیکھا جا سکتا ۔ دھنیہ کلکتہ ۔

اسمبلی ہاؤس سے ریڈ روڈ کی طرف مڑنے والے ٹریفک سگنل پر بہت سے لوگ بسوں کا انتظار کر رہے ہیں ۔ روشنی ان کے منہ پر ، روشنی ان کے کپڑوں پر ، روشنی ان کے پاؤں پر ، میرا کیا ، میں تو بس آوارگی کے لیے نکلا ہوں ۔ یہ جگمگاتی سڑک یہ جگمگاتی روشنی یہ اننگ کے آخری اوروں میں ایک ایک رن پر تماشائیوں کا شور ------ کتنے لوگ ہیں جنہیں زندگی میں یہ مسرت نصیب ہوتی ہے ۔ کتنے لوگ نے دیکھا ہے ۔ ہزار با ہزار بلب کی جس سیلابی روشنی سے اسٹیڈیم میں دن کا سماں ہو رہا ہے اس کی چھنتی ہوئی روشنی میں آس پاس کی سڑکوں پر گری ہوئی

ایک سوئی بھی تلاش کی جا سکتی ہے۔ یہ سب کئے لوگوں نے دیکھا ہے۔ یہ میرا کلکتہ ہے میرا گورو سینہ کیوں نہ پھولے میرا۔ سینہ پھولتا ہے تو بڑی چمتکاری باتیں دماغ میں آتی ہیں مثلاً یہی کہ مجھے خیال آیا ریڈ روڈ کو دیکھوں، کلکتہ کی سب سے خوبصورت سڑک اب بھی خواب جیسی خوبصورت دکھتی ہے کہ نہیں۔ دلی کا راج پتھ دیکھا۔ بمبئی کا میرین ڈرائیو۔ یہ سڑک ان کے مقابلے کم ہے کیا۔ زیادہ ہی ہوگی۔

وہاں کھڑی بھیڑ کے پاس پہنچ کر ٹھٹھک گیا۔ یہ لوگ، یہ اتنی عورتیں، کیا یہ سب بس کا انتظار کر رہی ہیں۔ نہیں۔ یہ ایک ---- دو ---- تین ---- چار ---- پانچ --- یہ بس کا انتظار نہیں کر رہی ہیں۔ یہ صرف انتظار کر رہی ہیں۔ ٹریفک کے شور میں بھی، ان کے نہ بولنے پر بھی، میں سن رہا ہوں یہاں کی ہوا میں "جابین" ----- "بوشبین" کی آواز کی لرزش۔ ان کے منہ بند ہیں مگر جگمگاتی روشنی میں ان کی آنکھیں بول رہی ہیں --- جابین۔ بچپن میں ہم لوگ چلچلاتی دوپہری میں شیشے کے ٹکڑے چمکا چمکا کر چھپر کے بانسوں کے خول میں چھپے چمگادڑوں کو نکل بھاگنے پر مجبور کر دیتے تھے اور دن کی روشنی میں کچھ نہ دیکھ پانے کی بے بسی میں چھٹپٹاتے اڑتے چمگادڑ کو دیکھ تالی پیٹ پیٹ کر ہاتھ لال کر لیتے تھے۔ ٹھیک اسی طرح ان کی آنکھ کے چمکتے شیشوں سے میرے اندر کے اندھیرے میں بیٹھا چمگادڑ چھٹپٹانے لگا۔ شکر ہے اتنے لوگوں میں سے کسی میں بھی اس چمگادڑ کو دیکھنے کی قوت نہیں ہے ورنہ وہ تالیاں بجا بجا کر مجھ پر ہنستے۔ اندھیرے کا دھندا اب ایسی جھک جھک روشنی میں چل رہا ہے۔ کوئی اگر کہے میں غلط ہوں۔ وہ صرف بس کا انتظار کر رہی ہیں۔ وہ گھر بار والی عورتیں ہیں ----- بس کے انتظار میں ----- میں شرط رکھ سکتا ہوں اگر میں غلط ہوا میں نوکری چھوڑ بھیک کا پیالہ لے کر کالی گھاٹ مندر یا مولا علی مزار پر جا کر بیٹھ جاؤں گا۔ پہچانتا ہوں۔ میں ان کے روئیں روئیں کو پہچانتا ہوں۔ اوہ! کتنا مشکل ہے۔ میں اگر نہ پہچانتا، دوسروں کی طرح میں بھی سمجھتا یہ گھریلو عورتیں ہیں۔ ان کی مانگوں میں سیندور ہے بالوں میں تیل ہے۔ ساڑی کے پلے کو داہنی کمر سے کھینچ کر بائیں کندھے سے پیٹھ تک انہوں نے ڈھانک رکھا ہے۔ جیسے سب بنگالی عورتیں ساڑی پہنتی ہیں۔ ان میں اور گرہستنوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ صرف یہاں ایک فرق ہے۔ گرہستنیں یہاں کھڑی بس کا انتظار کر رہی ہیں۔ یہ وہ انتظار نہیں کر رہیں .....

مگر یہ یہاں کیسے کھڑی ہیں۔ اتنی روشنی میں۔ انہیں شرم لاج کچھ نہیں۔ کیا دنیا کے کسی کونے میں اندھیرا نہیں بچا۔ جی میں آئی ان سے جا کر کہوں۔ بتیاں بجھنے دو۔ انہوں نے جیسے میرے دل کی بات سن لی ہو۔ وہ بولیں۔ "سنئے! آج یہاں اتنا اجالا ہے۔ روز کیا اتنا ہوتا ہے۔ دو دن پہلے یہاں آکر دیکھتے۔ دو دن بعد آکر دیکھئے گا اتنی روشنی نہیں ہوگی۔ یہ سیلابی روشنی بڑے لوگوں کے چونچلے ہیں۔ ہماری یہ پرمننٹ جگہ ہے ہم اسے چھوڑ کر یہ کتنے دن کہاں جائیں" رہو

بابار ہو۔ میں وہ نہیں کہہ رہا۔ میں تو بس اتنا کہہ رہا ہوں تمہارا یہ اندھیرے کا دھندا ایسی جگمگاتی روشنی میں۔ کوئی لجا نہیں۔ کوئی مریادا نہیں۔ بنگال کی آدرش ناری کے سنسکاروں کا کوئی پاس نہیں۔ دو دن بعد کیا تم یہاں ساڑی اتار کر کھڑی ہو جاؤ گی۔ تمہیں لاج شرم ذرا نہیں ہے تم میں، ہے، ہے جناب! بہت شرم ہے ہم میں۔ آپ ہمارے گھر آکر دیکھئے۔ ہم بھی عورت ہیں۔ مگر چوبیس گھنٹوں میں جو چار گھنٹے ہم یہاں ہیں اپنے دھندے پر" یہ چار گھنٹے اگر ہم شرم کریں تو ہمیں باسی بھات بھی نہیں ملے گا۔ ان چار گھنٹوں ہمیں روشنی اور اندھیرا کسی سے شرم نہیں۔ لڑکا، جوان، ادھیڑ، بڈھا، کسی کا لحاظ نہیں۔ اوپر بیٹھا وہ۔۔۔ اس سے بھی نہیں،

کہاں میرا گورو۔ کہاں میرے سپنوں کا ریڈ روڈ۔ کچھ دیکھے بغیر۔۔۔۔ جیسے مجھے اب اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ مجھے صرف لگ رہا ہے یہ سڑک پار کر جاؤں۔ ایک سڑک پار کر کے لگتا وہ سڑک پار کر جاؤں۔ وہ پار کر کے لگتا وہ۔۔۔۔ ٹرام لائن پار کر کے دیکھا سامنے گاندھی جی کا مجسمہ۔ وہاں خاصی روشنی تھی۔ اسٹیچو کے سر سے پیٹھ تک کوؤں کی بیٹ بھری ہوئی تھی۔ ریلنگ پھلانگ کر اندر چلا گیا۔ بہت چل چکا ہیں۔ بہت سے بہت زیادہ چل چکا ہیں۔ بیٹھنے کے سوا چارہ نہیں۔ اس جگہ بہت پہلے ہم چار دوست آکر بیٹھے تھے۔ بیٹھے تھے؟ ارے بابا! وہ ہنگامہ کیا ہم نے۔ تب ہم چاروں نے مل کر ایک نیا زینت کیمرہ خریدا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب زینت کیمرے پر میڈ ان یو ایس ایس آر، کی مہر لگی ہوئی تھی۔ نئے کیمرہ میں ریل بھر کے ہم پہلی جنوری کو نکلے تھے اپنے کلکتہ کے دل یعنی دھرمتلہ کے خاص خاص اسپاٹ کی تصویریں کھینچنے کے لیے۔ طرح طرح کی تصویریں۔ طرح طرح کا ایکشن۔ اس دن ہم لوگوں نے یہاں گاندھی جی کے اسٹیچو کی کئی تصویریں اتاری تھیں۔ ایک ایسی جس میں اسٹیچو کے پیچھے چورنگی انٹرنیشنل سینٹر، ماما بلڈنگ وغیرہ۔ ایک ایسی جس کے پس منظر میں ایڈن گارڈن اسٹیڈیم۔ جو نہیں جانتا اسے تصویر دکھا کر بتایا جا سکتا ہے یہ ایڈن، اس کے پیچھے ہگلی۔ ہگلی پر اس طرف ہوڑہ پل۔ پل پار ہوڑہ اسٹیشن۔ اسٹیشن سے ٹرین پکڑو چلے جاؤ بہار۔ بہار میں جا کر دیکھو آؤ جھمری تلیا۔ ایک اور جعلی تصویر ایسی اتاری گئی تھی جس کو دیکھ کر لگتا تھا میرا ایک ہاتھ گاندھی جی کے کندھے پر دوسرا ان کی لاٹھی کو سہارا دیئے۔ تصویر سے معنی نکلتا وہ ہمیشہ اکیلے نہیں چلیں گے۔ میں ہوں ان کے ہمراہ چلنے کو تیار۔ دوسرے سب ساتھی اس تصویر کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے" کس ٹکنیک سے یہ تصویر اتاری بھائی؟"

"مت پوچھو یار! ایک تو ہماری ٹیکنک۔ دوسرا یہ دیکھو۔ کیمرا یہ دیکھ رہے ہو نا۔ کہاں کا ہے، معلوم؟ یہ رشین کیمرہ ہے۔ کھیل ہے کیا۔ بارہ سو روپئے نقد دے کر فینسی مارکٹ سے خریدا ہے، اوریجنل"

کتنے دنوں تک اپنی اس تصویر کو ہم سب کو دکھایا کرتے تھے۔ کیا پتہ وہ تصویر اب کس

کے پاس ہے۔ میرے پاس تو نہیں ہے۔ ہے بھی کہ نہیں مجھے تو شک ہے۔ ایک وقت میں ایک چیز کتنی عزیز ہوتی ہے۔ بعد میں اسے سنبھال کر رکھنے کی بھی جگہ نہیں ملتی مثلاً پریم پتر۔

وہاں سے اٹھتے ہوئے سوچا پارک اسٹریٹ کے کسی ریستوراں میں آرام سے ہاتھ منھ دھو کر ایک کافی پیوں گا۔ ایسا کیا۔ کوئی مل گیا تو کسی بار میں ••• لمبا اور خالی راستہ۔ دوسرے سرے پر پارک اسٹریٹ موڑ۔ فٹ پاتھ پر اکادکا لوگ۔ سڑک گاڑیوں سے بھری ہوئی۔ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ مجھے کاہے کی جلدی۔ اس وقت مانو اپنے ہی شہر میں سیاح ہوں۔ سوایک گز آگے چلنے کے بعد دیکھا سامنے سے ایک مدر فیگر عورت چلی آرہی ہے۔ یہی کوئی فرلانگ بھر دور ہوگی۔ اسے دیکھ کر لگا اسے بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔ کچھ خاص کہیں جانا نہیں۔ وہ بھی کیا میری طرح۔ شام کی خوشگوار ہوا بہہ رہی تھی۔ آسمان پر کالے بادل چھا گئے تھے۔ یہی ہے کلکتہ۔ کب چاند نظر آئے گا، کس پل بادل گھر آئیں گے کچھ پتہ نہیں۔ پھر ہو سکتا ہے تھوڑی دیر میں ہوا ایک دم بند ہو جائے۔ تب لگتا ہے جیسے آدمی پریشر کو کر کے اندر ہے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ خاتون میری طرف دیکھ رہی ہے۔ ویسے ہی دیکھ رہی ہوگی۔ ہو سکتا ہے اس وقت میری طرح اس کا ایک بیٹا ایسے ہی کسی راستے پر سڑ گشتی کر رہا ہوگا۔ یہی سوچ کر وہ میری طرف ـــــ مگر نہیں۔ وہ میری طرف تاک رہی ہے۔ امید بھری نگاہ سے۔ کون سی امید؟ وہ بھکارن تو نہیں۔ سمجھ گیا۔ ابھی وہ میرے پاس آئے گی۔ رونی صورت بنا کر کہے گی، بیٹا! میرا آدمی پی۔ جی میں بھرتی ہے۔ اسے بلڈ کینسر ہو گیا ہے۔ اس کے علاج کے لیے کچھ مدد کرو۔ میں تم سے بھیک نہیں مانگ رہی۔ میرے بچے ـــــ میری کچھ مدد کرو۔ تمہاری نوکری میں ترقی ہو۔ بیوی بچے صحت سے رہیں ـــــ یہ نہیں تو کہے گی، بابو، میرے میاں کے کارخانے میں لاک آؤٹ ہو گیا ہے میرے بیٹے بیٹی ـــــ یا، بھگوان، تمہیں سکھی رکھے۔ مجھے اپنی بیٹی کو بیاہنا ہے۔ اگلے ہفتے اس کا بیاہ۔ میں غریب بیوہ میری کچھ مدد کرو۔ میری عزت •••• جانتا ہوں جانتا ہوں سب۔ ٹھگ بازی۔ میں خوب جانتا ہوں۔ جب سے کلکتہ ہوا ہے تب سے اس طرح کی کوئی نہ کوئی ٹھگ بازی چل رہی ہے۔ جن کے اندر میاد یا زیادہ ہے بدھی کم وہ بڑی آسانی سے ان کے پھندے میں پڑ کر جیب ڈھیلی کر دیتے ہیں اور سوچتے ہیں بھگوان اس پنیہ کا پھل دے گا۔ اس طرف ٹھگ پیٹھ گھما کر ہنستا ہے۔ احمق آدمی! کلکتہ میں رہتا ہے۔ اس کے بعد ہاتھ میں پیسے لیے لیے آسمان کو سلام کرتا ہے۔ بھگوان! تم نے اس دنیا میں مور کھ نہ بنائے ہوتے تو ہم جیسے تو بھوکے ہی مر جاتے۔ دیکھا ہے، بہت دیکھا ہے یہ سب اس شہر میں۔ کوئی بات نہیں بھولا ہوں اس شہر کی۔ آئے وہ میرے پاس۔ چونی بھی نہیں دوں گا میں اپنی کسی نیکی کے پھل کی تمنا نہیں کرتا اور ایسی نیکی کی تو ہرگز نہیں۔

میری اور اس کی دوری بہت کم ہو گئی تھی۔ اس ادھیڑ خاتون کی شکل شباہت لباس لیجے سب ٹیپکل کلکتیا لوئر مڈل کلاس گھرانے کی عورتوں جیسا۔ تو گویا میرا اندازہ صحیح نکلا۔ وہ ابھی

میرے پاس آکر ویسا ہی کوئی دکھڑا سنانا شروع کر دے گی ۔ دوں گا تو ایک پیسہ بھی نہیں ۔ مگر سنوں گا ضرور ۔ دیکھوں آج کل ان ٹھگ بازوں کے یہاں کیا ٹرینڈ چل رہا ہے ۔ نیا کچھ آیا کہ وہی پرانی بابا آدم کے زمانے کا راگ ۔ میرا مرد ۔۔۔ میری بیٹی ۔۔۔ میری عزت ۔۔۔۔

وہ میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی ۔ میں بھی بڑے اطمینان سے کھڑا ہو گیا ۔ دیکھوں! اچانک اس کی آنکھ کی چمک سے میرے اندر چھپا چمگادڑ بے چین ہو کر چھٹپٹانے لگا ۔ میں اس آنکھ کو جانتا ہوں ۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ۔ اس عمر میں یہ آنکھ ۔ نہیں نہیں ۔ اس آنکھ کی چمک سے میرے اندر کا چمگادڑ لگاتار چھٹپٹا رہا تھا ۔ کہو کہو ۔ کہنا چاہتی ہو اے خاتون ! تم ہی کچھ کہو ۔ میرا تو گلا سوکھ رہا ہے ۔ میرے پاؤں جمے جا رہے ہیں ۔ خدا کے لیے تم اپنا دکھڑا سنانا شروع کرو ۔ میں ضرور کچھ نہ کچھ دوں گا ۔ خالی ہاتھ نہیں جاؤ گی تم ۔۔۔ کہو

وہ میرے اور پاس آ گئی اور داہنی طرف کے اندھیرے میدان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی" جائیں ؟"

انیس اشفاق کی دو نئی کتابیں

اردو غزل میں علامت نگاری

(ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی)

- علامت اور متعلقہ اصطلاحات کے مفاہیم کا تعین
- علامت کی تخلیق کے محرکات اور علامت کا دائرۂ عمل
- اردو شاعری کا علامتی نظام اور علامتوں کا بدلتا ہوا مفہوم
- ممتاز غزل گو شاعروں کا انفرادی علامتی نظام
- تعبیر متن اور منشائے مصنف کی بحث
- اس کتاب کے مباحث کا دائرہ صرف اردو غزل کی علامتوں تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں تمام ادبی رموز و علائم کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔

ادب کی باتیں

- نئے اور پرانے ادب کی نئی تفہیم و تعبیر
- قائم، انیس، دبیر، یگانہ، جوش، فراق اور فیض وغیرہ کے جدید مطالعے
- تعبیر متن کے مسائل
- نئی غزل ۔ نئی علامتیں
- البیئر کامیو ۔ ایک تعارف

ملنے کا پتہ:۔ نصرت پبلشرز ۔ حیدری مارکیٹ، امین آباد ۔ لکھنؤ

خصوصی مُطالعہ

کشکول محمد علی شاہ فقیر

"... گویا دبستاں کھل گیا"

مرزا حامد بیگ

چودھری محمد علی ردولوی

نام : محمد علی

قلمی نام : چودھری محمد علی / محمد علی ردولوی

پیدائش : ۱۸؍ مئی ۱۸۸۲ء بہ مقام ردولی، ضلع بارہ بنکی، صوبہ اودھ (بھارت)

وفات : ۱۹۵۹ء

تعلیم : مکتب، کالون تعلقہ دار اسکول، لکھنؤ میں داخلہ لے کر چھوڑ دیا۔

مختصر حالاتِ زندگی

قوم شیخ صدیقی، ساکن ردولی، آبائی پیشہ تعلقہ داری۔ نام تعلقہ: امیر پورہ، ضلع بارہ بنکی، صوبہ اودھ۔ ماں باپ کا مذہب تشیعہ تھا۔ جس زمانے میں شبلی نعمانی اسلامی دنیا کے سفر سے واپس آئے تو انھوں نے ہوش سنبھالا۔ مرزا عبدالقادر بیدل اور مرزا غالب کے تتبع میں قلم کاری کا آغاز کیا اور نثر میں صاحبِ اسلوب ہوئے۔

محمد علی ردولوی ابھی ڈھائی برس کے تھے جب ان کے والد کا انتقال ہوا اور وہ خود تعلقہ دار ہو گئے۔ تعلقہ امیر پورہ، ضلع بارہ بنکی کو کورٹ آف وارڈز نے اپنے انتظام میں لے لیا۔ والدہ نے مارے لاڈ پیار کے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا اور یوں اسکول کی باقاعدہ تعلیم سے محروم رہے۔ کورٹ آف وارڈز کے انگریز مینیجر نے زبردستی کالون تعلقہ دار اسکول، لکھنؤ میں داخل کروا دیا۔ اسکول سے فرار کے بعد چودھری صاحب نے انگریزی ادب، فلسفہ اور آرٹ کے گہرے مطالعے کے ساتھ ساتھ مذاہبِ عالم کے تقابلی مطالعے اور کارل مارکس میں دلچسپی لی۔

نوجوانی میں جج کرامت حسین کے عقیدت مند اور آخر میں مجتہد ناصر حسین کے حلقہ ارادت میں رہے۔ زندگی بھر لٹریچر کو بطور مشغلہ اور فلسفے کو اوڑھنا بچھونا کیا۔ جس زمانے میں ان کا تعلقہ کورٹ کے زیرِ انتظام رہا تو چند دن کے لئے بینک میں ملازمت کا شوق پورا کیا۔ چھ برس تک صوبائی کونسل میں اودھ کی نمائندگی

کی۔ بہت اچھے شاعر تھے۔ تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا۔

اوّلین تحریر

"اتالیق بی بی" (کتابچہ) اس کے ناشر خود چودھری محمد علی ردولوی تھے۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب)

۱۔ "اتالیق بی بی" (مزاحیہ) دل گداز پریس، لکھنؤ۔ ۲۔ "صلاح کار" (جنسیات) ناشر: چودھری محمد علی ردولوی سرفراز قومی پریس، لکھنؤ۔ طبع اوّل: س۔ن۔ ۳۔ "نقادی کے نکتے" (قلمی تصاویر کی پرکھ سے متعلق کتابچہ) سرفراز قومی پریس، لکھنؤ۔ طبع اوّل: س۔ن۔ ۴۔ "خبطی" (مزاحیہ) انوار بکڈپو، لکھنؤ۔ طبع اوّل سنہ ۱۹۴۰ء۔ ۵۔ "یادگار مولانا کرامت حسین مرحوم سابق جج الٰہ آباد بانی گورنمنٹ" (سوانحی کتابچہ) ناشر: چودھری محمد علی ردولوی (یہ رسالہ مفت تقسیم ہوا)۔ ۶۔ "گناہ کا خوف" (افسانے) ناشر: چودھری محمد علی ردولوی۔ تقسیم کار: نیا سنسار، لکھنؤ۔ طبع اوّل: س۔ن۔ ۷۔ "میرا مذہب" (مذہبیات/فلسفہ) ۸۔ "پردے کی بات" (ضبطِ تولید سے متعلق کتابچہ) ناشر: چودھری محمد علی ردولوی۔ تقسیم کار: نیا سنسار، لکھنؤ۔ ۹۔ "کشکول محمد علی شاہ فقیر" (افسانے/خاکے) صدیق بکڈپو، لکھنؤ۔ طبع اوّل: س۔ن۔ ۱۰۔ "دبستان کھل گیا" (خطوط) اکادمی پنجاب، لاہور۔ طبع اوّل: س۔ن۔ ۱۱۔ "نادر کہانیوں اور افسانوں کا مجموعہ کشکول" (مرتبہ: سیّد علی کاظم) اردو اکادمی سندھ، کراچی۔ طبع اوّل: سنہ ۱۹۸۰ء۔ اس کتاب میں "کشکول محمد علی شاہ فقیر"، "گناہ کا خوف" اور "اتالیق بی بی" تین کتابیں یکجا کر دی گئی ہیں۔ ۱۲۔ "سیرۃ الاقطاب اردو" (سوانح) نول کشور، لکھنؤ۔ طبع اوّل: سنہ ۱۹۴۲ء سے قبل۔

غیر مدوّن:۔ ان مطبوعہ کتب کے علاوہ مجلّہ "معلومات" میں شائع شدہ ایک ایکٹ کے تین ڈرامے "عیاش کسان"، "کسان" اور "سعید اور سلمہ" ہیں۔ "معلومات" اور "اودھ پنچ" میں بکھرے ہوئے مضامین اکٹھے کیے جائیں تو ایک کتاب کا مواد مل سکتا ہے۔ "آسکر وائلڈ" کے "مقدمہ فند موت" اور "برنارڈ شاہ" کے "پیراڈاکس" کے تراجم اس کے علاوہ ہیں۔

نظریہ و فن:۔ "ان دو چار کہانیوں میں برخلاف اس نئے طرز کے وہی پرانا روّیہ برقرار رکھا گیا ہے۔ یعنی جہاں تک ممکن ہو نیچر کی پیروی رہے۔ چھوٹا دماغ بڑا تخیل پیدا نہیں کر سکتا۔

کافرِ نتوانی شد ناچار مسلمان شو اور عصمت بی بی از بے چادری

میں نے بھی وہی پرانا طرز اختیار کیا ہے۔ نئی بات نہ سہی، خدا کرے قدیم ہی ڈھرے پر چلنے بن گیا ہو۔"

(بحوالۂ دیباچہ "گناہ کا خوف" از محمد علی ردولوی)

مولانا صلاح الدین احمد (مرحوم)

محمد علی ردولوی۔ اردو کا اولین فطرت نگار

انیسویں اور بیسویں صدی کے سنگم پر ہماری زبان میں دو ایسے لکھنے والے نمودار ہوئے جنھوں نے اپنے بیان کی شستگی اور اظہار کی سلاست اور ادا مطالب کی بے مثال صلاحیتوں سے اردو کی حدود کو حدِ نظر تک پھیلا دیا اور عوام کو پہلی بار نہ صرف اعلیٰ درجے کی نثر سے لطف اندوز ہونے اور فائدہ اٹھانے کا موقع دیا، بلکہ اس رشتے کی تخلیق کی جو مصنف کے قلم کی لرزش کو جمہور کے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ کر کے ادب کی ایک لازوال خدمت انجام دیتا ہے۔ یہ دونوں اپنے اپنے رنگ میں منفرد تھے اور اگرچہ بنیادی طور پر ان میں ایک یک جہتی پائی جاتی تھی لیکن دونوں کے اسالیب نگارش اپنی علاحدہ علاحدہ امتیازی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ نہ صرف یہ، بلکہ دونوں کے کام کے میدان بھی جدا جدا تھے۔ ایک اگر خارجی دنیا کے میدانِ نا پید اکنار کا شہسوار تھا تو دوسرا دریائے دل کی گہرائیوں کا غوطہ زن۔ ایک اگر ابلقِ صحافت پر سوار، جادہء ادب کی نئی نئی منزلیں طے کر رہا تھا تو دوسرا مجلسِ احباب میں تکیہ لگائے اپنی موہنی کے عمل سے دلوں کے قلعے تسخیر کیے چلا جا رہا تھا۔ اتفاقِ زمانہ دیکھیے کہ ایک نے کم و بیش چالیس برس ہوئے اپنی بساط عمل تہ کر کے رکھ دی اور دوسرا جس آہستگی اور خاموشی سے اس میں داخل ہوا تھا، آج بھی اس کے پُر بہار راستوں پر اسی طرح دبے پاؤں چل رہا ہے۔ اور اپنی اس سیر صبح گاہی میں کبھی کبھی ہمیں بھی شریک کر لیتا ہے۔ ناظرین! ان میں سے ایک کا نام عبدالقادر اور دوسرے کا محمد علی ہے۔ وہ دونوں ہم سن ہیں اور خدا کرے کہ ایک عرصہ دراز تک اس زندگی میں ہم سن ہی رہیں۔

محمد علی جب اپنے عروج پر پہنچتے ہیں تو ہوا نصیبن یا امامن مہری کی زبان میں نفسیات انسانی کی وہ وہ گتھیاں سلجھا کے رکھ دیتے ہیں کہ ناظر ششدر رہ جاتا ہے۔ محمد علی اگرچہ اپنے افسانوں اور خاکوں کی بنیاد بیش تر محسوساتِ خارجی ہی پر رکھتے ہیں، اور وہ جو کچھ اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھتے ہیں وہی کچھ عین میں ہمیں دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اپنے موضوع کی طرف ان کی پیش قدمی خالصتاً داخلی اور نفسیاتی ہوتی ہے۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے ناظر کا ہاتھ پکڑے ایک نامحسوس انداز میں اسے اس دنیائے سنگ و خشت سے نکال کر، اس عالمِ خیال میں لے کر اتر جاتے ہیں، جس کی رنگینی، حقیقت کی عریاں سادگی سے آنکھیں ملاتی ہے اور محجوب نہیں ہوتی۔ محمد علی حقیقت پرستی اور خیال آفرینی کا ایک بے رحمانہ امتزاج پیش کرتا ہے، اور

ازبس کہ وہ اپنے مشاہدے میں صداقت سے کبھی آنکھیں نہیں چراتا، اور اپنے بیان میں تخیل کی باگیں کبھی ڈھیلی نہیں چھوڑتا، اور اس لیے اس کا پیش کردہ امتزاج فنی ادب میں ایک نہایت صحت مند معیار کا درجہ رکھتا ہے۔ اور اس معیار پر بہت کم فن کاروں کی تخلیقات پوری اترتی ہیں۔ محمد علی کا موضوع بیش تر صورتوں میں خود انسان اور اس کا وہ جہان خیال ہے جس میں وہ اس مختصر زندگی کے چند لمحے بسر کرتا ہے۔ اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ان کی تخلیقات بیش تر ان کی تخیل کی مرہون ہوتی ہیں یا وہ ان کی تعمیر کا مسالہ سراسر اس دنیائے داخلی سے حاصل کرتے ہیں جو ان کے اپنے ذہنِ رسا میں آباد ہے۔ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ محمد علی اپنے فکر کو زیادہ تر افسانے کا لباس پہناتے ہیں اور اپنے افسانوں میں نفسیاتِ انسانی کے بعض نازک ترین پہلوؤں کو بھی بے نقاب کر جاتے ہیں لیکن اس میں قطعاً کلام نہیں کہ وہ بنیادی طور پر مفکر نہیں بلکہ خالص افسانہ نگار ہیں۔ وہ آپ کو اس لیے کہانی نہیں سناتے کہ اس کے ذریعے سے وہ اپنی فکر کی کسی کاوش یا اپنے تخیل کی کسی گرفت کا اظہار چاہتے ہیں بلکہ وہ اس لیے سناتے ہیں کہ انھیں اسے سنائے بغیر چارہ نہیں اور اگر نہ سنائیں تو شاید بیمار ہو جائیں۔ وہ نہ تو نذیر احمد کی طرح کسی معاشرتی اصلاح کے علم بردار ہیں، نہ پریم چند کی مانند سماج کے بعض انوکھے تقاضوں کے ناز بردار۔ اور نہ انھیں ہمارے ترقی پسند دوستوں کی طرح جسم فروش یا مزدور طبقے کے مسائل کا کوئی افسانوی حل تلاش کرنے کی مجبوری ہے۔ میری ناچیز رائے میں وہ زندگی کے محض ایک خوش نظر تماشائی ہیں کہ اس کے پر رونق بازار میں سے اس کی رنگا رنگ کیفیتوں کا جائزہ لیتے ہوئے خراماں خراماں چلے جا رہے ہیں اور جہاں کہیں ان کی نگاہ کسی دلچسپ چیز پر پڑتی ہے وہ ایک لمحے کے لیے رک کر اسے نظر بھر کر دیکھ لیتے ہیں اور پھر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی نگاہ کیوں اور کہاں رکتی ہے اور اس انتخاب کے عناصر کیا کیا ہوتے ہیں۔ ان عناصر کا ایک ہلکا سا جائزہ، ہم آگے چل کر لیں گے، یہاں مجھے صرف اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ محمد علی کسی مقصد یا نظریے کی تبلیغ کے لیے کوئی کہانی بنا کر ہمیں نہیں سناتا، نہ اپنے کسی تخیل پارے کو پھیلا کر افسانے کے لباس میں پیش کرتا ہے بلکہ وہ زندگی کا ایک زیرک طالب علم ہے۔ اور اس کے مطالعے میں جو غیر معمولی یا لطیف یا مضحکہ انگیز صورتیں اس کے سامنے آتی ہیں یا اپنے طویل مشاہدے اور تجربے کی بنا پر وہ زندگی کی مختلف کیفیتوں سے جن نتائج کا استخراج کرتا ہے ان صورتوں اور ان نتائج کو وہ ایک نہایت لطیف و بلیغ پیرائے میں، کہ سلاست و رنگینی سے بہ یک وقت متصف ہوتا ہے، ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے۔ اور پھر اس بات سے قطعاً بے نیاز ہو جاتا ہے کہ ہم اس کی پیشکش سے کس طرح متاثر ہوتے ہیں۔ وہ ایک خالص آرٹسٹ ہے، اور اسے اپنی تخلیقات سے یہیں تک سروکار ہے کہ وہ اس نہاں خانہ محسوسات سے نکل کر لباسِ اظہار پہن لیں۔ رہا یہ کہ ہم ان کے جمالِ جہاں آرا سے کیا اثر قبول کرتے ہیں، اس سے اسے کوئی غرض نہیں

اس کا یہ اندازِ نظر اپنے موضوع تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ اس کے ذریعے اظہار یعنی زبان اور الفاظ کی نسبت بھی ایک انفرادی بلکہ خود سرانہ رویہ روا رکھتا ہے۔ وہ اس بارے میں کسی سمجھوتے کا بھی قائل نہیں۔ اور وہ ایک مخصوص ذہنی کیفیت کو عین وہی الفاظ دینے پر اصرار کرتا ہے، جن میں وہ اس پر وارد ہوئی اور اگر آپ قبول عام یا رواج ادب، یا خوفِ محتسب کے پیشِ نظر اسے کسی متبادل لفظ یا ترکیب کی طرف متوجہ کریں، تو وہ اسے سو میں سے نوے صورتوں میں رد کر دے گا اس سلسلے میں مجھ سے چودھری صاحب کی متعدد جھڑپیں ہوئیں، اور اگرچہ انھوں نے میرے ادارتی اختیارات سے مجبور ہو کر اکثر میری بات مان لی، لیکن کس طرح مانی، یہ ان کا دل ہی جانتا ہے۔ دو ایک موقعوں پر البتہ وہ میری ترمیم سے خوش بھی ہوئے لیکن یہ مواقع بہت شاذ تھے۔ تو اس سے ان کے خالص فنی زاویہ۔ نگاہ کا پتہ چلتا ہے۔ فن کار اپنی غیر مرئی محسوسات کو لباسِ اظہار پہناتا ہے، اولاً اس لیے کہ وہ اس کے لیے اپنے آپ سے مجبور ہے۔ اور ثانیاً اس لیے کہ وہ قدرت کی طرف سے تقسیم مسرت کی خدمت پر مامور ہے۔ مسرت کی تقسیم کا اندازہ وہ خود مقرر کرتا ہے اور اس بارے میں اسے کسی تعلیم یا تلقین کی ضرورت نہیں۔ فن کی منزل اصلی یہی ہے، اس سے آگے جو راستہ جاتا ہے وہ تصنع، آورد، مصلحت، اصلاح، تبلیغ اور پروپگینڈے کی پستیوں میں اتر جاتا ہے۔

محمد علی کا میدان تنگ و تاز اودھ کی قصباتی فضا اور اس کی نرم رو زندگی ہے۔ اس فضا میں اس نے اپنی ذاتی زندگی کے کم و بیش ستر برس گزارے ہیں۔ اور یہ ایک فطری تقاضا تھا کہ وہ اپنے فنی کارناموں میں اسی فضا کا عکس پیش کرے۔ دنیا میں جتنے بڑے فن کار گذرے ہیں، سب نے ایسا ہی کیا ہے۔ اور جب تک ادب میں خالص فن کی قدریں باقی ہیں ایسے ہی فن پاروں کو عظمت و عزت کے وہ مقامات حاصل رہیں گے، جو فطری طور پر ان کا حق ہیں۔ آپ میں سے جن حضرات نے والٹر سکاٹ کا "آئی ون ہو" پڑھا ہے یا ایملی برانٹی کی "وُدرنگ ہائٹس" یا گورکی کی "ایک خزاں کی رات"، یا موپساں کی "سکیپ گوٹ" یا کالی داس کی "شکنتلا" کا مطالعہ کیا ہے یا شرت چندر کا اناپورنا کا مندر دیکھا ہے، ان سے میں یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ اپنے مطالعے کے استغراق میں کیا انھوں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ وہ کسی طلسمی جھولے میں بیٹھ کر خود اس دنیا میں پہنچ گئے ہیں، جس دنیا میں ان کا داستان گو سانس لے رہا ہے۔ وادی نربدا کے کسی لہلہاتے ہوئے جنگل کی معطر گپھائیں ہوں، یا شمالی برطانیہ کے ویران پہاڑی قلعوں کی سنگین اور کپکپاتی ہوئی نیم روشن خلوتیں، ہمارے حواس ظاہری نے دونوں میں سے کسی ایک کو محسوس نہیں کیا لیکن فن کار کی طلسمی چھڑی کی ایک ہی جنبش سے ہم چشم زدن میں ان فضاؤں میں جا پہنچتے ہیں۔ اور ان رومانوں اور ان کہانیوں کے کرداروں کے دل کی دھڑکنیں، ہمارے اپنے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ اور ہیرو کی آنکھوں کی چمک اور ہیروئن کے سانس کی خوش بو ہمارے کلبہ۔

ذہن اور مشام جاں میں سرایت کر جاتی ہے اور ہم ان کے رنج وراحت کے شریک اور ان کے حاضر و غائب کے رفیق بن جاتے ہیں۔

اس کے خلاف آپ نے بیسیوں ایسے افسانے ملاحظہ کیے ہوں گے اور درجنوں ایسی کہانیاں پڑھی ہوں گی جو آپ کو بس یوں ہی چھوتی ہوئی گزر جاتی ہیں اور آپ کے دل یا دماغ پر اپنا کوئی نقش دیر پا نہیں چھوڑتیں۔ افسانے کی ان مختلف صورتوں میں فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر کا خالق اپنی تخلیق کے عناصر میں کسی مقصد خاص کو شامل نہیں کرتا۔ وہ جس طرح زندگی کو دیکھتا ہے، جس طرح اسے محسوس کرتا ہے، عین اس طرح اسے اپنے تصوّر کے خلوص اور اظہار کی شدت کی تائید سے ہم تک منتقل کر دیتا ہے۔ اور اس عملِ انتقال میں وہ اہلیتِ کم یاب جو اسے ارزانی ہوئی ہے، اور جسے ہم فن کا نام دیتے ہیں، بروئے کار آتی ہے اور اظہارِ محض کو حسنِ اظہار سے آراستہ کرتی اور سخنِ سادہ کو گرمیِ گفتار عطا کرتی ہوئی اپنی منزل کو جا لیتی ہے۔ دوسری قسم کی تصانیف ان صاحبوں سے نسبت رکھتی ہیں، جو فن کار نہیں بلکہ محض کاری گر ہوتے ہیں۔ اور وہ ایک دیے ہوئے نمونے پر گاہک کے حسب منشا اس کے کام کی چیز تیار کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی مصنوعات سے زندگی کے ادنیٰ اور معمولی کام تو لیے جا سکتے ہیں لیکن وہ شئے لطیف جسے اہتزازِ نفس اور بالیدگی روح کا منبع کہیے اور جو سوز و ساز کی ہمہ رنگ کیفیتوں سے ہم آغوش ہوتی ہے، ان کاریگروں کے تصور سے بھی ماورا رہتی ہے اور عنقا کی طرح ان کی پست بستیوں پر اپنا سایہ بھی نہیں ڈالتی۔

اردو کے فن کار ادیبوں میں جو مادرِ فطرت کے آغوش میں پلے اور بڑھے اور جن کی سحر بیانی اسی کے سہانے بولوں کی مرہون اور جن کی فکر و دانش اسی کی بتائی پہیلیوں کی ممنون ہے، محمد علی ایک یکتا اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے یکتا کا لفظ پورے ارادے اور ذمہ داری سے استعمال کیا ہے۔ وہ اس لحاظ سے یکتا ہیں کہ وہ اپنے ذاتی مطالعے کی حدود سے کبھی باہر نہیں جاتے وہ اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ وہ بنیادی طور پر ایک قصہ گو ہیں اور ان کا کوئی قصہ کسی اڑتے ہوئے جذبے یا کسی ابلتی ہوئی تحریک سے جنم نہیں لیتا بلکہ ہمیشہ ان کے کسی خیال افروز مشاہدے یا اضطراب انگیز مطالعے کا نتیجہ ہوتا ہے اور وہ اس حیثیت سے بھی ایک امتیازِ خاص کے مالک ہیں کہ وہ "من و تو" کی حدود کو ایک بے مثال شانِ بے تکلفی سے عبور کر کے اپنے ناظر سے اس طرح گھل مل جاتے ہیں، گویا وہ خود قصہ نہیں لکھ رہے بلکہ وہ اور ان کا پڑھنے والا دونوں ہاتھ میں ہاتھ۔۔۔۔ دیے اس قصے میں سے روحانی طور پر گزر رہے ہیں۔ یہ کیفیت ہمارے ہاں انھیں سے خاص ہے۔ میری اس گزارش سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ زندگی کے محض ایک چابک دست عکاس ہیں ہرگز نہیں۔ زندگی کی تصویر کھینچنے کے ساتھ ساتھ وہ اس تصویر میں بڑے لطیف اور نادر رنگ بھی بھرتے جاتے ہیں۔ اور یہ رنگ اپنی شوخی، ان کی شوخیِ طبع اور

سرخی، ان کے خون دل سے مستعار لیتے ہیں۔ زندگی کا ہر کامیاب مصور ایک دیدہ، بینا کے ساتھ ایک چشمِ باطن سے بھی بہرہ یاب ہوتا ہے۔ محمد علی کو بصارت کے ساتھ بصیرت بھی ارزانی ہوئی ہے۔ وہ ایک نادرہ کار مصورِ محسوسات ہونے کے ساتھ ساتھ ایک زیرک ماہرِ نفسیات بھی ہیں۔ اور ان کے بیش تر، خصوصاً اس کے جنسی پہلو کے بیش بہا مطالعات اور دستاویزات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زندگی کی تصویر کشی وہ نہایت اخلاص سے کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کا پس منظر بھی نمایاں کرتے ہیں اور اس کی پہیلیوں کا حل بھی بتاتے ہیں۔ حقیقتاً وہ تصویر کشی کے لیے بھی زندگی کا وہی پہلو چنتے ہیں جس میں کوئی نفسیاتی خصوصیت پائی جاتی ہو۔ اسی لیے ان کی تصویریں سپاٹ نہیں ہوتیں بلکہ وہ ناظر کے حواس پر چھا جاتی ہیں۔ اور بیش تر اوقات اس پر حملہ بھی کر بیٹھتی ہیں اور اس کے پندار کو چھلنی چھلنی کر دیتی ہیں۔ مثلاً ان کے ناظرین میں کوئی ادھیڑ عمر کی صحت مند بیوہ جب ان کے افسانے "دھوکا" میں ناظمہ اور اس کے اندر والے کا مکالمہ پڑھتی ہے تو بجز اس کے کہ وہ اپنا منہ نوچ لے یا سر پیٹ لے اور کیا کر سکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی نا، کہ کہانی کو دیا سلائی دکھادے اور جائے نماز بچھا کر ستّر نفلوں کی نیّت باندھ لے۔ اب آپ مضطرب ہوں گے کہ میں اس مکالے کی ایک جھلک آپ کو نہیں دکھادوں اس لیے پہلے ہی سے تعمیلِ ارشاد کیے دیتا ہوں۔

صغیر کے چلے جانے کے بعد ناظمہ بیگم کے دل کے اندر کوئی ان سے باتیں کرنے لگتا تھا۔

"سنیے صاحب۔ میں کہانی لکھتا نہیں ہوں کہانی کہتا ہوں۔ اگر آپ کو اس میں دو بدو باتیں کرنے کا مزا نہیں آتا تو اس کو دور دفان کیجیے۔ اگر اچھی معلوم ہوتی ہو تو سنتے جائیے کہ ناظمہ بیگم صاحبہ کی سلیم عقل نے کیا کہا۔ ان کی دبی ہوئی خواہش نے کیا کہا۔ اور ان کی حسِّ باطن نے عقل و خواہش سے کیا کچھ کہلایا:

اندر والا: سنو بی بی ناجو! تم اور صغیر (یہ ان کے ہمدرد کا نام ہے) پردے سے ملے، گھڑیوں باتیں کیا کرتے ہو۔ اور جو کوئی کچھ کہہ دے۔

ناجو: مجال ہے جو کوئی کچھ کہہ دے۔ کر نہیں تو ڈر کس کا۔ بھلا مجھ سے آٹھ برس چھوٹا اور پھر وہ تو مجھ کو بجی کہتا ہے۔

اندر والا: یہ تو ٹھیک ہے مگر تم جب دیکھو اس کی بی بی کا ذکر کیوں کرتی ہو۔

ناجو: تو اس میں کیا ہرج ہے، اگر میرے خیال دوسرے ہوتے تو اس کی بی بی نگوڑی کا ذکر کیوں آتا۔

اندر والا: تم ہنسنے زیادہ لگی ہو۔

ناجو: ہنسی آتی ہے تو کوئی کیا کرے۔

اندر والا: پہلے کیوں نہیں ہنستی تھیں، ہنسی تو پھنسی پرانی مثل۔

ناجو: ہوا کرے مثل۔ اپنے بڈھے پر سے ہزار جوان صدقے اتارے ہیں۔ خیر اس کا ذکر ہی کیا جب جوانی میں اس طرح کے خیالات نہیں آئے تو اب بڑھاپے میں اس کا ذکر کیا ہے۔

اندر والا: بوڑھی تو تم بالکل نہیں ہو۔ اس کو تم بھی سمجھتی ہو۔

ناجو: میرے تو ایک لڑکا بھی ہوا ہے۔ اس کی بیوی تو ویسی ہی پٹھیا ہے۔

اندر والا: مگر وہ صورت میں تو تمھارے تلووں کے برابر نہیں ہے۔

ناجو: یہ تو ٹھیک ہے مگر اس سے ملاپ تھوڑی ہونے کو ہے۔

اندر والا: اور جو ہو جائے۔

ناجو: ہو جائے تو ہماری جوتی سے لڑے، پاپوش سے، مگر نہ ہوتا تو اچھا تھا۔

اندر والا: یہ دیکھو گھلانا۔ یہی تو میں کہتا تھا۔

ناجو: ہوگا بھئی۔ ہم کیا کریں نیند نہیں آتی تو یہی سوچنے لگتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی خیال آئے گا ضرور۔

اندر والا: اور اسی کو سوچتے سوچتے سو بھی تو جاتی ہو۔

ناجو: ہاں سو جاتے ہیں، تب نہیں تو اب سو جاتے ہیں۔ منصرم صاحب تو ہیں نہیں۔ ہمیں ڈر کس کا پڑا ہے۔ کر ہی لیں تو ہمارا کوئی کیا کر لے گا۔

اندر والا: ہاں۔ اب ٹھیک راستے پر آگئیں۔ یہی تو میں کہتا تھا کہ جو کچھ کرو ہم سے صلاح مشورہ لے کر کرو۔ ہم تمھارے ساتھ ہیں۔ واقعی اگر صغیر کے ساتھ ہو جائے تو بے جا نہیں۔ گو اور سب باتوں کا آرام رہا مگر ہم سن کو جی ترس گیا۔

اور پھر اس کے بعد کہانی جس موڑ سے گذرتی ہے ہمیں اس وقت اس سے غرض نہیں لیکن لگے ہاتھوں اس افراتفری کی بھی ایک جھلک دیکھتے چلیے جو صغیر کے بامراد ہونے کے بعد اس کے دل میں اسی اندر والے نے مچائی۔

صغیر احمد نے ناظمہ کی جھلک یوں ہی کبھی دیکھ لی ہوگی۔ اب بامراد دیکھا۔ وہ صورت شکل، وہ رعبِ حسن، وہ تناسبِ اعضاء، وہ مزاج کی شگفتگی اور یہ ٹھہرے بھوکے بنگالی۔ آنکھوں میں چربی چھائی ہوئی۔ ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے۔ ایسے میں سن کا فرق کس کو دکھائی دیتا ہے۔ (واضح رہے کہ ناظمہ بتیس برس کے پیٹے میں تھی اور صغیر ان سے آٹھ برس چھوٹا۔) البتہ دو چار برس کے بعد کچھ کچھ فرق معلوم ہونے لگا۔

صغیر: بڑی پیاری چیز تقدیر سے ہاتھ آگئی ہے۔ ہاتھ پاؤں کے گوشت میں وہ سختی نہیں ہے تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ اور کسی بات میں بڑھاپا تو نہیں۔

اندر والا: بڑھاپا تو نہیں ہے، مگر وہ پنڈے کا کساؤ کہاں ہے۔

صغیر: اجی محبت اصل چیز ہے۔ پنڈا ونڈا کہاں رہتا ہے۔

اندر والا: محبت الگ چیز ہے، جوانی الگ ہے، ان دونوں کو ملاتے کیوں ہو۔

صغیر: جوانی کے دن کی ہے، محبت تو ہمیشہ کی ہے۔

اندر والا: ہے تو ہمیشہ کی، مگر جوانی میں بھی مقناطیس کا اثر ہے۔

صغیر: محبت کا لوہا مقناطیس کو نہیں مانتا۔

اندر والا: اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ محبت جیسے پلاؤ اور جوانی جیسے بیسنی روٹی۔ ہم مانتے ہیں کہ پلاؤ پلاؤ ہی ہے۔ بیسنی بیسنی ہی ہے۔ مگر کیا روز روز پلاؤ کھا کر کبھی کبھی بیسنی کو جی نہیں چاہتا؟ وہ بیسنی والی سند اہٹ تو تمھاری پہلی بی بی ہی میں ہے۔

صغیر: میں نے کہہ دیا کہ اور جو باتیں جی چاہے کیا کرو مگر ہماری اس بی بی کا نام ہمارے سامنے نہ آوے۔

اندر والا: ارے میاں تمھاری بی بی سے ہم سے مطلب! ہم تو جوان عورت کا خواب دیکھتے ہیں۔ وہ تمھاری بیوی ہو یا کوئی اور ہو۔ تمھاری بیوی کا نام تو اس وجہ سے آیا کہ وہاں تک پہنچ آسان ہے اور کوئی بات نہیں۔

صغیر: یار یہ تو ہے، مگر ناظمہ غریب کی چھاتی پھٹ جائے گی اور مجھ کو چین نصیب نہ ہوگا۔

اندر والا: خیر چھاتی داتی تو کیا پھٹے گی، مگر ہے بڑی سخت بات۔ اور غضب تو یہ ہے کہ اس کے بغیر اس کی بھی پیاس بجھتی معلوم نہیں ہوتی۔

صغیر: یار تو پھر کیا کریں ۔۔۔؟

اندر والا: کروگے کیا، ملاپ کرو۔

صغیر: اور ناظمہ کو کیا کریں ۔۔۔۔ اس سے چار آنکھیں کیسے کریں گے ۔۔۔؟

اندر والا: سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ سنو میاں! ہم ہوں، کہ تم ہو، ناظمہ ہوں، سب ٹھہرے حکم کے بندے حسن باطن کے۔ وہاں سے جو اشارہ ہوگا وہ کرنا ہی پڑے گا آپ کون سے ایسے خوب صورت تھے، کون بڑے روپے والے تھے کہ ناظمہ آپ پر ریجھ جائیں۔ حسن باطن نے کہا۔ ناظمہ! منصرم صاحب مرحوم کی صحبت میں تم اپنے ہم سن کو ترس گئیں۔ لہٰذا تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ صغیر کے ساتھ کر لو۔ ناظمہ نے کر لیا۔ اب تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ ناظمہ کو بھی نہ چھوڑنا۔ مگر اپنی کم سن بی بی سے ملاپ کر لو۔ بندگی بے چارگی۔ تمھارا بس ہی کیا ہے۔"

بعد کے قصے سے ہمیں مطلب نہیں لیکن آپ نے ملاحظہ فرمایا، فن کار کی اپنے موضوع پر گرفت کیسی کڑی ہے۔ اور وہ ناظر کی توجہ کو نقطۂ مطلوب پر مرکوز رکھنے میں کیسی عظیم الشان کامیابی حاصل کرتا ہے۔ مضمون پر ایسی ماہرانہ گرفت ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ آپ یہ بھی محسوس فرمائیں گے کہ وہ ادائے مطالب کے لیے کم از کم الفاظ استعمال کرتا ہے، لیکن ہر لفظ معنی کی بارود سے بھرپور ہوتا ہے اور جس طرح اور جس مقام پر اسے صرف ہونا ہے، وہ اس سے خطا

نہیں کرتا۔ الفاظ پر یہ قابو اور معانی سے یہ مفاہمت کچھ محمد علی ہی کا حصہ ہے۔ الفاظ و معانی کی یہ فن کارانہ آمیزش و آویزش بجائے خود ایک مطالعے کی طالب ہے مگر اس وقت ہمارے سامنے مصنف کی اور بہت سے خصوصیات اپنی قطار توڑ توڑ کر سامنے آرہی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ نفسیات کا ایک بہت بڑا ماہر ہونے کے علاوہ جنسیات کا ایک نہایت صحت مند شارح ہے۔ تعجب ہے کہ ہمارے بیش تر بزرگوں کے بر عکس، محمد علی جنسیات سے کسی قسم کی تنفر آمیز اجنبیت کا اظہار نہیں کرتے بلکہ وہ نہایت سکون و اطمینان سے اپنے افسانوں اور خاکوں میں اس کی معمولی اور غیر معمولی، نارمل اور ایب نارمل کیفیتوں کا امتحان اور تجزیہ کرتے ہیں۔ اور وہ گھناؤ ناتصور دور کرنے میں کاوش کرتے ہیں جو جنس کے متعلق اوّل دن سے ان کے ناظر کے دل و دماغ میں پرورش پارہا ہوتا ہے۔ کاوش سے میری مراد یہ نہیں کہ وہ اس مقصد کو سامنے رکھ کر اس پر کوئی افسانوی ڈھانچہ تیار کرتے ہیں، نہیں بلکہ میرا مطلب محض اسی قدر ہے کہ ان کے موضوعات کے انتخاب میں جنس عادتاً ایک اہم حصہ لیتی ہے۔ اور جب وہ اپنے کسی ایسے مطالعے پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس سے وہ اپنے ناظر کے لیے کسی قسم کی لذت کوشی کا سامان بہم نہیں پہنچاتے بلکہ ---- زیر نظر مسئلے کا نہایت بچا تلا اور صحت مند جائزہ لیتے ہیں اور زندگی کے عوامل میں جنسی کارفرمائیوں کو وہی مرتبہ دیتے ہیں جن کی وہ بجا طور پر حق دار ہیں۔ ان کے ہاں ہمیں بعض دیگر لکھنے والوں کے بر عکس، لذت فروشی کا سراغ تک نہیں ملتا۔ اس کے باوجود جو جنسی حقائق انھوں نے بے نقاب کیے ہیں۔ وہ اس ادنیٰ درجے کی "جنس خام" سے بدرجہا قیمتی ہیں، جو ہمارے بعض مقبول مصنفین آئے دن پیش کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کا بھرپور مطالعہ کیا ہے اور از بس کہ جنس، زندگی کی ایک بنیادی کیفیت ہے اور اس کے مدو جزر میں ایک نہایت اہم پارٹ ادا کرتی ہے۔ اس لیے ان مشاہدات و محسوسات کے انتخاب میں بھی جو کسی فن کار کو احساس سے صورت میں انتقال کے وقت درپیش ہوتا ہے، جنس اپنا پورا حصہ لیتی ہے۔ یہاں تک سب لکھنے والے برابر ہیں۔ لیکن اس سے ایک قدم آگے بڑھیں تو ایک تنہا لغزشِ پا سارا فرق پیدا کر دیتی ہے۔ لذت کوش جنس فروش علاحدہ ہو جاتے ہیں۔ اور وہ فن کار علاحدہ جو جنس کو دیگر عطیات وہبی کی طرح قدرت کی ایک مقدس اور دل کشا امانت سمجھتے ہیں اور اسے سفلیات سے، ہم صحبت اور آلودہ نہیں ہونے دیتے۔ محمد علی فن کاروں کے اس ثانی الذکر گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ہماری زبان میں بے عیب جنسی کہانیاں لکھنے میں ان کا کوئی ہم سر نہیں ہے۔ آنکھوں کی زبان، تیسری جنس، دھوکا اور ان کا طویل مطالعہ "یہ جنس" جس میں کنواری مس ہیلن اور گنجفہ کھیلنے والی رنڈی اور مچھلی والی سے روزانہ مار کھانے والے انسپکٹر صاحب بڑے کینڈے کے کردار ہیں نفسیات "جنس" کے نہایت بیش بہا اور نادر نمونے ہیں جو براہِ راست زندگی سے حاصل کیے گئے ہیں اور جن میں کوئی بے کار یا مصنوعی رنگ نہیں بھرا گیا، اور نہ کسی قسم کی لذت آفرینی کی

کوشش کی گئی ہے۔ چودھری صاحب نے ان بے مثال اور حیرت انگیز افسانوں کے علاوہ اور کہانیاں بھی لکھی ہیں جن میں "امیری کی بو" اودھ کی مٹتی ہوئی شرافت کے ایک دردناک مرثیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کہانی اس قابل ہے کہ اسے اردو کی پاکیزہ ترین کہانیوں میں ایک امتیازی مقام دیا جائے۔ اودھ کی معاشرت جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ان کا خاص مطالعہ ہے اور اس مطالعے کے بعض پہلو خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اس مطالعے کے افسانوں میں ہمیں بیش تر ایسے کردار ملتے ہیں جو اسی نسل کے ساتھ ختم ہو جائیں گے۔ وضع داری، افلاس دوستی، دوست نوازی، فن پردازی، تفریح پرستی، بے نیازی اور استغنا کے چلتے پھرتے مجسمے، کوئی دن کی بات ہے کہ سایوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ "مرزا عنش"، "میٹھا معشوق"، "خوش مذاقی کے اندھے" اور "زندگی کا مقصد" ان ہی نادر روزگار لوگوں کی مرقع نگاری ہے اور اگرچہ انھیں بقائے دوام دینے والے کا قلم ان کے محاسن کی تفصیل میں ایک پرخلوص اور دل کشا روانی دکھاتا ہے، لیکن کبھی کبھی ان کی زمانہ ناشناسی اور وامانگی پر انھیں کچوکے بھی لگاتا جاتا ہے اور اس عمل میں بعض دفعہ وہ طنز کی رفعتوں پر جا پہنچتا ہے۔ میری ناقص رائے میں محمد علی نے یہ خاکے کسی اصلاح کے خیال سے نہیں لکھے بلکہ اپنی روزمرہ زندگی میں ایک مٹتی ہوئی معاشرت کے جو قابلِ لحاظ نمونے وقتاً فوقتاً اس کے سامنے آئے انھیں اس نے ادب کے عجائب خانے میں محفوظ کر دیا۔ آنے والی نسلیں ان پہ آنسو بہائیں گی یا ان سے عبرت یا تفریح حاصل کریں گی، یہ اس کا دردِ سر نہیں۔

محمد علی کے خیال انگیز افسانوں میں "نیلم کانگ" اور "گناہ کا خوف" ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ "گناہ کا خوف" سماج کی ظواہر پرستی پر ایک لازوال طنز ہے اور "نیلم کانگ" مسیح کے اس قول کی بازگشت، کہ میں انسان سے مایوس نہیں ہوں۔ دونوں کہانیاں حقیقی زندگی کے پس منظر پر ابھری ہیں اور اپنے اندر مسرت اور تفکر کے انمول خزانے پنہاں رکھتی ہیں۔ کہانیوں کے علاوہ محمد علی نے امامن مہری کی زبان سے روزمرہ کے سماجی مسائل پر پانچ طنزیے ایسے بھی لکھے ہیں جنھیں اردو کی انشائے لطیف میں ایک نہایت ممتاز مقام ملنا چاہیے۔ امامن مہری کے فلسفیانہ خیالات پانچ عنوانات پر مشتمل ہیں۔ "ایمانداری بہترین دوراندیشی ہے"، "رکھ رکھاؤ"، "تیہا، طنطنہ"، "جوش"، "غصہ"، "جذبہ"، "کام کاج" اور "خیر خیرات"۔ ان کے لکھنے کا خیال انھیں Barry Pane کی ایک کتاب کے مطالعے سے پیدا ہوا تھا۔ میں نے نقشِ اول تو نہیں دیکھا لیکن نقشِ ثانی اپنی خیال انگیزی اور خلش آفرینی کے اعتبار سے ہمارے طنزیہ ادب میں ایک لاثانی حیثیت رکھتا ہے۔

محمد علی کی سب سے بڑی جیت یہ ہے کہ وہ زندگی کو بہ یک وقت خارجی اور داخلی دونوں زاویوں سے دیکھتا ہے۔ اور مقابل کی یہ خصوصیات ایک واحد فن کار میں بہت کم جمع

ہوتی ہیں۔ وہ اپنے خارجی محسوسات کو اپنے افکار کا لباس ایسی خوبی سے پہنا دیتا ہے کہ بیش تر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جامہ، تنگ اسی صنمِ عربدہ جو کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ وہ خارجی دنیا کے معمولی سے معمولی واقعات کو اپنے احساسات میں سمو کر انھیں ایک نئی زندگی اور ایک نئے معانی عطا کر دیتا ہے اور جب یہ عمل مکمل ہو جاتا ہے تو ہم یہ نہیں معلوم کر سکتے ہیں کہ ان میں محرک کون تھا اور تحریک کس نے پائی۔ مثلاً وہ ایک جگہ گرمیوں کی صبح میں نسیم کی آہستہ روی اور اس کی روانی میں ایک بڑی بی کی مناجات خوانی کا ذکر کرتا ہے۔ جزئیات کا یہ مطالعہ بجائے خود بغایت درجہ حیرت خیز ہے۔ لیکن جب وہ اس تاثر سے کردار زیرِ نظر کے ایک عمل کی نفسیاتی تعبیر کی طرف لپکتا ہے اور لپکتے ہی تاثر کو مکمل بھی کر لیتا ہے تو حیرت اپنی انگلی دانتوں تلے دبائے رہ جاتی ہے۔ اور آخر میں میں اپنے ممدوح کی نسبت ان الفاظ کو دہرا دینا ہی کافی سمجھتا ہوں جو حال میں میں نے ان کے ایک نمائندہ فن پارے سے متاثر ہو کر لکھے تھے۔ "چودھری محمد علی کا سا پیرایہ، بیان ہمارے عہد کے کسی افسانہ نگار کو نصیب نہیں ہوا۔ حقیقت پروری اس پر نثار اور دل نوازی اس پر تصدق ہے۔ اور ان کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں اس کے لیے انھیں کوئی اہتمام یا تکلف نہیں کرنا پڑتا۔ فطرت ایک ورقِ روشن کی طرح ان کے پیشِ نظر رہتی ہے اور اس کے جو اسرار ان کی نگاہِ انتخاب میں سما جاتے ہیں، وہ انھیں بے محابا اپنا لیتے ہیں۔ محمد علی کسی موضوع کو سامنے رکھ کر اس کی تعمیر کے لیے اپنے تخیل سے مسالہ نہیں مانگتا، بلکہ زندگی اپنی بوقلموں کیفیتوں کو لیے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے بھاگتی ہے۔ اور فن کار، جب کبھی اس کا جی چاہتا ہے اور جو کچھ اس کا جی چاہتا ہے اس کے دامنِ دولت سے مٹھیاں بھر بھر کر لے لیتا ہے۔ تو یہ ہے محمد علی زندگی کا ایک زیرک ناظر، اردو کا ایک صاحبِ طرز ادیب، اور ہماری زبان کا اولین فطرت نگار۔

قرۃ العینؒ حیدر

داستان طراز

نہیں معلوم آپ اس مضمون کو کیا سمجھ کر پڑھئے گا۔ یہ شخصیت نگاری بھی نہیں کیونکہ چودھری محمد علی ردولوی کے متعلق میں اس طرح سے کچھ نہیں لکھ سکتی جس طرح سے میں اپنی نسل کے فرد کے بارے میں لکھ سکتی ہوں۔ یہ چودھری محمد علی کی کتاب کی تنقید بھی نہیں۔ کیونکہ یہ چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔ یہ تو ایسا ہی ہوگا جیسے میں "خیالستان" یا "جلال الدین خوارزم شاہ" کے لئے قلم اٹھا کے بیٹھ جاؤں۔

ابھی چند روز ہوئے ردولی سے چودھری محمد علی کی علالت کی اطلاع آئی ہے۔ اب ان کی طبیعت پہلے سے بہتر ہے۔ خدا ان کو زندہ رکھے۔ میں اس وقت "کشکول محمد علی شاہ فقیر" اِدھر اُدھر سے دیکھ رہی تھی۔ جب یہ کتاب ابھی دو تین سال ادھر صدیق بک ڈپو سے شائع ہوئی تھی تب بھی مجھے خیال آیا تھا کہ اس کے مصنّف کے بارے میں آپ کو کچھ بتلاؤں۔ چونکہ اس مصنّف کی میری نظروں میں اس لئے بے اندازہ اہمیت نہیں ہے کہ ان کا مجھ سے بہت بزرگی کا رشتہ ہے بلکہ ان کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ میں سمجھتی ہوں کہ بحیثیت اسٹائلسٹ چودھری محمد علی اردو کے ایسے منفرد ادیب ہیں کہ کوشش کر کے بھی ان کی زبان اور اظہارِ بیان کا تتبع نہیں کیا جا سکتا۔ محمد علی ادب میں اپنے ساتھ یہ اسٹائل لائے اور یہ محض انہی کا حصّہ ہے۔

میں نے ایک زمانے سے انہیں نہیں دیکھا۔ اور جب دیکھا تھا تب میرا کچھ سوچنا نہ سوچنا کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ اور اب تو خاندان کے لوگوں سے محض ان کے قصے، حکایتیں اور دلآویز تذکرے ہی سننے کو ملتے ہیں کیونکہ اب وہ ہماری ساری روایتوں، سارے ادبی اور تہذیبی ورثے کے ساتھ سرحد کے اس طرف ہیں۔ اور ہم لوگ یہاں ہیں۔

ان کی نئی کتاب ادبی حیثیت سے ہمارے لئے کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے۔ نہیں معلوم ہم میں سے کتنے لوگوں کو اس بات کا اندازہ ہوگا کہ اس کتاب کا لکھنے والا اور اس کا پس منظر ہماری ہندو پاکستان کی تہذیب

کے تانے بانے میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔

اردو ادب کی وہ بیک گراونڈ جس میں اودھ اور صوبجات متحدہ کی ہمہ گیر ثقافتی زندگی کی ساری گہما گہمی موجود تھی، جس کی جھلک ہمیں سرشار، رسوا، اور اودھ پنچ کے فائیلوں میں نظر آتی رہی ہے۔ ان لوگوں کے ماضی میں طلسم ہوش ربا کی وہ داستانیں بھی تھیں جنہیں آغا میر کی ڈیوڑھی والے افیمچی داستان گو محفلوں میں سنایا کرتے تھے۔ دوسری طرف علی گڈھ میں مسلمانوں نے انگریزی پڑھنا شروع کر دی تھی۔ مولانا حالی مناجات لکھتے تھے اور اکبر الہ آبادی زمانے کے انقلاب پر تلخی سے ہنسنے میں مصروف تھے۔ سماجی پس منظر اس قدر گنجلک تھا۔ ہمارے بزرگ جو بیک وقت معاشرتی "مصلح بھی تھے" مجدد بھی، اور سیاستدان بھی، برصغیر کے مسلمانوں کے لئے نئی راہیں تیار کر رہے تھے۔ بڑا عجیب وقت رہا ہوگا جب سرسید کے سامنے کی نئی پود (کیونکہ بہرحال 'بغداد' اسپین وغیرہ کا قصہ تو اب MYTH میں داخل ہو چکا) اجتماعی طور سے ایک نئے تجرباتی دور سے گذر رہی تھی۔ ایک طرف اس تہذیب سے بھی شدید جذباتی "لگاؤ تھا جس نے اس احساس کو جنم دیا جس کے زیرِ اثر اب یہ لوگ قوم کے لئے تبدیلیاں چاہتے تھے، دوسری طرف انہی تبدیلیوں کی وجہ سے اسی تہذیب اور ان اقدار کے تباہ ہو جانے کا خدشہ بھی تھا۔ مستقبل بہت پریشان کن تھا۔ عیسائیت کا غلبہ، یورپ کا عروج، انگریز کی سلطنت کا اقبال، ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں قدم قدم پر یہ کشمکش اور یہ تضاد نظر آتے تھے۔ شرر مسلمانوں کے سنہرے ماضی کی نقاشی کر رہے تھے، جس میں ہر غازی ہیرو آخر میں عیسائی ہیروئن کو مشرف بہ اسلام کرتا تھا، گو اصل واقعہ یہ تھا کہ حال ہی میں لشکرِ نصاریٰ ایک غازی بادشاہ کو رنگون اور دوسرے کو مٹیا برج میں قید کر چکا تھا۔ لہٰذا قوم کے پاس سوا خون کے آنسو رونے اور رلانے کے اب اور کون مشغلہ رہ گیا تھا۔ ہندو مسلمان کی آمیزش بھی ہمارے بزرگوں کو پریشان کرنے لگی تھی۔ لیکن یہ سیاسی پلیٹ فارم کے جھگڑے تھے۔ روزمرہ زندگی میں تو ہندو مسلمان دونوں کو انگریز ڈپٹی کمشنر کے سامنے جوتے اُتار کر جانا ہوتا تھا۔

اس پس منظر کو دیکھئے اور پھر ان سوچنے والے دماغوں اور ان حساس دلوں کا خیال کیجئے جنہوں نے ہمارے نشاۃِ ثانیہ کے چراغ جلائے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ہمارے سماجی حالات کے اکثر تجزیئے صحیح نہیں کئے تھے۔ نہ وہ مسلمانوں کی زندگی کے بنیادی تضادوں کے متعلق سائنٹیفک طریقے سے سوچ پائے تھے۔ ہندوستان کی نئی جاگرتی کے ہراول دستے کے لوگ بنگال میں مغرب کے فلسفۂ انقلاب سے انیسویں صدی کے پہلے نصف ہی میں روشناس ہو چکے تھے۔ مائیکل مدھوسودن اور ان کے ساتھی انگلستان کے رومانی باغیوں سے متاثر ہو کر اس وقت

انگریزی میں نظمیں، ڈرامے اور ناول لکھ رہے تھے جس وقت ابھی لکھنؤ میں شمع کی روشنی میں غالباً رانی کیتکی کی داستان ہی پڑھی جا رہی تھی۔ پھر قیصر باغ کی بارہ دری کی اندر سبھائیں اُجڑ گئیں اور سرسید نے سفرنامہ انگلستان میں لکھا کہ آج بالآخر وہ مبارک دن آیا جب میں قصر بکنگھم میں حاضر ہوا۔ واقعی یہ خون کے آنسو رونے اور رلانے کا زمانہ تھا۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود کیا ہمیں اپنے لوگوں، اپنی اس تاریخ سے پیار، ایک طرح کا لگاؤ نہیں محسوس ہوتا؟

اب قلم اوپری متوسط اور متوسط طبقے کے ہاتھ میں آ رہا تھا۔ ایک وقت تھا کہ تصنیف و تالیف ایک رئیسانہ مشغلہ تھا۔ نوابان اودھ، نواب رامپور اور دوسرے والیانِ ریاست نے وقتاً فوقتاً ہندوستانی فنِ موسیقی پر کتابیں لکھیں یا ناٹک تصنیف کئے۔ اب اودھ پنچ اور دوسرے اخبار شائع ہو رہے تھے۔ سرشار جیسے جرنلسٹ پیدا ہو چکے تھے۔ مطبع نول کشور ۔ لکھنؤ سے ان گنت کتابیں چھپ کر باہر آ رہی تھیں۔ سحر قریب تھی۔ اور آغا میر کی ڈیوڑھی کے داستان گو اپنی شمعیں بجھایا ہی چاہتے تھے۔

ادھر علی گڑھ اور دلی کے مصلحین اپنے کام میں مصروف تھے۔ پھر جب نذیر احمد اور ان کے ساتھیوں کی اجتہاد اور اصلاح کی لہر اپنا رول ادا کر چکی تو نئی نسل نے آگے کی دنیائیں دیکھنا چاہیں۔ "خارا" اور "نسرین نوش" کے رومانی پیکر تراشے گئے۔ "خوابِ ہستی" دیکھا گیا۔ "رعنائی خیال" خالص رومان اور جمالیات کا چرچا ہوا۔

یہ زمانہ، جیسا کہ میں نے عرض کیا، شدید جذباتی کشمکش کا وقت رہا ہوگا۔ اس زمانے کا ایک کلچر تھا، جس نے لکھنؤ دلی اور دوآبے کے علاقے کی ایک طرح کی قلعہ بندی کر رکھی تھی۔ ہیومنزم کی چند اقدار تھیں جنہوں نے اس خطے کے کلچر کو جنم دیا تھا۔ جسے بیرونی مداخلت اور باہمی مذہبی آویزش نے مل جل کر خوبی ختم کر دیا اور جس کا فائنل اور خوفناک نتیجہ ہم نے ۱۹۴۷ء میں دیکھ لیا۔

پھر ہمارا عوامی کلچر تھا جو ہم نے اپنے دیہاتوں اور اپنے قصبہ جات میں دیکھا تھا۔ اور جس کی بنیادیں انسانیت پرستی کی ان روایات پہ رکھی گئی تھیں۔ اسی تہذیب اور ان اقدار کے ایک نام لیوا چودھری محمد علی ہیں جن کے بارے میں میں نے یہ مضمون لکھنا شروع کیا ہے۔

معاف کیجیے گا میں اس طرح کا مضمون لکھ رہی ہوں جس کی غالباً آپ کو مجھ سے توقع نہ ہوگی۔ اور آجکل جبکہ اس قسم کا تذکرہ امن، تہذیب، یا انسانیت پرستی کا اگر کیا جائے تو اس پر زیادہ توجہ نہیں دی

جاتی تھیں۔ ان سب چیزوں پر الگ الگ سیاسی لیبل چپکا دیئے گئے ہیں۔ اور ویسے بھی آج کل کلچر اور امن وغیرہ کا کیا کام۔ محض بین الاقوامی اور بین المملکتی جھگڑوں اور ڈالر اور اسٹرلنگ کا چرچا ہوتا ہے۔

چودھری محمد علی ضلع بارہ بنکی (اودھ) کے مشہور قصبے رودلی کے رہنے والے ہیں۔ ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ یہ بھی انیسویں صدی کے آخر والی اس نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس کا میں نے اوپر کہیں ذکر کیا ہے۔ محمد علی اس نئی نسل میں تنہا نہیں تھے میرے والد اس کے ایک فرد تھے۔ اور میرے والد کے سالے دوست اور ساتھی، منشی پریم چند، منشی دیانارائن نگم، سر محمد یعقوب، علی برادران، مشتاق احمد زاہدی، سید رضا علی، مولانا ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی، سر تیج بہادر سپرو، سید عبدالقادر سبھی اس گروہ میں شامل تھے، اور وہ کیسا گروہ تھا ——— !!

محمد علی ابھی ڈھائی سال کے تھے جب ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ اور یہ خود تعلق دار ہوگئے۔ تعلقہ کو کورٹ آف وارڈز نے اپنے انتظام میں لے لیا۔ ماں نے مارے لاڈ پیار کے اسکول نہیں بھیجا۔ کورٹ آف وارڈز کا انگریز منیجر جب ان کو اسکول لے جانے کے لئے آیا تو یہ ڈھیلا مارنے کے لئے اس کے پیچھے پیچھے دوڑے۔ آخر اسے اپنے سپاہی لے کر آنا پڑا اور انہیں باقاعدہ اغوا کر کے اسکول پہنچایا گیا۔ "کالون تعلق دارز کالج لکھنؤ" میں (جو اب فلک کی کج رفتاری کی وجہ سے محض تعلق داروں کے لئے ہی مخصوص نہیں رہا)، تاج برطانیہ کے فرزندانِ دل بند کی اولاد کو درس وفاداری دیا جاتا تھا اور شہسواری وغیرہ قسم کے رئیسانہ مشاغل سکھائے جاتے تھے۔ قوم پرستی، اصلاحات وغیرہ کا جو تھوڑا بہت چرچا انیسویں صدی کے آخری دہے میں ملک کی دوسری درس گاہوں میں شروع ہو چکا تھا اس کا بھلا کالون اسکول میں کہاں گذر ہوتا۔ بہر حال، محمد علی وہاں پڑھتے رہے۔ لیکن ان کی تعلیم کالون اسکول کے نصاب کے ساتھ ختم نہیں ہوگئی۔ بقول گورکی ساری دنیا ان کی یونیورسٹی رہی۔ انگریزی ادب، مغربی آرٹ و فلسفہ وغیرہ پر ان کا مطالعہ حیرت انگیز حد تک وسیع ہے۔ ہندو اپنشدوں اور کارل مارکس دونوں میں یکساں دلچسپی رہی۔ نہایت عمدہ انگریزی بولتے اور لکھتے ہیں۔ خاندان کے بہت سے نوجوانوں نے انگریزی ادب پر ان سے تبادلۂ خیالات کر کے ایم اے میں اچھے ڈویژن حاصل کئے۔

محمد علی مسلمانوں کے بہت بڑے آدمی جج کرامت حسین مرحوم (بانی مسلم گرلز کالج لکھنؤ) کے نہایت عقیدتمند چیلے تھے۔ حالانکہ دونوں کی متضاد طبیعتیں تھیں۔ جج کرامت حسین نہایت خشک مزاج مولوی آدمی اور یہ جینے اور ہنسانے پر جان دینے والے۔ اصولاً اور عقیدۃً ہمیشہ سخت قوم پرست رہے لیکن ماحول اور زندگی کی مجبوریوں

کی وجہ سے انگریز کی وفاداری کا بھی پاس کرنا پڑا۔ لکھنؤ کا مشہور "نواب" بٹلر (برطانیہ کے موجودہ چانسلر آف اکیس چیکر کا غالباً چچا) جو انگرکھا اور دوپلّی ٹوپی پہنتا تھا، حقہ پیتا تھا، اور یوپی کا بڑی دھوم دھام کا گورنر تھا اور اپنے ان وفادار تعلق داروں کی دوستی کا بہت دم بھرتا۔ اسی کے زمانے کا ایک واقعہ بتاتے ہیں کہ ایک انگریز حاکم نے ان سے کہا کہ محمد علی اگر تم ہم کو اپنے احباب کے متعلق اطلاعات دیتے رہا کرو تو کیسا رہے گا۔ یہ بگڑ گئے اور کہنے لگے میں اپنے ہوش و حواس میں تو ایسا نہیں کرسکتا۔ اگر میں شراب پیتا ہوتا اور تم مجھے اپنے یہاں کھانے پینے پر بلا کر خوب شراب پلاتے تو ممکن ہے میں تم کو خبریں فراہم کر دیتا۔ اس کے بعد ایک وفادار فرزند دل بند تاج برطانیہ انگریز حاکم کی یہ فرمائش پوری کرتے رہے جس کے صلے میں ان کو مزید جاگیروں اور نائٹ ہڈ وغیرہ سے نوازا گیا۔

چنانچہ یہ پس منظر محمد علی ردولوی کی زندگی کا رہا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیبی اور سیاسی تجدید کی تحریک کی قیادت اسی فیوڈل طبقے کے افراد نے کی تھی۔ دار المصنفین اعظم گڈھ، ندوۃ العلماء لکھنؤ، دار العلوم دیوبند، مسلم یونیورسٹی قائم کئے جا چکے تھے۔ لکھنؤ یونیورسٹی اور بھٹکنڈے یونیورسٹی آف ہندوستانی میوزک لکھنؤ بھی تعلق داران اودھ کے روپے سے قائم کئے گئے تھے لیکن اب اس طبقے کا ڈی جزیشن اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ اور یہ ایک ناگزیر اور تاریخی حقیقت تھی کہ اب یہ طبقہ اپنی طبعی موت مرنے والا تھا۔ متوسط طبقہ اوپر آرہا تھا۔ کانپور ایشیا کا سب سے بڑا صنعتی مرکز بن چکا تھا۔ گاؤں اُجڑ رہے تھے۔ یوپی کا وہ کسان جو کبھی اپنے آقاؤں کے کھیت چھوڑ کر دیہات سے باہر جانے کا خواب بھی نہ دیکھ سکتا تھا اب روزی کی تلاش میں بمبئی، کلکتے اور پنجاب دیس جاتا تھا۔ اور وہاں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی "بھیاؤں" کی برادری میں مدغم ہو کر مزدوری میں لگ جاتا تھا۔ اس بڑھتے ہوئے اقتصادی بحران اور طبقاتی کش مکش کو برطانوی حکومت نے بہت ہی آسانی سے فرقہ وارانہ رنگ دے دیا۔ سیاسی جماعتوں کا قیام عمل میں آیا جن میں سے چند واضح طور پر اس فیوڈل طبقے سے وابستہ ہوگئیں جو اس کش مکش میں حکومت کا معاون اور رفیق تھا اور چند نے ایک حد تک کسانوں اور نئے پرولتاریہ کا ساتھ دیا۔ لیکن آگے تک یہ ساتھ کسی سے بھی نہ دیا جاسکا ——— اس پورے دَور کی عکاسی پریم چند نے کی ہے۔ ان کا کینوس بہت وسیع اور ان کا انداز بے حد گمبھیر تھا۔ محمد علی اس دَور اور اس ماحول کے انتہائی فن کارانہ (مجھے اس لفظ سے چڑ ہوگئی ہے لیکن یہاں اس کا استعمال کئے بغیر چارہ بھی نہیں) MINIATURES پیش کئے ہیں. اور یہ کتنے خوبصورت MINIATURES ہیں ———!

وادئ گنگ و جمن کے معاشرے کی بنیاد جس تضاد پر قائم تھی وہ طبقاتی تھا، مذہبی نہیں۔ روساء اور تعلق داروں کا گروہ ایک طرف تھا اور حویلی کے ملازمین، کسانوں، کہاروں اور تنبولنوں کا دوسری طرف۔ راجہ پرتھوی پال

سنگھ اودھ کے ایک ہندو تعلق دار اور ٹھاکر درگاہی خان ایک مسلمان تعلق دار (محمد علی کے دو شناسندہ کردار) ایک گروہ کے افراد ہیں۔ امامن مہری اور بی دھتنا اور ان کے سالے دوسرے ساتھی جو دوسرے گروہ میں شامل ہیں، پریم چند کے یہاں بھی ملیں گے۔ اور ان سب نے مل کر ہندوستان کی تاریخ کے اس دَور کے (FRESCOES) کو بڑے دلآویز رنگوں کے ساتھ مکمل کر دیا ہے۔

پریم چند اور محمد علی، دونوں کے یہاں پرانے ماحول اور پرانی اقدار سے جذباتی لگاؤ اور ذہنی وابستگی موجود ہے لیکن دونوں برابر راجہ پرتھوی پال سنگھ اور ٹھاکر درگاہی خاں کی رعیت کے ساتھ بھی ہیں۔ جہاں تک اس بحرانی دَور میں کوئی واضح راستہ سامنے نہیں آسکا وہاں تک پریم چند کے یہاں بھی شدید (CONFUSION) ملتا ہے اور کہیں کہیں پر محمد علی کے یہاں بھی۔

محمد علی ردولوی کی قدر بحیثیت فن کار ہیں اس وقت کرنی پڑتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ نہایت ایمانداری سے انسانیت پرستی کی اقدار کو سنبھالے اور اونچا اٹھائے رکھتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ جس طبقے اور ماحول سے وہ خود وابستہ ہیں وہ اپنی ساری VALUES کھو چکا ہے۔

محمد علی گنتی کے ان بزرگوں میں سے ہیں جن کو نئے لکھنے والے بھی اپنا رفیق سمجھتے ہیں اور جنہوں نے غیر مشروط طریقے سے ادب کی نئی تحریک کا شروع سے ساتھ دیا ہے۔

اردو افسانے میں جو طرزِ بیان، برجستگی، شوخی، اور بانکپن محمد علی اپنے ساتھ لائے، میں نے اوپر کہیں لکھا تھا کہ وہ اتنا انوکھا اور منفرد ہے، کہ کوشش کرکے بھی اس طرح کی دو سطریں نہیں لکھی جا سکتیں۔ اندازِ بیان اتنا فطری ہے کہ جب دفعتاً یہ احساس ہوتا ہے کہ قصّہ گو یہ واقعہ اپنے مخصوص انداز میں خود اپنی زبان سے نہیں سُنا رہا تھا بلکہ یہ لکھی ہوئی تحریر ہے، تو عجیب سا لگتا ہے۔

ملاحظہ کیجئے گا: ——

"بھلا بتایئے تو اس کہانی کا ہیرو کون ہے۔" اتنے کے بیچ موری بندیا ہرانی ہے انہی لوگوں میں مگر تنکے اوٹ پہاڑ۔ بہلی کے سازوسامان میں بچھونے، لالہ کی لوٹیا۔ مرزا صاحب کا لوٹا۔ پاندان۔ ایک عدد توا۔ دو بٹیلیاں۔ مگر لالہ جی اور بڑے مرزا صاحب کے درمیان میں اور گاڑیبان کے پیچھے یہ کون چیز رکھی ہے اگر یہ نہ ہوتی، تو کہاں ہم کہاں آپ۔ کہاں یہ کہانی۔ بڑے مرزا صاحب کے ایسے ہزاروں سفر کر گئے۔ ہزاروں سفر

کر رہے ہیں۔ اور لاکھوں سفر کریں گے۔ مگر ہر مسافر کی کہانی تھوڑے ہی لکھی جا سکتی ہے۔ داستان گو اور قدر دانوں کو جمع کرنے والی وہی ہے جو بہلی کے نیچوں بیچ بڑی حفاظت سے رکھی ہے۔"

میر باقر مرحوم کا قصہ سنیے: ————

"وہیں سے سنا کہ پھر کہرام پڑ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ یہ چاروں بھائی جمع ہیں۔ اور نئی طرح کے بَین کر رہے ہیں۔ ایک کہہ رہا ہے ———— خدا کی قسم والد مرحوم آٹھ آٹھ دن منہ نہیں دھوتے تھے۔ اس پر سب مل کر بڑی زور سے روتے ہیں۔ پھر دوسرا کہتا ہے: رسول مقبولؐ کی قسم دانت بھی تو نہیں مانجھتے تھے۔ اور پھر وہی گھمسان پڑتا ہے۔ تیسرا کہتا ہے اور نہاتے کب تھے۔ قسم کلام مجید کی اماں کے ڈر کے مارے یونہی غسل خانے میں پانی پھینک کر چلے آتے تھے اور وہی شور مچتا ہے۔ چوتھا دھاڑیں مار کر کہتا ہے: دو بجے رات کو مرحوم کے پھینکنے سے ہانڈی اتار کر گپ گپ دہی بڑے کھانا یاد آتا ہے ———— اس پر تو پوری محفل ماہئی بے آب کی طرح تڑپنے لگتی ہے ————"

"———— ان صاحبزادی سے تعارف میرا کرایا گیا کہ فلاں شخص کے والد ہیں۔ ایک وقت تھا کہ ہمارا تعارف لوگوں سے اس طرح کرایا جاتا تھا کہ فلاں کے بیٹے ہیں۔ فلاں کے داماد ہیں۔ اور اب یہ زمانہ لگا ہے کہ فلاں کے باپ ہیں۔ فلاں کے سسرے ہیں۔ مگر ہم چکنے گھڑے۔ ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ ہم وہ نہیں ہے۔"

("عشق بالواسطہ")

"دھوکا" میں بی بی نائکہ اور "اندر والے" یعنی ان کے دل کا مکالمہ ملاحظہ فرمائیے: ————

"سنئے صاحب۔ میں کہانی لکھنا نہیں ہوں۔ کہانی کہتا ہوں۔ اچھی معلوم ہو تو سننے جائیے۔"

اندر والا: "سنو بی نائکہ تم اور صغیر تو پردے سے لگے گھڑیوں باتیں کرتے ہو، اور جو کچھ کہہ دے۔"

نائکہ: "مجال ہے جو کوئی کچھ کہہ دے۔ کرتے نہیں تو ڈر کس کا۔ بھلا مجھ سے آٹھ سال کا چھوٹا۔ اور پھر وہ تو مجھے پچی کہتا ہے۔"

اندر والا: "تم ہنسنے زیادہ لگی ہو۔"

نائکہ: "ہنسی آتی ہے تو کوئی کیا کرے۔"

پھر ٹھاکر درگاہی خاں سے ملئے، کہ صوبے کے اس ماحول اور اس زمانے کی ایک نساشدہ ہستی ہیں "جس قدر تعلیم حاصل کی تھی اسے بھی نہایت احتیاط سے چھپاتے تھے۔ بچپن میں کچھ انگریزی بھی پڑھی تھی مگر کیا مجال جو کوئی

اس کا پتہ پا جائے۔ زبان انہوں نے ملیے وضع داری کے ہمیشہ اودھی بولی مگر مطالب مارکس، جرمی بنتھم اور حافظ شیرازی کے ہوتے تھے۔ اندازِ گفتگو میں ڈاکٹر جانسن کی جھلک پائی جاتی تھی۔ ایک دفعہ دھوم دھام سے ہزاروں خرچ کرکے مچھلی کا بیاہ رچایا تھا۔ انکسار و خاکساری کی تصویر، اپنے سے زیادہ صاف کپڑے پہنے ہوئے ملازم کے لئے کہتے ہیں ــــــ

'امی ابیچ نہ آئیں۔ لالہ ہوئیں۔ ریل پر سب کو ڈھیں کا دھکیا وت ران کا رستہ دیت ہیں ؛ "

" اندرسبھا کی امانت " کا قصہ سنیئے : ــــــ

" جن لوگوں نے سلطان عالم کا زمانہ دیکھا ان کا ذکر نہیں۔ جو لوگ بعد کو آئے۔ وہ کیوں متاثر ہوتے تھے۔ جو کچھ اچھا رہا ہوگا وہ انہوں نے نہیں دیکھا۔ جو سنا ہوگا وہ دل خوش کن نہ تھا۔ پھر یہ دل پر چوٹ کیوں لگتی تھی۔ اس زمانے میں دل کی بات کہہ کر کون اپنے کو ہنسائے اور جوان فکر لوگوں میں بڈھا کہلائے مگر تاب نہیں ہوتی۔ کہے دیتا ہوں کہیں ان کے نمک کا اثر نہ رہا ہو۔

داستان گو صاحب آپ واقعی سٹھیا گئے ہیں۔ نمک کی آپ نے خوب کہی۔ نمک ملک میں پیدا ہوتا تھا۔ کوئی عمر ان کے باپ کا تھا۔

اے ہے میرا مطلب آپ نہیں سمجھے۔ خیر ہوگا۔ جانے دیجئے۔ کہانی سنئے : ــــــ

" کشکول " میں سے ایک اور نمونہ ان کے اسلوب کا دیکھ لیجئے۔ ایسے مضمون تو بہت طویل ہوا جاتا ہے لیجئے : ــــــ

" ــــــ راستے میں چھوٹا پھول کھلا تھا کہ مسافروں کو دیکھے گا۔ گدھا آیا اور اس کو چر گیا۔

" ــــــ پیاری چھوٹی چڑیا۔ یہ ننھی منی مکھی پھولوں کے بیچ میں مگن ہے۔ اس کو کیا کہ وہ کوئی کھا کے

" ــــــ دُور دراز کی جھیل مدتوں سے سکون کی نیند سو رہی تھی۔ نہ لہر۔ نہ ہچکولا۔ اے لو مینڈک اس میں کود پڑا۔

" ــــــ بوڑھے سفید بالوں والے کا جنازہ باپ دادا کی ہڈ داڑھیں رکھا ہے۔ جو زندہ ہیں لٹھیا پہ ٹیک لگائے کھڑے ہیں ــــــ

(سات جاپانی اشعار)

" لے ہے ان اشعار سے تو غم کے بادل چھا گئے۔ میری محفل سے رنجیدہ نہ اٹھئے۔ ایک ہو آئی سن لیجئے اور خوش خوش گھر جائیے۔ نہیں تو مجھ کو شرمندگی ہوگی ــــــ "

چودھری محمد علی کے یہاں قصے اور ان کے کردار خیالی یا فرضی نہیں ہیں۔ مولوی ابراہیم، راجہ پرتھوی پال سنگھ، بی بی ناچو، پچھمن تنبولی، اماّمن مہری، میر یوسف، حسنو کی بی بی، یہ سب اصلی، سچ مچ کے لوگ ہیں۔ داستان طراز نے واقفیت کا رنگ قائم رکھنے کے لئے ان کے نام بھی نہیں بدلے۔ ان میں سے چند ایک اب بھی لکھنؤ اور اس کے اطراف کے قصبہ جات میں غالباً ہوں۔ بہتیرے مرکھپ گئے۔ ان میں سے اکثر کا تذکرہ خود بھی گھر کے لوگوں سے سن چکی ہوں لیکن ان کو قصے کے پیرائے میں پیش کرنا محمد علی کا کمال ہے۔ یہ ہماری رچی ہوئی عوامی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ ان کی کمزوریاں، ان کی نیکیاں، ان کی معصومیت ——— اس بہتی ہوئی دنیا میں یہ حکایتیں لگتا ہے جیسے کسی اور سیارے کے قصے ہیں۔ وہ سیارہ جو کہیں کھو گیا ہے۔ یہ حکایتیں جزئیات نگاری کا شاہکار ہیں۔ یہ لوگ جنہیں لکھنے والے نے انتہائی ہمدردی، یگانگت اور خلوص کے ساتھ اپنے پڑھنے والوں سے متعارف کیا ہے۔ گویا دیکھئے یہ میرے لوگ ہیں میری دنیا کے باسی، شاید کوئی دلچسپی کوئی رنگینی، کوئی سنسنی خیز امکانات آپ کو ان میں نہ ملیں۔ لیکن یہ میری، میرے پرکھوں کی زمین کے بیٹے بیٹیاں ہیں۔ میری زمین، جو سارے ہندوستان کی زمین ہے۔ ان کا دکھ سکھ جو ہماری ساری تاریخ کا دکھ سکھ ہے۔

"کشکول محمد علی شاہ فقیر" کی اشاعت سے برسوں پہلے چند اور کہانیوں کے مجموعے، اور مختلف موضوعات پر کتابچے اور رسالے انہوں نے تصنیف کئے تھے۔ ان میں سے ایک "میرا مذہب" ہے جو غالباً ۱۹۲۸ء میں چھپا تھا۔ اس کے دیباچے میں انہوں نے لکھا تھا ——— "راقم الحروف انانیت کا شکار، باوجود استغفار کے بھی انانیت کا شکار رہتا ہے۔ "میں" کے استعمال سے پریشان ہے مگر "میں" اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا ———"

اس معذورت کی ضرورت انہیں اس لئے پیش آئی کہ عقلیت پرستی اور جذبات میں ہمیشہ ان کے یہاں جنگ رہی۔ شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے اور خود بھی شیعہ ہیں لیکن شیعوں کے بہت سے عقیدوں اور خصوصاً رسوم تعزیہ داری اور تبرّہ وغیرہ کے خلاف برابر شدید احتجاج میں مصروف رہے۔ اسی سلسلے میں یہ کتاب "میرا مذہب" لکھی۔ ہمیشہ مولویوں کی جان کو آئے رہے۔ لیکن مجتہد العصر جناب قبلہ ناصر حسین مرحوم کے بہت مداح ہیں۔ اور ساری عقلیت پرستی کے باوجود عالم یہ ہے کہ حسینؑ کا نام بھی کوئی ان کے سامنے لے تو بے اختیار رونے لگتے ہیں۔

آزادیٔ نسواں کے شدید حامی۔ آج سے تیس پینتیس سال پہلے، اپنی لڑکیوں کو اپنے گورو جج کرامت حسین مرحوم کے قائم کئے ہوئے اسکول میں انگریزی تعلیم دلوائی۔ چونکہ زندگی بھر مشغلہ لٹریچر رہا۔ لہٰذا نظریاتی طور پر

عورت بھی آرٹ اور لٹریچر کے زمرے میں آگئی۔ ان کا کہنا ہے کہ "عورت بدصورت ہو ہی نہیں سکتی۔"

آدابِ محفل اور فنِ گفتگو میں ماہران کے ایسے لوگ بہت کم دیکھے گئے ہیں۔ ان کے متعلق یہ مشہور ہے کہ انہوں نے آج تک اپنا ایک دفعہ کا سنایا ہوا قصّہ یا لطیفہ دوبارہ نہیں دہرایا۔ ہندوستانی کلاسیکل موسیقی پر AUTHORITY ہیں۔ اگر گانے والے سے ذراسی بھی کوئی چوک ہو جائے تو اسے فوراً خاموش کر دیتے ہیں یا وہاں سے اُٹھ جاتے ہیں۔

پریکٹیکل آدمی بالکل نہیں۔ آج تک کبھی خود اُٹھ کر پانی نہیں پیا۔ نوجوانی کے زمانے میں، جب ان کا علاقہ کورٹ میں تھا تب چند روز کے لئے بنک میں ملازمت کر لی تھی۔ لیکن کچھ دنوں بعد اسی صدمے اور دہشت سے بخار آنے لگا۔ اور بیمار پڑ گئے کہ نوکری کرنا پڑ رہی ہے۔

ان کا چاندی کا حقہ بھی بے حد مشہور ہے جسے ہمیشہ فصل کے نئے پھولوں سے سجایا جاتا تھا۔ یو پی میں زمینداری کے خاتمے کی وجہ سے اپنا تعلقہ ضبط ہونے کا ان کو اتنا زیادہ ذاتی رنج تو نہیں ہے لیکن اس کا بہت صدمہ ہے کہ اس قدر اہتمام و نفاست سے وہ حقہ اب تیار نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا انہوں نے اسے ترک کر دیا ہے۔

اودھ کی بہت سی باتوں سے بہت خفا ہے لیکن اسے چھوڑنے کے لئے کسی حالت تیار نہیں۔ لکھنؤ رودولی اور سائے اودھ کے اُجڑنے کی انہیں شدید ذہنی اور روحانی تکلیف ہے۔ اور اس وقت بھی جب کہ ان کی ساری اولاد اور پوتے، نواسے پاکستان اور سمندر پار کے ممالک میں سکونت پذیر ہیں۔ یہ گزرے وقتوں کے سائے کی طرح اب بھی اپنے پرکھوں کے وطن رودولی میں رہتے ہیں۔

دو تین ماہ ادھر کی بات ہے، انہوں نے اپنے اسی پرانے شگفتہ انداز میں، اپنی ایک صاحبزادی کو جو یہاں سے ان سے ملنے کے لئے رودولی گئی تھیں، ایک واقعہ سنایا کہ چند روز ہوئے وہ حضرت گنج میں سے گزر رہے تھے، راستے میں چند جانے والے نوجوان لڑکے مل گئے۔ ان کے ساتھ کچھ دیر ایک قہوہ خانے میں جا کر بیٹھے۔ ان سے ادھر ادھر کی باتیں کیں، جوانی کی جھلک دیکھی۔ اپنا بڑھاپا بھولے۔ پھر لڑکے اپنی راہ چلے گئے۔ سامنے سے ایک بوڑھا آتا نظر آیا۔ خیال آیا کہ اب پھر بڑھاپا دکھلائی دیا۔ بڑی کوفت ہوئی کہ اب دو گھڑی رک کر ان سے ملنا پڑے گا۔ صورت آشنا معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جی نہیں چاہ رہا تھا کہ ان سے ملیں۔ با دلِ ناخواستہ ان کی طرف بڑھے۔ دو قدم قریب پہنچ کر دیکھا تو سامنے قدِ آدم آئینہ تھا __________

مجھے احساس ہے کہ محمد علی ردولوی پر یہ مضمون سیر حاصل نہیں ہے۔ چودھری محمد علی کی کتاب کو پڑھنے کے لئے یا ان کی عظیم اور دلآویز شخصیت کے تذکرے سے لطف اندوز ہونے کے لئے، اس ثقافتی ورثے اور اس پس منظر سے محبت لازمی ہے ورنہ ان کی اور میری کھینچی ہوئی یہ تصویریں آپ کے نزدیک بالکل بے معنی ہوں گی۔ (بشکریہ "سویرا" لاہور ۱۹۵۵ء)

مرزا محمد عسکری

چودھری محمد علی رُدولوی

تعلقہ دار، امیر پور۔ ضلع بارہ بنکی

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

چودھری صاحب میرے شاگردِ رشید اور دوستِ عزیز ہیں۔ مجھ میں، اُن میں عاشق و معشوق کی نسبت ہے۔ کالوِن اسکول میں جس طرح یہ میری صحبت اور باتوں کے دلدادہ تھے، اور کوئی نہ تھا۔ کالون اسکول میں یہ بہ عمر ۱۳، ۱۴ برس داخل ہوئے اور ۹، ۱۰ برس تک تعلیم حاصل کی۔ اُسی زمانے سے اُن کے مزاج میں زور و شور حد کی ذہانت، صرفِ بے جا، جس کو سخاوت کہہ لیجئے، صنفِ نازک کے ساتھ دلچسپی، خمریات کا شوق، اشعار سے عشق، نچلے نہ بیٹھنا، لوگوں کو دِق کرنا، بزرگوں کی صحبت کا شوق، غرض کہ یہ صفاتِ عالیہ اُسی وقت سے آپ میں موجود تھیں اور بچّے کے پاؤں پالنے ہی میں معلوم ہو گئے تھے۔ اب ان میں کی اکثر باتیں داخلِ کیرکٹر ہو گئی ہیں۔ مثلاً عورتوں سے دلچسپی اب پرستش کی حد تک پہنچ گئی۔ اشعار کا شوق چوگنا ہو گیا۔ عملی مذاق کی یہ حالت کہ آپ نے اپنے پُر تکلف کمرے میں، جس میں آراتش قیمتی کپڑوں کی زرد رنگ کی تھی، ایک گیروا پوش صوفی کو کمرے کے رنگ کی رعایت سے ٹھہرایا اور موقع پاکر چلم ان کے سامنے ادب کے ساتھ اس زور سے پھونکی کہ اُن کی داڑھی جل اُٹھی اور وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر بھاگے۔ پردے میں آگ لگ گئی۔ سارا کمرا جل گیا اور آپ مثل نیرو کے، اس آتش زدگی کا تماشا دیکھتے رہے۔

بزرگوں کی صحبت سے شوق کی انتہا یہ تھی کہ آپ علّامۂ اجل مولانا سیّد کرامت حسین کنتوری۔ طاب ثراہ۔ کے بے تکلّف دوست۔ مہینوں بھوس والے بنگلے میں ان کے ساتھ رہتے تھے۔ انھوں نے مولانا مرحوم و مغفور کے دلچسپ حالات، مذاق کے پیرائے میں، ایک مختصر کتاب کی صورت میں لکھے ہیں۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہوشیار ظریف بزرگوں سے بھی ہنس سکتا اور ان کو ہنسا سکتا ہے۔ اس میں لکھتے

ہیں کہ ایک مرتبہ ایک خوبصورت کُبڑن خربوزے بیچنے آئی۔ مولانا تانہ تھے۔ وہ جانے لگی۔ چودھری صاحب نے اس کو روک کر مذاق کی باتیں شروع کیں۔ اتنے میں مولانا ہواخوری سے آگئے۔ کبڑن نے سلام کیا۔ مولانا متوجہ نہ ہوئے، گھر میں جانے لگے۔ چودھری صاحب نے کہا کہ حضرت اس کے خربوزے تو دیکھ لیجئے، ورنہ اس کو بڑا رنج ہوگا۔ مولانا نے فرمایا: خربوزے ابھی ہیں، اس وقت نہ لوں گا۔ آپ نے کہا اس کی محنت کا صلہ تو دیجئے۔ آخر اس نے کنگھی چوٹی کس کے لئے کی، سرمہ مِسّی کس کے لئے لگایا؟ کیا میرے لئے؟ مولانا بہت ہنسے اور اس کے خربوزے خرید لئے۔

چودھری صاحب جس وقت آتے ہیں ظرافت کا ایک باغ کھل جاتا ہے۔ میرے قلم میں طاقت نہیں کہ اس وقت کا سماں دکھاؤں جب چودھری صاحب مزے لے لے کر فارسی اشعار پڑھتے یا اپنے پرانے قصّے دہراتے ہیں۔ فکر ان کے پاس کبھی نہیں پھٹکتی اور یہ دوسروں کی بھی فکر تھوڑی دیر کے لئے مٹا دیتے اور غم غلط کر دیتے ہیں۔

آپ گزشتہ کونسل میں ایم۔ ایل۔ سی۔ تھے۔ پریسیڈنٹ اور تمام ممبر آپ کی اسپیچ سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے اصرار کیا کہ چودھری صاحب! کوئی مزے دار اسپیچ سنائیے۔ انھوں نے فیض اللہ و فرائض اللہ کا لطیفہ اس انداز سے بیان کیا کہ سب لوگ ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ یہ قصّہ انھوں نے مجھی سے سنا تھا۔ میں نے شکایۃً کہا۔ کیوں صاحب! ہمارے قصّے علی الاعلان سُنائے جاتے ہیں۔ کہنے لگے، یہ سب آپ ہی کا طفیل ہے۔

چودھری صاحب ردولی کے لڈّو اور رساول کی ہانڈی ہر سال بلا ناغہ ہدیۃً بھیجتے ہیں۔ خدا اُن شاد و شادکام رکھے۔

("مَن کیستم": مرزا محمد عسکری۔ ۱۹۴۲ء)

اے غریبِ دیباچے تجھ کو کون پڑھے گا

کون ہوتا ہے حریفِ مےِ مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

جو شخص کسی موضوع پر حاوی نہ ہو، اس کا کتاب لکھنا ظلم ہے۔ زبان سے غلط بات نکالنا بھی ظلم ہے مگر لکھنے میں تو یہ غضب ہے کہ "نوشتہ بماند سیہ بر سپید" ؎

گر کور کمر بہ باغبانی بندد — او را چہ زیاں، برگل و ریحاں ستم است

خالی ڈھارس اسی خیال سے ہوتی ہے کہ اس بھیڑ میدان میں ہم اکیلے نہیں ہیں۔ ہمارے ایسے نہ معلوم کتنے ہوں گے یہ تو میں اپنے دل کو تسکین دینے کے لئے لکھ رہا ہوں جو واقعی عذرات اس رسالہ کے لکھنے کے میرے پاس ہیں ان میں سے ایک یہ ہے۔ یہ کسی کو تعلیم دینے کے لئے نہیں لکھا گیا ہے۔ یہ تو ایک اعتراف ہے جو ایک گنہگار اپنے پروردگار، اور اس کے بندگان نیکوکار کے آگے کر رہا ہے اپنے خالق سے دعا ہے کہ مجھے معاف کرے اور ہدایت فرمائے اور مخلوق سے استدعا ہے کہ پڑھ کر عبرت کرے اور میرے لئے دعا، استغفار فرمائے۔

دل میں ایک چھپی ہوئی خواہش یہ بھی تھی کہ کاش اس رسالہ سے "واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً و لاتفرقوا" کی بھی صورت بندھ جاتی۔ مگر افسوس یہ سعادت میری تقدیر میں نہ تھی۔ اس چیز کا خواب میں ہمیشہ دیکھا کیا تھا۔ اور اصل غرض اس رسالہ کی بھی یہی تھی۔ میں نے ہزار کوشش کی کہ بغیر کھرو پنچ لگائے۔ اپنی بات دوسروں کے سامنے رکھ دوں مگر افسوس صد افسوس یہ کمال مجھے ودیعت ہی نہیں ہوا تھا ؎

جی میں جو آئے کہیو پیارے — ایک ہو نا نہ در پے آزار

یہ شرف خدا کے نیک بندوں کو عطا ہوتا ہے۔ ہم ایسے گئے گذرے بندوں کے لئے نہیں۔ پھر بھی اگر پڑھنے والے میرے اندازِ بیان پر غور کم کریں اور میرے منشاء کو ڈھونڈھنے پر زیادہ زور دیں تو شاید کچھ یگانوں کی بیگانگی کم ہو جائے۔ گو اسلام کا تفرقہ رونے کا مقام ہے۔ مگر ان گئے حالوں پر بھی کچھ باتیں ہیں جو جگہ جگہ دگر دگر کی خوش آیند جھلک دکھا دیتی

ہیں۔ بشرطیکہ آدمی خود اختلاف کے مزے نہ لینا شروع کردے۔ مغرب کی نماز اور افطار میں جو فرق یار لوگوں نے کر رکھا ہے ہر شخص کو معلوم ہے۔ شیعہ دیر ہی کرتا چلا جاتا ہے۔ سنّی جلدی ہی مچائے ہے۔ حالانکہ دونوں "ثم اتموا الصیام الی اللیل" پر منضبوط ہیں۔ اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی ہے تو شاید صدوق علیہ الرحمہ کا جن سے بڑا آدمی معصومین کو چھوڑ کر شیعوں کے یہاں نہیں گذرا ہے۔ حکم ہے کہ قرص آفتاب غایب ہونے کے بعد مغرب کی نماز میں انتظار کی ضرورت نہیں۔ غروب آفتاب بدیہات میں سے ہے جس میں مجتہد یا مولوی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ سنّی حضرات بھی افطار اور مغرب میں وہ عجلت کرتے ہیں کہ دیکھ کر صاف سمجھ میں آتا ہے کہ فرق کرنا اصل مقصد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دیر نہ ہونے پلئے ورنہ روزہ مکروہ ہو جائے گا۔ لیکن اگر روزہ جلدی کھل گیا تو کیا ہوگا۔ اِن کانوں نے اذان سُنی ہے اور اس کے ساتھ ہی اِن آنکھوں نے دَھنک دیکھا ہے۔ اونچی اونچی دیواروں پر دھوپ کی زردی بھی دیکھی ہے۔ یہ اسی جلد بازی کا نتیجہ ہے جو حضرات علماء نے اپنے مریدین اور مقلدین پر قبضہ رکھنے کے لئے کیا ہے۔ ایک چھوٹی سی مسجد کے زیرِسایہ خرابات یعنی غریب خانہ ہے خدا کا ایک بندہ اس میں اذان دیتا ہے اور چاہے کوئی آئے نہ آئے وہ مسجد میں وقت سے حاضر ہو جاتا ہے۔ ان مولوی صاحب کے پیچھے میں نے اکثر نماز پڑھی ہے۔ رمضان شریف گذر چکے تھے، شوال کا مہینہ تھا۔ مولوی صاحب نے اذان دی اس کے بعد آسمان پر دَھنک دکھائی دیا۔ میں نے بعد کو مولوی صاحب سے ازراہِ بے تکلفی کہا "مولوی صاحب میں تو آپ کو مسلمان سمجھتا تھا مگر آپ تو نرے سُنّی ہی نکلے۔ اس دن سے مولوی صاحب کی اذان سب اذانوں کے بعد ہی ہوتی ہے۔ اور کسی پڑھے لکھے سُنّی نے اعتراض بھی نہیں کیا کہ تم نے اذان دیر کر دی۔ اکثر حضرات فرنگی محل نے بھی مغرب کی نماز ان کے پیچھے پڑھی ہے مگر کسی نے اشارتاً کنایتہً بھی ان پر دیر کو اذان دینے کا الزام نہیں لگایا۔

نکاح ایک دوسرا مسئلہ اسی طرح کا ہے۔ حضرات علمائے فریقین نے اپنے مقلدین اور مریدین کے جہل پر بھروسا فرما کر ایک صاحب نے اس کا نام "نکاح" رکھا ہے اور دوسرے نے صیغہ۔ لغت میں نکاح کے معنے شاید صیغے سے وسیع تر ہیں۔ لیکن معاہدۂ نکاح دونوں میں عام ہے۔ شرائط میں اہلِ سنّت کے یہاں ایجاب وقبول مہر و اعلان ضروری ہے۔ شیعوں کے یہاں بھی یہی سب کچھ ہے صرف اعلان کی شرط نہیں ہے۔ میں عرض کرتا ہوں جن معاہدوں میں اعلان ہو جاتا ہے ہزار میں نو سو ننانوے ہوتے ہیں۔ پھر ان میں تو فرق نہ کریں۔ عموماً دو حضرات صیغہ جاری کرتے ہیں اور ایک صاحب نکاح پڑھتے ہیں۔ حالانکہ ایک آدمی بھی صیغہ جاری کر سکتا ہے اور دو آدمی بھی نکاح پڑھ سکتے ہیں۔

مجھ کو صرف یہ عرض کرنا ہے ؎

تو برائے وصل کردن آمدی — نے برائے فصل کردن آمدی

جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس کو لوگ معمولی بات سمجھتے ہیں۔ جن کے اوپر گذر چکی ہو وہی جانتے۔ میری پہلی شادی کے وقت نکاح کا تجربہ مجھ کو کم تھا جو جو آفتیں سنی شیعہ اعزا کے ہاتھوں میری مرحومہ بی بی اور مجھ کو جھیلنی پڑی ہیں وہ ہم ہی جانتے ہیں یا ہمارے اعزا بروز قیامت انشاء اللہ جانیں گے۔

میری پہلی بی بی مرحومہ پر زور ڈالا جا رہا تھا کہ وہ شیعہ ہو جائے مگر میں نے اس مرحومہ کو صلاح دی کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف ہرگز اپنا مذہب نہ بدلے چنانچہ مرحومہ کا اپنے قدیم طریقے پر انتقال ہوا اور اسی طریقہ پر سپرد خاک ہوئی۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔

میں خود وصیت کر چکا ہوں اور کہتا ہوں کہ خدا ایسا کرے کہ ہر "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کہنے والا مجھ کو سپرد خاک کرے اور میرے لئے نماز مغفرت پڑھے۔ نہ یہ کہ میرے جنازے پر لاٹھیاں اٹھ جائیں اور میرا مردہ اس آخری حق سے محروم رہے جو کلمات شہادتین پر یقین رکھنے والے کا حق ہے۔

سنی شیعہ کی شادی آپس میں نہ ہونا عجیب تازہ مصیبت ہے۔ اس خیال سے ضرور رکاوٹ ہوتی ہے کہ ممکن ہے شوہر بی بی پر ظلم کرے لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ رشتۂ محبت قائم ہو جانے سے دلوں کی سختیاں کم ہو جائیں کچھ دن ہوئے ایک شیعہ لڑکی کا عقد ایک سنی لڑکے کے ساتھ طے ہو رہا تھا۔ فریقین کے اکثر اعزا مخالفت پر تل گئے۔ عین وقت پر ایک شیعہ مولوی صاحب نے صیغہ جاری کرنے سے انکار کر دیا۔ ناچار دوسرے مولوی صاحب جو میرے بھتیجے ہیں اور جن کی شاگردی اور استادی پر مجھ کو فخر ہے' انہیں' مجتہد سلم الرحمن نے دونوں طرف سے عقد پڑھا۔ یہ مجتہد صاحب علی گڈھ کالج میں ابھی تک شیعہ ڈین تھے۔ ان کے پیچھے اکثر سنی لڑکے نماز پڑھا کرتے تھے اور اکثر شیعہ لڑکے سنیوں کی جماعت میں نماز پڑھ کر شیعہ رجسٹر میں آکر حاضری لکھا دیتے تھے۔ موصوف نے یہ بھی کوشش کی تھی کہ شیعہ سنی طلبہ کو تاریخ اسلام ساتھ پڑھائی جائے مگر مولویت نے درمیان میں بیچ تلوار رکھ دی۔ عمرانیات کی رو سے کبھی شیعہ سنی میں قرابت بند ہو جانا بڑی نکبت ہے۔ نوجوان حضرات اس پر غور فرمائیں۔ میرے پڑھنے والے! اختلافات پیدا کرنے والوں کی حد اس درجہ تک پہنچ چکی ہے کہ ایک صاحب السلام علیکم فرماتے ہیں اور دوسرے صاحب سلامٌ علیکم کہتے ہیں۔ حالانکہ زیارات میں شیعہ ہر جگہ السلام علیک یا ابا عبد اللہ وغیرہ پڑھتے ہیں۔ اور سنی قرآن میں سلامٌ علیٰ آل یٰسین وغیرہ پڑھتے ہیں۔ میں نے جل کر الف لام اور تنوین دونوں چھوڑ دی ہیں اور صرف بولتا ہوں کہ سلامًا علیکم بمہ

اکتفا کی ہے۔ مسلمان یہ نہ خیال فرمائیں کہ سُنّی شیعہ میں ہر جگہ اختلاف ہی اختلاف ہے۔ میں نے ایک بات میں پوری طرح اتفاق بھی دیکھا ہے ہر مسلمان اس پر فخر کرتا ہے۔ اور بجا فخر کرتا ہے کہ اسلام نے صفائی کے اصول سکھائے اور ہر جگہ اس کی ترغیب دی ہے۔ چنانچہ مسواک کے لئے بھی سنّت ہے کہ نماز کے پہلے کی جائے۔ میں نے حرم مدینہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جیسے ہی اذان شروع ہوئی اکثر شریعت کے پابند حضرات نے جیب سے یا عمامے کے پیچ سے چھوٹی چھوٹی مسواکیں نکالیں اور سُنّت کی پیروی شروع کی۔ چونکہ حرم میں قالین کا فرش ہے اس لئے تھوک تو سکتے نہیں لہٰذا ملغوبہ کیا ہوا؟ یہ میں نے اپنی آنکھوں سے سُنّی اور شیعہ علماء کو یہ کرتے دیکھا ہے۔ یہ ہے صفائی اور یہ ہے سُنّتِ رسولؐ کی پیروی۔

آخر میں ان حضرات سے معافی کا پھر خواستگار ہوں جن کو یہ کتاب پڑھ کر تکلیف پہونچے۔ طنزیہ عبارت لکھتے لکھتے عادت خراب ہو گئی ہے جیسے کوئی شریر لڑکا ہوتا ہے کہ راستہ چلتے شرارت کیا کرتا ہے ورنہ (غالب مرحوم تصرف سے معاف فرمائیں)

طنز و مذاق ہو یہ طبیعت بُری نہیں
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

آخر میں عزیزی غلام اصغر صاحب کا شکریہ ہے جن کی امداد کے بغیر یہ کتاب تیار ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ اسناد ڈھونڈنا۔ مسودہ صاف کرنا۔ مسکرا مسکرا کر میرا دل بڑھانا۔ ان تمام باتوں کا بہت بہت ممنون ہوں۔

برخوردار محمد رضا شبّر سلمہ کو خدا علم و عمر و دولت دے جنہوں نے آخری نقل اتاری اور جہاں میں اُول جلول آدمی املا وغیرہ میں غلطی کر گیا تھا یا روا روی میں کچھ کا کچھ لکھ گیا تھا اس کو ٹھیک کیا۔

"مصنّف"

○

راقم الحروف محمد علی ردولوی عفی عنہٗ انانیت کا شکار باوجود استغفار کے بھی انانیت کا شکار ہی رہتا ہے "میں" کے استعمال سے پریشان ہے مگر "میں" پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ناچار آپ بھی درگذر سے کام لیجئے۔ اور اگر کوئی اچھی بات نکل آئے تو اس کو قبول کیجئے۔ نہیں تو بہ نظر عبرت میرے لئے دعائے خیر کیجئے اور اس تحریر اور تحریر کرنے والے کو بھول جائیے۔

لارڈ مارلے کو جب وائیکاؤنٹ کا خطاب بادشاہِ انگلستان نے دیا تو انہوں نے لارڈ منٹو کو لکھا "ملک

اور قوم کی خدمت میں عمر کاٹ دی۔ اس بڑھاپے میں وہ چیز گلے پڑی جس لئے عمر بھر بگاڑ رہا۔ اب آخری عمر میں خطاب کلنگ کا ٹیکہ ہو کے ماتھے پر لگا۔ تو حبِ وطن کے لئے یہ بھی قبول ہے۔ اس بڑھاپے میں دربار عوام کی محنت نہ ہو سکے گی لیکن اس ذریعے سے دربار امراء ہی میں کچھ تھوڑا بہت مشغلۂ خدمت جاری رہے گا۔ نہ معلوم سچ یا جھوٹ اسی طرح میں بھی اپنے دل کو سمجھاتا ہوں کہ یہ حقیر "میں" کی بھرمار اسی وجہ سے کر رہا ہے۔ خدا جانے اصلیت کیا ہے۔

میں شیعہ گھر میں پیدا ہوا اور شیعہ تربیت پائی۔ لیکن تبرّا سے ہمیشہ نفرت رہی۔ یہ پہلی بناء مذہب سے بغاوت کی تھی جو مجھ کو یاد ہے۔ میری بڑی بہن مرحومہ کے لئے ایک مولوی نوکر تھے۔ جب میری بسم اللہ ہوئی تو میں بھی ان کے پاس بٹھا دیا گیا۔ ان مولوی صاحب کا تھوڑا سا حال بیان کر دوں تو شاید میری تربیت کا پتہ چل جائے۔ ان کا نام مولوی واجد علی تھا۔ سن تقریباً چالیس اور پچاس کے درمیان میں رہا ہوگا۔ چھوٹا سا قد۔ منہ پر کھچڑی داڑھی۔ تلاوت بڑی روانی سے کرتے تھے۔ دو روپیہ مہینہ اور کھانا پاتے تھے۔ ہمارا چھوٹا سا علاقہ کورٹ میں تھا۔ اس لئے عسرت میں بسر ہوتی تھی مگر غرور اور بڑائی کا سامان پھر بھی مہیا تھا۔ جو لڑکے میرے ساتھ کھیلتے تھے وہ اپنے انداز سے مجھ پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ تم امیر آدمی کے بچے ہو۔ ہمارے یہاں سے مولوی صاحب کو تین جوڑے روٹی اور دال دونوں وقت ملتی تھی یہ روٹیاں بہت پتلی اور چھوٹی ہوتی تھیں۔ دو روٹیاں ان میں سے مولوی صاحب کو تر دن کے لئے توڑتے تھے۔ باقی دس روٹیوں میں جو بچتا ہو اس کو یہ اصرار شریک کر لیتے تھے پیٹ نہ بھرنے کی شکایت جہاں تک یاد ہے کبھی نہ کی۔ نہ کوئی انداز ایسا یاد ہے جس سے یہ بات نکلتی ہو۔ تین مہینے کے رٹنے رکھتے تھے اور ہر وقت خوش رہتے تھے اس سن میں ہم پڑھتے کیا رہے ہوں گے مگر یہ مجھ کو یاد ہے کہ اکثر کاندھے لگا کر مجھ کو سلا دیتے تھے اور آب دست بھی دے دیتے تھے۔

میری عمر کے ساتویں سال دوسرے مولوی مقرر ہو گئے۔ اس لئے یہ واقعات میری عمر کے چھٹے سال تک کے ہیں۔ ہمارے دادا اثنا عشری تھے مگر دادی شیعہ تھیں۔ میرے والد بذاتِ خود شیعہ ہو گئے تھے اس لئے میرے گھر میں (کم سے کم مردانہ میں) تشیع کا رواج تھا۔ کیونکہ نوکر چاکر سب سُنّی ہی تھے۔ البتہ اندر غوطہ طہارت غیر مسلم کے یہاں کی چیز سے احتیاط پورے طور سے تھی۔ مجالس، تعزیہ داری اور دوسرے تمام مناسک جو شیعہ گھروں میں ہوتے ہیں برابر ہوتے تھے۔ کیونکہ میری والدہ مرحومہ بڑے کٹر شیعہ گھر کی تھیں۔ آٹھویں محرم کو حاضری بھی ہوتی تھی۔ چنانچہ مجھ سے بھی تبرّا کہنے کو کہا جاتا تھا۔ مجھ کو خوب یاد ہے کہ میں نے ایک بار انکار کیا۔ میرے یہاں عورتوں نے کہا کہ یہ اثر سُنّی مولوی کا ہے۔ وہ نکال دیئے جائیں۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے اس میں میری سزا کی بھی غرض تھی کیونکہ میں مولوی صاحب سے زیادہ مانوس تھا۔ اور لوگ جانتے تھے کہ اس طرح لڑکا دب جائے گا۔ میری سرتابی کی خبر مولوی صاحب تک بھی پہونچتی تھی مولوی صاحب کا

رقیہ میرے دل پر نقش کا الحجر ہے۔ مولوی صاحب مجھے گود میں لے لیتے تھے اور پیار کرتے تھے اور کہتے تھے جاؤ بیٹا۔ جو کچھ تمہاری ماں کہتی ہیں کہدو۔ پیار کرنے میں ان کی بیچ سے منڈی ہوئی مونچھیں میرے گال پر گڑ جاتی تھیں۔ یہ مجھ کو آج تک خوب یاد ہے اور جو کچھ سکھاتے رہے ہوں مجھ کو یاد نہیں۔ لیکن اس امر کا پورا الیقین ہے کہ انہوں نے تشیع کے خلاف کسی موقع پر کچھ نہیں کہا۔ گو اور لوگ اکثر کہا کرتے تھے کہ ان کے باپ بے تعصب تھے۔ گویا اس طرح سے شیعیت کے خلاف رجحان دلایا جاتا تھا۔ اس زمانہ کے بعد جہاں تک خیال جاتا ہے میں پوری طرح سے شیعہ رہا۔ اور مجلسوں میں کمسنی ہی میں بڑا باکی مشہور تھا۔ یہ حالت اس وقت تک ہے۔ خیراب تو بڑھاپے کی وجہ سے رقت بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ یہاں تک کہ اکثر باتیں کرنے میں رسول اللہؐ اور امام حسینؑ کا نام بغیر متاثر ہوئے نہیں لے سکتا۔ مگر اس میں بڑا حصہ اعصاب کی کمزوری کا بھی معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال میرے دل میں اہلبیت کی محبت ہمیشہ جاگزیں رہی اور آج بھی عقل کی بنا پر بہت ہے۔ گو عقیدت کی بناء پر اس درجہ کی نہ ہو۔ تب بھی میں ان حضرات کی دماغی۔ دلی۔ وجدانی۔ نسلی اور روحانی فضیلتوں کا خیال کرکے خوش ہوتا ہوں۔ اور دل کے اندر بحمد اللہ ایک کشادگی پاتا ہوں۔

میرے یہاں علاوہ اور مناسک عزاء کے مہندی بھی اٹھتی تھی۔ جوانی پر پہنچ کر سب سے پہلے اس معاملے میں دلی پریشانی شروع ہوئی۔ مجالس میں اور یوں بھی شیعہ علماء اور پڑھے لکھے حضرات سے سنتا آتا تھا کہ حضرت قاسم کی شادی کی روایت کربلا میں ضعیف ہے۔ ضعیف کے لفظ کے معنی تو جانتا تھا۔ مگر علم حدیث میں اس کے اصطلاحی معنوں سے ناواقف تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ وہ روایتیں ہیں جن میں اس وقت سے لے کر اس وقت تک تمام راویوں کا سلسلہ ایک طرح کا نہیں تو سمجھ میں آیا کہ یہ اُن الفاظ میں سے ہے جن کے لئے بجائے ایک بدنما لفظ کے ایک خوبصورت لفظ استعمال کیا جاتا ہے جیسے آٹھ برس کے گھوڑے کو "مِلے پنج" کہتے ہیں۔ کسی بحث میں ضعیف روایت قابلِ قبول نہیں سمجھی جاتی مگر ہم مقلدین کو دھوکے میں رکھنے کے لئے کافی ہے۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ اس آفت میں جو کربلا میں تھی شادی کیا ہوئی ہوگی۔ مگر اس خیال کو ظاہر کرنے کی جراءت نہ ہوتی تھی۔

ساتویں محرم کو ہمارے یہاں دس بجے رات کو مہندی اٹھتی تھی اور تقریباً دو بجے حضرت عباسؑ کی درگاہ پہونچ جاتی تھی۔ پھر رد و بدل کے محرم میں ترقی ہوجانے کی وجہ سے ہماری مہندی اکثر صبح ہوتے ہوتے درگاہ پہونچنے لگی۔ لوگوں کی تکلیف۔ ماتم کی محنت اور اس کے ساتھ یہ بھی ڈر کہ کہیں روشنی کا سامان نہ کم پڑ جائے۔ میں ہمیشہ سے چاہتا تھا کہ لوگ جلدی کریں۔ مگر جوشِ عقیدت میں میری بات کم مانی جاتی تھی۔ ایک بار ہم لوگ اس وقت پہونچے جب صبح کی نماز کا وقت قریب تھا۔ لوگوں نے ہاتھ پاؤں دھوئے چاء پی۔ اتنے میں صبح کی اذان ہوئی۔ گو اس وقت میں نماز کا پابند نہ تھا۔

مگر اہلبیت کے کارنامے دل میں حاضر تھے۔ میں نے لوٹے اور تسلے رکھوا دیئے کہ مومنین نماز بھی ادا کرلیں۔ مگر ایک صاحب نے بھی یہ نہ کیا ممکن ہے کہ بعض نے گھر پہ جاکر پڑھی ہو لیکن میرے یہاں سے مسکرا مسکرا کر سب چلے گئے۔ میری آنکھیں کھل گئیں کہ نماز قائم کرنے کی بہترین مثال کربلا میں ہوئی اور ہم نے گریہ و بکا و ماتم اور عقیدت کے باوجود نماز نہیں پڑھی۔

اب ہمارے وطن کا محرم اور ترقی پکڑ گیا۔ بڑی لمبی مجلسیں۔ بڑے علمی مذاکرے۔ منطق کی الٹ پھیر بڑھ گئی۔ مومنین مختلف وجوہ سے مجلسوں میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ مگر رقت کم ہوگئی۔ لیکن مشکل یہ آن پڑی ہے کہ جب تک گریہ و زاری کا خوب شور نہ ہو عموماً ذاکرین پنڈ نہیں چھوڑتے۔ اگر ایک بینیہ ٹکڑے پر رقت خوب نہ ہوئی تو ذاکر صاحب نے پھر سے تمہید شروع کی اور پھر کوئی بینیہ گوشہ نکالا۔ اس ڈر سے کہ کہیں صاحب پھر سے تمہید نہ شروع کریں۔ لوگ ہو ہو کر کے رو پڑتے ہیں۔ بڑی مجلسوں میں کچھ رونے والوں کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ اکثر تو یہی ہوتا ہے۔ کبھی کبھی کسی ذاکر کی پُرجوش تقریر اور واقعی دل سے پڑھنے پر بے اختیار گریہ ہوتا بھی ہے۔ چاہے مجلس تھک گئی ہو اور پریشان ہوکر رو دے یا واقعی دل سے رونا آئے۔ ہر شخص ختم مجلس پر خوشنودی ہی ظاہر کرتا ہے اور کہتا ہے "ماں مجلس" خوب ہوا۔ رفتہ رفتہ یہ خیال گزرنے لگا کہ ماں مجلس رونا کیسے ہو سکتا ہے۔

ایک حدیث بھی بیان کی جاتی "من بکی علی الحسین او ابکی و تباکی اوجبت لہ الجنۃ" اوّل تو اس کے ترجمہ میں منطق کا کمال دکھایا جاتا ہے یعنی "تباکی" کے معنی بجائے بہ تکلف رونے کے "رونے والوں کا سا منہ بنانا" بیان کیے جاتے ہیں۔ گو دونوں معنوں میں فرق ظاہر ہے لیکن اگر کوئی جراءت کرکے اعتراض کرے تو جواب موجود ہے کہ "منہ بنانے میں بہ تکلف رونا تو ہو جاتا ہے" (قربان جایئے اس منطق کے) علاوہ اس کے پڑھے لکھے لوگوں نے مجھ کو بصیغۂ راز بتایا بھی ہے کہ یہ حدیث کسی معصوم تک پہنچتی بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی شیعہ صاحب اس معاملے میں میری تسکین کر دیں تو انشاء اللہ عنداللہ ماجور ہوں گے اور یہ ناچیز بھی ہدیۂ تشکر پیش کرے گا۔

ماں مجلس اہلبیت کی پیروی اگر کہی جائے تو ایک بات بھی ہے خود رونا ماں مجلس کیسے ہوا۔

جس وقت مصائب اہلبیت سُن کر گریہ گلوگیر ہوتا ہے تو پڑھے لوگ پکار اٹھتے ہیں "یا لیتنی کُنْتُ مَعَهُمْ فَافُوزَ فَوْزًا عَظِيمًا" چنانچہ میں بھی یہی کرتا تھا اور اپنے زعم ناقص میں دل سے کرتا تھا۔ تقاضائے مستقیم طریقی دیکھئے یہ آیۃ قرآن پاک میں کس موقع پر آئی ہے[1]۔

---

[1] یا ایھا الذین آمنوا خذوا حِذرکم فانفروا ثبات او انفروا جمیعا ○ وانّ منکم لمن لیبطئن فان اصابتکم مصیبۃ قال قد انعم اللہ علیّ اذ لم (بقیہ حاشیہ صفحہ پر دیکھئے)

جب پہلی عالمگیر لڑائی شروع ہوئی اور عراق بھی انگریزوں کے قبضہ میں آگیا تو میں نے محسوس کیا کہ بھئی "یالیتنی" ہم کہتے تو ہیں مگر یہ دوسری ہی بات ہے۔

کربلا۔ نجف۔ کاظمین۔ سامرہ۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اور ہم چپ رہے۔ ہم سے جب چھوٹی چھوٹی قربانیاں نہیں ہو سکتیں تو کربلا کی قربانیاں کیسے ہوتیں۔ دل نے کہا "محمد علی بیٹر ہو، نامرد ہو۔ جب تم جانتے ہو کہ یہ قربانیاں تم سے نہیں ہو سکتیں تو فضول اپنے نفس کو دھوکا دینے کے لئے "یالیتنی" کیوں کہتے ہو۔ اگر تم امام حسینؑ کی تاسی کرو تو مواقع آج بھی موجود ہیں مگر تم سے نہیں ہوتا۔ پھر یہ جھوٹ موٹ کیا ہوا باندھتے ہو۔ بجائے "یالیتنی" کہنے کے حاضر و ناظر۔ سمیع و بصیر خدا کے آگے شرمندہ ہو۔ اتنا بڑا جھوٹ اپنے نامۂ اعمال میں لکھوا رہے ہو خیر تم سے قربانی کہاں ہوگی۔ اور تاسی کیا ہوگی۔ یہی بے ایمانی چھوڑ دو کہ "یالیتنی" کہتے ہی شرمایا کرو" چنانچہ برسہا برس ہوگئے۔ یہ بڑی بات اس چھوٹے منہ سے نہیں نکلی۔

گو میں انتہائی کوشش کر رہا ہوں کہ اپنے دل کی صحیح کیفیات نکال کر آپ کے آگے رکھ دوں۔ مگر یہ سہل کام نہیں ہے۔ آدمی اپنے زعم ناقص میں واقعہ بیان کرتا ہے مگر نفس نقاب کے اندر نقاب اور اس کے اندر نقاب ڈالے بہروپیا بنا بیٹھا رہتا ہے اور لکھنے والا خود دھوکا کھا جاتا ہے ؎

ہیں خواب ہی میں جو ابھی جاگے ہیں خواب سے

اس لیے پڑھنے والوں سے گذارش ہے کہ میرے اعتراف کو ایک پلّہ میں رکھیں اور اپنے نفس اور خیالات کو دوسرے پلّہ میں اور پھر اندازہ کریں۔ اگر میرا والا پلّہ ہلکا ٹھہرے تو بجائے مجھ سے نفرت کرنے کے از راہِ رحم میرے لیے ہدایت اور مغفرت کی دعا مانگیں۔

بہرحال سنئے۔ میرے ایک ہموطن کے یہاں مجلس تھی۔ میں بھی شریکِ مجلس تھا۔ ذاکر صاحب نے منبر پر پہونچ کر مجھے قریب منبر بیٹھنے کی دعوت دی اس کے بعد لڑکیوں کو انگریزی اسکولوں میں پڑھانے اور بورڈنگ ہاؤس میں رکھنے پر اعتراضات جڑے۔ جہاں تک خیال پڑتا ہے اس وقت میری ہی لڑکیاں الٰہ آباد یا لکھنؤ کے اسکولوں میں

اکن معهم شهیدا ٥ ولئن اصابکم فضل من الله لیقولن کان لم تکن بینکم وبینه مودة یالیتنی کنت معهم فافوز فوزا عظیما ٥" ترجمہ: ایمان والو خوب اپنی خبرداری کر لو۔ پھر جدا جدا فوج کی صورت میں کوچ کر کے ایک ساتھ چلو۔ تم میں وہ لوگ بھی ہیں جو جہاد میں جانے سے پہلوتہی کرتے ہیں۔ اور کوئی مصیبت تم پر پہنچتی ہے تو کہتے ہیں اللہ نے ہم پر فضل کیا۔ ہم مجاہدین کے ساتھ موجود نہ تھے۔ اور اگر ہم پر اللہ کا فضل ہوا تو اس طرح کہتے ہیں گویا تم میں اور ان میں کچھ دوستی ہی نہ تھی۔ کاش میں ان کے ساتھ ہوتا تو مجھے بھی بڑی کامیابی حاصل ہوتی۔

(سورۂ نساء آیۃ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳)

پڑھنے لگی تھیں۔ اس بات کو حاضرین میں سے سب نے محسوس کیا کہ ذاکر کا روئے سخن میری ہی طرف تھا۔ اور اسی دن سے ان کی مجلس اور تقریروں کے سننے کے وقت میرا نفس ہمیشہ شریک رہا۔ میرے دل نے کہا۔ ذاکر صاحب کا یہ مطلب ہوگا کہ اگر اس نے (یعنی میں نے) بانی مجلس سے لڑائی کر لی تو بھی اچھا ہے۔ اور اگر یہ کہا بد لو تو بھی ایک ملحد کو خوب ذلیل کیا۔ میں نے یہ خیال کیا کہ اگر بانی مجلس سے لڑ گیا تو جو شخص مجھ سے خار کھاتا ہے اس کو خوشی ہوگی۔ میرے وطن کے حضرات اہلسنت الگ خوش ہوں گے کہ شیعوں میں خوب تفرقہ پڑا۔ اسلیے میں پی گیا۔

ان ذاکر صاحب کو مجھ سے چشمک کیوں تھی؟ شروع جوانی سے میرے خیالات صرف ملحدانہ نہیں بلکہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ بالکل دہریت کے تھے اور منہ پھٹ بھی ہمیشہ کا تھا۔ آدمی کی طبیعت عجیب گورکھ دھندا ہے۔ میرے خیالات "مل" "ہربرٹ اسپنسر" اور اسی طرح کے دوسرے مصنفین کی کتابیں پڑھ کر دہریت کے ہو گئے تھے۔ مگر بچپن کی تربیت کی وجہ سے باوجود بہت سے شکوک کے پھر بھی شیعوں کا صرف ہمدرد ہی نہیں تھا بلکہ شیعوں کو جادۂ مذہب سے ہٹا ہوا بھی نہیں سمجھتا تھا۔ تبرا ہمیشہ خلاف طبیعت رہا اور شروع شروع اگر کہا بھی تو جی کے اندر شرمندہ سا ہوا۔

اس کے سمجھانے کے لیے ایک دوسرا قصہ بیان کرنا پڑیگا۔ مولانا کرامت حسین صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ بیرسٹر اور سابق جج الہ آباد ہائی کورٹ جنہوں نے اپنی عمر کی پوری کمائی لگا کر کرامت حسین مسلم گرلز کالج قائم کیا تھا جو آج تک لکھنؤ میں ہے بڑے ذی علم تھے۔ ان کی تصانیف قانون و اخلاقیات کے اوپر ایسی تھیں کہ امریکن اخباروں نے جہاں نہ مروت کا سوال تھا نہ سفارش کا۔ ان کی تعریف میں لکھا ہے کہ 'ان کو پڑھ کر "جرمی بینتھم اور "آسٹن" یاد آجاتے ہیں۔ جب ان کا انتقال ہوا تو لوگ ان کی نماز جنازہ پڑھنے سے رکتے تھے۔ ان کے چچازاد بھائی مولانا ناصر حسین صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ نے پڑھائی۔ بزرگ بڑے فلسفی بھی تھے اور ہربرٹ اسپنسر کے ماہر تھے۔ میں بھی ان کے قدموں سے لگا رہا اور یہ زمانہ میری عقل و دماغ کی صیقل کا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد میں نے ایک مختصر رسالہ "یادگار کرامت حسین مرحوم" کے نام سے لکھا۔ جس میں بعض باتیں سخت لکھ دیں اور میں بھی "لاادریت" کا خطاب پا گیا۔ اور شرمندہ نہ ہوا۔ شیعہ عموماً مجھ سے خفا ہو گئے۔ مگر میں آزاد خیالی پر فخر و مباہات ہی کیا کیا۔ اگر کھاتے پیتے گھر کا آدمی نہ ہوتا تو شاید دوسروں کے ڈر سے اپنے خیالات کا اشتہار نہ دیتا۔

میرے ایک دوست یکرنگ اور بڑے قابل آدمی شیخ ولایت علی قدوائی مرحوم تھے۔ ان کی صحبت میں یہ باتیں اور چمک اٹھیں۔ اور دوسرے پہلو سے بھی میرے اوپر ان مرحوم کا بہت اثر ہوا۔

شیعہ لوگوں کا رجحان یوپی ارسٹاکریسی کی طرف مائل ہے اور پھر میری تربیت بھی کالون تعلقدار اسکول (جواب

کالج ہے) میں ہوئی تھی جس سے اس قسم کے خیالات اور مضبوط ہو گئے تھے۔ ولایت علی مرحوم کی صحبت میں مجھ کو ڈیماکریسی کی خوبیاں معلوم ہونے لگیں۔ خیالات جو بچپن سے انگریز پرستی کی طرف راغب تھے ان میں فرق آنے لگا۔ لیکن جائداد سے محروم ہونے کا دھڑکا اور آرام کی زندگی بسر کرنے کے بعد تکلیف کا خوف، یہ چیزیں پالیٹکس کے میدان میں انگریزوں کے خلاف آنے سے روکتی رہیں۔ پھر بھی گورنمنٹ کے خوش آمدیوں میں میرا شمار کبھی نہیں ہوا۔ گو میرا مدعا صرف اپنی مذہبی ارتقاء کا بیان کرنا ہے۔ مگر ایک واقعہ عرض کرتا چلوں جس سے شاید میری افتادِ طبیعت کا پتہ چل سکے۔

ایک انگریز ڈپٹی کمشنر میرے بڑے دوست تھے۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا "میں تمہارا بہی خواہ ہوں۔ اور تمہارے لیے میں نے ایک کام تجویز کیا ہے۔ جس میں تم کو بڑے بڑے فائدے ہوں گے اور وہ یہ ہے کہ جو باتیں تم دوسروں کو کرتے سنو ان کی رپورٹ ہم کو دیا کرو۔" میں نے کہا: "دوستی کی آڑ لے کر اور باتوں باتوں میں آپ مجھ سے سب کچھ پوچھ سکتے ہیں۔ کیونکہ مجھ کو راز رکھنے کی حکمت ہی نہیں معلوم۔ لیکن اگر ارادتاً آپ کو اس قسم کی رپورٹیں دوں گا تو پھر میرا دل مجھ کو اس قدر بُرا کہے گا کہ میں شاید سو نہ سکوں۔ وہ مجھ سے مایوس ہوئے۔ اور دوسرے دن ہی ایک صاحب کو اسی خدمت کے لیے مامور کر دیا۔ ان کو ہزار روپئے کی معافی ملی۔ خان بہادر ہوئے اور دوسرے اعزاز بھی ہاتھ آئے۔ اس قصّہ سے شاید میرے پڑھنے والوں کو کچھ پتہ چل گیا ہو گا کہ مذہب کے مقابلہ میں کبھی دل میں کچھ اور منہ میں کچھ اور مجھ سے کبھی بن نہ پڑا تھا۔

دوسرے ذاکرین جو میرے قصبہ میں مجلس پڑھنے کے لیے آیا کئے وہ بھی مجھ کو اُسی حقارت کی نظر سے دیکھا کئے میرے قصبہ کے ایک صاحب جن سے مجھ سے کافی یگانگی اور خلوص تھا اور جو باوجود مراسم کے میرے مذہبی خیالات کو بُرا سمجھتے تھے ہنسی کے پیرائے میں ایک دن میرے عقائد پر اعتراض کرنے لگے کچھ تعزیہ داری کا ذکر تھا مجھ کو تاؤ آ گیا اور میں نے بھی سختی سے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا۔ اس وجہ سے اُن سے تو ملال ہو ہی گیا مگر اسی دن سے کم و بیش میرے عقائد دوسروں پر بھی کھل گئے۔

○

اسی زمانہ میں میری بی بی مرحومہ حج کو گئیں۔ دوسرے یا تیسرے دن میں اٹھ کھڑا ہوا اور بغیر کسی کو بتائے چلا گیا۔ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ رسول اللہ صلعم کی ذات بابرکات سے میرے دل کو ہمیشہ لگاؤ رہا۔ چنانچہ ایک قصّہ عرض کرتا ہوں۔

میں اپنے تشیع کے زمانے میں ایک مرتبہ محفل حال و قال میں قوالی سن رہا تھا قوالوں نے رباعی شروع کی ؎

صبا بحیت شوقم بہ آں جناب رساں — حدیث ذرۂ بیدل بہ آفتاب رساں
دراں مقام کہ آرام گاہ حضرت اوست — زمین بوس و سلام من خراب رساں

میرے اوپر عجیب طرح کا اثر ہوا۔ یعنی سر سے پاؤں تک رَو دوڑ گئی۔ اُس کو روکنے کی کوشش میں میرے جسم میں کپکپی پڑ گئی۔ دل کے اندر یہ خیال آیا کہ اب گھر نہ جاؤ۔ اسی طرف سے سیدھے اُٹھو اور مدینہ نکل چلو۔ طرفۃ العین میں جانے کا پروگرام تو بن نہیں سکتا تھا۔ لیکن اس خیال نے پوری طرح سے مجھ پر ایک لمحے کے لیے قبضہ کر لیا تھا۔ کون جانے کہ میرا نام اسی وقت درباریوں میں نہ لکھا گیا ہو۔ ع رحمتِ حق بہانہ می جوئد۔ زمانہ گذرتا گیا اور میری کفر و الحاد و عقیدت کی دیوانی ہانڈی دَم پر چڑھی رہی۔

جس زمانے کا یہ ذکر ہے اس زمانے میں میرا الحاد اگر عزت الکمال کے ذریعہ سے کبھی اتر آیا تھا تب بھی باقی ماندہ زیادہ مضبوط ہو گیا تھا۔ لوگوں نے مجھ سے پوچھا "تم بھی حج کو جاتے ہو"؟ میں نے کہا "میں کہا جاؤں گا"۔ مرحومہ کے جانے کے بعد رات کو یہ خیال ہوا "محمد علی اچھا موقع ہے"۔ دل میں بی بی کے دیکھنے کا بھی خیال تھا مگر اس کے ساتھ یہ خیال کہ ایسا مبارک موقع ہاتھ سے نکل جائیگا، روح میں اچھا خاصہ درجہ رکھتا تھا۔ دل نے کہا اگر آج نکل چلو تو خوب ہو۔ نہیں تو پھر مدینہ کی زیارت نصیب نہ ہو گی۔ میرے پڑھنے والو! جب میں مدینہ منورہ کی حاضری یا اپنی بی بی مرحومہ کا ذکر کرتا ہوں تو "بور" ہو جاتا ہوں، لوگ زبان حال سے کہتے ہیں "لو غضب ہو گیا"۔ مدینہ طیبہ کا کیا کہنا۔ مگر بیان کی کوئی حد بھی ہونی چاہیئے۔ بار بار وہی قصہ کہاں تک مزہ دے۔ بی بی کے ذکر پر کہتے ہیں "اے لو بڑھیا نہ معلوم کب مر چکی۔ مجبور صاحب نے دوسری شادی بھی کر لی مگر ہماری جان کا عذاب چلا جاتا ہے"۔ ہمدردوں کو کون سمجھائے کہ جوانی کا ساتھی بڑھاپے میں بھی دکھ دے جاتا ہے۔

میرے ناظرین اگر اس جگہ پر تھوڑا سا چھوڑ جائیں گے تو مجھے شکایت نہ ہو گی۔ بہرحال کچھ غیر مکمل کپڑے اور کچھ غیر مکمل زادِ سفر لیکر نکل تو کھڑا ہوا مگر دل میں کہتا تھا کہ محمد علی تم ملحد۔ بے ایمان۔ تم کو اس دربار میں بازیابی کیسے مل سکتی ہے۔ پہلی ٹھوکر تو یہ لگی کہ لکھنو پہنچ کر یہ پتہ چلا کہ بجائے نئے کپڑوں کے پرانے کپڑوں کی گٹھری اٹھا لایا ہوں۔ اور بجائے نئے پاجاموں کے بیاہ شادی کے دستر خوان کی پوٹ باندھ لایا ہوں۔ مگر میں ریل پر سوار ہو ہی گیا۔ جھانسی میں ریل چھوٹ گئی۔ میرے ہم وطن اور بچپن کے یار مولوی بدر الحسن صاحب وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ان کے ہاں ٹک گیا۔ دل نے کہا اس روک ٹوک کا مقابلہ تم کب کر سکتے ہو۔ مگر میں دوسرے دن بمبئی چل ہی دیا۔ وہاں بی بی سے ملاقات ہوئی۔ مسکرا کر کہنے لگیں "ہم کو رخصت کرنے چلے آئے"۔ میں نے کہا "ہم بھی چلیں گے"۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں "تم اور حج" میری ایک عزیزہ بھی جا رہی تھیں۔ وہ مجھ سے پردہ کرتی تھیں۔ کہنے لگیں "مجھے یقین نہیں جب تک جہاز چل نہ نکلے گا۔ میں تمہارے سامنے نہ آؤں گی۔

سب لوگ ٹکٹ خرید چکے تھے۔ اب ہم ٹکٹ لینے چلے۔ دفتر جا کر معلوم ہوا فرسٹ اور سیکنڈ کلاس میں کوئی جگہ باقی نہیں۔ بچپن کی عادت تھی۔ تھرڈ کلاس میں جانے پر نفس مردود کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا۔ اگلے جہاز کا انتظار کرنے میں "بڑھیا کے نکاح میں سو سو دھوکے"۔ نہ معلوم کیا کیا بدگمانیاں دل میں آتی تھیں۔ جیسے کوئی کان میں کہتا تھا "اب کھل گیا نا" آخر تم کو کیوں بلائیں کس بنا پر تم کو روضۂ مبارک دکھائیں۔ "کون ایسے گن ڈھنگ۔ کون ایسے جوبنا" کہ معشوق حقیقی تمہارا عاشق ہو جائے۔ گھونگھٹ الٹ کر تمہارا میٹھا منہ دیکھے۔ تم جس قابل ہو رہی ہو کے رہے گا۔ یہاں ایک ہفتہ میں تاج محل کی کاکٹیل اور فریج پل کے پرانے احباب روپیہ اڑا دینگے۔ بس حج ہو چکا۔ اتنے میں اسی جہاز کے وسیع دفتر میں ایک طرف سے آواز آئی "محمد علی کے تار کا جواب آیا؟" میں نے کان کھڑے کیے۔ معلوم ہوا کہ کوئی محمد علی ہیں رودولی کے انہوں نے اپنی بی بی کے لیے ایک فرسٹ کلاس ریزرو کرایا تھا۔ ان کو تار دیا گیا تھا کہ تمہارا ریزرو اسی وقت تک موجود ہے اطلاع دو کہ تمہاری بی بی جائیں گی یا نہیں۔

ہوا یہ تھا کہ میں نے ریزرویشن کے لیے لکھا تھا اور جواب بھی آیا تھا کہ روپیہ بھیج دو۔ مگر جو لوگ حج کرا چکے تھے انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ تاریخ روانگی بدل جائے یا اور کوئی آفت آئے۔ پہلے سے روپیہ کیوں بھیجو۔ جگہ وافر ہوتی ہے اور میری تحریر پر جو جگہ مقرر کر دی تھی وہ اللہ باقی رہی۔ جس کیبن میں میری بی بی جا رہی تھیں وہ دو برتھ کا تھا۔ اس پر یا کوئی عورت یا میں خود جا سکتا تھا۔

کارساز ما بہ فکر کار ما

فکر ما در کار ما آزار ما

مگر مجھ کو اپنے اعمال کی بنا پر ڈر بھی دھڑکا رہا کہ تم چلے بھی گئے تو راستہ میں مرتے کتنی دیر لگتی ہے۔ میری منطق یہ تھی کہ اللہ میاں کو کیا میرے ایسے آدمی کے لیے اگر مجھ سے مشورہ لیتے تو ایمانداری سے مجھ کو کہنا پڑتا۔ یا اللہ اس مردود کو ان پاک زمین پر قدم نہ رکھنے دے۔ لہٰذا میرے کوئی گلا نہیں کاٹا تھا لیکن اپنی حرکتوں سے ڈرا ہوا تھا۔ مگر اللہ میاں اور بندے میں جو فرق ہے آپ جانتے ہی ہیں۔ ہم بھی پہونچ گئے۔

جدہ پہونچ کر میں انگریزی کانسل سے ملا۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ آیا شیعوں پر کوئی ایسی سختی تو نہیں ہے کہ ان کو تقیہ کرنا پڑے۔ اس نے جواب دیا کہ سعودی لوگ حنفیوں سے زیادہ خفا ہیں۔ شیعوں کی زیادہ پروا نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کو جانتے ہیں کہ گئے گذرے ہیں۔ میں نے کانسل سے کہا کہ اگر مجھ کو معلوم ہو جائے کہ

بحیثیت شیعہ کے کہیں ایسی تکلیف اٹھاؤں گا جو برداشت نہ کر سکتا ہوں تو میرے خیال میں اس وقت جب آدمی اتفاقیہ آفت میں پھنس جائے تو تقیہ کر لے اور پھر اس مقام سے علاحدہ ہو جائے، کیونکہ روز روز تقیہ کرنا میرے نزدیک جائز نہیں۔ میں نے یہ بھی کہا تھا میں نے اس وجہ سے دریافت کیا تھا کہ اگر ایسا ڈر ہو تو عمرہ کر کے واپس آجاؤں۔ میں نے ضرور کہا تھا۔ لیکن اگر ایسی صورت ہوتی تو شاید میں برابر تقیہ کئے رہتا۔ گویا اس کا مثل سے میں اتنا جھوٹ بولا تھا کیونکہ اتنی دور جا کر اور پھر فوراً واپس آنا مجھ سے نہ ہو سکتا۔ تقیہ کی نسبت تب اور آج میں میرے خیالات میں بڑا اختلاف ہو گیا ہے۔ آج میری کچھ میں آتا ہے کہ تقیہ آدمی ہمیشہ کرتا ہے یہ کم و بیش فطری سی بات ہے۔ اسی فطرت یعنی حفاظت خود اختیاری کی بناء پر حضرت عمار بن یاسر کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے تقیہ کیا۔ اور رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ عمار کے ایمان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ قرآن شریف میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حال ہے۔ مگر وہ قرآن کے پہلے کا واقعہ ہے۔ اس لیے صرف نظیر کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ قرآن پاک میں یہ قانون موجود ہو۔ ورنہ نظیر بغیر قانون کے کیا کام آ سکتی ہے۔ قرآن شریف میں تقیہ کے بارے میں سورۂ آل عمران کے تیسرے رکوع میں ایک آیت[1] موجود ہے جس سے تقیہ کا حکم صریحی نکلتا ہے لیکن وہ صرف کفار کے مقابلہ میں ہے۔

آیا مسلمانوں کے مقابلہ تقیہ کیا جا سکتا ہے؟

یہ ذرا مشکل مسئلہ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حنفی مذہب میں قیاس سے کام لیا جاتا ہے۔ حضرات شیعہ قیاس پر ہنستے ہیں۔ مگر مجبوراً موقع بے موقع خود بھی کر جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو تقیہ مسلمانوں کے مقابلے میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کے احکام فطرت پر مبنی ہیں اور حفاظت خود اختیاری میں فطرت کافر اور مسلمانوں کا فرق نہیں کرتی۔ اس لیے وقت ضرورت مسلمانوں کے مقابلے میں بھی تقیہ کیا جا سکتا ہے۔ کسی کو تلوار سے مار دینا جائز نہیں ہے لیکن حفاظت خود اختیاری میں مار دینا جائز ہے۔ اسی طرح مسلمانوں سے بھی تقیہ کرنا فطرت کے موافق ہے۔ تقیہ کا مسئلہ اب بھی حل نہیں ہوا۔ اکثروں کا دعویٰ ہے کہ ائمہ نے بھی تقیہ کیا ہے۔ یہ بڑی ٹیڑھی بات ہے۔ غور کیجیے تو آخر وہ بھی

---

[1] لایتخذ المومنین الکٰفرین اولیاء من دون المومنین ۚ ومن یفعل ذالک فلیس من اللہ فی شئ الا ان تتقوا منھم تقٰۃ ؕ و یحذرکم اللہ نفسہ و الی اللہ المصیر۰

ترجمہ: مسلمانوں کو چاہیے کہ مسلمانوں کے سوا کافروں کو رفیق نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا اس سے اور اللہ سے کچھ سروکار نہیں لیکن کسی طرح ان سے بچا ہو تو خیر۔ اللہ تم کو اپنے جلال سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کے پاس جانا ہے۔

انسان تھے۔ پھر ان کو اپنے گروہ کی حفاظت بھی کرنی تھی۔ مسلمانوں کی تاریخ میں ایسے واقعات کی کمی نہیں رہی ہے۔ جہاں ایک فرقہ دوسرے فرقے کے خون کا پیاسا نہ رہا ہو۔ ایسی حالت میں میری سمجھ میں آتا ہے کہ ائمہ بھی تقیہ کرسکتے تھے۔ اب صرف ایک چھوٹی سی بات دیکھنی ہے۔ یعنی آیا مذہبی مسائل میں بھی تقیہ کرسکتے ہیں؟ میری ناچیز رائے میں مسائل میں ائمہ تقیہ نہیں کرسکتے۔ امام حسین علیہ السلام نے تو کیا نہیں، امام احمدؒ بن حنبل نے تو کیا نہیں اگر تقیہ واجب تھا تو ان حضرات نے کیوں نہیں کیا۔ یا کم از کم امام حسینؓ نے کیوں نہیں کیا۔ اس سے نتیجہ یہی نکلا کہ ہر چھوٹی بات پر اس مسئلہ سے فائدہ اٹھانا وہی منطقی کرسکتا ہے جو دین سے محبت کم رکھتا ہو اور حریف مخالف کے ہرانے کا زیادہ خیال رکھتا ہو یا خود غرضی کی بنا پر شرعی مسئلہ کو آڑ کا رہ بنانا چاہتا ہو۔ اس مسئلہ کو میں خود اس سے زیادہ نہیں سمجھ سکا ہوں، خدا مجھ پر رحم کرے۔

بہت سے حجاج کفایت اور آسانی کے خیال سے مدینہ منورہ کی حاضری کے لئے چلے گئے۔ ہم معلم صاحب کی دھوکہ بازی میں آکر مکۂ معظمہ چلے آئے اور عمرہ کیا۔ اس کے بعد مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ اور پھر واپس آکر حج کیا۔ میرے بیان کرنے میں واقعات آگے پیچھے ہوگئے ہیں۔ عمرہ اور حج کا بیان میں نے ساتھ ساتھ بیان کردیا ہے۔ اس کے بعد مدینہ کا حال لکھا ہے۔ جیسے آم کھانے میں جو آم سب سے مزے کا نکلتا ہے اس کو سب کے بعد کھانے کے لئے لوگ رکھ لیتے ہیں۔ مکۂ معظمہ جوں جوں قریب آتا جاتا ہے دل میں ایک کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ کتنی اس میں رعبِ خداوندی سے تھی اور کتنی سب لوگوں کو اس عالم میں دیکھ کر بہ تکلف مومنیت پیدا کرنے کی تھی یہ میں نہیں بیان کرسکتا۔ مگر اس میں کلام نہیں کہ زیادہ تر تصنع کی تھی۔ گویا میں بہ کوشش اپنے اوپر رعب خداوندی طاری کررہا تھا۔ حرم پاک میں پہونچ کر یہی حالت بہت بڑھ گئی۔ طواف کیا۔ حجرِ اسود کے بوسے دیئے۔ سعی کی۔ قصر کروایا اور احرام کھول ڈالا۔

بھائی منھو میرے قدیم خدمت گار اور دلی بہی خواہ۔ جوانی کے رازدار۔ بڑھاپے کے یار غمگسار نے حرم میں ہاتھ جوڑ کر مجھ سے کہا۔ "جو کچھ میں نے تمہارا کھایا پیا ہو وہ معاف کردو"۔ بس کچھ دستِ پاچہ سا ہو کر رہ گیا اپنے گناہوں کے خیال سے کانپ گیا۔ اور منھو کی فراست کا بھی قائل ہوگیا۔ میں نے کہا میں نے معاف کیا اور میرا خدا معاف کرے۔ اس گھڑی البتہ مجھ کو رعب خداوندی کا جو احساس ہوا وہ اب تک سب سے زیادہ تھا۔

چونکہ میری مرحومہ بی بی سنی تھیں اور چونکہ انہیں کے قدموں کی برکت سے مجھے حج نصیب ہوا تھا۔ اس لیے میں بھی سنی معلم کے یہاں ٹھہرا تھا۔ اور زیادہ تر طواف سنی ہی معلم کے ساتھ کرتا تھا۔ دونوں فرقوں کی کتابیں دیکھیں دونوں معلموں کے ساتھ طواف وغیرہ کیا۔ مجھ کو تو پتہ چلا کہ اگر زوائد جن کا نام مستحبات رکھا گیا ہے نکال ڈالے جائیں تو کچھ زیادہ فرق نہیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو اس راز سے واقف نہیں پایا۔ کیونکہ کوئی ہمارا ایسا

ذہن میں یقین حاجی ہونا کوئی دونوں سے واسطہ رکھتا تھا اب دوسرے دن سے دل اور دماغ کی تباہ کاری شروع ہوئی۔
"یار محمد علی! اللہ میاں تو لامکاں ہیں۔ اُن کا گھر کیسا اور اسی طرح توبہ توبہ معاذاللہ اجودھیا میں بھی سات چکر لگاتے ہیں۔" ان خیالات سے دل کانپ جاتا ہے اور اپنے جہنمی ہونے کا یقین بڑھتا جاتا ہے۔ اللہ میاں سے گڑگڑا گڑگڑا کر دعا مانگتا ہوں کہ میرے پروردگار مجھ کو سنبھال لے۔ میرے اوپر رحم فرما۔ مجھ کو شیطانی وسوسوں سے بچالے ؎

مرا دلیست بہ کفر آشنا کہ چندیں بار　　　بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

معلوم نہیں کہ میرا نام دفترِ اسلام سے خارج کر دیا گیا یا ارحم الرّحمین نے باقی رکھا۔ پھر دل میں خیال گذرا کہ کہیں حجرِ اسود کو بوسہ دینے کا تو یہ اثر نہ ہو۔ حجرِ اسود کے لیے یہ مشہور بھی ہے کہ آدمی کی اصلیت کو اوپر نکال لاتا ہے اور کھول دیتا ہے۔ حجرِ اسود تو خیر بڑی چیز ہے اس سے بہت کم درجہ کی چیزیں ہیں جو واقعی بُری ہیں۔ آدمی کی اصلیت کو کھول دیتی ہیں۔ دولت کو دیکھیے۔

بادہ نوشیدن و ہشیار نشستن سہل است
گر بدولت برسی مست نہ گردی مردی

اس سے بھی بُری چیز شراب ہے۔ کسی کو شراب پلا دیجیے۔ اصلیت معلوم ہو جائیگی۔ مَیں نے لوگوں کو ذرا سے سرور میں آیاتِ قرآنی کی تلاوت کرتے سُنا ہے۔ اور دیکھا ہے۔ میں نے شرابیوں کو صرف ذرا سی پی لینے میں خدا سے توبہ کرتے اور گناہ کے خیال سے روتے دیکھا ہے۔ زیادہ پینے والا تو اپنے آپے سے باہر ہو جاتا ہے اس کا ذکر نہیں۔ میں نے یہ حالتیں تھوڑی سی پی لینے میں دیکھی ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھا ہے کہ گھونٹ گلے سے اترا نہیں فحش کی بھرمار ہوگئی۔ غیبت کا طومار بندھ گیا۔ کسی کمینے کو برسرِ حکومت کر دیجیے پھر دیکھئے میرے خیال میں یہی حال میرا بھی ہوا۔ میری جتنی بُرائیاں تھیں عود کر آئیں۔ اگر شاید کہیں کوئی بڑی پُرانی اچھائی بھی رہی ہوگی تو وہ بھی اوپر آگئی ہوگی۔ مگر اتنا تو میرے تجربہ میں آیا ہے کہ شیعہ سُنّی سے میں ہمیشہ پریشان رہا۔ بہت سی باتوں کا منھ سے نکالنا کیسا دل میں سوچتے ڈرتا تھا۔ مگر حجرِ اسود کا بوسہ دینے کے بعد وہ کھلم کھلا کہنے لگا۔ اب حجرِ اسود کے بوسے کے بعد یہی اثر غیر مسلم پہ ہوگا کہ نہیں؟ از روئے نفسیات نہ ہو تو تعجب نہیں۔ مَیں خود اس مسئلہ کی گہرائیوں تک از روئے نفسیات پہنچ سکا نہ از روئے اعتقاد۔ میرے ساتھیوں میں سے ایسے بھی تھے جو اپنی بی بی سے کہہ اٹھتے تھے "تم ہی نے ہم کو اس آفت میں ڈالا ہے۔ اب یہاں سے ہماری لاش جائیگی۔" مجھ کو صرف موت کا دھڑکا رہتا تھا۔ ورنہ کوئی اور بات اس طرح پچھتانے کی اگر رہی بھی ہوگی تو بہت کم۔ نمازیں پڑھ کر دعائیں مانگ کر فرحت ہوتی تھی دل باغ باغ ہوتا تھا۔ دل میں نیکیاں آتی تھیں۔ انشراحِ قلب ہوتا تھا اور وہی آرزو بڑھتی جاتی تھی کہ مرنے کے پہلے مدینے کی زیارت ہو جائے۔

ایک دن کا قصہ سنیئے: میں جو حرم میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کعبہ شریف کا دروازہ کھلا ہے۔ بے اختیار رو پڑا مگر مجمع اس قدر تھا کہ لکڑی کی سیڑھی جو لگا دی گئی تھی اور جس کے ذریعہ لوگ بیت اللہ میں داخل ہوتے تھے اس پر نہ چڑھ سکا اور مایوس لوٹ آیا۔ پھر ایک دن اسی طرح کا اتفاق ہوا کہ دروازہ کھلا ہوا دیکھا۔ آج میں نے ارادہ کر لیا کہ چاہے جو کچھ ہو انشاء اللہ تعالیٰ اندر ضرور جاؤں گا۔ اور دیوانہ وار پہونچ ہی گیا۔ وہاں دیکھا کہ کلید بردار صاحب جن کا اسم شریف شیبی تھا دروازے کے پاس ایک صندوق سی چیز پر بیٹھے ہیں۔ اور ایک آدمی آ،بو زمزم لئے کھڑا ہے انہوں نے مجھ کو دیکھتے ہی نذر مانگی۔ میں نے ایک چاندی کا سکّہ تلے اوپر ہاتھ رکھ کر پیش کیا۔ انہوں نے فرمایا "دو" عموماً لوگ کچھ پیسے دیتے ہیں۔ میں نے جو خوشی میں روپیہ پیش کیا یقیناً وہ سمجھ گئے کہ یہ بیوقوف ہے۔ اس لیے دو مانگے میں نے دس کا نوٹ نکالا اور آٹھ روپے واپس مانگے۔ انہوں نے فرمایا روپیہ میرے پاس نہیں ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے ان کے آدمی کے پاس تھیلی میں کافی مال تھا۔ میں نے وہ نوٹ ان کے ہاتھ سے نکال لیا اور کہا کہ مطلوبہ رقم آپ کے دولت خانہ پر آکر دے جاؤں گا۔ یہ صاحب پہلی لڑائی میں بھاگ کر یا قید ہو کر ہندوستان آئے تھے اس لئے اردو سمجھتے تھے۔ بڑی عنایت سے فرمایا دو دو رکعتیں چاروں طرف پڑھو۔ میں نے پڑھیں۔ وہاں پہونچ کر ضرور میرے دل میں ایک حالت پیدا ہوئی۔ کچھ ناز، کچھ فخر، کچھ مباہات، کچھ یہ شکر کہ اللہ نے اپنے اس گنہگار بندے کو یہ مبارک دن دکھایا۔ رعب خداوندی کی کیفیت کم تھی۔ بجائے اس کے کچھ اس قسم کی کیفیت تھی جو غالبؔ نے بیان کی ہے

ہر اک قطرے میں ہے ساز انا البحر   ہم ان کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

چنانچہ "نازبر فلک و حکم بر ستارہ کنم"

منیٰ کی واپسی کے بعد مکہ معظمہ پہونچ کر طواف اور سعی کے علاوہ شیعوں کے یہاں ایک طواف نساء اور کرنا ہوتا ہے۔ یعنی آخری طواف کے بعد آدمی احرام سے باہر ہو جاتا ہے۔ مگر بی بی حلال نہیں ہوتی۔ جب تک طواف نساء نہ کر لیا جائے۔ گو بہت سی باتوں میں اختلاف تھا مگر تھا تو میں شیعہ ہی۔ اس لیے ایک شیعہ معلّم ڈھونڈ نکالا کہ طواف نساء مع تمام شرائط کے کر لوں تاکہ میری شریک زندگی پر کسی طرح کا حرف میرے شیعہ برادران کی طرف سے نہ آسکے۔ ان بزرگوں نے طواف کرایا۔ اس کے بعد سعی کی ٹھہری۔ اس میں ذرا لمبی دوڑ ہے اور معلّم صاحب ادھیڑ عمر کے کچھ موٹے تھے۔ وہ تو اکثر دیکھتے ہی تھے میں سنّی معلم کے ساتھ بھی طواف وغیرہ کیا کرتا ہوں۔ نماز بھی انہیں کی میں پڑھا کرتا ہوں۔ اس لیے کہنے لگے۔ "میں تمہاری نیّت ٹھیک کرائے دیتا ہوں۔ تم سعی سنّیوں کے ساتھ کر دو" مجھ کو اس میں کوئی ہرج نہ معلوم ہوا۔ اب جو وہ نیّت کروا رہے ہیں تو کیا سنتا ہوں کہ بجائے عربی کے صرف فارسی

سے مُرواد ہے اور کوئی فرق نہیں۔ میں نے ان سے کہا "شیخ صاحب۔ نیت ارادۂ دلی ہے جس کا اعادہ زبان سے نہ ہو۔ تب بھی کوئی حرج نہیں۔ نیت میں عربی میں کروں گا جو میرے پیغمبر کی زبان ہے۔ یا پھر اردو میں کروں گا۔ جو میری ماں کی زبان ہے۔ یہ فارسی میں کس رشتے سے کروں؟" بیچارے شرمندہ ہوئے اور کچھ نہ کہہ سکے۔ اس بات پر میری نظر بہت دنوں سے جایا کرتی تھی کہ شیعہ سنی کے اختلاف اسی طرح کے لاطائل ہوا کرتے ہیں۔ جہاں انگلی اتار یا عمامہ وکفش۔ یا پائجامہ ٹونٹی وار آگیا بس خدا کے واسطے کو شیعہ سنی لنگوٹ کس کے کھڑے ہوگئے۔ نماز روزہ نکاح وغیرہ میں کسی طرح کا فرق نہیں ہے۔ مگر جہاں ان حضرات علماء کا قدم درمیان میں آگیا۔ بس حالی مرحوم کی آواز کانوں میں گونج گئی ؎

مذہب کو توڑ ڈالا کافر بنا بنا کر　　اسلام مولویو ممنون ہے تمہارا

اب ہم لوگ بیت اللہ سے رخصت ہوئے اور دربار رسولؐ کی تیاری کی۔ مکہ معظمہ میں اپنے اوپر دو تین بار میں نے اچھا اثر محسوس کیا۔ جس دن پہلے حرم محترم میں نے دیکھا۔ جب خانہ کعبہ کے اندر داخل ہوا حجر اسود کے بوسہ دیئے کو جس کا اشارۃً پہلے بیان کرچکا ہوں۔

○

سعدیا عبث احرام طوف مردہ می بندی
روئے یار ما بنگر کعبۂ صفا این است

اختلاج کہیئے یا مراق یا اپنے گناہوں کا خیال۔ وہ دھڑکا کہ مجھے روضۂ مقدس رسول صلعم کی زیارت نہ ہوگی برابر قائم ہے۔ قریب شام شہر پہنچا۔ اب میں نے محسوس کیا کہ مجھے بخار ہے۔ یقین کامل ہوگیا کہ وہی بات جو دل میں شروع سے جاگزیں تھی پوری ہونے والی ہے یعنی بخار بڑھ جائے گا۔ اور میں زیارت سے محروم رہ جاؤں گا۔ جس مکان میں ٹھہرایا گیا تھا وہ حرم رسول اللہ سے قریب ہی تھا۔ بعد مغرب خیال آیا کہ ابھی بخار تو زیادہ نہیں ہے چلو اسی وقت زیارت کر آؤ۔ گو میں طاہر تھا اور نماز پڑھتا تھا مگر دل یہ چاہتا تھا کہ نہا دھو کر حاضر ہوں۔ دربار کے لیے ایک انگرکھا جامدانی کا مسلمان دھوبی کا دھویا ہوا گھر ہی سے لے کر چلا تھا۔ بس میں اسی بخار میں اُٹھا۔ اندر تو نہیں گیا مگر باب السلام سے روضۂ مبارک کا سامنا تھا۔ دروازے کے باہر ہی سے سلام کیا مختصر سی زیارت اپنے جی سے گڑھ کر پڑھی اور پھر گھر آگیا۔ وہ مارا اسے

عاشق زارمن بیا بردربارگاہ من　　　　حد توفیست این قبلے من بکرم نجوا لمنت

اس وقت تھوڑی دیر کے لئے بیماری اور موت سب بھول گیا۔ دوسرے دن گو حرارت تھی مگر حمام کر کے حرم میں حاضر ہو گیا۔ ع

"یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے"

زیارت پڑھی اور جُٹ گیا نماز پڑھنے پر۔ کتابوں میں کچھ طریقے اور کچھ قاعدے سنّت نمازوں کے اور کچھ نوافل کے دیکھے تھے۔ سفر میں اکثر وہ کتابیں دیکھتا گیا تھا مگر وہاں پہونچکر کیا قاعدہ اور کس کا طریقہ۔ دو دو رکعتیں اوٹنی شروع کر دیں، اسطوانۂ حرث پر۔ اسطوانۂ ابو البابا پر۔ اسطوانۂ حنّانہ پر ؎

بر زمینے کہ نشان کفِ پائے تو بود　　　　سالہا سجدۂ صاحبِ نظراں خواہد بود

اسطوانۂ عائشہؓ پر۔ روضۂ ریاض الجنہ۔ یہاں وہاں سب کہیں۔ ہر جگہ نمازیں پڑھنا شروع کر دیں۔ آج تک جب کبھی نماز پڑھی تھی تو رکعتیں ہی گنتا کیا تھا کہ اب ایک ختم ہوئی۔ اب دوسری ختم ہوئی۔ مگر حرم محترم میں پہونچ کر نمازیں پڑھنے میں لطف آ گیا۔ آپ سے وہ مزہ کیسے بیان کروں اگر آپ جانتے ہیں تو جانتے ہیں اور اگر نہیں جانتے تو کیسے سمجھاؤں، بس یہ سمجھ لیجئے کہ

پڑ گیا لوٹ میں سرکار کا مہماں ہو کر

ایک دن اسطوانۂ عائشہؓ پر نماز پڑھ رہا تھا۔ ہمارے جوار کے پڑھے لکھے مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی میرے قریب آئے اور مزاحاً کہنے لگے "آپ یہاں کیوں نماز پڑھ رہے ہیں؟" میں نے کہا "وہ جیسی کبھی رہی ہوں، جن کی چہیتی بی بی تھیں وہ پاس ہی تشریف رکھتے ہیں۔ میرے باپ کی بھی مجال ہے کہ اس مقام کی سعادت نہ حاصل کر دوں؟" یہ واقعہ انہوں نے بھی اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے۔ "مفہوم یہی ہے۔ گو سلیقہ سے لکھا ہے میں وہ لکھ رہا ہوں۔ جو مجھے یاد ہے۔ ایسی جذباتی باتیں ذرا بھولتی کم ہیں۔ اکثر حضرات عقیدت اور محبت کے جوش میں بعض واقعات جو ان کو مدینہ میں پیش آئے ہیں ان میں معجزات اور کرامات دیکھ لیتے ہیں۔ اگر میں چاہوں تو دو واقعے اس قسم کے بیان کر سکتا ہوں، مگر نہ ایسے واقعات پر میرے مذہب کا دارومدار ہے نہ خود وہ واقعات ایسے ہیں کہ فلسفی اور علم نفسیات کا ماہر ان کے دوسرے معنی نہ بیان کر سکے۔ میں تو اس چیز کے مزے لے رہا ہوں جو باوجود میری سیاہ کاری کے اور بد اعمالی کے مجھ کو نصیب ہوئی۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ ع

"یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے"

شیعوں کو جماعت کی نمازیں کم نصیب ہوتی ہیں۔ ہر جگہ پر امام نہیں ہوتے۔ اور نصیب بھی ہو گئیں تو کمیاب ہونے کی وجہ سے ان کا اہتمام کچھ ایسا ہو جاتا ہے جیسے عید کی سوتیاں، وہ روزوالی مساوات جس کو آدمی اپنا حق سمجھتا ہے وہ بات نہیں رہ جاتی۔ پیش نمازی کا مسئلہ شیعوں کے یہاں اتنی احتیاط کے ساتھ کہاں سے آ گیا۔ مجھ کو نہیں معلوم۔ دیکھا یہ جاتا ہے کہ جس کو مجتہد اجازت دے وہی نماز پڑھ سکتا ہے شرط شاید یہ ہے کہ جو گناہ کبیرہ نہ کرتا ہو اور گناہ صغیرہ پر اصرار نہ کرتا ہو وہ پڑھائے۔ یہ تو شیوہ ہر مسلمان کا ہونا چاہیئے۔ اور ہم کو بھی یہی رائے رکھنا چاہیئے۔ کہ یہ حضرات زیادہ تر ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔ لیکن مجتہد صاحب کو یہ اختیارات کہاں سے ملے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اسی وسیلہ میں تقلید کا مسئلہ بھی آ جاتا ہے۔

تقلید عالم کی کرنی چاہیئے۔ اگر کوئی شخص کسی عالم کا مقلد نہیں ہے تو اس کی عبادت ہی بیکار ہے (واضح ہو کہ یہ گنہگار بہت دن ہوئے تقلید چھوڑ چکا ہے) اس میں دقت یہ آن پڑتی ہے کہ خدا کی راہ ڈھونڈھنے سے بھی مشکل عالم کی تلاش ہو گئی۔ ہم تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ جس نے امام ابو یوسف[1] کی وردی پہن لی وہ پیش نماز ہو گیا۔ ترقی کی تو مجتہد ہو گیا اور اگر ان کے یہاں عاقبتی جوڑے زیادہ آنے لگے تو اعلم کہلایا۔ کیونکہ علاوہ علمی استعداد کے مرجع خلائق ہونا بھی تقدس کی ایک نشانی ہے۔ اور ایک حد تک بجا ہے۔ لیکن اعلم کا مسئلہ پھر بھی حل نہ ہو سکا۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ چند خاندان مخصوص ہو گئے ہیں جن میں ہمیشہ مجتہد اور پیش نماز ہوتے چلے آتے ہیں۔ میرے خیال میں تو تقلید کا مسئلہ پیری مریدی سے کم نہیں ہے۔ اکثر دل کو یہ گنہگار جانتا ہے کہ وہ نمازیں پڑھاتے ہیں مگر ویسے ہی وہ سب ہیں جن کے پاس اجازہ نہیں ہے۔ اسی لیے وہ نہیں پڑھا سکتے۔ اعلم کا مسئلہ تو ایسا ہے کہ جو اکثر پڑھے لکھے شیعوں کے دل میں کھٹکا کرتا ہے۔ مگر میں اس پر زیادہ لکھنا نہیں چاہتا۔ لیکن اس کا بڑا افسوس ہے کہ شیعہ اکثر جماعت کی نماز سے محروم رہ جاتے ہیں۔ میرا دل تو یہ چاہتا تھا کہ "ظن المومنین خیرا" پر عمل کر کے جس کا فسق و فجور نہ معلوم ہو اور جو ضروری مسائل سے واقف ہو اس کے پیچھے نماز پڑھ لی جائے۔ اس جگہ ایک قصہ جملہ معترضہ کی طرح عرض کر دوں۔

مغرب کی نماز میں ایک سنی دوست کے ساتھ پڑھنے لگا۔ انہوں نے تلاوت شروع کی۔ یاک نابدو یاک نستعین .... ولدوالین وغیرہ وغیرہ اولاالضالین کی مدو وسب غائب۔ میں نے نماز پھر سے پڑھ لی۔

اس بارے میں شیعوں کا مسئلہ جو مجھ کو بتایا گیا تھا۔ حسب ذیل ہے۔ نماز سنی امام کے پیچھے پڑھو۔

---

[1] واضح ہو کہ سیاہ عمامہ اور قبا علماء کے لیے حضرت امام ابو یوسف ہی نے تجویز کیا تھا۔ ملاحظہ ہو ابن خلکان وغیرہ

قرأت کی ضرورت نہیں ہے۔ رکوع و سجود۔ اور تمام ارکانِ نماز ساتھ ادا کرو بمگر نیت فرادہ کی کرو" میرا دل اس رویہ سے ہمیشہ کراہت کرتا رہا۔ اور جہاں تک یاد ہے میں نے حج کے پہلے بھی ہمیشہ نیت جماعت ہی کی۔ اکثر شیعہ پڑھے لکھوں سے بحث بھی کی مگر گُشتی ہمیشہ برابر چھوٹی۔ ممکن ہے وہ حضرات سمجھا گئے ہوں کہ میرا کندھا لگ گیا مگر میں اپنے چت ہونے کا قائل نہ ہوا۔

مطاف میں پھر یہ مسئلہ میرے دماغ میں زور و شور سے آیا تھا۔ میرے دل نے مجھ سے کہا۔ "اگر تمہاری فرادہ نیت کا حال دوسروں کو معلوم ہو جائے تو وہ تم کو گردن میں ہاتھ دیکر نکال دیں۔ جب تم سب ارکان تو ان کے ساتھ ادا کر رہے تو یہ فرادہ کی نیت دھوکہ بازی کے سوا اور کیا ٹھہری۔ اور پھر اللہ میاں کے گھر میں یہ حرکت" میں کانپ گیا اور وثوق سے امام کے پیچھے کی نیت کی۔ اور آج بھی کرتا ہوں۔ بیت اللہ میں اور نیز اس دربار میں بار بار خیال آتا تھا کہ ہر کام قاعدے کے موافق ہو جائے لہٰذا وہی خیال فرادہ نیت کا یہاں بھی دماغ میں آیا گیا۔ میں نے کہا "لاحول ولاقوۃ الا باللہ" اور اپنی اسی رائے پر قائم رہا۔ صرف فرق اتنا تھا کہ اگر وہاں جھوٹ خوف سے ترک ہوا تھا تو یہاں سچ نماز سے قائم رہا۔ ہم نے کہا ہم اصدق الصادقین کے اُمتی اور ہم دربار میں جھوٹ بولیں گے۔

جی تو چاہتا ہے ابھی اور لکھوں مگر ڈرتا ہوں۔ کوئی ایسی بات نہ عرض کرسکوں گا جو ضروری ہو۔ اس لیے نگاہ خراشی سے کیا فائدہ۔ وہاں چلتے وقت اتنا اور عرض کر آیا ہوں کہ آپ نے فرمایا کہ "زرومن زاورک" یعنی جو تمہاری زیارت کو آئے تم بھی اس کی زیارت کو جاؤ"۔ یارسول اللہ میں تو حاضر ہو چکا آپ ذری ہمارے مرتے دم خیال رکھیئے گا۔" اَللّٰھُمَّ صلی علیٰ مُحَمَّد وآلِ مُحَمَّد

جنت البقیع کی زیارت اکثر کی۔ قبورِ مطہرہ کی حالت دیکھ کر تکلیف ہوئی۔ ممکن ہے اس کی وجہ سے میرے دل میں کچھ وہابیوں کے خلاف سختی پیدا ہوگئی ہو۔ شاید کوئی حدیث ہے جس میں یمن کو روانہ کرتے وقت آنحضرت صلعم نے جناب امیر علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ کوئی اونچی قبر نہ دیکھنا مگر اس کو برابر کر دینا اور کوئی تصویر دیکھنا مگر اس کو مار ڈالنا اور اسی طرح کی کوئی تیسری چیز کے لئے حکم تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت ابراہیم فرزند اور جناب سیدہ صلوٰۃ اللہ علیہا بضعۃ الرسول اور دوسرے اہلبیت علیہم السلام کے مزار مطہرات کھد گئے۔

قرآن میں تاویلیں ہوں۔ بہتر فرقے پیدا ہو جائیں مگر اس حدیث کے سمجھنے میں رسول کی غلطی ثابت ہوگئی تھی سے

کس نیاموخت علم تیر از من
کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

○

ناظرین آپ کو خیال ہوگا کہ مجلس کا ذکر کرتے ہوئے میں نے حج کا قصہ چھیڑ دیا۔ اب پھر وہی مجلس کے ذکر کی طرف عود کرتا ہوں۔ یہ الٹ پھیر تقریر میں تبھ جائے مگر تحریر کے لیے زیادہ مناسب نہیں ہے۔ مگر چونکہ میں نے وہی باتیں کرنے والا طرز تحریر میں بھی اختیار کیا ہے۔ لہٰذا میری خاطر سے اس انداز کو برداشت کیجئے۔ اور ذہن میں وہی مجالس والا سلسلہ قائم کر لیجئے۔ یہاں تک تو اسباب کا تذکرہ تھا جن کی وجہ سے میرے خیالات بدلے آئندہ یہ ذکر ہے کہ کیونکر بدلے اور جب بدلے تو خیالات نے کیا صورت اختیار کی۔

شیعوں سے زیادہ کوئی فرقہ مسلمانوں میں اپنے مذہب سے آگاہ نہیں ہوتا ہے۔ کیوں کہ ان کے یہاں مجالس عزا کا سلسلہ تعلیم کا ایسا ذریعہ تھا جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بدقسمتی ہے کہ ذاکرین کمزور روایتیں پڑھتے رہتے ہیں۔ میرے بچپن میں تو یہ حال تھا کہ لوگ گڑھی روایتیں تک پڑھ جاتے تھے۔ خیر اب تو ایسا کم سنائی دیتا ہے مگر پھر بھی بعض ذاکرین کا رجحان اس طرف دکھائی دیتا ہے۔ اس زمانہ میں اگر غلط روایتیں پڑھی جاتی تھیں تو اب منطق کا ہیر پھیر۔ صغریٰ اور کبریٰ کا جھمیلا عقل کو چکرا دیتا ہے۔ مثال کے طور پر عرض ہے۔ آیت " بلغ ما انزل الیك "[۱] الخ کی تفسیر بیان کرتے وقت تمام ذاکرین بے دھڑک پڑھ جاتے ہیں کہ امام فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ یہ آیت جناب امیر علیہ السلام کی خلافت کے بارے میں آئی ہے۔ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس آیۃ کی دس شان نزول لکھی ہیں ان میں سے آخری یہ بھی ہے کسی ذاکر سے منہ پڑھا بلا دعوے کے سوا کوئی تفصیل نہیں۔

منطق کے مغالطوں کا کھیل ملاحظہ ہو کہ ذاکر صاحب اپنے زعم ناقص میں طے کیے ہوئے بیٹھے ہیں کہ کوئی ہم کو غلط ثابت نہیں کر سکتا۔ مگر اس پر بالکل نظر نہیں ہے کہ بغیر یہ فرمائے کہ تفسیر کبیر میں دس شان نزول ہیں اور ان میں خود ان کی بیان کی ہوئی شان نزول صرف ایک ہے۔ سامعین کو دھوکے میں ڈال رہے ہیں۔ ایک دوسری مثال دوسرے قسم کی ہے۔ احد کی لڑائی میں جن لوگوں کے پاؤں اٹھ گئے تھے ان میں حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ[۲] کا نام بھی

---

[۱] تفسیر درمنثور وسیوطی وکبیر ۱۲

[۲] ابن اثیر جزری۔ تاریخ کامل۔ بحوالہ تاریخ احمد صفحہ ۴۲۔ ۴۳

[۳] سورۂ آل عمران۔ ان الذین تولوا منکم یوم التقی الجمعان انما استزلهم الشیطن ببعض ما کسبوا و لقد عفا الله عنهم ان الله غفور حلیم ۱۵۵

دونوں جماعتوں کے مقابلے کے وقت جنہوں نے منہ پھیرا تھا ان کے گناہوں کی شامت سے شیطان نے بہکا دیا۔ اللہ نے ان کو معاف کر دیا۔ بیشک اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔

لیا جاتا ہے۔ بن ذاکر صاحب کو سنیئے پہاڑ پر جنگلی بکری کے بھاگنے کا ذکر فرماتے ہیں اور اس پر بالکل نظر نہیں ہے کہ جن لوگوں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے اُن کو خدائے تعالیٰ نے صریحی آیت بھیج کر معاف فرمایا ہے۔ منطق کے نزدیک بھی اس کا ذکر لاطائل ہے مگر سب سے بڑی خرابی اس ذکر میں یہ ہے کہ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ قرآن کے احکام اور منشا کی وقعت اور اس سے محبت کم ہے اور دوسروں کی برائی میں مزا زیادہ ہے۔ اتنا ضرور ماننا پڑے گا کہ باوجود معافی کی آیت کے بھاگنے والوں کی جگہ دل میں اس قدر نہیں ہو سکتی جتنی نہ بھاگنے والوں کی ہوگی مگر زیادہ سے زیادہ آدمی اس پر بحث کر لے۔ اعتراضات یا ہنسی اڑانے کا موقع حکم خدا کے بعد نہیں رہ جاتا۔

محرم کی مجلسیں شیعوں کے ہاتھ میں ایسا آلۂ کار تھیں کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کا ذکر نہیں۔ غیروں کا دل ہاتھ میں لیتے۔ امام حسین علیہ السلام کی کہانی اتنی بڑی قربانی کا ذکر اس طرح فرمایا جا رہا ہے کہ بجائے اغیار کے دل میں جگہ ہونے کے شیعوں سے بیگانگی اور شکایت دلوں میں جگہ کرتی جاتی ہے۔

مردوں کے آنسو جو بہت بڑی چیز ہیں ریوڑی کے دو دو نہیں بلکہ دس دس بیس بیس تک بک رہے ہیں۔ ایک بار میں علاج کی غرض سے لکھنؤ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ چاندنی رات تھی۔ میں قریب ہی ایک دوست کے یہاں جا رہا تھا، راستہ میں ایک مسجد پڑتی ہے اس کے صحن کی دیوار اس قدر چھوٹی ہے کہ سڑک کی پٹری پر کھڑے ہو کر آدمی کو اچھی طرح دیکھ سکتا ہے۔ مسجد کے صحن میں منبر رکھا ہوا تھا اور مجلس ہو رہی تھی میں بھی کھڑا ہو گیا۔ میں تو مجلس کرنے والا اور رونے والا مگر میرے اوپر ایک عجیب طرح کا اثر ہوا۔ اس اثر کو بیان کرنا مشکل ہے۔ جیسے آپ کا خوب پیٹ بھرا ہوا ہو اور آپ کسی دوسرے کھانے والے کے قریب سے گزر رہے ہوں تو وہی خوشبو جو تھوڑی پہلے بھلی لگتی تھی اس وقت بری لگے گی۔ وہی حال میرا ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک جملہ پر درود کے نعرے ہیں اور مسرت کا مظاہرہ ہے اور دوسرے ہی جملے پر نالے ہیں اور گریہ و بکا کا شور۔ تھوڑی دیر میں یہ دھوپ چھاؤں کئی بار ہوئی۔ اس دلی تکلیف کو ظاہر کرنے کے لیے میرے دل میں الفاظ نہیں آئے تھے کہ اتنے میں پاس ہی کھڑے ہوئے دو پنجابی سنیّوں میں سے ایک نے دوسرے سے کہا "لکھنؤ کو انہیں باتوں نے تباہ کیا ہے۔"

مظلومی کا لفظ جیسا اہلبیت نبیؐ پر عموماً اور کربلا والوں پر خصوصاً صادق آتا ہے۔ اس کی مثال کم ملے گی مگر اس لفظ کا استعمال کربلا کے واقعات پر اس قدر عام اور سستا کر دیا گیا ہے کہ جس کے بے موقع استعمال کی وجہ سے ہر شیعہ اور خصوصاً اودھ کا ہر چھوٹے سے چھوٹی مصیبت پر خود اپنے کو اس کا مصداق سمجھنے لگتا ہے۔ مختلف موقع پر شیعوں کے منہ سے یہ الفاظ سن کر افسوس ہوا ہے کہ "ہم مظلوم کے ماننے والے ہیں اور خود مظلوم تو ہیں ہی" ذرا غور کرنے کی بات ہے۔ کربلا کا ایسا ظلم کہاں ہوا ہوگا۔ مگر اس ایمانی ڈرامے کے افراد میں اور ہیرو (روحی لہ الفداء) میں کچھ اور

صفات بھی تو تھے۔ مومنین کو چاہیے تھا کہ ذری وہ صفات بھی اپنے میں پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ خالی مظلوم جاننے سے تو دنیاوی اور عقباوی معاملات میں زیادہ فائدہ مترتب ہوتے دکھائی نہیں دیتا۔ اس جگہ ایک قصہ عرض کر دوں۔ میرے ایک دوست زیارت کربلائے معلی کو مع عیال و ملازمین جا رہے تھے۔ کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ ان کے سب ساتھی کراچی ہی میں رہ گئے اور وہ تنہا چلے گئے۔ ان کو روانگی کا وقت نہیں معلوم تھا۔ وہ گئے تھے اپنی جگہوں کا معائنہ کرنے کہ جہاز چل پڑا ان کے پاس روپیہ تو تھا مگر اور کوئی چیز نہ تھی۔ بیچارے طہارت اور صوم صلوٰۃ کے بہت پابند تھے۔ بہت پریشان ہوئے۔ اس نیک سفر کے چلنے والوں کے دلوں میں بڑی نیکی ہوتی ہے۔ ہر شخص نے ہمدردی کی کسی نے جا، نماز عاریتاً دی۔ کسی نے لوٹا دیا۔ کسی نے کمبل دیا۔ بہتوں نے تسکین دی۔ جن صاحب نے لوٹا کمبل دیا تھا ان کے منھ سے نکل گیا "آپ محتاج ہیں آپ کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے" ہمارے دوست نے سب چیزیں اٹھا کر پھینک دیں اور کہا کہ محتاج تو وہ ہے جو تکلیف نہ اٹھا سکے۔ ہم تکلیف اٹھائیں گے مگر یہ چیزیں اب بغیر دام دیئے نہ لیں گے "تعز من تشاء بالقناعت وتذل من تشاء بالاحسان"

میری ناچیز رائے میں اس ادنیٰ ترین غلام سید الشہداء نے کچھ ایسا کام کیا کہ پتہ چلانے والے پتہ چلالیں کہ کس کا غلام تھا۔ بجائے اس کے صرف رونے میں تو تاسی کم دکھائی دیتی ہے۔ رونے کو مومنین ماتم مجلس کہتے ہیں۔ میرے زعم ناقص میں رونا ما آل ذاکر کہا جاتا تو بہتر تھا۔ میں رونے کا منکر نہیں ہوں۔ مگر جیسا کہ عرض کیا کہ یہ موتی اتنے سستے نہ بیچے جاتے تو اچھا ہوتا۔ مشہور ہے کہ جنگ احد کے بعد گھروں سے رونے کی آوازیں آتی تھیں اور رسول صلعم نے فرمایا کہ ہمارے چچا پر رونے والا کوئی نہیں۔ اس کے بعد اصحاب نے اپنی عورتوں کو بھیج دیا کہ وہ روئیں۔ یہ روایت[1] صحیح ہو یا غلط ہو لیکن اگر صحیح بھی ہو تو دو باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک تو یہ کہ رسول اللہ صلعم میں انسانی کمزوریاں بدرجۂ اتم موجود تھیں اور دوسرے یہ کہ وہ اسی وقت ہوا تھا ہمیشہ کی رسم نہیں قائم ہوئی تھی۔ بہرحال کربلا کے واقعات پر جس کا دل نہ ابھرے وہ اپنے دل میں یہ غور کرتا ہوگا۔

رونے سے دل کی سلیٹ صاف ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد جو نقش بیٹھے گا وہ روشن ہوگا۔ مگر یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ماتم اصل چیز سمجھی جائے اور ماتم مجلس صرف رونا ہی نہ سمجھا جائے ؎

غم سے عبرت کا ذوق حاصل ہے ۔۔۔ غم نہایت مجلّیٔ دل ہے

غم سے مطلب وہ غم جو داغ بنے ۔۔۔ نہ کہ جو رسم کا چراغ بنے

یہ دو شعر اکبر الہ آبادی مرحوم کے ہیں جو تصوف کی بڑی بلندی پر پہنچے ہوئے تھے۔ ایک شعر نجم صاحب اکبر آبادی کا بھی عرض کر دوں ؎

---

[1] ابن سعد نے طبقات میں ذکر کیا ہے

شربت کی طرح پیتا ہوں آبِ دمِ شمشیر   دنیا مری محنت کو تماشا نہ بنا دے

یہی تصنع کی ذہنیت مجھے بدقسمتی سے عزاداری کی ہر چیز میں دکھائی دیتی ہے برسہا برس غور کیا کیا کروں یہ طاقت اپنوں میں پائی نہیں کہ اصلاحیں کروں. نقارخانہ میں طوطی کی آواز کون سنے گا. نہ اتنا بڑا مقرر نہ اتنا بڑا منشی کہ کتابیں لکھوں. زبان یا قلم سے کچھ کہا بھی تو کسی نے اعتنا، نہ کی. بادشاہ کا نقارہ چوہے کی کھال سے کہاں منڈھا جا سکتا ہے. یہ بھی خیال آیا کہ ہر چیز اپنے پہلے مقصد سے اس قدر دور جا پڑی ہے کہ جب تک پوری عمارت ڈھا کر پھر سے نئے کوشش سود مند ہوتے دکھائی نہیں دیتی۔ ایک چھوٹا آدمی یہ کام کیسے کر سکتا ہے. دل نے کہا "تم اپنا کام کر جاؤ، اس کی فکر مت کرو کہ دوسرے کیا کر رہے ہیں ؎

"دنیا کی طوالت بیجد ہے خلقت کا تو لنبا قصّہ ہے
ہر شخص فقط یہ غور کرے اس کل میں مرا کیا حصّہ ہے"

اس کے بعد جو چیز کو میں کرنا چاہتا تھا کر گذرا. یعنی محرم مجلس جلوس. تعزیہ۔ مہندی اور محرم کے تمام مناسک چھوڑ دیئے۔ اس کے ساتھ محفلِ میلاد. مردہ اعزا کا فاتحہ. خاندان کے بزرگوں کی قبروں پر مزدوری دیگر قرآن خوانی سب ترک کر دی. ان تمام چیزوں میں بعض ایسی بھی تھیں کہ ان میں دوسروں کے ناز بھی اٹھانا پڑتے تھے. یہ بھی تکلیف دل کو رہتی تھی. اب چھوڑنے کے بعد اس سے بھی چھٹی ملی.

کتنا حصّہ میرے اس فعل میں ناز برداری کے ڈر سے نفس کا تھا اور کتنا واقعی پختہ خیالی کا. یہ دوسرے طے کریں میں نے اپنے دل کو بہت تولا. ناز برداری والا جزو موجود پایا مگر کم پایا. اور عقیدہ والا جز وبہت پایا اصل حقیقت خدا کو معلوم ہے. میں نے اپنے دل سے کہا "محمد علی تمہاری نیت نیک ہے اگر تم غلطی پر بھی ہو تو تمہاری نیت کی وجہ سے خدا تم کو انشاء اللہ معاف کر دیگا" "تم اپنے دل میں یہ سمجھتے ہو کہ لوگ امام حسینؑ علیہ السلام کی محنت اور قربانی کو روزی کا ٹھیکرا بنائے ہیں یا علاوہ خدائی رضا حاصل کرنے کے کسی دوسری غرض سے بھی کر رہے ہیں. اس لیے تم اس کو ترک کر رہے ہو لہٰذا تم سے نہ رسالتمابؐ ناراض ہوں گے نہ ان کے اہلبیت علیہم السّلام. تمہارے اس فعل کو تمہارے ہم چشم بُرا کہیں گے. لیکن شاید ہزاروں ہزاروں میں ایک آدمی ایسا بھی نکل آئے جو بجائے یکبارگی غصّہ کرنے کے یہ بھی سوچے کہ باوجود ادعائے محبت کے پھر بھی یہ کام اس کمبخت نے کیوں کیا. اور اس طرح سے شاید وہ بھی تمہارا ہم خیال ہو جائے یا کم سے کم اس پہلو سے غور تو کرے" یہ میرا معاملہ ہے جو میرا پیدا کرنے والا بہتر جانتا ہے. پھر بھی یہ کھٹک باقی رہ جاتی ہے کہ تم بذاتِ خود امام حسین علیہ السّلام کے احسان کا کیا بدلہ کر رہے ہو. میرا جواب یہ ہے کہ جو دوسرے کر رہے ہیں وہ احسان کا تشکر نہیں ہے اور میں سوائے اس کے کچھ نہیں کر سکتا کہ برادرانِ ملّت کو

اس غلطی سے آگاہ کر دوں"۔ یہ میری بدقسمتی ہے۔ شومیِ قسمت ہے کہ مجھ سے اظہارِ تشکر میں اور کچھ نہیں ہو سکتا خدا کا حکم۔ رسول کا حکم مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح امام حسین علیہ السلام کے احسانات پر اظہارِ تشکر بھی ہے جو مجھ سے نہیں ہو سکتا۔

خدا مجھ کو معاف کرے اور توفیق دے کہ کچھ مجھ سے نیکی ہو جائے مگر جس چیز کو میں غلط جانتا ہوں اس کو اس دلیل سے اختیار نہیں کر سکتا کہ چونکہ صحیح بات مجھ کو نہیں معلوم ہے۔ اس لیے میں غلط ہی کیا کروں گا۔ میرا خدا میری نیت سے واقف ہے۔ میری بداعمالیوں سے نواہی اور اوامر کی عدول حکمیوں سے واقف ہے وہ چاہے گا۔ مجھ پر رحم کرے گا، نہیں تو اس گنہگار کو کیفرِ دار کو پہونچائے گا۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا۔ میرے اس اقدام سے لوگوں کو خیال ہوا کہ شاید اس نے مذہب تبدیل کیا ہے۔ ایک دوست نے پوچھ بھی لیا کہ تم سنی ہو گئے ہو۔ میں نے جواب دیا کہ "اگر مجھے سنی ہی ہونا ہوتا تو شیعہ ہی کیوں نہ رہتا"۔ اکثر حضرات نے میرا مذہب دریافت کیا۔ اور جب میں نے کہا کہ اپنے کو مسلمان کہتا ہوں اور خدا مجھے مسلمانوں میں شمار کرے تو سننے والوں کو تسکین نہ ہوئی۔ عبرت کا مقام ہے۔ خدا کا بھیجا ہوا نام۔ رسول کا لایا ہوا نام "مسلمان" مجہول المعنی ہو گیا۔ جب تک شیعہ۔ سنی۔ وہابی کی ٹھیک نہ لگاؤ لوگوں کی سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کہنے والا مذہباً کیا ہے ؎

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

مجھ ناچیز کی سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ یہ افتراق بیجا جو رسولؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی اسلام پر پڑا۔ اس سے بڑی بدقسمتی مسلمانوں کی اور کوئی نہیں۔

ائمۂ اہلبیت علیہم السلام میں ایک بات وجہ رنج کی ہے۔ اکثر حضرات ان میں کے دنیاوی آرام سے کم و بیش محروم رہے۔ مگر ان میں کا ہر فرد صلوٰۃ اللہ علیہم وعلی جدہ وابیہ جس حال میں رہا ہمیشہ معلمِ دین ہی رہا۔ ہادیِ راہِ خدا ہی رہا۔ اور ان کی وقعت اپنے پرایوں کے دلوں پر سکہ جمائے رہی چاہے تختِ خلافت پر ہوں۔ چاہے کربلا کے میدان میں تڑپ رہے ہوں چاہے قید میں ہوں چاہے خانہ نشیں ہوں۔ چاہے حجرِ اسود کا بوسہ دینے جا رہے ہوں۔ ولی عہدی ہو کہ وزارت ہو۔ نظربندی ہو کہ آزادی ہو۔ یہاں تک کہ سن رشد کو بھی نہ پہونچے ہوں ہر شخص ان کو دیکھ کر کہہ دیتا تھا کہ "یہ تو عوام کے گروہ کا فرد نہیں"۔ اللہم صل علی محمد و آل محمد و بارک وسلم۔ کما صلیت و بارکت وسلمت علی ابراہیم وعلی آل ابراہیم۔ انک حمید مجید۔ برحمتک یا ارحم الراحمین،

ایشیا کی تاریخ سے لوگ واقف ہیں۔ دنیا کی تاریخ جانتے ہیں۔ کوئی مثال نہیں ملتی کہ تیرہ پشتوں تک کسی -

خاندان کے ایسے افراد ہوئے ہوں کہ باوجود زمانہ کی ناسازگاری کے اور باوجود مخالف کے ان کا وقار یگانے بیگانے، اپنے پرائے سب کے دلوں میں رہا ہوں۔

میرے یہ خیالات ائمہ معصومین علیہم کے لئے ہیں اور خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے بارے میں برخلاف شیعوں کے سب کو صاحبِ ایمان اور فدائے رسول صلعم و نیک نیت جانتا ہوں۔ جناب امیر علیہ السلام کو اس حیثیت سے کہ رسول اللہ علیہ وسلم کی گود کے پالے تھے اور شاگرد سعید تھے جن کے بارے میں رسول اللہ نے ایسی ایسی باتیں کہیں ہیں کہ کسی کے لیے نہیں فرمائیں۔ انہیں سب سے افضل جانتا ہوں مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صفات و فضائل کا بھی دل سے قائل ہوں۔ جو محبت کا درجہ حضرت ابوبکرؓ کو رسول اللہؐ سے حاصل تھا اور جو عقیدت کی یکسوئی حضرت خلیفۂ اول کو ذات پاک محمدی سے تھی اس کی مثال ذرا ملنا مشکل ہے۔ صلح حدیبیہ کے وقت ہر شخص پریشان تھا۔ حضرت عمر فاروق رضؓ پوچھتے تھے "کیا آپ نبی برحق نہیں ہیں رسول کے گود کے پالے حضرت علی کی کیا مجال تھی کہ اختلاف کرتے مگر انہوں نے بھی عرض کر ہی دیا کہ "رسول اللہ" کا لفظ صلحنامہ میں سے میں اپنے ہاتھ سے نہ کاٹوں گا۔ صرف یہی یارِ عتیق تھے جو پوری طرح ساتھ رہے اور بحیثیت ایک وفادار خادم کے یہی فرمایا کیے "میاں جو کچھ کہتے ہو وہی سچ ہے"۔ یہ جملہ کسی کتاب کا نہیں ہے، بلکہ خود میرے دل کا گڑھا ہوا ہے مگر مجھ کو اس میں کچھ ایسی وفاداری کی تصویر دکھائی دیتی ہے کہ بغیر کہے نہیں رہا گیا۔ ابھی ایک کتاب میں پڑھ رہا تھا کہ احد میں جب رسولؐ کی غلط شہادت کی خبر مشہور ہوگئی تو حضرت عمرؓ کے منہ سے یہ تقاضائے محبت نکل گیا اب کیا کریں گے لڑکر"۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا "اب کیا کریں جی کر"۔[1] جو شخص حضرت علیؑ سے یہ کہدے کہ اگر مجھ کو یہ[2] معلوم ہوتا کہ یا علی آپ کو اختلاف ہوگا تو میں خلافت قبول ہی نہ کرتا"۔ جو شخص یہ کہے کہ جب[3] تک سیدہ اس گھر میں موجود ہیں مجھ سے نہ ہوگا کہ علی سے زبردستی کر کے بیعت لوں، اس کی نیت پر کون حملہ کرسکتا ہے"۔

ایک بڑے سُنّی عالم متبحر کی بیٹی جو خود بھی پڑھی لکھی اور آزاد خیال خاتون ہیں اور تشیع کا ادعا نہیں کرتی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے قول پر کہنے لگیں "اگر ان کا واقعی خیال یہی تھا تو خلافت چھوڑ کیوں نہ دی۔ میں نے جواب دیا کہ انسان کی فطرت کچھ ایسی بنی ہے کہ ہر معاملے میں وہ یہی خیال کرتا ہے کہ جو کام درپیش ہے اس کو میں دوسرے سے اچھا کرلیتا اگر حضرت ابوبکرؓ کے دل میں بھی یہی خیال رہا ہو تو کیا تعجب ہے۔ علاوہ اس کے خلافت قبول کرنے کے بعد اور بیعت لینے کے

---

[1] تاریخ اسلام کامل جلد اول صفحہ ۸۵ مصنف عبدالقیوم ندوی ۱۲
[2] روضۃ الاحباب۔ بحوالہ تاریخ احمدی صفحہ ۱۱۳
[3] تاریخ اسمی المطالب شمس الدین بخاری۔ ابن قتیبہ۔ ماخوذ از تاریخ احمدی ۱۱۶

بعد انتظام کو پھر سے بے انتظام کرنا حکمت عملی، معاہدہ ہر چیز کے خلاف ہوتا۔ میرے جواب سے وہ خاتون چپ ہو گئیں۔

اس جگہ دل چاہتا ہے کہ وہ گفتگو بھی نقل کر دوں جو میرے اور میرے مرشد مولانا کرامت حسین صاحب اعلی اللہ مقامہ کے درمیان میں آئی۔ میں نے سوال کیا کہ خلافت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ فرمانے لگے: "میرے خیال میں رسول اللہ صلعم کا دلی منشا تو یہی تھا کہ میرے بعد علیؑ خلیفہ ہوں، مگر چونکہ کوئی صریحی حکم خداوندی اس بارے میں نہیں آیا تھا اس لیے انہوں نے کچھ نہیں کیا۔ اس کے بعد اپنی طرف سے کہنے لگے۔ میرے خیال میں تو اچھا ہی ہوا کیونکہ حضرت علی سے وہ سب کچھ نہ ہو سکتا جو ہوا۔" میرے خیال میں جب انہوں نے یہ کہا تھا تو وہ فتح ایران اور فتح مصر وغیرہ کا خیال کر رہے تھے۔ تاریخ اسلام اور فلسفہ مغربی کے عالم متبحر تھے۔ یہی باتیں مختلف پیرایوں مختلف مباحث کے سلسلے میں ان سے میں اکثر سن چکا تھا۔ اس لیے میرا اکلی یقین ہے کہ جب انہوں نے یہ کہا تھا تو دوسری تیسری اور چوتھی خلافتیں ان کے ذہن میں تھیں۔ میری ناچیز رائے میں خود جناب امیر علیہ السلام نے بھی کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ رسول اللہ صلعم ان کو اپنا خلیفہ بنا چکے ہیں۔

حضرت عثمانؓ کے خلیفہ منتخب ہوتے وقت انہوں نے جو دلائل اپنے لیے پیش فرمائے تھے اس کے اوپر حضرات شیعہ بھی اس تیرہ سو برس سے اوپر کچھ اضافہ نہ کر سکے۔ مگر ان میں بھی کہیں یہ نہیں ہے کہ رسول اللہ نے ان کو اپنی حیات ہی میں خلیفہ بنا دیا تھا۔ جو دلائل حضرت علیؑ نے اپنے استحقاق انتخاب پر دیئے تھے حسب ذیل ہیں:۔

(۱) سابق الایمان (۲) یا علی انت بمنزلۃ ہارون من موسیٰ (۳) مدینۃ العلم (۴) قرابت قریبہ (۵) سورۃ برأت لیکر مکہ جانا (۶) ہر موقع پر رفاقت (۷) مواخات (۸) کسی کو میرے اوپر کبھی امیر بنا کر لڑائی میں نہیں بھیجا (۹) من کنت مولا فہذا علی مولا (۱۰) دعوت عشیرہ۔

(۱۱) ان سب سے بڑھ کر آیت مباہلہ[1] ہے جہاں "انفسنا و انفسکم" آیا ہے۔ ان سب دلائل میں کہیں بھی نہیں ہے کہ آنحضرت صلعم اپنی زندگی ہی میں جناب امیرؑ کو خلافت عطا کر چکے تھے۔ دعوت عشیرہ سب سے زیادہ مضبوط دلیل ہے لیکن بائیس تئیس سال میں پھر اس واقعہ کی تصریح نہیں فرمائی گئی اور باوجود دعوت عشیرہ والی روایت کے بھی جناب امیر علیہ السلام نے کبھی نہیں فرمایا کہ ہم کو آنحضرت صلعم خلیفہ بنا چکے ہیں۔ رہا اخلاقی ثبوت وہ تو ہر جگہ شرح و بسط سے موجود ہے۔ سوائے اس کے کوئی راستہ نہ تھا کہ امت کا حق انتخاب باقی رکھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے صفات میرے دماغ میں حسب ذیل ہیں۔ ایمان کی

---

[1] فمن حاجك فيه من بعد ما جاءك من العلم فقل تعالوا ندع ابناءنا وابناءكم ونساءنا ونساءكم وانفسنا وانفسكم ثم نبتهل فنجعل لعنة الله على الكذبين ۝ (سورۂ آل عمران)

مضبوطی۔ ارادہ کا استقلال۔ خود اپنے نفس سے بے پروائی![1] دولت سے استغنیٰ۔ مساوات کے اصول پر اٹل رہنا۔ اسلام سے محبت۔ جس دن حضرت عمرؓ اسلام لائے اس دن سے کھُلم کھُلا مکہ میں اسلام برتا جانے لگا۔ جتنے خدمات' اسلام کے فتوحات وغیرہ کے پہلو سے حضرت عمرؓ کے ہیں اور کسی کے نہیں۔ یروشلم کی فتح کے بعد فاتح کا شہر کے اندر اس طرح سے داخل ہونا کہ غلام سوار ہوا اور خلیفہ پیدل ہو مساوات کی بہترین مثال ہے لیکن حضرات! وہ یارِ عتیق والی بات نہیں تھی۔ گو حضرت ابوبکرؓ بھی زیادہ سن میں مسلمان ہوئے مگر ان کی خصوصیتوں کا کیا کہنا۔

حضرت عمرؓ کے دل پر عرب کی قدیم نسلی حکومت کا بہت گہرا اثر تھا اور جس کی تطبیق وہ اسلامی اصول سے ہمیشہ کیا کئے۔ عرب میں قحطان' عدنان اور حضرت اسمٰعیلؑ کے وقت سے جمہوری طرز حکومت چلا آتا تھا۔ یہ لوگ اس پر فخر کرتے تھے کہ ہمارے اشعار ہمارے قوانین ہیں یعنی جو شعر جمہور کو پسند آگیا وہی ہمارا قانون ہو گیا۔ اور ہماری پگڑیاں ہمارے تاج ہیں۔ یعنی ہمارے ملک میں بادشاہ نہیں ہو سکتا۔ خدا کا کرنا ایسا کہ اسی ملک میں ایسا انسان فوق الانسان پیدا کر دیا گیا جس نے نہ صرف جسموں پر بلکہ دلوں پر بھی حکومت کی۔ اور اس کے سامنے سبھی نے خوشی سے سر جھکائے مگر جن لوگوں کو قرب رسالت نصیب ہوا تھا ان میں گو نورِ ایمان کی روشنی جاہلیت کے اندھیرے کو دور کئے ہوئے تھی مگر شعور باطنی تو اسلامی مساوات کی تطبیق قدیم مساوات سے کیا ہی کرتا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ کسی خاندان کی دوامی حکومت عرب کو فطرتاً ناگوار تھی۔ باغ فدک جو حضرت ابوبکر صدیقؓ جناب سیدہ صلوات اللہ علیہا کو دے رہے تھے مگر حضرت عمرؓ نے روک دیا۔ خود اپنے بیٹے کو باوجود اہل ہونے کے خلیفہ نہ مقرر کرنا۔ اپنے ایک بیٹے پر حد جاری کرنا۔ یہ سب اسی نسلی حکومت کے ذیل میں آتا ہے۔ حضرت علیؑ سے بیعت لئے جانے پر اصرار اور حضرت ابوبکرؓ کا رکنا۔ یہ سب میرے خیال کی تائید کرتے ہیں اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ انسان ہی تھے معصوم تو تھے نہیں۔ پھر باوجود اچھے آدمی ہونے کے طبائع کا اختلاف اپنا اثر دکھاتا ہی رہتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جو کیا وہ انہیں کی افتاد طبیعت کا نتیجہ تھا۔ امام حسن علیہ السلام نے جو کیا وہ وہی کر سکتے تھے۔ امام علیہ السلام نے جو کربلا میں کر دکھایا وہ انہیں کا حصہ تھا۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کو بھی سمجھ لیجئے کہ ان کے دل میں جتنی ملک کی محبت' رسول کی محبت' اسلام کی محبت ہر چیز اسی طرح ہونے کا آئی۔ جیسی افتاد طبیعت تھی۔

ع[1] تاریخ احمدی صفحہ ۱۱۰ برہان الدین حلبی نے سیر الحلبی بحوالہ کلام سید ابن جوزی سے نقل کیا ہے۔

O

اپنے خیالات کی تائید میں ایک بات اور عرض کر دوں۔ اس کے بعد آگے چلوں۔ وہ ابن عباس والی روایت جو ہر جگہ موجود ہے یعنی "حدیث قرطاس" وہ دل میں ایسی کھٹکتی ہے کہ میرے مخالف خیالات موافق نہیں ہونے پاتے۔ مولانا شبلی مرحوم نے زیادہ تر اس واقعہ کی تردید کرنی چاہی ہے مگر تیرہ سو برس کے بعد عقلاً تردید کرنا جبکہ فرقِ اسلام کا مدار نقل کے اوپر ہو کچھ لگتی ہوئی بات نہیں۔ طبرانی میں یہ روایت حضرت عمرؓ سے مسلم میں، بخاری میں۔ مسند احمد بن حنبل میں۔ شرح شفائی قاضی عیاض میں جس کو شہاب الدین خفاجی نے لکھا ہے۔ علامہ شہرستانی کی ملل النحل میں جن تحقیقات سے ان حضرات نے لکھا ہے وہ شاید علامہ شبلی کی تحقیقات سے کم نہ رہی ہوں گی۔ زمانہ کی قربت کی وجہ سے ان لوگوں کو شاید کچھ آسانیاں بھی شبلی مرحوم سے زیادہ رہی ہوں گی۔ مولانا شبلی نے اس روایت پہ نظر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "حضرت عبداللہ ابن عباس کی عمر اس وقت تیرہ چودہ برس کی تھی۔ یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباس اس جگہ موجود نہ تھے۔ اور یہ معلوم نہیں کہ یہ واقعہ انہوں نے کس سے سنا تھا۔" پھر حاشیہ پہ ارشاد ہوتا ہے کہ "بخاری میں جو حدیث مذکور ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اس واقعہ میں موجود تھے۔ اس لیے محدثین نے اس پہ بحث کی ہے۔ اور یہ دلائل قطعیہ ثابت کیا ہے کہ وہ موجود نہ تھے۔" اس کے بعد فرماتے ہیں کہ لوگوں نے درایت سے کام نہیں لیا، خود درایت سے کام لیتے اور کہتے ہیں: "گو صرف صحیح بخاری میں سات طریقوں سے مذکور ہے بایں ہمہ بجز عبداللہ ابن عباس کے اور کسی صحابی سے اس واقعہ کے متعلق ایک حرف بھی منقول نہیں ہے۔" میں عرض کرتا ہوں کہ یہی غنیمت ہے کہ عبداللہ ابن عباس ہی سے منقول ہے۔

رسول اللہ کی آنکھ بند ہوتے ہی جس پارٹی کی حکومت جس کا اثر اور جن حضرات کا اختیار ہوا ان میں سے اگر کسی اور صحابی نے نہیں لکھا تو کیا تعجب ہے۔ آیا میں دریافت کرسکتا ہوں کہ کسی صحابی نے اتنے بڑے اہم واقعہ کی۔ اتنی بڑی تہمت کی تردید بھی کی؟ کہ حضرت عبداللہ ابن عباس نے غلط کہا ہے۔ میں اصول درایت سے واقف نہیں ہوں۔ لیکن معمولی عقل رکھتا ہوں۔ اتنے بڑے الزام کی تردید نہ ہونا اور خصوصاً اس وقت میں جبکہ خود اسی پارٹی کی حکومت ہو۔ اتنے بڑے فرد پہ اتنا بڑا اعتراض عائد کیا جائے۔ اور وہ نظر انداز کر دیا جائے۔ کہاں تک عرض کروں۔ مولانا شبلی نے بھی آخر میں لکھ دیا "لیکن مشکل یہ ہے کہ صحیح بخاری وغیرہ میں اس قسم کی تصریحات موجود ہیں جو ہمارے اس قیاس سے مطابق نہیں ہوسکتیں" میں تو کہوں گا کہ مولانا شبلی مرحوم نے اس بات میں ذری دیر کر دی۔ اس لیے دل چاہتا ہے کہ مولانا کے بارے میں کچھ عرض کروں۔

شبلی مرحوم کی تصانیف دو حصوں تقسیم کی جاسکتی ہیں۔ ایک وہ جو مولانا کے سفرِ مصر و شام وغیرہ کے پہلے

لکھی گئیں، جیسے "المامون" وغیرہ جسمیں ہر مسئلہ کے دونوں پہلوؤں پر نظر کی گئی ہے۔ اور دوسری وہ جو بعد کو شائع ہوئی۔ سیاحت کے پہلے شبلی نعمانی صاحب ویسے ہی مولوی تھے جیسے ہوا کرتے تھے۔ اس سفر نے مولانا کی آنکھیں کھول دیں۔ ابن خلدون نے تاریخ کا مقدمہ لکھ کر یورپ بھر کو تاریخ کی تعلیم دی تھی۔ ابن خلدون کی کتابیں تو ہر دن ہر مولوی پڑھتا تھا مگر اس فلسفہ کو یورپ نے ہم سے پہلے اختیار کیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کی تاریخ ملک کی تاریخ نہ رہی بلکہ اس پارٹی کی تاریخ ہو گئی جس پارٹی کے ممبر نے وہ تاریخ لکھی ہو۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے ایچ۔ جی۔ ویلس نے دنیا کی تاریخ لکھی ہے جو صرف سوشلسٹ کی عینک سے دیکھی جاسکتی ہے۔ بہت دن ہوئے میکالے نے انگلستان کی تاریخ لکھی تھی جو خود ان کے زمانہ میں "وگ سالہ" کے نام سے طنزیہ مشہور ہوئی تھی۔ ابھی جواہر لال نہرو نے ڈسکوری آف انڈیا لکھی ہے جس نے قدیم ہندوستانی تہذیب کو ان صفات سے آراستہ کیا ہے جو آج بھی ڈھونڈے نہیں ملتے۔ سمجھانے کے لیے عرض کر دوں۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے ایک مرثیہ جوش ملیح آبادی نے لکھا ہے۔ امام حسین علیہ السلام کی قربانی وہی۔ حق پرستی وہی۔ آن بان وہی۔ ہر چیز وہی۔ مگر روس کی سوویت کو امام حسین علیہ السلام کے کارنامے بیان کر کے اور قوی کر دیا ہے۔ وراثت کا کمال یہی ہے۔ جس کے موجد ابن خلدون تھے۔ خود اللہ بخشے ابن خلدون جیسے تھے وہ ان کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوگا۔ جعل انہوں نے بنایا۔ اغلام کی تہمت ان کو لگی۔ خود غرضی۔ بے وفائی۔ نمک حرامی۔ ابن الوقتی تعصب۔ سلامتی سے بھی باتوں کا ذکر سوانح حیات[1] میں موجود ہے۔ دو برس جیل خانہ کو بھی جلوہ خانہ بنایا۔ گو آدمی کی تصانیف اور آدمی کے افعال دو علاحدہ علاحدہ چیزیں ہیں مگر پھر بھی برتن سے وہی رسے گا جو اس میں ہوگا۔ ان کے تقریباً سو برس بعد اٹلی میں میکاولی ہوئے۔ جن کا نام تاریخ سیاست میں آج تک موجود ہی نہیں بلکہ جو آدمی پولیٹکل چالوں سے آراستہ ہوتا ہے اس کو لوگ آج بھی میکاولی کہتے ہیں۔ اس کے صرف دو اقوال "مشتے نمونہ از خروارے" عرض کرتا ہوں "آدمی کو زبان اس لیے دی گئی ہے کہ اپنے راز کو چھپائے نہ یہ کہ ظاہر کرے"۔ بادشاہ کو جو قید کرے اور مار نہ ڈالے وہ خود واجب القتل ہے[2]"۔ مورخین ان کا موازنہ ابن خلدون سے کرتے ہیں اور ہر جگہ الفضل للمتقدم کے قائل ہیں۔

مولانا شبلی مرحوم انگریزی تو جانتے نہ تھے۔ جب انہوں نے فلسفہ تاریخ ابن خلدون قسطنطنیہ اور مصر وغیرہ

---

[1] ملاحظہ ہو ابن خلدون مرتبہ ایم۔ اے۔ انیان۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر صیغہ مطابع وزارت داخلہ۔ قاہرہ اول بکچرار صیغہ ادب۔ فواد یونیورسٹی مصر۔ صفحہ ۲۹۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۱۰۹ وغیرہ نیز انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔

[2] میکاولی کی کتاب "دی پرنس"

میں علاج برتے جاتے دیکھا تو ان کی آنکھیں کھل گئیں اور اسی رنگ میں رنگ گئے۔ اس کے پہلے سر سید مرحوم نے قرآن پاک کی تفسیر بالرائے کرنے میں بھی یہی کیا تھا۔ مگر مولانا شبلی نے جس پابندی اور خوبصورتی سے اس کو برتا وہ انہیں کا حصہ تھا۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیرہ سو برس بعد حدیث قرطاس غلط ہوگئی۔ اور حضرت علیؑ شراب پی کر نماز میں کچھ کا کچھ پڑھ گئے۔ گو پہلے کبھی یہ ہو چکا تھا کہ حضرت علیؑ نے ریشمی یا مخطط کرتا پہن لیا تھا اور ایک لڑائی میں کفار کو جلا دیا تھا۔ مگر پہلے یہ باتیں اس فلسفیانہ انداز میں کم تھیں۔ ہمارے بچپن میں ہر موقع پہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نام آتا تھا تب حضرت عمرؓ کا۔ تب سے مولانا شبلی حضرت آئے لوگ ہر معاملے میں پہلے حضرت عمرؓ ہی کا نام لیتے ہیں۔ اس کے بعد جب دل کے اندر کوئی بُرا ایسا کہنے لگتا ہے تو حضرت ابوبکر صدیق کا نام بھی آجاتا ہے۔ اس کے بعد درجہ بدرجہ سب خلفاء رضوان اللہ علیہم کا۔ اب مولوی شبلی اور ابن خلدون کی برکت سے ہر جگہ ہر بات میں حضرت عمرؓ ہی کا نام پہلے آتا ہے۔ واقعی حضرت خلیفۂ ثانی کے کارنامے ایسے ہیں۔ مولانا شبلی کے سفر کے پہلے کی کتابیں جیسے المامون اور بعد کی کتابیں جیسے الفاروق پڑھ کر ان کے فرق کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ممکن ہے میرے خیال کی غلطی یا صحت کا حال معلوم ہوجائے۔ مولانا نے سیرۃ میں "وانذر عشیرتک الاقربین" کے ذکر میں جس خوبصورتی کے ساتھ اختصار سے کام لیا ہے وہ قابل غور ہے ممکن ہے قابل تاسف بھی ہو۔ اسلام کی تاریخ میں روایتوں کا توڑ کبھی نہیں رہا۔ جس طرح کی خبر چاہیں مہیا کرلیں۔ بقول اکبر الٰہ آبادی مرحوم سے

"مرے قرآن پڑھنے سے نہ ہوں یوں بدگماں حضرت
مجھے تفسیر بھی آتی ہے اپنا مدعا کہیے"

جس مزاج کا لکھنے والا ہو اسی طرح کا مواد موجود ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ حضرت علیؑ کی شراب پینے والی روایت سیدھی سیدھی لکھ دی گئی۔ اور حدیث قرطاس جس کو سب نے لکھا ہے اس میں تمام اصول درایت پیش ہوگئے۔ راقم ایک کم علم آدمی ہے اور مولانا شبلی پر تنقید کر رہا ہے مگر شرط انصاف یہ ہے کہ خالی اس دلیل پر میری بات رد نہ کر دی جائے۔ خود الفاروق کے دیباچہ میں مولانا نے جن جن باتوں کی رد کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اصول درایت کی توضیح کے سلسلے میں جن تفصیلات کا ذکر کیا ہے جو تاریخ میں در آئے ہیں اور جن کو درست کرنا یا سدھارنا راوی کا فرض بتایا گیا ہے اس کو ناظرین صرف یہی نہیں کہ عبارت ہی پڑھ لیں بلکہ بین السطور جہاں معنی لکھے ہوتے ہیں ان پر بھی غور کریں اور یہ دیکھیں کہ مولانا نے کن باتوں کے رد کرنے کا تہیہ کیا ہے تو تعجب کیا ہے کہ میرا خیال بجا اور حق بجانب معلوم ہو۔

میرے پڑھنے والے کہتے ہوں گے کہ لکھنے والا تشیع کی تعصبیت سے کچھ لکھ رہا ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ میری تربیت شیعہ ہونے کی ہے مگر میری آرزو ہمیشہ یہ رہی۔ بجائے شیعہ سنی ہونے کے مجھ کو خدا توفیق دیتا کہ میں مسلمان ہوتا۔

میں حضرت عمرؓ کا بڑا معترف ہوں، گو حضرت ابوبکر صدیقؓ کا زیادہ معترف ہوں۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں صرف دو باتیں ایسی ہیں جو میرے دل میں کھٹکا کرتی ہیں۔ ایک تو وہی جو میں عرض کر چکا ہوں یعنی خلیفۂ ثانی کو اہلبیت اور بنی ہاشم سے ایک طرح کی کد تھی۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان حضرات میں مذہب کے معاملات میں تعاون نہ تھا۔ لیکن میرا عقیدہ ضرور ہے کہ حضرت عمرؓ ان حضرات کے صاحب اختیار ہونے کے خلاف ضرور تھے۔ دوسری بات یہ کھٹکتی ہے کہ اگر آنحضرت صلعم دس بارہ برس اور جی جاتے، آیا تب بھی اسی قدر فتوحات ہوتیں؟ اتنی فتوحات اور اسلام کی اتنی ترقی جو حضرت خلیفۂ ثانی کے عہد میں ہوئی شاید ہی کسی تاریخ میں اس کی مثال ملتی ہو۔ مگر سوال یہ ہے کہ آیا یہ سب فتوحات ہمیشہ دفاع کی صورت میں حاصل کی گئیں؟ میں تاریخ سے زیادہ واقف نہیں ہوں لیکن یہ جانتا ہوں کہ جب دوسری قومیں بانیٔ اسلام پر اعتراض کرتی ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا تو یہی جواب دیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ دفاع کی لڑائیاں لڑے۔ جب نہاوند کی عظیم الشان مہم کے لیے مجلس شوریٰ کا عام اجلاس ہوا تو حضرت عمرؓ نے کہا "اگر آپ لوگ ہماری مدد نہ کریں گے تو کون کرے گا؟" حضرت ابوہریرہؓ نے کہا "ہم آپ کو مدد دیں گے۔" مگر حضرت ابوعبیدہؓ نے کہا "اے عمر! تم رسول کے اصحاب کو دنیا میں آلودہ کرنا چاہتے ہو؟" اور حضرت عمرؓ نے صرف یہ جواب دیا۔ "میں ان بزرگوں سے نہ مدد لوں تو کس سے لوں؟"[1]

ہم شیعہ تربیت کے آدمی آرام کرسی پر بیٹھے جسارت کی باتیں منہ سے نکال رہے ہیں جس پر پڑے وہی جانے۔ اگر بفرض محال ہم صحیح بھی ہوں تو تمام فتوحات میں صرف خطاء اجتہادی ہی ٹھہرے گی۔ اللہ مجھ کو معاف کرے اور حضرت عمرؓ مجھ کو معاف کریں۔ میرے دل میں جو تھا وہ اگر نہ لکھتا تو میرا دل مجھ کو برا کہتا۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ حضرت عمرؓ ہمیشہ ہر مسلمان کو آزادی سے اظہار خیال کی اجازت دیا کرتے تھے، اور ٹھنڈے کلیجہ سن لینے کی کوشش کرتے تھے۔ ایران کے سلسلے میں انہوں نے خود فرمایا ہے کہ "[2] ہمارے اور فارس کے بیچ میں آتشیں پہاڑ حائل ہوتا تو اچھا ہوتا۔" اس کے آگے مولانا شبلی لکھتے ہیں "لیکن فارس سے ایک اتفاقی طور پر جنگ چھڑ گئی تھی۔" ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ اگر وہی آتشیں پہاڑ حائل رہتا تو آج مسلمانوں میں تشیع اور تصوف کا زور نہ ہوتا۔ جس نے اسلام کو بہت کچھ بدل دیا۔ سب کہنے کے بعد اتنا اور عرض کر دوں کہ اسلام کی عظمت و جبروت کے بارے میں جو حضرت عمرؓ کا احسان نہ مانے وہ ہٹ دھرم ہے۔

اب ابن خلدون کی برکت سے ہر پہلو سے بات ٹھیک ہو گئی۔ کچھ عجیب قصہ ہے جناب امیر علیہ السلام رسول اللہ کی گود میں پلے۔ سعید ازلی تھے۔ حاکم بد ہن کوئی پسر نوح کا انداز تھا کہ تعلیم کا اثر نہ قبول کریں مگر جب اس طرح کی لغزشیں

---

[1] الفاروق جلد دوم صفحہ ۲۸-۲۹۔
[2] الفاروق جلد اول صفحہ ۱۸۶۔

ہوتی تھیں تو انہیں سے ہوتی تھیں لیکن جو کفر کی زندگیاں بسر کر چکے تھے وہ ان لغزشوں سے پاک تھے۔ میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ حضرت علیؓ معصوم تھے۔ اگر اس قسم کی لغزشیں بیان کی جائیں جیسے ابوذر غفاریؓ کو رخصت کرتے جاتے ہوتے عمر عاص کی سواری کو کوڑا مار دینا تو میری سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی تعجب نہیں جو ایسا ہوا ہو لیکن جس وقت عرب[1] میں بھی نیک لوگ تھے جو شراب چھوڑ چکے تھے اور جب حضرت عمرؓ[2] تین بار شراب کے بارے میں پوچھیں اور ہر بار آیۃ اترے اور باوجود پہلا حکم آنے کے رسولؐ کے شاگردوں میں حضرت علیؓ[3] ہی شراب پی کر نماز میں کچھ کا کچھ پڑھا جائیں تو اس کو جانے امام بخاری یقین کریں چاہے مولوی شبلی یقین کریں چاہے ابن خلدون میں تو نہیں یقین کرسکتا۔

مولانا نے سیرۃ النبی میں "وانذر عشیرتک الاقربین" کا ذکر صفحہ ۱۰۸ حصہ اول پر کیا ہے۔ مگر جس خوبصورتی کے ساتھ اختصار سے کام لیا ہے وہ قابل غور ہے۔ حالانکہ یہ اہم واقعہ تاریخ احمدی کی رو سے تفسیر معالم التنزیل میں منقول ہے اور دوسری کتابوں میں بھی اور میرے خیال کو مضبوط کرتا ہے کہ مولانا شبلی مرحوم وہی ابن خلدون والی سنت برتتے ہیں۔ اور حضرت علیؓ کے مناقب بیان کیے جاتے ہیں "ابن خلدون کی سنت سے میرا مطلب یہ ہے کہ اصول درایت جو ابن خلدون نے سکھائے ہیں۔ دعوت عشیرہ والی روایت میں یہ اختصار اور حدیث قرطاس میں یہ پھیلاؤ وہی ابن خلدون کے تتبع کے خیال کو اور مضبوط کرتا ہے۔ پھر سب سے زیادہ کمال تو یہ کر دیا ہے کہ شروع بحث میں عبداللہ ابن عباس کا کمسن ہونا اور اس موقع پر موجود نہ ہونا ثابت کرکے پوری روایت کو ختم کر دیا ہے اور آخر میں یہ فرما دیا ہے "لیکن مشکل یہ ہے کہ صحیح بخاری وغیرہ میں اس قسم کی تصریحات موجود ہیں تو ہمارے اس خیال سے مطابق نہیں ہو سکتیں"۔

میرے پڑھنے والے!! خدا کے لیے یہ غور فرمائیں۔ حدیث قرطاس رفع کر چکے مگر صحیح بخاری کو باوجود اس تردید کے جو صحیح بخاری کی فرمائی "کذب" "مسلم رکھا" آئندہ جب ضرورت پڑے تو کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ صحیح بخاری "اصح الکتب بعد کلام باری" نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ درایت کی یہ نازک خیالیاں اور باریکیاں اب آپ کی سمجھ میں آگئی ہوں گی۔ "جے ابن خلدون کی" ابن خلدون نے درایت کو مستقل علم تو بنا دیا مگر یہ خیال نہ کیجئے گا کہ یہ فن محض انہیں کے طریقے سے تاریخ اسلام میں نہیں برتا جاتا تھا۔ یہی درایت کی مشقیں تھیں جس سے "والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم" کی آیت سے چاروں خلافتوں کا علی الترتیب قرآن میں پہلے سے آجانا ثابت کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس آیت سے خلافتوں کی جانشینی کو ڈھونڈ نکالنا شاعری برتنے والوں کی بزرگی ہے اور یہ

---

۱ سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۱۱۲

۲ سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۱۱۲

۳ الفاروق جلد اول صفحہ ۳۲

۴ الفاروق حصہ اول صفحہ ۶۵

کیا کہوں۔ اگر یہ پیشین گوئی مان بھی لی جائے تو یہ آیتہ جن حضرات کے لیے آئی ہو گی ان کو اس کی تفسیر کی خبر آنحضرت صلعم ہی سے معلوم ہو چکی ہو گی مگر یہ دلیل ان حضرات نے کہیں پیش نہیں کی کہیں ارتداد کے پھیلنے کا ذکر کیا گیا۔ کہیں طوائف الملوکی سے حفظ ماتقدم کی دلیل دی گئی۔ حضرت ابو بکرؓ نے یہاں تک فرمایا کہ "یا علی مجھکو معلوم ہوتا کہ تم اس کے خلاف ہو گے تو میں اس کو قبول نہیں کرتا۔" یہ بھی فرمایا گیا۔ تمہاری قوم تمہارا سردار ہونا گوارا نہیں کرتی تھی اور یہ پسند نہیں کرتی تھی کہ نبوت اور خلافت ایک ہی خاندان میں آجائے مگر خدا کا حکم بہ نص صریح کی مسکت دلیل کسی صاحب نے نہ پیش کی۔ پھر بھی آج اسی آیتہ سے استدلال کیا جاتا ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ شیعہ حضرات سُنیوں سے پیچھے رہ گئے۔ انہوں نے بھی قرآن شریف کا معتد بہ حصہ حضرت علیؓ کے مناقب کے لیے وقف کر دیا ہے۔ "اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ الخ" میں بیان کرتے ہیں کہ نماز پڑھنے میں سائل کو انگوٹھی دیدی اس پر یہ آیت اتری۔ جس شخص کے پاؤں سے تیر نکال لیا جائے اور اس کو خبر نہ ہو وہی شخص نماز میں انگوٹھی دینے کا کثیر کام کر بیٹھے۔ میری سمجھ سے تو باہر ہے: عبداللہ ابن یوسف علی کے ایسے لوگ تو ایسی آیتوں کو ہر ایسے مسلمان کے حق میں تصور کرتے ہیں جس کو اللہ ان نیکیوں کی توفیق دے مگر حضرات شیعہ اور حضرات اہلسنّت سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔ ہم ان پڑھے لکھے آدمی چپ ہیں۔ حالانکہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس کو معمولی عقل والا بھی سمجھ لیتا ہے۔ افسوس ہے کہ میں اس رسالہ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں مجمل ہی ہے۔ اگر کوئی صاحب چاہیں تو تاریخ کی کتابیں پڑھ کر وضاحت کا لطف اُٹھا سکتے ہیں۔ میں تو اپنے دلی معیار کا اظہار کر رہا ہوں۔ لوگوں کو شیعہ سُنّی یا صوفی نہیں بنا رہا ہوں۔ مولانا نے ایک جگہ ہم کو مرعوب کرنے کے لیے فرمایا ہے "جو علم الرجال سے واقف ہیں" الخ۔ علم الرجال کا ایسا مہتم بالشان نام ہم ایسے جاہلوں کا منھ بند کر دینے کو کافی ہے۔ مگر جو حضرات جانتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ علم الرجال میں بڑے بڑوں کے نام ہیں جن کو دوسروں نے ناقابلِ اعتبار مانا ہے مگر پھر بھی امید رکھتا ہوں کہ اگر پیچ و تاب کھا کر زیادتی کر گیا ہوں تو مولانا شبلی مجھے معاف کریں۔ اللہ مجھے معاف کرے اور آپ بھی درگذر کی کوشش کیجیے۔

خیر صبحانی ہوگا۔ کسی کی خامیوں سے اس کی نیکیوں پر پانی نہیں پھر سکتا۔ ہر شخص کو پیش خدا اپنا حساب دینا ہے "تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو" کوئی نص صریح تو تھی نہیں کہ حضرت علیؓ خلیفہ کر دیے گئے۔ ہم خود اس وقت موجود نہ تھے۔ لیکن اگر حدیث قرطاس والی بات صحیح ہے تو ہم تو اس کو اچھا کہہ نہیں سکتے۔ رسول اللہؐ بیمار ہوں۔ سلیقہ کی بات فرمائیں اور کہا جائے کہ بیماری کی شدت میں فرما رہے ہیں۔ تو ہم تو یقین کر سکتے نہیں۔ چاہے گلا ہی کٹ جائے۔ بات ناگوار قسم کی ہے۔ اسی لیے ختم کرتا ہوں۔ اتنا اور عرض کرنے کو دل چاہتا ہے کہ مولانا شبلی مورخ تو اچھے تھے ہی، اگر وکیل ہوتے تو اور اچھے ہوتے۔

حضرت عثمانؓ کی نیکی۔ نیک دلی۔ سخاوت۔ رسول مقبولؐ سے محبت ایسی چیزیں ہیں جن کی تعریف جتنی

کی جائے کم ہے۔ انتظام ان کے وقت میں اچھا نہ ہوا۔ اس سے خود ان کو جو تکلیف ہوئی ظاہر ہے۔ مروان اور دوسرے بنی اُمیّہ
کے اختیارات وسیع ہو گئے۔ جن کو رسولِ خدا صلعم شہر سے نکال چکے تھے وہ واپس آ گئے۔ جن کو رسول صلعم قدر کی نگاہ
سے دیکھتے تھے یعنی ابو ذر غفاریؓ جیسے لوگ باہر بھیج دیئے گئے۔ ملک میں طوائف الملوکی ہو گئی۔ میں تو بس یہ کہوں گا کہ شوریٰ
میں آدمی ہی ایسے رکھے گئے تھے کہ یہی ہو کے رہتا۔ اگر ان آدمیوں میں مقداد۔ جابر۔ یا دوسرے جو تجہیز و تکفین رسول اللہ صلعم
میں شریک تھے ہوتے یا عمار رضوان اللہ علیہم کے ایسے لوگ رکھے جاتے تو خلیفہ رسول کی شہادت نہ ہوتی۔ نہ ضعیف العمری میں
رسول کا ایک چاہنے والا دنیا میں یہ تکلیفیں اُٹھا کر اپنے رب کے سامنے حاضر ہوتا۔ حضرت عثمان غنیؓ کے ذمہ جتنے الزامات
نکلنے جاتے ہیں ان میں اخلاقی ذمہ داری ان کی رہی ہو مگر عملی ذمہ داری کا کوئی ایسا ثبوت نہیں ہے جس کے ذریعہ سے
ان کے خلاف ڈگری عقلِ سلیم کی عدالت سے حاصل کی جاسکے۔ اسی کے مقابلے میں ان کی خیرات ان کی نیکیاں، رسول صلعم
سے ان کی محبت ایسی چیزیں ہیں جو خود ان کی اور انہیں کی ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ٥

جناب امیر علیہ السلام کی خلافت ایک پہلو سے کامیاب کہی جاسکتی ہے اور ایک پہلو سے ناکامیاب۔ ناکامیاب
تو اس پہلو سے کہی جاسکتی ہے کہ اس میں سلطنت اور مقبوضات کی وسعت کم ہوئی۔ اور اس نظر سے کامیاب کہی جاسکتی ہے کہ
نائب (علیہ السلام) منیب (صلعم) کے قدم بہ قدم چلا۔ رسول اللہ ہمیشہ دفاع کی لڑائیاں لڑا کئے۔ اور جناب امیر علیہ السلام
نے بھی ہمیشہ یہی کیا۔ "نعم المنیب و نعم النائب" اور پھر مملکتِ محروسہ سے کوئی مقبوضات کم بھی نہیں ہوئے۔
جتنے دن جئے رسولؐ کی پیروی کی۔ اس کے بعد ملک و مال روحانی امانتیں اور پیغمبر کی خاندانی خوبیاں وارث جائز کے سپرد
کر کے اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے سرخرو حاضر ہو گئے۔ بعض لوگ دبی زبان سے قرآن کی تحریف کا ذکر کرتے ہیں۔ میرا عقیدہ
بحمداللہ یہ نہیں ہے کہ حضرت علیؑ "ناقص قرآن کی ذمہ داری اپنے سر اوڑھ لیتے ہیں اور خلافت ظاہری کے لیے ناقص قرآن کی ترویج
دینے پر تیار ہو جاتے۔ میرے علیؑ یعنی اس جاہل کے دل میں جناب امیر علیہ السلام کا جو تصور ہے اس کی رو سے تو یہ ناممکن تھا کہ وہ
کسی ایسے قرآن کو ظاہری حکومت حاصل کرنے کے لیے قبول کر لیتے جو بحیثیت مجموعی تمام احکام خدا اور منشاء رسول سے کچھ بھی
الگ ہوتا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے وقت میں جب قرآن جمع کیا گیا تو ممکن ہے کچھ اِدھر کا اُدھر ہو گیا ہو مگر یہ میرا ایمان
ہے کہ بین الدفتین قرآن وہی ہے جو خدا کے یہاں سے آیا ہے اور اس میں کوئی ضروری بات چھوٹی نہیں ہے۔

شیعوں کے ہاں امامت من اللہ پر بڑا زور دیا جاتا ہے۔ خلافت کے سلسلے میں عرض کر چکا ہوں کہ جناب امیر نے
کبھی نہیں فرمایا کہ "ہم کو آنحضرت صلعم خلیفہ بنا چکے ہیں" (دیکھو صفحہ ۴۱) پھر دوسری جگہ حضرت عمرؓ کے حال میں عرض کیا ہے
"کوئی نص صریح تو تھی نہیں کہ حضرت علیؓ خلیفہ کر دیئے گئے" (دیکھو صفحہ ۵۱) میرے خیالات کا پتہ تو ان جملوں ہی سے

چل گیا۔ لیکن ان وجوہ سے میری سمجھ میں امامت من اللہ نہیں آئی تو میں نے عرض کیا۔ حضرات شیعہ نہ معلوم کتنی آیتیں امامت من اللہ کے ثبوت میں پیش فرماتے ہیں۔ مگر سب وہی آیتیں ہیں جن کے معنی میں اختلاف ہے۔ اتنا ضروری مسئلہ جو اصولِ دین میں شمار ہو اور ایک آیت بھی ایسی نہ پیش کی جا سکے جس میں تاویل کی ضرورت نہ پڑے۔ وحدانیت، نبوّت۔ قیامت کے بہت سے احکام ہر جگہ موجود ہیں جن کے معنی میں کوئی فرقہ بھی اختلاف نہیں کر سکتا۔ فروعِ دین جن کا درجہ اصولِ دین سے کم ہے ان کے احکام بھی اسی طرح کے صریحی ہیں جن میں اختلافات کی گنجائش نہیں مگر امامت من اللہ کے لیے ایک آیت بھی ایسی نہیں پیش کی جا سکتی جس کے معنی میں دوسرے مفہوم کا احتمال نہ ہو اور دوسرے فرقے اس کے دوسرے معنی نہ بیان کرتے ہوں۔ امامت من اللہ کے دلائل جو پیش کیے جاتے ہیں ان کو دیکھ کر وہی آیت ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ والی پیشِ نظر ہو جاتی ہے جو اس کتاب میں موجود ہے۔

محکم آیت جیسے وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُولٌ کی ایسی ایک آیت بھی نہیں جس کے بعد چون و چرا کی گنجائش نہ رہ جائے مولوی فرمان علی صاحب مرحوم مترجم قرآنِ پاک نے اپنے ترجمے کے حاشیہ پر سات آیتیں لکھی ہیں جن سے امامت من اللہ کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ مجھ کو تو ایک آیت بھی صریحی نہیں معلوم ہوتی۔ اتنا ضروری۔ اتنا اہم مسئلہ اور اس میں صرف تشبیہوں استعاروں سے تاویل کی جائے کچھ دل پر بیٹھتی ہوئی بات نہیں ہے۔ ان کے علاوہ حضرات ذاکرین اور آیتیں بھی پڑھتے ہیں۔ مگر ان میں بھی بغیر تاویل کے کام نہیں چلتا۔

○

بعض فلسفیوں کے نزدیک جناب باری تعالیٰ تھوڑے تھوڑے دنوں کے بعد ایک انسان پیدا کرتا ہے جس کو کہنے کے لیے انسان فوق الانسان کہہ لیجیے۔ یہ انسان جسموں پر حکومت کر لیتا ہے اور دلوں پر بھی حکومت کر لیتا ہے اور ہر بات میں اس کو دوسرے انسانوں پر فوقیت ہوتی ہے۔ آنحضرت صلعم ایسے ہی انسان تھے۔ شیعہ حضرات گو منہ سے صاف صاف نہیں کہتے مگر اپنے انداز سے یہ چاہتے ہیں کہ قرابت قریبیہ کی وجہ سے جناب امیر علیہ السلام کو رسول صلعم کے برابر یا کچھ ویسا ہی مان لیا جائے۔ حضرات اہلسنت اس درجہ تک تو نہیں جاتے مگر وہ بھی حضرت عمرؓ کو کچھ انسان فوق الانسان ہی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ صحیح بخاری ایسی کتاب میں اکثر روایتیں ہیں کہ جناب رسالتمآبؐ اور حضرت عمرؓ میں اختلاف ہوا اور وحی حضرت عمرؓ ہی کے خیال کے مطابق اتری۔ میرا عقیدہ ان باتوں سے بہت دور ہے۔ اور میں اپنے عقیدہ پر شرمندہ نہیں ہوں۔ اس ذاتِ پاک رسالت سے کسی کو نسبت نہیں تھی اور نہ ہو سکتی ہے۔ یہ تو لوگوں کے منہ کی باتیں ہیں دنیا حاصل کرنے کو یا اپنے فرقہ کو فوق دینے کے لیے تو وہ کچھ

کیا آپ کو مذہب کے بہتر ٹکڑے ہو گئے؟

قرآن کا تو یہ دعویٰ ہے کہ ایک آیت بھی کہہ لاؤ۔ فصحی تو اعتراف کریں کہ "لا ھذا کلام البشر" اور ادیان نہ فرمائیں۔۔۔ جب حضرت عمرؓ اس وقت نہیں تو ادیب ہو جاتے۔

امام حسن علیہ السلام کا ذکر الطیب کے سلسلے میں آ چکا ہے۔ میرے لیے تو یہی کافی ہے کہ سنا ہے کہ امام ہما علیہ السلام کی صورت اپنے نانا سے بہت ملتی تھی" اللھم صل علی محمد وآل محمد" جناب امام حسن علیہ السلام اور جناب امام حسین علیہ السلام کی افتادِ طبع میں فرق تھا:

"الکاظمین الغیظ والعافین عن الناس ۰ واللہ یحب المحسنین" کا واقعہ امام حسن علیہ السلام کے مزاج کا آئینہ ہے۔ (شہید انسانیت میں یہ روایت امام حسین علیہ السلام کے لیے لکھی ہے) امام حسین علیہ السلام کی افتادِ طبع کربلا کے میدان میں ظاہر ہی ہو چکی ہے۔ اس سے زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

اب امیر معاویہ کے بارے میں میرے خیالات سنیے۔ وہ حکمت عملی کے بادشاہ تھے۔ ذہین تھے۔ فریس تھے۔ تو بھولے سے کوئی شخص خالی نہیں ہوتا۔ کوئی دبی دبائی اچھائی ہمارے جیسے آدمی میں پڑی ہو تو تعجب نہیں مگر حضرت ان کے بارے میں میری زبان نہ کھلوائیے۔ نہ ان حضرات کے بارے میں میری رائے پوچھیے۔ جو ان کو اچھا کہتے ہیں۔ جلیل القدر صحابی کہلاتے ہیں "صحابی کالنجوم" والی حدیث میرے گلے سے نہیں اترتی۔ اور شاعر کا تبرا بازی ان کے ذکر پر ہو تو مجھ کو وہ تکلیف نہیں پہونچاتی جو ہر دوسرے موقع پر سے

صحابی گرچہ جملہ کالنجوم اند ولے بعضے کواکب نحس و شوم اند

صحابی کی تعریف یہ بیان کی جاتی ہے کہ جس کو رسول اللہ صلعم کی زیارت نصیب ہوئی ہو اور وہ مسلمان ہو ممکن ہے صحابی کی کوئی اور تعریف ہو جو مجھ کو نہ معلوم ہو۔ اس میں کلام نہیں کہ ہر حالت میں اصحاب رسول اللہ رضوان اللہ علیہم کی تعداد بہت کثیر رہے گی۔ پڑھے لکھے حضرات کو دو اخبار معلوم ہیں جن میں پیشین گوئی تھی کہ بنی ہاشم اور بنی امیہ میں ہمیشہ تلوار کھنچی رہے گی۔ سورۂ جمعہ میں "واذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ" اور سورۂ برأت میں منافقین مذکور ہوئے ہیں۔ خدا نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اپنے کو مسلمان کہو۔ مومن نہ کہو۔ "ولقد علمنا المستقدمین منکم ولقد علمنا المستاخرین" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ نماز میں کوئی عورت آگئی تھی۔ کچھ نمازی پیچھے سے آگے چلے گئے اور کچھ آگے سے پیچھے چلے گئے تھے۔ وہ رکوع میں اس عورت کو بغل سے جھانکتے تھے اور جو پیچھے تھے وہ تو دیکھتے ہی تھے۔ اس وقت یہ آیت اتری۔

منافق مسلمان کے کوئی دُم سینگ تو لگی نہیں ہوتی صرف خدا "علیم بذات الصدور" ہے۔ ایسی صورت میں کالنجوم والی روایت کو ماننا میرے تو امکان سے باہر ہے۔

ان کے والد نے رسول اللہؐ کے دانت توڑے۔ ان کی والدہ ماجدہ نے رسول اللہؐ کے چچا کا کلیجہ چبایا۔ یہ خود جناب امیر علیہ السلام سے لڑے۔ اور سب کیا۔ ان کے برخوردار کے ہاتھوں کربلا کے میدان میں جو کچھ ہوا وہ آپ کو معلوم ہے۔ امام زین العابدین علیہ السلام کے لیے روایت ہے کہ یزید علیہ اللعن کو نماز غفیلہ بتائی جس سے ان کے گناہ معاف ہو جائیں۔ اب آپ ہی بنی امیہ اور بنی ہاشم کے درمیان فیصلہ کیجئے۔ یہ کہہ دینا کہ ہم اپنی زبان سے ان کو برا نہ کہیں گے، تو کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتا۔ آپ منہ سے مت نہ کہیئے۔ مگر دل تو آپ کا دو آدمیوں کے افعال کے بارے میں ملائے: "اثم کرتا ہے" ہی گا۔ اگر کوئی پھر بھی مرثیت بگھارے تو اس کی مثال اس بولاہے کی سی ہوگی جس کے پاؤں میں تیر لگا تھا خون بہہ رہا تھا۔ اور وہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ اللہ کرے جھوٹ ہو۔ تبرا کے کرنے اور کہنے کہنا حماقت اور سخت گناہ ہے بلکہ خود امیر معاویہ کی بیرونی ہے۔ لیکن رائے کوئی کیسے بنانے قائم نہ کرے گا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت عمر ابن عبدالعزیز کو چھوڑ کر دو آنکھوں گا نہوں کیسے اس خاندان نے پیدا کیے ہیں کہ اللہ کی پناہ ہے

اے ذوق اس جہان کو زیب اختلاف ہے

لیکن اس اختلاف کی ستم ظریفی دیکھئے کہ آتی امہات المومنین رضوان اللہ علیہن اجمعین ہیں مگر بقول حکیم سنائیؒ کے خال المومنین امیر معاویہ ہی کہلائے۔ حکیم سنائیؒ کہتے ہیں کہ اتنے جلیل القدر صحابی تھے جن کی بہنیں امہات المومنین تھیں۔ مگر سوائے امیر معاویہ کے یہ لقب اور کسی کو نہ ملا۔ جو حضرات اس خطاب کو بہ نظر استحسان دیکھتے ہیں یا جن کتابوں میں یہ لقب پسندیدگی سے آیا ہے۔ اگر دوسرے لوگ یا فرقہ ان حضرات اور ان کتابوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھیں تو کیا تعجب ہے۔ افسوس ہے کہ اس وقت میرے پاس حدیقہ حکیم سنائیؒ جس سے مجھ کو بڑی ہدایت ملی ہے موجود نہیں۔ ورنہ خال المومنین کے ذکر کو وسعت دیتا۔ یہ وہی حکیم سنائیؒ ہیں جن کے لیے مولانا کہتے ہیں ۔ے

عطار روح بود و سنائیؒ دو چشم او ما از پئے سنائیؒ و عطار آمدیم

اور مثنوی میں فرماتے ہیں:۔

ترک جوشی کردہ ام من نیم خام از حکیم غزنوی بشنو تمام

اس کے لکھنے کے بعد ایک نسخہ حدیقہ کا ہاتھ آ گیا۔ تفریح قلوب مومنین کے لیے کچھ اشعار خال المومنین کی مدح میں پیش ہیں:۔

خال مشکیں نہ بود بر خورشید خال بر دیدہ بود لیک سپید

آنکہ مردود و باؤ تلبیس است	آں نہ خال ونہ عم کہ ابلیس است
وانکہ خوانی کنوں معاویہ اش	وانکہ دربارہ است زادیہ اش

اس کے بعد امہات المومنین رضوان اور علیہن کے اسماء گرامی گنوا کر فرماتے ہیں سے

این ہمہ جفت مصطفےٰ بودند	جملگی مادران ما بودند
ہر یکے رابرادراں بودند	مصطفےٰ رابسان جاں بودند
از چہ مخصوص شد بخالیٔ ما	ابن سفیان زیان خالیٔ ما

وجہ یہ ہوئی کہ احادیث کی تدوین آنحضرت صلعم کے بہت دنوں بعد شروع ہوئی۔ سب سے پہلی کتاب موطا ابن مالک ہے جو تقریباً ڈیڑھ سو برس بعد لکھی گئی۔ اس کے بعد امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ نے دوسری کتاب جس کو مسند کہتے ہیں لکھی۔ پہلی صدی کے شروع میں حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ نے بھی حدیثوں کے لکھوانے کا سامان کیا تھا۔ اس زمانے تک تو پتہ چلتا ہے کہ لوگ اپنے اعمال صحیح کرنے کے لیے احادیث کا خیال کرتے تھے تاکہ رسول اللہ صلعم کی سنت کے ذریعے سے مسلمانوں کی زندگی قرآن کے موافق ہو جائے ۱۹۰ھ میں حضرت اسمٰعیل بخاری پیدا ہوئے۔ اور ۲۰۹ھ ہجری میں انہوں نے صحیح بخاری کی بنا ڈالی۔ جو انہوں نے اٹھارہ سال کی محنت میں تیار کی۔ اب حدیث بنانے میں وہ مستقل رنگ اختیار کر لیا گیا جو آج تک چلا آتا ہے۔ حضرت بخاری کی کتاب کے لئے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اصح الکتب بعد کلام الباری الصحیح بخاری۔

میں نے تجرید البخاری مؤلفہ علامہ حسین ابن مبارک زبیدیؒ کے دو مختلف نسخے دیکھے ہیں حضرت بخاری مرحوم کے لیے کہا جاتا ہے کہ آپ ہر جگہ گھومتے تھے اور جہاں جہاں آپ کو کوئی معتبر راوی ملا اس سے حدیثیں سنتے تھے۔ حافظ کا یہ حال بیان کیا جاتا ہے کہ احمد ابن حمزہ والی خراسان روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے ایک دن امام بخاری نے فرمایا کہ اکثر احادیث ایسی ہیں کہ میں نے بصرہ میں سنیں اور شام میں لکھی ہیں۔ جو شام میں سنیں وہ بصرہ میں آ کر لکھیں۔ علی ابن الحسین الہکندی کا بیان ہے کہ حضرت امام بخاری ایک دن ہمارے یہاں تشریف لائے کسی نے ہماری مجلس میں کہا کہ میں نے حضرت اسحٰق بن راہویہ کو فرماتے سنا ہے کہ مجھے اپنی کتاب میں سے ستر ہزار حدیثیں تو اس وقت یاد ہیں۔ حضرت امام نے یہ سن کر فرمایا تم لوگ اس پر تعجب کرتے ہو۔ بھلا جو شخص دس لاکھ حدیثیں یاد رکھتا ہو (گویا یہ اشارہ اپنی طرف تھا) اسی طرح یہ بھی دعویٰ ہے کہ حضرت بخاری کو چھ لاکھ حدیثیں یاد تھیں۔ ہشام کے زمانے میں زہری اور دوسرے حضرات جنہوں نے حدیثیں جمع کیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے مقدمہ فتح الباری میں لکھا ہے کہ شروع اسلام میں لوگ احادیث جمع کرتے ہوئے اس لیے ڈرتے تھے کہ کہیں حدیث قرآن شریف سے مخلوط نہ ہو جائے۔ مگر چرتابعین کے زمانے میں تدوین حدیث شروع ہو گئی۔ اکثر فقہا اور

محدثین مختلف ممالک میں منتشر ہوگئے اور روافض و خوارج اور قدریہ نے شورش برپا کر رکھی تھی۔ اس لیے جمع و تدوین فقہ کی طرف فقہا و محدثین کا خیال رجوع ہوگیا۔

یہ تمام باتیں اور اس طرح کی اور بہت سی باتیں، ایک منطقی کے لیے صحیح ہوں مگر مجھ کو تو پروپگنڈا ہی معلوم ہوتی ہیں میں کوئی علم حدیث یا تاریخ پر تو کتاب لکھ نہیں رہا ہوں۔ میں تو اپنے خیالات کا اعتراف کر رہا ہوں اس لیے بحث کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ احادیث جمع کرنے میں یہ احتیاط یہ دیانت اور زیادہ تر روایات کا رجحان کچھ ایسا ہے جس سے صرف فرقۂ اہل سنت والجماعت کی تقویت ہوتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ صحاح ستہ میں سب روایتیں ایسی ہیں۔ جب اسلامی تاریخ کا مدار ان پر ہو تو کوئی یہ کیسے کہہ سکتا ہے۔ مگر یہ تو ضرور کہوں گا کہ بہت سی روایتیں ایسی بھی ہیں جو نہ ہوتیں تو اچھا تھا۔ امیر معاویہ کے وقت میں عبید ابن شریح کی کتاب "کتاب الملوک والاخبار" اور وہب ابن منبہ کی کہانیاں اور کعب الاخبار کے قصے ہیں۔ یہی چڑیا چڑے کی کہانیاں تھیں جنہوں نے بعد کو بعید از قیاس معجزات اور قرآن کے برخلاف خرق عادات کی بنیاد ڈالی تھی۔ ابن ندیم کی "الفہرست" ابن خلکان اور نوادی وغیرہ کے بیانات پڑھ لیجیے[1]۔

بخاری میں خیبر کے متعلق پندرہ حدیثیں ہیں۔ اس میں صرف ایک جگہ حضرت علیؑ کا نام آیا ہے وہ بھی اس طرح کہ حضرت علی ابن ابی طالب سے مروی ہے کہ خیبر کے دن رسول اللہؐ نے نکاح متعہ اور گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔ ایک دوسری جگہ ایک دوسری سرخی کے تحت میں یہ بھی ہے کہ خیبر حضرت علی نے فتح کیا۔ میں اب اپنے دل کی بات کہہ دوں۔ خیبر کی لڑائی کا ذکر اور حضرت علیؑ کا نام صرف سرسری طور سے آجا نا میں تو اسی سے بھڑک گیا۔ کچھ اسی پر نہیں موقوف۔ ہر جگہ یہی بات دکھائی دیتی ہے۔ امام حسنؑ کا نام کسی جگہ ہے کہ رسولؐ کو ان سے بڑی محبت تھی اور صرف ایک جگہ ضمناً امام حسینؑ کا ذکر ہے کہ "حسنین میری دنیا کی زینت ہیں"۔ ایک دوسری جگہ ہے کہ حضرت عمرؓ منبر پر تھے اور حضرت امام حسنؑ بچے تھے۔ آپ نے کہا "ہمارے باپ کے منبر پر سے اترو"۔ حضرت عمرؓ نے کہا "سچ کہتے ہو۔ منبر تمہارے باپ کا ہے"۔ اس پر حضرت علیؑ نے کہا۔ "میں نے بچہ کو یہ نہیں سکھایا ہے"۔ ممکن ہے کہیں اور بھی ہو مگر اس پر میری نظر نہیں پڑی۔ میں نے ہمیشہ اللہ میاں سے یہ دعا مانگی کہ شیعہ سنی سے مجھ کو چھٹکارہ دے کر اس مذہب کی ہدایت کر جو آنحضرتؐ کے وقت میں تھا۔ جب ہر شخص مسلمان تھا اور ہر شخص اہلسنت تھا "الجماعت" کا ٹکڑا تو شاید امیر معاویہ کے وقت میں نکلا ہو کیونکہ انہوں نے اپنی حکومت کے پہلے سال کا نام "الجماعت" رکھا تھا۔

---

[1] ملاحظہ ہو حتی کی تاریخ عرب کا اکیسواں باب۔ جہاں بنی اُمیّہ کے زمانے میں علمی ترقیوں کا ذکر ہے۔ نیز ملاحظہ ہو کتاب "مذہب اور باطنی تعلیم"۔

حضرت علیؓ کا نام کئی جگہ ہے مگر کہیں اس طرح ہے کہ حضرت علیؓ نے کفار کو آگ میں جلوا دیا۔ اور کہیں ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہا جس سے رسول کو بھی تکلیف ہوئی! خیر بعد کو رک گئے۔ امام حسن علیہ السلام کی منقبت میں ایک حدیث ہے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلعم کو (ایک مرتبہ) منبر پہ دیکھا کہ حسن علیہ السلام ان کے پہلو میں تھے۔ آپ کبھی لوگوں سے کبھی ان کی طرف متوجہ ہوتے تھے اور فرماتے تھے ''میرا یہ بیٹا سید ہے۔ اور امید ہے کہ اللہ اس کے ذریعے سے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا۔''

ایک دوسری جگہ ہے حضرت اسامہ بن زید نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ ''آپ اسامہ اور امام حسنؓ کو لیتے تھے اور فرماتے تھے ''اللہ ان دونوں کو دوست رکھ کیونکہ میں ان دونوں کو دوست رکھتا ہوں۔ اتفاق دیکھئے کہ یہاں بھی بجائے امام حسین علیہ السلام کا ذکر نہ آیا۔ اس طرح کی حدیثیں، میں تو صاف کہوں میرے دل پہ بیٹھتی نہیں۔ میرے دل کو تو وہی بات دکھائی دیتی ہے جس سے ہمیشہ میں بھاگتا رہا۔ یعنی امام حسنؓ کی صلح سے امیر معاویہ کی ریشہ دوانیاں چھپ جاتی ہیں اور امام حسین علیہ السلام کی افتادِ طبیعت سے یزید باپ بیٹے کے ہتھکنڈے کھل جاتے ہیں۔ علاوہ اس کے پیشین گوئیاں اگر ایسی ہوئیں جیسی سورۂ روم کے شروع میں ہے ''غلبت الروم'' یا قرآن شریف میں اور آئندہ کے اخبار میں وہ میرا ایمان ہے مگر ایسی پیشین گوئیاں جو احادیث میں مذکور ہیں اور جن کا واسطہ قرآن سے کچھ نہیں ہے۔ یا یہ مقصد ہے اسباب و علل ان کا ظاہر ہونا عقل میں نہیں آتا۔ اور صرف پولیٹکل فائدہ کے لیے بیان ہو سکتی ہیں جیسے امام حسنؓ کا دو گروہوں میں صلح کروانا تو ان کے ماننے میں مجھ کو تامل ہے۔

اسلام میں حال و قال کا سلسلہ مولانا روم کے وقت سے شروع ہوا۔ آیا یہ حال و قال جزوِ اسلام ہے یا نہیں۔ یہ غور کرنے کی بات ہے۔ ایک مقام پہ آگے یا پیچھے میں نے عرض کیا ہے کہ حکیم سنائیؒ تک تصوف میری سمجھ میں آتا ہے۔ اس کے آگے نہیں آتا۔ میرے اس قول کی یہی وجہ تھی۔ اگر کہیں یہ ثابت ہو جائے کہ رسول اللہ صلعم یا حضرت علیؓ یا حضرت ابوبکرؓ نے یہ کیا ہے تو میں ماننے کو تیار ہوں نہیں، تو حضرت مجھ کو تو معاف ہی رکھیے۔ حال و قال کی محفل میں مجھ کو کبھی لطف آیا ہے۔ اور ان تقریبات میں بہت حصہ لیتا رہا اور لطف اندوز ہوتا رہا۔ لیکن غور کرنے سے پتہ چلا کہ لطف روحانی پہلو کا نہ تھا بلکہ عارض و گل و شراب محبت، عشق و وصال کے اذکار سے تھا ؎

روز بارفت کہ دست منِ مسکیں نہ گرفت ساقیِ شمشاد قدے ساعدِ سیم اندامے

اگر آپ کو بھی حافظ کا یہ شعر مزہ دے گیا ہو تو میں آگاہ کئے دیتا ہوں کہ ذری سنبھل کر مزے لیجئے گا اور ایکبارگی یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ خالی زمانِ قبض کی شکایت ہے اور حالت بسط کی آرزو ہے۔ اس کی پہچان بھی بتا دوں۔ اگر مجامعت کی تمام اصطلاحیں ترک کرنے کے بعد بھی قبض و بست کا خیال باقی ہے تو ٹھیک ہے۔ نہیں تو نہیں۔ اس جگہ تفریحِ قلوب مومنین کے لئے ایک واقعہ عرض کر دوں۔

ایک بزرگ جن کے مریدوں کی تعداد لاکھوں بتائی جاتی تھی ان کے آستانہ پر خود ان کے عرس کی رات کو محفل سماع تھی۔ میں بھی حاضر تھا اور سجادہ نشین صاحب کے پاس ہی بیٹھا تھا، دو دیہاتی رنڈیاں، دُبلی دُبلی سیاہ فام سی کریہہ الصورت مجہول الفن اس شعر کی تکرار کر رہی تھیں ؎

لغزشِ مستانہ در رفتار و جامِ مے بکف
رخصت اے تقویٰ کہ یار آمد بسامانِ دگر

شعر مزہ داری کا تھا مگر جو لطف چاہیے تھا وہ نہ اُٹھ رہا تھا۔ اتنے میں حکم ہوا کہ فلاں رنڈی حاضر ہو۔ حضرات رات کی مدھم روشنی میں محفل کے دوسرے سرے پر ایک رنڈی بڑھی۔ جوانی۔ خوبصورتی۔ چھپ تختی۔ گات گولائی۔ رنگ ڈھنگ۔ سُرخ پارسی ساڑی۔ بڑے بڑے سفید بوٹے غضب ڈھا رہے تھے۔ وہ رنڈی تو گا رہی تھی میں نے صرف تحت اللفظ میں کہا۔ "رخصت اے تقویٰ کہ یار آمد بسامانِ دگر" نہ مزامیر۔ نہ لے۔ نہ مُرکی۔ نہ زمزمہ۔ نہ بیڈار۔ نہ صوت یقین مانیئے کہ میرے اور دیگر حضرات مع سجادہ نشین صاحب کے جھوم ہی تو گئے۔

میرے پڑھنے والو۔ باوجود میری سیاہ کاریوں کے یہ نہ سمجھئے گا کہ قربتہ الی اللہ کے لیے میں نے تصوف کا در نہیں کھٹکھٹایا۔ حلقہ میں بھی بیٹھا ہوں۔ بزرگوں سے عرض حال بھی کیا ہے مگر جو راہ دل ڈھونڈھتا تھا وہ نہ ملی۔ حکیم سنائیؒ تک تو تصوف سمجھ میں آیا۔ اس سے مدد بھی ملی۔ مگر اس کے آگے نہ چلا۔ اگر تصوف سے مراد قرآن کے احکام کے اندر رہ کر وہ طریقِ زندگی ہے جو حضرت ابوذر غفاریؓ صحابی رسول اللہؐ کا تھا۔ جن کا ذکر مختلف کتب تاریخ اسلامی میں ملتا ہے۔ یا جناب ابودرداؓ کی زندگی تھی۔ یا حضرت سلمان کی تھی یا خود جناب امیر علیہ السلام کی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تھی تو پھر تو تصوف وہی ہے جو قرآن میں ہے۔ جہاں روایات اور بعض تاویل آیات پر آگے چلتے ہیں وہاں سے میری راہ ختم ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے مولانا روم کو نہ سمجھ سکا

مثنوی مولوی معنوی
ہست قرآن اور زبانِ پہلوی

اگر ان اشعار کے لیے کہا جائے جو بر بنائے آیات ہیں تو خیر۔ مگر جہاں ان روایات کی بنا پر وہ حکایتیں ہیں جن کی تدوین تیسری صدی کے شروع میں ہوئی ہے اور جن کی بابت میں اپنے ناچیز خیالات ظاہر کر چکا ہوں تو مجھ کو متذکرۂ بالا شعر اچھا نہیں

معلوم ہوتا۔

میرے پڑھنے والے مجھ کو معاف کرنا۔ اس جگہ رسول خدا صلعم کے اصحاب خاص کے اسماء گرامی آگئے ہیں۔ سلسلۂ کلام کو ترک کرکے آپ ہی آپ دل چاہتا ہے کہ ان حضرات کے بارے میں ایک ایک بات عرض کردوں۔ تب آگے چلوں۔ رشتۂ کلام تو چھوٹا مگر عروۃ الوثقائے محبت ہی ہاتھ آئے آپ کے دل اگر گندھ جائیں تو کیا برا ہے۔ حضرت ابو درداؓ اور حضرت سلمانؓ کے درمیان میں ان کے آقا و مولیٰ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے صیغۂ اخوت پڑھا تھا۔ ایک دن حضرت سلمان اپنے بھائی کو دیکھنے گئے۔ غریبی اور عسرت حضرت سلمان کے لیے کوئی نئی چیز نہ تھی۔ مگر حضرت ابو درداؓ کی بی بی کے پھٹے میلے کپڑے دیکھ رنج ہوا۔ استفسار پر حضرت ابو درداؓ کی بی بی نے کہا کہ تمہارے بھائی کو سوائے عبادت خدا کے اور کسی چیز سے واسطہ ہی نہیں ہے۔ رات کو حضرت ابو درداؓ سے حضرت سلمانؓ نے کہا کہ بی بی کا حق تم پر ہے اور اپنے نفس کا بھی اور خدا کا بھی۔ بعد کو جناب رسالتمآبؐ نے اس کی تصدیق فرمائی۔ جناب سلمان فارسیؓ کو حضرت علیؓ نے بصرے کا والی مقرر کیا تھا۔ راستے میں سواری کا گدھا مر گیا تھا۔ خود اپنی پیٹھ پر زین لادے ہوئے اپنی حکومت کے شہر میں داخل ہوئے۔ حضرت اویس قرنی بکریاں چراتے تھے اور دنیا کو بکریوں سے کم جانتے تھے صفین میں جناب امیر کی طرف سے لڑے اور جناب خال المومنین کی فوج نے شہید کیا۔ رسول اللہ کی زیارت نہیں ہوئی تھی مگر آنحضرتؐ فرماتے تھے کہ یمن کی طرف سے مجھ کو بوئے محبت آتی ہے۔ جناب امیرؑ فرمایا کرتے تھے کہ اے دنیا میں نے تیری مہار تیری گردن پر ڈال دی ہے۔ مجھ کو تیری پروا نہیں۔ چلی جا جدھر دل چاہے۔ حضرت ابو ذر غفاریؓ نے ہمیشہ اعلان کلمۃ الحق کیا۔ شروع میں اسی پر زد و کوب کی گئی اور آخر میں اسی پر اپنے حبیب کے دیار سے نکالے گئے۔ مگر کیا پروا۔ مارے گئے قرب خدا حاصل ہوا۔ نکالے گئے اپنے حبیب کے پاس جنت میں پہونچ گئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ تھے مگر اپنی ذمہ داریوں کا خیال کرکے کہتے تھے "کاش میں درخت ہوتا کہ جانور مجھے چر جاتے۔" ان باتوں کے اسناد لکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے پوری پوری روایتیں بھی نہیں لکھی ہیں۔ ان میں نہ معجزے ہیں نہ کرامتیں۔ یہ تو "جمال ہم نشیں در من اثر کرد" والی بات ہے اور کچھ نہیں۔ خیر اب پھر سلسلۂ کلام شروع ہوتا ہے۔ میں عرض کر رہا تھا کہ وہ تصوف تو میری سمجھ میں آتا ہے جو قرآن میں ہے۔ جہاں روایات اور بعض تاویلی آیات پر آگے چلتے ہیں وہاں سے میری راہ ختم ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے معتد بہ حصہ مولانا روم کا نہ سمجھ سکا مثلاً مثنوی کے دوسرے دفتر میں امیر معاویہ کو شیطان کا صبح کی نماز کے لیے جگا دینا اور بڑی مشکل سے بتانا کہ اگر میں نہ جگاتا تو وہ

گر نمازت فوت می شد آں زماں — می زدے از درد دل آہ و فغاں

آں تأسف واں فغاں واں نیاز — در گذشتے از دو صد رکعت نماز

اس حکایت سے جہاں تک میں سمجھا ہوں مدعا یہ ہے کہ انفعال تواب الرحیم کو بہت پسند ہے اور نفس امارہ آدمی کو ہمیشہ دھوکا

دیتا ہے لیکن اس تعلیم کے لیے جو حکایت اختیار کی گئی ہے وہ اور دوسرے دو د دام کی حکایتوں کی طرح کی نہیں ہے۔ بلکہ اس سے کچھ فرقہ بندی کے فوائد بھی نکلتے ہیں۔ اسی طرح کی اور مثالیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں مگر کیا کروں لکھ کر اس کے بعد ذیل کا شعر مجھ کو جسارت ہی جسارت معلوم ہوتا ہے ؎

من ز قرآں مغز را برداشتم ۔۔۔ استخواں پیش سگاں انداختم

قرآن کا ایک ایک حرف چاہے محکم ہو چاہے متشابہ ہر مسلمان کا ایمان ہے اور یہاں یہ ارشاد ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے مثنوی مولانا روم میری سمجھ سے باہر ہے۔

نماز میں جہاں تک فرائض کا تعلق ہے میں سنیوں کی نماز اور شیعوں کی نماز میں کوئی ایسا فرق نہیں پاتا کہ ساتھ پڑھنے میں نماز ہی نہ ہو۔ حنفی مسائل اور شیعوں کے مسائل میں فرق ضرور ہے۔ مثلاً حنفیوں کے یہاں یہ ہے کہ اگر ایک سجدہ چھوٹ جائے تو نماز فاسد نہ ہوگی بلکہ ناقص ہو جائے گی۔ شیعوں کے یہاں سجدہ رکن نماز ہے۔ اگر وہ چھوٹ گیا تو نماز ہی گئی۔

میں اس مسئلہ میں شیعوں کے مسئلہ کا قائل ہوں۔ سنیوں کے ساتھ نماز پڑھنے میں جس دن امام سے ایک سجدہ چھوٹ جائے گا اس دن وہ نماز میں پھر سے پڑھ لوں گا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ) دوسری رکعت میں شیعہ ہاتھ اٹھا کر قنوت پڑھتے ہیں۔ میں جب سنیوں کے ساتھ نماز پڑھتا ہوں تو قنوت نہیں پڑھتا۔ کیونکہ میرے خیال میں قنوت نہ پڑھنے سے صرف ایک مستحب چھوٹ جاتا ہے نماز باطل نہیں ہوتی۔ اسی طرح سے پہلی اور تیسری رکعت میں سجدہ سے اٹھ کر بیٹھے بغیر سیدھا کھڑا بھی ہو جاتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ قعود کا حکم دوسری اور چوتھی رکعت میں بیٹھنے سے پورا ہو گیا۔ حالانکہ ان دونوں معاملات میں شیعوں کے موافق احادیث صحیح بخاری تک میں موجود ہیں۔ مگر خیر۔ یہ کتاب مناظرہ کے اوپر نہیں لکھ رہا ہوں۔ میں تو اسلام میں افتراق کا ماتم کر رہا ہوں "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا" کی آیت پڑھ پڑھ کر اپنے دل کی تقویت بہم پہونچا رہا ہوں۔

سنیے حضرات! نماز وغیرہ کے مسائل میں جہاں سنی شیعہ کا اختلاف ہے وہاں میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کی بات کے مقابلے میں جناب سیدہ۔ علی اور حسنین روحی لہم الفداء ہی کی باتوں پر عمل کروں گا۔ ان حضرات کے اچھے ہونے میں شک نہیں۔ مگر یہ لوگ اطہر الطاہر البحر الذاخر العلم الظاہر المنصور المؤید۔ مولانا و سیدنا محمد ابن عبد اللہ خیر خلقہ و اشرف بریہ روحی لہم الفداء صلی اللہ علیہ وآلہ الاطہار و علی اصحابہ الاخیار کے گود کے پالے نہیں تھے۔ جب میں یہاں تک کہنے پر تیار ہوں تو اس شرع پر کہاں چل سکتا ہوں جس کی تدوین حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ نے کی ہو۔

میرے پڑھنے والو۔ ایک تھے ہارون موسیٰ اور ایک تھے ہارون محمدؐ۔ ہارون موسیٰ نے تفرقہ بچایا، اور ہارون محمدؐ نے بھی مدۃ العمر تفرقہ بچایا۔ اور گو دفاع کی لڑائیاں ان کو بھی لڑنا پڑیں مگر کوئی دشمن بھی یہ نہ کہہ سکا کہ علی نے کبھی آگ لگائی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے ایک ہونے کی آرزو رکھتا ہوں اور جہاں تک ہو سکا ہے عملاً بھی اس پر کاربند رہا ہوں۔ سخت عبرت کی بات ہے آج تیرہ سو اکسٹھ برس سے ہزاروں ہزاروں کتابیں افتراق کا خلیج بڑھانے کے لیے لکھی گئیں۔ مگر ایک بھی تحریر ایسی نہ دیکھی یا سنی جس میں مختلف فرق اسلام کو قریب لانے کی کوشش کی گئی ہو۔ مہد سے لے کر لحد تک کچھ اس طرح کی تعلیم ہوتی ہے کہ سڑک پر چلتا ہوا مسلمان اکثر پہچان لیا جاتا ہے کہ اپنے فرقہ کا ہے یا غیر کا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ آیتوں کی تاویل اور راویوں کی بھرمار نے قرآن کو اگر صورتاً نہیں تو معناً ضرور بدلنے کی کوشش کی ہے مگر "انا لہ لحافظون" فرمانے والا حفاظت کرے گا۔ "ھو الذی انزل علیک الکتاب سورۂ آل عمران کے پہلے رکوع میں ہے "اے محمد۔ اس نے تجھ پر یہ کتاب (قرآن) اتاری ہے۔ جس میں محکم آیتیں ہیں۔ جو اصل کتاب ہیں اور دوسری مبہم محتمل المعنی بھی ہیں لیکن جن کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ بڑھانے اور تاویل کرنے کو مبہم آیتوں کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ اس کی تاویل اللہ کے سوا دوسرے کو معلوم نہیں ہے اور بڑے پکے علم والے کہتے ہیں "ہم اس پر ایمان لائے ہیں۔ یہ سب کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہے" اور سمجھانے سے وہی سمجھتے ہیں جن کو دانش ہے"۔ اس آیت میں اگر وقف "اللہ" پر رکھیے جیسا کہ قرآن میں ہے یا وقف "راسخون فی العلم" پر کریے جیسا کہ مجاہدؒ وغیرہ اور شیعہ مفسرین کہتے ہیں۔ تو تخفیف سے معنی بدل جاتے ہیں۔ اگر وقف "فی العلم" پر کرو تو معنی حسب ذیل ہو جائیں گے۔ "حالانکہ اس کی تاویل اللہ اور بڑے پکے علم والے (ائمہ) کے سوا دوسرے کو معلوم نہیں"۔[۱]

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے لیے صرف آیات محکمات ہی خدا کے سامنے باسلوب نیک پہنچانے کو کافی ہیں۔ متشابہات کے معنے سے جو واقف ہوں وہ ان کے لیے ہے۔ متشابہات اگر صرف حروف مقطعات ہی ٹھہرائے جائیں تب تو غنیمت ہے۔ مگر محتمل المعنی آیات میں علاوہ حروف مقطعات کے اور آیتیں بھی شامل ہو گئی ہیں جیسے وضو میں پاؤں دھونے یا پاؤں پر مسح کرنے کی آیت ہے یا جس طرح اسی آیت میں وقف اللہ کے بعد کرنے پر یا وقف راسخون فی العلم کے بعد کرنے سے یا "اوحی ما اوحیٰ"۔

کوئی ان گہرائیوں تک میں نہیں پہونچ سکتا۔ لیکن اتنا دیکھتا ہوں کہ اگر آیات محکمات پر ہی نظر رکھی جائے

---

[۱] دیکھو قرآن عبداللہ یوسف علی کا حاشیہ

تو فرقہ بندی معدوم ہوجائے۔ کسی ایک فرقہ کو موردِ الزام ٹھہرانا بھی بُرا معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ جتنے فرق ہیں "وابتغاء الفتنۃ" میں آلودہ معلوم ہوتے ہیں۔ اور اگر فرقہ وارانہ مناظرہ پر مدار رکھا جائے تو بجائے طے ہونے کے ڈر ہے کہ دو ایک فرقہ اور نہ بڑھ جائیں تو تعجب نہیں۔ سیدھے سیدھے احکام جو کلام پاک میں ہیں وہی ہماری زندگی کو بہ اسلوب نیک پار کر دینے کو کافی ہیں۔ بشرطیکہ توفیقِ خدا شاملِ حال ہو۔ جیساکہ میں ایک دوسری جگہ عرض کرچکا ہوں' تولنے میں ڈنڈی نہ مارو۔ جھوٹی گواہی نہ دو۔ کافر اور مسلمان کے درمیان میں بھی فیصلہ کرنے میں انصاف کو ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ پڑوسی کے حقوق برقرار رکھو۔ لڑو۔ صلح کرو۔ معاف کردو۔ سخاوت کرو۔ اصراف نہ کرو۔ نماز پڑھو۔ روزہ رکھو۔ ہر بڑے گناہ سے بچتے رہو۔ چھوٹی چھوٹی غلطیاں انشاء اللہ تعالیٰ خدا معاف کردے گا وغیرہ وغیرہ۔ قرآنِ شریف کی گہرائیوں کا پایا جانا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ آپ محکمات پہ عمل پیرا رہیں۔ قرآنِ شریف کو سمجھ کر پڑھتے رہیں تو کچھ گہرائیاں بھی معلوم ہو جائیں تو تعجب نہیں۔ آپ نے گلستاں بچپن میں پڑھی تھی۔ آج دنیا کے تجربہ کے بعد پھر اس کو پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ اب سمجھ میں زیادہ آتا ہے۔ اسی طرح قرآنِ شریف کو پڑھتے رہیے۔ دیکھیے پردے کے بعد پردے اُٹھتے جاتے ہیں کہ نہیں۔ قرآنِ شریف کے لفظوں سے ممکن ہے یہی مطلب ہو جیساکہ عبداللہ ابن یوسف علی وغیرہ کہتے ہیں۔ اگر اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہو جیساکہ مولانا روم کہتے ہیں یعنی قرآن کے سات بطون ہیں، اور جیساکہ امام جعفر صادق علیہ السّلام کے لیے یا ان کے شاگردان۔ اہل صوفیہ کے لیے دعویٰ کیا جاتا ہے (اللہ جن کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے) تو ہم اس سے انکار نہیں کرتے۔ مگر ہم ایسے دنیا داروں کے لیے یہی کافی ہے جو محکمات میں ہے۔ ہمارے ایسے جاہل کا مشورہ کیا۔ مگر ہزار بات کی ایک بات عرض کردوں۔ قرآن پڑھتے جایئے۔ سب مسائل آپ ہی حل ہوتے چلے جائیں گے۔ صرف ایک بات اور عرض کردینے کو دل چاہتا ہے۔ اگر کوئی آپ سے کہے کہ ہم "بطون" والی بات سمجھ گئے ہیں یا فلاں بزرگ سمجھ گئے ہیں اور ہم کو بتا گئے ہیں تو آپ ذیل کی آیت کی فوراً تلاوت شروع کردیجیے[1]: "اپنے غیب پر وہ کسی کو اطلاع نہیں دیتا۔ مگر ہمارے علما تو کھلی کھلی آیتوں کے وہ معنے بیان فرماتے ہیں کہ آنکھیں کھل جاتی ہیں اور آدمی دنگ رہ جاتا ہے ؎

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر
کرچاہیں تو قرآں کو بنا دیں ابھی پاژند

"والذین معہ اشداء علی الکفار" کی مرثیے دار تفسیر کا ذکر میں پہلے کرچکا ہوں۔ ایسے مجھ سے تو دبی

---

[1] سورۂ جن۔ آیۃ ۲۶، ۲۷، "علم الغیب فلا یظھر علیٰ غیبہ احداً[26] الا من ارتضی من رسول فانہ یسلک من بین یدیہ ومن خلفہ رصدا"[27]

زبان میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ "بلغ ما انزل علیک" کے آخر میں "فی علی" تھا۔ جس قرآن کے لیے کہا گیا ہو "انا له لحافظون"[1] جس قرآن کی ذمہ داری اپنی خلافت ظاہری میں جناب امیر علیہ السلام نے قبول کر لی ہو اس میں "فی علی" جوڑنا یہ منطق داں ہی کر سکتا ہے۔ یہ دلیل کہ ان کے خود کے معاملے میں "فی علی"[2] اترا تھا اس لیے وہ "طرح دے گئے" یعنی امامت کو جو اصول دین میں شمار ہوتی ہے اور جو خدا کے یہاں سے جزو ایمان مقرر ہو چکا ہے اس میں جناب امیر علیہ السلام نے نعوذ باللہ کمی کی اور دین خدا کو ازراہ انکسار ناقص چھوڑ دیا تو یہ ایسی بات ہوئی کہ نبی صلعم درود کا حکم جس میں ان کا نام ہے اور ازراہ انکسار چھوڑ جاتے۔ یہ وارث علوم نبوی کے لیے میرے وہم میں بھی نہیں آ سکتا۔ میرے علی تو یہ نہ کر سکتے تھے۔ جس علی کو آیت مباہلہ میں انفسنا کا لقب عنایت ہو۔ جو روزہ رکھ کر اللہ کی محبت میں مسکین یتیم اور اسیر کو اپنا کھانا دے دے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نسبی اور روحانی بھائی قرار دیا جائے، جو فقراء کا بادشاہ تسلیم کیا جائے۔ وہ قرآن کو معلمہ ناقص چھوڑ جائے۔ میری سمجھ سے تو باہر ہے۔ شیخ صدوق[2] علیہ الرحمۃ جیسا متبحر عالم وہ بھی اس کا دعویٰ نہیں کرتے ہیں کہ فلاں چیز موجودہ قرآن پاک سے نکال ڈالی گئی ہے۔

تعزیہ داری کے اوپر میں افراط گریہ کے دیباچہ میں لکھ چکا ہوں۔ یہاں صرف اس قدر مجھے عرض کر دوں کہ تعزیہ رکھنا صرف ہندستان ہی میں رواج پایا۔ حالانکہ عزائے حسین سب ملکوں میں رائج ہے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کیا بتائی جائے کہ ہماری نانیاں دادیاں جو ہندو طبیعت کی بیبیاں تھیں ان کی طبیعت کو اس سے مناسبت تھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ بت پرستی ہے اور نہ کوئی مسلمان تعزیہ کو پوجتا ہے۔ لیکن جو اہتمام اور احترام تعزیہ کا ہوتا ہے اس میں شاید کچھ جھول سی اس کی آ جاتی ہے۔ میرے بچپن میں عام طور سے دیکھا جاتا تھا کہ مجتہدین کے گھروں میں تعزیہ داری کا رواج کم تھا۔ انہیں شرعی احتیاطوں کی وجہ سے علماء سوز بھی نہیں سنتے تھے جو کم و بیش آج تک باقی ہے۔

○

حضرات کیا کروں۔ جن چیزوں پر یقین صرف ۵۱ سیکڑا ہے اس کو سو سیکڑا یقین کے نام سے ظاہر کرتا

---

[1] تجرید البخاری حصہ دوم۔ روایت ۵۵۵۔

[2] ترجمہ خصال شیخ صدوق رح: صفحہ ۱۰۲ جلد ۳۔ آنچہ بے تردید معتوں گفت اینست کہ قرآنے را کہ علی جمع و کرد۔ ہمار وش درست پیغمبر را دارا بود ولے در اثر اختلاف مردم و کنار کردن آنحضرت از مقام خلافت مورد عمل مسلمانان واقع وشد۔ و چون مردم از قبول آں۔ و برتافتند آنرا در خاندان خود بہ امانت سپرد تا قائم آل محمد آنرا ظاہر سازد۔ وآیا اختلاف آں با قرآن کہ بہ نظر خلفائے وقت جمع گردید و بخط عثمان رض تحریر شد۔ تا چہ اندازہ است درست معلوم نیست

ہوں. جن چیزوں کا یقین ۹۹ سیکڑا ہے ۔ ان کو اس طرح ظاہر کرتا ہوں گویا سو سیکڑا بے یقینی ہے. خود اپنے عقیدے کا یہ حال ہے اور دوسروں کو یقین کا سبق پڑھانے چلا ہوں خدا مجھ پر رحم کرے مگر کیا کروں جس گروہ میں پیدا ہوا. جس گروہ میں پروان چڑھا ہوں اس کی محبت دل سے نہیں نکلتی ہے. اس کمبلی کو چھوڑتا ہوں مگر یہ کملی مجھ کو نہیں چھوڑتی۔ اس طرح کی باتیں جب سنتا ہوں دل پر ایک اذیت کی عجیب کیفیت گذرتی ہے ۔ خلافت کے معاملے میں شیعوں کا مقدمہ ایسا اچھا تھا مگر خود شیعہ حضرات نے اس کو خراب کردیا. اگر خلافت من اصد- تبرا. اور غیبت امام کو نکال ڈالتے تو آج بھی شیعوں کا مقدمہ عدالت عقل و انصاف کے سامنے کمزور نہیں ہے . اگر حضرات شیعہ عزاداری کو حدود کے اندر رکھیں تو آج بھی "واعتصموا بحبل اللّٰہ" تمام اہل اسلام کو طاقتور کردے۔

بے دولتی از نفاق خیزد — قوت ہمہ ز اتفاق خیزد

اس میں کلام نہیں کہ واقعۂ کربلا وہ عظیم مصیبت ہے جس کا اثر نہ مٹ سکتا ہے . اور نہ مٹانا چاہیئے ۔ یہ وہ مصیبت ہے جس کو سن کر انسان کیا پتھر پسیج جائے. بزرگوں کے کارنامے کبھی نہ بھولنا چاہیے . کیونکہ انسان تاریخ ہی پڑھ کر انسان ہوتا ہے . یہ بھی مسلم ہے کہ ع

"غم بڑا مدارک حقائق ہے"

مگر اس کو اس طرح کرنا کہ اس سے کینہ بڑھے ۔ اس امام ہمام کی تاسی تو نہ ہوئی! جس نے کربلا اور شام کے سفر کے بعد ثغور بلاد اسلامیہ کی حفاظت کی دعا مانگی. اس پیغمبر کی تاسی تو نہ ہوئی؟ جس نے ابوسفیان اور ہندہ جگر خوار کا اسلام قبول فرمایا

"اللّٰھم صل علیٰ محمد و آل محمد"

مذہبی نقطۂ نظر سے قطع نظر کر کے سیاسی پہلو سے بھی دیکھیئے تو سیاست میں حکمت عملی ہوتی ہے . اور سیاست نیک نیتی سے بھی ہو سکتی ہے جیسے رسول اللہ صلعم کی تھی. سیاست کے لئے کہا جاتا ہے کہ سیاست نہ دوست رکھتی ہے نہ دشمن بناتی ہے . اس کو اس طرح دیکھ لیجئے کہ ۱۹۴۷ء میں جو کچھ ہوا اس کو نہ تاریخ کبھی بھولے گی. نہ جن لوگوں نے وہ حالت دیکھی ہے . تا زیست ان کے زخم بھریں گے . مگر ہندوستان اور پاکستان اگر اسی اہمیت کا خیال تازہ رکھیں گے، تو آرام کی زندگی دونوں میں سے کسی کو نصیب نہ ہوگی ۔

شہدائے مذہب اور فدایان اُمت کا نام زندہ رکھنا بھی ہمارا فرض ہے ۔ ہمارا حق ہے . ان کا ذکر کر کے ، ان کے کارناموں کو سراہ کے اپنے پیشواؤں پر ناز کر کے اپنی انسانیت کو بلند کیجیے۔

سر دیدیا پہ بیعت فاسق نہ کی قبول — کیا بات ہے حسین تری آن بان کی

اس طرح مجلسیں منعقد کیجئے۔ اس طرح سے دین کی اشاعت کیجئے۔ اس طرح سے حسینؓ کی تاسی کیجئے کہ دیکھنے والا پھٹ سے کہہ دے کہ کس کا غلام ہے۔ ان کی قربانیاں بیان کر کے سنّی کو شیعہ کر لیجئے۔ وہابی کو شیعہ کر لیجئے۔ صوفی تو آدھا شیعہ پہلے ہی سے ہے۔ عیسائی کو شیعہ کر لیجئے۔ ہندو کو شیعہ کر لیجئے، اور پھر سب کو روحانی طواف کرا کے مسلمان کر لیجئے۔ ایسا کر دکھایئے کہ جنّت میں رسول اللہؐ امام حسینؓ سے فرمائیں۔ بیٹا تیری سعی مشکور ہوئی اور جناب احدیت میں فتح مکہ والی دعا پھر سے پڑھیں۔

لا اله الا الله وحده انجز وعده ونصر عبده واعز جنده اهزم الاحزاب عنده فله الملك وَلَهُ الحمد يحيي ويميت وهو على كل شئٍ قدير.

"یادِ احباب" کا بقیہ:۔

المکلف پر ختم تھا۔ اس کے بعد یگانگی کی حسب ذیل دو سطریں تھیں۔ مکرر آں کہ اگر آپ نہ آئیے گا تو مجھ کو شکایت نہ ہوگی۔ ہنسنے کو ہنس لیجیے مگر اسی جملے پر مجھ کو اپنے ایک دوست کا رقعہ یاد آگیا جو انھوں نے ایک ایسے ہی موقع پر لکھا تھا۔ بھائی محمد علی تم بہت دور پہاڑ پر ہو میں جانتا ہوں کہ تم کو آنے میں بہت زحمتیں ہیں۔ یہ رقعہ صرف اس واسطے بھیجتا ہوں کہ تم یہ نہ سمجھو کہ ایسی خوشی کے موقع پر میں تم کو بھول گیا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ ملاقات کے وقت میں نے حمد کا مطلب پوچھا۔

بابو صاحب۔ ایک دن کھدائے کے نام کی دعوت۔ ایک دن محمد کے نام کی اور ایک دن دنیا کے نام کی۔"

ایک طرف تو یہ حال تھا دوسری طرف پردے کو بالکل لغو جانتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اپنی قریب بجوانی لڑکی کو لڑکوں کی طرح دھوتی کرتا اور ٹوپی پہناتے تھے۔ جب میں نے دیکھا تو بال بھی نہ تھے۔ البتہ ایک انگوچھا گردن پر ڈالے رہتی تھی۔ چوں کہ وہ سینے تک نہیں پہنچتا تھا اس لیے شرم کی وجہ سے اس کے سرے دونوں ہاتھوں سے اکثر پکڑ لیتی تھی۔ اب ماشاء اللہ، بیاہی بال بچوں والی ہے۔ اس وقت بچہ ہی تھی مگر اس کی ۱۲ بور ۳۲ انچہ کی بندوق الگ تھی۔ میں نے اسی وقت کہا تھا اگر اس لڑکی کو ہسٹیریا کی بیماری ہو جائے تو جو جرمانہ کہو میں دوں۔

===== OOOOOO ====

چودھری محمد علی ردولوی

تیسری جنس

مدی کا اصلی نام احمدی خانم ہے۔ تحصیل دار صاحب پیار سے مدی مدی کہتے تھے۔ وہی مشہور ہو گیا۔ مدی کا رنگ بنگال میں سو دو سو میں اور ہمارے صوبے میں ہزار میں ایک تھا۔ جس طرح فیروزے کا رنگ مختلف روشنیوں میں بدلا کرتا ہے اسی طرح مدی کا رنگ تھا۔

تھی تو کھلتی ہوئی سانولی رنگت جس کو سبزہ کہتے ہیں۔ مگر مختلف رنگ کے دوپٹوں یا ساڑھیوں کے ساتھ مختلف رنگ پیدا ہوتا تھا۔ کسی رنگ کے ساتھ دمک اٹھتا تھا، کسی رنگ کے ساتھ تمتماہٹ پیدا کرتا تھا۔ بعض اوقات جلد کی زردی میں سبزی ایسی جھلکتی تھی کہ دل چاہتا تھا، دیکھا ہی کرے۔ شمع کی روشنی میں مدی کی رنگت غضب ہی ڈھاتی تھی۔ کبھی آپ نے دوسرے درجے کے مدقوق کو دیکھا ہے۔ اگر بیماری سے قطع نظر کیجیے تو رنگت کی نزاکت ویسے ہی تھی۔ آنکھیں بڑی نہ تھیں مگر جب نگاہ نیچے سے اوپر کرتی تھی تو واہ واہ معلوم ہوتا تھا مندر کا دروازہ کھل گیا۔ دیبی جی کے درشن ہو گئے۔ مسکراہٹ میں نہ شوخی نہ شرارت، بنوٹ کی شرم، لبھاوٹ کی کوشش۔ لکڑی لوہے کے قلم کو کیسے موقلم کر دوں کہ آپ کے سامنے وہ مسکراہٹ آ جائے۔

بس یہ سمجھ لیجیے کہ خدا نے جیسی مسکراہٹ اس کے لیے تجویز کی تھی وہی تھی۔ مدی اپنی طرف سے اس میں کوئی اضافہ نہیں کرتی تھی۔ اس کے کسی انداز میں بنوٹ نہ تھی۔ ہاتھ پاؤں، قد چہرے کے اعضا سب چھوٹے چھوٹے مگر واہ رے تناسب۔ آواز، ہنسی، چال ڈھال ہر چیز ویسی ہی۔ میں مدی سے بہت بے تکلف تھا۔ مگر عشاق میں کبھی نہ تھا، اور جہاں تک میں جانتا ہوں کوئی اور بھی نہیں سنا گیا۔ ایسی خوب صورت عورت بلا مرد کی حفاظت کے، زندگی بسر کرے اور عشاق نہ ہوں، بڑے تعجب کی بات ہے۔ مگر واقعہ ہے، ایک دن میں نے کہا مدی اگر ہم جادو گر ہوتے تو جادو کے زور سے تم کو تتلی بنا کر ایک چھوٹی سے ڈبیا میں بند کر کے اپنی پگڑی میں رکھ لیتے۔ اس فن شریف سے واقف کار حضرات جانتے ہیں کہ جو حربہ میں نے استعمال کیا تھا وہ کم خالی جانے والا تھا۔ مگر اس کے بھی جواب میں وہی بے تکلف مسکراہٹ کی ڈھال جو تلوار کا منہ توڑ دے۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اکثر خیال گذرتا ہے کہ یہ استغنا تحصیل دار مرحوم کی سفید داڑھی کے سائے میں پرورش پانے کا اثر ہے۔ مگر پھر عقل کہتی تھی کہ جوش حیات نے نہ معلوم کتنی سفید داڑھیوں میں پھونکا ڈالا ہے۔ وہ سفید داڑھی قبر میں پہنچ گئی اس کا اثر کہاں سے آیا۔ بہر حال قصہ سنتے جائیے اور رفتہ

رفتہ رائے قائم کرتے جائیے ۔ مدی کے ہر انداز میں نسوانیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی ۔ ایک بات البتہ تھی جو گو عورتوں میں بھی ہوتی ہے، مگر ہم ایسے بوڑھوا لوگ اس کو مرد ہی سے منسوب کرتے ہیں، یعنی اپنے، ہم طبقہ عورتوں میں اور اسی طبقے کے مردوں میں مدی حکومت خوب کر لیتی تھیں ۔ ہر شخص عورت ہو کہ مرد ان کا تابع فرمان رہتا تھا، اور ان کے اشارے پر چلنے کو تیار ۔ اب شروع سے قصہ سنیے، تحصیل دار صاحب کا نام کیا کہیے گا جان کر مرحوم بڑے اچھے آدمی تھے ۔ مگر بے عیب خدا کی ذات، کچھ خاص خاص کمزوریاں کہی جاتی تھیں ۔ پرانی وضع کے لوگ تھے ۔ بڑی شان سے تحصیل داری کی ۔ لاکھوں کمائے اور ہزاروں اڑائے مگر اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ان کی زندگی کچھ بے مرکز سی ہو گئی تھی ۔ بی بی بہت دن ہوئے مر چکی تھی ۔ کوئی قریب کا عزیز بھی نہ تھا ۔ صرف ایک نوکر تھا وہی سیہ سپید کا مالک تھا ۔ تنخواہ اسی کے ہاتھ آتی تھی اور جب پنشن ہوئی تو پنشن کا بھی وہی حق دار ٹھہرا ۔ میاں کے کپڑے اور کھانا بھی میاں حسن علی ہی پسند کرتے تھے ۔ حسن علی کسی کام کو بازار گئے ۔ دو تھان رادھانگری ڈوریے کے لیے چلے آتے ہیں ۔ میاں کے کرتے بنیں گے مگر میاں کو اس وقت خبر ہوئی کہ جب درزی قطع کرنے گا ۔

"ارے میاں حسن علی، یہ ڈوریہ کیا لائے ہو؟"

حسن علی: "آپ کے کرتوں کے لیے ۔ ڈوریہ وضع دار ہے ۔ سلنے پر اور کھلے گا ۔"

کھلے گا تو مگر کرتے تو میرے پاس تھے ۔ ابھی اس دن شربتی لے آئے ۔ آج ڈوریہ لیے چلے آتے ہیں آخر پوچھ تو لیا ہوتا" ۔

"پوچھ کے کیا کرتا ۔ آپ ہی تو کہتے کہ رہنے دو گھر میں ایک چیز ہو گئی ۔ برسات کا زمانہ ہے ۔ دھوبی دیر میں آیا کرے گا ۔ دو جوڑے فاضل اچھے ہوتے ہیں ۔"

"خیر بھئی!"

تحصیل دار کھانے پر بیٹھے ہیں ۔ "میاں حسن علی آج کل بازار میں مچھلی نہیں آتی ۔"

"آتی تو ہے مگر گرمیوں کی وجہ سے میں نے نہیں منگوائی ۔ اس فصل میں مچھلی نقصان کرتی ہے، صبح کو مرغ پک جائے گا ۔" تحصیل دار صاحب پر حسن علی کی شخصیت ایسی غالب آئی تھی کہ جو بات وہ پسند کرتے تھے تحصیل دار سمجھتے تھے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے ۔ اسی وجہ سے غیر ذمہ دار لوگ دونوں کا ذکر کر کے مسکراتے تھے اور آپس میں آنکھیں مارتے تھے ۔ میاں حسن علی کا استرے سے صفاچٹ چہرہ اور تحصیل دار صاحب کی بھبو داڑھی پر چہ میگوئیاں ہوتی تھیں ۔ داڑھی مونچھوں کا صفایا صرف انگریزی داں حضرات کا حق ہے ۔ اگر حسن علی ایسے اپنی چال چھوڑ کر ہنس کی چال چلیں گے تو اللہ ہی نے کہا ہے لوگ کوئی نہ کوئی نئی نکالیں گے ۔

بہر حال اصلیت کی خبر خدا کو ہے ۔ ہم تو جو کچھ بھی دیکھتے تھے، وہ یہ تھا کہ تحصیل دار کا ہمدرد دنیا جہاں میں حسن علی کے علاوہ کوئی نہ تھا حسن علی کو بھی اس سے اچھا آقا اگر چراغ لے کر

ڈھونڈتے تو نہ ملتا۔

اللہ میاں نے دو جنس بنائی تھیں ۔ عورت اور مرد یورپ کے ڈاکڑوں نے تحقیقات کرکے ایک اور جنس ایجاد کی ہے جو اپنے ہی جنس کی طرف راغب ہو ۔ اس جنس میں عورتیں بھی شامل ہیں اور مرد بھی ۔ اب نہ معلوم تحصیل دار اور حسن علی اس تیسری جنس میں سے تھے یا دیسے ہی تھے جیسے ہم آپ یا بعد کو کچھ ادل بدل ہوئی ۔ اس کو نہ ہم جانتے ہیں نہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں ۔ وہ جانیں اور ان کا کام ۔ بظاہر ان دونوں کے افعال سے دوسروں کی سماجی زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا ۔ اس لیے ہم کو کھوج کی کوئی ضرورت بھی نہیں معلوم ہوتی ۔ تحصیل دار صاحب بھاری بھر کم آدمی تھے ۔ اولاد نہ ہونے کا دکھڑا کیا روتے مگر اولاد کی تمنا اس بات سے ظاہر ہوتی تھی کہ جب کھانا کھاتے تو حسن علی احمدی کو بلوا بھیجتے تھے کہ دسترخوان پر بیٹھ جائے ۔ اسی وجہ سے کھانا تنہائی میں کھانے لگے تھے ۔ نوکر کی لڑکی کو دسترخوان پر کھلاتے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا ۔ اس کے علاوہ اگر سب کے سامنے کھلاتے تو صاحب اولاد نہ ہونے کا رنج اور بچوں کی تمنا لوگوں پر کھل جاتی ۔ بی احمدی خانم عرف مدی بیگم کا سن چار برس کا رہا ہوگا ۔ دسترخوان پر شوربا گرانا ۔ لقمہ ڈبونے میں دال کا پیالہ گھنگول دینا بچوں کا شیوہ ہے ۔ اور نفیس لوگ اسی وجہ سے بچوں کو الگ کھلاتے ہیں ۔ گو کہتے یہی ہیں کہ جوانوں والا کھانا بچوں کو نقصان کرتا ہے ۔ مگر تحصیل دار صاحب کو اس میں لطف آتا تھا ۔ ادھر دسترخوان پر بیٹھے اور ادھر ہی مدی کی طلب ہوئی رفتہ رفتہ مدی خود وقت پہچان گئیں ۔ تھوڑے دنوں میں مدی تحصیل دار صاحب ہی کے یہاں رہنے لگیں ۔ یا گھر میں ایک طرف چھوٹا بھیا اور بیچ میں حسن علی کی بی بی تھیں یا ان کی پلنگڑی الگ بنی ۔ صاف چادر لگائی گئی ۔ چھوٹے چھوٹے تکیے بنوائے گئے ۔ تحصیل دار صاحب کے پاس ان کی بھی پلنگڑی بچھنے لگی ۔ جوتے قرینے رہنے کی تاکید ہوئی کہ بچھونا میلا نہ ہو ۔ لڑکی تھی پیدائشی سلیقہ مند ۔ ایک بار سے دوسری بار بتانے کی ضرورت نہیں ہوئی تھی ۔ پانچ چھ ہی برس کے سن میں ایسا سلیقہ آگیا کہ آدھی بی بی معلوم ہوتی تھیں ۔ تحصیل دار صاحب کے پان خود بناتی تھی ۔ دس گیارہ برس کے سن میں جنس تلوانا، کھانا پکوانا، سب کچھ مدی کے ہاتھ ہو گیا تھا ۔ دن جاتے کچھ دیر نہیں لگتی ۔ چودھویں برس مدی کا شباب دمک اٹھا ۔ دیکھنے والوں کا دل چاہتا کہ دیکھا ہی کریں ۔ مدی بھی جب بال بنانے کھڑی ہوتی تھی تو آئینے کے ساتھ خود بھی متحیر رہ جاتی تھیں ۔ اب ماں کو شادی کی فکر ہوئی ۔ تحصیل دار صاحب کو کہا گیا ۔ انھوں نے کہا جلدی کیا ہے ہو جائے گی ۔ مگر لڑکی حسن علی کے بھتیجے کو بچپن ہی سے مانگی تھی ۔ ادھر سے بھی اصرار ہوا کہ جوان لڑکی کا امیروں کے گھر میں رہنا اچھا نہیں لیجیے صاحب شادی ہو گئی ۔ تحصیل دار صاحب نے خود تو اپنے گھر سے شادی نہیں کی، مگر جہیز وغیرہ خوب سا دیا ۔ چوتھی چالے کے بعد پھر وہی تحصیل دار صاحب کے یہاں کا رہنا ۔ مدی کے دولھا بھی تحصیل دار صاحب کے یہاں آتے تھے ۔ مدی سسرال کم جاتی تھی ۔ گئیں بھی تو کھڑی سواری، بہت

رہیں تو ایک رات نہیں تو اسی دن واپس آگئیں۔ سسرال والے جاہل، شوہر بھی الف کے نام لٹھا نہیں جانتے۔ گو مدی بھی بغدادی قاعدہ اور عم کے سپارے کے آگے نہیں پڑھی تھیں مگر پھر بھی پڑھے لکھے ہوئے کی پالی ہوئی تھی۔ عمر بھر امیری کارخانہ دیکھا تھا مدی کا دل سسرال میں کم لگتا تھا۔ کم سنی میں بیاہ کا تجربہ کچھ اچنبھے میں ڈالے تھا۔ شادی کے بعد اگر عورت پر کنوارپنے کی آب نہیں رہ جاتی تو سہاگ کی رونق چہرہ چمکا دیتی ہے۔ مگر احمدی کے چہرے سے نہ اس بات کا پتہ چلتا تھا نہ اس کا۔ میاں بیوی کے برتاؤ کا حال دو چار دن میں کیا کھلتا۔ مگر کسی خاص خوشی یا اطمینان کا اندازہ اس میں بھی نہیں دکھائی دیتا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں یہ بھی نہ رہ گیا اور کھلم کھلا ناخوشی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ شوہر صاحب کچھ دبے دبے سے تھے۔ تحصیل دار صاحب کے یہاں آکر وہ بھی اپنی شوہریت کا برتر درجہ برت نہیں سکتے تھے۔ خود اپنی ہیچ میرزی اور بی بی کی بلندی ان کی نظر میں کھٹکتی تھی۔ ضرورتیں مجبور کرتی تھیں نئی نئی بی بی، کچھ روپیہ پیسہ بھی ہاتھ آجاتا تھا۔ اس لیے چپ تھے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ مدی جو سو کر اٹھیں تو ایک چھلا غائب۔ بستر پر ادھر ادھر دیکھا، دلائی جھاڑی، پائنتی جھک کے دیکھا، گھر میں ادھر ادھر تلاش کیا مگر کہیں نہ ملا۔ نہ معلوم کیا سمجھ کر چپ ہو گئی۔ دوپہر کے قریب ماں سے آکر کہا۔ ماں نے شور مچادیا۔ تحصیل دار صاحب تک خبر ہوئی انھوں نے سنتے ہی کہہ دیا کہ یہ حرکت سوائے مدی کے دولھا کے اور کسی کی نہیں ہو سکتی یہ بھی کہا کہ اس کے جوا کھیلنے کی خبر بھی مجھ تک پہنچ چکی ہے۔ لیجیے صاحب شوہر بھی روٹھ گئے۔ دو چار دن کے بعد رخصتی کا اصرار ہوا۔ مگر چھرے والی بات پکڑ کر مدی کے ماں باپ نے انکار کر دیا۔ ایک روز مدی کے شوہر نے حسن علی کے گھر آکر بہت سخت سست سنایا، اور غصے میں یہ بھی کہا کہ حرام زادی کو جھونٹے پکڑ کر گھسیٹتا نہ لے جاؤں تب ہی کہنا۔ اس وقت تک مدی نے کسی کی جانب داری نہیں کی تھی لیکن اب وہ بھی فرنٹ ہو گئی۔ اور ایسی فرنٹ ہوئی کہ مرتے دم تک پھر منہ نہ دیکھا۔ حسن علی نے بھی خیال کیا، داماد ممکن ہے کچھ شہدا پن ہی کر بیٹھے اس لیے مدی کا پورے طور سے تحصیل دار صاحب ہی کے یہاں رہنا اچھا ہے۔ شوہر صاحب ہمیشہ کے لیے معطل کر دیے گئے۔

جب سے مدی کی شادی ہوئی تھی۔ تحصیل دار صاحب کچھ چپ سے رہتے تھے اس واقعے کے بعد وہ بھی بحال ہوگئے۔ مدی کے شوہر نے اپنی مفاہمت سے یہ بھی کہا کہ تحصیل دار صاحب نے اس سے آشنائی کر رکھی ہے مگر اس کو کون باور کرتا۔ حسن علی والی بات پر تو لوگ ہنسی مذاق بھی کرتے تھے۔ مگر اس بات کو کسی نے جھوٹوں بھی یقین نہ کیا۔ البتہ تحصیل دار صاحب تجربہ کار آدمی تھے انھوں نے موت زندگی کا خیال کر کے مدی کے لیے علاحدہ گھر اور کچھ بود گی کا انتظام کرنا شروع کیا۔ اس واقعے کے دوسرے سال کے اندر تحصیل دار صاحب کا انتقال ہو گیا۔ تحصیل دار صاحب مرحوم کے یا تو کوئی نہیں تھا یا یکبارگی نہ معلوم کتنے وارث پیدا ہو گئے اور آپس میں مقدمہ

بازی شروع ہو گئی ۔ بی مدی نے بھاری پتھر چوم کے چھوڑا ۔ اٹھ کر اپنے گھر چلی آئیں ۔ تخت ، چارپائیوں ، الماریوں پر نہ ان کا حق تھا نہ انھوں نے دعویٰ کیا ۔ نقد جو کچھ تحصیل دار صاحب ان کو دے گئے ہوں کون لے سکتا تھا ۔ ہاتھ ناک ، گلے میں جو کچھ تھا وہ ان کا تھا ہی ۔ مدی نے حسن علی کی صلاح سے یہ طریق اختیار کیا کہ اپنے طبقے سے اونچی ہو کر رہنا پسند نہ کیا بلکہ جس حیثیت کے لوگ ان کے ماں باپ تھے اسی برادری میں رہیں ۔ البتہ روپیہ پیسہ اور سلیقہ ہونے کی وجہ سے اپنے طبقے میں یوں رہیں جیسے مالی کی نگاہ میں سب پھولوں میں گلاب کا پھول ہوتا ہے ۔

تحصیل دار صاحب کے سال ہی بھر بعد طاعون بڑے زوروں کا پڑا ۔ اس میں میاں حسن علی اور ان کی بی بی بھی چل بسیں ، اب صرف بی مدی اور ان کا چھوٹا بھائی رہ گئے ۔

اس وقت تک مدی نے جو کچھ اچھا برا کیا ہو گا اس کی ذمہ داری صرف ان کے اوپر نہ تھی کیوں کہ ہر معاملے میں تحصیل دار مرحوم اور اس سے کم درجے تک ان کے باپ کی رائے شامل رہتی تھی ۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آیا وہ البتہ ان کے دل و دماغ کا نتیجہ تھا ۔ مدی کا برتاؤ ہر شخص سے عمدہ تھا ۔ کوئی شاکی نہ تھا بلکہ اڑوس پڑوس کی عورتیں ہر وقت ان کے گھر میں موجود رہتی تھیں ۔ ان سے بھی جو ہو سکتا تھا آنے جانے والیوں کے ساتھ سلوک کرتی تھیں ۔ گھر میں کپڑا سینے کی مشین تھی ۔ دن بھر لوگوں کے کپڑے مفت سیا کرتی تھی ۔ کسی کو اگر روپے دو روپے کی ضرورت ہوتی وہ بھی قرض کے نام سے دے دیے ۔ جس کسی کا کہیں ٹھکانہ نہ لگے وہ مدی کے یہاں چلا آئے ۔ روٹی اپنی پکائے دال بی مدی سے لے لے ۔ پان پتا بھی بی مدی کے پاندان سے کھائے ۔ اسی زمانے میں ایک عورت نہ معلوم کہاں کی باہر سے آئی ۔ اس کو بھی مدی نے رکھ لیا ۔ عورت سلیقہ مند تھی ۔ اپنا بار بھی ان پر نہیں ڈالتی تھی ۔ بلکہ پیسے دو پیسے کا سلوک خود ہی کر دیتی تھی ۔ کچھ انگوٹھیاں ، کچھ کیلیں ، لیس ، صابون وغیرہ بیچتی تھیں ۔ صبح ہوئی اور برقع اوڑھ کر نکل گئیں ۔ دوپہر کو آئیں ، کھانا کھایا ، آرام کیا ، اس کے بعد پھر نکل گئیں ۔ شام کو لوٹیں ۔ یہ مسماۃ آئی تھیں تو یہ کہہ کر کہ دو چار دن میں سودا کر کے دوسری جگہ چلی جائیں گی ۔ مگر مدی سے کچھ ایسی پر گت ملی کہ گھر کی طرح رہنے لگیں ۔ محبت ویگانگی کی وہ پینگیں بڑھیں کہ سگی بہنیں مات تھیں ۔ صورت شکل کی تو معمولی تھیں مگر قد کشیدہ تھا ۔ جب برقع اوڑھ کر راستہ چلتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ مرد بھیس بدلے ہوئے چلا آتا ہے چال ڈھال قد کے علاوہ بھی کچھ اور باتیں مردوں کی ایسی تھیں مثلاً ہاتھ پاؤں کے دیکھتے سینہ کم تھا ۔ کمر ، کولھے ، پاؤں کی چوڑی چوڑی ایڑیاں بھی عورتوں کی ایسی نہ تھیں ۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ ہو گیا کہ دن کو ویسا ہی مجمع رہتا تھا مگر رات کو دوسری عوتیں کم رہنے لگیں ۔ جب منہ نہیں پایا تو پرائے گھر میں کیسے ٹھہرتیں ۔ پہلے تو عورتوں میں سرگوشیاں ہوئیں پھر محلے میں ہر شخص اسی کا ذکر کرنے لگا ۔ مگر مدی اور اس عورت نے بجائے تردید کرنے کے ایک آزادانہ بے پروائی کا انداز اختیار کر لیا ۔ ان عورتوں نے کہا ہم لوگ کسی کی بہو بیٹی ہیں

یا پھر سے نکاح کرنا ہے جو ہر شخص کے آگے قسمیں کھاتے، قرآن اٹھاتے پھریں۔ دنیا اپنی راہ، ہم اپنی راہ۔ مدی نے کہا اگر ہمارے کوئی والی وارث ہوتا تو کسی کی مجال پڑی تھی کہ ایسی بات کہتا۔ زمانہ گذرتا گیا اور لوگوں کا شک یقین میں بدلتا گیا۔ قاعدہ ہے کہ بیچ برادری سے اگر دب جاؤ تو وہ اور دباتے ہیں۔ اگر مقابلے پر تیار ہو جاؤ تو لوگ اپنی نیکی کی وجہ سے اکثر معاف بھی کر دیتے ہیں۔ یہی حال ان دونوں کا ہوا کہ نہ کسی نے پوچھ گچھ کی نہ انھوں نے انکار کی زحمت اٹھائی۔

لکھنے والے کو اغلام مساحقے کے ذکر میں کوئی مزا نہیں آتا۔ مگر اسی کے ساتھ ان چیزوں کا ذکر کرنے سے ڈرتا بھی نہیں۔ اگر یہ چیزیں دنیا میں ہوتی ہیں تو چپ رہنے سے ان میں اصلاح نہ ہوگی۔ نہ یہ طے ہو سکے گا کہ کہاں تک یہ چیزیں فطری ہیں، اور کہاں تک اسباب زمانہ سے پیش آتی ہیں۔ کسی جولاہے کے پاؤں میں تیر لگا تھا۔ خون بہتا جاتا تھا مگر دعائیں مانگ رہا تھا کہ اللہ کرے جھوٹ ہو۔

ہمارے قصبے کے لوگ دراصل ہیولاک ایلس اور فرائڈ نہیں پڑھے ہیں۔ اس وجہ سے مجبوراً ہمیں ان مسائل پر بحث کرنا پڑی۔

ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ ہر عورت میں کچھ جزو مرد کا ہوتا ہے اور ہر مرد میں کچھ جزو عورت کا۔ جو جزو غالب ہوتا ہے اسی طرح کے خیالات اور افعال ہوتے ہیں۔ مردانہ قسم کی عورتیں اور زنانہ قسم کے مرد ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ ممکن ہے بعض ان میں ایسے ہوں جن کے فطرتاً اپنے ہی جنس سے اچھے تعلقات معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ اسباب زمانہ سے بھی لوگ اس راہ لگ جاتے ہیں۔ بجائے اصلاح کی کوشش کے ہر معاملے میں یہی رائے قائم کرنا کہ یہ قدرتی تقاضے سے ہے اور اس لیے اصلاح کی ضرورت نہیں ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ البتہ ایسے فعل کی جس میں سماج کا کوئی نقصان نہ ہوتا ہو تو قانونی سزا ہونی چاہیے یا نہیں یہ دوسرا مسئلہ ہے۔

اچھا اب قصہ سنیے۔ مدی اور اس عورت سے دو سال دوستی رہی۔ اس کے بعد لڑائی ہو گئی۔ کس بات پر بگاڑ ہو گیا یہ کسی کو معلوم نہیں وہ عورت جس راہ آئی تھی۔ اسی راہ چلی گئی۔ بی مدی اجڑی بچڑی رنڈاپا کھینے لگیں۔ جو ئندہ یابندہ۔ تھوڑے دنوں کے بعد ایک اور ہم جنس مل گئیں۔ اس کے بعد اور بھی ملاکیں مگر۔

نہ بے وفائی کا ڈر تھا نہ غم جدائی کا
مزا میں کیا کہوں آغاز آشنائی کا

وہ پہلی سی بات پھر نہ نصیب ہوئی۔ اب روپیہ پیسہ بھی کم رہ گیا تھا اسی لیے آمدنی بڑھانے کی بھی فکر دامن گیر ہوئی۔ بی مدی نے تحصیل دار کے آگے ہاتھ بڑھایا نہ پھر سے شادی کی ہوس کی۔ بلکہ خود کام کرنے پر تیار ہو گئیں۔ پرانے کباب بنانا شروع کیے جاڑوں کی فصل میں

(بقیہ ص۵۲۵ پر)

چودھری محمد علی ردولوی

دھوکا

ناجو غریب کا بچہ تھی مگر پیدائش اچھی ہونے کی وجہ سے اپنی ساتھ والیوں سے بڑی معلوم ہوتی تھی۔ کیا کھایا کیا پیا مگر ہاتھ پاؤں ایسے تھے کہ دیکھنے والا جانے کہ دودھ ملیدے ہی پر پلی ہے۔ صورت پر بھی وہ شان تھی کہ شاہزادیاں شرما جائیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ جوانی پر آکر اگر تاج پہن لے گی تو بے جوڑ نہ لگے گا۔

کھیت میں ککڑی اور گھر میں لڑکی کی باڑھ مشہور ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بڑی سی ہو گئی۔ سات ہی آٹھ برس کے سن میں یہ حال تھا کہ ماں کے پہلو میں بیٹھتی تھی تو آدھی بی بی معلوم ہوتی تھی۔ باپ ناظمہ کہتے تھے ماں جب تک جئیں ناجو ہی پکارا کیں۔ گیارھواں برس رہا ہوگا کہ باڑھ پر آگئی۔ بارھویں برس بھرنا شروع ہوئی۔ تیرھویں برس ایسی ہو گئی کہ ماں باپ سے نگاہ بھر کے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ ماں کو بیاہ کی فکر پڑ گئی۔ اس زمانے میں بر بڑی بڑی امیرزادیوں کو نہیں جڑتا غریب کس کھیت کی مولی ہے۔ یہ جوانی یہ خوب صورتی دیکھ کر ماں باپ کی چھاتی پہاڑ ہو جاتی مگر یہاں نگاہ بھر کے دیکھنا مشکل تھا۔ باپ صرف اچٹتی نظر ڈال لیتے تھے ماں کہتی تھی دیکھتے ہو اب کیا کسر ہے۔ کچھ نسبت کی بھی فکر کرو گے کہ یہ کالا پہاڑ یوں چھاتی پر رکھا رہے گا۔

دیوانی عدالت کے منصرم صاحب کی دوسری بیوی کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ ہمدردوں نے جوڑ توڑ ملا کر شادی کروا ہی دی۔

منصرم صاحب کا سن چالیس کے لگ بھگ رہا ہوگا۔ چالیس بیالیس برس کا مرد بڈھا نہیں کہا جاتا۔ ان کی کاٹھی بھی اچھی تھی مگر پندرہ اور بیالیس میں اچھا خاصہ فرق ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ناجو نے ہم جولیوں میں بھی بیٹھ کر کبھی اپنے سن کی ایسی باتیں نہیں کیں۔ ہمیشہ بھاری بھرکم اپنے کو لیے دیے رہیں۔ سولہ برس کے سن میں بھی مزاج اور حوصلہ ۶۱ برس والی کا ایسا رہا۔

ایک بڑے بد صورت ادھیڑ میاں اور ایک خوب صورت کم سن بی بی راستے میں چلے جاتے تھے۔ بی بی نے ایک کتّے کی جوڑی دیکھی، جو دونوں ایک ہی طرح کے تھے۔ میاں سے کہنے لگیں ایسا جوڑ ملتے بھی کم دیکھا ہوگا۔ انھوں نے جواب دیا ساتھ رہتے رہتے پہلے خیالات اور پھر صورت ملنے جلنے لگتی ہے۔ بی بی کا جی دھک سے ہو گیا کہنے لگیں میری جان گیا، ہمیشہ یہی ہوتا ہے؟

منصرم صاحب شریف خصلت نیک نام آدمی مشہور تھے۔ گھر کے بھی خوش حال کے

جاتے تھے شاید تیسری شادی نہ کرتے مگر اولاد کی تمنا اور بیماری حیرانی میں، ہمدرد کی ضرورت نے مجبور کر دیا۔ لڑکی والوں کی فرض سے سبک دوشی حاصل کرنے کی مصلحت نے اس بن کے فرق کا زیادہ خیال کرنے بھی نہ دیا۔ حالاں کہ ناجو کی ماں ہی نے نسبت پسند کی تھی مگر اسی کے ساتھ تنہائی میں میاں سے دبی زبان بن کے فرق کا بھی ذکر کیا تو انھوں نے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ سب کچھ تو کسی کو نہیں ملتا۔ ناجو پھند ناسی دلہن بنیں دیکھ کر ماں باپ کا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ دو سوتوں کا گہنا پہن کر سونے میں گندھ گئیں۔ چاہنے والا میاں پایا۔ ہر طرح کا چین آرام ہاتھ آیا۔ منصرم صاحب بھی خوشی میں خضاب جلدی جلدی لگانے لگے۔ ناجو نے جانا دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ میاں بی بی کے راز پردے کی بات کسی کو کیا معلوم۔ مگر خدا کو دیکھا نہیں عقل سے پہچانا ہے۔ بن کے تقاضے سے شوخی اچپلاہٹ کا جواب شائستگی سے ملتا رہا ہو گا تو یقیناً ناجو اس کو بھی زندگی کے کھیل کے ضروری قاعدوں میں سمجھتی رہی ہوں گی۔ پیٹ کا ملا کر ناجو کی شادی پندرھویں سال ہوئی تھی زن جواں و مرد پیر سہد بیار و بچہ بگیر۔ ڈیڑھ برس میں ماں بھی بن گئیں مگر کیا بچہ ہوا جیسے چوہیا کا بچہ۔ پیدا ہونے کے بعد بڑی دیر تک تو رویا نہیں۔ لیڈی ڈاکٹر نے بڑی بڑی ترکیبیں کیں تب کہیں چیں چیں آواز نکلی اور پھر ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی۔ ناجو البتہ بہت دن بیمار رہیں۔ اس کے بعد ہمیشہ کے لیے قابلہ کی روزی کا سامان ہو گیا۔ مگر ناجو کے پھر بچہ نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ ناجو تیس اکتیس سال کی تھیں کہ رانڈ ہو گئیں۔ منصرم صاحب پنشن لے کر اپنے وطن چلے گئے تھے۔ تقریباً دو ہی برس آرام کیا تھا کہ دوامی آرام گاہ میں پہنچ گئے۔ ناظمہ بیگم کے ماں باپ پہلے ہی مر چکے تھے۔ اب منصرم صاحب بھی ختم ہو گئے۔ ناظمہ بیگم تن تنہا رہ گئیں۔ جائداد رکھ کر یکسوئی سے زندگی بسر کرنا کسی کے امکان میں نہیں۔ چہ جائے پردہ دار رانڈ۔ منصرم صاحب ناظمہ بیگم کے لیے ہر طرح کی مضبوطی کر گئے تھے پھر بھی بغیر ایک ہمدرد کے کیسے کام چلتا۔ منصرم صاحب کے اعزہ کو مرحوم کی جائداد سے کچھ ملا نہیں تو انھوں نے کوئی واسطہ بھی نہیں رکھا۔ محلے میں ایک لڑکا رہتا تھا بیس اکیس برس کا سن رہا ہو گا مگر نہایت شریف، لائق اور سلیقہ مند۔ محلے کے رشتے سے منصرم صاحب مرحوم کو چچا کہتا تھا اور جب سے وہ پنشن لے کر آئے تھے یہ پیش پیش رہتا تھا۔ میں اصلی نام تو اس کا بتا نہیں سکتا قصے کی ضرورت سے صغیر احمد کہہ لیجیے۔

یہی میاں صغیر آڑے وقت میں کام آئے اور خدا ترسی سے سب کام کر دیا کرتے تھے۔ دن بھر میں اگر چار مرتبہ ضرورت ہو تو یہ اپنے کام کا ہرج کر کے حاضر رہتے۔ جھوٹوں بلا بھیجو تو غریب ڈیوڑھی میں پردے کے پاس موجود۔ ان کو اپنا ذاتی کام زیادہ تھا بھی نہیں۔ اکیلے تھے۔ ماں باپ نے بود گی اچھی خاصی چھوڑی تھی۔ دو چار مکانات بھی تھے اس میں سفید پوشی سے کاٹتے تھے۔ شادی تو ہو چکی تھی مگر بی بی سے بنی نہیں۔ چوتھی چالے کے بعد سے پھر ایک نے دوسرے کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ تین برس ہونے کو آتے تھے مگر ملاپ کی کوئی صورت نہ تھی بگاڑ مزمن

عارضے کی طرح جڑ پکڑ گیا تھا۔

جب صغیر، ناظمہ بیگم کے لئے کام آتے تھے تو یہ کہاں کی گئی گذری تھیں کہ ان کا حال پوچھ کر اظہار ہمدردی نہ کرتیں۔

مقدمات معاملات کی باتیں پردے کے پاس آہستہ آہستہ ہوتی تھیں۔ اس لیے بعد کو ہمدردی یگانگی کی باتیں بھی اسی مدھم آواز میں ہوا کرتی تھیں۔ باتیں کون تھیں صرف یہی کہ کیا کیا کرتے رہتے ہو' اپنی بی بی سے ملاپ کیوں نہیں کر لیتے۔ گھر آباد ہو جائے، پڑوس میں ایک ہمدرد بڑھ جائے۔ صغیر اس کے جواب میں صرف یہی کہتے تھے کہ اب ملاپ قیامت میں ہو گا اور پان لے کر چلے جاتے تھے۔ صغیر کے چلے جانے کے بعد ناظمہ بیگم کے دل کے اندر کوئی ان سے باتیں کرنے لگتا تھا۔

سنیے صاحب میں کہانی لکھتا نہیں ہوں کہانی کہتا ہوں اگر آپ کو اس میں دو بدو باتیں کرنے کا مزا نہیں آتا تو اس بکواس کو دور دفان کیجیے۔ اگر اچھی معلوم ہوتی ہو تو سنتے جائیے کہ ناظمہ بیگم صاحبہ کی سلیم عقل نے کیا کہا۔ ان کی دبی ہوئی خواہش نے کیا کہا اور ان کے حسِ باطن نے عقل و خواہش سے کیا کچھ کہلایا۔

اندر والا۔ سنو بی ناجو تم اور صغیر پردے سے لگے گھڑیوں باتیں کیا کرتے ہو اور جو کوئی کچھ کہہ دے۔

ناجو۔ مجال ہے جو کوئی کچھ کہہ دے۔ کر نہیں تو ڈر کس کا۔ بھلا مجھ سے آٹھ برس چھوٹا اور پھر وہ تو مجھ کو بجی کہتا ہے۔

اندر والا۔ یہ تو ٹھیک ہے مگر تم جب دیکھو اس کی بی بی کا ذکر کیوں کیا کرتی ہو؟

ناجو۔ تو اس میں کیا حرج ہے اگر میرے خیالات دوسرے ہوتے تو اس کی بی بی نگوڑی کا ذکر کیوں آتا۔

اندر والا۔ تم ہنسنے زیادہ لگی ہو۔

ناجو۔ ہنسی آتی ہے تو کوئی کیا کرے۔

اندر والا۔ پہلے کیوں نہیں ہنستی تھیں۔ پھنسی تو ہنسی پرانی مثل ہے۔

ناجو۔ ہوا کرے مثل۔ میرے بڑھے پر سے ہزار جوان صدقے اتارے ہیں۔ خیر اب اس کا ذکر ہی کیا۔ جب جوانی میں اس طرح کے خیالات نہیں آئے تو اب بڑھاپے میں اس کا کیا ذکر۔

اندر والا۔ بوڑھی تو تم بالکل نہیں ہو اس کو تم بھی سمجھتی ہو۔

ناجو۔ میرے تو ایک لڑکا بھی ہوا ہے اس کی بیوی تو ویسی ہی پٹھیا بنی ہے۔

اندر والا۔ مگر وہ صورت میں تو تمہارے تلوؤں کے برابر نہیں ہے۔

ناجو۔ یہ ٹھیک ہے مگر اس سے ملاپ تھوڑی ہونے کو ہے۔

اندر والا ۔ اور جو ہو جائے ۔

ناجو ۔ ہو جائے تو ہماری جوتی سے لڑے سے پاپوش سے مگر نہ ہوتا تو اچھا تھا ۔

اندر والا ۔ یہ دیکھو کھلاما ۔ یہی تو میں کہتا تھا ۔

ناجو ۔ ہو گا بھئی پھر ہم کیا کریں ۔ نیند آتی تو یہی سوچنے لگتے ہیں ۔ کوئی نہ کوئی خیال تو آئے گا ضرور ۔

اندر والا ۔ اور اسی کو سوچتے سوچتے سو بھی جاتی ہو ۔

ناجو ۔ ہاں سو جاتے ہیں سو جاتے ہیں تب نہیں تو اب سو جاتے ہیں ۔ منصرم صاحب تو ہیں نہیں ہمیں ڈر کس کا پڑا ہے ۔ کر ہی لیں تو ہمارا کوئی کیا کرے گا ۔

اندر والا ۔ ہاں اب ٹھیک راستے پر آگئیں ۔ یہی تو میں کہتا تھا کہ جو کچھ کرو ہم سے صلاح مشورہ لے کر کرو ۔ ہم تمھارے ساتھ ہیں ۔ واقعی اگر صغیر کے ساتھ ہو جائے تو بے جا نہیں ۔ گو اور سب باتوں کا آرام رہا مگر ہم سن کو جی ترس گیا ۔

دنیا اور باتوں میں نکمی ہو یا ہوشیار ریاضی خوب جانتی ہے ۔ یعنی ایک اور ایک جوڑ کر دو کا نتیجہ نکالنے میں کبھی غلطی نہیں کرتی ۔ دو ہی چار دنوں میں باندھنوں باندھنے والی دنیا نے ہوئی اور ان ہوئی ۔۔۔۔۔ باتوں کو اکٹھا کر کے اچھا خاصہ پلاٹ تیار کر لیا ۔ جس کی ہیروئن ناظمہ بیگم اور ہیرو میاں صغیر ٹھہرے ۔ شدہ شدہ یہ بات ناظمہ کے کبھی کان تک پہنچی ۔ بے چاری بہت پریشان ہوئی ۔ کر تو کر نہیں تو خدا کے غضب سے ڈر ۔ تمام زندگی ایک سرے سے دوسرے سرے تک نگاہ کے آگے پھر گئی ۔ وہ موتی کی آب جو آج تک ویسی کی ویسی ہی تھی مدھم پڑتی دکھائی دی ۔

آپ لوگ ناظمہ کے دلی راز سے ہزار واقف ہوں پھر بھی عورت کے دل کی بات سمجھنے کا کون دعویٰ کر سکتا ہے ۔

منصرم صاحب کو یاد کر کے آج ناظمہ ایسا روئی کہ شاید کبھی نہ روئی ہوگی ۔ آج ضروری کام کا بھی ہرج ہو گیا مگر صغیر کو نہیں بلایا ۔ دوسرے دن وہ خود آئے رفتہ رفتہ اندر والے نے صلاح بتائی ۔ آبرو پر سے جان قربان ہے ۔ تم ہزار پاک صاف رہو ۔ مگر دنیا بے دوکھ لگائے نہ چھوڑے گی ۔ اگر اس کو ہرانے کی کوئی ترکیب ہے تو یہی کہ نکاح پڑھوالو ۔

ناظمہ اپنے منھ سے کیا کہتیں مگر اس کا انتظام کچھ مشکل نہیں تھا کہ چھیڑ ادھر ہی سے شروع ہو ۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا اور دشمنوں کا منھ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ۔ اچھا ناظرین! اب ٹہلیے یہاں سے کھسکیے ۔ غریب ہندوستانی عورت شرم کے مارے کٹی جا رہی ہے ۔ دوسرا نکاح بے چاری نے نہ معلوم کن اسباب، کن مجبوریوں سے کیا ۔ اور آپ ہیں کہ پردے کی باتوں کی ٹوہ لگانے کو اڑے ہیں ۔ میں ہرگز نہ بتاؤں گا میرا گلا بھی کٹ جائے تب بھی کوئی ایسی بات منھ سے نہ نکالوں گا

کہ صبح کو آپ خیر صلاح کے بہانے آئیے اور مسکرا مسکرا کر اس کو دیکھیے۔ اور ہماری ناجو گردن جھکائے شرم کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو جائے۔خیر۔ اتنا بتائے دیتے ہیں کہ ناظمہ کی زندگی دوسری طرح کی ہو گئی۔ (آیا صغیر کے بھی خیالات بدلے اس کا حال آئندہ معلوم ہو گا) فی الحال اتنا سمجھ لیجیے کہ منصرم صاحب اور صغیر احمد کے ساتھ دو بالکل مختلف طرح کے ساتھ تھے جو ایک دوسرے سے ویسے ہی الگ تھے جیسے ناظمہ کے بچپن کا زمانہ مختصر رنڈاپے کے زمانے سے۔ تب اگر ۱۶ / برس کے سن میں اکسٹھ کی تھیں تو اب ۳۲ برس کے سن میں ۲۳ کی ہو گئیں تھیں۔ جوبنی جو گدگدی شروع میں نہ آئی تھی وہ بے فصل کے آم کی طرح سواد کھو کر اب آئی۔ یہ حسِ باطن کا کھیل کون سمجھے۔

صغیر احمد نے ناظمہ کی جھلک یوں ہی کبھی دیکھ لی ہو گی اب بھرا دیکھا۔ وہ صورت شکل وہ رعبِ حسن وہ تناسبِ اعضا وہ مزاج کی شگفتگی اور یہ ٹھہرے بھوکے بنگالی۔ آنکھوں میں چربی چھائی ہوئی ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے۔ ایسے میں سن کا فرق کس کو دکھائی دیتا۔ البتہ دو چار برس کے بعد کچھ فرق معلوم ہونے لگا۔

صغیر۔ بڑی پیاری چیز تقدیر سے ہاتھ آگئی ہے۔ ہاتھ پاؤں کے گوشت میں وہ سختی نہیں ہے تو اس سے کیا ہوتا ہے اور کسی بات میں بڑھاپا تو نہیں ہے۔

اندر والا۔ بڑھاپا تو نہیں ہے مگر وہ پنڈے کا کساؤ کہاں ہے۔

صغیر۔ اجی محبت اصل چیز ہے۔ پنڈا ونڈا کہاں رہتا ہے۔

اندر والا۔ "محبت الگ چیز ہے۔ جوانی الگ ہے ان دونوں کو ملاتے کیوں ہو۔"

صغیر۔ جوانی کے دن کی ہے۔ محبت تو ہمیشہ کی ہے۔

اندر والا۔ ہے تو ہمیشہ کی مگر جوانی میں بھی مقناطیس کا اثر ہے۔

صغیر۔ محبت کا لوہا مقناطیس کو نہیں مانتا۔

اندر والا۔ اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ محبت جیسے پلاؤ اور جوانی جیسے بیسنی روٹی۔ ہم مانتے ہیں کہ پلاؤ پلاؤ ہی ہے، بیسنی بیسنی ہی ہے مگر روز روز پلاؤ کھا کر بھی کبھی کبھی بیسنی کو جی نہیں چاہتا؟ وہ بیسنی والی سندھاہٹ تو تمھاری بی بی ہی میں ہے۔

صغیر: میں نے کہہ دیا ہے کہ اور جو باتیں جی چاہے کیا کرو مگر ہماری بی بی کا نام ہمارے سامنے نہ آوے۔

اندر والا: ارے میاں تمھاری بی بی سے ہم سے مطلب! ہم تو جوان عورت کا خواب دیکھتے ہیں۔ وہ تمھاری بیوی ہو یا کوئی اور ہو۔ تمھاری بیوی کا نام تو اس وجہ سے آیا کہ وہاں تک پہنچ آسان ہے اور کوئی بات نہیں۔

صغیر: یار یہ تو ہے، مگر ناظمہ غریب کی چھاتی پھٹ جائے گی۔ اور مجھ کو بھی چین نصیب ہو گا۔

اندر والا: خیر چھاتی واتی تو کیا پھٹے گی، مگر ہے بڑی سخت بات، اور غضب تو یہ ہے کہ نہ بغیر اس کے بھی پیاس بجھتی معلوم نہیں ہوتی۔

صغیر: یار تو پھر کیا کریں۔

اندر والا: کروگے کیا، ملاپ کرلو۔

صغیر: اور ناظمہ کو کیا کریں۔۔۔۔

اندر والا: کروگے کیا۔ یہ بھی رہیں گی وہ وہی۔ ان کا مقابلہ کوئی تھوڑی کرسکتا ہے۔ اور وہ آئے گی تو تمہارے گھر میں رہے گی۔ یہ اس گھر میں رہیں گی۔ اُن کا اِن کا سامنا بھی تو نہ ہوگا۔

صغیر: بھئی ناظمہ سے چار آنکھیں کیسے کریں گے؟

اندر والا: سب کچھ ہوجائے گا۔ سنو میاں! ہم ہوں، کہ تم ہو کہ ناظمہ ہوں، سب ٹھہرے حکم کے بندے حسنِ باطن کے۔ وہاں سے جو اشارہ ہوگا وہ کرنا ہی پڑے گا۔

آپ کون سے ایسے خوب صورت تھے، کون بڑے روپے والے تھے کہ ناظمہ آپ پر ریجھ جائیں۔ حسنِ باطن نے کہا۔ ناظمہ! منصرم صاحب مرحوم کی صحبت میں تم اپنے ہم سن کو ترس گئیں لہٰذا تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ صغیر کے ساتھ کرلو۔ ناظمہ نے کرلیا۔ اب تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ ناظمہ کو بھی نہ چھوڑنا۔ مگر اپنی کم سن بی بی سے ملاپ کرلو۔ بندگی بے چارگی۔ تمہارا بس ہی کیا ہے

صغیر۔ تو غریب ناظمہ دونوں طرف سے گئی۔ منصرم صاحب کے وقت میں پلہ ایک طرف جھکا تھا اس بار دوسری طرف جھک گیا۔ دونوں کا نتیجہ اس غریب کے لیے تو برا ہی ہوا۔

اندر والا۔ یہ تو ہے ہی۔ ناظمہ کے ماں باپ نے شروع میں جو غلطی کی تھی اس کا خمیازہ غریب ناظمہ کو بھرنا ہے۔ تم نے سنا نہیں۔ خدا تین خطائیں معاف کر دیتا ہے۔ بندہ بھی کبھی کبھی ایک آدھ خطا معاف کر دیتا ہے مگر بھول چوک کی سزا فطرت کے یہاں ہمیشہ بھرپور ہے۔

==== OOOOOO ====

"میر باقر صاحب" کا بقیہ:-

محبت نہ کرنے لگے تو نفرت بھی نہ کرے۔ اگر میں اس میں کامیاب ہوا ہوں تو خیر اللہ کا شکر ہے۔ اور اگر اس میں بھی ناکامیاب رہا ہوں تو مرحوم مجھ کو معاف کریں اور خدا مجھے بخشے۔

==== OOOOOO ====

چودھری محمد علی ردولوی

دوا

بوا رحمانی کے یہاں زمین داری تو کبھی نہ تھی مگر گاؤں میں آبرو دار گھر سمجھا جاتا تھا۔ دو بیل کی سیر ہوتی تھی اور عورتیں پردے دار تھیں۔ بھرا پرا گھر تھا۔ ان کے شوہر ہمت خاں کی توقیر گاؤں میں کسی سے کم نہ تھی۔ گاؤں پٹے داری کا تھا جس میں حصہ دار، قبضے دار، ماتحتی والے سبھی رہتے تھے۔ اسی وجہ سے لوگ برابری کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ اگر ان کا گاؤں کسی بڑے علاقے میں شامل ہوتا تو رعایا سب برابر اور تعلقہ دار، نائب صاحب اور ضلع دار سب کی حکومت اٹھاتے اٹھاتے لوگ محکومی کے زیادہ عادی ہو جاتے۔ ان کا گاؤں ایسا نہیں تھا۔ چھوٹے زراعت پیشہ کو بنتے بگڑتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ دو فصلیں اچھی ہو گئیں، اناج سے گھر بھر گیا، لگان بھی نکل گیا۔ پرانے بیلوں کی جگہ نئی گوئی بھی آ گئی اور اپنے ہم چشم عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ ایک فصل خراب ہو گئی۔ لیجیے صاحب لیکھا ڈیوڑھا برابر ہو گیا۔ اگر کہیں دو فصلیں تابڑ توڑ بگڑ گئیں تو کسان ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد اگر کہیں خدا نخواستہ کوئی بیماری حیرانی پڑ گئی یا کوئی مقدمہ اٹھ کھڑا ہوا تو فاقے کی نوبت آ گئی اور گھر بار چھوڑ کر دیس پردیس نکل گئے۔ نہیں تو دو تین برسوں میں پھر حالت سنبھل گئی اور کام چلنے لگا۔ ہمت خاں کے دو لڑکے تھے اور ایک لڑکی۔ بڑا لڑکا سولہ سترہ برس کا تھا۔ لڑکی کا سن دس گیارہ برس کا تھا۔ چھوٹا بچہ سات سال کا رہا ہوگا۔ رحمانی کے یہاں بچے تو آٹھ ہوئے مگر جیے تین ہی۔ باقی کوئی چیچک میں، کوئی سوکھے یا اسی طرح کی دوسری بیماریوں میں جن میں حفاظت ہو سکتی تھی مگر نہیں ہوئی مرتے گئے۔ گاؤں میں ایسی عورتیں بھی تھیں کہ جن کے بچے تو بہت سے ہوئے مگر جیا ایک بھی نہیں۔ ان کے دیکھتے رحمانی اسی کو اپنی خوش قسمتی سمجھتی تھیں اور اللہ کا شکر بھیجتی تھیں۔ زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا۔ اسی کو اہل جہاں انقلاب سمجھتے ہیں۔ ایک سال گاؤں میں ہیضے کی بیماری آئی جس میں ہمت خاں کا انتقال ہو گیا۔ رحمانی نے بڑے بیٹے کی مدد سے کھیتی باڑی سنبھالنے کی کوشش کی مگر پردے کی وجہ سے کام بگڑ تا ہی گیا۔ باہر جا کر پردہ چھوڑ دینا ممکن تھا مگر اپنے گاؤں میں رہ کر یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ بڑا لڑکا بھی کچھ بیمار رہنے لگا۔ کھٹ کھٹ کھانسی تو گذشتہ جاڑوں ہی سے آتی تھی اب تو تیسرے پہر کو حرارت بھی رہنے لگی رفتہ رفتہ یہ حال ہوا کہ کھیت بے جوتے بوئے پڑے رہنے لگے۔ کچھ شکمی اٹھا دیے۔ کچھ جھوٹ موٹ بوئے بھی گئے تو بسارہ بھی مشکل سے نکلا۔ فاقوں نے بڑے لڑکے کی بیماری اور بڑھا دی۔ گاؤں سے دس کوس پر ایک بڑا قصبہ تھا جہاں حکیم ڈاکٹر اور سرکاری شفا

خانہ سب ہی کچھ تھا۔ وہیں رحمانی کی خالہ زاد بہن رہتی تھی۔ جو کسی رئیس کے یہاں نوکر تھی۔ رحمانی نے علاج کے بہانے وہیں چلے جانے کا ارادہ کیا۔ اڑوسیوں پڑوسیوں سے روز روز قرض مانگتے مانگتے تھک گئی تھی۔ کہاں تک مانگتی۔ کسی سے آٹا، کسی سے دال کہاں تک ادھار لے۔ اگر گاؤں چھوڑ کر چلی گئی تو زمین دار کا پیادہ لگان بھی مانگنے روز سر پر نہ کھڑا رہے گا۔ لڑکے کا بھی علاج ہو جائے گا۔ گاؤں میں سوا نیم کے سینکوں کے اور دوسری دوا نہیں تھی۔ ایک دن اللہ کا نام لے کر چل کھڑی ہوئی۔

قصبے میں آکر پتہ چلا کہ لڑکے کو بڑی بیماری ہے۔ پہلے حکیم صاحب کا نسخہ پلایا۔ پھر خیراتی ہسپتال سے دوا آنے لگی مگر "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" اور تھوڑے دنوں میں چار پائی سے لگ گیا۔ ایسے بیمار کو کون گھر میں رکھتا مگر رحمانی کی بہن نے نکالا نہیں البتہ بیمار کے برتن الگ کر دیے۔ رحمانی کی خالہ زاد بہن ایسی خدا ترس کہاں تھیں کہ بال بچوں والا گھر رکھا کر ایسے بیمار سے گھبراتیں نہ مگر وجہ یہ تھی کہ رحمانی کی لڑکی کو اپنے لڑکے کے ساتھ کرنا چاہتی تھیں، اسی کی خوشامد تھی۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ کسی رئیس کے یہاں نوکری کرنے کے بعد رحمانی کی لڑکی کا پیغام دینے کی جرأت بھی نہ پڑتی۔ آج یہ دن تھا کہ وہی رحمانی خود ان کی نگاہ دیکھتی تھیں۔ اللہ جس کو چاہے عزت دے جس کو چاہے ذلت دے۔ لڑکی کا سن بارہ تیرہ برس کا تھا۔ پڑھے لکھے خوش حال لوگوں کے یہاں یہ سن کھیلنے کا ہے۔ غریب اگر اپنی لڑکی کا بیاہ کر کے ذمہ داری دوسرے پر نہ ڈالنے کی کوشش کرے تو کیا کرے، رحمانی کا لڑکا گرمیوں میں صاحب فراش ہو چکا تھا ساون کے مہینے میں ختم ہو گیا۔ اتنی لمبی بیماری اور بیمار کی تکلیف دیکھ دیکھ کر ہر شخص کے دل میں آتا تھا کہ اللہ اس کی مشکل آسان کرے۔ اس دعا میں ماں بھی شریک تھی۔ مگر ایسی بات کون ہندوستانی ماں منھ سے نکال سکتی تھی۔ انتقال کے بعد رحمانی نے بین ایسے کیے کہ ہر شخص کے دل پر چوٹ لگی۔ تجہیز و تکفین کے بعد ہمدردوں نے اصرار کر کے غریب کو کھانا کھلایا۔ لڑکے کے انتقال کے پہلے نہ معلوم کتنے وقت فاقہ کیا تھا۔ اس وقت بھی کھانا کیا اچھی طرح کھایا جاتا مگر جب تک دنیا میں آدمی ہے بغیر کھائے چارہ نہیں لیکن اس وقت میں بھی بین ایسے کیے کہ سننے والے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اس باضابطہ رونے میں کتنا رونا رواج کا تھا، کس قدر دل کے تقاضے کا اور کس قدر دماغ کے اشارے کا، اس کو اللہ ہی جانتا ہے۔

رحمانی مصیبت میں گھر سے نکلی تھی اس کے پاس تھا ہی کیا؟ جو بار چلتا رہا تھا ہی ہو گا، وہ لڑکے کی بیماری میں اڑ گیا۔ اب خانہ، رسول اللہ تھا۔ جس چیز کا خیال گھر پر خواب میں بھی نہ آیا تھا، اور جس کو یہاں آکر منھ سے نکالنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی وہ سامنے آئی یعنی رحمانی ماماگیری کرنے پر تیار ہو گئیں اور لڑکے کے سیوم کے بعد منھ پھوڑ کر بہن سے کہہ بھی گذریں۔ بہن نے کہا اس کی فکر ہو جائے گی۔ مگر جوان لڑکی کو کیوں کر ساتھ لے جاؤ گی۔ جو ان کے دل میں تھا وہی

ان کی خالہ زاد بہن کے دل میں تھا۔ قصہ مختصر لڑکے لڑکی کی نسبت ہو گئی اور دو بول شرع کے بھی ہو گئے۔ گھر میں اتنی بڑی موت ہو چکی تھی اگر پیسہ ہوتا بھی تو ڈھول کیوں کر رکھی جاتی لیکن ان کی سمدھن نے بھی اتنا لحاظ کیا کہ گانا وانا نہیں ہوا۔ لڑکی کے فرض سے سبک دوش ہو کر رحمانی نوکری کرنے نکلیں اور رحمانی سے بوا رحمانی ہو گئیں۔ یہ تو ماما گیری کرنے پر تیار تھیں مگر تقدیر کی اچھی تھیں۔ ایک بڑے گھر میں کھانا پکانے پر نوکر ہو گئیں۔ بہت بڑی سرکار تھی۔ باہر کا باورچی خانہ جدا تھا اندر کا کارخانہ جدا۔ نوکروں چاکروں کی کثرت تھی اندر باہر ملا کر خدا جھوٹ نہ بلاوے پچاس ساٹھ آدمیوں کی روٹی رہی ہوگی۔ نوکر تو پھر نوکر لیکن اتنا غنیمت تھا کہ ماما گیری کی ذلت سے بچ گئی تھیں۔ زمانہ گذرتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ قصے کہانی میں تو کچھ بھی دیر نہیں لگتی۔ دس برس ایک سطر سے دوسری سطر پر نگاہ دوڑاتے گذر جاتے ہیں۔ اتنے زمانے میں بوا رحمانی کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ دیہات کا گھر، کھیتی باڑی، وہاں کا رہنا سہنا پچھلے جنم کی باتیں ہو گئی تھیں۔ اس کے بجائے صاف ستھرا چھوٹا سا گھر رئیس صاحب کی مدد سے انھیں کی زمین پر بن گیا تھا۔ گھر میں گرہستی بھی حیثیت کے موافق ہو گئی تھی۔ بوا رحمانی ادھیڑ عمر میں تو آئی ہی تھیں اب اچھی خاصی بوڑھی ہو گئی تھیں۔ پہلے دبلی تھیں اب بلغم نے بھاری بھرکم بنا دیا تھا۔ ناک میں کیل تو پہن نہیں سکتی تھیں۔ مگر ہاتھوں میں موٹے موٹے کڑے اور بتانے، گلے میں جھالر دار طوق اطمینان کا پتہ دیتے تھے۔ سونے کی بجلیاں بھی بنوائی تھیں مگر وہ بہو کے لیے رکھی تھیں۔ ساتھ کی ماما اصیلوں نے کہا بھی کہ بوا کان میں ڈال لو اپنے جیتے جی بہو کو کیوں دو گی تمھارے بعد تو اس کا ہی ہے۔ اس سے ذرا بہو پر رعب رہے گا اور تابع دار رہے گی۔ مگر رحمانی نے نہ پہنا۔ اللہ وہ دن بھی لایا کہ بوا رحمانی بہو بیاہ کر لائیں مگر اپنے قدیم دیہاتی اعزا کو نوید نہیں بھیجی اور نوید بھیجتیں بھی تو شاید وہ نہ آتے۔ وجہ یہ تھی کہ جس لڑکی سے انھوں نے لڑکے کی نسبت کی تھی اس کی پرورش ایک دوسرے رئیس کے گھر میں ہوئی تھی۔ اس کی ماں کسی زمانے میں اسی طرح رانڈ دکھیا دیہات سے آکر دودھ پلانے پر نوکر ہوئی تھی۔ پہلا ہی لڑکا گود میں تھا۔ نوکری کے بعد اس کو کافی دودھ نہ مل سکا اور وہ دبلا ہو کر مر گیا۔ قاعدے کے موافق انّا کا لڑکا اوپر کا دودھ پاتا تھا چوری چھپے کسی وقت انّا بھی پلا دیتی تھی اگر کسی نے نہ دیکھا تو خیر۔ اگر دیکھ لیا تو آفت آتی تھی۔ جس لڑکے کو انھوں نے دودھ پلایا تھا اس کی دودھ بڑھائی کے بعد کچھ معطل سی ہو گئیں۔ گو گھر میں عزت توقیر وہی رہی جو ہونا چاہیے تھی، مگر دھندا کم ہو جانے سے خیالات کچھ اچاٹ رہنے لگے۔ جو وقت بچے کی خدمت میں صرف ہوتا تھا وہ بناؤ سنگار میں گذرنے لگا۔ دودھ بڑھ جانے کی وجہ سے پرہیز کی بھی تقید اٹھ گئی تھی۔ مرچیں کھانے کو زبان ترس گئی تھی۔ کھٹاس کا مزا خواب ہو گیا تھا وہ پھر لوٹ آیا۔ کچا لوچٹ پٹے اور چنے جور گرم کا چٹخارہ بھرا جانے لگا۔ کپڑے اور زیور تو اناؤں کے پاس اچھے ہوتے ہی ہیں ان کے پاس بہر دل جوانی کا بھی خزانہ تھا۔ جوانی میں دانت نکال کر طاق پر رکھ دو

تب بھی نکلے ہی رہیں گے ۔ یہی حال اناکا تھا ۔ کسی مرد سے آنکھیں چار ہوئی نہیں کہ ہونٹوں کی کلی بکس گئی ۔ اسی زمانے میں بیگم صاحبہ نے ایک آدھ مرتبہ رئیس صاحب کو بھی آنکھیں ملاتے اور انا کو مسکراتے دیکھ لیا ۔ آدمی بڑی سمجھ دار تھیں ۔ بجائے اس کے کہ سوئی کا بھالا بناتیں ، بات کا بتنگڑ کرتیں ، ہمنامت ڈالتیں ، گھر کا پالا ہوا ایک لڑکا تھا انھوں نے اسی کے سر انا کو تھوپ دیا ۔ لیجیے صاحب اس کا بھی گھر آباد ہو گیا اور قاضی صاحب نے اپنی عنایت سے آئندہ اور گذشتہ تہمتوں کا دروازہ بھی مسدود کر دیا ۔ مجال ہے کہ شوہر دار عورت پر کوئی دو کھر رکھ سکے یا باندھنو باندھے مگر سال کے اندر ہی لڑکی پیدا ہوئی ۔ حساب لگانے سے بیاہ کے آٹھ مہینے ہوتے تھے ۔ اب کیا تھا عورتوں اور عورت مزاج مردوں کے ہاتھ ایک مشغلہ آگیا جہاں سنیے اسی کی باتیں ہوتی ہیں ۔ کہیں غصہ ہے ، کہیں ہنسی ہے ، کہیں تعجب ہے ، کہیں کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا جا رہا ہے ، توبہ توبہ ، کہیں ماتھا کوٹ کر کہا جاتا ہے اللہ ہر آفت سے بچائے ، کہیں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر "اوئی بہن یہ کیا ہوا" کی آواز آتی ہے ۔ کوئی چار دن کے بچے میں رئیس صاحب کی مشابہت دیکھ لیتی ہے کوئی پہلے ہی سے سر پر پورے بالوں کا ذکر کر کے کہتی ہے اٹھو اسی تو ہو نہیں سکتی ۔ ایک متشرع بزرگ شوہر کو بزرگانہ صلاح دے رہے ہیں کہ بیٹا پھر سے نکاح پڑھوا لو ۔ قصہ مختصر جتنے منھ اتنی زبانیں ۔ جتنی زبانیں اتنی باتیں ۔ ہر شخص اپنی چھوڑ پرائی بات طے کرنے پر تیار تھا ۔ اگر یہ دیہات میں پیدا ہوئی ہوتی تو اس کا نام کوئی رسولن ، امامن وغیرہ ہوتا ۔ یہاں اس کا نام جوہی خانم رکھا گیا ۔ یہی لڑکی تھی جس کے ساتھ بوا رحمانی کے لڑکے کی شادی ہوئی تھی ۔ بوا رحمانی نے بہو نہایت سلیقے کی پائی ۔ سینا پرونا ، کھانا پکانا ، ہر چیز میں بے مثال تھی ۔ گھر کے انتظام میں صفائی ، کفایت شعاری میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی ۔ آنے جانے والوں سے برتاؤ ، ان کی خاطر مدارات میں اپنی حیثیت سے کہیں بڑھ کر کام کرتی تھی اور گو بڑے لاڈ پیار کی پالی ہوئی تھی اور جس گھر سے آئی تھی گر وہاں نوکر چاکر اس کی قدر منزلت نہ معلوم کس وجہ سے نوکروں کی دوسری لڑکیوں سے زیادہ کرتے تھے پھر بھی یہ سسرال میں ہر طرح کی کڑی جھیلنے کو تیار رہتی تھی ۔ بوا رحمانی جہاں نوکر تھیں وہاں کے نوکر چاکر مختلف موقعوں پر ان کے گھر آن نکلتے تھے اور ہر شخص کے ساتھ ایسا برتاؤ ہوتا تھا کہ بوا رحمانی کی بہو کی ہر طرح واہ واہ تھی ۔

اب دو باتیں بوا رحمانی کے لڑکے کی بابت سن لیجیے ان کا نام دائم خاں تھا ۔ بوا رحمانی کی سرکار میں یہ بھی رہتے تھے ۔ پہلے چلم وغیرہ بھرتے تھے ۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو پھر خدمت گاری کرنے لگے مگر اوروں کی طرح تنخواہ ان کی نہ مقرر ہوئی گو مہینے میں تنخواہ سے زیادہ پا جاتے تھے غیر ذمہ داری کا کام ، رفتہ رفتہ متر گشت زیادہ اور کام کم کرنے لگے ۔ عمر بھر یہی رہا کہ گھر کا خرچ اسی سرکار سے چلا کیا ۔ وقتاً فوقتاً کام بھی کیا کیے مگر مقررہ تنخواہ کبھی نہیں پائی ایسے لوگوں کو لواحق کہتے ہیں ۔ آدمی نیک تھا مگر بے وقوف ، نوکروں میں ایک کہاوت ہے ۔ "جس کی بڑھیا محل کے اندر

اس کا طالع بڑا سکندر۔ "بچپن سے پکے پکائے عمدہ کھانے کے عادی رہے۔ مزے سے مزے کی چیز جو گھر میں پکی اس میں ان کا حصہ ضرور لگا اور کانہ بسی پسندی کا شوربہ تو ان کا کہیں گیا نہ تھا بغیر محنت کیے کھانے کی سزا چھوٹے بڑے ہر شخص کو ملتی ہے۔ ان میں کیا سرخاب کے پر لگے تھے جو یہ بچ جاتے اسی وجہ سے کاہل بھی ہوگئے تھے۔ غریبوں کے لڑکوں کا دستور ہے کہ دس ہی بارہ برس کی عمر میں یا اپنے آبائی یا کسی نہ کسی دوسرے کام پر لگادیے جاتے ہیں۔ بعض اسی وقت سے کرنے لگتے ہیں بعض جب مصیبت پڑتی ہے تب کرتے ہیں۔ لیکن ماں باپ کوشش یہی کرتے ہیں کہ کام کرنے کی عادت شروع ہی سے پڑ جائے۔ میاں دائم خاں کو ان کی ماں نے اس ڈھرے پر نہ لگایا۔ اسی طبقے کے دوسرے لڑکے جب دوپہر کو کام پر سے لوٹتے تھے تو موٹا، جھوٹا جو کچھ ملا بے تابی میں کھا گئے۔ بھوک کی شدت نے شکوے شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔ میاں دائم خاں کی یہ عادت پڑی تھی کہ گھومنے پھرنے کے بعد جب دوپہر کو لوٹتے تو جو ڈالی ماں سرکار سے لے کر آئی ہیں سامنے رکھ کر کھانے لگتے۔ اگر کسی دن سالن کم بچا تو جائزہ لیتے ہی وہیں سے شکوے کے انداز میں پکارے "اور اماں اس میں تو ہڈی ہی ہڈی دکھائی دیتی ہے۔ بوٹی تو ہے ہی نہیں" ماں نے کہا کھالو نہیں بچی تو میں کیا کرتی وہ دیکھو طاق پر کاغذ میں لپٹی ایک برفی کی ڈلی رکھی ہے وہ کھالینا۔ اس کے بعد دائم چپ چاپ کھا کر باہر چلے جاتے تھے۔ حق بات کہنا چاہیے۔ کھانا چاہے اچھا ہو چاہے برا میاں دائم خاں اس معاملے میں مذکورہ بالا شکایت سے زیادہ کبھی نہیں کرتے تھے۔

شادی کے بعد ایک نئی آفت نازل ہوئی یعنی نہ فاتح کے اوپر فتح مندی کے آثار دکھائی دیے نہ مفتوح پر فتح ہو جانے کا وہ اطمینان چمکا جو تسلط کے بعد ہوتا ہے۔ آٹھ دس دن تو بات چھپی رہی مگر رفتہ رفتہ یہ راز دائم خاں کی سسرال سے کھلنا شروع ہوا۔ بوا رحمانی بہت گھبرائیں بیٹے کو حکیم صاحب کے پاس لے جانے کو تیار ہوئیں۔ لڑکا پہلے تو جانے ہی سے انکار کرتا رہا۔ اس کے بعد مجبور آگیا۔ حکیم صاحب نے وہی سوالات کیے جو دواؤں کے اشتہاروں میں دیکھے جاتے ہیں اور یہی سبب مرض کا ٹھہرایا۔ پھنکی کا نسخہ لکھ دیا کہ صبح کو گائے کے دودھ کے ساتھ پیو۔ کئی روپے کا حلوا بنادیا۔ جب اس سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا تو کہا ذرا سردی اور پڑنے لگے تو علاج شروع ہوگا۔ اب یہ راز پوری طور سے افشا ہو چکا تھا۔ ساتھ کے نوکروں چاکروں نے دائم خاں سے صاف صاف پوچھنا شروع کیا۔ دائم خاں کبھی جز بز ہوئے، کبھی شرمائے، کبھی ہمدردی کا اظہار پا کر کہنے لگتے "یار کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے ایسے تو اچھے ہیں مگر وہاں پہنچ کر نہ معلوم کیا ہو جاتا ہے۔ حکیم صاحب نے کہا ہے کہ جب ناقص مواد نکل جائے گا تو اچھے ہو جائیں گے۔ دیکھو بھائی کیا ہوتا ہے۔"

بوا رحمانی اپنی پریشانی میں دائم خاں کو لے کر لکھنو بھاگیں۔ ایک بڑے ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس نے حال سن کر کہا یہ روحانی شکایت ہے جس کو غلطیوں سے کوئی واسطہ نہیں ممکن ہے غلطیوں سے کچھ بیماری زیادہ ہو گئی ہو مگر اصل وجہ روحانی ہے۔ اس علاج میں دیر لگے گی اور

یہاں رہنا پڑے گا۔ بوا رحمانی کے پاس نہ اتنا وقت تھا نہ روپیہ۔ ناچار نسخہ لکھوا کر واپس آئیں۔
اس کے بعد پھر سے حکیم صاحب کا علاج شروع ہوا۔ پھر میاں دائم خاں عطائیوں کے ہتھے چڑھ گئے
نہ معلوم کتنے زخم ڈالے گئے کتنا خون مواد ہو کر بہہ گیا۔ مگر "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔"
تقریباً دو سال یہی ہوا کیا اس کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ رہے۔ سسرال والے پہلے ہی سے طلاق مانگ
رہے تھے اب بڑے زور و شور سے اس کا مطالبہ کیا گیا۔ اسی زمانے میں بوا رحمانی کا بھی انتقال
ہو گیا۔ لڑکی کے ماں باپ مقدمہ چلانے پر تیار ہوئے مگر جوہی خانم نے صاف صاف کہہ دیا کہ
میری تقدیر میں جو کچھ ہونا تھا ہوا اور جو ہونا ہے ہو گا ہو کے رہے گا۔ پہلے تو بے سوچے مجھے
جھونک دیا اب فارغ خطی لکھواتے ہیں۔ طلاق ولاق نہ لوں گی۔ اور خدا نے چاہا تو عمر بھر یوں ہی
پار کر دوں گی۔ بہت سی کم سنی میں رانڈ ہوتی ہیں۔ آخر وہ یوں ہی پہاڑ ایسی جوانی کاٹ دیتی ہیں۔
دائم خاں میاں بی بی کا سلوک جوں جوں اغیار در اندازیاں کرتے گئے اور اچھا ہی ہوتا گیا۔ لوگ
کہتے ہیں اور دیکھنے میں بھی یہی آیا ہے کہ بغیر زناشوئی رشتے کے محبت قائم نہیں ہوتی۔ یہی فرق
بہن بھائی اور میاں بیوی کی محبت میں بتایا جاتا ہے مگر دائم خاں میاں بیوی کی یگانگی وہ استثنا
تھیے جس سے ہر قاعدہ مضبوط ہوتا ہے۔ اسی طرح دس پانچ برس گذر گئے اور بات پرانی دھرانی
ہوتی گئی۔ دوسروں پر اعتراض جمانے کے نت نئے معاملات نکلا کرتے ہیں۔ معاشرتی، مالی، جنسی
گڑبڑیں ہوا ہی کرتی ہیں۔ اس قدیم فضیحتے کو لوگ کب تک لیے بیٹھے رہتے۔ آخر بھول گئے۔ اگر کچھ
لوگ نہیں بھولے تھے تو محلے کے دو چار دل پھینک لونڈے تھے اور خود دائم خاں کی سرکار کے دو
ایک نوجوان نوکر جو وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی عذر سے دائم خاں کے گھر پہنچ ہی جاتے تھے لیکن یہاں
عجیب رنگ تھا۔ لوگ نہ معلوم کیا کیا ارادے اور کون کون منصوبے گانٹھ کر آتے تھے مگر وہاں
نگاہ میں کچھ ایسا برف، کافور، کتیرہ، کیلے کا پانی، برومائیڈ گھلا ہوا تھا کہ لونڈے کیا بڑے بڑے
تماش بین سٹ پٹا جاتے۔ مسز سڈنس انگلستان کی بڑی مشہور ایکٹرس کی پرستش کرنے والوں کی
کمی نہیں تھی۔ شاہزادوں سے لے کر متوسط درجے تک بچاریوں کا شمار سیکڑوں میں تھا۔ شریڈن
بھی انھیں میں تھے۔ کسی نے کہا تعجب ہے کہ تم نے باوجود اس گرم جوشی کے مسز سڈنس سے
کبھی اظہار عشق نہیں کیا۔ شریڈن نے کہا، ارے اس کے رعب حسن میں وہ دبدبہ ہے کہ جو
شخص اس سے اظہار عشق کرلے وہ آرچ بشپ آف کینٹربری سے بھی اظہار عشق کر لے گا۔ یہی
حال جوہی خانم کا تھا۔ ایک آدھ بے تکے بے ہودہ آنے جانے والے نے مذاق میں یا کسی اور
بھدے طریقے سے منھ پھوڑ کر اظہار مطلب بھی کیا مگر ایک ہی نگاہ میں کھسیانے ہو کر بھاگ آنا پڑا۔
زمانہ گذرتا گیا۔ لوگوں کی کوششیں جاری رہیں۔ میاں بیوی کی بے واسطہ محبت مضبوط ہوتی گئی
ہرج مرج میں یہ حال ہوتا تھا کہ اگر ایک کی انگلی دکھی تو دوسرا بے چین ہو گیا۔ عورت کو مرد کا
جھوٹ موٹھ کا سہارا ابھی بہت ہوتا ہے لیکن مرد کو بھی ہمدردی کی کم ضرورت نہیں ہوتی۔ ظاہر یہی

وجہ معلوم ہوتی تھی کہ یہ لوگ ایک جان دو قالب تھے ۔ ورنہ معاملات ایسے تھے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو کون تعجب کی بات تھی ۔ بعض عورتیں جو ہمدرد تھیں اور جن سے یہ بھی اپنے دل کا حال کہہ دیتی تھی ان سے اکثر باتیں ہوئیں ۔ اس نے صرف یہی کہا کہ مجھ کو کوئی تکلیف نہیں ہے ۔ یہ بھی کہا کہ جب جو کوئی مرد اس طرح کا کوئی کنایہ کرتا ہے تو نہ صرف سر سے پاؤں تک آگ لگ جاتی ہے بلکہ یہ بھی جی چاہتا ہے کہ کنویں تالاب میں پھاند پڑوں ۔ کہتی تھی کہ آبرو پر سے سو جانیں قربان ہیں ۔ مختلف مردوں کے ڈورے ڈالنے کی مصیبت اس غریب پر اس وجہ سے اور زیادہ تھی کیوں کہ میاں دائم خاں رشک کے مادے سے بالکل بے واسطہ رہے ۔ اگر کوئی مرد کسی بہانے سے گھر میں آیا تو انھوں نے کوئی مزاحمت نہ کی اور اگر نہ آیا تو کوئی پوچھ گچھ نہ کی گویا ان کے دماغ میں ڈاہ کا خانہ ہی خالی تھا ۔ میاں دائم خاں کو کبھی زکام ہو گیا، کبھی یوں ہی طبیعت سست ہو گئی ، مگر ان کی بیوی ہمیشہ عورتوں کی بیماری میں گرفتار رہتی تھی ۔ کمر میں درد ، سر میں درد ، آنکھوں میں تکلیف غرض کہ آئے دن روز کی بیمار تھی ۔ ایسے وقتوں میں میاں دائم خاں کی بے چینی قابل دید ہوتی تھی کہیں سرد بار رہے ہیں ، کہیں حکیم صاحب کے یہاں دوڑے جاتے ہیں ، کہیں قابلہ کی خوشامدیں کر رہے ہیں ۔ غرض کہ یہی مشغلہ رہ گیا تھا ۔

دائم خاں کی شادی کو تقریباً دس بارہ برس ہو چکے ہیں ۔ جوہی خانم جوانی کے بے آب ریگستان کو پار ہی کیا چاہتی ہیں ۔ مگر مثل ہے "عورت کو تین دن قبر میں بھی بھاری ہیں ۔ "عاشق تن لوگ اس کی طرف سے کم و بیش مایوس ہو چکے ہیں ۔ ٹوہ لگانے والی عورتیں طوطیا طوفان اٹھانے والیاں بھی بے پرواسی ہو گئیں ہیں کہ ایک نیا گل کھلا ۔ پڑوس میں ایک آدمی کوئی پینتیس چھتیں برس کے سن کا آکر رہا ۔ ڈھونڈے نام ، نہ صورت نہ شکل ، نہ ایسی کمائی ، نہ اٹھتی جوانی ۔

رمضان شریف کے دن ہیں رات کے دس بجے ہیں ۔ میاں دائم خاں شبینہ پڑھنے بڑی مسجد گئے ہیں ۔ جعفر نامی ایک خدمت گار کچھ بچی کھچی افطاری بیگم صاحبہ کے حکم سے لے کر آیا ۔ صدر دروازے کی طرف تو گیا نہیں ۔ کھڑکی قریب تھی اسی طرف آیا کھڑکی بند تھی مگر کچھ آہٹ پاکر اس نے نہ آواز دی نہ زنجیر کھٹکھٹائی بلکہ دروازے میں کان لگا کر سننے لگا ۔ کیا سنتا ہے کہ دائم خاں کی بی بی آہستہ آہستہ کہہ رہی ہیں " عورت کی دوا مرد ۔ میں ہمیشہ کی بیمار ۔ برسوں ہو گئے ٹھیک وقت پر نہ سر دھویا نہ بغیر تکلیف کے ایک مہینہ گذرا اور وہی اب ہوں کہ کوئی بیماری نہیں ۔ دن بھر سر جھکا کر سیا کرو نہ آنکھوں کے ڈھیلے دکھیں نہ سر میں دھمک پیدا ہو ، کمر کا درد تو جیسے تھا ہی نہیں ۔ "میاں جعفر بھی ان کھسیانی بلیوں میں تھے جو کسی زمانے میں کھمبا نوچ چکے تھے ۔ اب کیا تھا پیٹ پکڑے دوڑے اور دوسروں کو خبر سنائی ۔ آبرو بڑی قیمتی چیز ہے مگر دوسرے کی آبرو

کوڑیوں کے مول بیچنے میں سب کو لطف آتا ہے۔ بس کیا تھا لوگ چڑھ دوڑے۔ ان میں وہ بھی تھے جو خود ناکامیاب رہے تھے اور وہ بھی تھے جو مفت کی سیر دیکھنا چاہتے تھے اور چور چور کا بلڑ کر دیا۔ دو چار آدمیوں نے چور کی ہانک لگائی۔ چالیس پچاس آدمیوں نے ڈنڈے لاٹھی لے کر گھر گھیر لیا۔ کچھ لوگ چاروں طرف اپنے اپنے کوٹھوں پر چڑھ گئے کہ چور نکل نہ جانے پائیں۔ وہاں چور ہو تب تو نکلے، میاں ڈھونڈے شرمائے لجائے پریشان حال نکلے اور کہنے لگے میں تو آگ لینے آیا تھا۔ لوگوں نے ایک نہ سنی۔ بعض منچلوں نے دو چار گدے بھی رسید کیے اور پکڑ کر رئیس صاحب کے پاس لے آئے۔ دائم خاں کی بیوی بھی طلب ہوئیں۔ نہایت سراسیمہ سر سے پاؤں تک کانپتی ہوئی۔ منھ چادر سے چھپائے آئی اور رئیس صاحب کے قدموں پر گر پڑی۔ رئیس صاحب کو ترس آیا اس کو اندر بھیج دیا اور مجمع کو منتشر ہونے کا حکم دے دیا۔ اتنے میں پولیس کا آدمی بھی آگیا مگر صورتِ حال دیکھ کر دست اندازی کی کوئی وجہ نہ پائی۔ اگر وہ عورت غریب آشنائی میں پختہ کار ہوتی تو نہ معلوم کتنے بہانے ڈھونڈ لیتی اور دوسروں کے پیٹلے شاید خود ہی چور چور پکار اٹھتی مگر وہ ایسی تو تھی نہیں۔ رئیس صاحب سے تنہائی میں اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ آج اتنے دن مجھ کو ان کے گھر میں آئے ہوئے جو حال ہے آپ سے چھپا نہیں ہے۔ میں ہمیشہ آبرو پر سے جان قربان کرتی رہی البتہ اس معاملے میں مجھ کو جو روسیاہی بدی تھی وہ ہوئی اور میں تو کہوں گی اس میں میرا بھی قصور نہیں۔ کیوں کہ اٹھتی جوانی کا جو زمانہ تھا اس میں نہ معلوم کتنوں نے میری آبرو لینی چاہی مگر میرا پاؤں نہ ڈگا۔ اب آدھی عمر گزر چکی تب لکھا پورا ہوا اس کی صورت یہ ہوئی کہ جب جب میں نے اس مرد کو دیکھا تو میری حالت ہی بدل جانے لگی۔ ادھر اس کا سامنا ہوا اور ادھر میرا دل دھڑکنے لگا اور سر سے پاؤں تک تھرتھری سی پڑ گئی، ہاتھ پاؤں کی طاقت سلب ہو گئی زبان سے نہیں نکلنا مشکل ہو گیا۔ دل میرا آبرو جانے پر رویا کیا مگر ہونٹ بلا اختیاری میں مسکراتے رہ گئے میں اس کو نہ تب چاہتی تھی نہ اب چاہتی ہوں۔ اب چاہے سر منڈوا کر اور منھ میں کالک لگا کر گدھے پر سوار کیجیے چاہے، اجازت دیجیے کہ کچھ کھا کر سو رہوں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی خیال ہے کہ اگر میں مر گئی تو پھر ان کی (دائم خاں کی) کون خبر لے گا۔

جو بی خانم کا ڈھونڈے کی محبت سے انکار ممکن ہے اس وجہ سے رہا ہو کہ محبت سے انکار عورت اپنا فطرتی حربہ سمجھتی ہے۔ ممکن ہے اس وجہ سے رہا ہو کہ دائم خاں سے شادی کے بعد وہ سمجھنے لگی ہو کہ عورت کا جنسی حق اور مرد پر جان دے دینے کی صفت قسّامِ ازل کے یہاں سے اس کو ملی ہی نہیں ہے۔ رہی دائم خاں سے محبت وہ کوئی بلند چیز رہی ہو یا ہندوستانی رسوم کی گنگا میں پھسل پڑنے کے بعد صرف "ہر گنگا" رہی ہو۔ اس میں کلام نہیں کہ ان میاں بیوی کا وہ تعلق تعلق

(بقیہ صفحہ ۴۰۰ پر)

چودھری محمد علی ردولوی

ایک عمدہ کتاب

سر رضا علی کی کتاب اعمال نامہ پڑھی جارہی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ سرسری تنقید بھی ہوتی جاتی تھی۔

ایک دوست:۔ "بھئی مجھ کو جو بات اس دال روٹی پوس کاٹ میں سب سے زیادہ پسند آئی وہ سچائی کی کھنک ہے۔ بے چارے نے اپنے دل کے دونوں کنواڑ کھول کر رکھ دیے ہیں کہ جو کچھ ہے دیکھ لو۔ کوئی پردہ نہیں ہے۔"

دوسرے دوست:۔ اب چاہے دال روٹی پوس کاٹ کہہ کر ہنسیے چاہے اس کی صاف دلی کی داد دیجیے۔

تیسرے دوست:۔ دل کے دونوں کنواڑ کھول کر لکھ دینا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اس کی کوشش کی ہے کامیاب بھی ہوئے یا نہیں یہ ذرا غور کے قابل ہے۔ اگر یہ فرمایئے کہ زبان خوب کمائی ہوئی ہے تو میں ماننے کو تیار ہوں اگر یہ کہیے کہ انھوں نے تہذیب کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے تو یہ بھی درست ہے لیکن پوری بات کہہ جانا کارے دارد۔

دوسرے دوست:۔ میں مطلب نہیں سمجھا۔ بے چارے نے اپنے خانگی معاملات ساس بہو کی ان بن تک کہہ گذاری ہے۔ پھر اور کیا کرتا۔ بڑے بڑے بزرگوں کی خامیاں، کمزوریاں نہایت صفائی سے بیان کر دی ہیں اور کیا چاہیے۔

تیسرے دوست:۔ ہاں ہاں یہ بالکل ٹھیک ہے۔ انھوں نے بھرپور اس کی کوشش کی ہے مگر ہر شخص رو سو نہیں ہو سکتا۔ آپ تہذیب کا بھی دامن نہ چھوڑیں گے، قانونی گرفت بھی نہ آنے دیں گے، بزرگوں کی وکالت بھی کرتے جائیں گے اور سچائی کو بھی لیے رہنے کی کوشش کریں گے تو اللہ ہی نے کہا ہے کہ کہیں نہ کہیں ٹھوکر دھری ہے۔ غریب نے کتاب کو دلچسپ بنانے کے لیے نہ معلوم کتنے قصے عشق عاشقی کے بیان کر ڈالے ہیں کہ انسان کے مبارک گناہ' یعنی اس کی جنسی لغزشوں سے سب کو بچا لیا ہے۔ حضرت آدم و حوا کے پہلے گناہ سے ایسے ڈرے ہوئے ہیں کہ عملاً سب کچھ کریں گے مگر منھ سے نہ کہیں گے۔ اس طرح کی باتوں سے اور صداقت سے جس سے انسانیت پر روشنی پڑتی ہے کوسوں کی دوری ہے۔ اگر آپ کہیں کہ ہندو مسلمان اختلاف کی تاریخ اچھی بیان کی ہے، اردو ہندی کے جھگڑے کا بھانڈا خوب پھوڑا تو میں بھی تسلیم کرنے کو تیار ہوں

لیکن یہ کیوں کر مان لوں کہ کسی کو خفا بھی نہ کیجیے گا، قدیم تہذیب کے خلاف باتیں بھی نہ کہیے گا اور پھر سچائی کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیجیے گا۔ تو یہ کیسے بنے گی۔ آپ کی جتنی ہیروئنیں ہیں وہ سب کی سب کنواری بیٹھی رہیں گی، آپ کے جتنے ہیرو ہیں وہ سب بسم اللہ کے گنبد کے پلے ہوں گے اور پھر بھی زندگی ویسے ہی اصلی دکھائی دے گی جیسی کہ ہوتی ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

دوسرے دوست:۔ (ذرا گرمی کے ساتھ) کیا آپ کا مطلب ہے کہ سر رضا علی نثر میں وہ کھلی ڈلی حماقتیں کرتے جن کی اجازت صرف نظم اور بندادین کی ٹھمریوں میں ہے۔

تیسرے دوست:۔ (خفیف سی اونچی آواز میں) نظم اور بندادین کی ٹھمریاں تو میں جانتا نہیں لیکن حد سے زیادہ تہذیب برتنے میں کھیل بنتا ہی نہیں۔ محسن الملک مرحوم کا حال لیجیے۔ مرحوم کا قصہ تو الگ رہا خود پڑھنے والے اس چکر میں پڑ جاتے ہیں کہ جتنی نیک دلی اور درگذر سر رضا علی اپنے میں ظاہر کر رہے ہیں یہ فطرت میں بھی ہے یا نہیں۔ جو پھس پھسی ---- عشق و محبت کی کہانیاں انھوں نے لکھی ہیں آیا دنیا میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے یا کہیں انسانیت جوش حیات سے دب بھی جاتی ہے۔

پہلے دوست:۔ جناب مرزا صاحب آپ کچھ نہیں بولتے۔

مرزا صاحب:۔ جی سن رہا ہوں: ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے۔

تیسرے دوست:۔ ہاں مرزا صاحب۔ آپ فرمائیں۔ ہم لوگوں کو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے۔ فیصلہ آپ ہی کے ہاتھ ہے۔

دوسرے دوست:۔ مجھ کو کوئی عذر نہیں لیکن دونوں فریق کو جو کچھ کہنا ہے وہ پہلے سن لیں اس کے بعد حکم سنا دیں۔

مرزا صاحب:۔ فیصلے دوسرے کرتے ہوں گے میں تو اقبال جرم کرتا ہوں۔ سزا آپ حضرات خود تجویز کریں۔ (پہلے دوست کی طرف مخاطب ہو کر) اس دنیا میں بے عیب کون ہے۔ جب ہمارے آپ کے ایسے لوگ اتفاق سے غلطی کر جاتے ہیں تو بے چارے سر رضا علی کی کتاب میں خامیاں ہوئیں تو کیا تعجب ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی کتاب خوب ہے۔ پالیٹکس ان کا کام ہے وہ بہت اچھا کیا ہے۔ احباب کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ جس میں احباب سے زیادہ خود ان کی نیک دلی اور اجلی روح کا پتہ چلتا ہے۔ آدمی یقیناً دل پھینک قسم کے واقع ہوئے ہیں اور ان لوگوں میں معلوم ہوتے ہیں جو کر گذریں گے مگر کہہ نہ سکیں گے۔ بقول سعدی کے۔ "جوانی میں اے ہم نشیں جیسی پڑی ہے تو بھی جانتا ہے۔" معلوم ہوتا ہے کہ:

انھیں بھی آتش الفت جلا چکی اکبر
حرام ہو گئی دوزخ کی نار ان پر بھی

مگر ساٹھ سے اوپر کے آدمی ہیں۔ بے چارے صاف گوئی کی کوشش کرتے ہیں مگر کامیاب

نہیں ہوتے۔

دوسرے دوست:۔ بزرگوں میں تو آپ بھی ہیں۔

مرزا صاحب:۔ اجی ہم سینگ کٹا کر بچھڑوں میں داخل ہوئے ہیں ہمارا کیا کہنا۔ کتاب کی تنقید آپ حضرات کریں۔ ہم تو صرف اپنی تنقید کرتے ہیں جس میں بحیثیت انسان کے ہمارا آپ کا سر رضا علی اور ازاڈوراڈنکس سب کا حال ہے۔ یہ نہیں کہ کوئی سن لے گا، کوئی کچھ جائے گا، کوئی غیر مہذب ٹھہراوے گا۔ اس لیے تصویر ادھوری چھوڑ دی۔ اجی حضرت ہومر سے لے کے سعدی، گئٹے اور مرزا محمد ہادی رسوا کی پیروی میں اگر ہم وکٹورین پنچایت سے ٹاٹ باہر کردیے جائیں گے تو ٹھینگے سے۔ لیجیے آپ بیتی سنیے۔ مگر پہلے ذرا کچھ گزارش کرلوں۔ ہم آپ کی نئی نئی باتوں پر نہیں ہنستے آپ ہماری پرانی باتوں پر کیوں ہنسیے؟ آدمی کی فطرت نہ بدل گئی ہے اور نہ آئندہ ہی اس کے خدانخواستہ فرشتہ ہوجانے کا ڈر ہے۔ پھر یہ نوجوانوں کا برتری کا گھمنڈ کس برتے پر؟ زمانے کے ساتھ کچھ ردوبدل ہوجاتا ہے، کچھ انداز میں فرق آجاتا ہے۔ بس لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم اپنے پہلے والوں سے اچھے ہوگئے، ہم نے ترقی کرلی۔ مجھ کو جو بات اب نوجوانوں میں بھاتی ہے وہ یہی بھولا پن ہے۔ جنسی ہی معاملات کو لے لیجیے۔ وہی عشق و محبت کی کہانیاں ہیں۔ وہی دماغ کی بے بسی، وہی دل کی حکمرانیاں ہیں۔ اگلے لوگ رنڈیاں نوکر رکھتے تھے اب گھر گرستوں کا راج ہے۔ پہلے پیشہ ور تھے اب دل بہلاؤ کے لیے انیلی خوش باش ہیں۔ رنڈیوں کی لڑکیاں برابر اپنے پیشے کے لیے تیار کی جاتی تھیں، جو اپنے کام کی اونچ نیچ سے واقف ہوتی تھیں۔ ان کے سر پر ان کے بزرگ ہوتے تھے جو بے راہ چال سے ان کو روکتے رہتے تھے۔ اب "ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی" اب جس چھوکری کو دیکھیے بن سانپ کا منتر جانے بل میں ہاتھ ڈالنے پر تلی ہے۔ کہیں خودکشیاں ہیں، کہیں بدنامیاں ہیں۔ کاتا اور لے دوڑی اور چیز ہے۔ کرنے کی دنیا اور ہے۔ اچھا تو اب قصہ سنیے۔

ہمارے مکتب میں ایک رئیس زادے تھے جو سن میں ہم سب سے بڑے تھے۔ قریب قریب باپ بیٹے کا فرق رہا ہوگا۔ ان کی تعلیم ہم سے دس گیارہ برس پہلے ختم ہوئی تھی۔ مگر بے چارے ایسے اچھے آدمی تھے کہ بزرگی کا خیال نہیں کرتے تھے اور ہم کو باوجود عمر کے فرق کے اپنی بے تکلف صحبت میں داخل کیے ہوئے تھے۔ ان کے پاس ایک نئی رنڈی نوکر ہوئی۔ نہایت خوب صورت، بڑی خوش مزاج اور اس فلسفے کی قائل تھی جس کا پہلا کلیہ یہ ہے کہ جوانی پھر لوٹ کر نہیں آتی۔ ہمارے دوست کا جو سن رہا ہو، ہم کوئی اٹھارہ انیس کے تھے۔ رنڈی کا سن ہمارے اور ان کے درمیان میں توازن قائم کیے تھا۔ جس کے پاس بہرحال جوانی اور تجربہ دونوں تھے۔ ہم لوگ گنجیفہ کھیل رہے تھے۔ مگر عجیب اتفاق کہ سوائے ہمارے دوست کے اور کسی سے کھیل بن ہی نہیں رہا تھا اس رنڈی کے ایک سو سوخت ہوگئے۔ اور ہم کھیل اعلیٰ کا دوسرا سر دینا بھول گئے

اور پھر بجائے سوختی ہونے کے ہنسی برابر چلی آرہی ہے جیسے زمین و آسمان کے بیچ میں گد گدی ہی گد گدی بھری ہو۔ ہمارے دوست اچھ اچھ کر رہتے ہیں کئی مرتبہ پتے بھی پھینک دیے کہ اس کھیلنے سے کیا فائدہ مگر ہم نے سنجیدگی کا وعدہ کیا اور پھر وہی کیا۔ ہم نا گفتہ بہ کھیرے ایک نیا لطف محسوس کرتے تھے۔ مگر یہ لطف کس وجہ سے تھا یہ نہ سمجھ میں آتا تھا نہ اس کے سمجھنے کا خیال ہی ہوتا تھا۔ معلوم نہیں ان دونوں کے دلوں میں کیا لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس رنڈی کی دل آویزی ہمارے دل میں جگہ قرار کرتی چلی جاتی تھی۔ جنسی خیالات بھی ابلے پڑتے تھے مگر ان خیالات کو عملی جامہ بھی کس طرح پہنایا جا سکتا ہے اس کی بابت کوئی امید افزا یا مایوس کن منصوبے نا تجربہ کاری کی بنا پر دل میں آہی نہیں رہے تھے۔ جو کچھ تھا وہی کیا کم مزے کا تھا جو اور زیادہ کی ہوس ہوتی۔ کیونکہ غریب آدمی کی دولت ناواقف کاری ہی میں ہے۔ اب برسوں کے بعد سمجھ میں آتا ہے کہ ہمارے تجربہ کار دوست کیوں اکھڑ رہے تھے۔ اور آزمودہ کار سپاہی کی طرح وہ رنڈی کیوں نہایت اطمینان سے کھیل رہی تھی۔ اور ہنس بھی رہی تھی۔ عورت اس قسم کے ہر نئے موقع پر مرد سے کیوں کر اپنے کو زیادہ لیے دیے رہتی ہے اور کیوں کر زیادہ نڈری سے کام کرتی ہے اس کو عورت کے نفسیات جاننے والے سمجھیں یا وہ سپاہی جو میدان میں صرف مورچہ ہی نہیں سر کر چکا ہے بلکہ شکست اٹھانے پر بھی جی نہیں ہارا ہے۔ اس کے بعد کئی موقعوں پر ہم تینوں کا ساتھ رہا ہے لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے کوئی بات یاد رکھنے کے قابل نہیں ہوئی اور نہ کوئی خاص یگانگی ہی بڑھی۔ اس واقعے کو دو تین ہفتے ہو گئے اور ہم اس مختصر سی کائنات عیش و رنگ ہی کو بہت سمجھا کیے کہ اتنے میں ایک تار ملا۔ "آٹھ بجے شام کی گاڑی پر ہم سے ملو۔" بھئی واہ یہ تو خوب ہوا! بھلے کو رات کے آٹھ بجے گاڑی آتی ہے اگر دن کے آٹھ بجے گاڑی آتی تو بڑی گڑ بڑ ہوتی۔ دیکھیں یار ملاقات میں کوئی گھنڈت تو نہیں پڑتی اور اگر اسٹیشن پر کوئی بزرگوں میں سے مل گیا تو کیا کریں گے! اونھ ہوگا کوئی دیکھ ہی لے گا تو کیا کرے گا۔ اور ہم اس سے کچھ تعلق کرنے تھوڑی جا رہے ہیں۔ خالی ملاقات میں کیا ہرج ہے۔

ایک ساتھ کھیلے راز دار نوکر کو ساتھ لے کر اسٹیشن پہنچے۔ نوکر سے شرط کرنے لگے۔ سنو جی۔ اسٹیشن پر آٹھ بجے آنے والی گاڑی کا میل ادھر سے آنے والی گاڑی سے اگلے اسٹیشن پر ہوگا اگر موقعہ ہوا تو ہم وہاں تک چلے جائیں گے اور زیادہ سے زیادہ ۳۵ منٹ میں واپس آجائیں گے۔ تم اسٹیشن ہی پر موجود رہنا۔ ہاں اور سن لو جب ہم اشارہ کریں گے تب تم ٹکٹ لینا۔ گاڑی آئی بہت سی خوشی تھوڑی وحشت سے ملاقات کی۔ بھلے کو درجہ بالکل خالی تھا اور سردی کی وجہ سے جھلملیاں چڑھی ہوئی تھیں یہ اچھا ہوا۔

"اگلے اسٹیشن تک چلیے ساتھ رہے گا۔ شروع کی کم ہمتی میدان خالی پا کر کھل کھیلی۔ انیلے پن کو فطرت نے راہ دکھائی۔ پھر بھی جو کمی رہ گئی وہ استاد نے بتادی۔ دبکی ہوئی تھی گر یہ

صفت خواہش گناہ چمکارنے سے پھول گئی، شیر ہو گئی۔

بھئی ابابا۔ زندگی میں لتنے بڑے بڑے راز پنہاں تھے۔ اور ہم آج تک بے خبر۔ خیراب سے آئے گھر سے آئے۔ کیسا اگلا اسٹیشن اور کیسا پچھلا اسٹیشن۔ گاڑی پٹریوں پر چل رہی تھی اور ہم رنگ برنگ کے بادلوں میں سے ہوتے ہوئے چاند کے پاس پہنچ رہے تھے۔ پہلے دوسرے تیسرے نہ معلوم کس آسمان پر تھے کہ یک بارگی جو چیتے تو گھر سے تین سو میل پر ایک بڑے جنکشن کے اوپر کھڑے ہیں صرف چند ریزگاریاں اور چھ میل کا ٹکٹ جیب میں اور ٹکٹ چیکر کا سامنا ہے۔

ٹکٹ چیکر۔ یہ ٹکٹ تو صرف فلاں اسٹیشن سے فلاں اسٹیشن تک ہے۔

میں۔ ہاں آپ ہم کو ادھر کی گاڑی سے بھیج دیجیے۔ جس قدر دام کہیے گا وہیں دیں گے۔

ٹکٹ چیکر۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

میں۔ تو آپ میری گھڑی اس وقت تک کے لیے رکھ سکتے ہیں جب تک میں روپے نہ دوں۔ یا میں تار بھیج کر روپے منگوا سکتا ہوں۔

ٹکٹ چیکر۔ اور وہ لیڈی کون تھیں جو آپ کو رخصت کر کے پھر گاڑی میں بیٹھ گئیں۔

میں۔ یہ آپ کیوں پوچھتے ہیں۔ یہ میں نہ بتاؤں گا۔ آپ کو روپے چاہییے وہ آپ میری گھڑی سے وصول کر سکتے ہیں۔

ٹکٹ چیکر۔ چلیے اسٹیشن ماسٹر کے پاس۔ یہ وہی طے کریں گے۔

اسٹیشن ماسٹر نے ٹکٹ چیکر سے حال سنا۔ پھر میری طرف مخاطب ہوئے اور تقریباً سب وہی باتیں پوچھیں جو اوپر آچکی ہیں۔

اسٹیشن ماسٹر۔ اگر تار دیا جائے تو کہاں۔

میں۔ فلاں اسٹیشن کو۔

اسٹیشن ماسٹر۔ (دلچسپی سے) آپ کا نام کیا ہے۔

میں۔ (ایک ذرا رک کر) مُنّے (جو میرا عرف ہے)

اسٹیشن ماسٹر۔ (اور زیادہ دلچسپی سے) آپ کے والد کا نام۔

میں۔ (باپ کا نام غلط بتانا حمیت کے خلاف، شرافت کے خلاف یہ تو غلط نہیں بتا سکتا) میں نے صحیح نام لے لیا۔

اسٹیشن ماسٹر ہاتھ پھیلا کر دوڑے اور مجھ کو گلے سے لگا لیا۔

اس کو حسن اتفاق کہتے ہیں۔ کہاں آپ اور کہاں۔ خیر۔ آپ ہم کو کیا جانیں مگر ہم آپ کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہم نے آپ کو گودیوں میں کھلایا ہے۔ آپ کے والد سے اور ہم سے بڑے مراسم تھے۔ ہم وہاں سے برسوں ہوئے چلے آئے۔ ہمارے والد صاحب سید غلام حسین کو آپ

جانتے ہوں گے۔

اسٹیشن ماسٹر۔ جب انھوں نے دوسری شادی کر لی تو ہم لوگ اپنے ننہال چلے آئے۔ وہاں کا سلسلہ ہی چھوٹ گیا۔

میں۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔

اسٹیشن ماسٹر۔ اس وقت جو حالت میرے قلب کی ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ اس وقت وہ صحبتیں یاد آگئیں۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ مجھ کو آپ کی صورت دیکھتے ہی کچھ یاد سا آرہا تھا۔ ہنس کر۔ بی بی اور یہ لیڈی کون تھیں۔

میں۔ اب اس کو کیا کیجیے گا پوچھ کر۔

اسٹیشن ماسٹر۔ بی بی اچھا جانے دیجیے۔ مگر بی بی۔ ہمارا زمانہ بھی خوب تھا۔

==== OOOOOO ====

"دوا" کا بقیہ:

نہ تھا، جو عورت اور مرد کی محبت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

رئیس صاحب پڑھے لکھے نیک دل آدمی تھے۔ یہ بیان اس صفائی سے سن کر دنگ رہ گئے اور بجائے نفرت کے عبرت سی ہوئی۔ میاں دائم خاں مسجد سے واپس ہوئے انھوں نے ہاں ناں کچھ نہ کہا اور بیوی کو ساتھ لیے گھر چلے آئے وہاں پہنچ کر کہنے لگے۔ سب کے سب سالے ہماری آبرو لینے پر لگے ہیں مگر تم کچھ پروا نہ کرو۔ لو مسجد سے یہ مٹھائی تمھارے لیے لائے ہیں کھالو۔ تمھارا سحر گہی کا دودھ لا کر طاق پر رکھ دیا تھا جب مسجد گئے تھے دیکھنا بلی تو نہیں پی گئی۔

لیجیے صاحب قصہ ختم ہو گیا۔ میاں دائم خاں کے رقیب صاحب دوسرے دن غائب ہو گئے۔ دائم خاں کی بیوی کا کچھ خطرہ سا ٹل گیا اور تب ہی سے کچھ بہکی بہکی سی باتیں کرنے لگیں مگر اس حالت میں بھی میاں بیوی ایک دوسرے پر فدا ہی رہے بلکہ کچھ ایک دوسرے کا سہارا زیادہ ڈھونڈھنے لگے۔

==== OOOOOO ====

چودھری محمد علی ردولوی

میٹھا معشوق

اللہ بخشے مرزا صاحب کا دماغ بذلہ سنجیوں کا ذخیرہ تھا زبان چٹکلوں کی پوٹ تھی پھر عمر بھی اتنی پائی کہ دوسرے کے پاس اتنا سامان ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے علاوہ انداز بیان کچھ ایسا تھا کہ سیدھی سیدھی بات روزمرہ کے واقعات جب کہنے لگتے تھے تو داستان گو کی داستانیں مات تھیں۔ نہ معلوم کس طرح کا الٹ پھیر لفظوں کا ہوتا تھا کہ جملوں میں نئے نئے معنوں کی جھلک پیدا ہو جاتی تھی۔ فقروں میں اصلی معنی کے ساتھ ساتھ دوسرے پہلوؤں کی پرچھائیاں دکھائی دیتی تھیں جیسے نگینے کی چھوٹ پڑتی ہے۔ اختصار کے بادشاہ تھے۔ ایک دن ایک شاعر صاحب کہنے لگے میں تو بہت کم کہتا ہوں۔ مرزا صاحب بولے خیر غنیمت ہے۔ ان کا طول بھی ایسا ہی دل آویز ہوتا تھا۔ کسی نے مزاج شریف پوچھا کہنے لگے اگر شکر نہیں بھی ہے تو شکایت کی مجال کس کو ہے۔

ایک قصہ خود اپنے خاندان کا بیان کرتے تھے مگر میں وہ زبان کہاں سے لاؤں گا۔ فرمانے لگے کہ غدر کے بعد ہمارے ایک داد ھیالی عزیز تھے۔ لکھنو سے فاصلے پر رہتے تھے۔ ان کا مقدمہ فائنانشلی میں تھا۔ ریل اس وقت تک نکلی نہیں تھی۔ لوگ شکرم اور اونٹ گاڑیوں پر سفر کرتے تھے۔ امرا کہاروں کی ڈاک بٹھا کر چلتے تھے۔ متوسط حال لوگ اپنے گھر کی رتھ بہلیوں پر مع نوکروں چاکروں کے آہستہ خرام بلکہ مخرام کی چال چلتے تھے۔ انھیں حضرات میں مرزا صاحب کے چچا بھی تھے خود بہلی پر اور مصاحبت میں مختصر ریاست کے دیوان منشی بخت بلی کائستھ جن کے بغیر چھوٹی بڑی ریاست کا ہونا ویسے ہی ناممکن تھا جیسے ان کی ماش کی دال بے ہینگ کے بو جلو میں۔ کارکن صاحب جن کو نائب کہہ لیجیے ٹٹو پر۔ ایک لٹھ بند سپاہی اور دو نفر ہمراہی جن میں ایک بڑے مرزا صاحب کا خدمت گار اور دوسرا نائب صاحب کا نیم سائیس اور نیم خدمت گار اور وقت ضرورت باورچی بھی۔ میری گستاخی کی جسارت معاف ہو۔ اس جگہ میں اپنے پڑھنے والوں کا امتحان لینا چاہتا ہوں بھلا بتایئے تو اس کہانی کا ہیرو کون ہے۔ "اتنے کے بچ موری بہندیا ہرائی" ہے ان ہی لوگوں میں مگر تنکے اوٹ پہاڑ۔ اگر آپ بوجھ گئے تو ہم بھی قائل ہیں۔

بہلی کے ساز و سامان میں پچھونے، لالہ کی لوٹیا، مرزا صاحب کا لوٹا جانماز مختصر سامان مطبخ ایک عدد توا اور ایک دو پتیلیاں کچھ دال مسالے کی پوٹلی، بہلی کے پچھے جال میں مسل مقدمے کی دیوان جی کی بغل میں۔ مگر لالہ صاحب اور بڑے مرزا صاحب کے درمیان میں اور گاڑی بان کے پیچھے یہ کون چیز رکھی ہے۔ حضرت اس کو نہ پوچھیے یہی تو قصے کی جان ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو کہاں ہم

کہاں آپ، کہاں یہ کہانی۔ بڑے مرزا صاحب کے ایسے ہزاروں سفر کر گئے، ہزاروں سفر کر رہے ہیں اور لاکھوں سفر کریں گے مگر ہر مسافر کی کہانی تھوڑے ہی لکھی جا سکتی ہے۔ داستان گو اور قدر دانوں کو جمع کرنے والی وہی ہے جو بہلی کے بیچوں بیچ میں بڑی حفاظت سے رکھی ہے۔ یہ مٹھائی کی ایک ٹوکری ہے جس میں کم سے کم دس بارہ سیر مٹھائی ہوگی۔ اس پر ایک پرانی چادر سلی ہوئی ہے اور انداز سے سوغات معلوم ہوتی ہے۔ تین دن دو راتوں کا سفر ہے۔ خدا خدا کر کے پہلا دن کٹا۔ سرا کی صورت دکھائی دی۔ کمریں کھلیں۔ اسباب اتار لیا گیا۔ لالہ نے عرض کی کہ ان کے ایک عزیز کا گھر سرائے سے تھوڑی ہی دور پر ہے اگر بڑے مرزا صاحب اجازت دیں تو یہ وہیں سو رہیں۔ ضروری سامان مثل حقہ بچھونے کے کوٹھری میں اتار لیا۔ باقی بھٹیاری کی سپردگی میں دیا گیا۔ اتنے میں بھٹیاری پان کھائے ماہ لال کیے مسکراتی سامنے آن کھڑی ہوئی۔ میاں مٹھائی میرے یہاں نہ رکھتے تو اچھا ہوتا۔ میرے لڑکے بہت شریر ہیں۔ کھانے پینے کی چیز رکھنے والا میرا گھر نہیں اگر نقصان ہو گیا تو میں کہاں سے پورا کروں گی۔ بڑے مرزا صاحب پریشان ہو گئے۔ بے ساختہ اپنے خدمت گار پر نگاہ جمائی اور پھر کارکن صاحب کی طرف بے بسی سے دیکھا اور زبان حال سے بولے کہ بتاؤ اب کیا کیا جائے۔ سب بولی تو یہ ہو لالا تو فرمانے لگے کہ مٹھائی اس کوٹھری میں نہیں رہ سکتی۔ اپنے خدمت گار کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ جب تک یہ مردود یہاں ہے مٹھائی کی ٹوکری اس کوٹھری میں نہیں رہ سکتی۔

ملازم۔ (نہایت بے باکی سے۔ جس میں گذشتہ اور موجودہ جھوٹے سچے الزامات کی شکایت بھی پائی جاتی تھی) ہم آپ کی کوٹھری کے پاس نہ جائیں گے۔ اس کی مٹھائی کی طرف ہم پھر کے بھی نہ دیکھیں گے۔ راستے میں چھوڑ کر چلے جانا نمک حرامی ہے مگر گھر پہنچ کر میاں ہمارا حساب ہو جائے۔ پیچ پیچ ہزار نعمت کھائی۔ اب ہم نوکری نہ کریں گے۔ چار آدمیوں کے بیچ میں جب دیکھو آپ ہم کو چوری لگاتے ہیں۔ ہاتھ بچا ہے کوئی ذات تھوڑی بچتی ہے۔ جب آبرو ہی نہ رہی تو نوکری کس کام کی۔ اپنے گھر کے سوکھے ٹکڑے ہم کو بہت ہیں۔ جہاں کام کریں گے وہیں پیٹ پل جائے گا۔ بڑے مرزا صاحب نائب صاحب کی طرف اس طرح مخاطب ہوئے گویا انھوں نے ملازم کی باتیں سنی ہی نہیں اور کہنے لگے کہ شیخ جی یہ مٹھائی کہاں رکھوائی جائے

شیخ جی۔ آپ کو اگر ایسا ہی خیال ہے تو منشی بخت جی کے ہاتھ کر دیجیے صبح کو لیتے آئیں گے۔ ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ لالہ تمہارے نوکری ملتے ہماری طرف سے بچ سکی ہے۔ نہیں تو یہ مردود ضرور کھا جائے گا۔

بظاہر ایسے بدتمیز، بدنیت نوکر کو رکھنا مرزا صاحب ہی کا کام تھا۔ کیوں کہ جانے ہمارے بچپن کے مرزا صاحب ہی کا ہاتھ پتھر کے نیچے دبا تھا۔ گھر میں ایک نوجوان لڑکی رہتی تھی۔ اس سے بڑے مرزا صاحب سے کچھ لگاؤ ہو گیا تھا۔ بے پڑھے ستھرائی سے کم، مہذب، شائستہ۔

ذی عزت آدمی تھے مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئے تھے۔ اور اس مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں رذیل شریف سب میں مساوات ہو جاتی ہے۔

بندہ۔ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی
کاندریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

چیز اچھی تھی جیسے گھورے کا گلاب، نہ پگڑی میں لگاتے بنے نہ توڑ کر پھینکتے بنے۔ اس لیے یہی ٹھہری تھی کہ ایک ٹٹی کی آڑ ضرور ہونی چاہیے اور یہ ملازم صاحب وہی ٹٹی تھے جن کے آڑ میں شکار ہوتا تھا۔ چوں کہ ان واقعات سے تینوں فریق واقف تھے اس وجہ سے آپ ہی کہیے کہ اس تثلیث میں تفریق کیوں کر ہو سکتی تھی۔ رات کو لوگوں نے آرام کیا اور صبح اندھیرے منھ چلنے کا پاتراب ہوا۔ مگر منشی جی کو آنے میں کچھ دیر ہوئی۔ مرزا صاحب کا ملازم دوڑا گیا۔ منشی جی آئے تو مگر بہت پریشان اور شرمندہ۔

منشی جی۔ حضور۔ ایک بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ جو سزا دیجیے کم ہے۔ مجھ سے ایک چوک ہو گئی ہے۔

مرزا صاحب۔ کیا چوک ہو گئی ہے۔

منشی جی۔ چوک حضور یہ ہو گئی ہے کہ جب آپ کا خدمت گار پہنچا تو میں نے اپنے عزیز سے کہا کہ مٹھائی اندر سے منگواؤ اور میں بیٹھ کر داتون کرنے لگا۔ اتنے میں ٹوکری میں کتے نے منھ ڈال دیا۔

بڑے مرزا صاحب۔ ایں یہ کیسے ہوا۔ (خدمت گار کی طرف اشارہ کر کے) اور یہ کہاں تھا۔

منشی جی۔ یہ بھی وہیں تھے۔ انھوں نے ہی دوت دوت کہا مگر وہ منھ ڈال چکا تھا۔

بڑے مرزا صاحب۔ اجی بالکل غلط۔ کتا وتا کچھ نہیں۔ یہ اسی بے ایمان کی حرکت ہے۔ تم منشی جی اس کو کیا جانو یہ بڑا حرام زادہ ہے۔ حرام خور، نمک حرام آدمی ہے۔

ملازم۔ آپ ہم ہی کو کہتے ہیں دیکھیے کپڑا دانت سے پھٹا ہے کہ نہیں اگر میں دوت دوت نہ کرتا تو سب کھا جاتا۔

بڑے مرزا صاحب۔ کچھ نہیں ایک ہی طرف تو خراب ہوئی ہے۔ اس نے کپڑا دانت سے پھاڑ ڈالا ہو گا اور پھر دوت دوت چلایا ہو گا۔ اجی میں اس کے ہتھکنڈوں سے خوب واقف ہوں۔ بھٹیاری سے کہو کہ جلدی سے اس کو سی دے یہ مٹھائی خراب وراب نہیں ہوئی ہے۔

لیجیے صاحب دوسرے دن کا سفر شروع ہوا۔ اور شام کو بجائے سرائے میں سونے کے میدان میں پڑاؤ ڈالنے کی ٹھہری۔ چاندنی آدھی رات کے پہلے پہلے کھیت کر آئے گی۔ چپقلش سے یہ کھلے میدان کی ہوا کہیں خوش گوار ہے۔ بہلی ایک طرف کھڑی کی گئی۔ اور بیل اور گھوڑا درختوں سے باندھے گئے۔ گاڑی بان اور سائیس جانوروں کی حفاظت کے لیے نکل گئے۔ باقی

۶

لوگ مٹھائی کی رکھوالی کرنے لگے۔ بیچ میں مٹھائی کی ٹوکری اور اس کے ایک طرف بہ نفس نفیس خود مرزا صاحب کا بستر لگا۔ دوسری طرف نائب صاحب تیسری طرف منشی جی کا اور چوتھی جانب سپاہی تعینات ہوا۔ یہ دیکھ کر خدمت گار نے اپنا مختصر بچھونا ہٹ دور ہٹ کر لگایا۔ رات کو دو کا عمل رہا ہوگا کہ دور سے آواز آئی دوت، دوت۔ مرزا صاحب اٹھ بیٹھے اور نائب صاحب سے کہنے لگے۔ شیخ جی دیکھتے ہیں آپ۔ کتا اسی سالے کو دکھائی دیا اور کسی کو نہیں۔

خدمت گار۔ میاں آپ گالی دے رہے ہیں۔ وہ دیکھیے کالا کالا جارہا ہے۔ خیر رات کو بھاگتا ہوا کتا کسی کو کیا دکھائی دیا ہوگا۔ مگر ٹوکری کا کپڑا پھر اسی طرح پھٹا ہوا پایا گیا۔ اور کچھ مٹھائی بھی ادھر ادھر پڑی دیکھی گئی۔ کتے اور آدمی کا مسئلہ دوبارہ تازہ ہوا۔ آج بھٹیاری تو تھی نہیں لیکن سوئی دھاگا سپاہی کے بٹوے میں نکل آیا اور مرزا صاحب نے خود گانٹھ گونٹھ کر ٹوکری کو درست کیا اور شاموں شام بخیر و خوبی لکھنو پہنچ گئے۔

لکھنو سے دو چار کوس پہلے جب بڑے مرزا صاحب ایک خاص ضرورت سے ادھر کے کھیت کی طرف تشریف لے گئے تھے اور خدمت گار لوٹا لے کر ساتھ گیا تھا اس وقت منشی جی اور سپاہی میں مٹھائی کی باتیں چھڑیں تھیں۔ ان دونوں آدمیوں کو مٹھائی سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہو سکتا تھا اس لیے یہ لوگ بہتر رائے قائم کر سکتے تھے۔ منشی جی کا خیال تھا کہ مرزا صاحب اتنے شوق سے مٹھائی کی سوغات لے کر چلے ہیں وہ نہیں چاہتے کہ کتے والی بات ثابت ہوجائے۔ کیونکہ پھر تو مٹھائی پھینک ہی دینا پڑے گی۔ سپاہی اس کے خلاف تھا مگر اس کی بھی رائے بدل چکی تھی کہ نائب صاحب کا ملازم آگیا اور اس نے آہستہ سے کہا کہ خدمت گار نے مٹھائی کی دو ڈلیاں مجھ کو بھی دی ہیں۔ اب معاملہ صاف ہو گیا۔ مگر مرزا صاحب سے کسی نے نہیں کہا۔ بہر حال لکھنو پہنچ کر مٹھائی رات کو سرائے کی کوٹھری کے اندر قفل میں رکھی گئی۔ اور رات ہی سے صبح کو کچہری کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ منشی جی کسی اور کام سے بھیجے گئے اور خود مرزا صاحب مع نائب صاحب کے عدالت کو چلے۔ احتیاطاً خدمت گار علیہ ما علیہ کو ساتھ لے لیا کہ مٹھائی اس کے دست برد سے بچی رہے۔ عدالت کے دروازے پر خدمت گار سے بستہ مانگا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ کوٹھری ہی میں رکھا ہے۔ مٹھائی کی تباہی اور نیز لذت تینوں آدمیوں کی نگاہوں میں پھر گئی مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ وہی خدمت گار واپس بھیجا گیا اور سخت حکم دیا گیا کہ الٹے پاؤں واپس آئے۔ مٹھائی کا خیال بار بار آیا۔ مگر مجبوری تھی۔ اب مرزا صاحب کی الجھن نہ پوچھیے۔ بے چارے پریشان حال سراسیمہ ادھر ادھر ٹہل رہے ہیں۔ کیوں جی شیخ جی اگر پکار ہوگئی تو کیا ہوگا۔ مقدمہ تو خاک میں مل ہی چکا۔ غضب تو یہ ہے کہ جو کوئی سنے گا کیا کہے گا کہ گئے تھے مقدمہ لڑنے اور مِسل گھری چھوڑ آئے۔ ہمارے مد مقابل وطن پہنچ کر کیا کیا ہنسی اڑائیں گے، قصے کو کیسا کیسا مشہور کریں گے۔ نمک حرامی کی انتہا کر دی۔ اب گھر پہنچتے ہی اس مردود بے ایمان، مربی کش، محسن سوز، مار آستین کو نکال ہی دیں گے

اور بری طرح نکالیں گے ۔ بھلا میں کہتا ہوں کہ دوسرے فریق سے مل نہیں گیا ہے اور جو مسل سرا میں بھی نہ ہوئی تو ۔ یہ بڑا بے وقوف ہے اس کا اعتبار تو شاید دشمن بھی نہ کریں ۔

شیخ جی ۔ جی نہیں اتنے دنوں کا رہا سہا ہے ایسا تو کیا کرے گا دیکھیے معلوم ہوا جاتا ہے ۔ اگر پیشی کے وقت تک نہ آیا تو کوئی نہ کوئی ترکیب نکالی ہی جائے گی ۔ آپ پریشان نہ ہوں ۔

بڑے مرزا صاحب ۔ پریشان کیسے نہ ہوں ۔ سب کی کرائی محنت غارت غول ہوئی جارہی ہے ۔ نقصانِ مایہ اور شماتتِ ہمسایہ اوپر سے ۔ خدا کرے ابھی پکار نہ ہو ۔

مرزا صاحب یہ دعائیں مانگ ہی رہے تھے کہ قیامت کا صور پھنک گیا ۔ مرجا فلاں بنام فلاں کوئی حاجر ہے ۔ چہرے پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں ۔ کلیجہ بلیوں اچھلنے لگا ۔ ہاتھ پاؤں برف ہو گئے حواس یہ جا وہ جا ۔ خدمت گار سے جا طے ۔

بڑے مرزا صاحب ۔ اب کیا ہوگا ۔ شیخ جی ۔

شیخ جی ۔ چلیے تو عدالت سے عذر کریں گے ۔

خدا نے خیر کی کہ وہاں پہنچتے ہی معلوم ہوا کہ تاریخ بڑھ گئی ۔ جان میں جان آئی ۔ باہر نکلے ۔ کچھ خوش کچھ غصہ ۔ لمبے لمبے قدم رکھتے چلے کہ مسل کی خبر لیں ۔ سرا کے پھاٹک پر نائب صاحب کا نوکر دکھائی دیا ۔

بڑے مرزا صاحب ۔ اور وہ کیوں نہیں آیا ۔

نوکر ۔ اس نے کہا کہ میرے پاؤں میں موچ آگئی ہے ۔ تم لے کر جاؤ ۔

بڑے مرزا صاحب ۔ شیخ جی مٹھائی کی خیر نہیں معلوم ہوتی ۔

دور ہی سے کوٹھری کی کنڈی اتری ہوئی اور دروازہ بھڑا ہوا دکھائی دیا ۔ مرزا صاحب نے چال بدل دی اور دبے پاؤں چلنے لگے ۔ دراڑ سے بھر کر ملاحظہ کیا ۔ دیکھتے کیا ہیں کہ پلنگ پر رنگ برنگ کی مٹھائی کا چورا اور ٹکڑے بکھرے ہوئے بہار دکھا رہے ہیں ۔ ٹوکری کا گریبان پہلے ہی تار تار ہو چکا ہے اور رقیب روسیاہ کا منھ اور جیبیں پھولی ہوئی ہیں اور وہ پانچوں انگلیاں زمین پر رگڑ رگڑ کر صاف چادر پر موقع موقع سے کتے کے پاؤں بنا رہا ہے ۔ دروازہ کھلا دھڑ سے چٹاخ پٹاخ چٹ پٹ ۔ دھم پٹ تڑ ۔ بھلا بے اندھی رانڈ کے جنے آج پکڑا گیا نا ۔

==== OOOOOO ====

چودھری محمد علی ردولوی

زندگی کا مقصد

۷۵ - ۱۸۷۰ء کا قصہ ہے ظاہراً کوئی سبق بھی نہیں حاصل ہوتا مگر واقعہ سچا ہے، جس کا ہونا نوجوانوں کی سمجھ میں مشکل سے آئے گا۔ البتہ مرزا صاحب مرحوم جنھوں نے وہ زمانہ دیکھا تھا ان کو روزمرہ کی بات معلوم ہوتی تھی ۔ اس قصے کے ہیرو آغا صاحب کہلاتے تھے ۔ ان کے یہاں پشمینے کا کارخانہ تھا اور نمکین چائے خوب بنتی تھی ۔ ان سے ایک دیہاتی رئیس صاحب سے ملاقات ہو گئی ۔ آغا صاحب نے ان کی چائے کی دعوت کی ۔ دیہاتی رئیس نے خواب میں بھی ایسی چائے کبھی کاہے کو پی ہوگی ۔ جب کبھی لکھنو جانے کا اتفاق ہوتا تھا آغا صاحب کے لیے دیہات کے تحفے لے جاتے تھے اور چائے کی فرمائش ہوتی تھی ۔ رفتہ رفتہ پینگیں بڑھ گئیں ۔ اب یہ اصرار شروع ہوا کہ آغا صاحب ہمارے یہاں چلیے تاکہ وہاں کے لوگ بھی یہ چائے پی لیں ۔ مہینوں کا زمانہ وعدہ وعید میں ملا ۔ پھر مہینوں تہیہ کرنے میں صرف ہوئے ۔ اس کے بعد ایک دن آغا صاحب امام ضامن بندھوا کر چل کھڑے ہوئے ۔ بڑی آؤ بھگت ۔ بڑی خاطریں ہوئیں ۔ جن صاحب کے یہاں آغا صاحب مہمان گئے تھے ان کے یہاں دن عید رات شب برات ۔ مکان کا پھاٹک کبھی بند ہی نہ ہوتا تھا ۔ ناچ رنگ اور اسی قبیل کے مشاغل زندگی کا مزا دو بالا کیے ہوئے تھے ۔ گئے تو تھے ایک ہی دن کے لیے مگر کچھ ایسا لطف آیا کہ ایک دن اور بھی رہ گئے ۔ تیسرے دن چلنے کا ارادہ کیا ۔ لوگوں نے توجہ دلائی کہ تیسرا دن مہمان کے جانے کا نہیں ہوتا ۔ چوتھا دن اسی رعایت سے گذرا ۔ پانچویں دن ارادہ مصمم ہو گیا کہ آج ضرور جائیں گے ۔ اتفاق سے اسی دن سنیما کی زبان میں ایک نئی آرٹسٹ کا مجرا تھا ۔ کہا گیا کہ غضب کیجیے گا بغیر ان کو سنے چلے جائیے گا ۔ اس کے بعد آغا صاحب نے کپڑے نہ ہونے کا عذر کیا ۔ خیر یہ کوئی ایسا مشکل مسئلہ نہ تھا ۔ اسی وقت درزی بیٹھ گئے ۔ مردانے جوڑوں کی تیاری میں کتنی دیر لگتی ہے ۔ ایک چھوڑ کئی جوڑے تیار ہو گئے ۔ اس عذر میں ایک کے بجائے دو دن گذر گئے ۔ اب پھر روانگی کا پاترا ب ہوا مگر دن کی نحوست کے خیال سے ارادہ فسخ ہو گیا ۔ اسی طرح کبھی تاریخ نحس ہوئی، کبھی پچھم کا چالانہ ہوا، آج قمر در عقرب ہے تو کل تحت الشعاع، کبھی ریل چھوٹ گئی ۔ کبھی کوئی خاص دوست سے عین وقت پر رخصت نہ ہو سکے ۔ غرض کہ روانگی کی گھڑی یوں ہی ٹلتی رہی ۔ حضرات ناظرین اگر روز

روز کا حساب بنایا جائے تو اس مشکل زمانے میں کاغذ کہاں سے آئے گا۔ قصہ مختصر گیارہ برس اسی میں گذر گئے اور آغا صاحب وہیں کے ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ اتنا زمانہ صرف دور کی دلچسپیوں میں کیسے صرف ہوتا۔ ہوتے ہوتے ایک نقلی بیڑی بھی پاؤں میں پڑ گئی۔ اس کے بعد دو ایک ہتھکڑیوں کا بھی اضافہ ہو گیا۔ اب جانے میں کچھ شرم مانع ہوئی۔ کچھ دل نے بھی نہ چاہا۔ بات ہمیشہ آئندہ پر اٹھتی رہی۔ اس گیارہ برس کے دوران میں والد ماجد کی علالت اور بعد کو انتقال کا بھی خط آیا مگر یہاں کی خاک کچھ ایسی دامن گیر تھی کہ نہ جاسکے۔ انتقال کی خبر سن کر بالکل تیار ہو گئے تھے۔ مگر لوگوں نے سمجھایا کہ تمھارے لیے جنازہ رکھا ہو گا؟ اب اگر جانا ہی ہے تو کل جانا تاکہ سیوم میں شرکت ہو جائے۔ مگر کچھ ایسے اتفاقات پیش آئے کہ سیوم میں بھی نہ پہنچے۔ اسی طرح ماں بھی مریں کارخانہ بھی تباہ ہوا اور مکان بھی گر گیا۔ زمین دوسرے شرکا نے لے لی۔ اب کیا تھا جس کے لیے جاتے۔ دو برتن پاس ہوتے ہیں تو کسی نہ کسی طرح ٹھیس لگ ہی جاتی ہے۔ اسی طرح گیارہ برس کے بعد رئیس صاحب سے کسی بات پر شکر رنجی ہو گئی اور ہمارے آغا صاحب روٹھ گئے۔ لکھنو جاکر کس کو منھ دکھاتے اس لیے کلکتے کی سیدھ باندھی۔ جانے کو تو چلے گئے مگر دل نہیں لگتا۔ وہاں پر ہر شخص کاروباری اپنے دھندے میں لگا ہے۔ آپ کی زندگی ٹھہری بھونرا تتلی کے انداز کی کہ پھول پر بیٹھے رس چوسا اور اڑ گئے۔ زندگی کا مقصد جوانی اور جوانی کا مقصد اپنے رنگین پروں کا مقابلہ۔ پھولوں کی رنگینی سے رس جمع کرنے والے اور ہوں گے۔ یہ تو اس برج دیس کے کنہیا تھے جہاں پھول کا مقصد پھل نہیں بلکہ صرف خوش بو تھا۔ جہاں بہار کا مقصد نامیہ نہیں بلکہ رنگوں کی نمائش تھا۔ حکیم ابیقورس کے نام لیوا۔ آئندہ اور گذشتہ سے بے پروا حال پر جان قربان کرنے والے اس زمانے میں آغا صاحب ہی تو تھے۔ اس وجہ سے وہی صحبتیں وہی احباب ہر وقت نگاہ کے سامنے پھرا کرتے تھے۔ کام کرنے کی عادت کبھی رہی تو کوئی مشغلہ اختیار کرلیں۔ ہمت ہر کام کی باندھتے ہیں مگر ہوتا کچھ نہیں۔ بیڑی تو گیارہ برس میں پڑی اور کٹ بھی گئی۔ مگر دو ہتھکڑیاں تین سو کوس پر بھی چین نہیں لینے دیتیں۔ ادھر رئیس صاحب بھی پریشان ہیں۔ مجبوراً ایک بے تکلف مصاحب روٹھے کو منانے کلکتے بھیجے گئے۔ آغا صاحب پھر چلے آتے ہیں۔ وہی دن ہیں۔ وہی راتیں۔ زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا۔ اسی کو اہل جہاں انقلاب سمجھے ہیں۔ لیجیے صاحب رئیس صاحب کا انتقال ہو گیا۔ صحبت درہم برہم، یار احباب تتر بتر۔ شیرازہ ہی نہ رہا تو اوراق کہاں کے۔ مگر اس سرزمین میں بلا کی کشش ہے کہ پاؤں اب بھی نہیں اٹھتے۔ اس دائرہ احباب میں ایک صاحب کھانے کا تمباکو بناتے تھے مگر نسخہ بتاتا کیا معنی کسی کو ہوا بھی نہ لگنے دیتے تھے جو سمجھتے تھے "دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔" اور یہاں یہ حالت کہ بغیر اس تمباکو کے پان کا

ذائقہ اور مزہ نہیں۔ اور بغیر پان کے زندگی کا مزہ نہیں۔ ادھر منھ میں گلوریاں رکھیں ادھر رئیس صاحب اور وہی صحبتیں یاد آگئیں۔ خود تو اچھے چلے گئے۔ ہماری زندگی ملیامیٹ کر گئے۔ ہم کو ساتھ نہ لے گئے۔ لعنت ہے ایسی زندگی پر۔ تف ہے ایسے جینے پر۔ خیر خدا رزاق ہے کھانے کا انتظام تو ایک دوسرے رئیس صاحب کی شریف پروری سے ہو گیا۔ رہا حقہ کبھی خود بھرنے کی عادت تو تھی نہیں۔ شروع شروع نہ معلوم کتنی چلمیں اٹھا کر پٹخ دیں نہ معلوم کتنی بار انگلیاں جلیں۔ مگر رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو گیا۔ البتہ تمباکو کی مشکل نہ حل ہونا تھی نہ حل ہوئی۔ اب کیا کیا جائے۔ اتنے میں پتہ چلا کہ کوئی اور صاحب فیض آباد میں رہتے ہیں۔ ان کے پاس بھی کوئی نسخہ تمباکو کا عمدہ ہے۔ تمباکو کی طلب بہتوں کو تھی مگر ہمارے آغا صاحب کو بری طرح لت پڑ چکی تھی۔ بے چارے سب کام چھوڑ کر فیض آباد دوڑے گئے۔ وہ تمباکو بھی کھایا۔ واہ وا۔ یہ تو وہی چیز ہے بلکہ اس سے بھی بہتر ہے۔ کیا لعاب بندھتا ہے اور جب تک ذرا سا بھی پان منھ میں ہے وہی ذائقہ قائم بلکہ ایمان کی تو یہ ہے پتی کی تمباکو میں گول دانہ ایسا نہ دیکھا نہ سنا۔ مگر یہاں بھی نسخہ اسی احتیاط سے بندھتا ہے اور مال اسی طرح تیار ہوتا ہے کہ پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ آغا صاحب نے دوستی پیدا کی ہر وقت ساتھ رہنے لگے۔ جہاں وہ صاحب بازار کو چلے یہ سائے کی طرح ساتھ ہیں۔ انھوں نے پنساری سے کوئی چیز خریدی نہیں کہ آغا صاحب نے بیاض پر ٹانک نہیں لی۔ انھوں نے بھی ایک چیز آج لی ایک کل۔ ایک اِس دکان سے ایک اُس دکان سے۔ مگر آغا صاحب ہیں کہ ٹوہ لیتے جاتے ہیں۔ "تم ڈال ڈال تو ہم پات پات۔" انھوں نے ایک دوا تمباکو کی اگر خریدی تو اس کے ساتھ دو ایک دوائیں باؤ بھر لگ تر کور اور لے لیں۔ اب جو آغا صاحب نسخہ تیار کرتے ہیں تو نہ معلوم کیسا سیٹھا پھیکا ہو کر رہ جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ تمباکو کے کیمیاگر کے ایک مطلقہ لڑکی ہے۔ عمر سن تو ہے نہیں کوئی چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ مگر ہے تو عورت اور سوا اس کے بڈھے بڑھے کے اور کوئی آگے پیچھے نہیں ہے۔ وہ مارا۔ ترکیب سمجھ میں آگئی اس لڑکی کا پیغام بھجواؤ۔ طلاق نہ معلوم کیوں ہوئی تھی۔ آج تک بیٹھی کیوں رہ گئی ان سب باتوں کو کون سوچے۔ "در کارِ خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست۔" یہی نا کہ بد مزاج ہوگی۔ اجی ہم ایسی خاطر کریں گے کہ وہ ہم سے مزاج کی لیں گی ہی نہیں۔ جب ہم کلیجہ کاٹ کر رکھ دیں گے تو کب تک دل نہ پسیجے گا۔ جب ہم ان کی راہ میں آنکھیں ہی بچھا دیں گے تو بھنوؤں کی کمان کیسے نہ اترے گی۔ "ہر چہ گیری رضائے تو۔" ہم کو تو تمباکو کا نسخہ چاہیے۔ اس میں جو کچھ برداشت کرنا پڑے اور ممکن ہے کہ کچھ ایسی پرگت مل جائے کہ اس کی نوبت ہی نہ آئے۔ کچھ ایسا جوڑ توڑ مل جائے کہ کھٹ پٹ ہو ہی نا۔ چناں چہ رقعہ بھجوا ہی دیا۔ اے سبحان اللہ سات پشتوں میں کہیں بال برابر کا بل نہیں۔ لڑکی والے کیا عیب

نکال سکتے تھے۔ رہی دولتِ دنیا تو وہ نہ اُدھری تھی نہ اِدھر۔ مگر اس کی فکر نہ لڑکی والوں کو ہے نہ لڑکے والوں کو خدائے رب العزت نے کہا ہے کہ یغنہم اللہ من فضلہ۔ پھر تشویش کس بات کی لیجیے صاحب مبارک ہو عقد ہو گیا۔ آغا صاحب کے نہ صرف بی بی ہاتھ آئی بلکہ تمباکو کا نسخہ بھی مل گیا۔ نکاح کے وقت ایک ذری سی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ کیوں کہ لڑکی والے خاندان کے مراسم کے موافق ایک لاکھ من زرِ سرخ سے مہر کم نہیں کرتے تھے۔ اور ان کے طرف دار اُسّی (۸۰) ہزار من سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ مگر آغا صاحب کے اشارے سے یہ بھی برداشت کر لیا گیا اور دلہن رخصت ہو کر ایک کرائے کے مکان میں اتار دی گئی۔ رفتہ رفتہ یہی تمباکو کا نسخہ دونوں کا ذریعۂ معاش ہو گیا اور آغا صاحب اور ان کی اہلیہ کے ساتھ قبر میں دفن ہو گیا۔

"عشق بالواسطہ" کا بقیہ:۔

دیکھیے ۔۔ یا اے گی۔

منورما۔ آپ اپنے لڑکے کو کچھ پیغام تو نہ دیجیے گا۔ کیوں کہ کل کمیونسٹ جلسے میں ان سے ملاقات ضرور ہوگی۔ وہ تو لکھنؤ کی کمیٹی کے سکریٹری ہیں نا؟"

میں۔ جی اسے تو کچھ کہنا نہیں ہے۔ مگر آپ سے ایک درخواست ہے۔ اگر ہو سکے تو ہمارے لڑکے ہی پر عاشق ہو جائیے گا۔

منورما۔ میں حتمی وعدہ تو نہیں کر سکتی مگر کوشش کروں گی۔ ختم

اس مضمون کی تنقید خود مصنف کے قلم سے۔ ڈاکٹر جانسن نے بادشاہ جارج سے کہا تھا کہ نئی باتیں آدمی صرف تیس سال تک سیکھتا ہے۔ اس کے بعد اسی پرانے علم کی جانچ، رگڑ تگڑ ہوا کرتی ہے۔ چمک صفائی زیادہ ہو جاتی ہے۔ لیکن چیز وہی رہتی ہے۔ بارنرڈ شا نوے سال سے اوپر کے ہیں۔ ان کے عنفوانِ شباب کے ناول دیکھیے، جوانی کے ڈرامے دیکھیے، جو چمک، جو شفافی، دو آخری ڈراموں میں ہے اس پر عش عش کیجیے لیکن غور سے دیکھیے تو پتا چلتا ہے کہ وہی اگلے برس کی تیلیاں ہیں۔ خالی اوپر کی جگمگاہٹ، رونق اور ٹھاٹھ دل آویز ہے۔ نئی بات بڑھاپے میں کہاں جو کچھ ہے وہی غنیمت ہے۔

جب بارنرڈ شا کا یہ حال ہو تو ہم کس کھیت کی مولی ہیں۔ لہٰذا امید ہے کہ تنقید کرنے میں بوڑھے کا دل رکھ لیجیے گا۔ بقول رسکن کے تصویر میں "یہ نہ ڈھونڈھو کہ کیا نہیں ہے بلکہ جو کچھ ہو اس کی تعریف کرو۔" اس نظر سے اگر دیکھا جائے تو مصنف کا نذر انداز اور ریلزم قابل داد ہیں:

پیری کے دلولے ہیں خزاں کی بہار ہے

چودھری محمد علی ردولوی

عشقِ بالواسطہ

لارڈ کرزن ہندوستان کے سابق وائسرائے اور انگلستان کے مشہور سیاست داں کی بابت مشہور تھا کہ وہ "میں" کا استعمال بہت کرتے۔ تھے قیصر ولیم شہنشاہ جرمنی میں بھی لوگ یہی عیب بتاتے تھے۔ نفسیات کے ماہرین کہا کرتے تھے کہ یہ لوگ اپنی انانیت کی وجہ سے وہ وہ ٹھوکریں کھائیں گے کہ ان کے مرنے کے بعد بھی دوسرے یاد رکھیں گے۔ وہ دونوں تو چل بسے اب اس زمانے میں ایک ہم ہی خودی کے قدرداں رہ گئے ہیں۔ رہے نام اللہ کا۔ تو ہم بھی کب تک۔ ناظرین کو اگر میری بات میں شک ہو تو واحد متکلم کا صیغہ اس تحریر میں گنتے جائیں۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے، معلوم ہی ہو جائے گا۔ میرے ان دونوں ہم خیالوں میں صفات یہی تھے جن کو سراہنے میں ان کو لطف آتا تھا۔ ہم میں ذری صفات کی کمی رہ گئی ہے۔ اس لیے ہم اپنے عیوب ہی کا ذکر کر کے سڑا منھ سوندھا کرتے ہیں۔ عیوب کا لفظ ہم نے مصنف خوار معترضین کا منھ بند کرنے کے لیے استعمال کیا۔ اگر ہم ان کو واقعی عیب سمجھتے تو بیان ہی کرنے کیوں بیٹھتے۔ زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ کمزوریاں کہہ دیتے۔ وہ بھی آپ کی خاطر سے ورنہ ہم تو ان کو صفات ہی سمجھتے ہیں۔ اپنے عیوب اور صفات کی طویل فہرست میں ہم جس عیب کا تذکرہ کرنے جاتے ہیں وہ صنفِ نازک سے تعلق رکھتا ہے۔ دنیا عجب جگہ ہے۔ یہاں دل میں کچھ ہو مگر زبان پر وہی ہوگا جس کو سننے والے اور کہنے والا سب ہی بی جھوٹ جانتے ہیں۔ مگر سچ پکارتے رہتے ہیں۔ آپس میں سمجھوتا اسی پر ٹھہرا ہے۔ جیسے چوروں میں ہوتا ہے۔ عورت کا نام آیا نہیں کہ ان حضرات کا ذہن عیوب کی طرف منتقل ہوا نہیں۔ اب لا حول و لا قوۃ بے الحیاء من الایمان ہے۔ استغفر اللہ کا زور بندھا ہے۔ دل کا حال تو خدا ہی جانتا ہے کہ صرف منھ میں شیخ فرید ہے ورنہ بغل میں اینٹھیں ہم سے بھی زیادہ لیے ہیں اور ہم ہیں کہ حافظ شیرازی، شیخ سعدی اور عمر خیام اللہ تعالیٰ کے قدموں سے لگے مونچھوں پر تاؤ دیتے چلے جاتے ہیں۔

من ارچہ عاشقم و رند و مست و نامہ سیاہ
ہزار شکر کہ یاران شہر بے گنہ اند
گر کند میل بخوباں دل من خوردہ مگیر
کیں گناہ ہے است کہ در شہر شما نیز کند

باماہ جبیں نشستہ در ویرانے
عیشے است کہ ہست حدِ ہر سلطانے

تو وجہ کیا کہ ہمارے دشمن لوگ عورت کا صرف ایک ہی مصرف جانتے ہیں اور ہم خدا کی اس "موہبت عظمیٰ، عطیۂ کبریٰ" کی قدر پہچانتے ہیں کہ چاہے ابو الآدم کی پہلی خدائی خلافت ہو چاہے ابو القاسم محمدؐ کی آخری رسالت ہو۔ حوا اور خدیجہ سلام اللہ علیہما کی ضرورت ہمیشہ تسلیم ہوئی ہے تو ذرا غور فرمائیے۔ حضرت آسیہ نہ ہوتیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کیسی بنتی۔

پولیٹکل ضرورت سے ایک بار ہم الہ آباد گئے۔ کئی دن کی مصروفیت اور ہم آدمی ٹھہرے کاہل۔ مگر لطف کے جلسے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ ہم سے زیادہ ہماری بی بی پریشان ہو گئیں۔ مہاوٹیں جو برسنے لگیں تو ڈنر ٹیبل اور ڈرائنگ روم، پارٹیوں اور چائے کی دعوتوں کا مزا کرکرا ہو گیا اور بی بی کی طرف سے واپسی کا اصرار شروع ہوا۔ اپنی بی بی کے مزاج سے کون نہیں واقف ہوتا۔ اس لیے میں نے کہا بھی کہ ابھی تو دو ایک ساڑیاں اور جوڑے بن ٹھنے رہ گئے ہیں جلدی کاہے کی ہے مگر ان کی ضد بڑھتی ہی گئی۔

میں۔ "اور وہ سبز پائپنگ والی شفن جارجٹ ساری اور نیا سٹ!"

بی بی۔ "ہوگی۔ وہ ساری اور نیا سٹ۔ کوئی ہم سے چھین لے جائے گا! دیکھ رہے ہو یہ بن برسات کی برسات لگی ہے۔

بوتات والی کوٹھری ساون میں کتنی ٹپکتی تھی۔ اور اناج یوں ہی ٹوکروں میں بھرا چھوڑ آئے ہیں۔"

یہ نسوانی دلیل پائپنگ والی ساڑی اور نئے سٹ پر بھی غالب آگئی اور ناچار ایک عنایت فرما کو معذرت کا خط بھی لکھنا پڑا کہ ہم لوگ سخت مجبوری میں گھر واپس جارہے ہیں اور کل کے ڈنر میں نہ شریک ہونے کا ہم دونوں آدمیوں کو بڑا قلق ہے۔

میں۔ "صرف جج صاحب کے یہاں جانا رہ گیا۔ صبح ان کے یہاں ہوتے ہوئے مکان نکل چلیں گے۔"

بی بی۔ "ان کے یہاں جانا بہت ضروری ہے۔ نہیں تو بڑی شکایت ہوگی۔ مگر زیادہ دیر نہ لگانا تم تو جہاں بیٹھ جاتے ہو اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے ہو۔

دوسرے دن صبح کو نو بجے ہم لوگ جج صاحب کے یہاں پہنچے خود جج صاحب تو تھے نہیں مگر ان کے چھوٹے بیٹے اور جج صاحب کی بی بی تھیں۔ ایک مہمان بھی ٹھہری تھیں۔ تعارف ہوا، باتیں ہونے لگیں، یہ صاحبزادی ابھی ابھی آکسفورڈ سے واپس آئی ہیں۔ جج صاحب کے صاحبزادے اور یہ لوگ کمیونسٹک انداز کے لوگ ہیں۔ خیر پولیٹکل خیالات سے اس وقت نہ ہم کو دلچسپی ہے نہ ان

جھگڑوں میں پڑنے کو دل چاہتا ہے۔ ہم تو کسی ایسے ستارے کی گردش میں پیدا ہوئے ہوں گے جہاں عورت کا راج ہو گا۔

اب بھی ہمارے آگے یارو جوان کیا ہے

ان صاحب زادی سے تعارف میرا کرایا گیا کہ فلاں شخص کے والد ہیں۔ ایک وقت تھا کہ ہمارا تعارف لوگوں سے اس طرح کروایا جاتا تھا کہ فلاں کے بیٹے ہیں فلاں کے داماد ہیں اور اب یہ زمانہ لگا ہے کہ فلاں کے باپ ہیں اور فلاں کے سسرے ہیں، مگر ہم چکنے گھڑے ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ ہم وہ نہیں رہے۔

وہ صاحب زادی: آپ سے مل کر بڑا جی خوش ہوا۔ (اپنے میزبان کی طرف اشارہ کر کے) ان سے اور اپنے دوسرے دوستوں سے آکسفورڈ میں اور یہاں بھی آپ کے لڑکے کی بڑی تعریفیں سنی ہیں۔ آج کل کہاں ہیں؟

میں۔ جی ہاں۔ یقیناً لکھنؤ میں ہوں گے۔

صاحب زادی: ہم لوگ اس وقت دریا کی سیر کو جا رہے ہیں۔ چلیے آپ بھی چلیے۔

میں۔ میں تو کل ہو آیا ہوں مگر چلیے ضرور چلوں گا (اپنی بی بی کی طرف مخاطب ہو کر) پھر اس وقت کا جانا ملتوی کر دو۔ شام کو چلیں گے۔

اناطول فرانس، میر تقی میر، ویلیسکیز، فردوسی، ریمبرانٹ، سعدی، گوئٹے اور رفیلؔ روحیں میری مدد کو پہنچو۔ تمھارے اس ناچیز مرید پر بڑا سخت وقت پڑا ہے۔ تم نے بڑے گاڑھے وقتوں میں میری مدد کی ہے۔ میری کمزور انگلیوں میں حس دو۔ میرے گھسے پٹے قلم کو موقلم کا زور بخشو کہ اس گھڑی کی تصویر اتار دے۔

ہماری کمسن بی بی نے کہا تو صرف "اچھا" مگر ان کے چہرے پر اس مایوسی کی جھلک دکھائی دی جو ارادہ فسخ ہونے پر پیدا ہوتی ہے۔ فلسفیانہ تاسف کی مسکراہٹ نے زبان حال سے کہا "ہم نے تو ان کی صورت دیکھتے ہی سمجھ لیا تھا کہ تم پھسل پڑو گے۔" ماتھے کی خفیف شکن اور ابرو کی کمان نے کہا تمھارے سن کی زیادتی سے اور نیز اس وجہ سے کہ ہم سے محبت کرتے ہو اطمینان ہے کہ افلاطونی محبت سقراطی محبت تک نہ پہنچے گی۔ پھر بھی ہماری مسکراہٹ پر نہ جاؤ آنکھوں نے یہ بھی کہا کہ اس وقت غیر جگہ نہ بیٹھے ہوتے تو رنگ دوسرا ہوتا۔ مگر تم پریشان نہ ہو گھر پہنچ کر بھی ہم لڑیں گے نہیں۔ عادت کے گھٹنے پڑ چکے ہیں۔" ہونٹوں نے کہا "اور بات خدا لگتی کہنا چاہیے۔ تمھاری بچوں کی ایسی باتوں پر ہنسی بھی تو آتی ہے کہ جہاں کسی نے چٹکی بجائی تم گیگلے بچے کی طرح ہمک کر اسی کی گود میں پہنچ گئے۔" گردن کے ڈورے نے ایک طرف پھر کر کہا۔ "ارے تم شام کو بھی نہ چلو گے۔ ہم تو جانتے ہیں نا! خیر۔ دریا کی سیر ایک بار پھر ہو جائے گی اور وہ یاپونگ والی ساڑی اور نیاسٹ بھی سوارت ہو جائے گا۔ ہمارا ابھی تو ہاتھ نگوڑا پتھر کے نیچے دبا ہے

چلو یوں ہی سہی۔"

کالوں نے ٹھڈی کی مدد لے کر کہا۔ "ہم بھی تو تمھارے پیار سے بے بس ہیں۔"

بنگالی کی شاخ کا چشمہ انگلستان کے پودے پر بندھا۔ منورما اپنے ملک کو واپس آئیں۔ آکسفورڈ کے فرسٹ کلاس کے نیچے کبھی بات نہیں کی۔ ہندوستان آئیں جو دیکھتا ہے کہتا ہے "واہ واہ۔"

صورت شکل کوئی دنیا سے نرالی نہیں ہے۔ مگر وہ بات جس کو شیراز کے حافظ جی "آن" کہا کرتے تھے، ہر چیز سے پیدا ہے۔ کچھ ناگن کی سی چال، کچھ برق تمثال، کچھ پھول، کچھ کلی، آدھی بند آدھی کھلی چاندنی کی سی بے تکلفی، علم کی خود اعتمادی، کمیونسٹ فلسفے کی بنا پر برابری کا دعویٰ۔ خود نسوانیت کے حقوق نہیں مانگتی تھیں مگر مردوں میں کچھ ایسا رومانی اثر پیدا ہو جاتا ہے کہ ہر شخص خراج تحسین لیے حاضر ہے۔ آنکھوں سے باتیں کریں، ہنسی سے خوشی پیدا ہو، ہونٹوں کی جنبش میں پسندیدگی ناپسندیدگی ----- گال، ناک ماتھا مسائل حل کر رہے ہیں۔

نہ گفت و من بشنیدم ہر آنچہ گفتن داشت
کہ در بیان نگہش کرد بر زبان تقدم
وہاں چو نوبتِ خویش از نگاہ باز گرفت
فتاد سامعہ در موج کوثر و تسنیم

میرے پڑھنے والو! معلوم نہیں کہ تم میرا مضحکہ اڑاؤ گے یا خود اپنے آنے والے بڑھاپے کا خیال کر کے عبرت برمذ پیشگی کرو گے، مگر ہم تو کھیت رہے۔ انا للامانات وانا الیہن راجعون۔ کہاں کی واپسی اور کیسا رختِ سفر۔ اس وقت چائے ہے تو اس وقت سنیما ہے۔ سیر ہے، تفریح ہے رشتہ در گردنم افگندہ دوست می دبرجا کہ خاطر خواہ اوست۔ ایک کوی ہمارے ہی ایسے اگلے زمانے میں بھی گذرے ہیں خالی وہ جوان تھے ہم تجربہ کار ہیں۔ شحنہ۔ عشق ان پر بھی ہماری ہی طرح سوار تھا۔ وہ بے چارے جنگل جنگل اپنی معشوقہ کا نام لیتے پھرتے تھے اور نعرے لگاتے تھے کہ "او حسینہ میری نیند اڑالے جانے والی، مجھ کو راتوں کو جگانے والی۔ ان کا خدمت گار بھی ساتھ ساتھ تھا۔ دبی زبان وہ بھی کہتا جاتا تھا" میری بھی نیند اڑالے جانے والی۔ مجھ کو بھی راتوں کو جگانے والی۔" یہی حال ہماری بیگم صاحبہ کا تھا کہ وہ بھی کچھ ہنسی کچھ غصہ، زبان حال سے وہی خدمت گار والی باتیں فرماتی تھیں۔ گو تجربے کی بنا پر ان کو اطمینان تھا۔ پھر بھی "دل نہ اڑ جائے کہیں دام سے تیرے صیاد گرچہ پژمردہ ہے یہ صید و لے طیر تو ہے" عمر بھر کے ساتھ کا وعدہ خدا کے سامنے رسول کے سامنے، پنچ برادری کے سامنے کر چکی تھیں۔ بھلا ایسے وقت میں ایک باؤلے کو بغیر رسی کے یوں ہی کیسے چھوڑ دیتیں۔ صبح کی گاڑی تو چھوٹ ہی چکی تھی۔ شام کی گاڑی گئی۔ اب دوسرے دن کا پاترا رکھا گیا۔ مگر منورما بولیں" کمیونسٹ پارٹی کی ماہوار میٹنگ کل ہو گی۔ ہم تم

کو بھی ممبر کرنا چاہتے ہیں اس کے بعد چلو تو ہم بھی لکھنو جائیں گے۔ تمھارے گھر رائے بریلی تک ریل پر بھی ساتھ رہے گا۔" میرا تو ذکر ہی کیا مگر منورما کی وجہ سے صحبتیں کچھ ایسی دلچسپ ہو گئی تھیں کہ خلاف امید میری بی بی بھی ایک دن اور ٹھہرنے پر راضی ہو گئیں۔ عموماً ان جلسوں میں ایک ہم ہی مسن ہوتے تھے۔ ورنہ عورت مرد سب وہی تھے جن میں امنگ، جوانی، تہیہ، ارادہ ہمت، آئندہ کی امیدیں موجود۔ مختصر گزشتہ قریب قریب مفقود۔ ان صحبتوں میں ہر فرد پڑھا لکھا زیادہ تر دو ہی قسم کی باتیں ہوتی تھیں یا قربانی، خدمت، کارل مارکس کے اصول کی بے دھڑک پابندی۔ ہتھیلی پر جان لے کر کام کرنے کی، یا کھلے ڈلے جنسی طلسمات۔ دونوں قسموں میں جوش قدرِ مشترک۔ کیا کہنا جوانی کا۔ اصول اخلاق کی نئی دلآویز تفسیریں، جوانی کے خواب کی نئی تعبیریں۔ جنس کے دنیا ساز قیود ٹوٹے پڑے تھے۔ البتہ فطرت کی حفاظتیں مجبوراً برقرار تھیں۔ مساوات نے عورت مرد کا فرق کم کر دیا تھا۔ اگر کسی نے لڑکی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ جھجکی نہیں۔ اگر کوچ پر کوئی کسی سے بھڑ کر بیٹھا تو تعجب نہیں۔ تھوڑی بے تکلفی اور بڑھ گئی تو کمر میں ہاتھ ڈال کر بیٹھ گئے۔ یہ باتیں دیکھ کر ہماری بی بی کی آنکھیں کھل گئیں:

بیٹھے بیٹھے کچھ مزا ہم کو بھی اب آنے لگا
اب تو ہم بھی درد دل میں مبتلا ہونے لگے

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ بے جھجک اس میدان میں آگئیں مگر شعور باطن ان کا بھی کمیونسٹ ہی ایسا معلوم ہوا۔

بجائے ان کے اب ہم گھر کی واپسی کے منصوبے باندھنے لگے۔ ہماری بیگم بھی کمیٹی میں شریک ہوئیں۔ ناواقف کاری کی وجہ سے زیادہ حصہ تو نہ لے سکیں مگر بہت ذہانت اور دلچسپی سے جلسے کی کاروائی سنا کیں۔ گہرے مسائل تک تو شاید نہ پہنچتی ہوں مگر دبی زبان سے اتنا تو کہا کہ جب مرد ایک سے زیادہ شادی کرتے ہیں تو عورت بھی اپنا یہ حق کیوں نہ لے۔ ناظرین، ہم نے واپسی کا ارادہ مصمم کر لیا۔ آج پہلے پہل شام ہم نے اپنی قیام گاہ ہی پر بسر کی اور رات وہی اپنے ستارے کی گردش کے اثر سے بیگم اور منورما کے منصوبوں میں گزاری۔ صبح کو ریل پر منورما کا آخری مرتبہ ساتھ ہوا۔ دریا کی سیر میں منورما نے کچھ تصویریں احباب کی اتاری تھیں وہ دکھائیں: ہم نے اپنے چہرے کی شکنیں دیکھ کر اللہ کا شکر بھیجا کہ آدمی خود اپنی صورت نہیں دیکھ سکتا۔ اسی کے ساتھ ہم نے یہ بھی محسوس کیا کہ باوجود چہرے پر آلو کے ہمارے دل کو تصویر سے ایک تشفی سی بھی ہوئی، اسٹیچو ہو کہ تصویر ہو، اولاد ہو کہ تصنیف ہو، جہاں اس فنا کے چھتھرے کو کسی نہ کسی صورت سے کچھ دن اور بھی دنیا میں رہنے کی آس ہوئی۔ دل خوش ہی ہو جاتا ہے۔

لیجیے صاحب رائے بریلی کا اسٹیشن آگیا۔ ہم ہاتھ ملا کر ریل گاڑی سے اترے۔ ہم نے اپنے دل میں کہا "خوش درخشید و لے دولت مستعجل بود۔" اب یہ موہنی صورت پھر کاہے کو

(بقیہ ص ۴۰۹ پر)

چودھری محمد علی ردولوی

نیک کام

مرزا صاحب کہنے لگے لوگ اپنی نیکیاں نہیں بیان کرتے۔ہم کو اپنے نیک کام کا ذکر کر کے لطف آتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ شاید یہ ہو کہ ہم اپنی چھوٹی چھوٹی برائیاں بھی کہہ گزرتے ہیں اور پیٹ میں کوئی اچھی بری بات رکھ نہیں سکتے، ممکن ہے یہ سبب ہو کہ جو لوگ بہت نیکیاں کرتے ہیں وہ کہاں تک یاد رکھیں اور ہم سے اگر کوئی اچھی بات ہو جاتی ہے تو وہ ہر وقت دماغ میں کھیلا کرتی ہے۔ جیسے وہ عورت جس کا ایک ہی بچہ ہو اور وہ چاہے کہ اس کا بچہ کسی وقت نگاہ سے اوجھل نہ ہو۔ اگر کسی کے بہت سے ہوئے ممکن ہے کہ اس کے خیال سے بعض وقت کوئی بچہ اتر بھی جائے۔ یا یہ بات ہو کہ مذہب کی طرف سے ہم کچھ بے پرواہ ہیں اور اچھائیاں برائیاں جہنم کے خوف یا بہشت کی لالچ سے نہ کرتے ہوں۔ بلکہ زیادہ تر فطرت کے تقاضے سے کرتے ہوں اور بہشت دوزخ بجائے دوسری دنیا کے خود اپنے دل ہی میں پاتے ہوں۔ بہرحال جو کچھ ہو واقعہ سنیے ہم کو تھوڑی دیر کے لیے بھاڑ میں جھونکیے۔ میں اس وقت یہی کوشش کر رہا ہوں گو مشکلیں پڑ رہی ہیں اللہ کرے کامیاب ہو جاؤں۔

گرمیوں کا زمانہ ہے، پہاڑی کا مقام ہے ہوٹل میں، ہمارا کمرہ شاگرد پیشہ کے پاس ہے۔ ہوٹل کے فیشن ایبل مہمان اس طرف کا راستہ بھی نہیں چلتے۔ حالاں کہ پہاڑ کی سنہری دھوپ کا لطف جیسا اس طرف ہے دوسری طرف خواب میں بھی نہیں دکھائی دیتا۔ پاس ہی نوکروں چاکروں کے لڑکے کھیل رہے ہیں۔ میلے، کچیلے، دبلے بعض بیمار بھی ہوں گے بعض کی صورتیں اچھی بھی ہیں مگر گندے کپڑوں اور میلے چہروں میں ایسے چھپے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا۔ مگر سب خوش ہیں اور شور مچا رہے ہیں۔ ان کو دیکھ کر مفلسی، بیماری، غریبی کا خیال اللہ میاں کے خزانے کی تازہ ہوا اور جنت کے ایسے موسم کا مزا کرکرا کر دیتا ہے اسی لیے بڑے بڑے روشن خیال فلاسفر اور قومی خدمت کرنے والے رفارمر جو ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں ادھر نہیں آتے ہیں۔ ان بچوں میں ایک لڑکی بھی ہے کوئی آٹھ نو برس کی ہوگی۔ یہ کھیل میں کیوں نہیں شریک ہوتی؟ اے ہے۔ یہ تو ایک ہی ہاتھ کی ہے۔ دوسرے ہاتھ میں کوڑھ کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ ارے تیرا ہاتھ دیکھیں "نہیں کوڑھ نہیں ہے۔ جل گیا ہے۔ یہ کیسے جلا؟

لڑکی ۔ ہم کو نہیں معلوم ہم بہت چھوٹے تھے تب جلا تھا۔

میں ۔ ارے اس زخم کی دوا نہیں کرتی ہے۔

ایک نوکر ۔ جاتی تو ہے اسپتال۔ مگر روز چھٹی کہاں پاوے۔

میں ۔ کیوں اس کو کون کام ہے۔

نوکر ۔ اس کو مالی نے اپنے لڑکے کے واسطے دو سو کی مول لیا تھا اس کی ساس بڑی جالم ہے۔

میں ۔ ارے اس کا بیاہ ہو گیا ہے؟

لڑکی ایک ذرا سا گھونگھٹ نکال لیتی ہے اور چہرے پر سے بچپن دور کرکے بیاہی عورت کی ذمہ داریاں لانے کی کوشش کرتی ہے۔

ناظرین تیار ہو جائیے۔ قصے کا نچوڑ آگیا۔ میں تصویر کھینچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ بھی موقلم لے کر بیٹھ جائیے۔ جہاں مجھ سے رنگ بھرتے نہ بنے وہاں آپ میری مدد کیجیے گا اور اپنی لطافتِ خیال سے تصویر مکمل کیجیے گا۔ اتنا سمجھ لیجیے کہ ہندوستانی لڑکیاں سرد ملکوں کی لڑکیوں سے پہلے نسوانیت کی ذمہ داریاں محسوس کرنے لگتی ہیں۔ یہ نکتہ مجھ کو سر آرتھر سائمن نے سروجنی نائیڈو کے حال بیان کرنے میں بتایا تھا۔ دوسری بات میں خود عرض کرتا ہوں۔ غریبی کی درس گاہ میں بچہ بہت جلد پڑھ لکھ کر فاضل ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے ساتھ بیماری حیرانی بھی لگ گئی جیسا کہ اکثر ہو جاتا ہے تو کیا کہنا۔ پھر تو زمانے کا گرم سرد ایسا سمجھنے لگتا ہے کہ ہم آپ جن پر مصیبت نہیں پڑی ہے کیا سمجھیں گے۔ آپ نے کسی چھوٹے بچے کو پیاس کے پنجے میں مبتلا نہیں دیکھا ہے جتنی مصیبت وہ بے زبان اپنی آنکھوں سے کہہ گذرتا ہے عاشق کی نگاہ کیا کہے گی۔"

دوسرا نوکر ۔ حضور یہ تو ہاتھ کی وجہ سے سو روپے کی بھی مہنگی تھی نہ جانے مالی نے اس کو اتنے داموں پر کیوں لے لیا۔

اب لڑکی پر نہ بچپن کا الڑھ پن پایا جاتا تھا نہ ہی بیاہی عورت کی ذمہ داری کا اثر۔ اس کا چہرہ ہر طرح کے تاثر سے بالکل خالی اور صاف ہو گیا۔ اس طرح کے مباحثے اپنی بابت جب سے اس گھر میں آئی تھی ہمیشہ سنتے سنتے عادی ہو گئی تھی اس لیے اس کے چہرے پر نہ غصہ تھا، نہ تعجب، نہ شرم۔ ان سب کے بجائے میرے دماغ میں وہ چھوٹا سا گھوڑا پھر گیا جو بچپن میں میرے لیے ایک مرتبہ خرید اجا رہا تھا اور لوگ اس کی بال بھونری دیکھ کر اس کے دام لگا رہے تھے۔ جانور کو اس کی کیا خبر کہ اس کی تقدیر کا فیصلہ کیوں کر ہوتا رہتا ہے۔ لیکن انسان کے بچے پر اگر سماجی ظلم ایسی مصیبت ڈھاتا ہے تو وہ سمجھے یا نہ سمجھے مگر اس کا شعور باطن برچھی پر برچھی اور گھاؤ پر گھاؤ کھاتا رہتا ہے۔ لڑکی کے دلی کیفیات کا حال اللہ جانے مگر مجھ کو کسی نے ذ ھکیل کر اس لڑکی کے قریب

(بقیہ صفحہ ۴۱۹ پر)

چودھری محمد علی ردولوی

نفاست

مرزا صاحب نے بڑی عمر پائی۔ ۱۰۹ برس کے سن میں ابھی تھوڑے دن ہوئے کہ انتقال کیا ہے۔ مرنے کے دو چار دن پہلے تک وہی انداز رہا جو ہم لوگ ہمیشہ سے دیکھتے چلے آئے تھے۔ کچھ انگریزی سے بھی واقف تھے۔ نہیں معلوم نوابی میں کس سے پڑھی تھی۔ نئی باتوں میں تو حافظہ ضرور کم زور ہو گیا تھا مگر پرانی باتیں اسی طرح یاد تھیں اور اس وضاحت سے بیان کرتے تھے کہ تصویر کھنچ جاتی تھی۔ الفاظ منھ سے نکلتے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ تختے پر موقلم کا کام کر رہا ہے۔ خوش بیانی کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ منھ سے پھول جھڑتے تھے۔ جی یہی چاہتا تھا کہ "وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔" بچہ ہو، جوان ہو، بوڑھا ہو، عورت مرد سب یہی چاہتے تھے کہ مرزا صاحب باتیں کیے جائیں۔ ملیا انگلستان کی کاہے کو یورپ کی مشہور گانے والی کے نام سے کسی نے اپنی تصنیف کو یوں عنوان دیا تھا۔ "اس بلبل غریب کے نام جو ملیا کو سن کر چپ ہو گئی۔" بس مرزا صاحب جب باتیں کرتے تھے تو اسی بلبل کی طرح سب چپ ہو جاتے تھے۔ احباب میں سے کسی نے شعر پڑھا:

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

اس شعر کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں کہ مرزا صاحب آ گئے۔ حسبِ عادت، ہم لوگ اپنے خیالات چھوڑ کر مرزا صاحب کی باتیں سننے کے مشتاق ہوئے، اور شعر پھر سے پڑھا گیا۔ مرزا صاحب۔ "شعر کے اچھے ہونے میں کلام کیا ہے۔ مگر مجھ کو ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ساٹھ برس سے اوپر کی بات ہو گی۔ نوابی جا چکی تھی مگر نوابی کی بو ویسی ہی باقی تھی۔ ناچ گانے کے جاننے والے اور پہنچاننے والے جب گھروں کے اندر بیٹھتے تھے تو بھول جاتے تھے کہ دنیا بدل گئی ہے۔

کتھکوں کا ایک خاندان شجاع الدولہ بہادر کے وقت سے لکھنؤ میں آ کر بسا تھا ہر صاحب کمال قدر دان کی تلاش میں رہتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ لوگ بھی اس شہر پر جان فدا کیے ہوئے تھے۔ اور یہیں کے نام سے بکتے تھے۔ اس خاندان نے ناچ میں لکھنؤ کا نام اونچا کر دیا تھا۔ لکھنؤ نے بھی ان کے ساتھ یہ کیا تھا کہ پرانی مثل یعنی "کتھکوں کی بسا ہند نہیں جاتی" ان کے لیے غلط ٹھہرا دی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں تک ترہنگ کا تعلق تھا یہ عیب ان میں نام کو نہیں رہ گیا تھا۔ دوسرے خالص ناچوں کا حال جو جانتے ہوں وہ جانیں۔ ناچ علمِ سینہ بھی ہے اور علمِ سفینہ

بھی ۔ جس کو جس قدر پہنچا ہے سامنے رکھ دے اور دامن جھاڑ کر ہٹ آوے اِس امانت میں خیانت کی گنجائش نہیں ۔ دوسرے چیز بھاؤ بتانا ہے ۔ اس میں ہر شخص کی ذہانت اور جودت اس کے ساتھ ہے ۔ استاد کا کام صرف راہیں دکھا دینا ہے ۔ آگے تم جانو تمھارا کام ۔ ذہنِ رسا جہاں تک لے جائے بڑھتے جاؤ ۔ مگر یہ کھیل ایسا نازک ہے کہ جس میں اچھائی برائی کے مدارج نہیں قائم کیے جاسکتے ۔ اگر اچھا ہے تو بھاؤ ہے اور اگر بھونڈا ہے تو کوئی دوسری بلا ہے ۔ بات شیطان کی آنت ہو گئی مگر آپ لوگ میری بکواس سنتے ہیں اس لیے اگر کہیے تو بھاؤ بتانے کی ایک مثال بھی دیتا چلوں ۔ ہم لوگ "ضرور ضرور" "مرزا صاحب ۔" "بہت خوب ۔" "میر مونس کے پڑوس میں ایک بھانڈ رہتا تھا ۔ بچپن میں دونوں ساتھ کھیلے تھے ۔ بڑھ کر دونوں کی راہیں جدا ہو گئی تھیں مگر رشتہ باقی تھا ۔ ایک مرتبہ اس بھانڈ کو ایک مشکل آن پڑی ۔ مشکل یہ تھی کہ "کوری گگریا" بتانا تھا ۔ مگر ذہن وہاں تک نہیں پہنچ رہا تھا ۔ موقعہ پاکر میر مونس مرحوم کے پاس آیا ۔ ادھر ادھر دیکھ کر کہنے لگا ایک کام ہے اگر کر دینے کا وعدہ کیجیے تو کہوں ۔ کہو تو ۔ نہیں وعدہ کر لیجیے ۔ وعدہ کیسے کر لیں ۔ اگر امکان میں ہوا تو کریں گے ۔ آہستہ سے ، کوری گگریا سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے بتاؤں ۔ ہائیں ۔ لاحول ولا قوۃ میں کیا جانوں ۔ بھانڈ (پاؤں کا پنجہ پکڑ کر) ۔ حضور میں تو یہ قدم نہ چھوڑوں گا ۔ بچپن سے جوتیاں سیدھی کی ہیں اسی دن کے لیے ۔ اگر آپ نے نہ بتایا تو میں جان دے دوں گا ۔ میر صاحب (سنجیدہ ہو کر) "کواڑ بند کر او ۔" مونس صاحب نے بائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیاں اوپر کیں جیسے پھول کی آدھی سے ایک ذرا زیادہ کھلی ہوئی کلی ہوتی ہے ۔ ہاتھ چہرے کے برابر ، اور سامنے لائے داہنے ہاتھ سے ڈھیلی ڈھیلی مٹھی باندھی اور بیچ کی انگلی کو سیدھی کرکے آدھی اس طرح خم کی کہ بیچ کا پور دوسرے پوروں سے آگے نکلا رہا اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے کچھ بلندی پر خیالی گگریا کو ٹھونکا مار دیا ۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا ۔ بھاؤ بتانے میں صرف ذاتی ذہانت ہی سے کام نہیں لینا پڑتا بلکہ یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ کس کے سامنے کمال دکھایا جا رہا ہے ۔ انھیں کتھکوں میں کا ایک فن کار ، عالی قدر والا جاہ نواب وزیر مرزا بہادر چو لکھی والے "کدر پیا" کے سامنے مجرا کر رہا تھا ۔ جوانی کا عالم تھا جوہر شناس کا سامنا تھا ۔ جان توڑ کر اپنے کمالات دکھائے ۔ اصطلاحوں میں باتیں ہوئیں ۔ انکسار کے ساتھ داد چاہی ۔ فراخ دلی سے حوصلہ افزائی کی گئی ۔ ناچ کے بعد بھاؤ بتانے کا وقت آیا ۔ گانے کی چیز کوئی ہو فن کار نہ معلوم کتنی خوب صورتیاں نکال لیتا ہے ۔ کتنی جدتیں پیدا کر لیتا ہے ۔ سویفٹ کے لیے کسی نے کہا کہ اگر وہ جھاڑو کی سوانح عمری لکھنے بیٹھتے تو وہ بھی دل آویز ہوتی ۔ یہی حال بھاؤ بتانے والے کا ہے کہ اگر لطافت رکھتا ہو تو کیسی ہی بھدی چیز ہو ۔ خوب صورت سے خوب صورت تصویریں دکھاتا چلا جائے گا ، چیز جو اس نے شروع کی آپ کے شعر سے ملتی جلتی تھی "وہیں جاؤ جہاں رہے رتیاں ۔" کئی طرح اٹھیسار دکھایا ۔ مان دکھایا ۔ برہا کا خاکہ اتارا اور نہ معلوم کتنے پہلو ، گوشے پیش نظر کر دیے آخر میں ایک پاؤں ڈگ گیا ۔ کی کرائی محنت پر پانی پھر گیا ۔ موقع

یہ تھا اب مُکرو نہیں۔ تمھارے کپڑوں کی خوش بو سے یہ ثابت ہے کہ تم سوت کے یہاں تھے۔ دیکھو تمھارے لباس میں کون عطر ہے اور تمھاری بغل سے کس زمانے عطر کی لپٹیں آرہی ہیں۔ معشوق کو بغل سے جو نسبت ہے وہ ظاہر ہے مگر بغل سے مطلب پہلو ہے اور کھٹک نے غضب کیا کہ واقعی بغل کی طرف اشارہ کیا بس غضب ہو گیا۔ حضور کی لطافتِ طبع نزاکتِ مزاج کو ایسی ٹھیس لگی کہ منھ پھیر لیا۔ ہے ہے بد مذاقی کی انتہا کر دی۔ یہی بات دکھانی تھی تو پہلے آستینیں سونگھتا پھر دامن سونگھتا دونوں میں مختلف خوش بوئیں کہاں سے آئیں " وہیں جاؤ جہاں رہے رتیاں " مطلب حاصل تھا۔

==== OOOOOO ====

"نیک کام" کا بقیہ:۔

کر دیا اور میرا ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹھڈی میں لگا دیا۔ اس کے چہرے کو پیار سے دیکھنے کے لیے میری گردن کو ایک طرف جھکا دیا۔ مجھ کو نہیں معلوم جو الفاظ میری زبان سے نکلے وہ کس نے کہلائے لیکن میرے کانوں نے سنا کہ میں کہہ رہا ہوں دو سو روپے! دو سو روپے تو بہت کم ہیں۔ ہم سے کوئی تین سو روپے ابھی لے لے!!!

لیونارڈو۔ڈا۔ونچی کی روح میری مدد کر۔

چھوٹی سی مالن کے چہرے پر نئی بات سن کر پہلے تو تعجب ظاہر ہوا اس کے بعد شکر گزاری کی جھلک دکھائی دی۔ پھر خوب صورتی کا احساس۔ دل آویزی کا ادعا۔ ناز و شوخی کی جھلک پیدا ہوئی پھر بن بیدھے موتی کی آب اور عورت کی خودی نے چہرے کو بو قلموں بنا دیا۔ اے ہے پھر بھی تصویر ناقص رہ گئی۔ ان سب باتوں کے ساتھ بچپن کی خوشی بھی چہرے پر کھیلنے لگی۔ ہماری مالن اپنی کوٹھری کی طرف مسکراتی چلی جاتی تھی اور مجھ کو پھر پھر کر دیکھتی جاتی تھی اور میرا دل چاہتا تھا کہ اس بچی کے قدموں کے نیچے آنکھیں بچھاتا جاؤں۔

===== OOOOOO =====

چودھری محمد علی ردولوی

مرزا منش

یاد احباب کے سلسلے میں رطب و یابس سب ہی آجاتا ہے۔ قصہ بھی میرے بچپن کا ہے۔ بہت سی باتیں خیال سے اتر گئی ہوں گی۔ ہماری یاد کے ہیرو دو بھائی تھے بڑے کا نام مرزا عابد اور چھوٹے کا نام مرزا سجاد تھا۔ ان لوگوں نے بہتر دن دیکھے تھے اور ان کے خاندان والوں کا بڑا زمانہ تھا۔ عالی ہمتی اور دولت مندی کی نشانیاں آج بھی کھنڈر کی صورت میں باقی ہیں۔ ان کے مورث کئی پشتوں سے ردولی میں آکر بسے تھے۔ سب صاحب جائداد۔ مرزا سجاد کے نانا چکلے دار تھے جن کا مکان امام باڑہ پائیں باغ۔ ٹوٹے در باو قعت گواہ ہیں۔ مرزا صاحب کے والد کی شادی لکھنو میں ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں ان دونوں بھائیوں نے تربیت یا بے تربیتی لکھنو میں حاصل کی تھی۔ یہ تو پرانی باتیں ہوئیں اس وقت خاندانی اور اکتسابی صفات غریبی کی وجہ سے حسب ذیل پائے جاتے تھے۔

بہادری، سیر چشمی، قد کی لمبائی مع اپنے دوسرے لوازم کے، فضول خرچی، دوستی کا نباہ، ڈنڈے بازی اور ضرورت پڑے تو جگت بازی بھی۔

چھوٹے چھوٹے مشاغل مثل مرغ بازی، بٹیر بازی کے شریفانہ زندگی کی حماقتیں تھیں۔ بڑے بھائی کو ان چیزوں کا شوق خاندانی روایات کی وجہ سے رہا ہوگا مگر ہم نے جب دیکھا تب صرف چھوٹے بھائی انہماک رکھتے تھے۔ مرزا عابد اپنے چھوٹے بھائی کو اولاد کی طرح چاہتے تھے اسی وجہ سے ہر شوق میں چھوٹے بھائی کی پشت پناہی کیا کرتے تھے۔ گذر اوقات کے لیے لکھنو میں ایک سدا برت تھا جو پچاس ساٹھ برس ادھر خوب بٹا کیا اور اب بھی کبھی کبھی دیکھنے میں آجاتا ہے۔ سدا برت ان پرانی چیزوں کا ہوتا ہے جو بگڑے رؤسا کاروباری زندگی سے ناواقف ہونے کی وجہ سے احباب یا دوسرے آدمیوں کے ذریعے سے بیچا کرتے ہیں۔ اس میں ہزاروں چیزیں ہوتی تھیں۔ سونا، چاندی، جواہرات، شال کے ریزے، پرانی چینی، تصویریں، قلمی نسخے، اس کو سدا برت اس لیے کہا گیا ہے کہ بگڑی سرکاروں سے یہ چیزیں برآمد ہوتی تھیں اور سوا ان سرکاروں کے سب کو مالا مال کر دیتی۔ مرزا صاحب بھی یہی کرتے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ عطر، کچھ قوام کا تمباکو وغیرہ بھی رکھتے تھے۔ اسی طرح دوڑ دھوپ کر چھوٹے بھائی کے شوق اور گھر کی روٹیاں پوری کیا کرتے تھے ان کی طبیعت میں نرمی بردباری تھی مگر خاندانی خصوصیات ضرورت کے وقت ان میں بھی موجود تھے۔ قصہ مختصر بس یہ سمجھ لیجیے کہ مرزا عابد، شری رام چندر جی کی طرح نرمی ہی برت سکتے تھے مگر

مرزا سجاد لچھمن جی کی طرح سپر نکھا کی ناک کاٹنے پر تلے ہی رہتے تھے۔ اسی وجہ سے اکثر محلے والے ان حرکات سے پریشان ہو کر یہ شعر کہنے پر اتر آئے تھے۔

کریما بہ بخشائے برحال ما
ردولی سے آئے ہیں دو ظالماں

ہمارے دونوں مرزا منش مرغ اور بٹیر کی پالیوں میں بازیاں اسی انداز سے بدتے تھے جیسے آغا خان یا مہاراجہ بڑودہ گھوڑ دوڑ کھیلتے ہیں کہ جیت میں جتنا ہاتھ آیا اس سے پچاس گنا زیادہ خرچ ہو گیا مثلاً فتح مند بٹیر یا مرغ کی سواری دولھا کی طرح حضرت عباس کی درگاہ جاتی تھی۔ چڑھاوے چڑھتے، نذریں دی جاتی تھیں۔ جب جائداد یں مہاجنوں کے بھینٹ چڑھ گئیں تو بازی لگاتے وقت نفع نقصان کا بھی خیال ہونے لگا۔ ضرورت نے دوسروں کے مال پر اوپر کی بازیاں لگانے پر مجبور کیا۔ آج جتنا پیسہ فلش، سولو میں گھڑی بھر میں نکل جاتا ہے۔ اتنا دون تگون چوگون میں دن بھر میں نہیں نکلتا تھا مگر اس زمانے میں روپیہ اس قدر تھا کہاں۔ تب بھی تباہی پھیلانے کو جتنا تھا وہی کافی تھا۔ رہا لطف! حضرات اس کی نہ پوچھیے۔ انگریزی کھیل گالف دیکھنے میں بڑا نرم کھیل معلوم ہوتا ہے نہ کوئی جوش نہ خروش، گہما گہمی نہ طنطنا۔ کاندھے پر لکڑی رکھے کف دست میدان طے کرتے۔ پوقدمے چلے جاتے ہیں۔ کیڈی یعنی لکڑیاں لادنے والا لونڈا دُم میں لگا ہے۔ دیکھنے والے کی سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ یوں ہی گھٹ مکر سے کی ٹھہری ہے یا کوئی نتیجہ بھی نکلے گا۔ مگر جو لوگ جانتے ہیں وہ جانتے ہیں جو نہ جانتے ہوں جان لیں کہ ہاتھ خالی جانے پر جز بز ہونا، پاؤں پٹخنا، دانت پیسنا، ڈیم کی جھڑ باندھ دینا، کھیل کے چٹخارے کو کافی چوکھا کر دیتا ہے۔

اسی طرح بٹیر بھی دیکھنے میں تو مٹھی بھر ہے مگر جب لڑتا ہے تو دونوں پالنے والے اس سے کڑے لڑتے ہیں۔ حریف کا بٹیر جولات مارتا ہے وہ پالنے والے کے سینے پر موگری ہو کر پڑتا ہے جو منھ مارتا ہے وہ بٹیر باز کے کلیجے میں برچھی کی انی ہو کر چبھتا ہے۔ پھر اس کے بعد حریف کے زبان کی چوٹیں تیر تلوار کا کام کرتی ہیں۔ تلوار کا زخم اچھا ہو جاتا ہے زبان کا زخم تب ہی بھرتا ہے جب دوسرا تیر، ہمارا بھی ترازو ہو جائے اور ہم بھی چوکھے جملے تیز فقروں سے کسر نکال لیں۔

مرزا صاحب کا ایک بٹیر صوف کرتا تھا اور حریف کا گلا پکڑ کر جھنجھوڑیاں بتاتا اور سینہ تان کر پر پھلا کر مقابل کو ڈھکیل ڈھکیل کر پالی باہر کر دیتا تھا اور چھوڑنے کے پہلے پوٹے میں پنجے گڑو کر ایسی لات بتاتا تھا کہ بٹیر باؤلا ہو جاتا تھا۔ اس صوفی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ جس دن نواب الن صاحب کے کٹہروے کو اس نے بھگایا ہے بڑی شدت ہوئی۔ نواب کے بٹیر نے بڑی راڑ ڈالی مگر صوفی وہ صوف کیا کہ حریف نوک دم نکل گیا۔ مرزا صاحب کی لمبائی کی رعایت سے نواب صاحب کے مصاحبین کی طرف سے شور تھا مار بینترا ڈھیسک کو مرزا صاحب کی داڑھی کی رعایت سے پکار رہے تھے ہاں بیٹا گل چھوؤں کی ٹھیک آج نکل جائے۔ مرزا کا بٹیر بڑھ گیا۔ پھر کیا

تھا مرزا صاحب کے طرف داروں کی چڑھ بجی تھی ۔ قریب تھا کہ بٹیر کی جگہ آدمی لڑنے لگیں ۔ مگر نواب صاحب خاندانی شائستہ ۔ ان لوگوں کے منھ کیا لگتے ۔ مصاحبین بھی کپڑوں میں بے موقع شکن پڑ جانے کے خیال سے طرح دے گئے ۔

خیر یہ تو لکھنو کے لوگ تھے اگلا جمعہ ایسا پڑا جس میں باہر والوں سے شد تھی ۔ پٹھان لوگ یوں ہی لڑنے کو تیار رہتے ہیں نہ کہ جب پالی پڑ جائے ۔ دو چار موقعے ایسے ہو چکے تھے جس میں بٹیر کسی کا بڑھے مگر آدمی باہری والوں کے زور دار رہتے تھے ۔ دیہاتی کانوں کی لو تک لاٹھیاں باندھے فوج داری کے نہ معلوم کتنے میدان سر کیے ۔ لکھنو والوں پر ایسی دھونس ڈالتے تھے کہ ان غریبوں کی زبان بند ہو جاتی تھی ، منھ پر ہوائیاں اڑنے لگتی تھیں ۔ مرزا سجاد کہنے لگے یار ان لوگوں نے تو کچا کر لیا ہے ۔ جب دیکھو دبا لیتے ہیں ۔ کیا لکھنو والے ایسے بیٹھے ہو گئے کہ جس کا جو جی چاہے کہہ جائے اور ہم لحا بدیں ۔ دو چار منچلے نوجوان تیار ہو گئے ۔ جمعہ آیا ، گونگے نواب کی بارہ دری میں پالی تھی ۔ دو چار شرفا جن کو اس تیاری کی سن گن مل چکی تھی گھری سے نہ نکلے ۔ باقی لوگ مرزا سجاد کی سرکردگی میں پہنچ گئے ۔ دیہات والوں کا غول بھی پہنچ گیا کہ کریز تو بیٹھ چکے تھے دو ایک نو کارا بھی مد پر تھے ۔ ان کی بھی لڑائی ختم ہوئی ۔ لکھنو والوں کا پالا بہت گرم رہا ایک بٹیر بھی ان کا نہیں بھاگا نہ برابر پر چھوٹا ۔ اب نئیوں کی باری آئی ۔ مرزا صاحب نے ایک نئے پر بڑا ریاض کیا تھا ۔ جس بٹیر سے اس کی شد ہوئی تھی وہ دو بٹیر بھگا چکا تھا ۔ اس لیے اب کی مرزا صاحب کا بٹیر اس کے مقابلے پر آیا تھا ۔ مرزا کے بٹیر نے کابک سے نکلتے ہی ٹھاٹھ کیا ۔ مرزا صاحب کی چھاتی پہاڑ ہو گئی مگر اتنا بڑا کھلاڑی ایک بات میں چوک گیا ۔ وجہ یہ ہوئی کہ آج جیت کی خوشی میں احتیاط ہاتھ سے جاتی رہی تھی ۔ حریف کا بٹیر ان کا پہچانا ہوا ضرور تھا مگر چوک یہ ہوئی کہ اس کو آج پھر اچھی طرح دیکھا نہیں ۔ لیجیے صاحب لڑائی شروع ہوئی ۔ ارے یہ کیا غضب ہوا ۔ ہر منھ پر مرزا صاحب کا بٹیر سو کھتا چلا جاتا ہے ۔ دوسری مصیبت یہ ہوئی کہ ان کے بٹیر کے منھ میں پر آگیا ، اب جو غور سے دیکھتے ہیں تو حریف کے بٹیر کے نوک پنجے بنے ہوئے ہیں ۔ یہ کیا ہوا اتنے اتنے بڑے مبصروں کا مجمع اور جیت کی خوشی میں آنکھوں پر ایسے پردے پڑ گئے کہ اس چلین پر کسی نے نظر ہی نہ کی ۔ ایں یہ کیا ہے ! مرزا صاحب یہ کہہ ہی رہے تھے کہ بٹیر نکل گیا ۔ دہ مارا کا شور ہوا ۔ ایک طرف سے آواز آئی کل مغل یون ۔ مرزا صاحب کے مورث بکسر میں کھیت رہے تھے ۔ شجاع الدولہ کی شکست کی یہ تاریخ ہوئی تھی ۔ مرزا اپنے حواس سے چوک گئے ۔ آنکھوں پر پردے پڑ گئے ۔ حریف کا بٹیر دانے پر لگا تھا مرزا صاحب نے اٹھا کر پٹخ دیا ۔ خاں صاحب مرزا سے لپٹ گئے ۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کرنے کے بجائے اپنی اپنی پالی الگ الگ قائم کر دی ۔ لات ، گھونسا ، تماچہ ، کشتم کشتا ، گدم پٹخنی کا بازار گرم ہو گیا ۔ کابکیں ٹوٹی پڑی ہیں ۔ انگرکھے عشاق کا گریبان ہو گئے ۔ مرزا صاحب کے بڑے بھائی جو الگ بیٹھے تھے وہ بھی اکھاڑے میں اتر آئے ۔ اتنے میں پٹھانوں نے لاٹھیاں سنبھالیں ۔ گونگے

نواب کی بارہ دری کوئی اینچ خاں کا میدان تو تھا نہیں جہاں لاٹھیاں گھوم سکیں ۔ لکھنو والے چھوٹے چھوٹے ڈنڈے آستینوں میں لیے تھے ۔ بند جگہ پر خوب کام کرنے لگے ۔ بڑی گھمسان ہوئی وہ یورش پڑی کہ رن بولنے لگا ۔ ہمارے مرزا ہیں کہ بپھر بپھر کر حملے کر رہے ہیں ۔ بانک بنوٹ، پھکو اظفر پیکر کے کمالات دکھا دکھا کر لوگوں کے دل بڑھا رہے ہیں ۔ پٹھان بڑی بودی مار کھا رہے ہیں اتنے میں کسی دیہاتی نے چکو چلا دیا ۔ ہائے کا نالہ مار کر نواب للن صاحب کا ایک عزیز گر پڑا ۔ خون دیکھ کر لڑائی کے خاتمے کی صورت بندھی ۔ دیہاتی مثل ہے کھائے اور پڑ رہے مارے اور ٹل رہے ۔ باہر والوں نے جانا قتل ہو گیا، وہ تو صفائی دینے کی فکر میں اپنے گھروں کو بھاگے ۔ لکھنو والوں نے بھی دیکھا معاملہ سنگین ہو گیا ۔ اتنے میں لال پگڑی دور سے دکھائی دی ۔ اب کیا تھا جس کے سینگ جدھر سمائے نکل گیا ۔ بارہ دری میں دو چار جنٹیل کھیلے پڑے اور فاتح جنرل مرزا کھڑے ہیں گذشتہ مہابھارت کے آثار بتانے کو چالیس پچاس جوڑے جوتے ادھر ادھر دکھائی دے رہے ہیں ۔ دوسروں کے تو خیر معمولی چوٹیں کھرونچے، گلم، موچوں کے آئی تھیں ۔ جس شخص کے چاقو لگا تھا وہ البتہ لہو لہان سانس نہ ڈکار غش میں پڑا تھا ۔ مارنے والے نے بڑا کاری ہاتھ پیٹ پر مارا تھا مگر خدا کا کرنا ایسا کہ کنجی کے چھلے میں چکو کی نوک پھنس کر ادھر ادھر تک صرف ایک گہرا سا خط دیتی چلی گئی تھی ۔ زخمی نے دو پشتوں کی غلامی میں اتنا خون اتنا لمبا زخم کاہے کو دیکھا تھا ۔ بے تکلف جان بحق تسلیم ہونے کے ارادے سے لیٹ گئے غش بھی آ گیا ۔ ان کے خیال میں وعدہ پورا ہو رہا ہے ۔ ابھی پولیس تحقیقات ہی کر رہی تھی کہ ان کے گھر والوں کو خبر ہوئی ۔ تو چل میں چل سر وپا برہنہ مرد اور بین کرتی ہوئی ڈولیاں سینہ کوٹتی ہوئی انّا ئیں، چھو چھو خادمائیں، مہریاں ایک تانتا بندھ گیا ۔ پولیس نے ایک نہ سنی ۔ مضروب کو معائنے کے لیے اسپتال چلتا کیا اور مرزا صاحب کا چالان بول دیا ۔ اب معاملے نے ایک نئی صورت پکڑی ۔ یعنی ہر شخص پورے واقعے کا ذمہ دار سجاد مرزا صاحب ہی کو ٹھہرانے لگا ۔

عدالت کے جھمیلے سے تو یوں چھٹی ملی کہ ڈاکٹر نے صرف ضربِ خفیف لکھی ۔ مرزا صاحب اس طرح بچے کہ ملزم تو ضرور حوالات میں تھا مگر مستغیث کا کہیں پتہ نہ تھا ۔ عربی قواعد میں ایسا مفعول بھی ہوتا ہے جس کے فاعل کا پتہ نہ ہو یہاں ایسا فاعل تھا جس کا مفعول ڈھونڈھے نہ ملے ۔ خیر بڑی آفت سے بچے ۔ مرزا سجاد کے اکھڑ پن سے پولیس یوں ہی پریشان تھی ۔ محلے والے روز ان کا دکھڑا روتے تھانے پہنچا کرتے تھے ۔ لہٰذا تھانے دار صاحب نے ان کو بلا کر کہا کہ اگر تم اپنی خیر چاہتے ہو تو لکھنو خالی کر دو نہیں تو ہم تم کو بے کرائے کے گھر پہنچائے بغیر دم نہ لیں گے ۔ مرتا کیا نہ کرتا ۔ بے چارے لکھنو چھوڑ کر اپنے موروثی وطن ردولی پہنچے ۔ یہاں پشتینی گھر گر چکا تھا ۔ اپنے ماموں کے یہاں رہنے لگے ۔ بڑے بھائی محبت میں جب چھٹی ملتی تھی آکر دیکھ جاتے تھے ۔ پھر چلے جاتے تھے ۔ اگر وہ بھی یہاں رہ جاتے تو پیٹ کہاں سے بھرتا ۔

اس تازہ مصیبت سے تکلیفیں بڑھ گئیں تھیں مگر عمر بھر کی پڑی ہوئی عادتیں کیسے بدلتیں وہی ڈینڈا وہی باتوں کا انداز وہی شرافت کی جھلک۔ رہے ہتھکنڈے اجی اس سے شرافت کو کیا بٹا لگتا ہے۔ اہلِ وطن بھی حسب رواج ملک غریبی کو الگ چیز سمجھ کر ان کی قدر کیا کیے۔ اگر کوئی سیدھی طرح بولا تو مرزا سجاد انکسار سے بچھ گئے اگر کسی نے امیری کی لی تو مرزا سجاد ماش کا آٹا ہو گئے ماموں صاحب بھی پریشان حال تھے صرف گنڈا، تعویذ فال کھولنے پر گذر اوقات تھی مگر:

طبل و علم ہی پاس کچھ اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہوکے کرے گا زمانہ کیا

بھانجے کو اسی طرح گلے لگایا۔ رہو جو کچھ میسر ہو تم بھی کھاؤ نہ ملے تو یوں ہی پڑ رہو۔ ایک دن مرزا عابد آئے، اپنی فلاکت پریشانی کا دکھڑا رویا جا رہا تھا۔ وہ یکہ ہی چلاتے تھے۔ بھلے کو اس وقت مرزا عابد کے پاس روپیہ تھا۔ ڈیڑھ سو نکال کر کھٹ سے گن دیے۔ اب مرزا صاحب یکے والے ہو گئے۔ ردولی چھوٹی سی جگہ اور وہ بھی پچاس پچپن برس ادھر کی۔ قصبے میں دو چار یکے پرانی گورکھپوری چال کے تھے جن میں دوہرے ہم اسپتالوں کی بیسا کھی کے ایسے لگے تھے۔ کمانی و مانی کا کسی نے خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ چھوٹے بڑے کھانچوں کا پتا سواری کو اپنے سر کی دھمک سے چلتا تھا یعنی جتنا گہرا کھانچہ ہوا اتنا ہی زور سے بھچاہل گیا۔ دوسری پہچان ایک اور تھی یعنی جتنا گہرا کھانچہ ہوا اتنا آدمی اچکا اور اتنا ہی بڑا زخم سر میں پڑ گیا۔ مرزا صاحب کے یکے نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں کہ ایسے آرام کی سواریاں بھی ہوتی ہیں۔ مرزا صاحب نے بیاہ نہیں کیا تھا اولاد کہاں سے ہوتی۔ لہٰذا جتنی اولاد والی محبت ان کو خدا کے یہاں سے ملی تھی وہ سب ٹٹو پر صرف ہوتی تھی۔ عورتوں میں جتنی اوہام پرستیاں اولاد کے معاملے میں ہوتی ہیں وہ سب یہاں پائی جاتی تھیں۔ مالش صفائی تو ہوتی ہی تھی۔ صبح شام ابٹن دی جاتی تھی۔ نہ معلوم کتنی دعائیں دم کی جاتی تھیں۔ ماموں ابا سے فال کھلوائی جاتی تھی، چوراہے پر زرد مٹھائی اور سفید پھول ہلدی کی گرہ سات لونگیں فال کے احکام کے مطابق رکھی جاتی تھیں۔ صبح کو جب یکہ نکلتا تھا تو گھوڑے کے ماتھے کی سفیدی پر ایک طرف سیاہ ٹیکہ کاجل کا لگایا جاتا تھا کہ نظر نہ لگے۔ گلے میں نیلا گنڈہ کہربا کا دانہ، تعویذ ججّ کی تختی نہ معلوم کیا کیا پہنایا جاتا تھا۔ قصہ مختصر جو جو باتیں زہر عشق کے ہیرو کی والدہ نے ان کے لیے کی تھیں وہ سب مرزا صاحب اپنے ٹٹو سلمہ کے لیے کرتے تھے۔ کبھی آنکھ بھر کے دیکھتے نہ تھے اگر کسی وقت مرزا کو دیکھ کر ٹٹو ہنہنایا یا کوئی اور ادا کنوتیوں کی جی میں کھپ گئی تو فوراً اپنی ایڑی دیکھ لیتے تھے کہ کہیں خدانخواستہ شیطان کے کان بہرے لاکھ کوس دور سات قرآن درمیان دشمنوں کو نظر کا پھیر نہ ہو جائے۔

ٹٹو بھی جان دار تھا۔ پھر اس دیکھ بھال پر کیوں نہ بوٹی چڑھتی۔ اور یکے کے گھوڑوں کا شاہ زادہ معلوم ہوتا تھا۔ کٹ کٹ کٹ کٹ ایسی دلکی چلتا تھا کہ راہ گیر کی نگاہ پڑتی تھی۔ اگر کبھی

(بقیہ صفحہ ۴۳۰ پر)

چودھری محمد علی ردولوی

میر یوسف

میر محمد یوسف غریبی کی گھریا میں تپائے گئے تھے۔ کھرامال رہ گیا تھا کھوٹا جل گیا تھا لیکن گھریا سے نکلنے کے بعد سنار کھرے سونے کو بھی سہاگے وغیرہ سے چمکیلا کر لیتے ہیں۔ آدمی میں یہ سہاگا تعلیم کا ہوتا ہے۔ تنگ دستی مفلوک الحالی کی وجہ، وہ سہاگا ان کو ملا مگر کم ---۔ بچپن ہی میں ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ باپ نے مجبوراً دوسری شادی کر لی تھی ایسے لڑکے کی بد قسمتی بیان کی محتاج نہیں۔ ایک چھوٹا بھائی تھا اور یہ تھے۔ شروع جوانی میں روٹی کے لیے گھر چھوڑ کر سفر کو جانا پڑا۔ خود فخریہ بیان کرتے تھے کہ میں کلکتے کو پیدل چلا کچھ پیال بچھانے کو اور جیب میں کچھ پیسے زندگی قائم رکھنے کو۔ کلکتے تقریباً ایک ماہ میں پہنچے۔ وہاں سے برما گئے کرایہ کہاں تھا۔ جہاز پر کوئلہ جھونکنے یا پلیٹ وغیرہ دھونے کا کچھ کام کر کے رنگون پہنچے۔ بیان کرتے تھے کہ دن کو اینٹیں پاتھنے کا کام کرتے تھے۔ تیسرے پہر کو ایک برف والے کا سامان سڑک کے کنارے لگاتے تھے۔ میز برف کا صندوق سوڈا واٹر کی بوتلیں اور گیارہ بجے رات کو پھر اس کے گھر یہ سب چیزیں پہنچاتے تھے۔ جب کچھ روپیہ ہو گیا گھر لوٹ آئے۔ مگر غریبی نے دامن نہ چھوڑا قصہ مختصر غریبی وفادار عورت کی طرح عمر بھر گلے کا ہار رہی۔ یہ بے وفائی پر ہمیشہ تلے رہتے تھے مگر اس نے ان کو نہ چھوڑا

مستقل نوکری کبھی نصیب نہ ہوئی مگر بے کار کبھی نہیں رہے۔ زیادہ تر پیمائش میں جایا کیے۔ شادی بھی ہو گئی تھی غریبی اور برخورداری بچے بھی بہت سے پیدا ہو گئے۔ ایک بار اڑیسہ میں تھے بیمار پڑ گئے۔ گھر پریشانی سے خط بھیجا کہ کرایہ بھیج دو۔ بیوی نے گردیں گانٹھ کر کے دس روپیے بھیجے منی آرڈر میں دو ٹکڑے دس روپیے کے نوٹ کے ملے اِس زمانے میں نوٹ کے آدھے کرنا خلاف قانون نہ تھا اب جو گھر میں آکر دیکھتے ہیں تو دونوں ٹکڑے مختلف نوٹوں کے ہیں۔ پوسٹ ماسٹر کے پاس گئے خوشامد کرنے لگے کہ منشی جی، ہم غریب آدمی ہیں، بیمار ہیں، ہم مرجائیں گے۔ للہ یہ واپس لے لیجیے، ہم کو دوسرا نوٹ دے دیجیے۔ پوسٹ ماسٹر صاحب بہادر کبھی یہ غلطی کر گئے تھے اور یقیناً سرکاری روپیہ ان کو بھرنا پڑا ہو گا اس کے بعد سے انھوں نے اس ذریعے سے نہ معلوم کتنا کما لیا تھا۔ اکثر جاہلوں کو یہی ٹکڑے دے دیتے اور جب وہ واپس لاتے تھے تو روپیہ دو روپیہ کم پر معاملہ کر کے اپنا گذشتہ نقصان روز کے منافع سے بدلا کرتے تھے۔ میر یوسف نے غریبی، بیماری، غریب الوطنی، بے یاری و مددگاری کے نہ معلوم کتنے سفارشی پوسٹ ماسٹر صاحب

کے سامنے پیش کیے مگر وہاں شنوائی نہ ہوئی اور دو روپیہ انھوں نے لے ہی لیے ۔ دو ٹکڑے واپس لیے ۔ میر صاحب بے چارے پوسٹ آفس کے احاطے کے باہر ٹہلا کیے ۔ جب پوسٹ ماسٹر صاحب دفتر بند کر کے باہر نکلے تو میر صاحب نے موصوف کو بلا تکلف اٹھا کر دے مارا اور چھاتی پر چڑھ بیٹھے اور نہایت لجاجت سے اپنے مصائب دہرانے لگے ۔ یہ بھی عرض کر دیا کہ غریبی نے جان لینے اور جان دینے دونوں کا ڈر دل سے دور کر دیا ہے ۔ اپنی تنہائی کا دکھڑا رونے میں یہ بھی کہا کہ آپ حاکم بالا دست سرکاری ملازم ہیں ۔ اگر آپ کے طرف دار لوگ چھڑانا چاہیں گے تو فوراً میں آپ کو گلوئے مبارک جس پر میں احتیاطاً ہاتھ رکھے ہوں فوراً گھونٹ دوں گا ۔ میر صاحب کا حلیہ بھی کچھ ایسا تھا کہ اس طرح کی باتوں کی امید میر صاحب سے کی جا سکتی تھی ۔ نیچے کا جبڑا چوڑا ، ارادے کی مضبوطی بتاتا تھا ۔ بڑی بڑی آنکھیں ایسے موقع پر پھیل کر اور بڑی معلوم ہونے لگتی تھیں ۔ آخر کلام میں ہونٹ مضبوطی سے بند کر کے دہانہ اور چوڑا کر لیتے تھے ۔ پوسٹ ماسٹر بہادر کے دو چار ہم درد جمع ہو گئے مگر اس الٹی میٹم کے بعد ہاتھ کسی نے نہیں لگایا بلکہ یہی صلاح ٹھہری کہ پوسٹ ماسٹر صاحب میر یوسف کی غریبی پر رحم کر کے معاملہ طے کر لیں ۔ لوگ وطن سے دور جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو وہاں کے واقعات بیان کرنے میں ذری طلسم ہوش ربا کا رنگ پکڑ لیتے ہیں ۔ میر صاحب کے بیان کے پہلے دو دوسرے گواہوں نے مجھ سے یہ واقعہ اسی طرح بیان کیا تھا اس لیے میر صاحب پر مبالغے کی تہمت نہیں لگائی جا سکتی ۔ ارادے کی مضبوطی کی تصدیق مجھ سے زیادہ کوئی نہ کر سکے گا ۔ کیوں کہ جب میرا علاقہ کورٹ سے چھوٹا تو میر صاحب نے ارادہ مضبوط کر لیا کہ میرے یہاں مختاری کریں گے ۔ میں نے ہزار ہاتھ پاؤں مارے ، بہت سمجھایا کہ میر صاحب آپ کے اور ہمارے برادری کے مراسم جو کھٹم میں پڑ جائیں گے ۔ مگر پوسٹ ماسٹر صاحب کی طرح مجبور ہو گیا اور میر صاحب مرحوم کا ارادہ ایسا کامیاب ہوا کہ درمیان میں سوا ایک تھوڑے سے دم لینے کے وقفے کے یہ رشتہ صرف میر صاحب کی موت توڑ سکی ۔ مختاری کا شوق کافی تھا مگر قانون سے کوئی خاص مناسبت نہیں تھی ، سنا کرتے تھے کہ مختار لوگ بڑے چالاک ہوتے ہیں ۔ پیال کے پاؤں ایسے کھڑے کر دیتے ہیں کہ عدالت پیچ پیچ کے سمجھنے لگتی ہے ۔ دھول کی رسی بٹ کر تیار کر دیتے ہیں مگر خود کبھی ان باتوں میں کامیاب نہیں ہوئے ۔ ایک مرتبہ ان کے محلے میں ایک مسماۃ کا انتقال ہو گیا وہ کچھ صاحب جائداد تھیں ۔ چند شریف النسل کمینہ خصلت بے کار لونڈوں نے یہ تجویز کیا کہ مسماۃ کا جعلی وصیت نامہ تیار کیا جائے ۔ شامت کے مارے ادھر سے میر یوسف آرہے تھے محلے کا معاملہ ، ہر شخص سے جان پہچان لونڈوں نے کہا خوب آ گئے ذری بتائیے تو کس طرح یہ مسودہ لکھا جائے ۔ ان کو خود کوئی منفعت کی امید نہ تھی ۔ صرف مختاری اور قانون دانی اور ایک مشکل کام میں کمال دکھانے کو بیٹھ گئے ۔ مشورے میں کہیں کہیں اپنے قلم سے بھی اصلاح دی بعد کو جب لوگ پکڑے جانے لگے تو محلے بھر میں امن یجیب المضطر اذا دعاہ

ویکشف السوع اکی دھوم مچی۔ خدا جھوٹ نہ بلائے دو چار لاکھ مرتبہ تو میر یوسف بھی پڑھ گئے ہوں گے۔ خیر آپس کی بات تھی کسی نہ کسی طرح معاملہ دب گیا لیکن اللہ میاں کی دنیا کچھ اس بات کے کہنے والے اور صرف اس کے پڑھنے والوں سے تو تیار نہیں ہوا کرتی۔ یہاں تو ہزاروں لاکھوں طرح کے آدمی ہوتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک صاحب تھے (ان کی روح نہ بچے) جن کا قاعدہ تھا کہ دوستی، ہمدردی کے پیرائے میں وہ اگر کسی کو ذلیل کر سکنے کا موقع پا جاتے تھے تو پھر کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ ظاہر ہے کہ میر یوسف کا یہ فعل کوئی قابلِ تحسین تو تھا نہیں۔ لیکن جن لوگوں کے دل میں ان کی جگہ تھی انھوں نے اس بنا پر معاف کر دیا کہ کوئی ذاتی فائدہ نہ ہو تو اس قسم کی حرکت حماقت کی حد سے باہر نہیں جاتی۔ مگر ان صاحب کے ہاتھ ایک مشغلہ آگیا۔ جہاں دو چار آدمیوں کے بیچ میر یوسف کو دیکھا کہنے لگے کیوں جی یوسف پہنچ گئے اپنی سزا کو نا۔ اب پھر جعل بناؤ گے۔ پہلے تو میر یوسف اظہارِ ندامت کے ساتھ ساتھ ان کی بے تکلفانہ ہمدردی کو بھی سراہا کیے لیکن جب یہ بات اور بڑھی اور ایک اچھے خاصے مجمع میں انھوں نے پھر یہی کہا تو میر یوسف نے اپنی آنکھیں پھیلائیں اور ارادے کی مضبوطی والے جبڑے کا ٹھاٹھ بدلا سینہ تانا گردن اونچی کی تاکہ محفل بھر ان کی آواز اچھی سن سکے اور فرمانے لگے بس صرف ایک مرتبہ جعل اور بناؤں گا جب تم مرو گے تو تمھارا وصیت نامہ تیار کروں گا۔ ایسے موقعوں پر میر صاحب چوڑے جبڑے کو اور چوڑا کر لیتے تھے۔ دونوں ہاتھ خم کر کے نیچے کمر پر جما لیتے تھے جیسے دو چشمی ھ۔ آنکھوں کو پھیلا کر جتنی حونق بنا سکتے تھے بنا لیتے تھے۔ اس کے بعد اعلان جنگ فرماتے تھے اور اعلان جنگ کے بعد سر کو دو تین بار اس طرح جنبش دیتے تھے جیسے ٹھڈی سے سینے کی ہڈی چھونا چاہتے ہیں۔ گویا ارادے پر تصمیم کی مہر لگاتے تھے۔ جب جملہ پورا کر لیتے تو اپنے ہونٹھ دبا کر دبانا اور چوڑا کر لیتے تھے گویا زبانِ حال سے فرماتے تھے کہ اب تو میرے کہنے میں تم کو کوئی شک نہ رہا ہوگا۔

ظاہر ہے کہ یہ مضمون نہ میر یوسف کی تعریف کا قصیدہ ہے نہ ہجو لکھی جاتی ہے یہ تو ایک خاکہ ہے جس سے اگر میر صاحب مرحوم کی ایک دھندلی سی تصویر کھینچ جائے تو میں کامیاب ہوا نہیں تو ائے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

میرے پڑھنے والو! جب ہمارے آپ کے ایسے اچھے آدمیوں میں کوئی نہ کوئی عیب ڈھونڈھنے سے نکل آئے گا تو اگر میر یوسف میں کوئی کمی رہی ہو تو کیسا تعجب ہے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں بچپن میں انھوں نے بڑی تکلیف اٹھائی تھی۔ پیش از وقت روٹی کی فکر نے ان کے اوپر دوامی اثر ڈالا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ بچوں کے پیٹ پالنے میں نہ خودداری باقی رہی تھی نہ ایسی حرکتوں سے شرماتے تھے۔ جو شخص دوسروں کے لیے ایسی محنت مزدوری کرے یا دوسروں کی ضرورتیں پوری کرنے میں اپنے آرام کا خیال نہ رکھے، اپنی تکلیفوں سے نہ گھبرائے، بچوں کے اوپر اپنی خودی نچھاور کر دے اس کی برائی کس منھ سے کی جائے۔ ایک مرتبہ ایک گاؤں میں روپیہ کم

Join eBooks Telegram

چل رہا تھا۔ ضلع دار کے کام کو دیکھنے کے لیے یہ بھیجے گئے۔ خیر کام تو جیسا دیکھا ویسا دیکھا ہی لوٹے تو یوں کہ گھر کے لیے جھاڑو باندھے چلے آتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص حلقے کے ضلع دار کے اوپر تعینات کیا جائے وہ وہاں سے جھاڑو بغل میں دبائے واپس آئے اس کا رعب بھی تو کچھ ہلکا پھلکا ہوگا جوانی میں بڑے جفا کش تھے بڑھاپے میں بلغم بڑھ جانے کی وجہ سے اوپر کی منزل بھاری ہو گئی تھی اور نیچے کی منزل یعنی پاؤں کو زیادہ محنت پڑتی تھی اس لیے چلتے پھرتے ذری تکلیف سے تھے۔ مگر فرض منصبی ادا کرنے میں ہمت سے سب کچھ کر لیتے تھے۔ میر صاحب غصہ کبھی کبھی تو دکھادیتے ہی تھے لیکن اصل صفت ان کی انکسار تھی۔ بڑے منکسر مزاج، کام میں کبھی عذر نہیں۔ باتوں میں تصنّع کی جھلک بھی پائی جاتی تھی مثلاً مجلس عزا میں روتے بڑے زور سے تھے مشاعرے یا قصیدہ خوانی کی محفلوں میں تعریفیں بھی مبالغے سے کرتے تھے چاہے اس میں سخن فہمی کی ٹھیک ہی نکل جائے۔ اپنے بچوں پر فدا تھے اور اگر کبھی گھر میں کسی پر خفا بھی ہوتے تھے تو لوگوں کو تصنع کا پتا چل جاتا تھا اس دوسرے قسم کی غصے کی تصویر کھینچنا میرے امکان سے باہر ہے۔ بھلے کو ایک مثال مل گئی ہے اس سے شاید پڑھنے والوں کو کچھ اندازہ ہو جائے۔

اخبار میں اشتہار نکلا کہ ایک سنیما کمپنی میں ایکٹر اور ایکٹرسوں کی ضرورت ہے۔ ان کے لڑکے نے اپنی خدمات پیش کیں۔ وہاں سے جواب آیا کہ ہم تم کو ضرور لے لیں گے بشرطیکہ تم اپنے ساتھ ایک ایکٹرس بھی لاؤ۔ مجبوراً انھوں نے اپنی بے بسی ظاہر کی مگر یہ لکھا کہ اگر کہیے تو اپنے والد ماجد مدظلہ کو لیتا آؤں غصے کا پارٹ موصوف اچھا کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں یہ تھوڑے دن کے لیے میرے یہاں سے چلے گئے تھے مگر مختار نامہ منسوخ نہیں کرایا گیا تھا اور ایک دوسری عقل سے دورِ جہالت سے قریب ریاست میں مختار ہو گئے تھے۔ وہاں میر صاحب مرحوم نے اچھا خاصہ کمایا۔ ہمارے ملک میں اوپر کی آمدنی علاحدہ ہے۔ کسی سے پوچھیے کیا تنخواہ ہے وہ بتاتا ہے اس قدر۔ پھر پوچھیے۔ اوپر کی آمدنی؟ وہ کہتا ہے جی ہاں کچھ مل جاتا ہے، شکر ہے اللہ کا۔ اودھ میں ریاستوں کے مختاروں کی ایک برادری قائم ہو گئی ہے جن کے اصولِ اخلاق بھی بن گئے ہیں۔ اکثروں کا خیال ہے کہ شاعر کی طرح مختار بھی پیدا ہوتا ہے۔ یہ لوگ مقدمہ بازی کا شوق اللہ میاں کے یہاں سے لاتے ہیں اور اسی فطری تقاضے پر مختاری کو دوسری نوکریوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے مالکوں کو لوٹنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں لیکن مدّمقابل کا احسان لینا یا اس سے مل جانا ان کے مذہب میں جائز نہیں میں ایک ریاست کے مختار کو جانتا ہوں جن کو فریقِ ثانی نے رشوت دے کر ملا لینا چاہا۔ اس نے نہایت حقارت سے کہا کہ لوٹنے اور نفع کمانے کے لیے خود ہماری ریاست کیا کم ہے جو ہم غیر کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ذلت قبول کریں۔ ہم حساب میں ایک کے دس لکھتے ہیں اور پا جاتے ہیں۔ ہم شریف ہیں مدّمقابل سے مل جانا وہی کر سکتا ہے جس کے نطفے میں فرق ہو جہاں یہ رنگ ہو وہاں اگر میر صاحب مرحوم نے کچھ جمع کر لیا ہو تو کون ان ہونی

بات کی ۔ البتہ ایک آدھ لغزش ایسی کر گذرے جس سے ان کے نئے آقا پر تو ان کا رعب رہا مگر دوسرے ان کو پہچان گئے ۔ یہ ریاست جس ضلع میں تھی وہاں کے حاکم ضلع میرے بے تکلف جاننے والے تھے ۔ میر یوسف حاکم ضلع کے سلام کو گئے ہمارے یہاں کسی حاکم سے گھر پر ملنے کی نوبت ان کو کبھی نہیں آئی تھی اس ملازمت میں اپنے آقائے ولی نعمت کو مرعوب کرنے کے لیے اور ریاست میں اپنا رنگ جمانے کو یہ بھی کر گذرے ۔ وہاں انھوں نے کہا کہ چوں کہ اس ریاست کا انتظام بہت خراب تھا اور مالک ریاست نے میرے رئیس سے (یعنی اس حقیر سے) ایک منتظم مانگا تھا لہٰذا میں بھیجا گیا ہوں کہ ہر چیز درست ہو جائے ۔ بد قسمتی سے وہ میرے لا ابالی پن اور سڑ پڑ کام سے اچھی طرح واقف تھے اس لیے آتش بازی چھینک گئی اور وہ بجھ گئے انیتھ راجا تیتھ پرجا ۔ میر صاحب بھی کچھ ایسے ہی ویسے ہوں گے ۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں زمین داروں کو ایک نئی مشکل سے سامنا کرنا پڑا تھا وہ یہ کہ گاؤں سے جو نئے رنگروٹ بھرتی ہو کر فوج میں جاتے تھے وہ وہاں سب سے پہلا کام یہ کرتے تھے کہ اپنے زمین داروں اور دوسروں کی شکایتوں کے خطوط اپنی فوج کے کرنل کے ذریعے سے بھجواتے تھے اور سول حکام ان کی چھان بین کرتے تھے ۔ چناں چہ اس طرح کی کچھ درخواستیں ہمارے اوپر بھی گذری تھیں لیکن یکے بعد دیگرے سب خارج ہو جایا کیں ۔ چناں چہ کسی مقدمے میں میر صاحب میرے پیرو کار تھے ۔ ڈپٹی صاحب تھے تو بنیے مگر تجربہ کار اچھے خاصے تھے ۔ علاوہ قانونی کارروائی کے دھونس ڈال کر بہت سا عدالتی کام کم کر لیتے تھے ۔ صلح کرا دینا، مستغیث یا مدعی سے زور ڈال کر عرضی دعویٰ یا استغاثہ واپس کروا لینا ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا ۔ چناں چہ عدالتی کارروائی کے درمیان میں ان کو کسی فوجی آدمی کی درخواست یاد آگئی ۔ مقدمہ چھوڑ کر ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی ۔

ڈپٹی ۔ کیوں جی مختار تمھاری ریاست کے خلاف ایک درخواست تو پہلے ہی سے تھی اب ایک اور آئی ہے، میں کہتا ہوں کون جیل خانے جائے گا ۔ بتاؤ جیل خانے کون جائے گا ۔ فوجیوں کی درخواست بالا بالا جانے والی نہیں ہے ۔ اس میں کوئی نہ کوئی تو ضرور جیل خانے جائے گا ۔ بتاؤ کون جیل خانے جائے گا ۔

میر صاحب ۔۔۔ پیچھے سے بڑھ کر وکیل کے برابر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے ۔

میر یوسف ۔ جیل خانے جائیں گے یا مالک ریاست یا ڈپٹی کلکٹر ۔ ہم نوکر آدمی، ہم سے آپ کیا پوچھتے ہیں ۔

ڈپٹی صاحب بے چارے بنیے آدمی تھے پھر مقدمہ کرنے لگے ۔ ایک بار میر صاحب ریل میں سفر کر رہے تھے ۔ اسی ریل پر میں بھی تھا مگر ان سے علاحدہ تھا ۔ لکھنو کے اسٹیشن پر ریل کا ایک آدمی مجھ سے آکر کہنے لگا کہ تمھارے ملازم سے اور ایک انگریز سے لڑائی ہو رہی ہے ۔ میں چلا گیا کہ دیکھوں کیا معاملہ ہے ۔ دیکھا کہ درجے میں کئی آدمی ہیں اور ایک بیچ کے بیچوں بیچ میں میر

صاحب بیٹھے ہیں اور سامنے کے بنچ کے کونے پر ایک انگریز بیٹھا ہے ۔ میں نے کہا میر صاحب خیریت ہے ۔ کہنے لگے آپ جانیے سب خیریت ہے ۔ میں نے کہا ڈنڈا اونڈا ہے کہنے لگے جی ہاں ڈنڈا ہے اور (مدِ مقابل کو دیکھ کر) اور حکو بھی ہے ۔ یہ کہتے وقت میر صاحب کی وہی آنکھیں ، وہی ٹھڈی ، وہی ہونٹھ اور وہی گردن کی جنبش اس وقت نگاہوں کے سامنے ہے ۔ ستر سال کے ادھر رہے ہوں گے کہ کل عید ہے آج درزی کے یہاں اپنے پوتوں کے کپڑوں کے لیے گئے تھے کہ عید کے پہلے مل جائیں ۔ وہیں قلب کا دورہ ہوا اور گھڑی بھر میں ختم ہو گئے ۔ لوگ کہتے ہیں آخر وقت اپنے عقائد بیان کرتے جاتے تھے اور پوچھتے جاتے تھے کہ صحیح الفاظ منھ سے نکل رہے ہیں نا ۔

===== OOOOOO ====

"مرزا منش" کا بقیہ :-

کسی جاننے والے نے تعریف کر دی تو مرزا صاحب لجاجت سے گھگیانے لگے کہ بھئی ایسا نہ کہو جنور کو نظر لگ جائے گی ۔ شدہ شدہ گھوڑے اور مرزا کی یہ کمزوری لوگوں کو معلوم ہو گئی اگر سڑک پر کسی نے کہہ دیا واہ مرزا تو فوراً مرزا نے بڑی زور سے جھٹکا دے کر ایک بارگی گھوڑے کو روک لیا اور تعریف کرنے والے سے نیلے پیلے پڑنے لگے ۔ کوئی ہنس دیا کوئی مرزا کا قد اور بدلی ہوئی نگاہ دیکھ کر دب گیا ۔ چوں کہ گھوڑا واقعی جان دار تھا اس لیے ان جان لوگوں سے یہ غلطی اکثر ہو جاتی تھی اور مرزا ہمیشہ زور کا جھٹکا دے کر یکہ روک لیتے تھے کہ جتنی نظر لگ چکی ہو اتنی ہی رہے زیادہ نہ ہو ۔ رفتہ رفتہ گھوڑا جھٹکوں سے ایسا ڈر گیا تھا کہ کسی نے واہ کہا نہیں اور گھوڑا سہم کے رکا نہیں ۔

اب تو لونڈوں کو مشغلہ ہاتھ آیا ۔ جدھر سے مرزا نکلتے ہیں "واہ مرزا" کی آوازیں آ رہی ہیں ۔ گھوڑا کھڑا ہوا ہے اور مرزا صاحب یکے سے نیچے اترے کوڑا ہاتھ میں لیے لونڈوں کی نانیوں دادیوں اور ان کے خاندان کی دوسری عورتوں کے جنسی رجحان کی بکھان مختلف انداز ، مختلف پیرایوں سے بالاعلان کر رہے ہیں جس میں شاعرانہ پہلو پر نظر رکھتے ہوئے اپنا تخلص بیچ بیچ ڈالتے چلے جاتے ہیں ۔

==== OOOOOO ====

چودھری محمد علی ردولوی

میر باقر صاحب

سید محمد باقر رضوی المشہدی ثم اہرولوی مرحوم، مضافات ردولی موضع ابرولی سادات کے رہنے والے تھے۔ ان کے بچپن میں ان کے والد گورکھ پور میں سرکاری ملازمت کرتے تھے ان کے ماموں مرحوم بستی میں اچھے خاصے زمین دار تھے۔ ابرولی یا ردولی آتے تھے مگر کم۔ باپ کی نوکری کا سلسلہ ختم ہو گیا ماموں کا انتقال ہو گیا ناچار اپنے آبائی گھر واپس آئے۔ بچپن میں مجھ سے بتایا گیا تھا کہ کس بابا آدم کے رشتے سے یہ ہمارے چچا ہوتے ہیں۔ چناں چہ ہم نے چچا کہنا شروع کیا آخر میں تو ان کو آدھی ردولی چچا کہنے لگی تھی۔ جگت چچا ہو گئے تھے۔ چار بھائی تھے۔ بھرا پرا گھر تھا ماں کے پاس دولت تھی۔ ماموں کی زمین داری کے وارث تھے۔ ان کے باپ یعنی سجاد دادا تو خاموش آدمی تھے شہد کی مکھی کے نر تھے مگر ہماری دادی بڑی منتظم تھیں اگر دروازے پر دس آدمی پہنچ جائیں تو گھڑی بھر میں سب کو کھانا کھلا دیں۔ مہمان نوازی، چلّا کے بات کرنا اور ہر وقت کام میں لگی رہنا ایک ایک جھلے میں تین تین قسمیں کھانا ان کی خاص الخاص خصوصیات میں سے تھے۔ پہلی، دوسری اور چوتھی صفت ان کے بچوں کو پوری طرح وراثت میں پہنچی تھی اور حق بات کہنا چاہیے ان صفات کو ان لوگوں نے مرتے دم تک خوب نباہا۔ چوں کہ ان کی جائداد بستی میں تھی اس لیے ردولی والے ان کی دولت کا معیار نہیں قائم کر سکے مگر ان کا شمار خوش حال لوگوں میں ہوتا تھا۔ کچھ روپیہ بھی قرضے پر دیتے تھے اس لیے دولت گھٹنے کی بجائے بڑھنے کی امید کی جاتی تھی۔ شامت کہیے یا تقدیر کا لکھا، سید محمد باقر صاحب کی شادی ایک لکھ لٹ رئیس کی لڑکی سے ہو گئی سب وہی عیوب ان لوگوں میں بھی سرایت کر گئے۔ خودداری نے سسرال والوں کا مقابلہ کرنے کا خیال دل میں پیدا کیا۔ خوش حالی میں پہلا گھن یہیں سے لگا۔ اس کتاب میں نواب راحت حسین مرحوم کی یاد موجود ہے۔ ہمارے نواب صاحب ہی کی بہن ان کو بیاہی گئی تھیں۔ میر باقر۔ باقر سے میر باقر داماد ہو گئے۔ صفات کی نہ سہی نام کی نسبت تو بلند ہو گئی۔ جہیز میں جان لیوا دق بھی آئی جس نے ان کی سسرال کا گھر اور نہ معلوم کتنے گھر گھالے تھے۔ تھوڑے دنوں کے بعد سجاد دادا نے انتقال کیا۔ یوں تو موت مکروہ ہے لیکن اگر ایمان کی پوچھیے تو کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ البتہ متذکرہ بالا مزاجی اور خاندانی خصوصیات اس وقت تک جو تھوڑے تھوڑے دکھائی دیتے تھے ان کا بھرپور مظاہرہ ہو گیا۔ نواب راحت حسین صاحب مرحوم اپنے خاص انداز میں اس غم فزا واقعے کی جو تصویر کھینچتے تھے اس سے شاید پڑھنے والوں کو بھی کچھ اندازہ ہو جائے۔

نواب صاحب کہتے تھے اس حادثے کے بعد سوا میر باقر صاحب کی والدہ کے کسی کے حواس بر جانہ تھے ۔ حالاں کہ ان کا غم حقیقی غم تھا مگر لڑکوں کے خیال سے موصوفہ نے مجھ کو خاص اس کام پر تعینات کیا کہ لڑکوں کو تسلی و تشفی دوں ، راضی برضا رہنے کی تلقین کروں اور صبر کی خوبیاں ان لوگوں پر اچھی طرح روشن کر دوں ۔ دفن کے پہلے تو خیر سب ہی کے اوپر اثر ہوتا ہے لیکن قبرستان سے واپس آنے کے بعد بے کاری میں رونے کا مشغلہ بہت ترقی پکڑ گیا ، اس لیے میں نے یہ تدبیر نکالی کہ میاں باقر کے چاروں بھائیوں کو یک جانہ ہونے دوں ۔ چناں چہ ایک کو میں نے صدقے کے کام کو دیکھنے کو کہا ۔ دوسرے کو مہمانوں کی طرف بھیج دیا ۔ دو چھوٹے تھے وہ بغیر دونوں بڑے بھائیوں کی مدد کے زیادہ آفت نہیں جوت سکتے تھے اس لیے ان کو دلاسا دے کر یوں ہی چھوڑ دیا ۔ اس کے بعد نواب صاحب بیان کرتے ہیں کہ میں رفع حاجت کے لیے چلا گیا ۔ وہیں سے سنا کہ پھر کہرام پڑ گیا ۔ میں نے سمجھ لیا کہ ہو نہ ہو یہ چاروں بھائی اکٹھا ہو گئے ۔ جلدی جلدی واپس آیا ۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سب کے سب جمع ہیں اور نئی طرح کے بین کر رہے ہیں ۔ ایک کہہ رہا ہے خدا کی قسم بابو مرحوم آٹھ آٹھ دن منھ نہیں دھوتے تھے اور اس پر سب مل کر بڑی زور سے روتے ہیں ۔ پھر دوسرا کہتا ہے رسول مقبول کی قسم دانت بھی تو نہیں مانجتے تھے اور پھر وہی گھمسان پڑتی ہے ۔ تیسرا کہتا ہے اور نہاتے کب تھے قسم کلام مجید کی اماں کے ڈر کے مارے غسل خانے میں یوں ہی پانی پھینک کر چلے آتے تھے اور وہی شور مچتا ہے ۔ چوتھا داڑھیں مار کر کہتا ہے کہ دو بجے رات کو مرحوم کا چھینکے سے ہانڈی اتار کر گپ گپ دہی بڑے کھانا یاد آتا ہے اس پر تو پوری محفل ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگتی ہے ۔ نواب صاحب کا رشتہ مذاق کا تو تھا ہی آپ کا بیان ہے کہ میں نے ایک ڈانٹ بتائی اور کہا سالو ! ابھی ان کی قبر کی مٹی بھی خشک نہیں ہوئی ہے اور تم نے ان کے یہ بکھان شروع کر دیے ۔ کچھ سچی بات کچھ مذاق کا پہلو کچھ نواب صاحب کی زبان کا اثر اظہار غم مدھم پڑ گیا ۔ پہلے تو ہم لوگ سمجھتے تھے کہ یہ سب کچھ نواب صاحب مرحوم کی شاعری ہے لیکن بعد کو تصدیق ہوئی کہ کچھ اصلیت بھی تھی ۔ باقر مرحوم کے چھوٹے بھائی محمد جعفر مرحوم نے بیان کیا کہ راحت حسین نے روایت کرنے میں تدین سے کام نہیں لیا ہے ۔ ہم لوگ تو صرف یہ کہتے تھے کہ گو منھ نہیں دھوتے تھے مگر چہرہ چاند کو ماند کرتا تھا گو دانت نہیں مانجتے تھے مگر ان کے آگے موتی بے آب تھے ۔ نہاتے کم تھے مگر ان پر میل کچیل کا کبھی گمان بھی نہ ہوتا تھا ۔ رہی دہی بڑوں والی بات اس میں اعتراض کرنے کی گنجائش کہاں ہے ۔ ان کا مال تھا کھاتے تھے ۔ راحت حسین کے باپ کا اجارہ ۔

پڑھنے والو آپ کو ہمارے ہیرو کی حسب ذیل باتوں کا اندازہ ہو گیا ہو گا ۔ خودداری ، مہمان نوازی ، سسرالی رشتے سے امیری کی چھاؤں ، زور سے بولنا اور قسمیں ۔ مذاق کا چٹخارہ جو آگے چل کر بہت چوکھا ہو گیا موجود تو تھا مگر ابھی تک اس کے اظہار کا پورا موقع سوا معمولی ہنسی ٹھٹھے

کے نہیں آیا تھا۔ البتہ ہنسی ٹھٹھے میں شروع ہی سے یہ حال تھا کہ میر باقر جہاں جاتے تھے وہاں محلے بھر کو معلوم ہو جاتا تھا اجنبی جگہوں میں تو یہاں تک ہوا کہ لوگ صبح کو ان کے میزبان کے یہاں خیریت پوچھنے آئے۔

دوسرا باب اس دفتر کا اس وقت شروع ہوتا ہے جب کہ اس گھر کی لچھمی اٹھ گئی یعنی میاں باقر صاحب کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ خرچ کی تنگی اب بھی نہیں تھی دو چار آدمی اب تک ان کے قرض دار تھے۔ مگر وہ بات جاتی رہی تھی۔ پھر ان کا گھر بیماریوں نے دیکھ لیا۔ دولت، بودگی زیادہ تر دوا علاج میں اور کچھ رکھ رکھاؤ میں ختم ہو گئی۔ بستی کی جائداد کا بھی وارا نیارا ہو چکا۔ یہاں تک کہ تنگی سے بسر ہونے لگی۔ کثرتِ اولاد بڑا کنبہ، مشکلیں زیادہ ہو گئیں۔ چھوٹا بھائی جو ان کے بڑے لڑکے کے، ہم سن تھا اس کو بڑھانے میں دقتیں پیش آنا شروع ہو گئیں۔ غریبی بڑا سخت امتحان ہے اس امتحان میں پاس کا درجہ کسی کو مل جائے مگر آنر ز ہزاروں میں کہیں ایک کو نصیب ہوتا ہے۔ ہمارے ہیرو کا بھی یہی حال ہوا کہ ادھر ادھر ملازمت کی تلاش کرنے لگے۔ سن زیادہ، کوئی ڈگری نہیں، پابندی سے کام کے عادی نہیں۔ اگر کسی جگہ ٹھکانہ ہوا بھی تو مصاحب کی صورت میں۔ اب تو ان کی بذلہ سنجی، ہنسی ٹھٹھے کی دھوم مچی گئی۔ اس کے بعد لڑکے جوان ہو گئے کوئی سو کمانے لگا کوئی دو سو۔ چھوٹا بھائی وکیل ہو گیا مگر میاں باقر کی نہ کوئی ضرورت پوری کر سکا اور نہ انھوں نے اپنا رویہ بدلا۔ گورکھپور بستی میں نشوونما ہوئی تھی وہاں تاڑی شراب کے قطرے بڑی بڑی ڈاڑھیوں پر دکھائی دیتے ہیں۔ کسی طرح بد قسمتی سے یہ بھی اس کے مزے سے واقف ہو گئے۔ میں یہ ذکر ہرگز نہ کرتا کیوں کہ یہ ذاتی فعل ہے جس سے دوسرے کو واسطہ نہیں۔ یہ تذکرہ صرف اس وجہ سے آگیا کہ بغیر اس کے ان کے واقعات ادھورے رہ جائیں گے۔ جوانی میں مجھ کو ایک کتاب آئرلینڈ کے متعلق پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا جس میں ایک خاص کلب کے ممبروں نے یہ قسم کھائی تھی کہ مذاق کی بات چاہے اپنی ماں ہی کی کیوں نہ ہو ہر ممبر ضرور بیان کرے گا۔ میاں باقر نہ آئرلینڈ گئے تھے نہ اس زمانے میں پیدا ہوئے تھے جب یہ کلب قائم تھا مگر کسی نامعلوم طریقے سے یہ اس کے ممبر ہو گئے تھے اور ہنسنے کا چسکا ایسا پڑ گیا کہ اپنی برائی یا کسی کی بات ہو اگر اس میں ہنسنے کی گنجائش ہوئی تو میاں باقر اس کے بیان کرنے سے نہ رکیں گے۔ بد قسمتی سے گھوڑ دوڑ کھیلنے کا بھی شوق ہو گیا۔ شوق کے بعد عادت ہوئی، عادت کے بعد لت ہو گئی۔ اس شوق کے پیدا کرنے میں شاید میری بھی کچھ ذمہ داری ہو بلکہ ضرور ہے، میں تو بچ گیا مگر وہ مرحوم "فنافی الگھوڑ دوڑ" ہو گئے۔ اس مشغلے میں روپیے کا خرچ اور یہاں پیسہ پاس نہیں مگر انھوں نے ایک ترکیب نکالی۔ کسی کرنل جنرل کا کوئی خانساماں تھا جس نے بہت سا اندوختہ کرنے کے بعد ریس کے احاطے کے اندر چائے وغیرہ کا ٹھیکہ لینا شروع کیا تھا۔ گھوڑ دوڑ کی آمد و رفت میں اس سے یاد اللہ ہو گئی اب راوی چین لکھتا ہے میاں باقر ہوٹل کا پاس لٹکائے ہوئے اوّل اسٹینڈ پر دوسرے اسٹینڈ پر پیڈک میں،

اصطبل میں ہر جگہ موجود تمام جاکیوں سے ملاقات اکثر بکیوں سے جان پہچان ٹماؤٹس سے ان سے ملی مار بہتر سے بہتر ٹپ ان کو ملنے لگے مگر اس تباہ کن کھیل میں سوا جوا کھلانے والے کے اور کسی کو امیر ہوتے دیکھا نہیں۔ پھر اس کے لیے بڑے سرمائے کی بھی ضرورت ہے یہاں تنگی کیا نہائے کیا نچوڑے وہی روپیہ دو روپیہ کا کھیل مگر شوق پورا ہوتا رہا مجھ سے ان سے زمین داری وغیرہ کے معاملے میں شکر رنجی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر نوبتیں پہنچ گئیں۔ معاملات نے اکثر بہت طول کھینچا مگر ہنسنے ہنسانے کے مراسم اسی طرح رہے مثلاً عرض کرتا ہوں۔ ایک دن دورانِ ملال میں آئے کہنے لگے محمد علی قسم ہے کلام مجید کی تم ہزار ہمارے دشمن ہو جاؤ مگر خدا کی قسم ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ مذاق کا کوئی واقعہ پیش آوے اور تم سے نہ کہیں مگر دیکھو واللہ کسی سے کہنا مت۔

میں — ہاں ہاں نہ کہیں گے۔ کہو تو۔

میر باقر — ارے تم ضرور کہو گے قسم رسول مقبولؐ کی تم بغیر کہے نہیں رہ سکتے۔ تمھارے پیٹ میں بات ہی نہیں رہتی اور تم کیا ہم خود کہیں گے مگر ابھی تازہ تازہ واقعہ ہے قسم امام حسینؑ کی اگر تم نے کہا تو مجھ کو بہت تکلیف ہوگی۔

میں — بالکل ٹھیک میں سمجھتا ہوں تم کہہ چلو۔

میر باقر — چند طالب علموں نے مل کر امین آباد میں ایک مکان لے رکھا ہے۔ اس میں ہمارا چھوٹا بھائی بھی شریک ہے۔ جگہ ضرور تنگ ہے مگر ان لڑکوں کے اعزا کو ضرورت کے وقت ایک چار پائی کی جگہ مل ہی جاتی ہے۔ ہم جو ریس سے لوٹے تو وہیں چلے۔ آج بڑا اچھا دن تھا قسم امام حسین کی اگر ہمارے پاس روپیہ ہوتا تو آج امیر ہو گئے ہوتے۔ تین گھوڑے ہمارے نکلے ایک پلیس اور دو اول فیورٹ تو فیورٹ ہم کو تو آوٹ سائڈر کی ٹپ ایسی ملی مگر کیا کریں صرف پانچ روپے پلیس پر لگائے پچیس ملے خدا کی قسم آج پانچ ریسوں میں تو بکیوں کا دوالا نکل گیا۔ اچھا خیر۔ دل خوش تھا اس لیے ذری زیادہ پی گئے گھر پہنچتے پہنچتے نو بج گئے تھے زینے پر چڑھنے لگے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ردولی کے فلاں فلاں کئی ریشائیل بیٹھے ہیں۔ بھلے کو زینے پر اندھیرا تھا نہیں تو قسم خدا کی بڑا غضب ہوا تھا۔ ہم الٹے پاؤں واپس آئے اب امین آباد میں اس ادھیڑ بن میں ٹہل رہے ہیں کہ چلّے کے جاڑے ہم اس حالت میں کمبل لینے بھی نہیں جا سکتے۔ کیا کریں گے۔ ایک بڑھیا پان بیچ رہی تھی اس سے گلوریاں لینے لگے وہ بھانپ گئی کہ نرم چارہ ہے۔ کہنے لگی میاں کہیں ٹھکانہ کیجیے گا؟ قسم قرآن کی محمد علی میں نے کہا دہ مارا سب مشکلیں یک بارگی حل ہو گئیں۔ نہ لحاف کی فکر نہ رضائی کی۔ گھر جانے میں فضیحتے کا خوف۔ ہم تیار ہو گئے۔ تم جانتے ہو کہ ہم کو ان باتوں کا شوق کبھی نہیں رہا مگر یہ موقع ایسا تھا کہ سوا اس کے اور کون صورت تھی۔ اس بڑھیا نے ایک چھوٹی سی لڑکی میرے ساتھ کی اس سے کہا میاں کو اپنی آپا جان کے یہاں لے جاؤ۔ گلی در گلی وہاں پہنچ صورت دیکھتے ہی کہنے لگی جنیا ہمیں بھی پلواؤ خیر ایک ادھا منگوایا۔ تعالوا تمتعوا شروا کی ٹھہری۔ ہم

تو پی چکے تھے اس کی خاطر سے ذری سی چکھ لی مگر وہ ادھے کا ادھا چڑھا گئی ۔ اختلاط کی بے تکلفی میں ہماری واسکٹ میں دو ایک روپے اور ریزگاریاں تھیں پان مٹھائی کے نام سے پہلے اس نے وہ اینٹھے نوٹ وغیرہ نیفے میں تھے اس پر ہاتھ نہیں ڈالا اس کے بعد نشانی کے نام سے انگوٹھیاں لے لیں۔ ہم کو اس طرح کا اتفاق کاہے کو ہوا تھا مگر اس وقت حالت بھی کچھ ایسی ہی باتوں کی تھی بندہا خوب مار کھاتا ہے ہماری آنکھ قریب تین بجے کے کھلی ۔ گھوڑدوڑ سے لے کر اس وقت تک کے تمام واقعات نگاہ کے سامنے آگئے اپنے اوپر غصہ ، ان داڑھیوں کے اوپر غصہ ، کچھ اپنی حرکتوں کا انفعال لاحول ولا قوۃ مگر قسم قرآن کی سب سے زیادہ غصہ اس رنڈی پر تھا ۔ بھلا دیکھیے تو ملے کیا ہوا تھا اور لے کیا کچھ گئی ۔ انگلیاں خالی کر دیں چڑیل نے ۔ اور وہ فیروزہ بھی تو نہیں ہے اماں کی نشانی تھی ۔ اور دہان فرنگ والی انگوٹھی بھی اینٹھ لی ۔ پھوپھی اماں مرحومہ کے پیٹ میں جب درد ہوتا تھا تو دھو دھو کر پلائی جاتی تھی ۔ حرام زادی قحبہ قطامہ شفتل غیبانی اور دیکھو تو کیسی میٹھی نیند سو رہی ہے ۔ رہ جاؤ ، ہم باقر کاہے کو جو اس کی کسر نہ نکالی ہو ۔ بھیا میں اٹھا اور اس کا لوٹا پاندان گلاس پان کی ڈبیا سب میں نے سنبھالی ۔ دل نے کہا باقر شراب تو پیتے ہی تھے رنڈی بازی بھی کر گذرے اب سب پر طرہ یہ کہ اچکا پن بھی کر گئے ۔ اس خیال کے آتے ہی مجھ کو ہنسی کی گدگدی اٹھی ۔ یہ گدگدی پیدا ہوتے ہی تمام رکاوٹیں کافور ہو گئیں ۔ بڑے آہستہ آہستہ میں زینے سے اترنے لگا ۔ اب جو اندھیرے میں کنڈی چھوتا ہوں تو قفل دبا ہوا ہے ۔ اس طبقے کے لوگوں کو چور اچکوں سے روز ہی سابقہ رہتا ہے ، پاؤں سے سر تک ایک سناٹا ہوا ۔ پنڈلیاں کانپنے لگیں ۔ پسینہ آگیا ۔ سب چیزیں جہاں جہاں سے اٹھائی تھیں وہیں پر جمادیں اور مجبوراً اس کو جگانا چاہا کہ کنجی دو وہ اس وقت تک نشے میں انٹا غفیل تھی ۔ اوں اوں کر کے کہنے لگی تکیہ کے نیچے ہے اور پھر کروٹ لے کر خراٹوں کی سادھی ۔ ہم نے کہا اس میں کیا گیا ۔ محمد علی قسم رسولِ مقبول کی میں نے پھر سب چیزیں اٹھائیں بغل میں پاندان ایک ہاتھ میں لوٹا گلاس دوسرے ہاتھ میں ڈبیا اور کنجی ۔ قفل تو کسی نہ کسی طرح میں نے کھول لیا ۔ اب جو کنڈی کھولتا ہوں تو بغل ڈھیلی پڑ گئی کھڑ بڑ کھڑ بڑ کر کے زینے پر پاندان گرا ۔ اسی گڑبڑ میں لوٹا گلاس وغیرہ بھی میں نے پھینک دیا ۔ اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا ۔ قسم قرآن کی اس وقت سمجھ میں آیا کہ چوری آسان کام نہیں گلی میں سناٹا تھا ۔ میرے پر لگ گئے تھے مگر قسم امام حسین کی معلوم ہوتا تھا کہ فوج پیچھے دھاوا کرتی چلی آتی ہے ۔ ایک دو ہی موڑیں میں نے پار کی ہوں گی اب چال بھی آہستہ کر دی تھی کہ ایک طرف سے آواز آئی "چائے گرما گرم" دل پر جیسے موگری سی پڑی آواز تو تھی چائے والے کی مگر قسم خدا کی مجھ کو معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی کہتا ہے وہ چوٹا جاتا ہے پکڑنا جانے نہ پاوے ۔ اگر راستے میں کتا بھی ملتا تھا تو معلوم ہوتا تھا پولیس کے انسپکٹر جنرل ہی آگئے ۔ خیر بھئی کسی نہ کسی طرح امین آباد پہنچے ۔ قسم کلامِ پاک کی حواس اس وقت درست ہوئے ۔ باقر چچا نے ٹھیک اندازہ کیا تھا یہ بات میں بھی ہضم نہ کر سکا اور یہ قصہ اچھا خاصہ عام ہو گیا

مگر باوجود اس کے لوگوں نے باقر صاحب کے بارے میں رائے وہی رکھی جو ہمیشہ سے تھی۔ اسی امید پر یہ قصہ میں بھی لکھ گیا ہوں کہ پڑھنے والے بھی صرف مذاق پر نظر کریں گے اور مرحوم کو واقعی چور اچکانہ سمجھیں گے۔

میرے پڑھنے والے! آدمی اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے آپ کو پورا اختیار ہے کہ میرے اور میرے دوست سید محمد باقر مرحوم کے لیے وہی رائے قائم کیجیے جس کے ہم دونوں آدمی سزاوار ہیں مگر پھر بھی میں یہی کہے جاؤں گا کہ میاں باقر چوری کے کبھی قریب نہیں گئے تھے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اگر آپ باقر مرحوم کو ایسا جانے ہوتے جیسا میں نے جانا، یا میرے قلم میں وہ طاقت ہوتی کہ ان کی سچی تصویر آپ کے سامنے آجاتی تو آپ بھی میرے ہم خیال ہو جاتے۔ مذاق کی تعریف کی گئی ہے "دو غیر چیزوں کو ایک خاص انداز سے ملا دینا۔" باقر مرحوم میں یہ مادہ اس درجہ تھا کہ جہاں اس کا موقع آجاتا تھا وہاں وہ بے بس ہو جاتے تھے۔ گذشتہ واقعے میں غور کیجیے تو باوجود میری کج مج بیانی کے شاید اس بات کا پتہ چل جائے۔ میاں باقر جن کو رنڈی سے کبھی کا لگاؤ نہیں رہا۔ چوری سے کہیں دور کا بھی واسطہ نہیں باوجود اپنی حرکتوں کے اپنے زعم ناقص میں شریف تھے۔ مذاق کی صورت بندھ جائے تو بے اختیار ہو جاتے تھے ان سب چیزوں کو یکجا کیجیے تو شاید آپ بھی مرحوم اور راقم الحروف کو معاف کر دیں اور ان کے بچے محسن اور دلی ہمدردوں کو ان کی اکثر یہ شکایت پیدا ہو جاتی تھی کہ یہ ایک طرف کی بات دوسری طرف لگا دیتے تھے جس کے زیر بار احسان تھے اس کی بھی ہنسی اڑا جاتے تھے اس طرح کے اور بھی الزامات ان پر لگائے جاتے تھے۔ لیکن ان کے جاننے والے اکثر اس کا تجزیہ کرنے بیٹھے ہیں اور یہ بات ہمیشہ ثابت ہو گئی ہے کہ اگر کوئی مذاق کا پہلو نکل آیا تو چاہے تیسری جنگ عظیم ہی کیوں نہ چھڑ جائے میاں باقر راز فاش کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس مذاق کے چسکے کے پیچھے جو شخص خود اپنا مضحکہ کروا دے اس سے دوسروں کو کیا شکایت ہو سکتی ہے۔

ایک زمانے میں باقر صاحب بہت پریشان ہو گئے تھے ناچار ایک بڑی ریاست میں درخواست دی تھی ان کے بچپن کے ہم مکتب بے تکلف دوست ایک قاضی صاحب وہاں پہلے سے ملازم تھے۔ یہ قاضی صاحب نہایت بے وقوف مذاق سے ہزاروں کوس دور۔ بانگڑو۔ نیک نیت بادفا قسم کے آدمی تھے۔ کنگڑ بھی تھے۔ جب میاں باقر ان کو بناتے تھے تو یہ ہاتھ پاؤں سے جواب دیتے تھے۔ اس لیے میاں باقر ان کو صرف ایسے وقت میں چھیڑتے تھے جب جان لیتے تھے کہ قاضی صاحب کا دسترس ان تک ممکن نہیں ہے۔ قاضی صاحب رخصت پر آئے میاں باقر نے اپنی درخواست کا حال سنایا۔ قاضی صاحب نے نہایت ہمدردی کا اظہار کیا اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ میں دفتر میں ایک معمولی جگہ پر ہوں میں تمھاری کیا امداد کر سکتا ہوں لیکن اگر منیجر صاحب کے نام تم ایک درخواست یاد دہانی کی مجھ کو لکھ کر دے دو تو میں وہاں دفتر میں یہ کوشش کر سکتا ہوں کہ

وہ درخواست آخری حکم کے لیے پیش کردی جائے۔ منظوری نہ منظوری تمھاری قسمت کے ہاتھ ہے۔

میر باقر۔ ہم کو قاضی صاحب آپ سے یہی امید ہے۔ تو بھائی صاحب جب واپس جانے لگیں تو میرا خط لیتے جایئے گا۔ بھولیے گا نہیں، عنایت ہوگی۔

قاضی صاحب۔ نہیں، بھولوں گا کیسے اور کسی قابل خدا نے نہیں کیا تو کیا اتنی خدمت بھی دوست کی نہ کریں گے۔ ہم کوئی ہفتے عشرے میں جائیں گے۔ اس وقت خط لے لیں گے۔ اس گفتگو کے آٹھ دس دن بعد ایک روز میر باقر ہمارے یہاں آئے۔ کہنے لگے افوہ بہت مارا سالے نے قاضی کا ہے کو قسائی ہے قسم کلام مجید کی ہڈیاں ہڈیاں توڑ دیں۔

میں۔ کہو کیا ہوا۔

میر باقر۔ ارے میاں وہی درخواست نوکری کی جو ہم نے دی تھی نا۔ تمھارے سامنے تو باتیں ہوئی تھیں۔

میں۔ ہاں ہاں، تھوڑی دیر ہوئے وہ تو تم کو ڈھونڈھنے یہاں بھی آئے تھے۔

میر باقر۔ ہاں ہاں، آیا ہوگا۔ سب کہیں تلاش کرتے کرتے شاہ صاحب کے یہاں پہنچا۔ ہم لوگ کوٹھے پر خوش گپتیاں کر رہے تھے نیچے سے میاں باقر میاں باقر کی بانگیں لگانا شروع کیں۔ میں نے کہا کیا ہے، قاضی صاحب کہنے لگے بھئی میں آج دوپہر کی گاڑی سے جاؤں گا۔ ردولی بھر کے صدقے ہو آیا تب تم یہاں ملے ہو۔ وہ خط دے دو تو جو کچھ میرے بس میں ہوگا دفتر میں کوشش کروں گا۔ میں نے بہت بہت شکریہ ادا کیا اور خط لکھنے بیٹھ گیا مگر قاضی مردود کا سبز کشمیرے کا دگلہ اور اس کا سڑک پر سے گردن ٹیڑھی کر کر کے باتیں کرنا کچھ ایسا تھا کہ میں نے درخواست کی یاددہانی یوں کی:

جناب منیجر صاحب! تسلیم۔ یہ افریقہ کا بوٹ (بروزن نوٹ) حاضرِ خدمت ہوتا ہے اس وقت میں ایک ضروری کام میں مصروف ہوں لہٰذا تکلیف کر کے آپ اس کو پانچ جوتے پٹوا دیجیے۔ مشکور رہوں گا۔

لفافہ بند کر کے میں نے دے دیا اور شکریہ ادا کیا اس نے کہا میاں باقر کیا شرمندہ کرتے ہو اور کسی قابل نہیں تو میں دوست کی اتنی خدمت سے بھی گیا وہ تو چل کھڑا ہوا تھا مگر یاروں نے اس سے کہہ دیا کہ قاضی صاحب میاں باقر کا خط ہے کسی اور کا نہیں ذرا پڑھ لیجیے گا تو پیش کیجیے گا۔ اس نے جو پڑھا تو میاں کوٹھے پر چڑھ آیا کسی اور طرف راستہ نہیں بس اس نے پکڑ لیا۔ بہت مارا خیر ہم بھی کسی دن کسر نکال لیں گے جاتے کہاں ہو بچہ۔

سید باقر صاحب کے گھن اور ہتھوڑے والے مذاق کا ذکر آپ نے سنا بکنے اور ہنسنے کا جس کو عارضہ ہو وہ نظیر اکبرآبادی ہو جائے مگر میر تقی میر کی نزاکتیں ہر جگہ نہیں پیدا کر سکتا۔ مگر

ہمارے باقر چچا کبھی کبھی نازک خیالیاں بھی دکھاجاتے تھے۔ ایک دن صبح کو ہم لوگ چائے پی رہے تھے۔ ایک شخص میلاسامنڈاسا باندھے آیااور کہاکہ ہم جوہری ہیں۔ جوہری کسی طرف سے نہیں معلوم ہوتاتھامیر باقر صاحب نے اس کو اپنی دُرِ نجف کی انگوٹھی دکھائی اس نے کہاکوئی اسی روپے رتی کاہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ہیرا بھی ہر دوسری چیز کی طرح بامول نہیں تھاجب بلور کو ہیرابتاکر اس نے اپنی جوہر شناسی ظاہر کردی تو آپ نے وہی مرحومہ دہانِ فرنگ والی انگوٹھی دکھائی اور کہنے لگے دیکھیے اس میں کچھ پشمینے کامیل تو نہیں ہے۔

ایک صاحب پر لے سرے کے جھوٹے تھے لڑکپن میں عادت پڑی اور جوانی میں مضبوط ہوگئی اپنی عادت کے موافق بیان میں کچھ غلطیاں کر گئے جو اسی وقت کھل گئیں۔ ہر شخص نے مختلف انداز سے نفریں کی۔ میاں باقر ہمدردی سے کہنے لگے دیکھو تم جھوٹ نہ بولاکرو نہیں تو تمھاری عادت پڑ جائے گی۔

ایک مرتبہ ایک صاحب لکھنو کے ہمارے قصبے میں آئے ان کو یہ ناز تھاکہ ہم دیہاتی بولی خوب بولتے ہیں کچھ ذکر اروی کاآگیاجس کو دیہات میں گھیاکہتے ہیں وہ صاحب اپنادعویٰ بھول کر پوچھنے لگے گھیاکیا؟ میر باقر نے ان کو بتایاکہ اس کو ان کے یہاں اروی کہتے ہیں ان کو اپنادعویٰ یاد آگیااور کہنے لگے ہاں ہاں میں جانتاہوں اور اس کو بھاما بھی تو کہتے ہیں (بھاما دیہات میں بیگن کو کہتے ہیں) بھاماکہتے وقت لکھنوی صاحب نے اس لفظ پر اچھاخاصہ زور دیاتھا۔ باقر صاحب کہنے لگے جی ہاں جب غصے میں ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ یہ امین آباد کے ایک بالا خانے پر ایک صاحب کے مہمان تھے اس بالا خانے کے نیچے کی دوکان پر ایک حافظ جی صاحب لال داڑھی لانباکرتہ ٹوپی دار پائجامہ مذہبی سنجیدہ آدمی ایک بڑی دوکان رکھے تھے۔ رات کے وقت کوئی گیارہ کاعمل رہاہوگا۔ ایک صاحب حافظ جی کی تلاش کرتے آئے۔ ان کو خیال تھاکہ اوپر کے حصے میں حافظ صاحب کے علاوہ اور کون ہوگا۔ سڑک پر سے انھوں نے حافظ صاحب کو پکارنا شروع کیا۔ ان کی بے تابی بتاتی تھی کہ کوئی بڑی ناک ہے کیوں کہ وہ بار بار پکارتے تھے اور یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ ایک دو منٹ سے زیادہ زحمت نہ دیں گے۔ یہاں بجائے حافظ جی کے جنگلے سے چارپائی ملائے ہوئے میاں باقر لیٹے تھے ہر آواز کے ساتھ ان صاحب کی بے تابی بڑھتی جاتی تھی دو چار آوازوں کے بعد یہاں سے بنہایت اطمینان کی پتلی آواز اور مدھم سروں میں آئی "دوت" وہ صاحب کچھ نہیں انھوں نے کہاکیافرمایاحافظ صاحب یہاں سے پھر مناسب وقفے کے بعد آواز آئی "دوت" اب تو اس شخص نے آواز بھی سنی اور معنی بھی سمجھامگر اس کو یقین نہ آیاکہ 'دوت' کہاگیاہوگا۔ یہاں سے بھی مقررہ وقفے کے بعد وہی "دوت" کہاگیا۔ تعجب کے لہجے میں نیچے سے آواز آئی "ایں یہ کیا" مقررہ وقفے کے بعد اسی اطمینان سی سنجیدگی سے انھیں مدھم سروں میں "دوت" "ارے یہ کیاشرافت ہے" "دوت"۔ پھر وہی "دوت" "یہ دیکھیے بڑاحافظ بن کے آیاہے۔ ہاتھ بھر کی داڑھی لٹکائے چوری ٹنگے ہوئے اور

حرکات یہ "دوت" اب تو وہ سڑک پر اینٹیں پتھر تلاش کرنے لگا۔ مگر اول تو سڑک صاف تھی دوسرے ان تک کوئی ڈھیلا پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔ "دوت" پھر وہی کمینہ پن کیا پاجی آدمی ہے "دوت" لاحول ولاقوۃ۔ "دوت" وہ جاتے جاتے پھر پلٹ پڑا اور حافظ جی کو گالیاں دینے لگا۔ اب برابر یہی ہوتا ہے کہ وہ حافظ صاحب پر نفریں کرتا ہوا جانا چاہتا ہے مگر "دوت" کی آواز پھر اس کو کھینچ لاتی ہے اور وہ نئی نئی گالیاں حافظ صاحب کی خدمت میں پیش کرتا جاتا ہے۔ وعدہ تو کر گیا تھا کہ صبح کو وہ اپنے مخاطب یعنی حافظ صاحب قبلہ کی جوتوں سے مدارات کرے گا مگر باقر صاحب صبح تڑکے ہی کی گاڑی سے چلے آئے اس وجہ سے پتہ نہ چل سکا کہ ان دونوں میں صحبت کیوں کر گرم ہوئی۔

ہمارے قصبے میں کربلا ایک تفریح کی جگہ ہے۔ وہاں بڑی عمدہ عمدہ عمارتیں، امام باڑے، مسجدیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جناتوں نے بنوائی ہیں ان کو دیکھنے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ ایک بار وہاں باہر کے ایک بڑے رئیس نے منّت کی مجلس کی تھی۔ میں بھی مدعو تھا۔ میاں باقر صاحب پہلے سے موجود تھے۔ کسی کونے میں بھڑوں نے چھتا لگایا تھا۔ میاں باقر جو اوپر سے نکلے تو گردن اور کان میں کئی ایک بھڑیں لپٹ گئیں۔ باقر صاحب کو اور کمالات کے ساتھ ہی یہ بھی تھا کہ درد کی تاب نہ تھی۔ ذری سی بات میں چیخنا چلانا۔ ہائے ہائے کے نعرے لگانا معمولی بات تھی۔ چناں چہ اس واقعے کے بعد پاؤں پٹخنا' اُفوہ افوہ کی جھڑ باندھنا' درد کے شکایت ہر شخص سے ہم دردی کی بھیک مانگنا' بڑے شدومد سے ہو رہا تھا۔ اتنے میں دو ایسے باہر کے حضرات کو آتے دیکھا جو ان کے شناسا مگر اس عمارت سے اجنبی تھے یہ لوگ پڑھے لکھے، شائستہ، شرافت کی تصویر معلوم ہوتے تھے۔ میاں باقر نے جہادِ نفس کر کے جزافزا ایک دم روک دی اور باوجود تکلیف کی شدت کے چہرہ سنجیدہ کر لیا اور بڑھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔ عمارت دکھانے کے بہانے وہیں لے گئے جہاں خود ان پر مصیبت آگئی تھی۔ میں نے چاہا کہ ان کو آگاہ کروں۔ مگر جب تک میں آدمی بھیجوں یا پہنچوں، وہاں جو کچھ ہونا تھا ہو چکا تھا۔ سید باقر صاحب تو غائب ہوگئے۔ اب دیکھتا کیا ہوں کہ وہ دونوں آدمی خیالی پتنا بانا ہلاتے مختلف پیترے بدلتے سر و گردن پر تھپڑ مارتے چلے آتے ہیں۔ اور بھڑیں ہیں کہ ان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ اب اس سے اندازہ کر لیجیے کہ باقر مرحوم کو جب کوئی مذاق سوجھ جائے تو دل سے مجبور ہو جاتے تھے۔

مکمل تصویر تو بڑے سے بڑا آرٹسٹ بھی نہیں کھینچ سکتا۔ یہ کام تو فقط احسن الخالقین ہی کا ہے۔ ایک آن، ایک دھج، ایک جذبہ' افتادِ طبیعت کا ایک رنگ اگر کوئی اتارنے میں کامیاب ہو گیا ہے تو وہ اپنے وقت کا رفیل اور ولیسکیز کہلاتا ہے۔ جب اتنے بڑے صاحبانِ موقلم کا یہ حال ہو تو ایک چھوٹا آدمی لکڑی لوہے کا قلم ہلانے والا کیا کر سکتا ہے؟ مگر میں نے کوشش کی ہے کہ باوجود تمام باتوں کے ہمارے باقر چچا اس قلمی خاکے میں ایسے معلوم ہوں کہ پڑھنے والا اگر ان سے

(بقیہ ص ۳۸۹ پر)

چودھری محمد علی ردولوی

غریبی میں امیری

نواب راحت حسین صاحب مرحوم کو میں بھائی کہتا تھا۔ اگر آپ سے مرحوم سے ملاقات ہوئی ہوتی تو آپ بھی بھائی کہنے لگتے۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ ان میں کوئی عیب ہی نہ تھا۔ یا ہر شخص ان سے محبت ہی کرنے لگتا تھا۔ جی نہیں۔ ایسا آدمی کہاں پیدا ہے جس کے دشمن ہی نہ ہوں اللہ میاں کے آسمان میں نہ معلوم کتنے ستارے نیک و بد ہیں لیکن ابھی تک وہ ستارہ وہاں بھی نہیں چمکا جس کے سائے میں پیدا ہو کر آدمی دشمنوں کو ترسے۔ پھر بھی نواب صاحب کے خلاف کم لوگ تھے۔ اس کے کئی اسباب تھے۔ وجیہہ آدمی تھے۔ ان کو دیکھ کر نگاہ سفارشیں کرتی تھی۔ ہنس مکھ تھے اس لیے کمینہ جذبات کم ابھرتے تھے۔ بہت امیری سے اتنی بڑی غریبی میں پڑ گئے تھے کہ حسد ان کے مقابلے میں بے دست و پا ہو گیا تھا۔ یکے بعد دیگرے ان کی سب اولادیں جوان ہو کر ان کی آنکھوں کے آگے خاک میں مل گئی تھیں۔ اس لیے ان کا ذکر کر کے لوگوں کو اپنی نرم دلی ظاہر کرنے کا موقع ملتا تھا۔ شیریں کلام تھے۔ خوش مذاق تھے۔ ان کی بڑی مبالغہ آمیز تقریریں سن کر دل کہتا تھا کہ ایسی باتوں کے لیے جھوٹ کا بھونڈا لفظ استعمال کرنا ظلم ہے۔ یہ ایک حد تک ٹھیک بھی تھا کیوں کہ ان کی واقعہ بافی کا سرچشمہ ہی دوسرا تھا۔ یہ تنہائی میں بیٹھے بیٹھے سوچتے تھے کہ اگر ایسا ہو جاتا تو بہت اچھا ہوتا۔ رفتہ رفتہ یقین کر لیتے تھے کہ ایسا ہو ہی گیا۔ پھر اس کو بیان ایسے انداز سے کرتے تھے کہ غلط جان کر بھی آدمی سننے کا مشتاق رہتا تھا۔ کیوں کہ کسی کی برائی نہیں چاہتے تھے۔ ہم لوگوں کے ایک جاننے والے تھے جو صوبے کی سروس سے بڑھ کر سیلکیٹیڈ جگہوں پر مستقل ہو گئے تھے۔ اور بجائے ضلع کا چارج لینے کے ادھر ادھر کے کام مثلاً صنعت و حرفت یا کوآپریٹیو زیادہ پسند کرتے تھے۔ بھائی راحت حسین کے دل میں آتا تھا کہ اگر ضلع کا چارج مل جاتا تو دوستوں کو اور اچھا معلوم ہوتا۔ ایک دن مجھ کو دیکھتے ہی کہنے لگے "محمد علی سنا تم نے ہمارے۔۔ ڈپٹی کمشنر اناؤ ہو گئے" میرا بھی دل خوش ہوا۔ میں نے پوچھا کس سے سنا۔ ادھر ادھر دیکھنے لگے جیسے کسی کو ڈھونڈتے ہیں۔ بولے یہ منشی جی کہتے تھے۔ اب بھی میں نہ سمجھا اور منشی جی کا نام پوچھنے لگا۔ کہنے لگے نام تو نہیں معلوم اب میری سمجھ میں آیا کہ تعیناتی صرف نواب صاحب کی من گھڑت گزٹ میں چھپی ہو گی۔ میں نے نواب صاحب کے بہت سے صفات بیان کیے مگر سب سے بڑی صفت آخر کے لیے رکھ چھوڑی تھی۔ نواب صاحب سخی بڑے تھے۔ غریبی اور سخاوت کبیر داس کی الٹواسی۔ ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ دولت، ثروت، علاقہ نکل گئے برسوں ہو چکے ہیں۔

مفلسی کے گھٹنے مضبوط ہو چکے ہیں مگر نہ چہرے پر شکن نہ ہمت میں کمی۔ ایک دن ایک صاحب نے بیان کیا کہ ہمارے کھانے کا سامان کہیں نہیں ہے۔ نواب صاحب نے کہا کہ آپ کھانا ہمارے یہاں آکر کھالیا کیجیے۔ پتا لگا کہ جس دن نواب صاحب یہ دریا دلی فرما رہے تھے اس دن ۹ بجے صبح تک گھر میں ہانڈی نہیں چڑھی تھی۔ اسی دن شام کو ہم اور ایک اور مہربان نواب صاحب کے دہاں پہنچے۔ محلے کی دو تین عورتوں کو دیکھا کہ اپنے گھروں سے مٹی کی رکابیاں لے کر آئی ہیں اور پلاؤ بھر بھر کر لے جا رہی ہیں۔ پلاؤ بالکل معمولی تھا۔ جو شخص دو چار کو کھانا کھلائے بغیر کھا نہ سکے وہ اچھا پلاؤ کیسے کھا سکتا ہے۔

نواب صاحب کی والدۂ مرحومہ اور ان کی بہنیں مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھیں کیوں کہ بچپن سے مجھ کو دیکھا تھا۔ مگر بیگم صاحب اور جوان لڑکیاں مجھ سے پردہ کرتی تھیں۔ ان کی ایک لڑکی تھی اس کی آواز پڑ گئی۔ اس لیے میں اس کو سامنے لے آیا کہ جس میں حلق وغیرہ اچھی طرح دیکھ سکوں۔ اس واقعے کو برسوں ہوگئے۔ مگر میرا افسوس آج تک باقی ہے کہ میں نے اس کو کیوں دیکھا تھا۔ وہی نواب صاحب کی آنکھیں، وہی نواب صاحب کا شاندار چہرہ، وہی شرافت کی جھلک، چار دن میں خاک کا پیوند ہو گئی۔ حلق کا دق تھا جو اپنا کام کر گیا۔ رفتہ رفتہ بیگم صاحب بھی میرے سامنے ہونے لگیں اور ان آنکھوں نے دیکھا کہ ان کے گھر کے اندر امیری غریبی دونوں بہنیں کاندھے سے کاندھا جوڑے نہایت بے تکلفی سے بیٹھی رہتی تھیں۔ ایک طرف بیگم صاحب خود کھانا پکا رہی ہیں دوسری طرف روز کے آنے والے چند مہمان پہنچ گئے۔ کھر چن تک پوپچھ کر کھا گئے۔ لیجیے صاحب گھر والوں کے لیے پھر سے ہانڈی چڑھی۔ بے حیا کھانے والے اور حمیت دار کھلانے والے دونوں ہنس رہے ہیں۔ کہیں فکر کا نشان نہیں ملتا۔

کرام ویل انگلستان کے پیش از وقت ڈکٹیٹر اور بادشاہ خوار کے پاس ایک مصور آیا کہ مجھ کو تصویر کھینچنے کی اجازت دی جائے۔ کرام ویل تیار ہوگئے اور کہنے لگے میرے چہرے پر بہت سے مسّے ہیں اگر ایک بھی چھوٹا تو تم جانو گے۔ اگر غور کیجیے تو بات بڑی پکی کہی تھی۔ بھاٹوں کی طرح صرف اچھائیاں ہی اچھائیاں دکھانے سے نہ کسی شخص کا کیریکٹر پیش کر سکتے ہیں نہ مسّے چھوڑ جانے سے وہ چہرہ ہی سامنے آتا ہے جس سے آدمی کی افتادِ طبع معلوم ہو سکے۔ نواب صاحب کا حال بیان کرنے میں مجھ کو بھی اسی طرح کی دو دقتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں اپنی محبت کی وجہ سے شاید صحیح رائے نہ قائم کر سکتا ہوں۔ دوسرے جب تک ان کے بچپن اور ان کے خاندان کا حال نہ بیان ہو ان کی تصویر مکمل نہیں ہو سکتی۔ ہمارے قصبے کے رہنے والے نسل کی اصالت پر جان دینے والے شیخ انصاری کسی پشت میں ان کے یہاں کسی نے لکھنو میں شادی کر لی تھی تب سے یہ لوگ نام ہی کے نہیں بلکہ سچ مچ کے نواب ہوگئے اور گھر لٹا دیا۔ پچاس برس سے اوپر ہوئے ہوں گے کہ نواب راحت حسین لکھنو میں انگریزی پڑھنے بھیجے گئے۔ نہ معلوم کیا پڑھا کیا نہ پڑھا مگر گھر

میں نوکروں کو انعام بٹ گیا اور احباب کی دعوتیں ہو گئیں کہ منجھلے میاں نے کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس پاس کیا ہے۔ اسی زمانے میں ایک گونگا لڑکا نہ معلوم کہاں سے آگیا۔ راحت حسین بھائی کی والدہ نے اس کی پرورش اپنے ذمے لے لی۔ قسمت کا لکھا اس کو دق ہو گئی۔ بڑی بیگم صاحب نے اس کی تیمار داری خود کی۔ لوگوں نے سمجھایا کہ اس مرض میں بڑی احتیاط چاہیے مگر انھوں نے کہا کہ جیسے میرے تین بیٹے ویسے ہی چوتھا یہ۔ قصہ مختصر اس کا جنازہ اسی گھر سے نکلا۔ اس زمانے میں دیہات میں اصول حفظان صحت اور چھوت، نا معلوم چیزیں تھیں جن کا ذکر خواب میں بھی کسی نے نہ سنا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دق ایسی گھر میں گھس کر بیٹھی جیسے ہندوستان میں اغیار۔ نواب صاحب اور نواب صاحب کے بچے، ان کی بہنیں اور ان کے بچے خدا جھوٹ نہ بلوائے اسی گھر سے پندرہ بیس جنازے تو میری آنکھوں کے سامنے سے نکل چکے ہیں اور سب اسی کم بخت مرض کے مارے ہوئے۔ نوابی کا اثر یہ بھی تھا کہ ان بیماریوں میں آخر وقت تک یہی ذکر ہوتا رہتا تھا کہ اب مریض اچھا ہو گیا۔ اللہ بخشے بہایت اطمینان سے یہی کہا کرتے تھے کہ پرسوں تک مرض کی تشخیص ہی غلط ہوئی تھی۔ کل سے مرض کا پتہ چل گیا ہے اب آج مریض بالکل اچھا ہے۔ لوگ نہ معلوم کیا کیا شکوک دل میں لاتے تھے، نہ معلوم کون کون بدفال زبان سے نکالتے تھے اور تھا صرف نزلہ۔ ایک ہی خوراک میں صحت ہو گئی۔ اب ماشاء اللہ جیسے بیمار ہی نہ تھے۔ آج صبح کو یہ کہا اور کل ہی جنازہ نکلا۔ صبر اور استقلال اس درجے کا تھا کہ جوان جوان بیٹے، بیٹیاں، بھانجے، بھانجیاں، بہنوں کو اپنے ہاتھوں سپرد خاک کر آئے مگر اظہارِ غم نہ کیا۔ دل پر جو گذرتی رہی ہو، اس کو وہ جانتے تھے اور ان کا بنانے والا۔

ہمارے بھائی راحت حسین بذلہ سنج اور شیریں گفتار تو تھے ہی نثار بھی اچھے تھے۔ جوانی میں اخبار میں مضامین وغیرہ لکھتے تھے۔ آخر میں ایک سوانح عمری۔؟ لکھ رہے تھے۔ کس کی سوانح عمری۔ جی اس حقیر کی۔ انداز سے مجھ کو معلوم ہو گیا تھا کہ میری بابتہ کچھ لکھا جارہا ہے مگر مجھ کو دیکھنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ ایک دن تنہائی میں ملاقات ہو گئی۔ چند اوراق میں نے دیکھے۔ میرے حواس باختہ ہو گئے۔ حضرت یوسف کی خوب صورتی، اکبر اعظم کا حوصلہ، نعمت خاں عالی کی بذلہ سنجی، حاتم کی سخاوت، رستم کی طاقت سب ہی کچھ تو مجھ میں تھی۔ میں گھبرا گیا۔ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ نہ معلوم کتنی منت سماجت کتنی لجاجت کی، قسمیں دلائیں، تب وہ مانے۔ نہیں تو میری رسوائی کا سامان مکمل ہو گیا تھا۔ اسی کتاب کا ایک جملہ سن لیجیے اور اس کے بعد بھول جانے کی کوشش کیجیے۔ ریل پر کوئی صاحب بھائی راحت حسین کو ملے یعند الذکر انھوں نے پوچھا کہ ردولی میں قابل زیارت کوئی چیز ہے۔ بھائی صاحب مرحوم فرمانے لگے دو چیزیں ہی۔ ایک حضرت مخدوم احمد عبد الحق قدسرہ، کا مزار اور دوسرے چودھری محمد علی۔ ایک مرتبہ بھائی صاحب مرحوم نے نوکری بھی کی تھی۔ قصہ ذرا طولانی ہے۔ نہ معلوم کس کے کہنے سے ڈپٹی کمشنر سے ملنے چلے گئے

(بقیہ صفحہ ۴۵۱ پر)

چودھری محمد علی ردولوی

راجہ پر تھی پال سنگھ

پودوں میں ایک قسم ہوتی ہے جن کو انگریزی میں "پیراسائٹس" کہتے ہیں۔ اپنے ملک کی زبان میں ان کو بیل کہہ لیجیے۔ ان میں یہ بات ہوتی ہے کہ دوسری کے بل بوتے پر خوب پھیلتے ہیں۔ اگر یوں زمین پر بو دیجیے تو تھوڑے سے بڑھ کر رہ جاتے ہیں اگر کوئی چیز ایسی پا گئے جس پر چڑھ سکیں تو جی بھر کر پھولتے پھلتے ہیں۔ ہمارے بچپن کے یار، ساتھ کے کھیلے، ساتھ کے پڑھے راجہ پرتھی پال سنگھ تعلقہ دار سورج پور کی افتاد طبیعت ایسی ہی تھی۔ اگر اس بات کو یاد رکھیے گا تو ان کی زندگی کا ہر پہلو ان کے ہر قول، ہر فعل ہر کام کی چھپی ہوئی بتہ آب پر کھل جائے گی۔ میرا ان کا ساتھ کالون تعلقہ دار کالج میں جو اس زمانے میں اسکول کہلاتا تھا ۱۸۹۲ء سے ہوا۔ یہ کوئی گیارہ برس کے ہوں گے اور میں دس برس کا تھا۔ پرتھی پال سنگھ کی خصوصیات حسب ذیل تھے: صاف دلی، ذہانت، نیکی، بعض باتوں میں بہت نڈر، بعض باتوں میں بڑے ڈرپوک۔ مثلاً اندھیرے میں ہو سے کردو تو بے ہوش ہو کر گر پڑیں، بجلی چمکے تو لحاف سے منھ بند کر کے لیٹ رہیں۔ اگر بات پر اڑ جائیں تو چاہے جان ہی جائے اس پر قائم رہیں۔ دوست احباب کے کام آنے کے موقعے ڈھونڈھا کریں۔ موٹے تھلتھلے آدمی تھے۔ فٹ بال فیلڈ میں خود فٹ بال معلوم ہوتے تھے۔ ٹینس غنیمت کھیلتے تھے۔ گھوڑے پر اچھا چڑھ لیتے تھے۔ ان کی عشق پیچاں والی افتاد طبیعت کا پہلا نمونہ جو میں نے دیکھا وہ یہ تھا کہ ہمارے رائڈنگ اسکول کے دفعہ دار کے مرید ہو گئے۔ دفعہ دار بے چارہ ان پڑھ سرکاری پنشن خوار، سپاہی بھرتی ہوئے اور دفعہ داری سے پنشن پائی تھی۔ پال سنگھ کے مشیر تھے۔ انگریزی کپڑے بنوائیں گے تو دفعہ دار سے مشورہ کر کے، ٹینس کا بلا خریدیں گے تو دفعہ دار سے پوچھ کے، حتیٰ کہ کوئی کتاب بھی مول لیں گے تو دفعہ دار سے صلاح لینے کے بعد:

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

یہ سلسلہ پڑھے لکھے جاہل نیم تعلیم یافتہ لوگوں کے ساتھ عمر بھر جاری رہا۔ پڑھنے لکھنے میں بہت تیز تھے۔ مذہبی تعصب کہیں چھو تک نہیں گیا تھا۔ چوکا برتن تو بڑے احتیاط سے ہوتا تھا مگر چھوت چھات سے پیدائشی نفرت تھی۔ اتنی جراءت تو تھی نہیں کہ پندرہ سولہ برس کے سن میں کھلم کھلا ہم لوگوں کے ساتھ کھانا کھاتے مگر چوری چھپے کسی چیز سے پرہیز نہیں تھا۔ اس کے

بعد دو آدمیوں کا اثر ان کے اوپر بہت پڑا ایک کورٹ آف وارڈس کے ہیڈ کلارک تھے اور دوسرے میرے خیال میں ایک تھیا سوفسٹ وکیل تھے۔ کلارک نے تو شمپین اور گزک کے آزاد خیالی اور آزادہ روی کی راہ لگائی۔ بڑی کھچڑی داڑھی والے وکیل زیادہ اہم باتوں کی طرف لے گئے۔ پولٹیکل خیالات، ہندو مسلم فرق، ملک کی سیوا، انگریزوں سے نفرت، یہ باتیں پختہ ہونے لگیں۔ اس جگہ پر تھی پال سنگھ کی مضبوطی کا ایک واقعہ سن لیجیے۔ یقیناً ہم لوگ ۱۹، ۲۰ برس کے رہے ہوں گے، ہم لوگوں کے علاقے ابھی تک کورٹ کے انتظام میں تھے۔ فیض آباد میں ایک کمشنر تھا جو نہایت منصف مگر بہت بد دماغ آدمی مشہور تھا۔ علاوہ اور باتوں کے ایک سنک اس میں یہ بھی تھی کہ اگر لوگ اس سے ملتے نہیں تھے تو وہ برا مانتا تھا۔ بعض انگریز تھے جو زیادہ ملاقاتیوں کا آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے ہم غریب نابالغوں کو بڑی دقت پڑتی تھی۔ حکام میں کوئی غرّاتا تھا کوئی دم ہلاتا تھا اور ہم بد قسمتوں کو ملنے کے پہلے یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ یہ انگریز غرّانے والا ہے یا دم ہلانے والا۔ بعض تھے جو غرّاتے بھی تھے اور ساتھ ہی دم بھی ہلاتے جاتے تھے۔ ان کا سمجھنا سب سے مشکل تھا کہ کس سرے کا اعتبار کیا جائے۔ چناں چہ سب سے پہلے اس کمشنر نے ایک بوڑھے ذی عزت تعلقہ دار کو جھنجوڑ کھایا۔ ان سے اس نے پوچھا آپ ہم سے کبھی اور ملے ہیں؟ انھوں نے کہا نہیں۔ اس نے کہا تو ہم آپ سے نہیں ملنا چاہتا۔ یہ کہہ کر اٹھ گیا۔ یہ بے چارے بہت شرمندہ ہوئے۔ ان کو عمر بھر میں کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ان کی تکلیف کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اس کے بعد یہی مصیبت مجھ پر پڑی۔ میں مبہوت رہ گیا اور اٹھ کر چلنے لگا۔ لیکن اس نے پھر بٹھا لیا مگر مجھ سے کچھ کرتے دھرتے نہ بن پڑتا تھا۔ تیسرا واقعہ پرتھی پال سنگھ کا ہوا۔ ان سے بھی اس نے یہی کہا۔ انھوں نے جواب دیا مجھ کو بڑا افسوس ہے کہ میں ایسے گستاخ آدمی سے ملنے آیا اور اٹھ کر چلے آئے۔ اس کے بعد سے اس کے کان ہو گئے اور پھر اس طرح کی حرکت اس کی سنی نہیں گئی۔ بغیر پہلے اور بعد کا لحاظ کیے ہوئے ہمارے دوست کا ایک اور واقعہ سن لیجیے جو تصویر کا دوسرا رخ دکھاتا ہے۔ اس وقت ہم لوگوں کا سن اور بھی کم تھا۔ مگر ٹھیک وقت یاد نہیں۔ بڑے دن کی چھٹی ہونے کو دو تین دن باقی ہیں۔ دل کی خوشیاں بڑھ رہی تھیں۔ رات کے تقریباً آٹھ بجے ہوں گے، پرتھی پال سنگھ ہیڈ ماسٹر کے پاس پرائیوٹ ٹیوشن لے رہے ہیں۔ پڑھنے کے بعد رخصت ہوتے ہیں۔ برآمدے میں اندھیرا ہے۔ کونے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کالا بھجنگ آدمی دس فٹ کا قد مٹکے کا ایسا سر لیے کھڑا ہے۔ یہ ایک چیخ مار کر پھر کمرے میں گھس گئے اور ہیڈ ماسٹر صاحب پر پھٹ پڑے۔ جھرپ جو لگی تو لیمپ بھی گر کر بجھ گیا۔ اچانک واقعہ ایسا ہوا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے بھی پرتھی پال سنگھ کی چیخ میں چیخ ملائی۔ نوکر جب تک آدیں آدیں کالا دیو رفو چکر ہو گیا تھا۔ لیمپ جلا تو لوگوں کے حواس بجا ہوئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب جو رضائی اوڑھے بیٹھے تھے اس وقت جو کرسی کے گدّے کا کام بھی دے رہی تھی بیچ کو بیچ میں دھوئی نچوڑی ہیڈ ماسٹر صاحب کی دیوار پر پھیلی تھی

یہ ہیڈ ماسٹر صاحب سے خطا ہو گئی یا پر تھی پال سنگھ سے، آج تک دریافت نہ ہو سکا۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد آزادی کے خیالات زیادہ ہو گئے۔ علاقہ بھی کورٹ سے چھوٹ گیا۔ عالی ہمت آدمی تھے ہاتھ بھر کا کلیجہ تھا جو کام کرتے تھے بڑے پیمانے پر ہوتا تھا اگر کسی کو دیں گے تو اس کی امید سے زیادہ۔ اگر مکان کی بنیاد ڈالیں گے تو ایسی کہ دو منزل کا اگر بنوانا ہے تو تین منزل سنبھال لے۔ اگر ہنسیں گے تو جی بھر کے ہنسیں گے، اگر غصہ کریں گے تو اسی طرح جی بھر کے۔ چناں چہ ایک مکان بنوایا کلکتے کے مشہور انجینیرس مارٹن اینڈ کو کو ٹھیکہ دیا تھا۔ اس زمانے میں ڈھائی لاکھ کا مکان آج دس لاکھ کا اسٹیمیٹ بیٹھتا۔ دو منزلیں، تیسرا ہوادار گنبد، غسل خانے اوّل درجے کے جس میں اسپرے باتھ شاور باتھ اور نہ معلوم کیا کیا لگا یا تھا۔ لفٹ بھی تھا۔ کتب خانہ بھی اسی پیمانے کا تھا۔ کارل مارکس، ینگ، فرائیڈ سے تو شاید مشکل ہی سے واقف رہے ہوں گے۔ مگر مل اور ہربرٹ اسپنسر اور مسز اینی بیسنٹ، برائٹ، بریڈلا کے ماہر تھے۔ یقیناً ہو یلاک ایلس سے بھی ناواقف نہ رہے ہوں گے۔ تلک کا فلسفہ تو تھا ہی۔ یہ کتب خانہ آج بھی الہ آباد یونیورسٹی میں موجود ہے۔ لاوارث پڑے رہنے سے تو بہتر ہوا کہ پر تھی پال سنگھ کی خیرات مرنے کے بعد بھی ان کے ملک والوں کو فائدہ پہنچا رہی ہے۔ میرا ان کا ساتھ بیچ بیچ چھوٹ جاتا تھا مگر دل کے تعلقات میں فرق نہ آتا تھا۔ مختلف زمانوں میں برسوں ملنے کی نوبت نہ ہوئی مگر جب ملے تو اسی صفائی سے ملے۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں ان کی پوری سوانح عمری نہیں ہے۔ اس یادِ احباب کی مثال اس طرح سمجھ لیجیے جیسے کوئی مصور ہو اور روٹیاں کمانے سے الگ خالی یاد پر اپنے بچپن کے یاروں کے اسکیچ بنانے کی کوشش کرے۔ کامیاب ہو یا نہ ہو مگر جو انداز ان لوگوں کے اس کے دماغ میں ہیں وہ تو نکال ہی لے گا۔ کسی دوسرے کو اچھی لگیں یا نہیں اس کے لیے تو پرانی یاد تازہ ہو کر مزا دے جائے گی۔ بوڑھی ماں زندہ تھیں بیاہ کا تقاضا شروع ہوا مگر پر تھی پال سنگھ اس رنگ پر نہ آتے تھے۔ وجہ نہیں معلوم ہوتی تھی کہ شادی سے کیوں گھبراتے ہیں۔ ہم لوگوں نے اکثر کہا مگر سو لہنس کر ٹال جانے کے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اب ملک کی سیوا کی خواہش اور پولٹیکل خیالات اور گہرے ہونے لگے۔ لوک مانیا تلک کا دور دورہ تھا۔ نہ معلوم کس سلسلے سے وہاں پہنچ گئے کچھ دن وہاں رہ کر کام کیا اس کے بعد واپس آگئے۔ باوجود آزادی اور صاحب اختیار ہونے کے جاننے والوں کو دو باتوں کا پتہ چلتا تھا ایک تو یہ کہ ملک کی خدمت کرنا چاہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ کام کچھ برہم چاری ہی خوب کرتا ہے۔ اگر شادی ہو گئی تو چلتی گاڑی میں روڑا اٹک جائے گا۔ دوسرے یہ بھی اندازہ ملتا تھا کہ ابھی تک یہ طے نہ کر سکے تھے کہ سیوا کا کون کام تجویز کریں جس پر اپنی پوری زندگی تج دیں دفع الوقتی کے لیے غریب لوگوں کی تعلیم میں مدد کرنا، بڑے اداروں کو چندہ دینا، پولٹیکل بٹے بازوں کے جعل فریب میں آجانا فی الحال یہی مشغلہ رہ گیا تھا۔ تعلیمی خیرات کے سلسلے میں ایک غریب خاندان کی ایک لڑکی کو کمائیوں کے پہاڑ میں دیکھا۔ اس کا وظیفہ مقرر کر کے کسی پاٹھ شالا

وغیرہ میں بھیج دیا۔ میرے خیال میں اچھے آدمیوں کی پہچان میں سے یہ بڑی پہچان ہے کہ اس کو بچوں سے محبت ہو۔ پھر اگر بچہ خوب صورت ہوا تو اس کی طرف تو دل اور کھنچتا ہے۔ اس لڑکی کو بھی دیکھ کر لوگوں کے دل میں ویسی کیفیت پیدا ہوتی تھی جیسے کوئی کلی جو رنگ پکڑ چکی ہو یا شمع روشن ہو۔ پرتھی پال سنگھ جب گرمیوں میں نینی تال جاتے تھے تو یہ لڑکی بھی چھٹیوں میں آتی تھی اور اس کے گھر والے سلام کے لیے لے آتے تھے۔ سال دو برس میں لڑکی کی شان ہی دوسری ہو گئی

قدم قدم پر اٹھاتے ہو فتنۂ محشر   یہ کم سنی کا ہے عالم شباب کیا ہوگا

کچھ دنوں میں یہ ہوا کہ دیکھنے والے درود بھیجنے لگے اور دن گذرے تو قرآن پڑھنے لگے "فتبارک اللہ احسن الخالقین۔" ایک ڈرامے میں ایک ڈویل ہونے والی تھی میدان بدا گیا۔ جن صاحب نے لڑنے کا پیغام بھیجا تھا ان کو اپنی بہادری کا بڑا دعویٰ تھا۔ جب موقع پر پہنچے تو اپنے ساتھی سے کہنے لگے ارے یار اب تو بہادری کچھ کم ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ اے لو یہ تو بہت ہی کم ہو گئی۔ اس لڑکی کا اٹھان دیکھ کر پرتھی پال سنگھ کا برہم چاری پن بھی اسی بہادر کی راہ جاتا دکھائی دیا۔ آخر کھیت رہے۔ پرتھی پال سنگھ گذر گئے۔ ان کی بی بی کی مٹی نربدا نے اپنی گود میں لے لی۔ ہم خود قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں مگر پرانے تذکروں سے کچھ تازگی سی آگئی:

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا   ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

جوانی کی منزل پار کر چکے بڑھاپے کا راستہ بھی کٹا چاہتا ہے مگر دل ابھی تک جوان ہے۔ ایک آفت میں جان ہے پیارے دوست کا قصہ پھر کہوں گا۔ لگے ہاتھوں دو چار شعر سن لیجیے۔ ان کا ربط قصے سے ہو نہ ہو آپ جانیں میرے دل میں لہر اٹھی ہے میں لکھے جاتا ہوں آپ کا جی چاہے گا چھوڑ جائیے گا۔

چھپ چھپ کے دیکھنے کے مزے سب یہ اے اثر
معلوم ہوں گے جو کبھی ان نے نگاہ کی

نہ بے وفائی کا ڈر تھا نہ غم جدائی کا   مزا میں کیا کہوں آغاز آشنائی کا

اے فغاں دیکھنا کچھ لینا   دے کے دل پھر لیا نہیں جاتا

سایۂ طوبیٰ و دل جوئی حور و لبِ حوض   بہ ہوائے سرِ کوئے تو برفت ازیادم

ز بادشاہ وگدا فارغم بحمد اللہ   گدائے خاکِ درِ دوست بادشاہِ من است

اڑائے ساتھ یہ مشت غبار لیتا جا   ہمیں رکاب میں او شہہ سوار لیتا جا

کہ کرد قطعِ تعلق کدام شد آزاد   بریدۂ زہمہ با خدا گرفتار است

اب زندگی ہی دوسری ہو گئی۔ ملنا جلنا کم ہو گیا۔ پولٹیکل دلچسپیاں ماند پڑ گئیں اگر کوئی ملتا ہے تو اسی طرح مل لیتے ہیں جیسے ہمیشہ ملتے تھے مگر دل کہیں اور ہوتا ہے۔ "میں تو پیا تورے رنگ

ماں سمائی رہی" سے مطلب سمجھ جائیے۔ آدھا علاقہ رانی صاحبہ کے نام لکھ گیا باقی آدھا خرچ اخراجات کے لیے رہا۔ اس آدھے کی، دھو لوٹ پڑ گئی۔ نہ معلوم کتنا قرضہ ہو گیا۔ بد قسمتی دیکھیے کہ اولاد کوئی نہ ہوئی۔ ان کے سالے کی ایک پیاری پیاری لڑکی تھی اس کو اولاد سے زیادہ چاہتے تھے۔ غالب سے کہا گیا تھا کہ جو شخص شراب پیتا ہے اس کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ انھوں نے جواب دیا کہ جب شراب مل گئی تو اب کون چیز رہی جس کے لیے دعا مانگی جائے۔ یہی حال ہمارے دوست کا تھا۔ مذہبی پختہ دلی سے دل مضبوط، رعایا پروری سے ضمیر کو آرام، وہ لڑکی آنکھوں کا نور، چاہنے والی سے دل کا سرور، زندگی کی چاشنی، علم اور کتابوں سے دل کی طاقت دماغ کی روشنی گرمیوں میں مسوری، جاڑوں میں بھتوندا کی جنت نما کوٹھی اور سب پر اضافہ مزے کا حقہ لکھنؤ کا خمیرا لچھے دار دھواں خوش بو کی لپیٹیں جو بابو بنکم چندر چٹرجی کو للچائیں۔ عمر خیام کے خوابوں کی تعبیر اگر یہاں نہیں مل رہی تھی تو کہاں مل رہی ہوگی۔ ظاہر ایٹم ٹام اور اوچھے پن سے نام پیدا کرنے سے ان کو ہمیشہ کی نفرت مگر وہ بھی بن مانگے مل رہی تھی۔ سر ولیم میرس کا زمانہ ایک راجہ سورج پور یوں ہی کہلاتے تھے۔ اب گورنمنٹ نے یہ بھی خطاب بے مانگے ان کے سر منڈھا۔ ان کو ذری سی خوشی نہ ہوئی مگر مفت کی لڑائی کون مول لے اس لیے چپ رہے۔ پرتھی پال سنگھ بلا وجہ انگریزوں سے لڑنا نہیں چاہتے تھے مگر ان کو بھی دوسرے پڑھے لکھوں کی طرح انگریزی حکومت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ سر ولیم کے پہلے ایک مرتبہ بارہ بنکی میں لفٹنٹ گورنر آئے تھے ایک چھوٹی سی لیوی دی۔ پرتھی پال سنگھ اس میں مجبور آ آئے مگر بالکل معمولی کپڑے پہن کر۔ اس زمانے میں فیلٹ کیپ اور گھٹنوں تک کا بند کوٹ کلارک لوگ عموماً پہنا کرتے تھے۔ پرتھی پال سنگھ بھی ہیڈ کلارک کے بھیس میں آئے تھے۔ شام کو جب گارڈن پارٹی ہوئی تو یہ بڑی عمدہ انگریزی پوشاک پہنے تھے۔ اس کو بعض انگریزوں نے بھی دیکھا دانت پیس کر رہ گئے۔ تھوڑے دنوں کے بعد سر ولیم نے پرتھی پال سنگھ کو لکھا کہ ہم تم کو وزارت میں لینا چاہتے ہیں انھوں نے کیا، رانی صاحبہ نے رائے تو اسی وقت قائم کر لی تھی مگر دنیا کو قائل کرنے کے لیے دو چار احباب سے مشورہ بھی لے لیا۔ نتیجہ تو پہلے ہی معلوم تھا۔ انھوں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ خوشی کی پینگیں مزے کی لہریں عیش کی راتیں آرام کے دن کب تک رہتے:

غفلت کفیلِ عمر و اسدؔ ضامنِ نشاط
اے عمرِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

لیجیے صاحب ورق جو الٹتا ہے رانی صاحبہ چل بسیں اس کے بعد وہ لڑکی بھی بعد کو گذر گئی۔ پرتھی پال سنگھ تنہا رہ گئے۔ مذہب سے کبھی بے خبر نہ تھے۔ اب سوا اس سہارے کے کون سہارا پکڑیں۔ ممالکِ متوسط میں کھنڈوا بڑی جگہ سمجھا جاتا ہے۔ دادا جی کا دربار ہندوستان کی بڑی جگہوں میں سے ہے۔ پرتھی پال سنگھ کا عقیدہ بہت دنوں سے ادھر مضبوط تھا۔ اب بالکل

وہیں کے ہو گئے۔ خاندان کے ایک لڑکے کو راس بٹھایا۔ اور خود کھنڈوا چلے گئے۔ کھنڈوا میں داداجی کے دربار جانے کو بہت جانتے ہوں مگر پرتھی پال سنگھ اس طرح گئے کہ پھر کسی چیز سے واسطہ ہی نہ رکھا" جو بن پیا بار لیے سے تج دیں" انھیں کو کرتے دیکھا۔ روپیہ ضرور گھر سے جاتا تھا مگر اس کا انتظام ٹرسٹ کے ذریعے سے پہلے ہی کر چکے تھے۔ جان، جسم، عقل، رائے سب کچھ دادا جی کا ہو گیا تھا ان کو جینے کا حکم تھا جیتے تھے جب مرنے کا حکم ملا اسی آن سے مر بھی گئے۔ نہ دل میں خوف نہ ہراس نہ خوشی نہ غم، نہ دھڑکا نہ کلک، نہ نفرت نہ رغبت۔ یورپ والا تو سمجھ نہیں سکتا تھا دنیا دار ہندوستانی جو ان باتوں کو کچھ سمجھتا بھی ہے وہ بھی راضی بہ رضا کا یہ درجہ دیکھ کر مبہوت رہ جائے گا۔ عشق بیچاں والی بات جو شروع میں عرض کی گئی اب ایسی ایسی صورتوں میں ظاہر ہونے لگی کہ اگر ہمارے دوست کی جگہ دل میں نہ ہو تو ناواقف دماغ کی خرابی سمجھے۔ میں خود کھنڈوا نہ پہنچ سکا لیکن ہمارے دوسرے احباب جو وہاں گئے اور جن کے بیان میں شک کی گنجائش نہیں ہے اپنے چشم دید واقعات بیان کرتے ہیں۔

اس مذہبی دربار کی خصوصیات میں سے ہے کہ داداجی مہراج کے منھ سے وجد ان میں کبھی کبھی ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں کہ ظاہر دار لوگوں کی سمجھ میں کسی طرح نہیں آتے۔ ان باتوں کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اس استھان کے فیضان میں حصہ رکھتے ہیں اور روحانیت کی روشنی حاصل کر چکے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ اسی طرح کے ارشادات کی بنا پر پرتھی پال سنگھ نے کسی بہت چھوٹے آدمی کو بہت قیمتی ریشمی گاؤن بنوا دیا ہے، کسی اسی درجے کے آدمی کو موٹر کار خرید دی ہے۔ جواہرات اور دولت سے وہ لوگ مالا مال ہو گئے جو نہ علم رکھتے تھے اور نہ ہنر اور جن کا برتاؤ پرتھی پال سنگھ کے مرنے کے بعد اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہو گیا۔ اتنا پڑھا لکھا آدمی' اتنا سمجھ دار شخص اور اس طرح معمولی آدمیوں کے ہاتھ کٹھ پتلی ہو کر رہ جائے اگر آدمی زحمت نہ اٹھانا چاہے تو پورا معمہ ایک لفظ میں حل ہو سکتا ہے۔ یعنی سڑی پن۔ ہاں اگر کوئی دماغ پر زور دے تو ممکن ہے کچھ معنی بھی نکل سکیں۔ ویدانت اور تصوف میں پہلی شرطوں میں ہے کہ خودی نہ رہ جائے۔ اس درجے پر پہنچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کھانا پہننا' روپیہ پیسہ' ضروریاتِ زندگی کی خواہش دور کر دی جائے۔ مختصر آمایا کی محبت نہ رہ جائے۔ آدمی کھانا کھائے مگر صرف اس واسطے کہ اس کو حکم دیا گیا ہے کہ کھاؤ۔ پانی اس واسطے پیے کہ اس کو حکم دیا گیا ہے پیو۔ اس واسطے نہیں کہ اس کو خود اس میں کوئی لطف ہے۔ زندہ رہنے کا حکم ہے، زندگی کے لیے یہ ضروری چیزیں ہیں۔ اس لیے یہ بھی سہی، جب حکم ہو گا کہ مر جاؤ اسی انداز سے مر بھی جائیں گے:

بیٹھے نہیں زمیں میں خزانے کو گاڑ کے
موت آئی اٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کے

اسی انداز سے مر بھی جائیں گے جس انداز سے جیا کیے ہیں۔

خود اپنی خواہش اگر شریک ہو گئی تو سب محنت ملیامیٹ ہو گئی۔ لکھنے والا دنیادار آدمی جب ان باتوں کو خود نہیں سمجھتا تو دوسرے کو کیا سمجھائے گا۔ مایا سے یہ بے تعلقی اور وہی پیراسائٹ والا مزاج اگر اکٹھا کیا جائے تو شاید سمجھ میں آجائے۔

تھوڑا سا حال میرے دوست کا اور رہ گیا ہے۔ اس کو پڑھ لینے سے شاید وہ کچھ سمجھ میں آجائے جس کو بیان کرنے میں میرا قلم اور میری زبان دونوں ہار گئے۔ کچھ دنوں کے بعد پرتھی پال سنگھ بیمار پڑے۔ لوگوں نے کہا دوا کیجیے۔ انھوں نے جواب دیا میں تو اپنی جان داداجی کو سپرد کر چکا۔ اب مجھ سے اور دوا سے کیا واسطہ۔ داداجی جانیں اور ان کی مصلحت مجھ سے مطلب؟ نمونیا ہو گیا دق ہو گئی۔ پرتھی پال سنگھ نے علاج کیسا فکر بھی نہ کی۔ جب حالت بہت خراب ہوئی تو مہراج نے خود فرمایا کہ اپنے گھر چلے جاؤ۔ انھوں نے جواب دیا صرف داداجی کے چرنوں میں میرا گھر ہے اس در کو چھوڑ کر میں کہاں جاؤں۔ چیلے کی خاطر سے گرو خود بھتونڈا آنے کو تیار ہوئے۔ پرتھی پال سنگھ ان کے قدموں سے لگے یہاں بھی چلے آئے مگر جیسے کوئی غیر آوے۔ میں نے سنا۔ دل تڑپ گیا۔ فوراً ایک خط لکھ کر بھیجا کہ میری آرزو تھی کہ اپنے مرنے کے پہلے تم کو دیکھ لوں خدا کا کرنا ایسا کہ تم آگئے۔ اب جب کہو میں آؤں۔ پرتھی پال سنگھ حقّے کے نیچے مجھ ہی سے منگوایا کرتے تھے۔ میں نے یہ بھی لکھا کہ دو نیچے بنوا کر رکھ دیے ہیں۔ اگر تم نے حقہ چھوڑ نہ دیا ہو تو اپنے ساتھ لیتا آؤں گا۔ اس کا جواب کسی اہلکار کے ہاتھ کا لکھا ہوا آیا کہ راجہ صاحب بہت بیمار ہیں کسی سے ملتے جلتے نہیں لیکن تم سے ملیں گے۔ جب چاہو چلے آؤ۔ میں دوڑا گیا۔ وہی کوٹھی مگر باغ اجاڑ برساتی کے پیچھے برآمدے میں راجہ صاحب کے گرو آرام کر رہے ہیں۔ سیاہ فام دبلے سے ایک آدمی ہیں داڑھی مونچھ صاف سبز تمپبر کا کرتا۔ کسی اور رنگ کی ریشمی دھوتی۔ ہاتھوں میں بے گھنڈیوں کے موٹے موٹے سونے کے کڑے، پاس ہی ایک بڑے سے تسلے میں دھونی کا سامان۔ ہال کے بیچ میں بھی دھونی کی راکھ پڑی ہے۔ ایک چھوٹے بغلی کمرے میں راجہ صاحب ہیں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بجائے تن و توش کے آدمی کے ایک منحنی سا پھوسڑا جامہ، قضا کا چیتھڑا پڑا ہے۔ جو نہ جانتا ہو وہ سمجھے کہ سات آٹھ برس کا کوئی بچہ بیمار ہے۔ داہنی طرف دیوار پر داداجی کی چھوٹی سی تصویر لگی ہے اور اسی کروٹ پرتھی پال سنگھ پڑے ہیں:

کل آپ عیادت کو جدھر بیٹھے تھے آکر
اب تک اسی کروٹ سے یہ بیمار پڑا ہے

آدمی نے کہا مہراج چودھری صاحب آئے ہیں۔ پرتھی پال سنگھ نے آنکھیں کھول دیں۔ وہی مسکراہٹ وہی انداز۔ صورت میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا تھا۔ مگر پرتھی پال سنگھ وہی تھے۔

محمد علی اچھے ہو۔

ہاں اچھے ہیں۔

تم اچھے ہو۔

بالکل اچھے ہیں۔

میں دل میں سوچنے لگا کہ باوجود ترک دنیا کے بچپن کا یارا یار ہی ہے۔

پرتھی پال سنگھ۔ بال بچے اچھے ہیں، گھر پر سب خیر عافیت۔

"بال بچے اچھے گھر پر سب خیریت!" یہ تو پرتھی پال سنگھ والا انداز نہ رہا یہ تو جیسے کوئی ظاہر دار بات کر رہا ہے۔

میں (دل سے) ارے یہ کیا! (میرا دل) یہ سب باتیں صرف حلق سے تھیں دیکھتے نہیں ہو کہ ان کی لو دوسری طرف لگی ہے۔

پرتھی پال سنگھ۔ لال جی کو بلاؤ (مجھ سے) لال جی کو دیکھ لو۔

نوکر۔ (لال جی) مہراج باہر گئے ہیں۔

میں۔ میں نے لال جی کو دیکھا ہے مگر اب اچھی طرح مل لوں گا۔ اس کے بعد پرتھی پال سنگھ کی آنکھیں نقاہت سے بند ہو گئیں ان چند لمحوں میں میرے برسوں برس کی آرزو پوری ہو گئی تھی اس لیے فوراً چلا آیا۔

باہر نکل کر راجہ صاحب کے ماموں ٹھاکر جگ موہن سنگھ کہنے لگے مجھ سے کہتے تھے کہ میرے اندر بہت طاقت ہے۔ فقط دیکھنے میں کمزور معلوم ہوتا ہوں اتنے میں لال جی بھی آگئے۔ یہ ان کے متبنیٰ تھے مگر عجیب بات سامنے کے دانت وہی، ہنسی کا انداز وہی، جسم کی کھلکھلاہٹ وہی۔ پرتھی پال سنگھ پھر چھوٹے ہو گئے۔ میرے کان میں جیسے کسی اپسرا کسی گندھارو نے کہا۔ ارے کہیں یہ تصویر بھی تو پرتھی پال سنگھ کے ساتھ مٹنے والی نہیں ہے، ہتھونداور لکھنو کے درمیان میں بارہ بنکی پڑتا ہے جو ہمارے ضلع کا صدر مقام ہے۔ وہاں کے ڈپٹی کمشنر میرے ملاقاتی تھے۔ میں وہاں ٹھہر گیا رات کو میں نے ڈپٹی کمشنر صاحب کی آواز سنی کہہ رہے ہیں کہ چودھری صاحب سے کہہ دینا کہ راجہ صاحب سورج پور کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے۔ میں وہاں جاتا ہوں صبح کو چائے پر انتظار نہ کریں۔ کوئی نو بجے کے قریب وہ لوٹے۔

میں۔ کہیے کیا حال ہے۔

وہ۔ الاقتہ الموت معلوم ہوتا ہے۔ جب میں پہنچا تو وہ سنبھل گئے تھے۔ صاحب وہ تو معمولی آدمی نہیں ہے۔ وہ تو کوئی بزرگ رسیدہ آدمی معلوم ہوتا ہے۔ بڑے اطمینان سے اس نے

باتیں کیں ۔ میں نے کہا راجہ صاحب خدا آپ کو اچھا کر دے مگر احتیاط سب کا فرض ہے ۔ اگر کچھ روپیہ وغیرہ نج کی تحویل میں ہو تو ریاست کے خزانے میں داخل کر وادیجیے ۔ یہ بھی آپ کا وہ بھی آپ کا ۔ راجہ صاحب نے کہا اچھا داخل کر وادیجیے ۔ میں نے کہا جواہرات وغیرہ بھی ہوں تو وہ بھی داخل کر وادیجیے ۔

راجہ صاحب ۔ جواہرات وغیرہ تو کچھ رہے نہیں ۔ پچپن ہزار کے زیو رات تھے وہ میں نے اپنی بی بی کی لاش کو پہنا کر نربدا میں بہادیا تھا اب کچھ نہیں ہے ۔ دوسرے دن راجہ پر تھی پال سنگھ ختم ہو گئے ان کی لاش بھی ان کی وصیت کے موافق نربدا کو لے جائی گئی تھوڑے دنوں میں وہ متبنیٰ لڑکا بھی ختم ہو گیا ۔

ہم سا کوئی گمنام زمانے میں نہ ہو گا
گم ہو وہ نگیں جس پہ کھدے نام ہمارا

===== OOOOOO ====

"غریبی میں امیری" کا بقیہ :-

ڈپٹی کمشنر نے جائداد ضائع ہونے کا حال سنا اور صرف افسوس ہی نہیں کیا بلکہ ہمدرد بھی ہو گئے ۔ چناں چہ نوکری کی بسم اللہ اور ہمت یوں ہوئی کہ تین مہینوں کے لیے کورٹ کی ضلع داری مل گئی چھوٹی نوکری ، قلیل تنخواہ ۔ محلے بھر کر لوگ خدمت گار ، باورچی کے نام سے حاضر۔ بدقسمتی سے سال تمام بھی انھیں کو بنانا تھا ۔ تین سو روپے کی کمی تحویل میں پڑی ۔ کنجی خود اپنے پاس رکھتے تھے پھر روپیہ آخر گیا کہاں ۔ کوئی خرچ بھی یاد نہ پڑتا تھا ۔ راتوں کی نیندیں حرام ہو گئیں مگر گم شدہ روپے کسی بھی طرح نہ ملتی ۔ رشوت تو لیتے نہ تھے ۔ اب روپیہ کہاں سے آوے ۔ نہ معلوم کہاں سے انتظام کر کے روپیہ داخل کیا گیا ۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی ۔ اللہ کا شکر بھیجا کہ مال گیا ۔ مگر آبرو بچی ۔ اتنے میں مستقل ضلع دار واپس آ گئے ۔ مال تمام داخل کرنے لے گئے ۔ یہاں بڑی الجھنیں رہیں ۔ آخر کار پتہ چلا کہ مبلغ تین سو روپیہ ضلع دار کا ہے جو شاہی تحویل میں زیادہ داخل ہو گیا ہے ۔

==== OOOOOO ====

چودھری محمد علی ردولوی

یادِ احباب

دیوجانس یا ابی قورس؟

تقریباً ۱۸۸۰ء میں تعلقہ داران اودھ کا ایک البم نکلا تھا۔ اس میں ایک آٹھ نو برس کے لڑکے کی بھی تصویر تھی۔ اس مجمع کا یہ آخری بڈھا تھا جس نے تقریباً آٹھ نو برس ہوئے انتقال کیا۔ اب وہ محفل پوری کفن پوش ہو چکی۔ ان کا نام درگاہی خاں تھا۔ اونچ گاؤں ان کے تعلقے کا نام تھا اور مسلمان ٹھاکر تھے۔ میں ان کا نام دیکھنے کے بہت پہلے سے سنتا تھا۔ مجھ سے عمر میں بہت بڑے تھے۔ مگر ایک زمانہ ایسا تھا کہ ہمارے اور ان کے دونوں کے علاقے کورٹ آف وارڈس میں تھے۔ نہایت کم سنی میں میرے کورٹ کی شروع تھی اور ان کے نابالغی کے زمانے کا صرف دم چھلا باقی تھا۔ اسی وجہ سے ان کا نام اکثر سنتا تھا۔ جب ہوش سنبھالا تو ان کے واقعات زیادہ دلچسپی سے سننے لگا۔ پھر وہ وقت بھی آگیا کہ ملاقات ہوئی۔ تھوڑے بہت مراسم بھی ہو گئے۔ لیکن ہمارے ان کے گھروں کے درمیان میں جنگل، دریا، پگڈنڈیاں، نالے، کھوئے، اوسل، بنجر، کھادڑ خاک، دھول بلا اتنے حائل تھے کہ ملنے کا اتفاق کم ہوتا تھا۔ لیکن ان کی طبیعت اس طرح کی واقع ہوئی تھی کہ اگر کوئی ایک مرتبہ بھی دیکھ لیتا تو عمر بھر نہ بھولتا۔ پڑھے لکھے کم تھے۔ وضع قطع بالکل ہندو کی۔ بڑی سی چوٹی بھی تھی جس کو کہتے تھے کہ کچھوچھے شریف کی منت کی ہے۔ سنا جاتا ہے کہ جس قدر علم تھا بھی اس کو نہایت احتیاط سے چھپاتے تھے۔ بچپن میں کچھ انگریزی بھی پڑھی تھی مگر کیا مجال جو کوئی اس کا پتہ پا جائے۔ بعضوں کا خیال تھا کہ جو کچھ پڑھایا گیا تھا وہ بھول گئے تھے۔ اکثروں کا خیال تھا کہ درگاہی خاں ان لوگوں میں نہ تھے جو کوئی چیز بھی بھول جائیں۔ ان کی زبان بالکل جاہل دیہاتیوں کی تھی۔ ش۔ ق۔ کی چھاؤں بھی نہ تھی مگر مطالب مارکس، اریبلس، سقراط، جرمی بینتھم، حافظ شیرازی، برٹرنڈرسل کے ہوتے تھے۔ اندازِ گفتگو میں ڈکٹر جانسن کی جھلک پائی جاتی تھی۔ اور پھر دیکھیے تو خالص جاہل دیہاتی بانگڑو۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی پہنانے والا بہت دور کی کوڑی لانے والا۔ عقلِ سلیم کا لطف رکھنے والا۔ جنگلی، ہوش، ان پڑھ، بڑا کوا اور کندہ ناتراش۔ غرض کہ ہمارے دوست تمام متضاد باتوں کا مجموعہ تھے۔ حضرات ناظرین۔ بابو درگاہی خاں کی قلمی تصویر نہ میں کھینچ سکتا ہوں نہ آپ اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ مگر مثالوں سے شاید کچھ اندازہ ہو جائے۔ ایک دن کسی نے پوچھا بابو صاحب آپ کے کئے صاحبزادے ہیں۔ بولے چار ہیں

مرے جیسے سسر دوئی جانو ۔ اسی طرح کسی نے خبر سنائی کہ فلاں تعلقہ دار کا علاقہ کورٹ آف وارڈس سے چھوٹ گیا ۔ بولے "بھیا ۔۔۔۔۔ کا علاقہ چھوٹ گوا ۔ تو اب مہرون کی پھلواری لاگ ہوئی ۔" یعنی اب عورتوں کا باغ لہلہا رہا ہوگا ۔ ایک دن ایک دوست کے یہاں ملاقات ہوئی ۔ بڑے تپاک سے ملے ۔ میں نے خوش دلی اور خلوص سے کہا ۔ بابو صاحب ہم آپ کے یہاں آئیں گے ۔ کہنے لگے "کون پوادے اہو" یعنی تم کو کیا حق ہے آنے کا ۔ کس بنا پر آؤ گے ۔ میں نے جواب دیا ۔ خیر میں آؤں گا ضرور ۔ آپ کا دل چاہے تو نکلوا دیجیے گا ۔ فرمانے لگے نہیں ۔ اہو تو بکرا مرئیں کا پڑہیے ۔ مل بے بلائے کوئی یہاں جاب ٹھیک نہیں ۔ یعنی آؤ گے تو بکرا حلال ہی کرنا پڑے گا ۔ مگر بغیر بلائے کسی کے یہاں جانا اچھی بات نہیں ہے ۔ درگاہی خاں صاحب بڑے منتظم تعلقہ داروں میں تھے ۔ ایک دن میں نے ان سے ترکیب پوچھی کہ اخراجات کیوں کر کم کیے جائیں ۔ کہنے لگے کہ یہ میز، کرسی، کوچ، سوفا جس مکان میں رکھے ہو اس کو بند کر دو اور اس حصۂ مکان کی طرف اشارہ کر کے جو قدیم وضع کا دیوان خانہ کہلاتا ہے ۔ وہاں چارپائی بچھا کر بیٹھو ۔ اگر مہاراجہ محمود آباد بھی آویں تو وہیں بٹھاؤ ۔ سرہانے سے سرک کر تم خود پائینتی جا بیٹھو اور معزز مہمان کو سرہانے جگہ دو ۔ خرچ ابھی کم ہو جائے ۔ خود اپنا واقعہ بیان کرتے تھے کہ جب ان کا علاقہ واگذار ہوا تو ناچ اور رنگ تھا ۔ عیش اور جوانی کی امنگ تھی ۔ اسی سلسلے میں ایک مچھلی کا بیاہ بھی رچایا تھا ۔ مچھلی کا بیاہ کیوں کر ہوا تھا یہ نہیں معلوم ۔ پچاسوں رنڈیاں، ڈیرہ دار موجود تھیں ۔ بڑے زور کا مجرا ہو رہا تھا ۔ اتنے میں مسند کے پیچھے ایک پشاوری سوداگر آکر کھڑا ہوا اور بھری محفل میں کہنے لگا ۔ بابو صاحب ہمارا روپیہ کب دو گے ۔ تھیٹر میں جیسے جادوگر کے آتے ہی پردہ پھٹتا ہے اور سین بدل جاتا ہے اسی طرح بابو صاحب اٹھ کھڑے ہوئے ۔

"ہم کہا کہ جب ایسے میں مہاجن کر جہ مانگ بیٹھا تو ای گانے ما کون مجا رہگوا ۔ (میں نے کہا کہ جب قرض خواہ بھری محفل میں اپنا قرضہ مانگ بیٹھا تو عیش کہاں باقی رہا) محفل برخاست ۔ رنڈی، بھڑوے، حوالی، موالی، تماشائی، طفیلیے رخصت ۔ مصاحب، خوشامدی، نیمبو نچوڑ، مہتمم ناظرات، میراثی، بھانڈ، بھگتیے سب یک قلم برطرف ۔ رات تو جوں توں کٹی ۔ صبح سے دوسرا رنگ، دوسرا ڈھنگ، دوسرا سامان ۔ خیمے، شامیانے غائب ۔ فرش و فروش جہاں کے تہاں پہنچے ۔ خالی چوپال کے چھپر میں بابو صاحب کھٹیا (یعنی چارپائی) پر بیٹھے ۔ سیر کا غلہ تلوا تلوا کر دیہاتیوں کو ڈیڑھی سوائی پر بانٹ رہے ہیں ۔ تھوڑے ہی دنوں میں ریوولیوشن ختم ہوا ۔ قرضہ، بد انتظامی قصہ پارینہ ہو گیا ۔ ایوولیوشن کا وقت آیا ۔ علاقے بھر میں جتنے پیشہ ور مثلاً تیلی، موچی، جلاہے ہیں سب بابو صاحب کے قرض دار ۔ جتنے کاشت کار و رعایا ہیں سب سے ڈیڑھی، سوائی کا بیوپار ۔ خود ہی زمین دار، خود ہی ساہوکار ۔ دل کی کھڑکی بند ہو گئی ۔ دماغ کا دروازہ کھل گیا ۔ رعایا برایا اگر خوش نہیں تو مطمئن ضرور ہو گئے ۔ بابو صاحب نے ابیقورس کا فلسفہ چھوڑ کر دیوجانس کا

اختیار کیا۔ گاندھی کے کھدر کا کسی نے خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ اس وقت بابو درگاہی خاں گاڑھا زیب تن کیے اور اس پر کچھ رنگ ملامتی فقرا کا اضافہ کیے نظر آتے ہیں۔ مقامی صنعت و حرفت کی مدد کا خیال صرف کتابوں میں رہا ہو گا اس وقت بابو صاحب اپنے علاقے کے چماروں کا بنایا ہوا جوتا پہننے لگے تھے۔ اسی کے ساتھ امارت کی شان باقی تھی۔ گاڑھے کے کرتے میں بڑے بڑے سونے کے بٹن جو شاید چھینی سے کاٹے گئے تھے، لگے ہیں۔ تین آنے کے نرپل حصے میں دس تولے کا دست پنا سونے کا لٹکایا گیا ہے۔ مگر اس میں بجائے زنجیر کے سُتلی بندھی ہوئی ہے۔ اسی طرح بٹنوں میں بھی سوت کی ڈوری کرتے کے نیچے بندھی تھی۔ ضلع اور صوبے کے دربار کے لیے ایک پوشاک معہ ایک کام دار ٹوپی کے رکھتے تھے۔ مگر اس انداز سے پہنتے تھے کہ جس سے کپڑے کی شان اور دربار کا ڈھونگ دونوں کی ٹھیک نکل جائے۔ ان کے ضلع کے ڈپٹی کمشنر مجھ سے کہتے تھے کہ جب درگاہی خاں ملنے آتے ہیں تو ہمارے دفتر کے سامنے وہ جو آم کا پیڑ ہے اس کے نیچے درباری کپڑے زیب تن کر کے اطلاع کروا دیتے ہیں۔ لکھنو سے بابو صاحب کا مکان تقریباً ساٹھ میل ہو گا۔ یہ لکھنو کے دربار وغیرہ میں ہمیشہ چھکڑے پر جاتے۔ گھر سے جنس اور ایندھن ساتھ لے جاتے تھے اور سواپانی کے لکھنو کی کسی چیز کے شرمندہ نہ ہوتے تھے، سپاہی، باورچی، سب ساتھ ہوتے تھے۔ غربت میں وطن کا لطف اٹھاتے تھے۔ آخر زمانے میں کبھی کبھی ایک اکّا بھی ہمراہی میں ہوتا تھا جس کو خود ہانکتے تھے۔ میں نے ان کو مچھلی کے بیاہ کے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن ان کی بات میں استہزا اور سماج سے نہ ڈرنے کا پہلو ایسا نکلتا تھا کہ جس سے شک ہوتا تھا کہ طبیعت کا رنگ جب سے بدلا تب ہی سے سینک ہو گئے تھے۔ عموماً اودھ کے دیہاتی زمین داروں کا یہ حال ہوتا ہے کہ ممکن ہے خود اپنی رعایا پر سختی کر لیں لیکن دوسرے کے مقابلے میں اپنے اسامی کے لیے جان ہی دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ بابو صاحب نہ اس رنگ میں تھے نہ اس رنگ میں مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ اضافہ بھی نہ کرتے تھے۔ بندوبست کے بعد جس قدر مال گزاری بڑھی اسی حساب سے انھوں نے آنکھیں بند کر کے اضافہ کر لیا۔ پھر اس کے بعد ہفت سالہ یا بے دخلی اور نت نیا انتظام جس میں لگان بڑھایا جائے ان کے یہاں نہیں ہوتا تھا۔ ۱۹۲۰ء کے نان کوآپریشن اور کسان سبھا کے زمانے میں ایک دن وہ میرے یہاں بیٹھے تھے کہ چند کانگریس کے لوگ آ گئے اور مختلف علاقہ جات میں جو شورشیں ہو رہی تھیں ان کا ذکر کرنے لگے۔ بابو صاحب نے کہا کہ اگر آپ لوگ ہمارے علاقے میں بدامنی پھیلا دیں تو ہم سو روپیہ آپ کو مٹھائی کھانے کو دیں۔ اردگرد کے علاقوں میں آفتیں بپا تھیں مگر جہاں تک سنا گیا ان کے یہاں ہر طرح سے امن ہی رہا۔ اس کے بہت سے وجوہ ہو سکتے ہیں اور میرے خیال میں وہ سب تھے۔ نذرانہ وغیرہ نہ لینا، ہر شخص کو قرضہ دے کر قابو میں رکھنا، ڈیڑھی سوائی کی وجہ سے رعایا کا ٹوٹا ہونا، پکی سڑک اور ریل سے دور ہونا، اور بے جا ظلم اور تشدد نہ کرنا۔ اضافے اور نذرانے والا فائدہ ڈیڑھی سوائی سے نکال لینا۔ ان کے ضلعے میں

زراعتی نمائش تھی۔ رؤسا اور تعلقہ داروں نے بڑے بڑے سامان کیے۔ ہر شخص نے نمائش کے میدان میں اپنے کیمپ قائم کیے۔ سپاہیوں کی وردیاں بنیں۔ تلواروں کے قبضوں پر چاندی کا پانی پھرا۔ کاٹھیوں پر مخمل پھر سے چڑھایا گیا۔ قصہ مختصر ہر شخص نے علی قدرِ حیثیت خوب شان دکھائی۔ بابو صاحب کے وہی ٹھاٹھ رہے جو ہمیشہ سے تھے۔ وہی چھکڑا وہی گھر سے اناج وغیرہ ساتھ آیا۔ نہ رتھ، نہ بہلی، نہ بیلوں کی نئی جھول، نہ چاندی کی سینگوٹیاں۔ البتہ ان کی گوئی نے ضلعے بھر میں اول انعام پایا۔ دروازے پر ایک شان دار مگر نہایت بے وقوف منیڈھا بندھا رہتا تھا۔ اس غریب کو خبر بھی نہ ہوئی اور بابو صاحب نے اس کا بھی اول انعام اپنے ڈب میں کیا۔ خود فخریہ حساب بتانے لگے کہ اور لوگوں نے اپنی آمدنی کا معتد بہ حصہ خرچ کیا۔ اور ہم بجائے خرچ کرنے کے کچھ کماہی لائے۔ نمائش کے سلسلے میں راجہ صاحب مرحوم حسن پور نے سب تعلقہ داروں کی دعوت کی تھی جس میں بابو صاحب بھی تھے۔ سب سے پہلے ان کی نظر مزعفر پر پڑی اور ذرا سا چکھ کر طشتری دسترخوان پر سے اٹھا کر اپنے پہلو میں رکھ لی۔ میزبان نے اس کی وجہ پوچھی۔

بابو صاحب۔ نماہیں اب نہ کھیبا۔ ای کا جگنو کے کھاتر لے جیبا۔ (نہیں اب نہ کھائیں گے۔ اس کو جگنو کے واسطے لے جائیں گے)

میزبان۔ یہ جگنو کون ہیں۔

بابو صاحب۔ جگنو ہمری مہرواآئین (جگنو ہماری بی بی ہیں)

میزبان۔ یہ خطاب ان کو آپ کے یہاں دیا گیا ہے یا پہلے ہی سے ان کا یہ نام تھا۔

بابو صاحب۔ ناہیں جب آئی رہے تو اس لو نکے جس دیا کی ٹیون۔ تو ہم کہا جگنو آئے۔ (نہیں جب بیاہ کے آئی تھی تو ایسی چمکتی تھی جیسے شمع کی لو۔ تو ہم نے کہا تھا یہ جگنو ہے)

پڑھنے والوں نے یہ الفاظ تو دیکھ لیے مگر جگنو کہتے وقت درگاہی خاں کا چہرہ کہاں دیکھا؟ آپ اگر کسی رکاب دار سے عمدہ چٹنی بنوائیے اور کسی کو کھلا کر اس کا چہرہ غور سے ملاحظہ کیجیے تو شاید بابو درگاہی خاں کے چہرے کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ پچھلی کے بیاہ کے زمانے کی رنگینی آج بھی باقی تھی مگر ڈھنگ دوسرا تھا۔ تب دنیا بھر کی آخور، بیڑنیں، بن پتریاں، چمر بنگلیاں بھری رہتی تھیں۔ اب بجائے ان کے لمبے گھونگھٹ والی دیہاتنیں، الھڑ نادان بے سمجھ مگر فطرت کی دولت سے مالا مال نیچ قوم کی عورتیں تھیں جو اکثر سیر اور کاشت کاری کے سلسلے میں گھر پر کام کرنے آتی تھیں۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ ایمان ایک اور دبات ہے۔ (یعنی اس میں ایک فائدہ اور بھی ہے) پھر اناج چوری جائے کا ڈر نہیں رہجات ہے۔ (پھر اناج وغیرہ کی چوری کا ڈر نہیں رہ جاتا) او سسری پھر اپنے مال جانے لگت ہیں۔ (یعنی ان تعلقات کے بعد پھر وہ بے وقوف لوگ اپنا مال سمجھنے لگتی ہیں اور بجائے چوری کے الٹے حفاظت کرتی ہیں) اس کے بعد بے تکلفی میں بابو صاحب نے صنف نازک کے بارے میں کچھ میرے تجربات دریافت کرنا چاہے۔ مگر میں نے یہ کہہ کر سلسلہ کلام

Join eBooks Telegram

جاری رکھا کہ وسط حیات میں پہنچ کر ہم سن دل نہیں گرماتی اور کم سن سے شرم آتی ہے ۔ کہنے لگے ڈراوانہ کرو ۔ روپیہ پیسہ ، مٹھائی ، کٹھائی سب کی پوری کر دیتی ہے ۔ معاملے کے بہت صاف تھے اور زبان سے جو کہہ دیتے تھے وہ پتھر کی لکیر ہو جاتا تھا ۔ اسی ذیل میں ووٹ دینا بھی تھا مگر ایک بات ادر کرتے تھے یعنی مبلغ ۔/ ۵۵ کرائے کے نام سے لے لیتے تھے ۔ پھر کوئی ہزار روپیہ بھی دے مگر درگاہی خاں یہی کہتے تھے کہ ہم تو بکائے گئیں (یعنی اب ہم بک گئے اب کچھ نہیں ہو سکتا) اس معاملے میں ان کی دور بینی اور دور اندیشی کا قائل ہو جانا پڑتا ہے ۔ یوں دیکھنے میں بڑی ذلیل سی بات ہے مگر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ ان سے زیادہ دولت مند ان سے زیادہ پڑھے لکھے بات کھلم کھلا کرتے ہیں اور پھر کوئی تعداد بھی نہیں جس قدر مل جائے شیر مادر تو صرف مرحوم کا گناہ ہلکا ہی نہیں ہو جاتا بلکہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے ۔ پھر انھوں نے برسوں پہلے وہ کچھ دیکھ لیا تھا جو دوسروں کو نہ سجھائی دیا تھا ۔ بعد کو انھوں نے رقم دو گنی کر دی تھی ۔ میں نے وجہ پوچھی ۔ کہنے لگے کہ فلاں راجہ کے انتخاب میں گئے تھے ۔ بڑی خاطر ، بڑی مدارات ، ہر وقت مزاج پرسی کے لیے ذی عزت ملازمین موجود ، خدمت کے لیے نوکروں کی کمی نہیں ، سواری بھی حاضر لیکن ووٹ گذرنے کے بعد کوئی بات نہیں پوچھتا ۔ ہم لاوارث لڑکے کی طرح ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے ہیں ۔ اتنے میں راجہ صاحب نے دیکھ لیا ۔ راجہ صاحب ۔ "ارے بابو صاحب آپ کو سواری نہیں ملی ۔ کوئی ہے لاؤ موٹر کار آپ کے لیے ۔ " اس کے بعد نائب صاحب آئے ۔ "ارے بابو صاحب آپ کو بڑی تکلیف ہوئی ۔ ارے میاں سواری منگواؤ بابو صاحب کے لیے ۔ معاف کیجیے گا ۔ موٹر سب سواری میں گئے ہیں ۔ جوڑی حاضر ہے ۔ اسی پر چلے جائیے ۔ تھوڑی دیر کے بعد مختار صاحب آئے ۔ بابو صاحب ارے ابھی تک آپ کے لیے سواری نہیں آئی ۔ دیکھیے میں ابھی منگواتا ہوں البتہ آپ کو تکلیف تو ہوگی اس وقت سواریوں کا ایسا توڑا ہو گیا کہ کیا کہوں ۔ تانگا منگواتا ہوں ۔ سپاہی سے ۔ جاؤ ایک اچھا سا تانگا لاؤ ۔ دیکھ لینا ذرا صاف صوف ہو ۔ ابھی آتا ہے تانگا ۔ یہ کہہ کر وہ بھی تشریف لے گئے ۔ کیسی کار کیسی جوڑی ۔ کیسا تانگا ۔ جوتیاں چٹخاتے ڈیرے پر پہنچے ۔ " تب سے ایک سو دس روپیہ کر دیں ۔ " اسی طرح کے ایک انتخاب کے سلسلے میں مجھ کو بھی ایک دوست کی سفارش میں ایک خط بابو صاحب کو لکھنا پڑا ۔ جواب آیا کہ مجھ کو آپ کے کہنے میں کوئی عذر نہیں ہے لیکن ایک سو دس امرود اپنے باغیچے سے بھجوا دیجیے ۔ چناں چہ میرے دوست کے کارکن صاحب ایک سو دس امرود رائج الوقت چہرہ دار لے کر گئے ۔ اس خاص معاملت پر پسندیدگی کی مہر لگانے کی غرض سے دو عدد پیڑے مختار کو عنایت ہوئے جن کا رنگ امتداد زمانہ سے بدل کر سفید کا سبز ہو گیا تھا ۔ مختار نے وہاں سے واپسی پر مجھ کو دکھائے اور اس کے بعد اپنے آقا کو دکھانے کے لیے لیتے گئے ۔

ووٹ حاصل کرنے میں جو خوشامدیں چاپلوسیاں اور ابلہ فریبیاں کرنی پڑتی ہے معلوم ہیں ۔ جو دھوکے اٹھانے پڑتے ہیں وہ بھی ظاہر ہیں ۔ چناں چہ آزمودہ کار مختار نے غور کرنا شروع

کیا کہ مکان فرنیچر، باغ، سواریاں، کوئی چیز بھی تو ایسی نہیں کہ جن کی تعریف کرکے میز بان کو خوش کیا جائے۔ جب ہر طرف سے مایوس ہوگئے تو کہنے لگے کہ بابو صاحب آپ کے مکان کے سامنے میدان بڑا عمدہ ہے جس میں تازہ ہوا کا فاسدہ کھلا کھلا ہے۔ وہاں ایسے واقعہ پرست سے سابقہ ہوا تھا جو خوشامد کی لغویت اسی وقت کھول دیتا تھا۔ لہٰذا بابو صاحب نے ایک غلط انداز "ہوں" بلکہ "ہو۔۔۔۔۔۔م" میں تصنع اور دنیاسازی کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ مختار نے دوسرا حملہ کیا مختار "بابو آپ کے دروازے مسجد بڑے موقع سے ہے۔ مگر اس کی چھت بھی پٹوادی جائے۔ اب کی بابو صاحب مقابلے پر تیار ہوگئے۔ سنو مکھتیار صاحب ان کا جو بہت منھ لگاوا او کا بتا ہے دیکھا۔ بس لتنے بہت ہے۔ مالم ہوئے گوا کہ ہم ان کا مانت ہن۔ اور کا چہیے؟ او کچھ ہمری نماج کے بھوکے ہیں کہ ان کا رہے کا گھر چہئیے۔ اس جگہ مجھ کو غالب کا ایک شعر یاد آگیا۔

بزم ترا نہ شمع و گل خستگی بو تراب
ساز ترا زیر و بم واقعہ کربلا

بابو درگاہی خاں انکسار و خاکساری کی تصویر تھے۔ ان کے ملازمین اکثر ان سے صاف ستھرے رہتے تھے۔ ایک دن انؐ کے ساتھ ایک اہل قلم ملازم تھے جن کو میں سمجھا کہ ان کے کوئی عزیز ہوں گئے۔ میں نے دریافت کیا۔

بابو صاحب۔ "ناہیں اجیج نہ آئیں لالہ ہوئیں ہمرے یہاں کام کرت ہیں (دبی زبان سے) ریل پر سب کوؤ ہمیں کا دھکیاوت ہیں۔ ان کا رستہ دیت ہیں (صاف کپڑوں کی طرف اشارہ کرکے) (ریل پر سب لوگ ہم ہی کو دھکا دیتے ہیں اور ان کے لیے راستہ چھوڑ دیتے ہیں) ایک مرتبہ انھوں نے غضب ہی کیا۔ میرے یہاں آئے معلوم ہوا کہ میں ایک دوست کے یہاں ہوں۔ وہ بھی وہاں پہنچے۔ دیکھتا کیا ہوں کہ بیچوں بیچ پیٹھ پر کوئی چھ انچ مربع سرخ چھینٹ کا پیوند لگا ہوا ہے۔ واپسی میں مجھ سے نہ رہا گیا میں نے کہا کہ دوسروں کی رائے سے بے پروائی کی ایک انتہا ہوتی ہے۔ بابو صاحب نے اعتراض کا جواب اور معذرت سب دو لفظوں میں کی۔ مسکراہٹ کے ساتھ آنکھ مار کر۔ مہرون کے لہنگا کا ہوئے۔" (یہ پیوند عورتوں کے لہنگے کا لگایا ہے) ایک پہلو ان کی شخصیت کا اور سن لیجیے۔ اگر موقع آن پڑے تو بابو درگاہی خاں دبنگ بھی تھے۔ پہلی جنگ میں ضلع کے پارسی ڈپٹی کمشنر سے ملنے گئے۔ کسی بات پر مزاج برہم تھا۔ ڈپٹی کمشنر۔ "بابو صاحب آپ نے جنگ میں کتنا چندہ دیا ہے۔ بابو صاحب۔ ہم کچھو ناہیں دیا ہے۔ ہم سنا کہ جرمن آوت ہیں اور چھین لے ہیں تو ن، ہم قرضہ بانٹ دیا۔

ڈپٹی کمشنر۔ یہ کیسی بات ہے۔ آپ نے اپنی سند پڑھی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ سرکار تم کو یہ علاقہ عطا کرتی ہے۔ جب سرکار کو ضرورت ہو تو اس کی مدد کرو۔ آپ کو معلوم ہے کہ سرکار آپ کا علاقہ واپس لے سکتی ہے۔

بابو صاحب ۔ "ہاں صاحب اے، ہم کاناہیں مالم رہے (یہ کہیے یہ ہم کو نہیں معلوم تھا) اچھا کیو صاحب بتائے دیو (اچھا کیا آپ نے بتادیا) اب ہم اوکے پاس نہ جاب (اب ہم اس کے پاس نہ جائیں گے) ہاں صاحب پرائی چیج کے پاس جائی مارے جائی (ہاں صاحب دوسرے کی چیز کے پاس جائیں مارے جائیں)

ڈپٹی کمشنر ۔ نہیں نہیں یہ مطلب نہیں ۔ آپ کا علاقہ آپ کے پاس رہے گا ۔ لیکن آپ کو سرکار کی مدد کرنا چاہیے ۔

بابو صاحب ۔ ناہیں صاحب الاکا ہمراہوئیے نہ کرے تو رہیے کیسے، ہمرے پاس اب صاحب تم جانو الاکا جانے ۔" (نہیں صاحب جب علاقہ ہمارا ہی نہیں تو رہے گا کیسے، ہمارے پاس اب آپ جانیے اور علاقہ جانے)

مالگجاری والگجاری اب ہم سے نہ مانگیو صاحب ۔ اپنا وصول کرلینو ۔ ہم پرائی چیج کے پاس کیسے جان ۔ (مالگزاری والگزاری اب آپ ہم سے نہ مانگیے گا ۔ خود وصول کرلیجیے گا ۔ ہم دوسرے کے مال کے پاس کیسے جائیں)

ڈپٹی کمشنر ۔ نہیں نہیں ۔

بابو صاحب ۔ ناہیں ناہیں اب ہم سے کوؤ مطلب نہیں ۔

ڈپٹی کمشنر پریشان کہ ذرا سی بات کے لیے کیا لوکل گورنمنٹ کو لکھا جائے اور کیا گورنمنٹ آف انڈیا کو لکھا جائے پشتینی تعلقہ دار علاقے سے کیوں دست بردار ہورہا ہے ۔ کیا سختی کی گئی ہے جس کا یہ نتیجہ ہوا ہے ۔ خیر اس وقت تو بابو صاحب ہی کی جیت رہی مگر بعد کو قرضہ ۔ جنگ دینا ہی پڑا ۔

اسی طرح ایک سینیر ڈپٹی کلکٹر سے میں نے ملایا اور کہا کہ آپ کے ضلع میں یہ ڈپٹی کمشنر ہوکر آنے والے ہیں ۔

بابو صاحب ۔ "ہاں کاہے ناہیں ۔ بہت آئے، بہت چلے گئے ۔

یہ دونوں واقعات ہندستانیوں کے ساتھ ہوئے ۔ نہ معلوم انگریز کے ساتھ بھی بابو صاحب یہی برتاؤ کرتے تھے یا نہیں ۔ اس کا تجربہ نہیں ہوا ۔ ایک مرتبہ بابو صاحب ایک صاحب کے یہاں گئے ۔ وہاں دوسرے کمرے میں ایک بہت بڑے شخص بیٹھے تھے اور چاہتے تھے کہ بابو صاحب کی دیہاتی باتوں سے لطف اٹھائیں ۔ ان کے ایک مصاحب نے بابو صاحب کو وہاں بلانا چاہا بابو صاحب نے کہا ۔ "کاکری ہواں آئے کے ہم ذو نگیا اوئی جہاج ۔ تنی سے دھکا لاگے ڈوب جائی ۔" (کیا کریں ہم وہاں آکر ہم ذرا سی پن سوئی اور وہ جہاز ذری سے دھکا لگے گا تو ہم ڈوب جائیں گے)

ایک مرتبہ ایک دعوت کا رقعہ موصول ہوا جس میں بجائے بسم اللہ کے حمد لکھا تھا ۔ رقعہ تین دن یا تین وقتوں کی مسلسل دعوت کا تھا ۔ مگر جو چیز مجھ کو پسند آئی وہ تتمہ تھا ۔ باضابطہ خط

(بقیہ صفحہ ۳۷۴ پر)

چودھری محمد علی ردولوی

کشکول محمد علی شاہ فقیر

(۱)

نواب سعادت علی خاں کے وقت میں ان کا ہوادار رزیڈنٹ کی چوکڑی سے آگے نکل گیا۔ نواب نے کہاروں کو انعام دیا۔ حالاں کہ سعادت علی خاں سے یہ ذرا تعجب ہے۔ کہار لوگ اس خوشی میں ناچے۔ یہ ناچ کہروا کہلایا۔ یہ ناچ دلی میں نہ تھا صرف لکھنؤ میں ایجاد ہوا۔ اس کے لَے ہے۔

"دھن دھاگے ناتے تک۔ دھن دھا۔"

"دھا" پر سم ہے۔

عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں　　اس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں

جاگ پڑی میں تو پیار کے جگائے　　بھور بھوت جب پیا مورے آئے

ان نینن میں نیند کہاں ہے　　جن نینن میں آپ سمائے

یہ ٹھمری عالی جاہا والا قدر نواب وزیر مرزا (چو لکھی والے) کی ہے۔ مرحوم نے اس کو تلنگ میں باندھا ہے۔

مدرس صاحب اعتراض نہ فرمائیں کہ صبح کو نیند آگئی تو دوسرے مصرع کا دعویٰ غلط ہو گیا صبح کو ذری سے آنکھ لگ جانا فطرت ہے۔ مثل ہے کہ نیند تو سولی پر آجاتی ہے۔ مگر اس نیند کو نیند کون کہے گا۔

اس محرومی پر نظر کیجیے کہ جس کی وجہ سے نیندیں اڑ گئیں اسی نے صبح ہوتے جگایا۔ وہ یہ سمجھ ہی نہ سکا کہ اس نے رات بھر تارے گنے تھے۔

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منھ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

(۲)

مسلمان، یہود، نصاریٰ اور ستارہ پرست ان میں سے جو اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے، بے شک یہ لوگ اپنے رب سے اپنا اجر پائیں گے، نہ ان کو کچھ خوف ہو گا نہ کچھ غم ہو گا۔ یہ آیت (۶۲) باسٹھویں آیت آٹھویں رکوع پر سورہ بقر میں ہے۔ اور پھر یہی

آیت بہترویں (۷۲) آیت آٹھویں رکوع پر سورہ۔ مائدہ میں ہے اور پھر یہی آیت کچھ اختلافِ معنی اور الفاظ کے ساتھ سورہ۔ حج میں سترھویں (۱۷) آیت ہے۔ اس آیت کے منسوخ ہونے کا گمان بھی نہیں ہے، کیوں کہ سورہ۔ مائدہ جہاں تک خیال پڑتا ہے تنزیل کی رو سے آخری سورۃ ہے۔ اور پھر یہ آیت بہ تکرار آئی ہے۔ اس سلسلے میں لوگ پہلے بھی لکھ چکے ہیں اور آج عبداللہ ابن یوسف علی نے "صابئین" کی بڑی تحقیقات کی ہیں۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ باوجود کہ بہت سے مفسرین اختلافات کریں گے لفظ "صابئین" کے معنی ہیں ازروئے قیاس "نیک نیت زردشتی، وید کے ماننے والے، بودھ کنفیوشس اور دوسرے اخلاق کے معلمین کے پیرو بھی شامل کیے جاسکتے ہیں۔

(۳)

سائیں کی جھولی میں بندے کا دیا، اللہ کا دلوایا۔ کیا کچھ نہیں نکلتا۔ ایک شعر استاد جرأت کا سناتا ہوں۔ یہ ایرسٹاکریٹک شعر نہ روس والا کہہ سکتا ہے نہ امریکہ والا۔ یہ ہندوستان جنت نشان ہی کی سرزمین ہے جہاں یہ پودا اگتا ہے، پھبکتا ہے۔

نالہ و آہ و فغاں سب مرادم بھرتے ہیں
آپ کا جان کے سب مجھ پہ کرم کرتے ہیں

"دیدی ناچت ہیں مہنوں پچھیوں" (میری بڑی بہن ناچتی ہے میں بھی ناچوں گی) ارے صاحب وہ جوان ہے، اس کے دل میں جوانی کا جوش ہے۔ سن کا تقاضا ہے۔ امنگ ہے۔ ترنگ ہے، آپ چیاں ریزی کس پر برتے پر ناچیں گی۔ نہ چھپ نہ تختی۔ گات نہ گولائی۔ کیا سبزہ۔ روئیدہ ابھرے گا۔ کیا توڑا لیں گی مگر نہیں ناچیں گی ضرور۔ اچھا ناچو خوش رہو بابا، ہم اللہ کے فقیر ہم کو اس سے واسطہ"

ایک جاپانی عورت کا شعر

جیسے گہرے سمندر کا پہاڑ ہوتا ہے جوار میں بھی پانی کی تہہ میں رہتا ہے اور بھاٹے میں بھی۔ اسی طرح میری آستین ہمیشہ آنسوؤں سے تر رہتی ہے۔

سات اور جاپانی اشعار

۱۔ اے شبنم کے قطرو۔ لاؤ میں اپنی مصیبت زدہ زندگی کے دھبے تم میں دھولوں۔
۲۔ راستے میں چھوٹا پھول کھلا تھا کہ مسافروں کو دیکھے گا۔ گدھا آیا اور اس کو چر گیا۔
۳۔ پیاری چھوٹی چڑیا یہ ننھی منی مکھی پھولوں کے بیچ میں مگن ہے اس کو کیا کر دگی کھا کے۔

۴۔ دور دراز کی جھیل ۔ مدتوں سے سکون کی نیند سو رہی تھی ۔ نہ لہر نہ جھکولا ۔
اے لو مینڈک اس میں کود پڑا

۵ ۔ لڑائی کا میدان ہزاروں ملے خون سے رنگین بنا آج بہار کے پھلوں سے بھرا پڑا ہے ۔ شکست و فتح کے خوابوں کی تعبیر یہ ہے ۔

۶ ۔ بوڑھے سفید بالوں والے کا جنازہ باپ دادا کی ہڑواڑ میں رکھا ہے ۔ جو زندہ ہیں لٹھیا پر ٹیک لگائے کھڑے ہیں ۔

۷ ۔ باغ کی گھاس کے کیڑے ابھی تو چوں چوں کر رہا تھا ۔ کون کہہ سکتا کہ تو یک بارگی چپ ہو جائے گا ۔

اے ہے ان اشعار سے تو غم کے بادل چھا گئے ۔ میری محفل سے رنجیدہ نہ اٹھیے ۔ ایک ہولی سن لیجیے ۔ اور خوش خوش گھر جائیے ۔ نہیں تو مجھ کو شرمندگی ہوگی ۔

ساری ڈاردیو موپہ رنگ کی گگر
ایسا دھوکہ دیا ۔ میں تو بھولے سے دیکھن لاگی ادھر
ساری ڈاردیو ....

بن رنگ ڈارے میں جانے نہ دوں گی
جاتے کہاں ہو کدر ۔ ساری ڈاردیو .... (کافی)

صفحہ ۵۵۲ کا بقیہ :۔

8. The Reconstruction of Religious Thought in Islam, Lahore, 1981, p. 42

9. Ibid., p. 128

10. Ibid., pp. 142-43

11. Ibid., p. 147

۱۲۔ دیکھیے ۔ انور معظم ۔ "اقبال کا تصور تہذیب ۔ ذہن جدید ۔ جلد ۲، شمارہ ۳، ۱۹۹۱ء

۱۳۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ۔ ترجمہ سید نذیر نیازی ۔ لاہور، ص ۱۸۶

۱۴۔ حوالہ بالا ۔ ص ۱۸۵

۱۵۔ حوالہ بالا ۔ ص ۱۸۵

۱۶۔ حوالہ بالا ۔ ص ۱۸۵-۱۸۶

۱۷۔ انور معظم ۔ "سر سید احمد خاں، جمال الدین افغانی کی نظر میں" علی گڑھ میگزین، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۶۰ء

****

بیگم ہما اخلاق حسین

پیش لفظ

پھول وہ جو ہمیشہ سر چڑھیں۔ کام وہ اچھا جس سے کسی کو فائدہ پہنچ جائے۔ کتاب لکھنے کا مقصد بھی وہیں تک جائز جہاں تک اس میں تعمیری خیال مضمر ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ بڑے بڑے مسائل پر ہی کتاب لکھی جائے۔ دنیا میں وہی شخص جو بڑی بات کرتا ہے، ایک چھوٹی سی بات کرنے پر بھی مجبور ہوتا ہے۔ لہٰذا زندگی کے ہر چھوٹے بڑے پہلو کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ ہر شخص بڑے کام نہیں کر سکتا ہے، البتہ چھوٹے کام شوق اور سلیقے سے کرنے کی کوشش تو کر ہی سکتا ہے۔

یہ خطوط معلوم نہیں کسی کو پسند آئیں گے یا نہیں۔ اور پسند آئے بھی تو کس حد تک۔ ان خطوط کو شائع کروانے میں میرا اپنا ذاتی مقصد یہ ہے کہ اگر انھیں ضائع ہونے سے بچا لیا جائے اور اکٹھا کر کے دنیائے ادب کو دے دیا جائے تو پڑھنے والے کچھ نہ کچھ پرکھ ہی لیں گے۔ میرا خیال ہے کہ ان خطوط میں تحریر سے زیادہ گفتگو کا انداز نمایاں ہے۔ زبان سلیس اور بامحاورہ ہے۔ موضوعاتِ کلام دلچسپ، رنگین اور زندگی کی حقیقتوں سے مملو ہیں۔

چودھری صاحب کی شخصیت کی خصوصیات جو ان خطوط میں ظاہر ہوئی ہیں، ان میں سے بعض ایسی ہیں جنھیں کوئی محسوس کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ وہ اپنے ملنے والوں سے بڑے جی سے ملتے ہیں۔ گفتگو میں خلوص ہوتا ہے۔ اپنے اور مخاطب کے تعلقات پر اعتماد یہاں تک ہوتا ہے کہ خطوط میں جہاں دیکھیے دل کے پردے اٹھتے نظر آتے ہیں۔ قریب آ کر یوں باتیں کرتے ہیں کہ دوستی کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ خفگی میں بھی ان کی ایک یگانگت کا انداز جھلکتا ہے۔

بہرکیف یہ تو میرے اپنے دل اور نگاہ کا کھیل تھا جس کے متعلق میں کوئی دعویٰ نہیں کر سکتی ہوں، البتہ

ں کا یقین ہے کہ انتہائی نیک نیتی سے چودھری محمد علی صاحب ردولوی کے خطوط کا یہ مجموعہ نذرِ ناظرین کر رہی ہوں
برا ارادہ ۱۹۳۰ء ، ۱۹۳۲ء سے تھا کہ ان خطوط کو ادبی دنیا سے روشناس کرایا جائے۔ اس وقت میں نے تہیّہ
لیا تھا کہ میاں جان (چودھری محمد علی صاحب) کے خطوط چھپواؤں گی۔

آج بحمداللہ وہ ارادہ پورا ہو رہا ہے اور اُسی عقیدت کے ساتھ
اُن کی خصوصیاتِ تحریر پر ایمان مستحکم ہے۔

ہمارے مہربان مولانا صلاح الدّین احمد صاحب بھی چودھری صاحب کے بڑے دوستوں اور قدردانوں
ں سے ہیں۔ یہاں تک کہ اُنھی کے ذریعے سے یہ کتاب چھپی اور اس کی تمہید لکھنے کی ذمّہ داری بھی یہ کہہ کر قبول
رلی کہ "یہ میرا فرض ہے۔ اور میں اسے ضرور انجام دوں گا۔" اس سے زیادہ قدردانی اور کیا ہو سکتی ہے۔ دیباچہ انھوں
نے لکھا، مجھے نہیں معلوم کہ کیا لکھا (کیونکہ میں نے ابھی دیکھا ہی نہیں ہے) البتّہ یہ معلوم ہے کہ جو لکھا ہے وہ ضرور صحیح ہوگا
ور ایک بڑے نبّاض کی حیثیت سے لکھا ہوگا۔

ان کی عنایات کا شکریہ ادا کروں یہ بدتمیزی ہوگی۔ صرف دعاگو ہوں اور دعاگو رہنے کی متمنّی۔

ان خطوط سے متعلّق پڑھنے والوں سے اتنی التجا اور ہے کہ "انسان ناقص ہے" پر نظر رکھتے ہوئے میری
غلطیوں کو ازراہِ کرم معاف کر دیں۔

صلاح الدین احمد

اِس کتاب میں

چودھری محمد علی صاحب ردولوی ہمارے ان چند اکابرِ ادب میں سے ہیں جن کی ذات میں مشرقی وضع داری اور مغربی آزاد خیالی کی بہترین کیفیتیں ایک ہی وقت میں نہایت خوش امتزاجی سے جمع ہو گئی ہیں۔ حسنِ اتفاق سے آپ کے کردار کی تربیت ایک ایسے زمانے میں ہوئی جو ہندوستان میں لبرآزم کے فروغ کا زمانہ تھا۔ مغربی تہذیب کی روشنی مشرقی تمدن کے ایوانوں میں بڑی تیزی سے نفوذ کر رہی، اور اُن مٹتے ہوئے نقوش پر غالب آ رہی تھی جو ہماری ہزار سالہ روایات کی یادگار تھے۔ اسی عالم میں ہمارے معاشرے کے ایک بہت بڑے طبقے نے اس روشنی کو نہ صرف اپنی آنکھوں میں جگہ دینا بہتر سمجھا بلکہ اپنے دلوں کے خلوت کدے بھی اس کے لئے کھول دیئے۔ ایک اور طبقہ ایسا تھا جس نے اس سے بچنے کے لئے اُن تاریک گوشوں کی طرف فرار اختیار کیا جن پر فرسودگی و پسماندگی کی دبیز چادریں تہہ بہ تہہ پڑی ہوئی تھیں۔ لیکن ایک قلیل التعداد گروہ ایسا بھی تھا جس نے اس سیلابِ نور کو متبسم لبوں سے خوش آمدید تو کہا مگر اس کے سامنے سربسجود نہیں ہوا، بلکہ اسے اپنے آئینۂ دل میں صرف اِس حد تک انعکاس پذیر ہونے دیا جس حد تک ہماری اپنی تہذیب، ہمارا اپنا ادب اور ہماری اپنی روایات اسے قبول کرنے پر آمادہ ہوئیں۔ اس مختصر گروہ کے رہبروں کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں اور میری ناقص رائے میں چودھری محمد علی کا نام ان میں سرِ فہرست ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ چودھری صاحب کے کردار کا فروغ لبرلزم کی فضا میں ہوا اور یہی وجہ

ہے کہ اُن کی تمام تصانیف اور تخلیقات میں لبرلزم کا عنصر بدرجۂ غایت نمایاں ہے۔ مجموعۂ زیرِ نظر میں، کہ اُن کے نجی خطوط کا ایک دلآویز مجموعہ ہے، لبرلزم کا یہ رجحان اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ وہ اپنی بیٹی سے بھی اسی انداز میں گفتگو فرماتے ہیں جیسے وہ احباب کے لئے اختیار کرتے ہیں اور اس بارے میں کسی تصنّع یا تورّع کا دور دور تک سراغ نہیں ملتا۔ اور یہی کیفیت اُن کے اخلاص اور اُن کے صدق کی آئینہ دار اور اُن کی روانیٔ نگارش اور خوبیٔ تحریر کی آفریدگار ہے۔

جن صاحبوں نے مکاتیبِ غالبؔ کے بعد خطوط کے اُن متعدد مجموعوں کا مطالعہ کیا ہے جو وقتاً فوقتاً گزشتہ پون صدی میں ہمارے سامنے آئے ہیں وہ مجموعۂ زیرِ نظر کو دیکھنے کے بعد غالباً میرے اس خیال کی تائید فرمائیں گے کہ جن خوبیوں اور خصوصیات نے غالبؔ کے خطوط کو دوام بخشا وہ ایک لباسِ تازہ میں اس مجموعے کی زیب و زینت ہیں۔ وہی سلاست، وہی بے تکلفی، وہی شگفتگی، وہی برجستگی اور سب سے بڑھ کر وہی احساسِ یگانگت اور وہی کیفِ مخاطبت جو اردوئے معلّٰی اور عودِ ہندی کے مکاتیب میں پایا جاتا ہے، ایک بہت بڑی حد تک ان خطوط میں بھی اپنی پوری رعنائی سے جلوہ افروز ہے اور از بسکہ اِن کے جمع کرنے کا کسی کو خیال تک نہیں تھا اور ان کی نوعیت بھی سراسر نجی ہے، اس لئے ان کیفیتوں کی قدر و قیمت اور بھی بڑھ گئی ہے۔

مکاتیبِ محمد علی کی ادبی خوبیوں کی نسبت صرف اسی قدر کہنا کافی ہوگا کہ چودھری صاحب کو زبان و بیان کی لطافتوں اور نزاکتوں پر جو بے پناہ قدرت حاصل ہے وہ اس مجموعے کے قریب قریب ہر خط میں جھلکتی ہے۔ اور بعض مکاتیب میں تو اس کے کرشمے ہر ہر سطر پر دل کا دامن کھینچتے ہیں اور پڑھنے والے کی نظر اس لطافت زار میں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔

چودھری صاحب کی نگارش کی ایک نہایت اہم خصوصیت ان کی وہ لطیف حسِّ مزاح ہے جو اعلیٰ ادب کی نادر خصوصیات میں شمار ہوتی ہے۔ چونکہ وہ فطرتاً ایک نہایت خوش نظر فنکار ہیں اس لئے ان کی نگاہ کسی صورتِ حال کے مضحک پہلو پر سب سے پہلے پڑتی ہے۔ اور یہ پہلو اُن کی نگاہ پڑتے ہی جگمگا اٹھتا ہے اور اُن کے ہر پڑھنے والے کے لئے حظ و انبساط کی ایک مسلسل کیفیت فراہم کرتا ہے۔

محترمہ ہماؔ بیگم نے یہ مجموعہ مرتب فرما کر درحقیقت اردو ادب کی ایک گرانقدر خدمت سرانجام دی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اہلِ ذوق اس یادگار مجموعے کے مطالعے سے نہ صرف محظوظ اور مستفید ہوں گے بلکہ اس کے اوراق میں ایک رخصت ہوتی ہوئی تہذیب اور ایک گمشدہ تمدن کے نقوشِ جمیل کو درخشندہ و تابندہ اور ایک دلآویز شخصیت اور ایک سحر نگار ادیب کے نوادرِ احساس اور لطائفِ صحبت کو ہمیشہ زندہ و پائندہ پائیں گے ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

"... گویا دبستاں کھل گیا۔"

خطوط

ہما بیگم کے نام ________ المورٹہ۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۳۲ء

میری مصاحب میری بیٹی! دعائیں۔ تمہارا حکم ہے کہ ایک اور خط لکھوں۔ لیجیے ایک خط اور لیجیے۔
میں ردولی میں پابہ زنجیر ہوں۔ وجہ کیا۔ کہ روز معلوم ہوتا ہے کہ موٹر کل تیار ہو جائے گا۔ اور ہمیشہ وہی روزِ اوّل رہتا ہے۔ تمہارے تفضّل ماموں دو چار روز کے لئے گھر آئے تھے۔ آج نانپارہ گئے ہیں۔ کہتے تھے کہ وہاں رہ کر ملازمت کی کوشش کروں گا۔ میرا دل کہتا ہے کہ دو ایک دن نانپارے میں رہ کر گھوڑی بھسیلے ہی میں دم دے گی۔ مگر میں کس منہ سے کہوں۔ سوپ تو سوپ ہنسے، چھلنی کیا ہنسے جس میں بہتر چھید۔ شاہ ضیاء الحق کی بی بی سے پندرہ سولہ برس کے بعد ملاپ ہوا ہے۔ اتنے زمانے تک بیچارے بندر کی طرح زندگی بسر کیا کئے۔ کھانا بازار سے کھایا۔ کباب روٹی باورچی کے یہاں سے مول لے لی، نہیں تو دکان ہی پر حلوائی سے مٹھائی لے کر کھالی۔ پانی گھر میں آ کر پی لیا۔ پان ملا تو ملا نہیں تو ایک کھٹیا منھ میں ڈال اور بیرزادگی کے مزے چوس چوس کر لیا کئے۔ ریوڑی کھٹیا کچھ مول لینا نہیں۔ مخدوم صاحب کے مزار پر انوار کی طرح ہر وقت برسا کرتی ہیں۔ اب بیچارے پکّی پکائی روٹی پاتے ہیں ع عید ہوئی ذوق والے شام کو۔ مگر ہو تو گئی۔ غرّۂ رمضان سے بہرحال میں غنیمت ہے۔

موتی جانؔ[1] بیچاری قضا کر گئیں۔ مگر کسی سے خدمت نہیں لی۔ شام کو دروازے پر بیٹھی تھیں۔ صبح کو جب دروازہ نہ کھلا تو جگن بڑھئی نے حق ہمسائیگی ادا کیا۔ دیوار پھاند کر گھر میں گھسا۔ دیکھا تو انگنائی میں پڑی ہیں۔ اور ہر دم سانس آ جا رہی ہے۔ ادھر سے غفورا ماں دوپہر کا کھانا لے کر پہنچی، اُدھر موتی جان نے ع زجامِ دہر مئے کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَان

---

[1] زندگی۔

نوش کیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ چھینکا ٹوٹا بلّی کے بھاگوں۔ وہ گھر انور کو دیا گیا۔ ابھی دُلہنیا یا ستدن وہاں گئی نہیں ہیں مگر اُن کے نامزد ہو گیا ہے۔ دلہنیا کے لڑکا ہونے والا ہے۔ دن قریب ہوں گے۔ گو قریب تر نہیں معلوم ہوتے۔ وہ بہت خوش ہے۔ باورچی خانے سے سہ دری آتے وقت ذرا سا سر جھکا کر کنکھیوں سے اپنا پیٹ دیکھتی چلتی ہے۔ مجھ کو نہ معلوم آپ ہی آپ کیوں خوشی ہے۔ مجھ کو معلوم ہوتا ہے کہ گویا میرے ہی پوتا پیدا ہونیوالا ہے۔

حسن احمد غریب محل اور اس گھر کے درمیان میں گھوما کرتے ہیں۔ ابّو نے ان کے لئے سلطانپور میں کچھ ٹھیکہ کا ڈھچر ڈالا ہے۔ دیکھئے کیا نتیجہ نکلتا ہے اور کب کام شروع کرتے ہیں۔ نہ معلوم تم کو لکھ چکا ہوں کہ نہیں۔ شمسُل کے لڑکا ہونے والا ہے۔ مِٹھو بہت خوش ہیں یہی حال سب گدھوں کا ہوتا ہے۔ نام گنوانے شرم نہیں معلوم ہوتی ہے۔

عظمت، مِٹھو اور ہم حج کو ساتھ گئے تھے۔ گو اعمال ایسے نہ ہوں مگر "رحمتِ حق بہانہ میجوید" کے حکم سے ممکن ہے انشاء اللہ تعالیٰ حج مقبول ہوا ہوگا۔ کیونکہ خدا جس شخص کو دوست رکھتا ہے اس کو امتحان میں ڈالتا ہے۔ چنانچہ ہم لوگ بی بیوں کی مفارقت میں امتحان میں مبتلا کئے گئے۔ اور سب کے سب فیل ہو گئے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ۔

گرامو فون کے بارے میں تم نے لکھا ہے کہ تم کو پسند نہیں ہے۔ واقعی گانا اس کو نہیں کہہ سکتے۔ میں خود عمر بھر یہی کہا کیا۔ لیکن بی بی اگر ریکارڈ عمدہ ہوں اور آواز ملائم ہو تو خوش آئند ثابت ہوتا ہے۔ ممکن ہے مجھ کو اس وجہ سے معلوم ہوتا ہو کہ مجھ کو بے کاری کا مشغلہ ہاتھ آیا ہے۔ خیر انشاء اللہ تعالیٰ سنا دو چار ریکارڈ اچھے ہیں۔

خط ختم کرنے کے بعد دیکھا تو ایک صفحہ باقی رہ گیا ہے۔ ہزار دماغ دوڑایا۔ کوئی مضمون دماغ میں نہیں آتا۔

نہ معلوم الموڑے میں تم کو اپنی پیدائش کا گھر ملا یا نہیں۔ پھر ایک مرتبہ پتا لکھے دیتا ہوں۔ بازار کی طرف سے اگر تمہارے مکان کی طرف آؤ تو گرجا کے داہنے بائیں دو سڑکیں ہیں۔ ایک سڑک جیل کو گئی ہے اور دوسری عیسائیوں کے سینی ٹوریم کو گئی ہے۔ اگر تم داہنے ہاتھ والی سڑک لو تو گرجا تمہارے بائیں ہاتھ پر پڑے گا۔ اور وہ مکان داہنے ہاتھ پر۔ بالکل لبِ راہ۔ اس میں جو کمرہ بازار کے رُخ پر یعنی سب سے پہلا ہے وہی تمہاری پیدائش کی جگہ ہے۔ ممکن ہے اب قطع بدل گئی ہو۔ مکان کے مالک کا نام جیوا نند پنتھ تھا۔ یہ ہندو تھے۔ مگر اسی مکان کے پاس کچھ عیسائی پنتھ بھی رہتے تھے۔ اب ممکن ہے مکند لوگ رہتے ہوں۔ کیونکہ ایک مس پنتھ نے مکند کے ساتھ بیاہ کیا تھا۔ اور ان کے دو لڑکیاں تھیں۔ شانتی اور رتّیں۔ مکان کا نام شاید "پائن ویو" تھا۔ اب یقیناً ہم

Bore ہو گئے ہوں گے۔ تمہارا دعاگو۔ محمد علی عفی عنہ

عابد میاں کے نام ———— بنام مولانا عابد التستر صاحب، مقیم لاہور۔ آخرِ نومبر

لختِ جگرم! دعا۔ بابا فرید گنج شکرؒ جب دنیا چھوڑ کر جنگل کو نکل گئے تو پیٹ پر کچھ اینٹیں باندھ لی تھیں۔ کہ دل کو تسکین رہے کہ روٹیاں تو بندھی ہیں جب جی چاہے گا کھا لیں گے۔ اسی طرح جب تم علیگڈھ میں تھے تو دل کو تسکین تھی کہ عابد قریب ہی تو ہیں جب تار دیں گے چلے آئیں گے۔ اگر دیدار نہ دیکھیں گے تو نماز جنازہ تو پڑھا ہی دیں گے۔ اب اللہ میاں صاحب نے ہم کو ٹھیک راہ لگانے کی یہ ترکیب نکالی ہے کہ تم کو یہاں سے دور پہنچا دیا۔ تاکہ ہمارا یہ گنہگار بندہ صرف ہمارے ہی اوپر بھروسہ کرنا سیکھ جائے ؎

عاشقِ زارِ من بیا بر درِ ایں و آں مرد برد رِ من نشیں کہ من از ہمہ وارہانمت

ہم اُس کے عاشقِ زار کب تھے۔ یہ ترکیب تو اُس نے ہم کو بہلانے کی نکالی ہے۔ جیسے ماں کہتی ہے۔ "بیٹا ہمارا بھوکا ہے، ہم اپنے بیٹے کو ہپّا کھلائیں گے۔ دیکھو ہم آنکھیں بند کئے لیتے ہیں۔ دیکھیں یہ لقمہ کون کھا جاتا ہے" مگر لونڈا ایسا نٹ کھٹ ہے کہ وہ اس پر بھی ٹھنک ٹھنک کر منھ پھیر لیتا ہے۔ مگر کسی نہ کسی طرح اس کو کھلا ہی دیتی ہے۔ اسی طرح اللہ میاں کوئی نہ کوئی ترکیب سے ہم کو اپنا عاشقِ زار بنانے کی صورت پیدا کر ہی لیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ اُس وقت اگر تم لندن بھی چلے جاؤ گے تو ہم پرواہ نہ کریں گے۔ مگر جب تک یہ صورت نہیں ہے اس وقت تک تو ہم جن جن کو چاہتے ہیں ان کے لئے دل بیکل ہے ہی۔ تم ہوئے، ہُما ہوئیں، کجّن، چھٹّن، اتّن ہوئیں۔ اور اثر کرد و چار اور ہوئے۔ ان سب کی یاد ستایا کرتی ہے۔ سلمان نے دوسری ترکیب نکالی۔ انھوں نے سوچا اگر ہم اس کو خط نہ لکھیں تو اس کو غصہ چڑھے گا۔ اور جب اس کے دل میں شکایت پیدا ہو جائے گی تو یہ کہے گا "اوہ جی اگر کوئی ہماری پرواہ نہیں کرتا تو ہم بھی اُتنے فارغ ہیں" اور اس طرح سے اس بڈھے خرف کی تکلیف کم ہی ہو جائے گی۔ جب یہ مرے گا تو بہنوں کو اور دوسروں کو تاسّف کے خطوط لکھ دیں گے۔ ڈھونڈ ڈھانڈ کر کچھ صفات بیان کر دیں گے کہ اردو اچھی لکھتے تھے، ہاہا بڑا افسوس ہے۔ قیصر کو لکھ دیں گے کہ تم گھبراؤ نہیں۔ میاں جان نہیں رہے تو کوئی بات نہیں، ہم تو ہیں۔ اگر کسی بات کی تکلیف ہوگی تو ہم کو لندن میں خط بہت جلد مل جائے گا۔ صبر کرو صبر۔ صبر بڑا ناڑ شا کیا کرتے تھے۔ دیکھو چوراغوے بڑس جئے۔ آخرِ خط میں انا للہ وانا الیہ راجعون لکھنے والے تھے مگر اس کے ہجے ہی نہیں یاد تھے۔ اس لئے چھوڑ گئے۔ قصہ مختصر، یہ حال ہے۔

آجکل ہم ایک ڈرامہ لکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر یہ بیل منڈھے چڑھتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔ اگر ختم بھی ہوا تو مکالمہ بن کر رہ جائے گا۔ ڈرامہ بڑی چیز ہے۔

آجکل موسم اچھّا ہے۔ میں باغ کی طرف والے برآمدے میں بیٹھا ہوں۔ مریضوں کو دوا بھی دیتا جاتا ہوں تم سے باتیں بھی کئے جاتا ہوں۔ آج ضیغم باہر پور سے آئے ہیں۔ اس وجہ سے ذری جی خوش ہے۔

دعاگو: محمد علی عفی عنہ۔ ۲۹ ر نومبر ۱۹۵۰ء

عتیق بیٹی کے نام

پیاری عتیق! دعائے عمر و اقبال۔ جس طرح صوفیوں کے یہاں ایک زمانہ ہوتا ہے جس کو قبض کہتے ہیں۔ اس زمانے میں ہزار عبادتیں کریں، مجاہدے کریں، ریاضتیں کریں مگر انوارِ الٰہی نہیں ساطع ہوتے۔ اور ایک زمانہ بسط کا ہوتا ہے، جس میں عبادتوں کا لطف آتا ہے اور انوارِ الٰہی کی بارش ہوتی ہے۔ اسی طرح سے میرے خط لکھنے کا بھی حال ہے۔ کبھی ہر وقت خطوط لکھنے کا تقاضا ہوا کرتا ہے اور سب کو لکھا کرتا ہوں۔ کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ تم لوگوں کو یاد کیا کرتا ہوں مگر خط لکھنے کی نوبت نہیں آتی۔ غالبؔ کہتے ہیں ؎

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل — کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیئے

یعنی ایامِ قبض میں سب کوششیں بیکار ہیں۔ ہاں البتہ جب اللہ میاں اپنی رحمتوں کا دروازہ کھول دیتے ہیں پھر عبادتوں کا لطف ہے۔ آج نہ معلوم کتنے دنوں سے کسی کو خط نہیں لکھا تھا۔ اس وقت تمہارا خط پڑھ کر یکبارگی بسط شروع ہو گیا۔

الحمدللہ رب العالمین۔ پہلا خط تم کو لکھ رہا ہوں۔ اب کچّن، چھبّن، اٹّن، ہما وغیرہ سب کو خط لکھوں گا۔ تمہارے آخری خط کے جواب میں جو خط میں نے لکھا تھا اس میں تمہاری تفریح کے لئے بہت سے اشعار لکھ دئے تھے۔ اگر تم کو وہ خط نہیں پہنچا تو مجھ کو بڑا افسوس ہو گا۔ کیونکہ وہ خط خود مجھ کو بڑا اچھّا لگا تھا۔ اچھا خیر۔ تم کو لکھ چکا ہوں کہ جب آیۃ الکرسی پڑھتا ہوں تو تمہاری ماں کا نام جہاں آیا بس تم یاد پڑ جاتی ہو۔ اب ایک اور ذریعہ تمہاری یاد آنے کا پیدا ہو گیا ہے۔ میں اِدھر ایک رسالہ لکھ رہا ہوں "میرا مذہب"۔ اس میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کا ذکر بہت ہے۔ جہاں حضرت خلیفۂ اوّل کا نام آیا بس تم یاد آگئیں۔ وہ رسولؐ کے یارِ عتیق تھے اور تم ہماری۔ تمہارا جی دھک سے ہو گیا ہو گا کہ ارے نانا مُوا شیعہ ہے۔ اس نے کچھ ان کی شان میں بُرا کہا ہو گا۔ یہ خیال تمہارا غلط ہے۔ میں حضرت ابوبکر صدیق کا قائل ہوں۔ میں نے اس رسالے میں ان کی بڑی تعریفیں کی ہیں۔

اگر وہ چھپا تو تم کو بھیجوں گا۔ تھوڑا سا اقتباس لکھ بھی دوں تاکہ تم کو اطمینان ہو جائے۔

"جناب امیر علیہ السلام کو اس حیثیت سے کہ وہ رسولؐ کے گود کے پالے تھے، شاگردِ سعید تھے اور ان کے بارے میں رسول اللہؐ نے ایسی باتیں کہی ہیں کہ کسی کے لئے نہیں فرمائیں، انھیں سب سے افضل جانتا ہوں۔ مگر حضرت ابوبکر صدّیق کے صفات کا بھی دل سے قائل ہوں۔ جو درجہ محبت حضرت ابوبکرؓ کو رسول صلعم سے حاصل تھا، جو عقیدت کی یکسوئی حضرت خلیفۂ اوّل کو ذات پاک محمدیؐ سے حاصل تھی، اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ صلح حدیبیہ کے وقت ہر شخص پریشان تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ پوچھتے تھے کہ کیا آپ نبیٔ برحق نہیں ہیں؟ رسولؐ کی گود کے پالے حضرت علیؓ کی کیا مجال تھی کہ اختلاف کرتے مگر انھوں نے بھی عرض کر ہی دیا کہ رسول کا لفظ صلح نامے سے میں اپنے ہاتھ سے نہ کاٹوں گا۔ صرف یہی یارِ شفیق تھے جو پوری طرح ساتھ رہے۔ اور بحیثیت ایک وفادار خادم کے یہی فرمایا کئے کہ میاں جو کچھ کہتے ہیں وہی سچ ہے۔ یہ جملہ کسی کتاب کا نہیں ہے بلکہ خود میرے دل کا گھڑا ہوا ہے۔ مگر مجھ کو اس میں کچھ ایسی وفاداری کی تصویر دکھائی دیتی ہے کہ بغیر کہے نہیں رہا گیا۔ ابھی ایک کتاب میں پڑھ رہا تھا کہ جب جنگِ احد میں رسول اللہؐ کی شہادت کی غلط خبر مشہور ہو گئی تو حضرت عمرؓ کے منھ سے بہ تقاضائے محبت یہ نکل گیا۔ "اب کیا کریں گے لڑ کر"۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا۔ "اب کیا کریں گے جی کر۔"

تم نے لکھا ہے۔ اختصار سے گریز کیجئے گا۔ اس کو اب پڑھتے پڑھتے پریشان نہ ہو جانا۔

تم مالِ کے فقیر کو جانتی ہو۔ وہی جو بڑے خبیس مشہور ہیں۔ ان کے لڑکے کی نسبت ہوئی۔ اس تقریب میں سمدھیانے سے لڈو آئے تھے۔ وہ انھوں نے تقسیم کئے۔ چنانچہ اپنے عزیز تینوں بھائیوں کو بھیجا۔ ان لوگوں نے واپس کر دیا۔ اس پر بہت خفا ہوئے اور اُسی غصّے میں ان کو خط لکھا۔ اس خط میں شاید نطفۂ حرام لکھ دیا اب ان لوگوں نے ازالۂ حیثیت عرفی کا نوٹس دیا ہے۔ یہاں اِنھوں نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا، تو نوٹس کیسے تعمیل ہو۔ لوگوں نے ڈاکئے کو گانٹھ لیا۔ اس نے دروازے پر جا کر پکارا کہ منی آرڈر آیا ہے۔ آواز سن کر نکل آئے۔ نوٹس تعمیل ہو گیا۔ محلّے کے دس پانچ آدمی دروازے کے اِدھر اُدھر چھپے کھڑے تھے۔ انھوں نے گواہی دی کہ میاں نے نوٹس لینے سے انکار کیا۔ اب مقدمہ چلنے والا ہے۔ یہ بہت کم پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ سنا ہے وہ کہتے ہیں کہ نطفۂ حرام کہنے میں کیا حرج ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ میں اپنے باپ کو ہمیشہ القاب میں لکھتا تھا۔ "جناب قبلہ گاہی صاحب نطفۂ حرام دام ظلہٗ۔"

ڈپٹی بدرالحسن صاحب اور خانکے پورے کے لوگ سب اس مقدمے میں دلچسپی لے رہے ہیں۔

Join eBooks Telegram

دیکھئے کیا نتیجہ ہو۔ آجکل یہاں تین چیزوں کا بڑا زور ہے۔ آم، گرمیاں اور راندھوری۔ آم کا رنج نہ کرو۔ یہاں کی جھنی گرمی اور راندھوریوں سے تو بچ گئیں۔ تمہاری ماں بہو لو کو دیکھنے آئی تھیں، اچھی ہیں۔ تمہاری بیماری کی خبر خدا نے غلط ثابت کی۔ اُس کا ہزار ہزار شکر ہے۔ خدا کرے تم ہمیشہ تندرست رہو اور بڑی عمر ہو۔ اور زندگی کی تمام آرامیں تمہارے حصے میں آئیں۔ آمین! اپنے میاں سے میری دعا کہنا۔

عتیقؔ! یہ تو بتاؤ جب تمہارے میاں دفتر چلے جاتے ہیں تو کیونکر وقت کاٹتی ہو؟ دو چار جاننے والیاں قریب میں ہیں یا بالکل تنہائی ہے؟ یہ کلب کیسا ہے جس کا ذکر تم نے کیا ہے؟ تم پردہ کئے جاتی ہو یا چھوڑ دیا؟ پردہ بڑی غلط چیز ہے۔ قرآن شریف میں چہرے اور ہاتھ پاؤں کا پردہ کہیں نہیں ہے۔ نہ اللہ میاں کا منشا ہے کہ اس کی آدھی مخلوق قید میں رہے۔

دعا گو: محمد علی عفی عنہ۔ ۱۲ر جون ۱۹۵۱ء

تمہارا خط کل ملا۔

چھبّن کے نام

پیاری چھبّن! دعا۔ ہُما کے خط سے معلوم ہوا کہ سبط ماشاء اللہ اچھے ہیں اور بجائے پھیپھڑے کی شکایت کے جگر کی شکایت ہے۔ بخار بھی اتر گیا ہے۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن! کیا لکھوں بیٹی! انسان کی بے بسی بے اختیاری عبرت کے قابل ہے۔ جب سبط کی بیماری کا خط آیا تو سب سے زیادہ تکلیف اس کی ہوئی کہ کاش میں تمہارے پاس ہوتا۔ پوچھو اگر میں ہوتا بھی تو کیا کر لیتا۔ آخر خدا نے رحم فرمایا اور سبط سنبھل گئے۔ بار الٰہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ لاکھ لاکھ شکر ہے۔

ادھر دو تین کچوکے ایسے لگے ہیں کہ بہت دن تک نہ بھولیں گے۔ ایک تو سبط کی بیماری۔ دوسرے یہ کہ قیصر نے ہمارے راجندر کی تصویر چوکھٹے میں لگا کر سامنے رکھ دی۔ ایسا شاندار جوان۔ چہرے پر وہ مردانگی، دل کی صفائی کی وہ جھلک آنکھوں میں، وہ کشادہ سینہ۔ جی چاہتا ہے کہ بلائیں لے لوں۔ کس کی بلائیں، اور کس کی جوانی پر خوش ہوں۔ وہ تو خاک میں مل چکا۔ نہال سنگھ کے لڑکوں میں یہ میرے حصے میں پڑا تھا۔ تصویر دیکھ کر اُس کا بچپن، اس کی جوانی، اس کے جہاز کا ناچتے ہوئے ہوا میں گزرنا، زمین میں نوفٹ دھنس جانا، اس کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا، سب کچھ نگاہوں میں آ گیا۔ اور ہم بے بس، بے اختیار اُسی طرح بیٹھے یہ خط لکھ رہے ہیں۔ تیسری تکلیف یہ ہوئی کہ ریاض مرحوم کا اسباب کھولا گیا۔ ریاض مرحوم کا یاد دل ناخواستہ کراچی جانا، اس غریب کی حسرت بھری رخصت، اس کی پھر ردولی آنے کی خواہش، سب پھر سے سامنے آ گئی۔ ہم نے نہ اس کا جنازہ دیکھا نہ اس کی قبر دیکھی۔ مگر اس وقت سب کچھ دیکھ لیا۔ بہت سی کتابیں کیڑے کھا گئے۔ جو چیزیں

باقی ہیں ان کو ٹھکانے لگانے کی فکر ہے۔ مگر دیکھو کیا ہو ؎

کب لگاتا ہے کوئی اس دلِ بے حال کا مول   سب گھٹا دیتے ہیں مفلس کے غرض مال کا مول

کل ہُما کے خط سے اس اندھیرے میں روشنی دکھائی دی۔ اللہ کا شکر بھیجا۔ بی بی! جے دن زندہ ہیں، یہی نشیب و فراز دیکھنا ہیں۔ اسی کو زندگی کہتے ہیں۔ اور باوجود ان ٹھوکروں کے اور پھر خدا کی عنایات کے دل میں آتا ہے کہ مر جائیں تو ان غموں سے، ان خوشیوں سے چھٹی ملے مگر دل کہتا ہے کہ اگر یہی بے حیائی کی زندگی چلی جائے تو اچھا ہے۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

سبط میری انہی باتوں پر اعتراض کیا کرتے ہیں کہ "کیا مایوسی کی باتیں کرتے ہو؟" تہیّہ ارادہ ہوتا تو ایک بات بھی تھی۔ کہاں سے لاؤں امید اور کہاں سے لاؤں تہیّہ اور ارادہ؟ علاقہ جا رہا ہے۔ غریبی کھڑی گھور رہی ہے۔ بھائی نظیر حسین کی مفلسی یاد ہے۔ ان کے گھر کا کھنڈر نگاہ کے آگے ہے۔ خود اپنے گھر کے کھنڈر کا نقشہ جو اسی کھنڈر سے مقابلہ کرنے پر تُلا ہے۔ دماغ کے اندر موجود ہے۔ بچپن، چھٹپن، ہُما، سلمان کی سینکڑوں تصویریں، پیدا ہونے سے لے کر آج تک، خوشی کی، غم کی، بیماری کی، تندرستی کی، بھولے پن کی، ہوشیاری کی، ہنسی کی، رونے کی، ان کو چھاتی سے لگانے کی، ان پر غصّہ کرنے کی، اپنی بڑھیا کے روحانی اثر کی آج تک گھر پر چھایا ہے۔ قیصر کی، جو ماشاء اللہ آج تک گھر بھر پر چھائی ہوئی ہیں، جابر، جن کے دل کا حال وہی جانتے ہیں مگر ان کی بے اختیاریاں ہم ہی جانتے ہیں۔ سعید کی جو صرف گور کن ہیں۔ یہ سب کچھ نگاہ کے آگے ہے اور یہاں سبط ہیں کہ آرام کرسی پر پاؤں پھیلائے لیٹے ہیں اور کہہ رہے ہیں:

"ماموں! ہنسی خوشی کی باتیں کیا کرو۔ یہ کیا غم کی داستان لے کر بیٹھے ہو۔"

ہمارے آگے تو سینما کی یہ ریل اڑسٹھ برس چھ مہینوں سے برابر چلی جا رہی ہے۔ شیطان کی آنت ہو گئی ہے۔ اور میاں سبط اپنی اڑائے جاتے ہیں ؎

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں   آبلے پر بھی حنا باندھتے ہیں

قیصر، بدر گل، آفاق سب تم کو دعا و سلام کہتے ہیں۔ سبط کی تندرستی پر مبارکباد دیتے ہیں اور بالکل اچھا ہو جانے کی دعا دیتے ہیں۔ بدر گل کی لڑکی عذرا کو اگر موقع ہو تو کاظم سے کہو موٹر بھیج کر بلا بھیجیں تم لوگ اس کو دیکھ لو گے تو مجھ کو معلوم ہو گا جیسے میں نے بھی دیکھ لیا۔

دعاگو: تمہارا باپ عفی عنہ

ایک بیگم صاحبہ کے نام

محترمہ! واضح ہو کہ ان بیگم صاحبہ نے مجھ سے اپنے لئے دوا[1] مانگی تھی۔ زبانی حال یوں ہی سا کہلا بھیجا تھا۔ اور کہا تھا کہ استخارہ[2] صرف تیری دوا استعمال کرنے کا آتا ہے۔ قریب تھا کہ مجھ کو بھی دوا دینے کو استخارہ منع آجائے۔ اسی وجہ سے میں نے استخارہ نہیں دیکھا۔ آخر کچھ انصاف ہے۔ گھر گھوڑے نخاس[3] مول۔ کیسے دوا تجویز کروں اور کیسے مرض کی تشخیص کروں۔ تقریباً "بڑے گاؤں" کے تمام سادات ابوالخیرات کا یہی حال ہے۔ مگر کیا کروں۔ دوا دینے کا کام ہی اپنے سر لیا ہے۔ دواں نہ دوں تو کیا کروں۔ یہ گولیاں اسی طرح ارسال ہیں جیسے بعض شریر لڑکے رات کو ڈھیلے پھینکتے ہیں۔ اگر لگ گیا تو واہ واہ، اگر نہ لگا تب بھی لوگ پریشان تو ہوں ہی گے۔ اگر خدانخواستہ اس دوا سے آپ کو دو ہزار دست آجائیں یا دو ہزار قے آجائیں یا نصیب دشمناں آپ کا خطرہ ٹل گیا تو مجھ سے شکایت نہ کیجئے گا۔ اندھے کی داد نہ فریاد۔ ان گولیوں کو صبح شام کھائیے اور گھنٹہ بھر پہلے اور گھنٹہ بھر بعد پان تمباکو نہ ہو۔ اور جب فائدہ ہو دوا بند کر دیجئے گا۔ اس دوا میں خوشبو بدبو نہ لگے۔ کسی ایسے طاق پر رکھئے گا جہاں دھواں نہ بھرتا ہو۔

ہمایوں مرزا کے نام

مائی ڈیر ہمایوں مرزا صاحب! اسلام مسنون الاسلام۔ آپ کے ذہن پر مجھ کو رشک ہے۔ آپ کے خیال پر غبطہ ہے اور بڑا افسوس ہے کہ میں آپ کا ایسا کیوں نہ ہوا۔ میرا شعور باطنی بھی پکار پکار کر کہا گیا ہے جو آپ نے خط میں لکھا ہے۔ مگر میں اسی دلدل میں خر در گل رہا جس سے پاؤں آپ نے باہر نکال لئے۔ اور کتاب بند کر دی۔ کیا کروں آدمی تاریخ کا بچہ ہے اور تاریخ سے بچ کر نکل جانا سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ مگر اللہ میاں کی دنیا صرف ہمایوں مرزا صاحب اور محمد علی سے تو بنی نہیں ہے۔ یہاں تو مولوی عبدالشکور صاحب بھی ہیں اور مولوی

---

[1] کاتب موصوف ہومیوپیتھک دوا لوگوں کو بانٹتے ہیں۔ اس دوا کی خصوصیت یہ ہے کہ تمام چھوٹی بڑی علامتوں کو اچھی طرح مریض سے جانچا جائے تب دوا طے ہو سکتی ہے۔

[2] شیعوں میں کچھ لوگ ہیں جو تسبیح پر کچھ پڑھ کر اپنے کاموں میں خدا سے مشورہ کرتے ہیں۔ اس کو استخارہ کہتے ہیں۔

[3] لکھنؤ میں ایک محلہ ہے جہاں پرانی نئی چیزوں کی بہت بڑی بازار ہر اتوار کو لگتی ہے۔

[4] دماغ پھر جانا، خراب ہو جانا۔

مہدی حسن صاحب بھی ہیں اور علی ظہیر بھی۔ اور جو راستہ اختیار کرو ملیح آباد کے خان صاحبان سے مڈبھیڑ ہو ہی جائے گی۔ جب تک روپیہ دنیاوی آرام کی کنجی ہے، جب تک ایک سے دوسرا چالاک ہے، تب تک دنیا ایسی ہی رہے گی۔ سب سے بہتر زمانہ جو اسلام کا تھا یا عیسائیت کا یا یہودیوں کا، جب پیغمبران علیہم السلام موجود تھے۔ اس وقت تو تاویلیں ہوا کیں۔ خود پیغمبر علیہ السلام کی موجودگی میں سورۂ منافقون کی ضرورت ہوئی۔ السلام علیکم کا جواب ترکی بہ ترکی دیا گیا تو یہ امید لگانا کہ ایک دن مولویوں سے چھٹکارا ملے گا، کچھ ٹوٹی ہوئی آس ہی معلوم ہوتی ہے۔ تم کو جب تک دنیا سے تعاون کرنا ہے، جب تک لڑکوں کا بیاہ کرنا ہے، لڑکیوں کو پار گھاٹ لگانا ہے، دوستوں کی تیمارداری کرنا ہے، دشمنوں سے حفاظت کرنا ہے صلح کرنا ہے، لڑائی کرنا ہے، معاملت کرنا ہے، بدمعاملگی سے بچنا ہے، جب تک تبرّا اور مدحِ صحابہ رض کی آوازیں سننا ہے تب تک دشمنوں کی کھٹ پٹ، دوستوں کے معانقے سے چھٹی نہیں۔ ہم فقط یہی کر سکتے ہیں کہ اپنا کام کئے جائیں اور کوشش کریں کہ قرآن کو مہجور نہ بنا دیں۔ میں قدرتاً Pessimist واقع ہوا ہوں۔ کاش Optimist ہوتا۔ یقین جانئے آپ کے خط سے میرے دل میں وہی خیال آیا جو میں آپ کے سامنے کہہ چکا ہوں۔ یعنی خدا مولوی عبدالشکور اور مولوی مہدی حسن کو بھی آپ ہی ایسا پہلوان کر دے۔ آمین ثم آمین۔

سمپورنانند جی اور الگورائے شاستری کے ساتھ تو سفر کر نہیں سکتے۔ پھر نسیم صاحب اور علی ظہیر ہی صاحب بدرقۂ راہ ہوں گے۔ کتنے ہمایوں مرزا دنیا میں ہیں اور کے محمد علی پانچوں سواروں میں ہیں کہ جن کے ساتھ مل کر خدا تک راستہ پورا ہو۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے خیالات نے راستبازی کی شاہراہ دکھائی۔ مگر Gregarious Animal کیا کرے۔ نماز آدمی ہاتھ باندھ کر پڑھے گا یا ہاتھ کھول کر۔ اگر آدمی دونوں طریقوں کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے تب بھی جو Ritual اختیار کرے گا، اس میں پھنس جائے گا۔ اس لئے صرف قرآن کی پیروی سے کام چلتا دکھائی نہیں دیتا۔ اور مجبوراً تاریخ، روایات Traditions کی پابندی کرنی پڑے گی۔ باقی سب چیزوں کو مٹا دیجئے اور صرف قرآن ہی رہنے دیجئے۔ یا کوشش کیجئے کہ اور سب چیزوں میں کچھ نہ کچھ ہم خیالی پیدا ہو۔ نہیں تو دنیا چھوڑ کر کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چلے جائیے۔ اور جب معلوم ہو کہ اسلام رہبانیت نہیں ہے تو کھسیانے ہو کر پھر لوٹ آئیے اور ؎

با ہمیں مردماں بباید ساخت　　　　چہ تواں کرد مردماں ایں اند

کا وظیفہ پڑھئے۔

ہمایوں مرزا صاحب! یقین کیجئے گا آپ کے خط سے میرے دل کی قوت بڑھ گئی۔ پھر کہتا ہوں کہ بارِ الٰہا اسلام میں بہت سے ہمایوں مرزا پیدا کر دے۔ آمین۔

دعا گو عقیدت کیش: محمد علی عفی عنہ۔ ردولی۔ یکم فروری ۱۹۵۲ء

ایک دوسری کتاب دوسرے رنگ میں پیش کرتا ہوں ـــــ بیکار سی کتاب ہے مگر جو عمر بھر کام کر کے بڑھاپے میں دل بہلانا چاہتا ہو، اس کی خدمت گزار "کشکول محمد علی شاہ فقیر"۔

ڈپٹی صاحب کے نام

مکرمی! تسلیم۔ شوقِ دیدار و دولتِ ہم کلامی کے بعد آں کہ گزشتہ عرس کے موقع پر جب آپ انتظاماً ردولی تشریف لائے تھے، اس وقت مجھ کو معلوم ہوا تھا کہ آپ ماشاءاللہ شاعر بھی ہیں۔ گو مجھ سے آج تک ایک شعر بھی موزوں نہیں ہوا ہے لیکن نثر کچھ کچھ لکھ لیتا ہوں اور اسی وجہ سے "جہاں روکھ نہیں وہاں انڈر روکھ"۔ ردولی میں ادب سے نسبت بھی دی جاتی ہے۔ چونکہ آپ حاکم تحصیل اور ہم رعایائے تحصیل۔ دل دھک سے ہو گیا کہ محمد علی! ڈپٹی صاحب کی شاعری سے دنیا بچ نکلے مگر تم بچتے دکھائی نہیں دیتے۔ چونکہ اس طرح کے مواقع اکثر آچکے ہیں اس لئے جی مضبوط کر لیا کہ پریشان ہونے سے کوئی فائدہ نہیں، جیسی پڑے گی جھیل لیں گے رع

بر سرِ فرزندِ آدم ہر چہ آید بگذرد

دوسرا غضب یہ ہوا کہ آپ نے اپنا دیوان میرے عزیز بھائی غلام مصطفےٰ صاحب شاعر بے بدل پنشنر تھانیدار کو عنایت کیا۔ موصوف نے تعریف بھی کی مگر دیوان دیکھ کر دل کی کلی کھل گئی۔ انشراحِ قلب ہوا۔ اس طرح کی فرحت ہوئی جیسے لکھنؤ کے بنارسی باغ میں صبح کی مَنشی میں کسی شائستہ، متوازن، متقصد، خوش مذاق، شریف آدمی سے پہلے پہل ملاقات ہو جائے اور دل فوراً یہ کہے کہ کہیں دیکھا ہے۔ یہ پہلی ملاقات شاید میدانِ ازل میں ہوئی ہو جہاں ہم مذاق لوگوں کی ٹولیاں الگ الگ رہی ہوں گی۔

نئی شاعری نے ایسی بلند پروازیاں کی ہیں کہ ان کو سن کر ہم دقیانوسی لوگوں کے حواس اڑ جاتے ہیں۔ اسی حالت میں حدود کے اندر والی شاعری اگر کہیں دکھائی دے جاتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بچھڑے مل گئے۔ میں نے آپ کا دیوان صرف دو چار لمحوں کے لئے دیکھا۔ میرے دل پر بڑا اچھا اثر ہوا۔ ہر جگہ جدّت کوئی نہیں کر سکتا لیکن جو بات کہی جائے وہ سلیقے سے کہی جائے، شعر میں دل کا درد ہو، صداقت ہو، دل سے محسوس کر کے کہا گیا

ہو۔ بیان میں سادگی ہو، الجھن نہ ہو، تعقید نہ ہو اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آدمی خدا کے یہاں سے بندش کا سلیقہ لے کر آیا ہو۔ ماشاء اللہ آپ کی شاعری میں یہ تمام باتیں موجود ہیں۔ اسی وجہ سے دل چاہتا تھا کہ ایک نسخہ جناب کے دیوان کا میرے پاس بھی ہوتا۔ زمینداری جانے کے بعد سب سے زیادہ ضرورت تو بیبیوں کی ہے لیکن روح کی بھی غذا کچھ حکم رکھتی ہے۔ گو ہاتھ کی تنگی دل کی تنگی سے بھی سخت ہے لیکن پھر بھی فرحتِ قلب سے لحظہ بھر کے لئے آرام مل جاتا ہے۔ دو کتابوں کا ہدیہ پیش کرتا ہوں۔ ان کی قیمت آپ کے دیوان سے کم ہے مگر غریب وہی دے سکتا ہے جو اس کے پاس ہے۔

محمد علی عفی عنہ۔ ردولی

ہُما بیگم کے نام ——— ۱۴ فروری ۱۹۴۴ء

ہُما پیاری! دعائیں۔ تمہارا دستی خط آج پانچ بجے شام کو ملا۔ مجھ کو افسوس ہوا کہ اب رسا دل وغیرہ کا سرانجام نہیں ہو سکتا۔ اندر جو گیا تو معلوم ہوا کہ رسا دل پک رہی ہے۔ لڈو بھی مل گئے۔ امیر علی کی کتاب میرے پاس اب نہیں ہے۔ ایک صاحب لے گئے اور واپس نہیں کی۔ اخلاق سے میں نے Hitti کی کتاب کا ذکر کیا تھا، وہ حاضر ہے۔ امیر علی والی کتاب کا دوسرا رنگ ہے۔ اور اس کا دوسرا رنگ ہے۔ وہ مسلمان کی لکھی ہوئی ہے جس میں خالی دوست ہی کا درد نہیں ہے، دشمن کی بھی جگہ دل میں ہے۔ یعنی مسلمانوں کے ہر فرقے کا دلی منشا سمجھ کر لکھا۔ اُس کتاب میں خلافت کا سنی نقطۂ نظر اور اہلبیت کا شیعہ نقطۂ نظر دونوں موجود ہیں۔ Hitti نے بڑے تدین سے لکھا ہے مگر شیعہ سنی کسی کا بھی درد نہیں دکھائی دیتا۔ البتہ تاریخ پڑھ کر غیر پر جو اثر مترتب ہو سکتا تھا وہ ہے۔

یہ کتاب میری بڑی ضرورت کی ہے۔ روز ہی کام رہتا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ ڈیرک (Derek) ہضم نہ کر لیں گے۔ اس لئے بھیج دیتا ہوں۔ میرا خود دل چاہتا ہے کہ ڈیرک پڑھ لیں۔ لیکن چونکہ ان کو مسلمانوں سے واسطہ ہے، اس وجہ سے امیر علی کی دونوں کتابیں پڑھنے کی ضرورت پھر رہ جائے گی "شارٹ ہسٹری" اور "اسپرٹ آف اسلام"۔ ڈیرک سے میرا سلام کہنا۔ بدرُل سے بھی سلام شوق اور اخلاق کو اور بچوں کو دعا۔ تم کو آنکھیں ڈھونڈتی ہیں۔ سلمان کا خط کل آیا تھا۔ اُن کا دلّی آنا ابھی طے نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ ان کو دوسری نوکری بھی ملنے کی امید ہے، جس میں تنخواہ بھی زیادہ ہے اور آئندہ ترقی کی امید بھی ہے۔ اگر انشاء اللہ تعالیٰ مل گئی تو آئندہ انشاء اللہ العزیز ان کو اونچی بنا ہوا دیکھیں گے۔ ہاتھ ڈھل تمرو دیا کمر بیچ کھو تیسے کٹریا۔ ہاتھ بلیچی چمکت آوے پڑ گئی موری بجریا۔ ارے یہ کون چلا آتا ہے۔ یہ اسٹاف کپتان

سلمان احمد علی صاحب ہیں۔ جی اور نہیں تو کیا۔ تمہارا: محمد علی عفی عنہ۔ ۱۴ فروری ۱۹۴۴ء

ڈاکٹر حسین ظہیر کے نام

مائی ڈیر ڈاکٹر! سلام شوق۔ بہت دن ہوئے یونیورسٹی کے پتے سے ایک خط بھیجا تھا۔ چونکہ پتہ مکمل نہ تھا، معلوم نہیں پہنچا تھا یا نہیں۔ اب پھر لکھتا ہوں۔ "گناہوں کا خوف" اکثر احباب مانگتے ہیں۔ میرے پاس صرف ایک جلد باقی ہے۔ معلوم نہیں وہ کتابیں جو آپ کے ساتھ گئی تھیں ردّی کی ٹوکری میں پہنچ گئیں، کیڑے کھا گئے یا ابھی کچھ باقی ہیں۔ اگر کچھ ہوں تو بھیج دیجئے۔ مشکور رہوں گا۔ جب سے آپ گئے ملاقات کا کیا ذکر، مہینوں حال نہیں معلوم ہوتا۔ لکھنؤ میں کبھی عالیہ یا عبدالمحسن صاحب سے ملاقات ہو گئی تو خیریت معلوم ہو جاتی ہے۔ زمانہ اور اسبابِ زمانہ اتنے دوسرے ہو گئے ہیں کہ نہ معلوم کتنے ہیں جن سے مل کر جی خوش ہوتا تھا اور اب برسوں خبر بھی نہیں ہوتی۔ خود ہمارے ساتھی تو قریب قریب ختم ہو چکے۔ بھلے کو ہم نے اپنے سے کم سن لوگوں سے رسم بڑھالی تھی۔ گویا سینگ کٹا کے بچھڑوں میں شامل ہو گئے تھے۔ مگر خدا کا کرنا ایسا ہے ان سے بھی واسطہ نہ رہا۔ اب ایک دو بڈھے رہ گئے ہیں ان سے کبھی ملاقات ہو جاتی ہے تو آپس میں ایسی باتیں ہوتی ہیں جیسے ہم لوگ اعراف میں بیٹھے ہیں۔ تازہ ترین اسکینڈل جو ہم لوگوں میں دل کے بہلاؤ کے لئے بیان ہوتا ہے، ان لوگوں کی دادیوں، نانیوں کے متعلق ہوتا ہے جو خود گورنمنٹ کے پنشن خوار ہیں۔ ایک ایک پرانا قصہ بیس بیس بار بیان ہوتا ہے۔ سنتے سنتے جگہیں مقرر ہو گئی ہیں کہ کس مقام پر ہنسنا چاہئے اور کس پر افسوس کرنا چاہئے، اور کس مقام پر تعجب کرنا چاہئے۔ نیا سے نیا مصنّف جو اب ہم پڑھتے ہیں "اڈیسن" اور "اسٹیل" ہیں۔ نیا سے نیا مسئلہ جو ہم سوچتے ہیں، ڈارون کا "خلافۃ الارتقا" ہے۔

قصہ مختصر زندہ ام مگر مردہ، مردہ ام مگر زندہ۔ سیّدہ کو دعا۔ ہم کو اس وقت سیّدہ کا جو چہرہ یاد آیا وہ وہی چہرہ ہے جس پر بے شکن جوانی کھیل رہی ہے۔ تمہارا چہرہ بھی وہی صاف امنگ کا بھرا یاد ہے۔ اب نہ معلوم کتنی شکنیں تجربے کی پڑ گئیں۔ ہماری لڑکیاں گجن، اتن، ممّا سنا ہے سب بڑھیاں ہو گئیں (عالیہ میں ماشاء اللہ ابھی خفیف جوانی کی جھلک دکھائی دیتی ہے) سنا ہے سلمان کے ماتھے کے بال اڑ گئے۔ گالوں پر بڑھاپے کا گوشت بھر آیا ہے۔ جب یہ حال ہو تو ہمارے چہرے کا کیا پوچھنا۔ کوشش کرتے ہیں کہ خط بنانے میں بھی اپنے چہرے پر نظر نہ پڑے۔ اور اگر پڑ جاتی ہے تو جی چاہتا ہے ایک تھپڑ ماریں۔ معلوم ہوتا ہے شیخ حبیب اللہ مرحوم کے والد شیخ عنایت اللہ مرحوم بیٹھے ہیں۔ جب ہماری شادی ہوئی تھی تو اعزّہ میں دو ایک جوان لڑکیوں کی مائیں جن کو حسد ہوتا تھا، اُن

میں سے ایک تھیں جو ہماری بی بی مرحومہ سے جلن نکالنے کے لئے کہتی تھیں کہ "ارے دولہا کی چاند ایسی صورت دیکھ کر شیعہ ہو جائے گی۔" آج یہ قصہ جس سے بیان کریں وہ کہے یہ بڈھا بہت جھوٹ بولتا ہے۔

علی ظہیر لکھنؤ میں منسٹر ہیں۔ مگر اُن کی منسٹری کا لطف ہمارے لئے آدھا رہ گیا ہے۔ حبیب اللہ مرحوم ہو گئے ہیں۔ وسیم غریب نہ رہ گیا۔ خلیق چلے گئے۔ زمانہ بدل چکا۔ صرف شیعہ کانفرنس وہی رہی اور عماموں کا وہی زور ہے۔ خود ہماری AGNOSTICISM ہربرٹ اِسپنسر والی باقی ہے۔ مگر موت کے قریب ہو جانے کی وجہ سے صرف اشاروں کنایوں میں کبھی کبھی دکھائی دے جاتی ہے۔ ورنہ عموماً پانچوں وقتوں کی نماز کے آڑ میں چھپی بیٹھی رہتی ہے۔ تمہارے پاس ڈاکٹر اتنا وقت کہاں ہوگا کہ فضول اتنی بکواس کرو۔ لیکن اگر اس کے جواب میں سیدہ اور بچوں کا حال لکھ بھیجئے تو تھوڑی دیر کے لئے جی خوش ہو جاتا۔

ہماری سمدھن صاحبہ بیگم علی رضا جن کو ہم "دلارا اینٹا" کہا کرتے تھے، سنا ہے غریب بہت بیمار ہیں۔ علی رضا مرحوم انتقال کر گئے۔ اب غریب دلاری ہیں نہ اینٹا۔ خط ختم کرنے کو دل نہیں چاہتا مگر مجبوراً ختم ہی کرنا پڑیگا۔

میری بیوی سیدہ اور بچوں کو اور تم کو دعا کہتی ہیں۔ دعا گو: محمد علی عفی عنہ۔ ردولی۔ ۱۸/ اگست ۱۹۵۱ء

ہما بیگم کے نام ———— ردولی۔ ۱۶/ دسمبر ۱۹۴۹ء

ہما بیگم! سنو۔ آجکل میں بہت پریشان رہا اور پریشان ہوں۔ مگر میری پریشانی موٹاپے پن کی ہے۔ سکھ روگ لگا ہے۔ بعضے وقت خیال ہوتا ہے کہ کفرانِ نعمت کر رہا ہوں۔ پھر عقل کہتی ہے ؎

ہو جائے گا چھوٹی چھوٹی باتوں میں خفا　　کیا تو نے خدا کو آدمی سمجھا ہے!

اب مولوی لوگ ان کے کان بھر دیں تو اور بات ہے۔ جیسا کھانا کھاتا تھا ویسا ہی کھانا کھاتا ہوں۔ بلکہ شاید اُس سے بہتر اللہ دے دیتا ہو۔ کیونکہ قنبر آجکل ہمیشہ سے بھی زیادہ خیال کرتی ہیں۔ نیا ریشمی لحاف اوڑھتا ہوں۔ سفید کپڑے، جاڑوں کا عطر، دوسرے دن خط بنا تا ہوں۔ پھر اور کیا چاہیئے۔ مگر دل نہیں مانتا ؎

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے　　یہ رنج کہ کم ہے۔ مئے گلفام بہت ہے

دکھڑا رونے کو اور کچھ نہ سہی تو یہی ہے کہ سلمان کا خط نہیں آتا۔ 　　تمہارا باپ: محمد علی عفی عنہ

مولانا صلاح الدین احمد کے نام

دامت نوازشکم! تسلیم۔ محبت نامے کا شکریہ۔ "ادبی دنیا" موصول ہوا تھا مگر شکریہ کا خط نہ لکھ سکا۔ نو ہفتے تک ہلکی حرارت میں مبتلا رہا۔ اب بحمد اللہ بالکل اچھا ہوں۔ گو گزشتہ علالت اللہ میاں کا نوٹس تھی کہ تیار

رہو۔ جواباً اوپر کے جی سے لبیک، لاشریک لک لبیک کہہ دیا۔ اور کیا کہتا۔ بہر حال اب بالکل اچھا ہوں۔ البتہ عقل کچھ گٹھل سی ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ "ستر ا بہترا" غالب کہہ گئے ہیں۔ کچھ سٹھیا نے پن کا اثر شروع ہو گیا ہے۔ حضرت آپ کی ادب نوازی، ادیب پروری کا تقاضا تو یہ کہتا ہے کہ "ادبی دنیا" کی خدمت میں دن رات مصروف رہوں۔ مگر ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ اپنے میں وہ حال نہیں پاتا جس سے استہزا یعنی Sense of the ridiculous کچھ کم ہوتا دکھائی دیتا ہے، اس لئے قلم اٹھاتے کچھ ڈر سا معلوم ہونے لگا ہے۔ میرے استاد مرزا محمد عسکری صاحب لکھنوی بڑے ادیب اور مصنّف تھے۔ مرحوم نے ابھی انتقال کیا ہے۔ میرے بچپن میں ان کی خوش بیانی، نغز گوئی، بذلہ سنجی کے ڈنکے بجے ہوتے تھے۔ مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ اپنی کتاب "من کیستم" میں میرا ذکر بڑی للک سے کیا ہے۔ آخر عمر میں باتیں ویسی ہی کرتے تھے مگر واقف کار محسوس کرنے لگے تھے کہ باتیں کرنے میں طولِ کلام اور عرضِ معنیٰ اور رقبہ افادیت میں کچھ تناسب بگڑنے لگا تھا۔ یہی دھڑکا لگا رہتا ہے۔ نہیں تو لکھنے کو اب بھی جی چاہتا ہے۔ انشاءاللہ لامحالہ کوشش کروں گا۔ اور اگر کچھ ہو گیا تو وسطِ جنوری تک حاضر کروں گا۔

آپ نے میرے ہفوات پر تقریظ لکھ کر میرا کلاہ گوشۂ آفتاب تک پہنچا دیا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر میں حکم نہ بجالاؤں تو حیف ہے مجھ پر۔ اتنی درخواست ضروری ہے کہ اگر کچھ ہو گیا مگر "ادبی دنیا" کے پایہ سے گرا ہوا ہو تو خالی عبرت دلانے کی نظر سے قبول نہ کیجئے گا۔ "کشکول محمد علی شاہ فقیر" امید ہے کہ ڈھائی برس کے بعد اب پریس سے آ جائے۔ جیسے ہی آ گئی حاضر کروں گا۔ مگر صلاح الدین صاحب! چھاپنے والے نے کیا ظلم کیا ہے۔ چھپائی ایسی ہے جیسے یتیم بچّے کا منہ ہوتا ہے۔ غلطیاں ایسی ہیں کہ جیسے بڑے گھر کی لونڈی ہوتی ہے۔ کتاب مسخ ہو کر رہ گئی ہے اور ہم ہیں کہ بے بس، بے اختیار دم بخود بیٹھے ہیں۔ دیکھئے دیکھئے وہی بات جو میں کہتا تھا سامنے آئی۔ یعنی بے ضرورت کلام شیطان کی آنت ہو گیا۔ اور ہم کو کب خبر ہوئی جب صفحہ قریب بہ ختم پہنچا۔

دعاگو: محمد علی عفی عنہ۔ ردولی۔ ۱۲ر دسمبر ۱۹۵۱ء

نجّے کے نام

یار نجّے! خدا تمہاری ہیرے کی ایسی شفّاف روح، سونے کا ایسا دہکتا دل، موتی کے ایسے آبدار دانت، چاند ایسا چمکتا چہرہ بہت دن سلامت رکھے۔ تم بڑے اچھّے آدمی ہو۔ جتنے تم سے ملاقات ہو جاتی ہے وہ تعریفیں ہی کرتا ہے۔ چنانچہ ہما بھی انھی لوگوں میں ہیں جو تمہارا دم بھرتی ہیں۔ اگر میں نیک آدمی ہوتا تو

سچ کہوں مجھے تمہارے اوپر رشک آنے لگتا۔ مگر میں جیسا آدمی ہوں تم جانتے ہو، اس لئے میرے تمہارے درمیان مقابلے کا ڈر بالکل نہیں۔ تمہارا خط آیا۔ خلوص و محبّت کی جھلک اس میں ایسی تھی کہ جیسے دل کی کلی کھِل گئی۔ بحمداللہ اب اچھا ہوں اور یوں تو شکایت کرنے کی بہت گنجائش ہے۔ اچھا خاصا کھاتا ہوں، ہنستا ہوں، بولتا ہوں، لوگوں سے باتیں کرتا ہوں، سو رہتا ہوں، ہزاروں کا محسود ہوں، کم کا حاسد۔ مگر خدا کے احسانات کو بھلا کر کہو تو زمانہ کی شکایت، فلک ناہنجار کی ناسازگاری، وطن میں بے وطنی پر دفتر کے دفتر لکھ دوں۔ آدمی بھی عجب معجون مفرّح بلکہ معجون غیر مفرّح اللہ میاں نے بنایا ہے، کہ ہر وقت شکایت ہی کا پہلو تلاش کیا کرتا ہے۔ شکر کے موقعے ایسے نظرانداز کر جاتا ہے جیسے اس نے اللہ میاں کے ہاتھ گیہوں بیچے تھے اور اللہ میاں اس کے دام دبا بیٹھے تھے۔ لاحول ولا قوّۃ الا باللہ العلیّ العظیم۔ مثلاً دو چار شکوہ و شکایات کی باتیں لکھتا ہوں۔ غور سے پڑھنا۔

۱۔ بڑھاپا آگیا ——————— بڑھاپا کس کو نہیں آتا۔

۲۔ بال بچّوں سے دور رہا پڑا ——————— ہوش کے ناخن لو۔ نہ معلوم کتنے ہوں گے جن کے بال بچّے ہیں ہی نہیں۔ ان سے تو اچھے ہو۔

۳۔ لکھنؤ جاؤ تو معلوم ہوتا ہے، کوئی جاننے والا رہ ہی نہیں گیا ——————— کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ اب بھی دو چار احباب دوست مخلص تو مل ہی جاتے ہیں۔ اگر نہ ملتے تو ہم بار بار لکھنؤ کیوں جاتے۔ جب لکھنؤ جانا بند کر دو تو ہم جانیں کہ تم سچ کہتے ہو۔ چودھری مجتبیٰ حسن ہیں، محبوب عالم ہیں، چودھری نعمت اللہ ہیں، صدرالاسلام ہیں۔ اور نہ جانے کتنے نکلیں گے۔

۴۔ سلمان بہت یاد آتے ہیں ——————— کیوں سڑا منھ سو ندھا کرتے ہو۔ تین برس سے انھوں نے تمہاری بات نہیں پوچھی۔ اتنے زمانے میں صرف ایک خط لکھا تھا، وہ بھی اس لئے کہ بڑھاپے میں اپنا مزاج داں نوکر اُن کی ساس کی خدمت کرنے کو حیدرآباد بھیج دو۔ اور آپ ہیں کہ اُن کی یاد کے برہے گا رہے ہیں۔ کہیں منھ لگاتے تو آپ نہ معلوم کیا کرتے۔

۵۔ ادھر بڑھاپے کی وہ بیماریاں ہو گئیں جو جاتی نہیں ——————— لکھنؤ کے مشہور سرجن ماتھر ابھی ابھی بتا چکے ہیں کہ ستّر برس کے سن میں ایسے خوش قسمت کم دکھائی دیتے ہیں۔

اور تم ہائے کے (نعرے) نالے مار رہے ہو۔ آخر کیا قیامت کی بوربیرٹیورنے کاارادہ ہے۔

۶۔ ردولی میں عیب جُو زیادہ رہ گئے، ہُنر دیکھنے والے چلے گئے ــــــــــــ خود اپنی افتادِ طبیعت دیکھو، گریبان میں منھ ڈالو۔ ہر شخص سے تو لڑائی کر لیتے ہو اور پھر اُلٹے شکایتیں کرتے ہو۔...... سے لڑ گئے...... سے بگاڑ کر لیا...... سے بول چال بند (خیر یہ تو اچھا کیا) اور پھر چاہنے والوں سے خراجِ ہمدردی کے طلب گار ہو۔ اور پھر ہمدردوں کا ذکر نہیں کرتے۔ بدرُل ہیں، آفاق ہیں، حسن عباس ہیں۔ فیض آباد میں صفت حسین۔ اور کیا چاہتے تھے، کوئی چاہنے والوں کی فوج بھرتی کرنے کا ارادہ تھا۔ ضیغم کو بھول ہی گئے۔

۷۔ علاقہ جا رہا ہے ــــــــــــ معلوم نہیں کہ علاقہ پہلے جائے کہ تم پہلے جاؤ۔ پھر اس کا رونا کیا روتے ہو۔ حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے تو کہہ ہی دیا ہے کہ علاقہ جائے گا ضرور مگر تمہارا کچھ نہ بگڑے گا۔ علاقہ کی فال یاد کرو نکلی تھی ؎

آں جامۂ کہ بود در دیوئے یوسفم ترسم برادرانِ غیورش قبا کنند

اور تمہارے لئے حافظ جی نے فرمایا تھا ؎

بے خبرانند زاہداں نقش بخواں ولاتقل مست ریاست محتسب بادہ بنوش ولاتخف

بیٹھے رہو جیسی پڑے گی کٹ جائے گی۔

۸۔ آجکل قیصر حج کو گئی ہیں، اسّے تنہائی تکلیف دہ ہے ؎

جب جاکے برآمدے میں سونا ہوگا تکیہ یک ہوگا، یک بچھونا ہوگا

تنہائی میں آہ! کون ہوئیگا انیس ہم ہوئیں گے اور بابا کا کونا ہوگا

ــــــــــــ اللہ کا شکر بھیجو کہ یہ دن نصیب ہوا۔ خدا چاہے گا تو انشاء اللہ تعالیٰ حج اور زیارت سے مشرف ہو کر آجائے گی۔ اللہ اُس کی آرزو پوری کرے۔ آمین۔ آج ۲۸ تاریخ، صبح کا وقت ہے۔ وہ اس وقت انشاء اللہ تعالیٰ جدّہ میں بیٹھی ہوگی۔ تنہا تو ضرور گئی ہے۔ مگر اللہ کا بھروسہ اور حج کا سہارا ہے۔ ذری اس کی ہمّت تو دیکھو۔ تم کو تو بجائے اظہارِ مفارقت کے خدا کا شکر بھیجنا چاہیئے۔ اور پھر یہ بھی تو سوچو ؎

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اچھا اب مریض بہت بیٹھے ہیں اور آج لکھنؤ جانے کا بھی ارادہ ہے۔ اس لئے ختم کرتا ہوں۔ خدا تم کو اور تمہارے والوں کو خوش و خرم رکھے۔ آمین۔ دعاگو: محمد علی عفی عنہ۔ ۲۸ اگست سنہ ۱۹۵۱ء

میجر سیّد ابوجعفر کے نام

جناب میجر سیّد ابوجعفر صاحب خان بہادر کلکتہ۔ صاحب خُلقِ عظیم کے اُمتی سیّد ابوجعفر صاحب کو سلامِ شوق پہنچے۔ واللہ میجر صاحب یہ نہ شرطِ انصاف نہ شرطِ دوستی، اپنے میٹھے بولوں سے آپ کیا کرنے پر تُلے ہیں۔ میں بوڑھا خرف۔ "بڑّھا اور بالا برابر"۔ سٹھیا گیا ہوں۔ بچّوں کا ایسا بھولا پن پھر سے آگیا ہے۔ اور آپ میری حالت سے فائدہ اٹھا کر مجھ کو پھر سے شیعہ کرنا چاہتے ہیں۔ آخر اِسّے آپ کو کیا فائدہ ہوگا ع

کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

اللہ میاں نے آپ کی زبان میں نرمی، آپ کے قلم میں اثر اسی لئے دیا تھا کہ آپ میرے ایسے نادان پر ہاتھ صاف کیجئے۔ اور مجھ کو مسلمان سے پھر شیعہ کر لیجئے۔ اور تو اور ذری اس بات پر غور کیا ہوتا کہ ابھی ابھی چار پانچسو روپیہ لگا کر "میرا مذہب" چھپوایا ہے۔ اگر میں شیعہ ہوگیا تو اس رقم پر پانی پھر جائے گا۔ مگر نہیں، آپ ماننے کے نہیں۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ آپ دم نہ لیں گے جب تک حاضری کے دسترخوان پر بٹھا کر آپ مجھ سے اَن کہی کہلا نہ لیں گے۔ اچھا میجر صاحب ہمارے آپ کے درمیان صلح ہو جائے۔ شرائط حسبِ ذیل ہوں:

۱۔ میں محمدؐ اور آلِ محمدؐ پر دل و جان سے قربان ہوں ؎

بصدق و صفا گشتہ بیچارہ جامی! غلامِ غلامانِ آلِ محمدؐ

آپ نام بنام تبرّا چھوڑ کر صرف دشمنانِ محمدؐ و آلِ محمدؐ سے بیزاری کیجئے۔ اور اس کی پرواہ بالکل نہ کیجئے کہ ٹوپی کس کے سر پر سج گئی ؎

شرابِ لعل کشں و روئے مہ جبیناں بیں خلافِ مذہبِ آناں جمالِ ایناں بیں

دل میں بھی صرف دشمنانِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کا خیال آوے۔

۲۔ میں آپ کا خط بھائی بدرُل[1] کو نہ دکھاؤں۔ اور آپ مجھ کو بڑے بڑے خطوط اکثر لکھ کر نصف ملاقات کا لطف بخشا کریں۔ اور آپ یہ سلسلہ جب ختم کر دیں تو آپ کا خط بھائی بدرُل کے آگے رکھ کر جتنی اشتعال انگیز باتیں کہہ سکوں، کہوں۔

---

[1] یہ صاحب میجر صاحب کے سُنّی دوست ہیں۔

آپ نے تحریر کیا ہے۔ "اچھا جناب آپ نے میرے اس کہنے کو بُرا کیوں مانا کہ آپ تقیہ کر رہے ہیں"۔
آپ کے اسی گمان پر تو سر دُھنتا ہوں کہ آپ بات اس انداز سے کہتے ہیں کہ بُری لگتی ہی نہیں۔ اندازِ بیاں
میرا بگڑ گیا ہوگا۔ ورنہ آپ کی بات اور بُری لگے۔ تقیہ کے اوپر جو کچھ مجھ کو کہنا تھا کہا۔ میں عرض کر چکا کہ اگر مجھ
کو پھر سے لکھنے کا موقع دیا جائے تو بھی شاید کچھ اضافہ نہ کر سکوں۔ البتہ بہت سی باتیں شیعہ اور سنی کی چھوڑ
گیا ہوں۔ تاکہ مطلب حاصل ہو جائے اور تکلیف کم سے کم پہنچے۔ ورنہ بہت سی باتیں لکھ سکتا تھا۔ مثلاً صحیح
بخاری کی بعض لغو احادیث یا ذاکرین کی لغو بکواس، اسی ذیل میں بند بات بھی آتی ہے کہ "تقیہ" کا غلط استعمال
اور تبرّا یہ دونوں ایسی مشکل راہیں ہیں کہ جن میں ذرا سا پاؤں ڈگ گیا آدمی منھ کے بل آ رہا۔ اور زندگی دوہری
ہو گئی۔ ایک وہ جو صرف اپنے فرقے والوں کے بیچ میں ہو سکتی ہے، اور دوسری وہ جو ملی جُلی صحبت میں ہوتی ہے۔
یہ بڑے غضب کی بات ہے۔ خدا اس سے بچائے۔ Sincerity ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ چاہے بندے
سے واسطہ ہو چاہے خدا سے، دوہری زندگی کسی کو پسند نہیں۔

آپ نے بیگم صاحبہ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ خدا کرے موصوفہ ویسی ہی اچھی ہوں جیسی آپ چاہتے
ہیں۔ آمین۔ اگر مرزا آ گئے ہوں تو اُن سے میرا سلام کہئے گا۔ آم اب کی سال یہاں کم ہیں۔ اس لئے مجھے امید
ہے کہ مرزا جب آم کھانے بیٹھے ہوں گے تو پہلے ہماری روح پر فاتحہ پڑھ دیا ہوگا۔ بھائی بدرُل کا سلام نہیں لکھ
رہا ہوں اس وجہ سے کہ ان سے اس خط کا ذکر اشارتاً و کنایتاً کبھی نہیں آیا۔

۱۹ر جون سنہ ۱۹۵۲ء

خورشید صاحب کے نام

میرے پرسانِ حال بھائی خورشید صاحب کو سلامِ محبت پہنچے!

گمانِ زیست بود بر منت ز بیدردی　　بد است مرگ و لے بدتر از گمانِ تو نیست

محسود زیادہ ہوں اور حاسد کم۔ چاند کے حساب سے بہتّرواں سال ۳۰ر جمادی الآخر کو شروع
ہو گیا۔ پھر بھی ہنس لیتا، برج کھیل لیتا ہوں۔ خوبصورت عورت کو دیکھ کر کم سے کم دل میں تو گرمی پیدا ہو
ہی جاتی ہے۔ اس سن میں اتنی خیالی قابلیت بھی قابلِ رشک ہے ؎

دل ابھی تک جوان ہے پیارے　　ایک آفت میں جان ہے پیارے

فالحمد للہ رب العالمین۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے آپ کا محبت نامہ میرے ذمے نہیں ہے۔ بہرحال یہ تو
ثابت ہے کہ جب آپ کے دل میں میرا خیال آیا تھا اس وقت میں بھی آپ کی دوستی کے مزے لے رہا تھا۔ کیونکہ

ہمارے آپ کے خطوں سے راستے میں کہیں ملاقات ہوئی ہوگی۔ خالی فرق اس قدر تھا کہ آپ بے غرض یاد کرتے ہیں اور میں اپنی غرض سے۔

آجکل میں ایک رسالہ لکھ رہا ہوں۔ میاں کھدّن کی پامردی سے ختم بھی ہوگیا۔ یہ عیب بڑا ہوگیا ہے کہ لوگ اس کو پڑھ کر خوش نہ ہوں گے۔ اس کا نام ہے "میرا مذہب"۔ بھائی خورشید آپ سمجھ سکتے ہیں کہ محمد علی اپنا مذہب بیان کرے اور کوئی خوش نہ ہو۔ یہ امیر خسروؒ کی ہے ؎

درکوئے نیکنامی مارا گذر نہ دادند   گر تو نمی پسندی تغیّر کن قضا را

لیکن اس رسالے سے میری آنکھوں کی سوئیاں ضرور نکل جائیں گی۔ دل کی آرزو تو یہ تھی کہ اس رسالے سے شیعہ سنّی کچھ قریب آجاتے مگر افتادِ طبیعت کچھ ایسی بری واقع ہوئی ہے کہ اگر کہیں میری سعی مشکور ہوگئی، جس کا امکان صرف واہمہ ہے، تو ایک نیا فرقہ پیدا ہو جائے گا۔ آجکل علاوہ روحانی تکلیف کے ایک جسمانی تکلیف بھی اضافہ ہوگئی ہے۔ یعنی کمر میں سخت چک آگئی ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ کون ایسی مصیبت تھی جس کی بنا پر احباب سے خراجِ ہمدردی وصول کیا جائے۔ حضرت بات یہ ہے کہ ایک بار دو کا نستھ میرے پاس ایک غرض لے کر آئے اور بہت چالاکی سے اپنا مطلب نکالنے میں معروف ہو گئے۔ میں نے کہا "ہو نہ کانستھ! اپنا مطلب نکالنے کے لئے دوسرے کے نقصان کی پرواہ نہیں کرتے ہو"۔ انھوں نے جواب دیا۔ "ہم وہ کانستھ نہیں ہیں جو آپ سمجھتے ہیں"۔ اسی طرح میری کمر کی چک وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ یہ ایسی چک ہے جو نماز میں بیٹھنی بنا دیتی ہے۔ بچّوں کو دعا۔ پرسانِ حال کو تسلیم۔ خصوصاً پڑوسی اسحٰق صاحب کو۔

دعاگو: محمد علی عفی عنہ۔ ۱۲ راپریل ۱۹۵۱ء

منیجر صاحب کے نام

جمیل المناقب جناب منیجر صاحب! دامت الطافکم۔ تسلیمات۔ آپ نے میرے مذہبی رجحانات کے بارے میں جو فرمایا ہے وہ ایک حد تک ممکن ہے بالکل درست ہو۔ گو مجھ کو خبر نہ ہو مگر میرے دل کو شیعہ یا سنّی کہے جانے سے تسکین نہیں ہوتی۔ اور جس جذبہ سے تسکین ہوتی ہے وہ نصیب نہیں۔ یعنی مجھ کو ارباب فہم بیوقوف کہیں، جاہل کہیں، گنہگار کہیں مگر مسلمان سمجھیں۔ غضب تو یہ ہے کہ کوئی متعصّب شیعہ کہتا ہے، کوئی سنّیوں کا خوشامدی کہتا ہے، کوئی ڈھل مل یقین کہتا ہے، کوئی دہریہ کہتا ہے۔ مگر مسلمان کوئی نہیں کہتا۔ تیرہ سو برس بعد مسلمان ہونا ویسا ہی مشکل ہوگیا ہے جیسے پھر سے معصوم بچّہ ہو جانا۔

دوش دیدم شبنم غلطاں بروئے گل زنار   یادم آمد طفلی و دامانِ مادر سوختیم

اگر دنیا میں آج بھی کوئی ایسا مسلمان ہونا چاہے جیسا رسول اللہؐ کے وقت میں ممکن تھا تو وہ کیا کرے گا؟ یہی تو کرے گا کہ اسلام کی تاریخ پڑھ کر ہر واقعے پر رائے قائم کرے گا۔ وہ رائے کہیں شیعوں کے موافق ممکن ہے ہو۔ ممکن ہے سنّیوں سے ملتی جلتی ہو۔ بعض باتیں وہابیوں کی اس کو بھلی معلوم ہوتی ہوں بعض باتیں صوفیوں کی اس کو پسند ہوں، تو وہ کیا کرے؟ آخر عقیدے کا اثاثہ تو وہ اسلامی ہی تاریخ سے فراہم کرے گا۔ پھر آخر وہی کیوں نہ مانا جائے جس کا وہ مدّعی ہے۔ جس کے لئے وہ خدا سے دعا مانگا کرتا ہے، اور جو اس کی بد قسمتی سے اس وقت تک شاید قبول نہیں ہوئی ہے۔ یہی حال اس گنہگار کا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جس گروہ میں میں پالا گیا ہوں اس کا اثر اپنی تخئیل میں موجود پاتا ہوں۔ مگر جن عقائد پر مضبوط نہیں ہوں وہ میرے سر کیوں منڈھے جائیں۔ مثلاً شیعہ مذہب امام علی علیہ السلام کا دل سے قائل ہے۔ میں اس کو سو فیصدی نہیں مانتا۔ میں حدیثِ قرطاس کے معاملے میں شیعوں کا ہم خیال ہوں۔ سنّی اس کے قریب نہیں جاتا۔ پھر لوگ میری بات کو تقیّہ یا جعل فریب پر کیوں محمول کرتے ہیں۔ وہی کیوں نہیں مان لیتے جس بات کا میں خود مدّعی ہوں۔ اغیار سے گلہ نہیں، احباب سے دوستانہ شکایت ہے کہ وہ بلا وجہ یہ کیوں خیال فرماتے ہیں کہ لکھنے والے نے صرف جعل فریب ہی کہا ہے۔ ذری، یارو! خدا لگتی کہو۔ اگر میں ائمہ کرام علیہم السّلام کی جگہ دل میں رکھتا ہوں تو شیعہ کب ہو گیا۔ اگر میں حضرت ابو بکرؓ کا معترف ہوں تو سنّی کیسے ہو گیا۔ آخر میں اپنے ایمان کی عمارت اسی اسلامی مسئلے سے تو تیار کروں گا؟ کہ کنفیوشس، گوتم بدھ اور مارکس کے جوزف اسمتھ کے دروازے دریوزہ گری کرنے جاؤں گا؟ بجائے اس کے کہ جو لوگ اپنی للّی گھوڑی پر سوار ہیں مجھ کو بھی اپنے پیچھے سوار کر لیں، میری ہدایت کے لئے دعا کیوں نہیں مانگتے۔ نصیری کو حق ہے کہ وہ نہایت صفائیِ قلب سے میرے لئے دعا کرے کہ بارِ الٰہا! اس کو راہِ حق دکھا کر نصیری کر دے۔ خارجی کو حق ہے کہ وہ دعا کرے کہ اس کے عقائد خارجیوں کے کر دے۔ مگر یہ کیا شرطِ انصاف ہے؟ کیا شرطِ دوستی ہے کہ نہیں، یہ سوار ہوگا تو میری ہی للّی گھوڑی پر سوار ہوگا۔ اس کتاب میں تقیہ کرنے کی گنجائش میں نے کہیں نہیں پائی۔ پھر میرے لئے یہ حسنِ ظن کیوں فرمایا جاتا ہے کہ یہ مردود یا یہ اچھا آدمی تقیہ کا روپ بھرے ہے۔

اکثر لوگوں نے اسی طرح کا شک اس گنہ گار پر کیا ہے جیسے جناب نے فرمایا۔ اس کی شکایت اگر مجھ کو اپنے عنایت فرماؤں سے ہوتی تو میں اپنے کو حق بجانب جانتا۔ مولوی عبد الماجد دریا بادی نے تو غضب کیا۔

انھوں نے لکھا ہے کہ "محمد علی کہتا ہے کہ میں سنّی یا شیعہ نہیں ہوں۔ اس میں پچاس سینکڑہ وہ کامیاب ہوا۔ یعنی شیعہ تو اس کو اپنے گروہ سے الگ سمجھیں گے مگر سنّی اس کو شیعہ ہی جانیں گے۔ اور اس کی ذمہ داری خود محمد علی ہی پر ہے۔ کیونکہ اس نے خلافت کا مسئلہ چھیڑ دیا۔" یعنی اُن کا مطلب یہ نکلا کہ اختلافی باتیں اگر میں نہ چھیڑتا تو سنّی مجھ سے، زیادہ خوش ہوتے۔ گویا میں نے یہ کتاب صرف سنّیوں کو خوش کرنے کے لئے لکھی تھی۔ اکثر حضراتِ اہلسنّت کا بھی خیال ہے کہ خلافت کا ذکر فضول ہے۔ میرے خیال میں اس وجہ سے کہ اس معاملے میں اُن کی کورد بتی ہے۔ فقہی مسائل میں میرا رجحان شیعوں کی طرف زیادہ ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ شیعوں کا مسلک ہے بلکہ اس وجہ سے کہ میرے خیال میں قرآن کا مسلک ہے۔ مگر اس کے بعد بھی میں اپنے کو شیعہ نہیں کہتا۔ مگر جس گروہ میں پیدا ہوا، جس گروہ میں پروان چڑھا، اس کی محبت دل سے نہیں جاتی۔ اسی کے ساتھ امامت من اللہ، قرآن پاک میں مجھ کو آج تک دکھائی نہیں دی۔ شیخ کلینیؒ کے یہاں حضرت امِ کلثومؓ اور حضرت عمرؓ کے واقعے کا ذکر سن کر تکلیف ہوتی ہے اور لکھنے والے سے دل میں شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض سنّیوں سے یہ سن کر کہ خلیفۂ وقت پر امام حسین علیہ السلام نے خروج کیا تھا اور وہ اپنے نانا کی تلوار سے مارے گئے (نعوذ باللہ) پیچ و تاب کھاتا ہوں۔

نیاز صاحب فتحپوری کے نام

کرم فرمایم! اس طرف لکھنؤ پہنچنے کی امید تو کم ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پہلی جولائی کو پالٹیکس کے اسرافیل، کانگریس کے دھوتو بیگ پنتھ صاحب اپنا نرسنگھا یعنی زمینداری کی موت کا صور پھونکیں گے۔ اس دن بچّے زمیندار بوڑھے ہو جائیں گے۔ زمینداروں کے محل گر جائیں گے اور زمینداروں کے بھی کھاتے ہوا میں روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے۔ اس رستخیز عظیم کے دھڑکے میں کچھ نہ کچھ مصروفیت بڑھ ہی گئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کے تشریف لانے کی خوشی میں اگر کوئی ضرورت لکھنؤ کی ہوتی بھی تو ملتوی کر دی جاتی کیوں کہ نیاز صاحب روز روز ردولی نہیں آیا کرتے۔ رہا تعارفی خطوط کا معاملہ، اس کے لئے قول و قلم سے ہر وقت دست و زبان حاضر ہیں۔ اکثر خطوط اس طرح کے لکھنے پڑتے ہیں۔ ان کے لئے خاص سباق ایجاد کیا ہے۔ ایک تھانیدار صاحب نے اپنے سپرنٹنڈنٹ کی شکایتیں بیان کر کے خط لکھوانا چاہا تھا۔ ان کو سراج الدین احمد صاحب ڈی۔ او۔ جی۔ الٰہ آباد کے نام خط لکھ دیا جو کامیاب ہوا۔ بہرحال جس طرح کے تعارفی خطوط فرمائیے گا انشاء اللہ تعالیٰ لکھے جائیں گے۔ اور پھر بھی یہ آرزو باقی رہے گی کہ کاش اس سے زیادہ کوئی خدمت کر سکتا۔

منیجر ابو جعفر کے نام

عطوفی ! دامت اعطافکم۔ تسلیم۔ اشتیاقِ دیدار۔ ۹ر جولائی والا عنایت نامہ کل شام کو موصول ہوا۔ سنئے صاحب ! آپ کے اخلاقِ حسنہ، قابلیت، نرمیٔ مزاج، علمی صورت کا سکّہ میرے دل پر بیٹھا ہے۔ اپنی اصطلاح میں ان تمام صفات کا مجموعی نام میرے یہاں مومنیت ہے۔ آپ سے مل کر دل میں بڑی نرمی پیدا ہوئی ہے۔ اور پھر ملنے کی آرزو رہتی ہے۔ میں یہ ڈر رہا ہوں کہ کہیں بحث مباحثے میں پڑکر یہ رشتۂ عقیدت جو مجھ کو جناب سے ہے، ٹوٹ نہ جائے۔ خود میری طرف سے ایسا ہونے کا ڈر نہیں۔ ایک عنایت فرما سے اسی کتاب کے سلسلے میں مجھ کو ڈر ہے کہ ایسا ہی ہوا نہ ہو۔ کیوں کہ بہت دنوں سے انھوں نے کوئی خط نہیں لکھا۔ لہٰذا گزارش ہے کہ مجھ کو مفصّل جواب نہ لکھنے کی معافی دی جائے۔ بد قسمتی سے احادیث اور روایات جو شیعہ، سنّی بیان فرماتے ہیں، ان میں سے بہتوں کو میں غلط جانتا ہوں۔ دل کو پوری طرح یقین ہے کہ اَلاِنسانُ مرکبٌ مِّن الخطاءِ والنسیان کا ثبوت بعد رحلت رسول صلعم ویسا ہی ملا جیسا آج ملتا ہے۔ آدمی کی فطرت تب بھی ایسی ہی تھی۔ ذاتی اغراض تب شاید زیادہ شامل رہے ہوں۔ مثلاً جو باتیں میں نے لکھی ہیں، جہاں شیعہ سنّی احادیث سے مجھ کو اختلاف ہے ان کا ذخیرہ میرے دل میں بھرا ہوا ہے۔ صرف اپنے خیالات ظاہر کرنے کے لئے دو دو، ایک ایک مثالیں لکھ دی ہیں تاکہ ضرورت سے زیادہ دل نہ دکھاؤں۔ بحث میں بڑی گنجائش ہے۔ منطق مسلمانوں کا علم نہیں۔ یہ یونان سے آیا۔ منطق کے صحیح ہونے کا سوال نہیں۔ کیونکہ عقلِ سلیم صحیح ہونے کا سوال نہیں۔ لیکن مغالطوں میں پڑجانے کا سوال ہے۔ آپ نے ایک جگہ یٰلَیۡتَنِیۡ کی مثال اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡن سے دی تھی۔ میرے دل میں یہ تشبیہ تشفی بخش نہیں۔ نماز میں جب آپ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡن کہتے ہیں تو جذبات کے تحت نہیں کہتے بلکہ Ritualistic انداز میں کہتے ہیں۔ مجالس میں صرف وہی شخص یٰلَیۡتَنِیۡ کہتا ہے جو وقتی جذبات سے اوروں سے زیادہ متاثر ہوگیا ہو۔ کیونکہ سب نہیں کہتے۔ ان دونوں حالتوں میں بڑا فرق ہے۔ جب شیعہ شیطان پر لعنت کرتا ہے تب شیطان کے غیر جنس ہونے کی وجہ سے دل میں ایک دوسری طرح کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اور جب کسی تاریخی انسان پر لعنت کرتا ہے تو دوسری طرح کی کیفیت دل میں آتی ہے۔ یہ خود میرا تجربہ ہے۔ میں اس معاملے میں دوسرے کے تجربے پر کیسے کاربند ہو سکتا ہوں اس طرح کی مثالیں اور بھی ہیں۔ لہٰذا بہتر ہے کہ باوجود اختلاف کے ہم لوگ بلا بحث کے ایک دوسرے کے بہی خواہ رہیں۔ اِدھر دو تین خطوط میں باوجود میرے تردّد کے آپ نے بیگم صاحبہ کی مزاجی کیفیت کا حال بالکل

نہیں لکھا۔ ڈرتا ہوں بجنا بجنی میں دل میں کہیں بال نہ پڑ گیا ہو۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو تھوڑے دن کی زندگی جو باقی ہے، اس میں یہ داغ رہے گا۔

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے ۔۔۔ ان کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے

خدا کرے کہ بیگم صاحبہ کا مزاج اچھا ہو۔ آمین ۔۔۔ دعاگو: محمد علی عفی عنہ

(۲)

ضاعف اللہ فضلکم! سلام مسنون اور اشتیاق دیدار۔ حادثۂ مفارقت پر میری دلی تعزیت قبول فرمائیے۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ سرد و گرم زمانہ دیکھ چکا ہوں۔ مجھ کو آپ کی تکلیف کا اندازہ ہے۔ کیونکہ شروع جوانی میں اسی طرح کی مصیبت میں مبتلا ہو چکا ہوں۔ اور آپ کی تکلیف کا اندازہ کر سکتا ہوں۔ یہ معلوم کر کے کہ دوسرا ابھی اس تکلیف میں ہے، چین سے نہیں ہے، اگر کچھ تسکین ہو سکے تو ہمدردی بدل و جان پیش ہے۔ رضاً بقضائہٖ وتسلیماً لامرہٖ کہنے سے کچھ مرہم سا ضرور رکھ جاتا ہے مگر زخم کی گہرائی ویسی ہی رہتی ہے۔ پھر بھی بقول کارڈل نیوٹر جس چیز کا چارہ نہیں اس کو حکیمانہ نظر سے برداشت بھی کرنا پڑتا ہے۔ میں ناتجربہ کاری کے زمانہ میں تعزیت اور ریٹر سے بہ ہنسا کرتا تھا۔ میری ایک لڑکی جو بہت دنوں سے بیمار تھی (اس کے علاوہ چار لڑکیاں اور بھی تھیں) وہ گزر گئی۔ صبح کو ایک صاحب تعزیت کو آئے بیچارے کم سخن تھے۔ آکر چپ بیٹھ گئے۔ میں نے کہا۔ ہاں تو پھر شروع کیجئے۔ بچی کیا بیمار تھی۔ مجھ کو اطلاع بھی نہیں ہوئی۔ خدا آپ کو صبر دے۔ وہ بیچارے پریشان ہو گئے۔ اس کے بعد میرا اکلوتا لڑکا گزر گیا۔ اس واقعے کے بعد ایک دیہاتی جاہل ملاقاتی نے ہمدردی کی۔ عجب بھونڈے طریقے سے اس نے مجھ کو تسکین دی۔ مگر یہ معلوم ہوا کہ جیسے زخم پر کسی نے مرہم رکھ دیا۔ اس نے کہا: "وہ لڑکا تمہارا تھا ہی نہیں، اگر تمہارا ہوتا تو تمہارے پاس رہتا نا؟ وہ جس کا تھا اس نے لے لیا۔ تم کیوں رنج کرتے ہو؟" ہاشمی صاحب! اس وقت بھی وہ زخم ہرا ہے اور اس وقت بھی وہ مرہم اپنا کام کر رہا ہے۔ اس کے بعد سے میں ہر پہلو سے تعزیت کی قیمت سمجھنے لگا۔ اور اسی وجہ سے یہ صفحہ سیاہ کیا کہ شاید دلی ہمدردی غم میں کچھ اضافہ کرے۔ ارحم الراحمین آپ حضرات کو صبر دے۔ آمین!

اب کی بار لکھنؤ آنے پر دولت ہم کلامی حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔

محمد علی عفی عنہ۔ ردولی۔ اودھ۔ ۱۰ اپریل ۱۹۵۲ء

مولانا عابد الشبیرؔ کے نام

لختِ جگرم! دعا۔ بھیّن کو خط دررازہ لکھا، کوی کو کراچی لکھا، اوری کو لکھا، دو خطوط حما کو لاہور لکھے۔ اب بجّے کے خط سے معلوم ہوا کہ حما ابھی کراچی ہی میں ہیں۔ لڈّن، بجّن کی صحت کا شکریہ اللہ میاں سے عرض کیا۔ سبط کے لئے اللہ میاں سے درخواست بھی کی اور رو بصحت ہونے کا شکریہ بھی ادا کیا۔ اوری کے چھٹنے پر بھی الحمد للہ ربّ العٰلمین کہا۔ مگر ادھر نہ معلوم کیا ہے کہ صدائے برنہ خاست۔ اپنے لئے بھی اللہ کے دربار میں برابر عرضیاں گزران رہا ہوں۔ مگر وہاں سے بھی کوئی احکام ابھی تک جاری نہیں ہوئے۔ ادھر سے میں مایوس بالکل نہیں ہوں مگر کسی طرح کچھ سن گن مل جاتی تو اطمینان ہوتا۔ چاہے وہ آخری حکم کی صورت میں ہوتا۔ یہاں زمینداری کی گھڑی ساعت لگی ہے۔ "نئی نادن یا نس کی نہتی"۔ یہ بھی نہیں پتا چلتا کہ اس میت کو ٹھکانے لگا کر کیا انتظام کریں گے۔ ہم بھی بیٹھے ہیں کہ جو کچھ ہونا ہے ہو رہی گا۔ کیا کریں پریشان ہو کر۔ روپیہ پیسے کا جوڑ توڑ آئندہ ہونے والا ہے، اس پر نظر کر کے میں نے کہا کہ یہ سنّت جو شاہانِ دہلی کی ہم برقرار رکھے ہیں یعنی حقّہ، جو اتنا شاندار ہے، اسی کی تخفیف بول دیں۔ کل دن بھر حقّہ نہیں پیا۔ بُری حالت ہو گئی۔ بلڈ پریشر بڑھ کر دو سو کے لگ بھگ پہنچ گیا۔ ناچار شام کو پی لیا۔ وہ تکلیف تو مٹ گئی۔ مگر ارادے کی کمزوری، ہمّت کی کمی، تہیّہ کا بودا پن، مستقل مزاجی کی ڈھل مل یقینی آئینہ ہو گئی۔ اس وقت صبح کے آٹھ بجا چاہتے ہیں اور حقّہ منھ سے لگائے تم کو خط لکھ رہے ہیں۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَارِ۔ سب کے لئے ہر وقت دعا کیا کرتے ہیں۔ تمہارے لئے بھی دعا کرتے ہیں مگر اورنگ زیب کی روح کان میں آ کر کہتی ہے ؎

میندار کاں کہنہ نخچیر گیر
بر دامِ دعائے تو گردد اسیر

اللہ میاں فرماتے ہیں اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ۔ اب تم ہی بتاؤ ہم اورنگ زیب کی بات پر کیسے کان دھر سکتے ہیں۔ گو اس میں کلام نہیں ہے کہ حضرت ایوبؑ، حضرت یعقوبؑ اور بہت بڑے بڑے آدمیوں کی حالتوں کا تجزیہ کر کے اورنگ زیب نے گُر کی بات بتائی ہے۔ مگر پھر بھی اللہ میاں صادق ہیں۔ اورنگ زیب کے ایسے دو ہزار بکا کریں تو ہم کب مانتے ہیں۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ اللہ میاں یہ تو دیکھیں گے کہ یہ گنہ گار بندہ ہمارا اورنگ زیب کی بات پر ہمارے قول کو ترجیح دے رہا ہے۔ اس میں اگر کام نہ بھی بنتا تب بھی فائدہ ہی ہے۔ لہٰذا عابد ہم دعا مانگتے ہیں، تم بھی ...... دعا گو: محمد علی عفی عنہ۔ ۱۰ر فروری ۱۹۵۱ء

ہما بیگم کے نام

ہما پیاری! دعائیں قبول کرو۔ میری دعائیں بے اثر ہیں۔ مگر پھر کیا کروں، جو کچھ ہے وہ حاضر ہے۔

سنو! ایک کہانی سنو۔ ردولی میں ایک محلّہ ہے، ملک زادہ۔ وہاں ایک بوڑھے آدمی رہتے ہیں۔ ان کا بھی نام ہے محمد علی۔ ان کے باپ پانچ چھ روپے مہینہ نوکر تھے۔ ان کے مرنے کے بعد یہ لڑکا جو میرا ہم سن تھا، رنگون بھاگ گیا۔ وہاں کہیں اردو پڑھانے کے لئے نوکر ہو گیا۔ رفتہ رفتہ ایک مدرسے میں مدرّس ہو گیا۔ دو لڑکے پیدا ہوئے، جوان ہوئے۔ ایک نے ایل۔ ایل۔ بی پڑھ لیا۔ دوسرا سینما میں پہلے نوکر ہوا پھر حصّہ دار بن گیا۔ باپ نے دو تین مکان خریدے تھے۔ دولت جمع کی۔ یکبارگی جاپانی یلغار ہوئی۔ سب چھوڑ چھاڑ کر ردولی واپس آئے۔ گئے تھے تنہا، اٹھارہ بیس برس کا سن رہا ہوگا۔ وہاں سے لوٹے، سن سفید۔ آخری امتحان بڑے لڑکے کا باقی تھا۔ وہ یہاں پاس کیا۔ محمد علی استقلال سے زندگی بسر کرتے رہے۔ مجھ سے کہا یہاں سے خالی ہاتھ، بے یار و مددگار گئے تھے۔ وہاں اتنا کمایا کہ اطمینان ہو گیا۔ وہ سب لٹ گیا مگر میری ہمت کم نہ ہوئی۔ اگر خدا نے چاہا تو پھر کما لوں گا۔ پہلے تو اکیلا تھا، اب تو تین ہو گئے۔ اتنے میں بڑا لڑکا جو وکیل ہو گیا تھا وہ چار پانچ دن میں مر گیا۔ اسی کی وجہ سے میں نے ان لوگوں کو جانا تھا۔ ورنہ ردولی میں بہت سے جاہل رہتے ہیں۔ میرے اور محمد علی کے کون ہم مذاقی تھی جو میں ان کو دوست بناتا۔ یہ خبر سُن کر میں بڑے میاں کے پاس گیا۔ شیعہ ہوتا تو رو دھو کر کچھ غم غلط کر لیتا یا کم کر لیتا۔ وہ بچارہ سنّی آدمی زیادہ رونا دھونا جانتا نہیں تھا۔ میں نے تسلّی تشفّی سے تعزیت کی۔ وہ سنا کیا اور چہرے سے مشکوری ظاہر کیا کیا۔ اتنے میں میرے منھ سے نکلا۔ میاں محمد علی خان! خدا جس پر مہربان ہوتا ہے اس کو امتحان میں ڈال دیتا ہے۔ میرا یہ کہنا تھا کہ وہ کانپنے لگا۔ "ارے میں اور امتحان۔ میں کب اس قابل تھا کہ میرا پروردگار میرا امتحان لے۔ ارے میرے مالک! تیرا ہزار ہزار شکر ہے۔ اپنے گندے بندے کو تو نے امتحان سے نوازا۔ نہیں چودھری صاحب! امتحان کیا لیا ہوگا؟ امتحان ہمارے ایسے نحس بندوں کا کیا لیتا۔ میرے مولا! کہاں تک تیرا شکر ادا کروں؟ امتحان اور میں؟ میں اور امتحان!"

ہُما پیاری! یہاں بھی کہیں وہی امتحان کے عنایات، مراحم، نوازشیں، کرم فرمائیاں تو نہیں ہیں؟ اگر ایسا ہے تو اس گنہ گار کی مبارکباد قبول کرو۔ میرا بھی خیال رکھنا ؎

بوقتِ مرحمت اے ساکنانِ صدرِ جلال　　زروئے حافظ و آں آستانہ یاد آرید

میں نے صرف ایک شعر لکھا ہے تم پوری غزل پڑھ لینا۔
ہما! میں بالکل اچھا ہوں۔ اگر حیاتِ مستعار باقی ہے تو ابھی اگر نہ مروں تو تعجب نہیں۔
راقم: تمہارا فدائی۔ تمہارا باپ

آفاق کے نام

آفاق بیٹا! آج کیا پروگرام ہے؟ اگر گاؤں جاتے ہو تو "بسلامت روی و باز آئی"۔
اگر گھر پر کوئی مشغلہ ہو تو "چشمِ ما روشن دلِ ما شاد"۔ اگر بیکار بیٹھے ہو تو "کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست"۔
دعاگو: محمد علی عفی عنہ

خورشید صاحب کے نام

بھائی خورشید! زاد اشفاقکم۔ سلامِ شوق۔ آپ کا محبت نامہ آیا تھا۔ اور جہاں تک یاد پڑتا ہے میں نے جواب بھی لکھا تھا۔ مگر قسم نہیں کھاؤں گا۔ ممکن ہے لکھنے کا ارادہ ہی کرتے رہ گیا ہوں۔ بہرحال اگر وہ خط میں نے نہ بھی لکھا ہو تو آپ از ڈاکخانہ دور رہے ہوں مگر از دل دور کبھی نہیں رہے۔ اس دوسرے خط کا بھی شکریہ قبول فرمائیے۔ میں زندہ ہوں اور ابھی تک چلا جا تا ہوں مگر ابھی تک یہ حالت ہے کہ ایک دن اگر بالکل ہی چلا جاؤں تو افسوس کر لیجئے گا مگر تعجب کی گنجائش نہ ہوگی۔ ادھر کچھ بڑھاپے کی وجہ سے شکایتیں بڑھ گئی ہیں۔ اس کے بعد انفلوئنزا کی ایک ٹھوکر لگی۔ مگر باوجود ان باتوں کے ابھی تک زندہ ہوں اور بے لوث احباب کے لئے دعا میں مشغول ہوں۔ بچوں کی مفارقت کا برا نافضہ ہے۔ اِدھر مولانا عابد بھی پاکستان کے ہو گئے۔ جب سے داغِ مفارقت سب کے سب چمک اٹھے۔ میری ایک کتاب "کشکول محمد علی شاہ فقیر" دو برس سے ایک ظالم مطبع والے کے ہاں پڑی ہے۔ دوسرا رسالہ "میرا مذہب" تیار ہے۔ چاہتا تھا ان دونوں کو چھپا ہوا دیکھ لیتا تو جی خوش ہو جاتا۔ صوری اولاد کو نہیں دیکھ سکتا ہوں، معنوی اولاد ہی کو کھیلتے دیکھ لیتا تو جی خوش ہو جاتا تا۔ آجکل "صحیفۂ کاملہ" اکثر دیکھتا ہوں۔ اردو کا ترجمہ تو کچھ نہیں مگر فارسی کے ترجمے میں کچھ جھلک اصل کتاب کی آجاتی ہے۔ جتنی دیر پڑھو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی پیٹھ پر ہاتھ رکھے تسکین دے رہا ہے۔ "صحیفۂ علویہ" بھی نظامی پریس نے چھاپا ہے۔ اگر یہ کتابیں اپنے پاس نہ ہوں تو منگا لیجئے۔ مذہب میں چھری کٹاری تو بہت دیکھی ہوں گی۔ مذہب کا مرہم، مذہب کی فرحت، مذہب کی ٹھنڈک، مذہب کی خوش گواری جیسے صبح کی ٹھنڈی ہوا۔ ذری ان کی بھی سیر کیجئے۔
محمد علی عفی عنہ۔ ۴؍ اگست ۱۹۵۱ء

ولایت حسین صاحب کے نام

ڈیر ولایت حسین صاحب! تسلیم۔ آپ کا آخری کارڈ آیا۔ آپ ماشاءاللہ جوان آدمی، پڑھے لکھے، سمجھ دار، ذمہ دار، بالغ، عاقل، مکلّف۔ راستے کی مشکلوں، سفر کی صعوبتوں کی اس قدر پوچھ گچھ کیا ہے۔ ارے صاحب! الٰہ آباد کے اسٹیشن پر ٹکٹ گھر ڈھونڈ لیجئے۔ ردولی کا ٹکٹ لیجئے اور ہمت کر کے ریل میں بیٹھ جائیے۔ ع دل افگندیم بسم اللہ مجریہا ومُرسٰہا

اور احتیاط مدّ نظر ہو تو جو ماما آپ کے گھر کھانا پکاتی ہے اس سے کہئے کہ داہنے بازو پر ایک پیسہ امام ضامن کا باندھ دے۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

فیض آباد کے اسٹیشن پر کوئی نہ کوئی بندۂ خدا مل ہی جائے گا جو لکھنؤ جانے والی گاڑی پر آپ کو بٹھا دے گا۔ فیض آباد کے اسٹیشن پر بندر بہت ہیں۔ مگر امام ضامن تو بازو پر بندھا ہی ہوگا، پھر ڈر کاہے کا۔ ہم سفر ردولی کا اسٹیشن بتا دیں گے، جی کڑا کر کے اتر پڑیئے گا۔ اگر آمد کا وقت معلوم ہو گیا تو میرا آدمی وہاں موجود ہوگا۔ اگر میں اس دن تک مر گیا تب بھی محمد علی کو لوگ اتنی جلدی بھول نہ گئے ہوں گے۔ کوئی نہ کوئی خدا ترس آپ کو میرے گھر کا پتا بتا ہی دے گا۔ ہمتِ مرداں مددِ خدا۔ آپ چل کھڑے ہوئیے گا۔ سب سے پہلے میری بی بی سے میری با وقت موت کا پرسہ دیجئے گا۔ اس کے بعد اور باتیں کیجئے گا۔ البتہ اسٹیشن سے غریب خانے تک سڑک خراب ہے۔ یکّے تانگے کا ڈنڈا مضبوط پکڑے رہئے گا۔ خدا چاہے گا تو بیڑا پار ہے۔ آپ خدانخواستہ کچھ موم کے بنے تو ہیں نہیں کہ دھوپ میں دشمنوں کے پگھل جانے کا ڈر ہو، شکر کا پنڈا تو ہے نہیں کہ برسات میں بہہ جائیے پھر کیا پروا ہے۔ اور تقدیر میں خدانخواستہ، نصیب دشمناں، لاکھوں کوس دور، سات قرآن درمیان، شیطان کے کان بہرے، اگر کچھ ایسا ہی لکھا ہے تو رضاً بقضائہٖ تسلیماً لامرہٖ مجبوری ہے۔ اگر آپ کے دل میں اس بات کا دھڑکا ہو کہ میں مہمان کو مار ڈالتا ہوں تو الٰہ آباد میں صدیق حسن صاحب، ممبر بورڈ آف ریونیو، سراج الدین احمد صاحب ڈی۔ آئی۔ جی۔ پولیس، جسٹس رگھبر دیال صاحب، رگھوپتی سہائے صاحب فراق لکچرر یونیورسٹی، جسٹس ولی اللہ جن سے مجھے میٹروپول ہوٹل، نینی تال میں ملاقات ہوئی تھی، ان حضرات سے تصدیق کر لیجئے گا کہ میں آدم خوری کا شوق نہیں رکھتا۔ اصل معاملہ تو ایک طرف رہا، مجھ کو بڑا اشتیاق آپ کی زیارت کا ہے اور امید کرتا ہوں کہ انشاء اللہ تعالیٰ میرے آپ کے مراسم گہرے ہو جائیں گے۔

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

گزشتہ سال میری بی بی تن تنہا ہوائی جہاز سے حج کو چلی گئی اور پھر واپس آ گئی۔ اسی طرح انشاءاللہ تعالیٰ آپ بھی اس سفر کی مہم کو سر کر لیں گے۔ مجھ کو آپ سے ملنے کا واقعی اشتیاق ہے۔ کیونکہ باوجود اختیاطوں کے آپ آدمی مجھ کو اچھے معلوم ہوتے ہیں۔

بندہ محمد علی عفی عنہ۔ ردولی۔ اودھ۔ ۴ر مارچ سنہ ۱۹۵۲ء

ہما بیگم کے نام

ہما پیاری! دعائیں قبول فرماؤ۔ اور میرے بس میں کیا ہے؟

ایک بار مولوی عوض علی مرحوم اور ہم ساتھ جا رہے تھے۔ میں نے ان کی تعریف شروع کی کہ آپ اچھی خیرات کرتے ہیں۔ وہ کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے۔ "ے بھائی! اے کا کیہو۔ بھئی ہمرا سب کیا کرا وا مٹی کر دیو۔ لے اب تم کہدیو اب کیا ہوت ہے۔ لے ہمرا تو توا لے گوا۔ حکم ہے کہ کہو نا اور تم کہدیو تو ہم تو کہیں کے نہ رہن بھائی۔ واہ بھئی واہ۔ ایسا کوئی کرت ہے بھائی۔" تم نے لکھا ہے کہ میرے خط چھپوانے کے لئے جمع کر رہی ہو۔ اب خط لکھتے وقت یہ یاد آ جایا کرے گا اور بجائے سادگی، صفائی، بے لوثی کے انانیت، اوچھا پن، اظہارِ قابلیت۔ الابلا خاک دھول۔ خطوں میں نہ معلوم کیا کیا سما جائے گا۔ لے بھائی ہما! ای کیا کیہو۔ بھئی ہمرا کیا کرا وا سب مٹی کر دیو۔ ایک مرتبہ یہی بات میں نے اپنے استاد مسٹر سڈنس کو لکھی تھی۔ انھوں نے جواب میں لکھا تھا کہ میرے خطوط کے چھپوانے کا خیال ہرگز نہ کرنا۔ اگر میں یہ جانتا تو مجھ سے وہ خطوط لکھے نہ جاتے۔

میں یہ تو نہیں کہتا کہ میرے خطوط چھپیں نا۔ اگر ان سے کوئی فائدہ مقصود ہو تو ضرور چھپیں۔ مگر اس خیال کے بعد وہ تحریر کی بے تکلفی تو گئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جیل خانے میں چھپوانے کے لئے خطوط لکھے تھے۔ دیکھ لو۔ ایک خط کے سوا جو انھوں نے اپنی بی بی کے مرنے پر لکھا تھا، اور جتنے خطوط ہیں اُن میں لڑکوں کا باپ مردہ، بی بی کا شوہر غائب اور صرف ادب کا منشی، علوم کا مولوی، انگریزی پالٹیکس کا اَدھ کچرا نقال، "انا" کا ڈھنڈورا پیٹنے والا، بڑے بڑے الفاظ اور عربی ترکیبوں کا اردو کی اونچی نیچی زمین پر Tank چلانے والا دکھائی دیتا ہے۔

اچھا لو اب شکایت نہ کرنا۔ رات دیوالی کی رات تھی۔ چاروں طرف چراغ جگمگا رہے تھے۔ ہر ہندو گھر میں جوئے کی پھڑ بچھی تھی۔ درمیان درمیان سنکھ کی پوں پوں اونچی دیواروں سے چراغوں کو پھاندتی ہوئی کانوں کے پردوں پر دھمال بجاتی تھی۔ نہ ملنے والا اندھیرا، اور نہ ختم ہونے والی جاڑوں کی رات دلوں پر خوف

طاری کر رہی تھی۔ اگر آسمان پر ستارے ٹوٹتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ جادو کی ہانڈیاں چل رہی ہیں۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ۔ یہ محمد علی، ہما بیگم کو خط لکھ رہا ہے یا مولوی عبدالحلیم شرر کی نقل بھانڈ لوگ کر رہے ہیں۔ تم نے گزشتہ خط میں میرے مسودے کا تو ذکر کیا مگر اپنی کتاب کا حال نہ بتایا۔ ہم لوگ زندہ ہیں، تم سب کے لئے دعا کرتے ہیں۔

محمد علی عفی عنہ

(۲)

پہلی مئی ۱۹۴۹ء۔ ردولی۔ میری جان سنو! راضی برضا رہنا تو ٹھیک ہے۔ مگر اس کے معنی اتنے سہل نہیں ہیں جتنے بادی النظر میں معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنے کو اور بلند کرتا جائے، اور بلند کرتا جائے۔ امتحانِ خدا کا شائبہ ہر گھڑی زیادہ ہوتا جائے۔ قدیم اصول مصوّری کا تھا کہ فطرت کی نقل جہاں تک ہو سکے اتارتے چلے جاؤ۔ اسی کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ ہزار نقل کرو گے پھر بھی فطرت کی پوری نقل نہ اتار سکو گے۔ لہٰذا انسان صرف یہی کر سکتا ہے کہ برابر بہتر سے بہتر نقل اتارتا جائے اور پھر بھی یہی سمجھتا رہے کہ ابھی منزل مقصود بہت دور ہے۔ یہی حال کسی کی ننھی منّی آزمائش کا ہے۔ ایک درویش نے کسی دوسرے درویش سے پوچھا کہ تمہارے شہر میں درویشوں کا کیا رویّہ ہے۔ اس نے کہا کہ ان کو جب ملتا ہے تو شکر ادا کرتے ہیں اور جب نہیں ملتا تو صبر کرتے ہیں۔ اس بزرگ نے کہا۔ ہاں! ہمارے بغداد کے کتّوں کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ دیکھا تم نے کہ جب آدمی سمجھتا ہے کہ میں کسی بلندی پر پہنچ گیا ہوں، اُس وقت بھی وہ صرف معمولی سطح پر ہے ؎

نہ ہو قناعت شعار گلچیں، اسی سے قائم ہے شان تیری۔ وفورِ گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا

دعا گو: تمہارا خادم تمہارا باپ

مولانا حمایت الحسن کے نام

مائی ڈیر مولانا۔ ایک عورت تھی وہ بڑی ہنس مکھ تھی۔ جس مرد کو دیکھتی تھی ہنس دیتی تھی۔ اس کے شوہر کو کچھ یہ بات پسند نہ تھی ؏ عشق است و ہزار بدگمانی

اس نے اپنے شوہر کو اطمینان دلایا "ہنسنا میرا سبھاؤ بلم تم جیتا نہ مانیو"۔ یہی حال میری کوتاہ قلمی کا ہے۔ آپ اپنے خطوطِ محبّت کا جواب دیر میں پا کر الجھا نہ کیجئے۔ اگر میں روز روز خطوط کا جواب دیا کروں تو اتنی تمہیدیں کہاں سے پاؤں۔ اور میرے خطوط بجائے میری عقیدت کا ترجمان ہونے کے جمعرات کا آموختہ ہو کر

رہ جائیں۔ اچھا اب سنئے۔ میں بے حیا زندہ ہوں۔ اور باوجود دنیاوی فکروں کے زندہ رہنے کا ویسا ہی آرزومند ہوں تاکہ اپنے چاہنے والوں کو خطوط لکھا کروں۔ اور اللہ میاں سے دعائیں مانگا کروں ؎

یا رب اماں دہ تا باز بینند ۔ چشمِ محبّاں روئے حبیباں

ارے بھئی خوب یاد آیا۔ میں مٹھا کو صاحب کا نام بھول گیا۔ جس کے یہاں جائے پی تھی اور برج کھیلا تھا۔ ارے بھئی وہی چھتریا کالج کے ہیڈ ماسٹر۔ ان کو نہ معلوم ہو کہ میں ان کا نام بھول گیا۔ ورنہ ان کو میری بات اوچھی معلوم ہوگی اور مجھ کو خفّت ہوگی۔ مگر اُن کو میرا پیغام دے دیجئے گا۔ انھوں نے تمہارے رشتے سے مجھے ماما کہنا شروع کیا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کی جگہ میرے دل میں اور زیادہ ہو گئی تھی۔ ان کی کتابیں دیکھ کر اُن کے پڑھے لکھے خوش علم ہونے کا اثر ہوا تھا۔ اسی کے ساتھ یہ کمی بھی محسوس ہوتی تھی کہ بجائے خود اپنے دماغ سے باتیں نکالنے کے شیکسپیئر اور ملٹن کا مال گدڑی بازار میں لئے بیٹھے رہتے ہیں۔ اچھا خیر اُن سے میری طرف سے کہہ دیجئے گا کہ اگر وہ مجھے چچا کہنا شروع کرتے تو مجھے زیادہ فکر لاحق نہ ہوتی۔ مگر انھوں نے ماما کہنا شروع کیا تھا۔ بھائی لوگ تو لڑنے بھڑنے والے ہوتے ہیں، ان کی میں زیادہ پروا نہیں کرتا۔ بہنیں تو خالص محبّت کی دیویاں ہوتی ہیں۔ ان کا رشتہ دل کو بے غرض ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ بڑے دن کی چھٹیوں میں میرے یہاں آئیں گے۔ میں برابر آس لگائے رہا مگر وہ نہ آئے۔ میں نے بدرل وغیرہ سے ان کی تعریفیں کر رکھی تھیں۔ "دوست آدمی ہیں، پڑھے لکھے ہیں"۔ اپنی کتابوں سے کہہ رہا تھا کہ "ایک دن ان کا قدرداں آنے والا ہے"۔ مگر کچھ بھی نہ ہوا۔

یہ خط یہاں تک، آج آٹھ تو روز ہوئے لکھا گیا تھا۔ پھر میں بیمار ہو گیا۔ بحمد اللہ آج بالکل اچھا ہوں۔ ہمارے یہاں عرس اگلے جمعہ سنیچر کو ہے۔ آفاق میاں آپ کو لکھ چکے ہیں۔ یا عنقریب لکھیں۔ میں بھی آپ کو لکھ رہا ہوں کہ آپ ہماری بھانجی سلّمہا اور بچوں کو لے کر حاضر ہوجیے۔ میں خط لکھوں یا نہ لکھوں مگر دل سے ہمیشہ اپنے چاہنے والوں کو یاد کیا کرتا ہوں۔ رضیہ سلّمہا اور حفاظت کو میری بہت بہت دعائیں پہنچائیے گا۔ اور کہئے گا کہ جوں جوں میری Sweet Peas بڑھتی تھیں، میں ہمیشہ رضیہ اور حفاظت کے باغ کو اور اُن کو یاد کرتا تھا۔ میرے Sweet Peas اب ختم ہو رہے ہیں۔ نو دس فٹ تک بڑھے۔ دوسرے پھول بھی اچھے ہوئے۔ خدا کرے میرے دوستوں کا بھی باغ سرسبز رہے۔ اور سوا دعائے عمر و اقبال کے اور کیا عرض کروں۔

دعاگو: محمد علی عفی عنہ۔ یکم مارچ ۱۹۵۱ء

ہما بیگم کے نام

ہما بیگم! دعائیں قبول کرو۔ تمہاری کتاب دیکھی۔ دوسروں کو دکھائی۔ ہر شخص ایک طرح خوش ہوا۔ اور میرا تو سینہ کشادہ ہوگیا۔ تم نے تو ہما! اپنا راستہ اپنے بنانے والے کی طرف سیدھا کرلیا۔ ذری ہم لوگوں کا خیال رہے۔ ہاں ہما بیگم! پھر تم نے اپنے ولایت جانے کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ مجھ کو تو تمہارا یہ خیال بہت پسند آیا تھا۔ نہ معلوم سلمان سے بھی تم نے مشورہ کیا یا نہیں۔ ان کو خط لکھنا اور جواب کی امید لگانا ذری سخت بات ہے، مگر مجبوری ہے۔ مجھ کو نہ حال معلوم ہے نہ میری رائے اس بارے میں قابلِ وقعت ہوگی۔ لیکن میرا تو یہ خیال تھا کہ اگر یہ ارادہ انشاء اللہ تعالیٰ ہے تو کوئی خاص امتحان یہاں سے پاس کرکے جانا صرف تضییع اوقات ہے۔ وہیں امتحان بھی پاس کرو اور وہیں ٹریننگ بھی لو۔ دو ہزار روپیہ میرے پاس ہے، تین ہزار قیصر سے لے لوں گا۔ اگر بعد کو ضرورت ہوگی تو خدا مسبب الاسباب ہے اس کا بھی سامان کردے گا۔ اگر میں مرگیا تو خدا مرنے والا نہیں ہے۔ تم کو دھڑکا کس بات کا ہے۔ کمرہمت باندھو اور چل کھڑی ہو۔ اس وقت سلمان وہاں ہیں، ایسے وقت سے بہتر وقت نہ ہوگا۔ آئندہ تم مختار ہو ہم تو خادم ہے۔ جب کتاب چھپتی ہے یا لڑکا ہوتا ہے تو عجیب خوشی ہوتی ہے۔ تم تو تم میں اس خیال سے خوش ہوں کہ ہماری ھما کو یہ خوشی نصیب ہے۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ ارے یار تمہاری وجہ سے ہم بھی مذہبی آدمی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ خیالات میں تو چنداں فرق نہیں، مگر "زیبِ داستاں" کے لئے ہم بھی اچھے خاصے خدا کو ماننے والے، خدا پر بھروسہ کرنے والے، اُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ (املا غلط تو نہیں ہوگیا) کا نعرہ لگانے والے رع "ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا" ہوتے جاتے ہیں۔ خدا میرا جعل فریب معاف کرے اور باوجود میرے دھوکے دھڑی کے مجھ پر رحمت نازل کرے۔ آمین رب العالمین!

ارے بھئی کتاب کی تعریف جی بھر کے نہیں کی۔ واقعی بڑی عمدہ کتاب ہے۔ زبان میں تمہاری شخصیت جھلکتی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو دل پر اثر نہ ہوتا۔ اب تو یہ حال ہے کہ جو کوئی تمہاری کتاب پڑھتا ہے اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب قمچی ہاتھ میں لئے سبق پڑھا رہے ہیں۔ ایک ایک بات ذہن نشین کروا رہے ہیں۔ اگر طبیعت اِدھر اُدھر بٹی یا نگاہ کتاب پر سے ہٹی تو قمچی پڑ جائے گی۔ لو ایک بات اور سن لو۔ کسی آدمی کی لڑکی کے پیٹ میں درد تھا۔ وہ سلا سیانے گنڈا تعویذ کے لئے دیوانہ وار دوڑا جا رہا تھا۔ راستے میں شیخ سعدی ملے۔ حال پوچھا۔ کہنے لگے "بھئی ایک ٹوٹکا ہے۔ ذری اس کو بھی کرکے دیکھو۔

تم جا کر اس کے کان میں کہدو۔ "یا مشکل کشا علی" یقیناً بلوٹھی کا رہا ہوگا۔" دو چار گھنٹے بعد پھر اُس آدمی کو دیکھا۔ پہلے سے زیادہ پریشان تھا۔ پوچھا کیوں بھئی وہ ترکیب بھی کی تھی؟ بولا ہاں مگر حالت میں کوئی فرق نہ ہوا۔ شیخ سعدی کہنے لگے۔ کیا کہا تھا؟ بولا کہا تھا "یا مشکل کشا علی"۔ انھوں نے کہا اب جاکے پھر تو کہو مگر کہنا۔ "سعدی کے مشکل کشا علی"۔ لڑکی کی مشکل آسان ہوگئی۔ جیسے ان کے دن پھرے ویسے کہنے سنتے کے دن پھریں۔ ہما بیگم خدا نے چاہا تو تمہاری محنت بھی ٹھکانے لگے گی۔ دنیا قرآن پر عمل پیرا ہوگی۔ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ تمہاری خدمت خدا قبول کرے گا۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔ راقم: دعاگوئے قدیم

(۲)

ردولی۔ ۱۹ر نومبر ۱۹۴۹ء۔ میری جان! دعا۔ تمہارا محبت نامہ آیا۔ خدا تم کو خوش رکھے اور تمہاری مرادیں پوری کرے۔ جو پند و نصائح تم کرتی ہو میرے دل میں بھی آتے ہیں۔ مگر دل پر اللہ میاں قفل چڑھائے ہیں۔ وہ کسی طرح نہیں کھولتے۔ اگر وہ قفل کھل جائے تو پھر کیا کہنا! اب نماز بھی زیادہ جی لگا کر پڑھتا ہوں۔ اور دعا بھی بہت جی سے مانگتا ہوں۔ اس کے رحم و کرم کا خیال جی میں جماتا ہوں مگر ؎

مرا دلیست بہ کفر آشنا کہ چندیں بار
بہ کعبہ بردم و باز ش برہمن آوردم

اور اوقات میں بھی غور و فکر کر کے ایمان کے عقیدے دل میں مضبوط کرتا ہوں۔ مگر صبح کے وقت جس کو حضوری کا وقت کہو، اس وقت دل میں وہی خیالات یلغار بولے رہتے ہیں جن سے ایمان متنفر ہے ؎

عالم بخروش لا الٰہ الّا اوست
غافل بگماں کہ دشمن است او یا دوست

دریا بوجودِ خویش موجے دارد
خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست
(سحابی نجفی)

یہاں جی چاہتا ہے کہ خاص تعلق ہوتا جس کو PERSONAL GOD کہتے ہیں مگر وہاں قاعدہ ہی دکھائی دیتا ہے۔ نماز کے بعد بارگاہِ خدا میں عرض کرتا ہوں کہ بارِ الٰہا ایمان دے۔ اللہ میاں فرماتے ہیں۔ ہمارا کام ہی ہے ایمان بخشنا۔ مگر تم خود اپنے دل میں ڈھونڈو کہ یہ طلب تمہاری صادق ہے؟ میں عرض کرتا ہوں میرے مالک! میری تمنا ایمان کی روشنی سے سینہ جگ مگ جگ مگ کرنے لگے جی سے معلوم ہوتی ہے۔ وہاں سے ارشاد ہوتا ہے کہ ہاں ہاں یہ تو ٹھیک ہے مگر ذرا غور کرو تم نے جوانی میں بہت سی عورتوں کو جانا ہے۔ بھلا ایمان سے کہو اُس بیتابی، تڑپ، شوق کا کچھ بھی شائبہ ہماری تلاش میں پاتے ہو۔ میں عرض کرتا ہوں۔ جی نہیں، اس طرح کی تڑپ، بے چینی تو نہیں پاتا۔ ایک دوسری طرح کی خواہش ضرور ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ ہم تمہارے دل کا

حال تم سے بہتر سمجھتے ہیں۔ یہ خواہش جو تم محسوس کرتے ہو تو یہ ہماری محبت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ بوڑھے ہو گئے ہو۔ عورت منہ نہیں لگاتی۔ طاقت جواب دے رہی ہے۔ موت کھڑی گھور رہی ہے۔ اس لئے اس طرح کے خیالات دل میں پاتے ہو۔ میں عرض کرتا ہوں بارِ الٰہا اب تیرے سمجھانے سے سمجھ میں آتا ہے۔ واقعی تیری خواہش انہی مجبوریوں سے ہوگی۔ مگر ہے تو۔ جوانی میں نہ سہی بڑھاپے میں سہی مگر اب تو ہے۔ اسی کا خیال فرما کر رحم کر اور رد بدرسے دولتِ ایمان۔ جواب ملتا ہے کہ ہاں ہاں چلے چلو ؎

چمرو وظیفۂ تو دعا کردن است وبس　　　در فکرِ آں مباش کہ نشنید یا شنید

اس میں بھی تمہارا فائدہ کچھ نہ کچھ تو ہے ہی۔ میں عرض کرتا ہوں۔ ارے میرے رب! میں تو اس سے زیادہ کی آس لگائے ہوں۔ تو رحیم ہے، کریم ہے، غفار ہے۔ تیرا کیا نقصان ہے اگر اس سے زیادہ دے دے۔ میرے قلب کو تو تسکین ہو جائے۔ حکم ہوتا ہے زیادہ بک بک مت کرو۔ کہہ تو دیا ہے کہ چلے چلو۔ اور کچھ نہیں تو جھوٹ سچ تمہاری عبودیت تو مضبوط ہو جائے گی۔ مگر مانتے ہی نہیں۔ قفل کھولو، قفل کھولو کی رٹ لگا دی ہے۔ ابے ہم تیرے رگ پٹھے سے واقف ہیں۔ مہرو پیا جیب جمالیا دنیا بھر کا۔ آیا ہے وہاں سے ہوا باندھنے۔ میں عرض کرتا ہوں۔ اب حضور مالک ہیں جو جی چاہیں کہیں۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہی کہا تھا کہ قائل تو تو نے کر دیا مگر دل کو تسکین تو نہیں ہوتی۔ وہ بڑے آدمی تھے، تیرے مقرب تھے۔ ان کو کچھ نہیں کہا اور ہم بیچارے ادبر خفا ہوتے ہیں۔ پھر آپ سے نہ کہیں تو کس سے کہیں۔ آخر کہاں جائیں، کس سے عرضِ حال کریں۔ میں ساڑھے تین برس کا تھا، آپ نے باپ کا سایہ میرے سر سے اٹھا لیا۔ کہیئے ہاں۔ اس کے بعد بیوقوف، چاہنے والی ماں نے لاڈ پیار کی انتہا کر دی۔ اگر میں نے کسی کو مارنا چاہا تو اُس نے ازار بند سے جوتی کھول کر اُس کو دی اور کہنے لگی کہ میرا بچہ یتیم ہے، یہ لو جوتی لو اور اس کو مار لینے دو، اس کا جی چھوٹا نہ کرو۔ گھر میں بیچو دادا رہتے تھے۔ وہ والد کے قصے سنایا کرتے تھے کہ تمہارے باپ نے یہ کیا، وہ کیا۔ میرے دل میں بھی شوق پیدا ہوتا تھا کہ ہم بھی بڑے ہوں گے تو یہی کریں گے۔ اس کے بعد ہم کالون اسکول بھیج دئے گئے۔ وہاں سب طرح کے خیالات دل میں ڈالے گئے۔ جب جوانی قریب آئی تو تو ہی نے خیالات میں آزادی دی۔ خود رائے قائم کرنے کی قوت بخشی۔ ہربرٹ اسپنسر مل کے خیالات دل میں جمنے لگے۔ کفر و الحاد کی بنا پڑ گئی۔ جس طرح سے تو نے خسرہ[۱] مقرر کیا ہے کہ سب کو نکلے۔ اسی طرح سے شروع جوانی میں تیرے ہی حکم سے خیالات میں آزادی آتی ہے۔

---

[۱] چھوٹی چیچک (measles)

جیسے بعضوں کو اسی خسرہ سے سینہ کی بیماری ہو جاتی ہے، جو جان لے کر جاتی ہے۔ اسی طرح شروع جوانی کے خیالات بھی ہیں کہ بعضوں پر ان کا اثر نہیں رہتا۔ اور بعض بیچارے ایسے بدقسمت ہوتے ہیں جن کو خیالات کی دق ہو جاتی ہے۔ جیسے دق کی دوا کرنے میں دوڑ دھوپ کرتے ہیں اسی طرح ان خیالات کو بھی دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہت سے خوش قسمت بچ جاتے ہیں۔ بہت سے ہمارے ایسے جوانا مرگ پاتے ہیں۔ اب اس میں ہمارا کیا بس تھا اور کون بس ہے۔ حضور جان بخشی ہو تو ایک بات عرض کروں۔

ہاتفِ غیب۔ کہو کہو، کہے جاؤ، ہم سنتے ہیں۔ میں: نیاؤں نہ کہن، کہن ٹھکرائی۔ ہاتفِ غیب کی آواز میں ایک ذری سی ہنسی اور خوش دلی کا انداز پایا جاتا ہے۔ بڑے منطقی ہو، خوب زبان چلتی ہے۔ گھبراؤ نہیں چلے چلو۔ ہم وعدہ نہیں کرتے مگر اتنا کہے دیتے ہیں کہ بے آس مت ہو۔ جاؤ میں اسی طرح سجدے میں پڑا رہتا ہوں حکم ہوتا ہے۔ ہم سب کچھ جانتے ہیں، مگر تم اپنے دل کی بھڑاس نکال لو۔ کہو کہو۔ کوئی حرج نہیں۔ ہم اپنے بندوں کے عرض حال کو برا نہیں مانتے۔ کہہ چلو۔ میں: بارِ الٰہا! تیرے مذہب کی تعلیم دینے والے کہا کرتے تھے۔ بس خدا میں یقین رکھو۔ ہم یقین کے معنی واقعی تو سمجھتے نہیں تھے مگر سن لیتے تھے۔ اس دن ایک امریکن کی کتاب میں نکلا:

"To believe in God is to desire his existence, and what is more to act as if He existed"

لے بھلا حضور ہی بتلائیں۔ ایک طرف تو منطق نے عقل کو باؤلا کر رکھا ہے، دوسرے مولوی کا بے ایمان، دنیا بھر کے خرافات بچپن سے دماغ میں ٹھونس رہے ہیں۔ اگر آپ کے بندے گڑبڑا جائیں تو کیا تعجب ہے۔ ہاتف: سنو محمد علی تم یوں ہی چلے چلو۔ ہم اپنا قاعدہ تو تمہارے لئے بدلیں گے نہیں مگر اتنا جان رکھو کہ ہم قہار جبار بھی ہیں اور رحیم و کریم بھی۔ ہم جانتے ہیں کہ تم کو ابھی اپنی بک بک سے سیری نہیں ہوتی ہے مگر تمہارا بکنا بالکل تحصیل حاصل ہے۔ کیونکہ ہم سب کچھ سمجھتے ہیں۔ ہم تمہارے اوپر مشیت کے راز اپنے کھولنا نہیں چاہتے مگر اتنا بتائے دیتے ہیں کہ اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ۔ بس اٹھو سجدے سے، اپنا کام دیکھو۔ ہما پیاری! دنیاوی مصائب جو میں نے بیان کئے ہیں ان میں ممکن ہے کچھ مبالغہ ہو مگر ہیں۔ اور بہت شدید ہیں۔ تمہاری پیٹھ کا درد بھی بے چین کئے ہے۔ کوئی اچھا خیال آتا ہی نہیں۔ لیکن میں ہر بات کے لئے تیار ہوں۔ اپنی موت سب سے سخت ہے۔ جب میں اس پر بھی راضی ہو گیا ہوں تو پھر کچھ اور کہنے

کی حاجت نہیں۔

سنو ہما! تم کو تمہاری بہنیں لتری کہتی تھیں۔ اب نہ معلوم کہتی ہیں یا نہیں۔ مگر تمہاری تیز اندیشی میں، تمہاری نیک نیتی میں کبھی کسی نے شک نہیں کیا۔ اور مجھ کو تو دل و جان سے یقین تھا اور ہے کہ تمہاری بوبو مرحومہ اپنی سب خوبیاں تم کو دے گئیں۔ مگر ایک بات کہنا چاہتا ہوں، تم سے کیسے تاب ہوگی کہ اس معاملے میں لترا ین نہ کرو۔ مگر میں مجبور ہوں کہنے پر۔ یہ سلمان مجھ کو خط کیوں نہیں لکھتے۔ کوئی شکایت ان کو مجھ سے ہے؟ میں نے تو اپنے خیال میں کوئی تکلیف ان کو نہیں پہنچائی ؎

رہ گئی بات کٹ گئی شبِ ہجر　　　تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

میں اسی طرح زندہ ہوں۔ ہنستا بھی ہوں، مضامین بھی لکھتا ہوں، برج بھی کھیلتا ہوں مگر سلمان والی کھٹک برابر رہتی ہے۔ تبرّا کہنے کی وجہ سے میرے ننھیال والے سخت بات کہنے کے عادی تھے۔ یہ ورثہ مجھ کو ملا ہے مگر میں طبیعت کو روکتا ہوں۔ اپنی ہی مثال لے لو۔ تمہارا خط آتا ہے۔ اس سے مالی مصائب کم نہیں ہوتے معدے کی تکلیفیں ویسی ہی رہتی ہیں۔ مگر ذری سی خوشی ہو جاتی ہے۔ جیسے کسی کو پھانسی کا حکم ہو چکا ہو۔ اور جیل کے احاطے میں کہیں کامنی پھولی ہو، کال کوٹھری سے نہ درخت دکھائی دیتا ہو نہ پھول مگر اس کی خوشبو کمبخت قیدی کی ناک تک آجائے اور ایک لمحے کے لئے جی خوش ہو جائے۔ بس تم لوگوں کے خط سے کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ تمہارا دل چاہے خط بھیجو، جی چاہے نہ بھیجو، کچھ زیادہ فرق تھوڑی ہوتا ہے۔ سلمان نے خود تو نہیں لکھا مگر منّن سے دو تین خط خیریت کے لکھوا کر بھیجے۔ خدا منّن کو خوش اور آباد رکھے، اس کے بچّے اقبال مند ہوں۔ میں اس کا ممنون ہوں۔ مگر مجھ کو کچھ ایسی تکلیف ہوئی کہ میں نے جواب نہ دیا۔ کیوں جواب نہ دے سکا اس کو تم سمجھ سکتی ہو، دوسرا جس نے مفارقت کی تکلیف نہیں جھیلی ہے، کیا سمجھے گا۔ میرا دلی منشا تو یہ تھا کہ سلمان کو میرے خط کی خبر نہ ہوتی۔ اور ان کا دلی خیال اس معاملے میں مجھ پر کھل جاتا۔ مگر تمہاری نیک نیتی اور اس جنّتی لترے پن سے جو تم میں ہے یہ امید رکھنا فضول ہے۔ اگر ان کو مجھ سے کچھ شکایت ہو گئی ہے، وہ معلوم ہو جاتی تو اس کھٹک سے تو نجات ملتی۔ بجائے اس کے یقیناً تم شیخ سعدی کی طرح مجھ کو اخلاق، محبّت، صلہ رحمی، درگزر، آتما کی آنچ، والدین کے حقوق پر لیکچر دینے لگو گی۔ اور میں اللہ کا شکر بھیجوں گا کہ ہما اس جگہ موجود نہیں ہیں۔ نہیں تو سارا غصّہ ہما ہی پر اترتا۔ ایک خط ولایت سے آیا تھا جب وہ گئے تھے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ آپ کی تکلیفوں، اختلاج وغیرہ کا حال سن کر مجھ کو

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا ولایت آنا ہی رائیگاں گیا۔ کتابیں بھیجنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ پمفلیٹس بھیجنے کو کہا تھا مگر پھر صدائے برنخاست۔ خیر کتابیں نہ بھیجو، نہ بھیجو۔ روپیہ یہاں سے جانے میں بڑی دقتیں ہیں۔ ان کے اخراجات میں اس کی گنجائش نہ ہو، یہ صحیح۔ مگر ویسے خط تو آتے جیسے وہ ہمیشہ لکھا کرتے تھے۔

ہما بیگم! اب دنیا کی ہر ہوس کم ہو گئی ہے مگر کتابوں کا شوق ویسا ہی ہے۔ مگر جانے دو اس ذکر کو۔ ہاں ہما ایک بات کہہ دوں۔ اگر تم نے اپنا پیٹ کاٹ کر یا بغیر پیٹ کاٹے ہی سہی تم نے کوئی کتاب بھیجی تو خدا اور رسول کی قسم! مجھ کو بڑی اذیت ہوگی۔ میں اپنے اللہ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میرا دل چاہے گا کہ دیوار سے سر پھوڑ لوں۔ اس لئے بیٹی میرے اوپر رحم کر کے ایسی بات نہ کرنا جس میں تمہارا باپ کمبخت بڑی شدید تکلیف میں مبتلا ہو جائے۔ اچھا سنو! ایک کہانی سنو۔ اپنے باپ کی جھپی تعریف سنو۔ چھ ہزار میل پر بیٹھی بیٹھی ایک بڑے مومن، خداشناس، سخی، عابد، زاہد کی غیبت کے مزے اٹھاؤ۔ اور گناہِ بے لذت کا پشتارہ باندھ کر میدانِ حشر میں لے جانے کا سامان کرو۔

ایک تھے لاڈلے نواب۔ رہتے تھے پٹنہ شہر میں۔ ننہال ددھیال کے بڑے امیر۔ مگر کچھ ایسا بجوگ پڑا کہ ان کے ماں کو نہ دادا کا ترکہ ملا نہ نانا کا۔ مگر پالے گئے ناز و نعم میں۔ آخر تھے نہ لاڈلے چھٹے ساتویں تک اسکول میں پڑھے اس کے بعد ڈنڈے بجانے لگے۔ ماں کے پاس پشتینی زیور وغیرہ کافی تھا۔ کسی چوہے کو ایک گرہ ہلدی کی مل گئی تھی، وہ پنساری بن بیٹھا تھا۔ اسی طرح نواب لاڈلے صاحب نے ایک بات سوچی۔ کہنے لگے۔ اماں! ایک ترکیب ہے۔ لاؤ اپنا زیور ہم کو دو۔ ہم جواہرات کی سوداگری کریں، تم کو موتیوں میں گوندھ دیں۔ سونے کا گھر بنالیں۔ ہن نہ برسنے لگے تب ہی نہ کہنا۔ اماں نے کہا بیٹا سچ مچ۔ کہنے لگے اور نہیں تو کیا۔ دے دو۔ آجکل مانک کے دام بہت چڑھ گئے ہیں۔ وہ تمہارا چند ن ہار ہزاروں کا بکے گا۔ کلکتہ کا ایک جوہری آجکل یہاں آیا ہوا ہے۔ بڑا دوست ہے ہمارا۔ ہم سے کہتا تھا کہ برما میں یاقوت کی تھیلیاں نیلام میں بکتی ہیں۔ ان میں بڑی چھوٹی چنیاں ہر طرح کی ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی اس میں کوئی بڑی کھڑ نکل آتی ہے۔ اگر نکل آئی تو اماں یہ جانئے کہ دن پھر گئے۔ نانا دادا والی ثروت پھر لوٹ آئی۔ نہیں تو نقصان کا ڈر تو ہے ہی نہیں۔ یہ دلی کے سادے کار جو چیزیں لاتے ہیں جیسی آپ کی مانک والی موتیوں کی جوڑیاں ہیں۔ ان چنیوں کے بازار میں یوں کوئی دام نہیں مگر جڑاؤ میں اٹھی کی قیمت دس گنی بیس گنی ہو جاتی ہے۔

تو بیٹا تم جواہرات کا حال جانتے بھی ہو۔ اور جو دھوکا ہوا ؟

جی نہیں دھوکا کیسے ہو سکتا ہے۔ بھلا مجال ہے کہ کوئی پتجپتا گلاب پتی کر کے بیچ جائے۔ دو پلکے کو پرب بتا دے، کا دمندب کو یاقوت کہہ جائے، پولکی کو کمل کہہ دے، اور ہم مان لیں۔

تو بیٹا تم تو بہت جانتے ہو۔ یہ سب کہاں سیکھا ؟ جی مجھ کو جواہرات کا شوق پیدائشی ہے۔ اور گھوم پھر کر بہت سی باتیں جانیں۔ یہی کلکتہ والا جوہری جو ہمارا دوست ہے اس سے روز باتیں ہوا کرتی ہیں۔ بیٹا گھر میں جو کچھ ہے تمہارا ہے۔ خوب سوچ سمجھ لو۔ جی، میں خوب سمجھے ہوں۔ آپ اطمینان رکھیں۔ محبّت کا پاؤں جہاں درمیان میں آیا عقل نے استعفا داخل کیا۔ ماں غریب کو یقین دلانا کتنی بڑی بات تھی۔ لاڈلے نواب صاحب جوہری ہو ہی بیٹھے۔ جتنے دن کر سکے جواہرات کا بیوپار کیا۔ مگر اتنی دلچسپیاں تھیں کہ وہی ہوا جس کا ڈر ان کی ماں کو تھا۔ پھر بھی دس پندرہ برس تو کٹ ہی گئے۔ اس درمیان میں بہت سا دل بستگیوں کا سامان ہو گیا۔ موسیقی، ستار نوازی، خوش خلقی، شاعری۔ یکے بعد دیگرے، دو شادیاں ہوئیں مگر ان کی زندگی بنی نہیں۔ دوسری بی بی ایک امیر خاندان کی تھیں۔ انھوں نے منھ نہیں لگایا۔ پہلی بی بی سے دو لڑکے بھی ہیں۔ مگر آج بی بی بچوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جیسے کوئی کہے کہ "فلاں شخص سے ریل پر کئی بار ملاقات ہوئی تھی مگر اب بہت دن ہوئے، شاید ہی پہچانیں۔ ہمارے حافظے میں بھی جو صورت ان کی ہے، اس سے تو اب بدل ہی گئی ہو گی۔" بھابیگم! مجھ کو لاڈلے صاحب کی کہانی بہت پسند تھی۔ مگر اب مختصر کئے دیتا ہوں۔ وہی شروع کی دور اندیشی سے دور، زندگی میں چانڈو پینے کی بھی عادت ہو گئی تھی۔ یہ واقعات بیس برس کے ہیں۔

دوسرا دور ———— محرّم کی پانچ تاریخ۔ میاں محمد علی باغ کی طرف کے برآمدے میں بیٹھے دوا بانٹ رہے ہیں کہ ایک صاحب آتے ہیں۔ گورا رنگ، لانبا قد، دانت گر چکے ہیں، منھ پر دو انگل کی داڑھی جیسے خط بڑھ گیا ہو۔ ایک نہایت پھٹی میلی سی اچکن پہنے، پاجامہ دونوں گھٹنوں پر پھٹا، جوتوں کی یہ حالت کہ پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر رکھتے ہیں، کرتہ ندارد، اچکن میں بھی صرف دو تین بٹن، ہاتھ کی مدد سے سینہ چھپائے ہوئے۔ بسم اللہ، بیٹھئے۔ لاڈلے صاحب کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اپنا حال کہنا شروع کرتے ہیں۔ میں سوز پڑھتا ہوں۔ شعر بھی کہتا ہوں۔ چودھری[1] ارشاد حسین صاحب کے یہاں کے محرّم کی بڑی تعریفیں سنی تھیں۔ آیا تھا کہ شاید کسی مجلس میں پڑھنے کا موقع مل جائے۔ مگر بدقسمتی سے ملاقات نہ ہو سکی۔ دن بھر دروانے

---

[1] ردولی کے بہت بڑے شیعہ تعلقدار۔

پر بیٹھے رہنے کے بعد اور عرضی لکھ کر دینے کے بعد پانچ روپے بھجوا دیئے اور کہلا بھیجا کہ جب تک لوگ کسی کا خط لے کر نہیں آتے یہاں داخلہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایک صاحب اسی طرح ٹھہرا لیئے گئے تھے۔ وہ صبح کو پلنگ پر کی دری اٹھا لے گئے تھے۔ اس لئے یہ قاعدہ مقرر ہو گیا ہے۔

محمد علی: کوئی سوز پڑھئے۔ جنگلا پیلو میں سوز شروع ہوتا ہے۔ قدیم سوز۔ ایسا خوبصورت بندھا ہوا کہ میر علی، شیخ عطا، مہدی بخش یاد آگئے۔ صحت کی راگنی، بلمپت کی گائکی۔ گلے کا نام نہیں۔ گانے سے ایسا علیحدہ جیسے رذیل سے شریف۔ ایسے خوبصورت کھٹکے، سُر کا سوت، استادی کی چھوٹی چھوٹی مرکیاں، خوش مذاقی کی ترکیبیں کہ واہ واہ۔ ہم آنسوؤں کے تریڑے خوب روئے۔ ہوری دھرپت بھی اسی ٹھاٹ کے گاتے ہیں۔ پھولتے پھلتے نہیں مگر واقف کار کہتے ہیں صحت ضرور ہے۔ شعر سے بھی مشق اور تلاش کا پتہ چلتا ہے۔ نہ مسطر نہ پرکار۔ قلم نہ روشنائی۔ خالی پنسل اور کاغذ سے وصلیاں اچھی بنا لیتے ہیں۔ اتنے ہنر ہیں اور یہ فلاکت۔ یہ بھی صفت ہے کہ اپنی مصیبت بیان کرنے میں مبالغہ بھی نہیں کرتے۔ بارہ دری میں ٹھہرا دیا۔ دوسرے دن لوگوں نے کہا کہ بارہ دری بھر میں چیلر ہی چیلر رینگتے ہیں۔ ان سے کہا گیا نہا ڈالیئے۔ نہائے، کپڑے بدلے۔ قیصر نے اوڑھنا بچھونا دیا۔ دوسرے دن کہنے لگے۔ آج دو برس کے بعد آرام سے رات کو سویا ہوں۔ کھٹملی کے مارے دو برس سے سو نہ سکتا تھا۔ ہما بیگم! جی ڈرتا ہے کہ کہیں اللہ میاں یہ نمونے اس واسطے تو نہ دکھاتے ہوں کہ دیکھ رکھو، کل تمہاری بھی یہی گت ہو گی۔

چھبن زیارت کے لئے جا رہی ہیں۔ کہتی تھیں ہما کو خط نہ لکھا۔ ان کو لکھ دینا کہ معاف کریں۔ اب چھبن بھی چلی جائیں تو تمہاری بو بو مرحومہ کی نشانی ہماری کمائی کے جابر رہ جائیں گے۔ اللہ میاں شکر ہے تیرا یہی غنیمت ہے۔ قیصر بہت بہت دعا کہتی ہیں۔

ہاں وہ لاڈلے نواب والا سوز تو لکھ دیں۔

عید کا دن عشرۂ ذی الحجہ مقرر کیوں ہوا ایک شہزادہ، نبی زادہ چھری سے بچ گیا
کرتے ہیں اس کے عوض میں مومنیں دنبے فدا عشرۂ ماہِ محرم کیا قیامت روز تھا
رحمتہ للعالمینؐ کا قتل دل جانی ہوا بھوکا پیاسا فاطمہؓ کا لال قربانی ہوا

بس بی بی خط ختم کرتا ہوں۔ راقم: تمہارا خادمِ دیرینہ، تمہارا باپ

(۳)

ردولی ۔ مارچ ۱۹۵۰ء ۔ ہما پیاری! تمہارے تین خطوط آئے ۔ میں اسپتال میں تھا ۔ گو اچھا تھا اور اچھا ہوں مگر طبیعت کو بہانہ ہاتھ آگیا تھا ۔ اس لئے جواب نہیں لکھا تھا ۔ دوسرا خط بڑی بے چینی کا آیا تھا ۔ اس لئے اُس کا جواب لکھ دیا تھا ۔ تمہارے تیسرے خط کے روانہ ہونے کے بعد پہنچا ہوگا ۔ میں اسپتال میں ایک مہینہ کچھ دن رہ کر چلا آیا تھا ۔ پھوڑوں کے زخم اب بھی باقی ہیں ۔ مگر نہ ایک دن چلنا چھوٹا ، نہ ہنسنا بولنا کم ہوا ۔ صورت سے بیمار نہ تب کوئی کہہ سکتا تھا نہ اب ۔ ڈاکٹر لوگ کہتے ہیں زخم کے اندمال میں بڑھاپے کی وجہ سے دیر ہو رہی ہے ۔ جسم کا حال روح کے مقابلے میں پھر بھی غنیمت ہے ۔ روحی تکالیف کی برداشت صرف اس وجہ سے قبول ہے کہ جانتا ہوں آگے اور زیادہ ہونے والی ہیں ۔ کہاں تک دکھڑا روؤں ۔ جانے دو ، جب انگلستان میں فاتحین کا یہ حال ہے جو تم نے لکھا ہے تو ہم لوگ کس گنتی شمار میں ہیں ۔ دنیا کی حالت اُس بیمار کی ایسی ہے جو بیمار پڑا ہوا اور بدپرہیزی نہ چھوٹے ۔ اصغر علی محمد علی کا نام جانتی ہو ۔ محمد علی مرحوم کو شراب کی لت تھی ۔ بیمار ہوئے ۔ ڈاکٹروں نے کہا پیوگے تو مر جاؤگے ۔ مگر نہ چھوٹی ۔ آخر وقت میں جب صاحبِ فراش ہوگئے ۔ گھر والوں نے حکم ماننا چھوڑ دیا ۔ کوٹھے پر رہتے تھے ۔ کھڑکی گلی میں تھی ۔ چھت یقیناً نیچی رہی ہوگی یا نیچے تہہ خانہ رہا ہوگا ۔ کیونکہ کھڑکی قدِ آدم سے کچھ ہی اونچی رہی ہوگی ۔ کسی کو اشارے سے بلایا ۔ دوگنی قیمت دی کہ ایک بوتل لا دو ، اور ہاتھ بڑھا کر ادھر ہی سے دیدو ۔ صبح کو دیکھا گیا کہ بوتل بغل میں پڑی ہے ۔ شراب جو پیٹ میں نہ پہنچ سکی تھی بستر پر بہہ چکی ہے ۔ اور وہ جاں بحق تسلیم کر چکے ہیں ۔ یہی حالت دنیا کی ہونے والی ہے ۔ جس چیز نے انسان کو اس قدر نقصان پہنچایا ہے ، وہ مشین ہے ۔ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ، جتنا غور کروگی اتنا ہی نقصان مشین کا کھلتا جائے گا ۔ مگر بدپرہیزی میں وہ مزا ہے کہ بیماری اور موت اس کے اوپر صدقے اتاری ہیں ۔ ہما بیگم! یہ خط آج کئی روز ہوئے لکھا تھا مگر جی چاہتا تھا کہ ابھی اور لکھوں تب بھیجوں ؂

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم　　　چناں کہ لفظِ عصا گفت موسیٰ اندر طور

مگر جی کی گھبراہٹ لکھنے سے روکتی رہی ۔ اس وقت صبح کے چھ بج کر کچھ منٹ آئے ہیں ۔ آفتاب کی روشنی پھیل چکی ہے ۔ مگر چمک صرف اب دکھائی دیتی ہے ۔ ابھی ابھی کامنی کی خوشبو آئی تھی ۔ سامنے گلاب ، رنگین مٹر اور بینیا ڈائمنتھس ، بینا نٹ ، ڈیلیا کھلے ہیں ۔ اور میں یہ لکھ رہا ہوں ۔ اکثر نماز کے بعد اور سوتے وقت

عموماً وہ دعا ضرور پڑھتا ہوں، جو رسول اللہ ؐ نے بعد فتح مکہ پڑھی تھی۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ اَنْجَزَ وَعْدَہٗ الخ۔

ہر طرح کے مصائب اور آلام میں رکھ کر خداوند تعالیٰ آرام سے میری زندگی گزار رہا ہے۔ اس کا ہزار ہزار شکر ہے۔ بس بی بی خدا حافظ۔ پورا خط انانیت سے بھرا ہے۔ اس لئے ختم کرتا ہوں۔ تم اپنا حال لکھ لکھ کر مجھ کو خوش کیا کرو۔ ہاں بی بی اَلَمْ تَرَ کَیْفَ اکثر نماز میں پڑھتا ہوں۔ یوں بھی اس کی مزاولت رکھتا ہوں۔

راقم: تمہارا خادم بے خدمت، محمد علی عفی عنہ۔ ۱۶ مارچ ۱۹۵۰ء

(۴)

اپریل ۱۹۵۰ء۔ ردولی۔ میری جان! دعا۔ تمہارے خط کا جواب سر آنکھوں سے لکھوں۔ مگر بجنّ وغیرہ کو خط لکھتے نہیں بنتا۔ ان کا خط آٹھ دس دن ہوئے آیا تھا۔ جواب اسی وقت لکھا مگر ڈاک میں ڈالنے کی جرأت آج تک نہ ہوئی۔ وجہ کیا کہ جبّن کا جانا ویسے ہی ہوا تھا اور دل بہت بھرا تھا۔ میں نے کہا ایسا خط بھیجوں گا تو بجنّ غریب کو خدا واسطے کو رُلاؤں گا۔ اس لئے نہیں بھیجا۔ اب یہ ناتمام خط تم کو بھیجے دیتا ہوں۔ اُن کو تار بھیج دیا ہے۔ تمہارا خط سلمان کی وکالت میں پہنچا۔ سلمان کے پر ہمیشہ مجھ کو فخر اور ناز رہا ہے اور رہے۔ اللہ میاں کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھ کو ایسا لڑکا عطا ہوا۔ مگر پیاسا بغیر پانی کے تسکین نہیں پاتا۔ اس وقت تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہزار مصروفی ہو، ایک پوسٹ کارڈ تو بس میں بیٹھے بیٹھے بھی لکھ سکتے تھے۔ اگر اس طرح کا سرسری لکھا ہوا پوسٹ کارڈ آتا تو الجھن ہوتی کہ آکسفورڈ کا ایسا خط کیوں نہیں آتا ہے

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

خیر ہوگا۔ جانے دو۔

اچھا اب اور سنو۔ آج پانچ دن ہوئے، میں لکھنؤ گیا۔ وہاں سوچا سنگھ سے ملاقات ہوئی۔ دیڑا اُن کی آئرش بی بی تو چلی گئیں (اگر کہیں لندن میں ملاقات ہو جائے، تم سے یا سلمان سے تو میرا اسلام کہہ دینا) اب سوچا سنگھ نے دوسری شادی کی ہے۔ قد اس کا لمبا ہے۔ رنگ بھی صاف ہے۔ مزاج بھی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ہے۔ تم نے لکھا تھا کہ یہاں ہر شخص اچھا ہے۔ اور دوسرے کی امداد کرنے پر تیار ہے۔ بی بی یہ خصوصیت، ماننا پڑے گا کہ کی برکت ہے۔ ان لوگوں

میں رواداری، برداشت، خدمت کی تربیت مذہب کی بنا پر دی جاتی ہے۔ اور چونکہ زندہ قوم ہے اس لیے ان چیزوں کا اثر بھی قبول کر لیتی ہے۔ یہی حال سوچا سنگھ کی نئی بی بی کا معلوم ہوتا ہے۔ ہما بیگم! تم بحیثیت مسلمان ان باتوں سے نادم نہ ہو۔ جب اللہ بخشے مسلمان زندہ تھا تو اس میں دوسرے قومی صفات تھے۔ بہادری، جوانمردی، ایمانداری، صداقت، خوش معاملگی۔ آج انگلستان، جرمنی، امریکہ، اسپین میں بھی ہو مگر وہ Honesty is the best Policy کی بنا پر معلوم ہوتی ہے۔ اور مسلمانوں میں Honesty is its own reward کی بنا پر تھا۔ ہمارے بچپن میں ایک مسیح نانا تھے۔ ابا مرحوم کے قریبی رشتے سے ماموں ہوتے تھے۔ دکھن اور سنا ہوگا۔ قائم ماموں کی بی بی تم کو یاد ہوں گی۔ وہ اسی گھر کی تھیں۔ یہ جب مرض الموت میں گرفتار ہوئے تو ایک ڈولی پر چڑھ کر ردولی میں نکلے اور جس جس بنئے اور مہاجن سے ان سے بیوپار تھا سب کے یہاں گئے اور معاملہ چکایا۔ ہر شخص سے معاملہ چکایا۔ ہر شخص سے کہا سنا معاف کروایا اور مر گئے۔ آجکل ایک مثل کبھی کبھی سنائی دے جاتی ہے۔ مگر شاذ و نادر۔ "ابے میاں مسلمان ہو کر جھوٹ بولتے ہو۔" جب ہم زندہ تھے اس وقت ہم میں یہ صفات تھے۔ ہندو آج بدل گیا ہے مگر رواداری، دان پن۔ ہر مذہب میں خوبیاں دیکھ لینا۔ خونخواری کے دور کے پہلے دل میں اہمسا کی منزلت یہ ہندو کی قومی خصوصیتیں تھیں۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِيْنَ (اگر املا غلط ہو صحیح کر دینا) ہاں بھئی سلمان سے کہنا کہ کتابیں بھیجنے کی تکلیف نہ کریں۔ یہاں سے روپیہ بھیجنا بہت مشکل ہے۔ اور وہاں یہ حال ہے کہ وہ گرجا کے چوہے ہو رہے ہیں کہ اللہ رزاق ہے۔ ورنہ گرجا میں روٹی کا ٹکڑا ابھی نہیں نصیب ؎

درم و دام اپنے پاس کہاں   چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

جو کچھ ملا کھا گئے۔ چیونٹی کی طرح ذخیرہ کرنا بلند پروازوں کا کام نہیں۔ اگر کتابیں آئیں گی تو میرا دل کڑھے گا کہ غریب نے تکلیف ہی اٹھا کر بھیجا ہوگا۔ اچھا اب ایک اور قصہ سنو۔ ہم گئے سوچا سنگھ سے ملنے سلیم پور ہاؤس میں۔ وہاں ایک لڑکی دیکھی جس نے مجھ کو پہچانا اور میں نے بھی اس کی صورت اچھی طرح پہچانی مگر اور کچھ یاد نہ آیا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے شوہر نے آکر کہا بی بی کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے۔ میں سمجھا ہسٹریا ہوگا۔ دوسری صبح کو مع قیصر کے پھر سوچا سنگھ کے یہاں گیا پھر وہ لڑکی ملی۔ لڑکی کا ہے کو تین بچوں کی ماں ہے۔ مگر صورت سے لڑکی ہی معلوم ہوتی ہے۔ اس نے کہا کل میں آپ کو

دیکھ کر بیتاب ہو گئی۔ کیونکہ آپ کو دیکھ کر مجھ کو میرے باپ یاد آگئے۔ اس نے بیان کیا کہ ہم لوگ پھر سَر کے رہنے والے ہیں۔ پھر سَر اور بڈّاور گاؤں سادات صحیح النسب بھرتپور میں واقع تھے اور واقع ہیں۔ ان لوگوں میں بڑے بڑے لوگ ہوئے ہیں۔ سیّد آلِ نبی، سیّد ابو محمد، سیّد آلِ محمد وغیرہ وغیرہ۔ دو برس اُدھر خونخواری کے دور میں یہ سب تباہ ہو گئے۔ نہ معلوم کتنے گھر کھُد گئے۔ کتنے لوگ ختم ہو گئے۔ کتنی عورتیں اِدھر سے اُدھر ہو گئیں۔ جو بچے وہ بھاگ گئے۔ تم سمجھتی ہو کہ میرا کیا حال تب سے ہے ؎

بنفشہ طرّۂ مفتول خود گرہ میزد ۔۔۔ صبا حکایت زلف تو در میاں انداخت

گو میری مصیبت اس کے عشرِ عشیر بھی نہ تھی۔ مگر مجھ کو تم لوگ یاد آگئے۔ اب میں نے بھی اس کو لکھا ہے کہ بی بی میں جے دن بھی زندہ ہوں مجھ کو اپنا باپ تصور کر و اور میرے گھر کو اپنا میکہ بناؤ۔ تمہاری ایسی مصیبت خدا کسی پر نہ ڈالے۔ مگر میرے موتی بھی دنیا بھر میں بکھرے پڑے ہیں۔ میں بھی اپنے پیاروں کو دیکھنے کو ترستا ہوں۔ گو خدا کی ذات سے نا امید نہیں کہ شاید کبھی دن پھریں اور آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔" جب تک سانس تب تک آس"۔ ہما بیگم ؎

اتنا پیغام درد کا کہیو ۔۔۔ گر صبا کوئے یار میں گزرے

کون سی رات آن ملئے گا ۔۔۔ دن بہت انتظار میں گزرے

اچھا چھوڑو اس قصّے کو بھی۔ آج چار پانچ دن ہوئے ایک صاحب سے میں اپنی سیاہیٔ قلب اور باوجود لَا تَقْنَطُوْا کے، اپنے اعمال کی وجہ سے اپنی مایوسی اور اللہ میاں سے دوری کا حال کہہ رہا تھا۔ انھوں نے کہا وَالضُّحٰی پڑھا کرو۔ واہ واہ وا۔ ہما بیگم ؎

بیٹھے بیٹھے کچھ مزا ہم کو بھی اب آنے لگا ۔۔۔ اب تو ہم بھی دردِ دل میں مبتلا ہونے لگے

اب ایک اور مصیبت آن پڑی۔ اللہ میاں سے ہر گھڑی دعا مانگا کرتا ہوں کہ اللہ میاں غرور گھمنڈ سے بچا۔ لاحول ولا قوۃ۔ انجن چھوڑ گھسیٹی میں پڑ گئے۔

محمد علی عفی عنہ

(۵)

میری جان! دعائے بے اثر حاضر ہے۔ کچھ آدمی کی طبیعت عجیب بنی ہے۔ اُسی خط کو پڑھ کر آرام بھی ملتا ہے جس سے چوٹ لگتی ہے۔ اگر چوٹ نہ لگے تو مٹھاس کا مزا بھی نہ آوے۔ انگریزی میں ایک دوا ہوتی ہے "ڈلکمارا"۔ اس کے لفظی معنی ہیں بیٹھا کڑوا۔ بس یہ سمجھ لو کہ دل کا لگاؤ وہی ڈلکمارا ہے۔

پوچھو تم وہاں بیٹھی ہوئی، میں یہاں دن کاٹ رہا ہوں۔ اور مٹھاس کڑواہٹ ملی جلی زندگی کی حلاوتیں۔ زندگی کی تلخیاں اپنا کام کر رہی ہیں۔ کسی چیز پر اختیار نہیں۔ کسی چیز پر بس نہیں۔ آدمی مجبور مگر بدقسمتیوں پر، سوئے اتفاقیوں پر، خلاف مزاج باتوں پر ایسا تعجب ہوتا ہے جیسے گیہوں بیچے تھے اور دام نہیں ملے بقول کسی کے: بارِ الہٰا کہاں سے۔ بارِ الہٰا کہاں کو؟ کیوں۔ کس واسطے؟ یہ تکلیفیں کیوں؟ یہ آرامیں کیوں؟ یہ آراموں تکلیفوں کی کھچڑی کیوں؟ عقل مفلوج ہے۔ منطق خاموش ہے۔ تجربہ حافظہ کھو بیٹھا ہے۔ سمجھ مبہوت ہو گئی ہے۔ اِدھر پردۂ راز ہے۔ اُدھر پردۂ راز ہے۔ معلوم نہیں کیسے آئے۔ معلوم نہیں کیسے جائیں گے۔ کہاں سے آئے، کہاں کو جائیں گے۔ حیرت کا بازار ہے۔ گورکھ دھندوں کا بیوپار ہے۔ خواب میں خواب دیکھ رہے ہیں ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

گوتم بُدھ کہتے ہیں خواہشوں کو چھوڑ دو۔ کیا سہل ٹٹکا بتا دیا ہے۔ انھوں نے کہا اور ہم نے کیا۔ بھلا اسباب و علل نے ہم کو اس قابل بھی رکھا ہے کہ ہم گوتم بُدھ کی صلاح پر کاربند ہوں۔

تمہاری بو بو مرحومہ حضوری کا حلوہ بنا رہی تھیں۔ مرزا سلطان علی مرحوم کی بی بی مرحومہ بیٹھی منھ دھو رہی تھیں۔ مالن سہرے لے کر آئی۔ تمہاری بو بو نے کہا: "اے چھپی ذری غوطے دے کر سہرے تعزیوں پر چڑھا دیجیے۔" کہنے لگیں۔ "دلہن! جو اس جوگے ہوتے تو اپنے ہی گھر میں عزاداری نہ کیا کرتے۔" اسی طرح ہم بھی اگر اسی جوگے ہوتے تو اُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ پر کاربند نہ ہوتے؟ میری بیٹی! لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ کی مزاولت کرو ؎

ہر آنچہ آید ت از غیب نیک و بد منگر ہمیں بس است کہ از کوئے دوست می آید

یہاں سب خیریت ہے۔ ہولو کی دوسری لڑکی کو پیچش ہو گئی ہے۔ قیمر ایسا کر رہی ہیں جیسے معلوم ہوتا ہے چھبّن ہو گئی ہیں۔

راقم: تمہارا باپ عفی عنہ۔ ۲۲ر جون ۱۹۵۱ء

(۲)

ردولی۔ نومبر ۱۹۵۱ء۔ ہما پیاری! دعائیں پیش کش ہیں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ۔ اما بعد! واہ بیگم تم بڑی منشی ہو۔ نئے نئے گوشے، نئے نئے زاویے ڈھونڈ نکالتی ہو کہ بڈھے باپ کا جی خوش کر دو۔ خیر اللہ تم کو خوش رکھے جیسے تم دوسروں کا جی خوش کرتی ہو۔ کل کا دن میرے

لئے بڑا اچھا تھا۔ صبح کو فیض آباد گیا تھا۔ آفاق کو ڈاکٹر کو دکھانا تھا۔ وہاں سے واپس آکر چار خط اور ایک تار ملا۔ تار بجن کا تھا کہ آپریشن ہو گیا۔ سب خیریت ہے۔ تمہارا خط تھا جس کا حال تم کو بھی معلوم ہے۔ اور میرا دل بھی مزہ لیتا ہے۔ ایک خط مرزا عسکری صاحب مدظلہ اللہ تعالیٰ کا آیا۔ میں نے ان کو رسالہ بھیجی تھی۔ لکھتے ہیں "خدا تم کو سلامت باصحت وعافیت، باقبال اور خوش دل وخوش حال رکھے۔ اس زمانے میں جب کہ نفسا نفسی، کشمکش اور بے تعلقی حد درجے کو پہنچ گئی ہے، تمہاری قدیم طرز روش اور پرانی چال یعنی سابق دوستوں اور محبت رکھنے والوں کا خیال تمہارا ہی کام ہے۔ اس پاسِ وضع اور دلی محبت کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ بہت دنوں سے نہیں ملے، دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔"

آلِ رضا کی نظم پڑھ کر ایک عجیب کیفیت دل میں آئی۔ بعض درمیانی مصرعے اور آخری بند نے دل کو اللہ میاں کا گھر بنا دیا۔ تنقیداً نظر کرنے سے آلِ رضا کے دلی کیفیات کا اندازہ ہوا کہ بیچارے کے دل میں وہاں پہنچ کر نہ معلوم کیا تلاطم رہا ہوگا۔ انھوں نے ہزار بیان کرنے کی کوشش کی ہو مگر اس وقت کا دماغ اس وقت کا دل کوئی کیا سمجھ سکتا ہے۔ نہ معلوم کیا جھلا تو پڑا ہوگا۔ ارے یہ جھلی پکڑوں کہ وہ۔ ارے وہ مچھلی دیکھو۔ چاندی ایسی چمکی۔ اس کو چھوڑ اسی کو لے لوں۔ دونوں لے لوں۔ قصہ مختصر ع

بڑھ گیا لوٹ میں شبیر کا مہماں ہو کر

اگر عقیدہ عمدہ ہو تو زندگی کی یہ گھڑیاں جنت سے آتی ہیں۔ ہم ملحد، بے ایمان امام حسین کو نہ معلوم کس زاویے سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست نے کربلائے معلیٰ سے خط لکھا۔ تھوڑی دیر کے لئے دل پر کچھ خفیف سا اثر ہوا۔ میں نے ان کو حسب ذیل لکھا تھا ؎

گرچہ دوریم از بساط قرب ہمت دور نیست بندۂ شاہ شمائیم و ثنا خوانِ شما

اتنا میری طرف سے بھی عرض کر دیجئے گا کہ یہ نادیدہ غلام آپ کا "مقام شبیری کو مقام ابدی جانتا ہے۔" لیکن ایک کمی ہے جس کی وجہ سے اپنے کو غلامانِ غلام میں گنتے کانپا جاتا ہوں۔ وہ یہ کہ نامرد ہوں، ہیٹر ہوں، ڈرپوک ہوں، ان کیڑوں میں ہوں جن کے ریڑھ کی ہڈی نہیں ہوتی۔ بھلا آپ کی غلامی کا دعویٰ اور ڈر۔ لاحول ولا قوۃ! میرے آقا! میرے خداوند نعمت! میرے قائد! میرے راعی! چاروں طرف ظلم کا کمال اور حق کو پامال دیکھتا ہوں اور مجھ سے چھوٹی سے چھوٹی قربانی نہیں ہو سکتی۔ ذری اللہ میاں سے کہہ دیجئے کہ بس اتنا چاہتا

---

[1] کربلائے معلیٰ

ہوں کہ بڑی سے بڑی نہ سہی اللہ میاں کے حکم پر اور آپ کا نام لے کر کچھ چھوٹی ہی چھوٹی قربانیاں کر لوں۔ ایاز قدر خود بشناس۔ اپنی حیثیت سے بڑھ کر بات نہیں کرتا۔ یہ نہیں کہتا کہ سر کی قربانی مجھ سے ہو جائے۔ بال بچوں کو اس کی راہ پر قربان کر دوں۔ گھر بار لٹا دوں۔ بس اتنا چاہتا ہوں کہ لوگ پہچان جائیں کہ یہ کس کا غلام ہے؟ ابھی آفاق نے اس دن جگر کا شعر پڑھا تھا ؎

تری خوشی سے اگر غم میں بھی خوشی نہ ہوئی یہ زندگی تو محبت کی زندگی نہ ہوئی

میں نے کہا یہ شعر ایسا ہے کہ جا ہے پلنگ پر دا ہنی کروٹ لیٹ کر پڑھو چاہے کربلا کے میدان میں تڑپ کر پڑھو آنسوؤں کا تو سستا سودا ہے، وہ تو سہل ہیں۔ دل بھی بے چین ہو جاتا ہے۔ مگر امام علیہ السلام کا نام بھی لے کر ہمت قربانی کی نہیں بندھتی۔ اسی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ جمع خرچ ہے، زبانی ہے۔ اگر دل سے ہوتا تو کبھی نہ کبھی کچھ تو ہو جاتا۔ بس یہی دعا میرے لئے مانگے گا۔

بدرل، آفاق، قیصر، جابر، سعید سب تم کو دعا اور سلام اور ہر ایک کی مزاج پرسی کرتے ہیں۔ للن اور گجن، کاظم اور سب کو بہت بہت دعا۔ محمد علی عفی عنہ

(۷)

۱۸ مئی ۱۹۵۲ء۔ میری جان! دعا۔ ہم سے تم سے ملاقات ہو کر نہ ہو۔ مگر ہمارے تمہارے خطوط تو اکثر راستے میں آتے جاتے مل لیتے ہیں۔ چنانچہ گزشتہ بار بھی شاید یہی ہوا ہو۔ جس دن میں نے تم کو خط لکھا، اس کے دوسرے دن تمہارا خط آ گیا۔ اسی وجہ سے تمہارے آخری خط کا جواب دیر سے دے رہا ہوں۔ تمہارے خط سے اور شاید گجن یا چھبن کے خط سے معلوم ہوا کہ میاں سلمان نے کسی غنے میں آ کر ردولی کا خیال کیا ہے۔ حالانکہ دوا کی دوری کی وجہ سے بجری کی بیماری نے مزمن صورت اختیار کر لی ہے۔ اور اگر نہ بھی آئیں تو حادثہ بیماری کی ایسی بے چینی نہیں ہے۔ پھر بھی غالب کا شعر دماغ میں اکثر گھوما کرتا ہے ؎

اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے جیتے تو ہم تم سب کہ بت غالیہ مو آئے

۱۹ مئی۔ یہ خط کل شروع کیا تھا۔ اس وقت دماغ میں نہ معلوم کیا خیالات آ رہے تھے۔ آج دوسری صبح دوسرے خیالات۔ ۲۲ مئی کو پھر لکھتا ہوں۔ گرمی کی وجہ سے قلموں میں روشنائی خشک ہو ہو جاتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کچھ تو واقعہ اور کچھ شاعری۔ جب تک غم نویسی نہ کرو اور اس میں مذاق کی چاشنی نہ ملاتے جاؤ عبارت کی دلہن خوب سنورتی نہیں۔ اور تم ٹھہریں شیخ سعدی کی شاگرد۔ نصیحت شروع کر دیتی ہو اور توکل کا سبق

پڑھانے لگتی ہو۔ توکل جیسے حکیم صاحب کا نسخۂ جلاّب کا بڑا سا قدحہ، گو جانتے ہیں کہ فائدہ کرے گا۔ تیمار دار بھی کہتے ہیں کہ اللہ شافی بسم اللہ کافی۔ آنکھیں بھینچ کر ناک بند کرکے پی جاؤ۔ اصلاً اس بہت فائدہ کرتا ہے۔ ہم بھی جانتے ہیں کہ پینا ہی پڑے گا۔ مگر پھر بھی طبیعت بھاگتی ہی رہتی ہے۔ اور یہی حال آپ کے توکل کا ہے۔ اور یہاں دل یہ چاہتا ہے کہ تیمار داری میں وہی اتھاک رہے مگر دوا اگر گریمالٹ شربت نہ ہو تو دواء المسک ہی سہی۔ یہ توکل کی آن تو نہیں ہو سکتی۔

ادھر میں نے دو تین خطوط لکھے جو اچھے خاصے تھے۔ ایک عسکری صاحب کو حیدر آباد لکھا تھا۔ اس کی نقل تو رکھ لی ہے مگر کچھ فرق نقل کرنے میں رہ گیا ہے۔ ایک خط میجر ابو جعفر صاحب کو لکھا۔ یہ اسحٰق علی مرزا کے سمدھی ہیں۔ بڑے پڑھے لکھے۔ بڑے عمدہ لکھنے والے، بڑے لاجواب مقرر، نہایت شائستہ، نرمی سے باتیں کرنے والے، مذاق کی چاشنی کے مزے سے واقف۔ قصہ مختصر بہت سے صفات سے متّصف۔ اپنے خیال میں وسیع النظر شیعہ ہیں۔ "میرا مذہب" کو نہیں پسند کیا۔ اور بدرل کو لکھا کہ چودھری صاحب پکے شیعہ ہیں۔ اور تقیہ کرتے ہیں۔ اپنے فطری تقاضے سے جو بات ناگوار بھی ہوتی اس کو نرمی سے کہہ گئے۔ ایک ہمارے نئے دوست پیدا ہوئے ہیں، ان کا نام ولایت حسین ہے۔ نوجوان آدمی ہیں۔ بی۔ اے۔ ہیں۔ سو سوا سو کے نوکر ہیں۔ ہمارے اوپر عاشق ہو گئے ہیں۔ باپ نے دوسری شادی کر لی اور پاکستان چلے گئے۔ یہاں صرف ایک چچا ہیں۔ وہ کچھ خفیف سی جائیداد کی وجہ سے ان کے خلاف ہیں۔ بیچارہ اپنے کو اسی طرح بے یار و مددگار پاتا ہے جیسے کوئی جہاز ہو اور بیچ سمندر میں اس کا قطب نما ٹوٹ گیا ہو۔ شادی کرنا چاہتا ہے مگر نہ معلوم کیا ڈھونڈتا ہے کہ کہیں نہیں پاتا۔ ناتجربہ کاری میں بے عیب ساتھی کا متلاشی ہے۔ میں اس سے کہنے والا ہوں کہ بیٹا تم کو اگر بے عیب ذات کی تلاش ہے تو اللہ میاں سے نسبت کر لو۔ اپنے کو ایسا بے یار و مددگار پاتا ہے کہ ایک دوست کے یہاں رہتا ہے اور وطن میں مسافرت کا مزہ چکھتا ہے۔

ہماری کتابوں پر "نگار" نے جو کچھ لکھا ہے، وہ مجھ کو بہت پسند آیا۔ تمہارے لئے نقل کر کے بھیجتا ہوں۔ میری جان! لکھنے کو کہو تو تم کو عمر بھر خط لکھا کروں۔ اور پھر بھی بہت کچھ لکھنے کو رہ جائے۔ مگر گرمیوں سے حواس باختہ ہیں۔ آرام کی عادت ڈال لی ہے۔ بقول تمہارے یہ سب مصیبتیں خود ساختہ ہیں۔ بس اللہ اللہ خیر سلّا!

"میرا مذہب"۔ اس کتاب میں چودھری محمد علی صاحب، رئیسِ ردولی نے اپنے مذہب نہیں بلکہ اپنے

مشرب کو پیش کیا ہے۔ اور یہ مشرب وہی ہے جس کا بیدلؔ نے اس طرح ذکر کیا ہے۔ ع

مشربِ پروانہ از آتش ندانند طور را

چودھری صاحب مذہبًا اثنا عشری جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ دنیا کے ہر تعلق کو انسانی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اس لئے ان کا مذہب بھی دراصل انسانیت پر مبنی ہے۔ جس کا دوسرا نام میری اصطلاح میں لامذہبیت ہے۔

چودھری صاحب کا اندازِ تحریر سب سے انوکھا ہے۔ وہ لکھتے نہیں بات کرتے ہیں۔ اور جس نے انھیں بات کرتے سنا ہے وہی سمجھ سکتا ہے کہ منھ سے پھول جھڑنا کسے کہتے ہیں۔ چودھری صاحب نے اس کتاب میں تبرّا، تناسخ، عزاداری، متعہ سب ہی مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اور اتنے حقیقت افروز انداز میں کہ سنّی اسے پڑھ کر شیعہ ہو سکتا ہے اور شیعہ سنّی۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد میں دیر تک سوچا کیا کہ اگر ہر شیعہ محمد علی ہو جائے اور ہر سنّی نیاز فتحپوری تو کیا ہو؟ شاید کہ دنیا بے دین اور رہنے کے قابل!

"کشکول"۔ یہ کتاب بھی چودھری محمد علی صاحب رئیس ردولی کی ۳۵ مستحضرات کا مجموعہ ہے۔ جس میں سے اکثر ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کا نام فاضل مصنف نے اپنے موجودہ رجحاناتِ تصوّف کی بنا پر کشکول رکھا ہے۔ اور خوب ہے۔ لیکن غالبًا "ملفوظاتِ محمد علی شاہ" زیادہ موزوں نام ہوتا۔ کیونکہ جیسا کہ ابھی عرض کر چکا ہوں۔ وہ لکھتے نہیں بلکہ بات کرتے ہیں۔ اور ان کی ہر بات پر غالبؔ کا یہ شعر سامنے آجاتا ہے ؎

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

چودھری صاحب بڑے وسیع المطالعہ انسان ہیں۔ اور مشرق و مغرب کی شاید ہی کوئی قابلِ ذکر کتاب ہو جو ان کی نگاہ سے نہ گزر چکی ہو۔ پھر لطف یہ کہ جو کچھ انھوں نے پڑھا ہے وہ آج بھی مستحضر ہے۔ ان کی ہر بات نفسیات، فلسفہ، ادب، معاشرت، لطف زبان اور لطیف مزاج کا ایسا لطیف مجموعہ ہوتی ہے کہ انسان اس سے مسحور ہو جاتا ہے۔ چودھری صاحب شمالی ہند کے اس کلچر کا نمونہ ہیں جس کو دیکھنے کو آج آنکھیں ترستی ہیں۔ وہ نوجوان، بچّوں اور بوڑھوں میں ہر جگہ اپنی جگہ پیدا کر لیتے ہیں۔ اور ہر شخص متمنّی رہتا ہے کہ وہ کچھ کہیں اور ہم سنیں۔ پھر ان کی گفتگو فضول وقت گزاری نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اس میں ایسے ایسے نفسیاتی اور ادبی نکتے بیان کر جاتے ہیں کہ سن کر لطف آجاتا ہے۔ یہ کتاب ایسے ہی نوادر سے لبریز ہے۔ ابتدا میں

صلاح الدین احمد صاحب نے اپنے مقدمے میں نہایت قابلیت کے ساتھ چودھری صاحب کی ادبی خصوصیات پر نظر ڈالی ہے۔ جو بجائے خود ایک بڑا اچھا انتقادی شاہکار ہے"۔

نیاز فتحپوری نہایت بے پیرے ہیں۔ یہ کسی کی رعایت مروّت پاس نہیں آنے دیتے۔ بی بی میں مغرور ہو گیا۔ آج نماز کے بعد میرے لئے استغفار نہ بھول جانا۔ اور اگر تم بھی کچھ افتخار کر بیٹھی ہو تو اپنے لئے بھی توبہ کر لینا۔ ہم نماز کے بعد پہلے ہی سے دعا مانگتے ہیں کہ بارِ الٰہا! غرور، اوچھاپن، انانیت دور کر دے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ قبول دُبول نہیں ہوتی۔ آئندہ خط میں اگر موقع ہوا تو پوری دعا لکھوں گا، جو میں اللہ میاں سے مانگا کرتا ہوں۔ مگر ابھی تک تو بن سکھاری ہنڈی ہی معلوم ہوتی ہے۔ "میرا مذہب" کی تعریفیں اور مذمتیں ہوتی ہیں۔ کبھی موقع ہوگا تو وہ بھی سن لوگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ!

میری جان! اب تم لوگوں کو دیکھنے کو دل بہت چاہتا ہے۔ ع بہت دن بیتے سیاں کو دیکھے!

دعاگو: محمد علی عفی عنہ

(۸)

ردولی۔ ۷ مئی ۱۹۵۲ء۔ میری جان! دعائیں حاضر ہیں ؂

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف　　آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ واقعی میرے دل میں درد اٹھا ہے اور حکیم ڈاکٹر چارپائی کے ارد گرد گھوم رہے ہیں۔ بلکہ صرف شاعرانہ پہلو سے درد ہو رہا ہے۔ تم کو تو کچھ لکھتے بھی ڈر معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ تم سے کوئی مصیبت بیان نہیں کی کہ تم نے توکّل کا راستہ دکھانا شروع نہیں کیا۔ حاجی ذاکر حسن مرحوم نے پیروئی جناب امیرؑ میں اپنا کھانا اٹھا کر فقیر کو دیدیا۔ اور غضب یہ کیا کہ روایت کی پوری پیروی کے شوق میں گھر بھر کا کھانا اٹھا کر دیدیا۔ دوسرے وقت بھی یہی کیا۔ اب تو لڑکے بہت بے چین ہوئے۔ وہ کہتے تھے ابّا بھوک لگی ہے۔ اور حاجی صاحب کہتے تھے کہ بیٹا کہو۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّد۔ جب وہ پھر رو رو کر کھانا مانگتے تھے تو ذاکر صاحب فرماتے تھے بیٹا کہو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ۔ وہ غریب سمجھتے تھے کہ اب کے ضرور پیٹ کی گھڑ جنّ کم ہو جائے گی۔ جب اس سے بھی کچھ نہ ہوتا تھا اور وہ پھر کھانا مانگتے تھے تو فرمایا جاتا تھا بیٹا کہو اَلْحَمْدُ لِلّٰہ۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ لڑکے زبانِ حال سے کہتے تھے۔ بھاڑ میں جائے یہ سب کچھ، ہم کو بھوک لگی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بھی اپنے توکّل کی تلقین سے مجھ سے بھی

کوئی کلمۂ کفر کہلانے پر تلی بیٹھی ہو۔ تم تو اس رنگ میں ہو اور بی کجن کو دیکھو، وہ کراچی میں بیٹھی بیٹھی تحریر فرماتی ہیں۔ کہ میاں جان میں نے سنا ہے کہ تم بہت بڈھے اور دبلے ہو گئے ہو۔ پوچھو! بڑھاپے میں کوئی دُبلا اور بوڑھا نہیں ہو جاتا تو کیا مسیں بھیگتی ہیں۔ جوانی میں ہمیشہ پہاڑ پر جاتے تھے۔ سال بھر کی تندرستی کا سامان جمع کر لیتے تھے۔ اب کی سال یہ ہے کہ پنکھا تلی بھی نصیب نہیں ہوا۔ زمیندار مقدمہ ہار گئے۔ انتہائی پہلی جولائی تک سب قصہ پاک ہو جائے گا۔ میں نے بہت دن ہوئے حافظؔ میں فال دیکھی تھی انھوں نے فرمایا تھا علاقے ضرور جائیں گے ؎

آں جامۂ کہ بود در بوئے یوسفم ترسم برادران غیورش قبا کنند

پھر میں نے اپنے لئے فال دیکھی تو انھوں نے کہا تھا ؎

بے خبر اندر زاہدان نقش بخواں ولاتقل مست ریاست محتسب بادہ بنوش ولاتخف

پہلی فال تو مہینہ بھر میں پوری ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ دوسری فال اسی طرح پوری ہو سکتی ہے کہ میں پہلی جولائی کے پہلے ہی چل دوں۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔

دعاگو: تمہارا باپ عفی عنہ

بنام نورالحسن صاحب ہاشمی، شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی

مکرمی و عطوفی! دامت فضلکم۔ تسلیم۔ جناب کے کارڈ کا شکریہ تہہ دل سے۔ آپ کی نیک بیں نگاہ نے "میرا مذہب" کے صرف صفات پر نظر کی اور عیوب کو نظری کر دیا۔ یہ خود جناب کی خوبی ہے، کتاب کی نہیں۔

کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لیتا ہوں

کتاب کے لکھنے کی اصل منشا کی طرف آپ نے اشارہ کر دیا۔ میری محنت کی سچی داد دے دی۔ خدا آپ کو اس کا اجر دے۔ ابھی بہت سی رائیں تو معلوم نہیں ہوئیں۔ دو چار جو معلوم ہوئیں، ان میں سوا ایک کے کسی صاحب نے میری دلی آرزو کی طرف اعتنا نہیں کی۔ مگر وہ صاحب میرے چاہنے والے، میرے شاگرد، میرے استاد مولانا عابد النشر سلّمہٗ ہیں۔ اس لئے ممکن ہے انھوں نے سعادت مندی سے وہی رائے قائم کی ہو جو آپ نے کی۔ باقی حضرات تو خیر شیعہ تو عموماً اس وجہ سے خفا معلوم ہوتے ہیں کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھاوے۔ سنّی ظاہرا خوش معلوم ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ از ترس موئے بس است۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ کتاب بہت مجمل لکھی گئی۔ ع کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے۔

روایت اور درایت کے بیان میں وضاحت ہونی چاہئے۔ گو میں نے اشارہ کیا ہے۔ مگر اس موضوع پر زیادہ

لکھتا تو اچھا تھا۔ عن فلاں عن فلاں میں یہ صفت ہے کہ جب تک آدمی از سر تا پا جھوٹ بولنے پر تیار نہ ہو جائے، پڑھنے والے کو مشکل سے دھوکا دے سکتا ہے۔ برخلاف درایت کے، جس میں یہ عیب ہے کہ باوجود ادعائے نیک نیتی ممکن ہے خود اپنے نفسانی رجحان کی وجہ سے، ممکن ہے لکھنے والا خود اپنے کو دھوکا دے جائے اس حقیر نے خود اپنے تجزیۂ نفس کی کوشش کی ہے۔ معلوم نہیں کامیاب ہوا ہوں یا نہیں۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۶۔ "گو میں انتہائی الخ"۔ دوسری کوشش میری یہ رہی ہے کہ بغیر کھرونچے لگائے بات کہہ جاؤں۔ افسوس ہے کہ اس میں مجھے پوری کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ خصوصاً مولانا شبلی کے معاملے میں۔ گو میں نے بڑی ایمانداری کی کوشش کی ہے مگر اس میں شاید میرا نفس شریک ہو گیا ہے۔ میں شبلی مرحوم کی اس روایت سے بہت جلا ہوا تھا جس میں انھوں نے حضرت علیؓ کے شراب پی کر نماز میں کچھ کا کچھ پڑھانے کا ذکر کیا ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ مجھ کو بڑے واثق ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ مولوی سلیمان صاحب* نے خود اس کو آئندہ ایڈیشن میں نکال ڈالنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ اور اس وجہ سے اس روایت کے کمزور ہونے کا یقین اور زیادہ ہو گیا ہے۔ اس طرح میرے نفس کو موقع مل گیا کہ وہ مجھ کو سختی برتنے پر مجبور کر دے۔ آخر میں عرض ہے کہ خدا کرے آپ سے دولت ہم کلامی حاصل ہو۔ ردولی میں ۱۱، ۱۲ مارچ کو عرس ہے۔ اگر موقع ہو تشریف لائیے۔ بوڑھا آدمی ہوں۔ مرنے کے پہلے گھڑی دو گھڑی جناب کی صحبت میں اچھی کٹ جائیں۔ جلیس الخیر نعمۃ۔

بندہ: محمد علی عفی عنہ۔ ردولی۔ ۴ مارچ سنہ ۱۹۵۲ء

مکرر آنکہ اگر جناب کچھ لکھنے کی زحمت فرمائیں، اور اس میں میری بیان کردہ خامیوں کا ذکر کریں تو مجھ کو برا نہ معلوم ہوگا۔

ضیا کے نام

یا رضیا! خدا تم کو خوش رکھے اور طولِ عمر عطا کرے۔ اقبال بلند کرے۔ آمین ثم آمین۔ یوں تو ہم تم کو اور تمہارے باپ کو دن میں دو دو، تین تین بار خط لکھا کرتے ہیں۔ مگر اوّل تو اتنا کاغذ، اتنے لفافے اور اتنے ٹکٹ کے پیسے کہاں سے آویں۔ اور تمہارے ماں باپ میں اتنے خطوط پڑھنے کا تحمل کہاں سے آوے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمہاری خیریت قریب قریب روز معلوم ہو جاتی ہے۔ اس لئے میری کوتاہ قلمی کا معقول عذر میرے پاس ہے۔ کل تمہاری ماں کا خط تمہاری قیصر دادی کے نام آیا تو دل چاہا کہ تم سے کچھ باتیں کر لوں۔ بیٹے تم ہم کو

* مولانا سید سلیمان ندوی۔ یہ روایت نکال دی گئی۔ (م۔ا)

کیا جانو مگر ہم تم کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ بقول شخصے تمہارے رگ پٹھوں سے واقف ہیں۔ اگر تم ہمارا یہ خط دس بارہ برس رکھے رہو گے تو تم کو کچھ اندازہ ہمارا معلوم ہو جائے گا۔ تمہارے باپ کے پاس ایک تصویر ہے، جس میں ایک جوان عورت اور ایک بڈھے کی تصویر ساتھ ساتھ ہے۔ عورت اپنی جوانی کے گھمنڈ میں متانت خودداری سے بیٹھی ہے۔ اور مرد اپنے بڑھاپے پر کھسیانی ہنسی ہنس رہا ہے۔ یہ عورت تمہاری دادی قیصر جہاں بیگم صاحبہ ہیں۔ اور یہ بڈھا تمہارا محمد علی شاہ فقیر ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا اگر تم اس کارڈ کو دس برس جگوئے رہو گے اور اس تصویر اور اس کارڈ کو ساتھ دیکھو گے اور خوب ہنسو گے تو تم ہم کو پہچان جاؤ گے دس برس میں تمہاری قیصر دادی ویسی ہی جوان دکھائی دیں گی، ہم شاید کچھ اور بڈھے دکھائی دیں گے۔ مگر تم پہچان لو گے۔ اگر زمانہ نے تفرقہ نہ ڈال دیا ہوتا تو اس تصویر کے دیکھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ نہ اس خط کے محفوظ رکھنے کی۔ مگر خیر ہوگا۔ تم ان باتوں پر دھیان مت دو۔ تم دادا کہنے کی مشق کرو۔ خدا چاہے گا سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اور ہاں بیٹے! ہم نے سنا ہے کہ تم نے نئی گاڑی خریدی ہے۔ اللہ مبارک کرے۔ اگر وہ گاڑی یہاں ہوتی تو اس پر ایک دن تمہاری دونوں دادیاں اور ہم سیر کو جاتے مگر اب اتنی دور کہاں پہنچ سکتے ہیں۔ اگر ہم تینوں آدمیوں کو اس گاڑی پر چڑھنے کا موقع مل جاتا تو ہم تو بہت خوش ہوتے مگر تمہاری ماں تمہارے باپ سے شکایت کرتیں کہ گاڑی تو مول لی گئی تھی ضیا کے واسطے اور اس پر چڑھے پھرتے ہیں یہ تینوں آدمی۔ بھلا یہ رہے گی، کہ ٹوٹے گی۔ تمہارے باپ کہتے کچھ نہیں، جانے دو۔ ٹوٹ جائے گی تو اور منگوا لیں گے۔ بڑوں کا جی چھوٹا مت کرو۔

ہاں بیٹے! اپنے باپ سے کہہ دینا کہ میں نے ہما کو تو خط بھیجے تھے مگر وہ کراچی میں تھیں۔ نہیں معلوم ان کو ملے یا نہیں۔ ہما سے کہہ دیں گے کہ مجھ کو خط لکھیں اور تجھے بھی سب کا حال لکھیں۔ دعاگو: تمہارا دادا

ایڈیٹر "نقوش" کے نام

جنابِ من! تسلیم۔ حضرت کا خیال ہے کہ میں نے مضمون لکھنے میں پہلے عذر کیا تھا۔ یہ نخرہ نہ تھا بلکہ بڑھاپا، گرمیاں، زمینداری جانے سے فقیری کا دھڑکہ سب مل کر حواس باختہ کیے ہوئے تھے۔ اب اس کے بعد تصویر کی فرمائش، کچھ مشکوری کا جذبہ ایسا ابھر آتا ہے کہ دل چاہتا ہے کہ بڑا سا خط لکھوں۔ اس وقت بادل گھرے ہوئے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ اس لئے طبیعت ذرا مزے میں ہے۔ آپ نے مضمون اس اصرار سے مانگا تھا اور تصویر بھی طلب کی تھی کہ انانیت اور اوچھا پن راضی ہو گئے۔ ع مرد فربہ شود ز راہِ گوش!

اس بڑھاپے میں میرے بچے سب دور دور جا پڑے۔ ان کے کہنے سے یہ تصویر کھنچوائی تھی۔ ورنہ اس سن میں تصویر کھنچوانا کیسا۔ آئینہ دیکھ کر غصہ چڑھ آتا ہے۔ اڑسٹھ برس دو مہینے کے سن میں ۷ر جولائی ۱۹۵۱ء کو یہ تصویر کھنچوائی تھی۔ اور حسبِ ذیل عبارتیں لکھ کر مختلف بچوں کو بھیجی تھی:

۱۔ یہ تمہارا باپ ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰۤاُولِی الْاَبْصَارِ۔

۲۔ پیری و صد عیب می گفتند۔

۳۔ یہ تصویر میری نہیں ہے۔ میں اتنا بوڑھا اور بدصورت کیسے ہو سکتا ہوں۔

۴۔ جو کچھ خدا دکھائے وہ ناچار دیکھنا۔

۵۔ بڑھاپے کی مسکراہٹ جوانی کا ماتم۔

جو تصویر آپ کو بھیج رہا ہوں اس پر کچھ لکھنے کو دل چاہتا ہے۔ "ہم امید لگائے تھے کہ چہرے کی شکنیں، جلد کا اتو جلد ختم ہو جاویں گی۔ مگر "نقوش" کے ہاتھوں ہم "ڈورین گرے" ہو کر رہ گئے۔" آپ کو یاد ہو گا کہ "آسکر وائلڈ" کا ہیرو "ڈورین گرے" جو جو آوارگی، سیاہ کاریاں کرتا تھا ان سب کا اثر بجائے اس کی صورت کے، اس کی تصویر پر پڑ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے اپنی تصویر دیکھ لی اور اس کو اس قدر نفرت ہوئی کہ اس نے تصویر کو خنجر سے چاک کر دیا۔ تصویر جیسی کھینچی تھی ویسی ہی ہو گئی۔ اور ڈورین سینہ چاک ہو کر اسی وقت مر گیا۔ یہ نہ خیال کیجیے گا کہ داد طلبی کے لئے انکسار کی کٹیا لگا کر تعریفوں کی مچھلیاں پکڑ رہا ہوں بلکہ واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ میرے اوپر بڑھاپے کا اثر شروع ہو گیا ہے۔ سٹھیاناپن قبضہ کرتا جا رہا ہے۔ رجس استہزا کم ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ سے بعض اوقات احساسِ کمتری بڑھ جاتا ہے۔ اور کچھ لکھتے وقت ڈر لگتا ہے کہ جن باتوں پر ہم دوسروں پر عبرت کرتے رہتے تھے وہی دن ہم کو دیکھنا پڑا۔ اظہارِ مشکوری میں اپنی کتابیں جو موجود ہیں بھیجتا ہوں۔ بعض ہیں جو نایاب ہیں۔ نہیں تو داد طلبی کے شوق میں وہ بھی حاضر کرتا۔

آپ کے یہاں مولویوں کی تباہ کاریاں زور پکڑ رہی ہیں۔ اس کا انسداد کیجیے گا ورنہ آپ کو بھی وہی روزِ بد دیکھنا نصیب ہو گا جو ایران، افغانستان وغیرہ کا ہے۔ مشکورِ عنایت: محمد علی۔ ۷ر جولائی ۱۹۵۲ء

علی ضامن صاحب کے نام

بھائی علی ضامن صاحب! زاد محبتہ۔ سلامِ شوق۔ آپ کا محبت نامہ آیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے

اندھیری رات میں سفر کر رہے ہوں اور دور کہیں چراغ دکھائی دے۔ چراغ حیات کی دلیل ہے جس کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہمارا ہم جنس وہاں ہوگا۔ آدمی تو ماشاء اللہ ہر جگہ ہیں۔ خدا کی خدائی پڑی ہے لیکن بڑھاپے میں ایسے آدمی جنھوں نے خود ہمارے بہتر دن دیکھے ہوں، کم رہ گئے ہیں ؎

تھا جن کو جن کو عشق کا آزار مر گئے　　اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

ایسا ہی کوئی ہم عمر، ہم جنس مل جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے جیسے جوانی لوٹ آئی۔ مگر یہ صرف لحظہ بھر کے لئے ہوتا ہے۔ جیسے اس وقت آپ کا خط دیکھ کر ہوا۔ ورنہ یوں تو بھائی بدرل اور ہم اکثر پاس بیٹھے رہتے ہیں مگر جوانی واپس آنا کیسا کا فور کی بو بڑھتی جا رہی ہے۔ بیماری، حیرانی کا ذکر کرنا، ایک دوسرے کو آئینہ دکھانا ہے۔ اس لئے اس ذکر کو چھوڑیئے۔ "میرا مذہب" اور "کشکول محمد علی شاہ فقیر" حاضر ہیں۔ یہ دونوں کتابیں اتنی غلط چھپی ہیں کہ دل سے اتر گئیں۔ مگر پھر بھی پیاری ہیں۔ جیسے چیچک نکلنے کے بعد اولاد ہوتی ہے۔ منھ الٹا توا ہو گیا۔ ایک آنکھ پھوٹ گئی۔ چہرے پر آدھ سیر قیمہ بھر دو تو جلد برابر ہو۔ مگر دل یہی کہتا ہے کہ بچوں کی نمائش میں شاید انعام بندہ زادہ ہی پا جائے!

بھائی بدرل پاس بیٹھے ہیں۔ ہم لوگ خود اپنی درازیٔ عمر کی دعا نہیں مانگتے۔ بلکہ ایک دوسرے کی طولِ حیات چاہتے ہیں۔ کیونکہ جانتے ہیں کہ جہاں ایک کھسکا دوسرا بھی ٹک نہیں سکتا۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللہ۔ ہزار کوشش کرتے ہیں کہ بڑھاپے کا ذکر نہ آئے مگر قلم سے یہی باتیں نکلتی رہتی ہیں۔ لہٰذا اس خط کو نظیر اکبرآبادی کے مصرعے پر ختم کرتا ہوں۔ ؏ اب بھی ہمارے آگے یارو جوان کیا ہے۔

بدرل اور ہم آپ کی باتیں اکثر کیا کرتے ہیں۔ ہم لوگوں کو معلوم بھی نہ تھا کہ آپ مرادآباد میں ہیں کہ رج گاؤں ہیں کہ کلکتہ میں۔ لکھنؤ ایسا مرکز تھا جہاں سب مل لیتے تھے یا ایک دوسرے کا حال جان لیتے تھے۔ اب لکھنؤ جاؤ تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی غیر شہر میں وارد ہوئے ہیں۔

دعاگو: محمد علی عفی عنہ۔ ردولی۔ ۲۹ مارچ ۱۹۵۲ء

خورشید حسن صاحب کے نام

دوست باصفا! تسلیم۔ آپ کا جواب موصول ہوا مگر پیاس نہیں بجھی۔ خود اپنی تعریف سے جی خوش ہوا۔ مگر دل جو چیز ڈھونڈتا تھا اس سے محروم رہا۔ ؏ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

آپ نے لکھا ہے کہ تیرے خیالات بہت اونچے ہیں۔ متاعِ نیک ہر دوکان پر کہ باشد خریدی جا

سکتی ہے۔ اس سے کام نہ چلے گا کہ جلیل القدر ذاتوں کی پیروی کرنے کا خیال بے کار ہے۔ بے شک ہم ویسے نہیں ہو سکتے مگر تاسی کا خیال ہی فائدہ مند ہے۔ جب ہمارے ایسے گنہ گار کے دل میں اس طرح کے خیالات آ سکتے ہیں تو بہتر انسانوں کے دل میں کیوں نہ آئیں۔ ایا زقدرِ خود بشناس درست ہے مگر پیروی نہ غرور ہے نہ گناہ۔ دوسرے آپ نے فرمایا ہے کہ "یہ بات علمائے کرام کے بس کی ہے۔" یعنی ریفارم ہم عوام الناس کا فرض نہیں۔ میرا دل یہ چاہتا تھا کہ بجائے اس کے آپ یہ کہتے کہ ہمارے عوام پڑھے لکھوں کی وردی پہنے ہیں اور جاہل ہیں۔ انھوں نے مذہب کو روزی کا ٹھیکرا بنایا ہے۔ جیسے ہم نے، آپ نے زمینداری اور وکالت کو بنایا ہے۔ ان کی آنکھوں پر حدیثوں اور روایات کے ڈھکوسلے چڑھے ہیں۔ جیسے تیلی کے بیل کی آنکھوں پر چڑھے ہوتے ہیں۔ قرآن کی روشنی کو لھو والی کوٹھری میں گم ہے۔ امام ابو یوسفؒ نے کہا جس طرح فوج کی وردی ہے اسی طرح علماء کے گروہ کی بھی مابہ الامتیاز پوشاک ہونی چاہئے۔ چنانچہ سیاہ عمامہ اور طیلسان تجویز ہو گئی۔ علم نے کپڑوں کی عزّت بڑھائی۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ کپڑے علم کی توقیر اونچی کر رہے ہیں۔ جب حضرت امام ابو یوسف کسی بات کو شروع کریں گے تو نتیجہ پہلے ہی معلوم ہے۔ ان لوگوں کے یہاں چھ سو برس سے اُدھر کی کوئی کتاب درس میں نہیں ہے۔ عقلِ سلیم سے جس کو Common Sense کہتے ہیں، ان حضرات کو باپ مارے کا بیر ہے۔ جو باتیں میں عرض کر رہا ہوں ان میں مذاق کا ابتذال اور طنز یہ تذلیل جھلکتی ہے۔ یہ طرز تو صرف اس واسطے اختیار کیا ہے کہ میں اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہوں۔ اور جانتا ہوں کہ آپ ان لغویتوں پر نگاہ نہ کریں گے، اور صرف نفسِ مطالب پر نظر کریں گے۔ یہ وجہ ہے کہ میں جلا ہوا ہوں۔ اسی وجہ سے یہ لغزشیں میری عبارت میں پیدا ہو جاتی ہیں، جو نہ ہونی چاہئے۔ ان حضرات کا روٹی کمانے کا شوق اور جہالت کا یہ حال ہے کہ منبر پر سے بغوات بک جاتے ہیں۔ شیعہ اثنا عشری کے عقائد کے حدود سے نکل کر قرامطہ اور دوسرے فرقوں کے دائرے میں جا پڑتے ہیں۔ میں جھوٹی مثال نہیں دیتا۔ مولوی........ مرحوم نے منبر پر سے فرمایا اور مجھ گنہگار نے سنا کہ ہم کو ائمہ کے فضائل بیان کرنے کا حکم نہیں۔ کیونکہ اگر وہ بیان ہو جائیں تو لوگ کافر ہو جائیں۔ اس قول کی گمراہی اور اغوا محتاجِ بیان نہیں۔ محتاجِ تشریح نہیں۔ کیونکہ اسلام کوئی خفیہ سازش نہیں۔ آئے دن روز اسی طرح کی باتیں واعظین سے سنا کرتے ہیں۔

بھائی خورشید صاحب! اگر اس آخری بات میں آپ کو کچھ مجھ سے اختلاف ہو تو میرے لئے

صرف ہدایت کی دعا کیجئے گا سمجھانے کی کوشش نہ فرمائیے گا۔ خط میں اتنی گنجائش کہاں کہ اپنے دل کا پورا حال اس مسئلے پر لکھ سکوں۔ اکثر حضرات کا خیال ہے کہ حضرات علماء ہم کو فائدہ زیادہ اور نقصان کم پہنچاتے ہیں۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ میری ناقص رائے (جو ممکن ہے غلط ہو) یہ ہے کہ یہ حضرات علماء ہمارے عقائد میں فرق ڈالتے ہیں۔ ہمارے مسائلِ فقہ میں مشکلیں پیدا کرتے ہیں۔ اور وہ افراد مفعول ہیں جو اگر نہ ہوتے تو چنداں نقصان نہ ہوتا۔ چند مثالیں سن لیجئے۔ چونکہ خود آپ کا تجربہ نہیں اس لئے آپ کو پورا حق ہے کہ مجھ کو شاہد غیر عادل مان کر ان کو مسترد کر دیجئے۔ لیکن یہ بد قسمت تو مجبوراً وہی رائے قائم کرے گا جو ان ارشادات سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور میرے تجربے میں آئی ہیں۔

ایک بڑے مجتہد العصر کو یوپی گورنمنٹ نے نجف اشرف کی گولہ باری دیکھنے بھیجا۔ وہاں سے آکر جو خفیہ رپورٹ انھوں نے گورنمنٹ کو دی وہ ایسی تھی کہ ہوم ممبر نے یہ کہہ کر واپس کر دی کہ گول مول رپورٹ جو سوالات کا جواب نہ ہو بیکار ہے۔ بجائے اس کے صاف صاف رپورٹ لکھی جائے۔ پہلی لڑائی کے بعد فتویٰ ہوا کہ عراق میں انگریزوں سے، جن کا قبضہ ہو چکا ہے، لڑنا نہ چاہئے۔ ایک بڑے مجتہد صاحب نے بقول ایک صاحب (جو اُن کے بڑے عقیدت مندوں میں ہیں اور جنھوں نے مجتہد صاحب کا عذر معقول مان لیا) کے فرمایا کہ میں نے فلاں جلیل القدر حضرت کی مروت میں دستخط کر دیا۔ جو شخص ایسی رپورٹ لکھے وہ حضرت علی کا پیرو کم حضرت معاویہ کا پیرو زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ میرے بھتیجے حکیم چندو مرحوم نے کہا کہ میں نے فیض آباد کی مسافت ردولی سے بیان کر کے استفتا کیا کہ نماز قصر ہے یا پوری نماز ادا کی جائے۔ ارشاد ہوا کہ دونوں ادا کی جائیں۔ یہ شریعت سہلہ ٹھہری۔ بہت حضرات سے سنا کہ ارشاد ہوا کہ شکار میں جانور اس وقت حلال کیا جا سکتا ہے جب اس میں حیاتِ مستقرّ باقی ہے۔ یعنی اگر یہ گمان نہ ہو کر فوراً احلال نہ کر ڈالا گیا تو مر جائے گا۔ دنیا کی بری سے بری چیز میں بھی کچھ خوبیاں ہوتی ہیں۔ قالی نظر اس پر رکھی جائے کہ خرابیاں زیادہ ہیں یا اچھائیاں۔ یہ رائے ہر شخص خود قائم کرلے اور بہشتِ خدا خود جواب دہ ہو، دوسرے سے مطلب نہیں۔ یہودی اور نصاریٰ نے اپنے علماء اور راہبوں کو شانِ ربوبیت سے متصف کیا۔ گو مسلمانوں میں اس کا خوف کم ہے مگر احتیاط لازم ہے۔ دل میں بھائی صاحب نہ معلوم کیا کیا بھرا ہے ؎

بیا و ربیدگر اینجا بود سخندانے ٭ غریبِ شہر سخنہائے گفتنی دارد

دعاگو: محمد علی عفی عنہ۔ ۱۱ر نومبر ۱۹۵۰ء

ڈاکٹر نورالحسن صاحب کے نام

دامت فضلکم۔ دعائے شوق۔ "فروغِ اردو" کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ بقول انشا مرحوم (بتصرف) "اس چھوٹی سی جاگہ میں یہ وسعت، یہ سماوٹ۔ اللہ ری جودت"۔ ڈاکٹر جانسن نے برک کے لئے کہا ہے کہ اگر راہ میں مویشیوں کو نکل جانے کے لئے آپ برک کے ساتھ لحظہ بھر کے لئے سڑک کے ایک طرف کھڑے ہو جائیے تو صرف اتنی ہی دیر میں آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ برک کوئی معمولی راہ گیر نہ تھا۔ یہی حال ماشاءاللہ "فروغِ اردو" اور اس کے اعزازی مدیر کا ہے۔

مجھے ارشاد ہوا ہے کہ اپنی کتابوں کی فہرست بھیج دو۔ اور کچھ ذاتی حالات کے بارے میں بھی شاید کہا ہے۔ کتابوں کی فہرست حسب ذیل ہے۔ ۱۔ اتالیق بی بی۔ ۲۔ یادگارِ مولانا کرامت حسین مرحوم و مغفور۔ ۳۔ نقادی کے نکتے۔ یعنی قلمی تصاویر کی پرکھ۔ ۴۔ صلاح کار۔ ۵۔ پردے کی بات (ایک بہت چھوٹا سا رسالہ ضبطِ تولید پر) ۶۔ گناہ کا خوف۔ ۷۔ کشکول محمد علی شاہ فقیر۔۔۔ ان کے علاوہ "معلومات" ایک ماہنامہ تھا۔ جس میں اکثر چھوٹے چھوٹے ایک ایکٹ کے ڈرامے نکلا کرتے تھے۔ عیاش کسان، سعید و سلمہ وغیرہ۔ اگر وہاں مل جائیں تو اردو کی تاریخ تو کیا، اس سے یہ ضرور پتہ چلے کہ انگریزی سے کس کس وقت اردو نے کیا کیا لیا۔ آسکر وائلڈ کا مقدمہ "فلدموت" ۔ پیراواکس برنا ڈشا کی شہرت کا عزت الکمال ہے۔ اس کے علاوہ ایک کاپی شملہ میں کھو گئی۔ شاید کسی وقت پانی مردے کو اچھال دے تو دو چار افسانے مل جائیں۔ مگر اب ان کا ذکر فضول ہے۔

شاید آپ نے یہ تحریر فرمایا تھا کہ کہیں تیرے حالات لکھے ہوں تو اُن کا پتہ بتا۔ حضرت! فالج کی وجہ سے دماغ بکھر گیا ہے۔ ایک بڑھیا ایک ٹوکرے میں دھان کوٹنے کو لئے جاتی تھی۔ اس پر بندر کود پڑا۔ ٹوکرا گر پڑا۔ دھان بکھر گئے۔ اس عورت نے کہا "لیو اب کیا کری؟" یہی حال میرا ہے ایک صاحب ہیں عسکری صاحب* ادیب۔ ایک بار انھوں نے میرا بہترین افسانہ ایڈٹ کیا تھا۔ دوسرے مصنفین کے ساتھ میرا بھی ایک افسانہ "تیسری جنس" چھاپا تھا۔ اس میں ان کے اصرار سے کچھ اپنا حال میں نے لکھ دیا تھا۔ اگر وہ آپ ڈھونڈ نکالیں تو کچھ حال میرا مل جائے۔ نہیں تو یہ مصرعہ

* حسن عسکری۔ "میرا بہترین افسانہ" (م۔ا)

کافی ہوگا۔ ع اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

بلکہ یہ اس سے بہتر ہوگا۔ "سیاں آون کی بھئی بیریاں۔ دروا جوا ٹھاری رہوں"

دعاگو: محمد علی عفی عنہ۔ ۸ راکتوبر ۱۹۵۴ء

ہما بیگم کے نام

ہما پیاری! کون ایسی دعا دوں کہ سیدھی دراجابت پر پہنچے۔ بہرحال تم نے ایسا جی بھرا خط لکھا ہے کہ روئیں روئیں سے دعا نکلتی ہے۔ میرا حال ہر حالت میں قابلِ شکر ہے۔ سال بھر پہلے فرعون بے سامان تھا۔ اللہ میاں نے یہ عنایت کی کہ فالج گرا کر آنکھیں کھول دیں۔ تب سے توبہ کر لی۔ اگر قبول کرنا نہیں تھا تو یہ ترکیب کیوں کی؟ میرے گناہ بعض ایسے ہیں کہ جب معافی چاہتا ہوں تو اللہ میاں سے بھی شرم آتی ہے۔ مگر لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ کی ایسی ڈھارس ہے کہ بے حیا رحم کی دعا مانگتا ہوں۔ اور شرماتا نہیں۔ میں ٹائیں ٹائیں باتیں کئے جاتا ہوں۔ ڈاکٹر روتے ہیں کہ بائیں بائیں چپ رہو۔ مگر بوڑھوں کی عادت نبا ہے جاتا ہوں۔ کبھی موت سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ کبھی ایسا پریشان ہو جاتا ہوں کہ "پیا ملن ہم جائب ہورراما" گاتا ہوں۔ بارہ برس پاچھے سیاں مورے آئے۔ ہنس ہنس گر دا لگائب ہورراما۔

تمہارے بچوں کو دعائیں۔ علی کاظم سے دعائیں اور رداد دینے کا شکریہ۔

راقم: تمہارا باپ عفی عنہ۔ یکم دسمبر ۱۹۵۴ء۔ ردولی

کاظم رضا کے نام

مائی ڈیر کاظم! دعا۔ نزہت کے منہ سے میں نے "متوارے نینوا" سنی تھی۔ اور مجھ کو بہت پسند آتی تھی۔ تمہارا نام اس میں موجود تھا۔ مگر نے کی خوبصورتی کے آگے الفاظ پر غور نہیں کیا تھا۔ اسی وجہ سے یہ نہ جانا کہ یہ تمہاری چیز ہے۔ تم نے بھی ظلم کیا کہ بتایا نہیں، ورنہ میرا مزا دگنا ہو جاتا۔ اس وجہ سے بھی کہ تمہارے دل سے نکلی تھی اور اس وجہ سے بھی کہ منھ پر تعریفیں کر کے میرا دل اور خوش ہوتا۔ بزرگوں نے انکسار، تعلّی اور منھ پر تعریفیں کرنے کے اصول کچھ ایسے غلط قائم کر دئیے ہیں کہ کچھ انتہا نہیں۔ تعلّی اور انکسار دونوں دھوکا دینے کی کوششیں ہیں۔ مگر ایک بُری سمجھی جاتی ہے اور دوسری اچھی۔ منھ پر تعریفیں کرنے کی قیمت نادانی سے اتنی کم کر دی ہے جیسے بازار میں حضرت یوسفؑ کے دام لگے تھے۔ بائے تصنّع

وائے تصنّع، بھاڑ میں جائے تصنّع ۔ یہ سب اسی وجہ سے ہوا ہوگا کہ شاید اگلے زمانے والے ہم لوگوں کے اتنے Sincere نہ رہے ہوں گے ۔ ایران کی تہذیب یہاں کیا عرب میں چھائی بچھائی تھی۔ جہاں امرأ القیس کی تعریفیں تو تھیں مگر متنبّی کا بھی رنگ جما ہوا تھا ۔ میری ناچیز رائے میں سچّی تعریف منھ ہی پر ہونا چاہئے ۔ البتہ جھوٹی تعریف ہمیشہ پیٹھ پیچھے کی جائے یا اتنے بڑے مجمع میں کی جائے جہاں دو شخصیتیں اتنی قریب نہیں ہوتیں کہ ان کی دل کی کسوٹیوں پر سونا کسا جا سکے ۔ سچّی تعریف میں کھرا ماں ہونا ہے جس کی کھنک میں دل کو دھوکا ہو ہی نہیں سکتا ۔ اس دارالمحن میں اگر دو آدمی کسی ذریعے سے اپنے اپنے دل کی کلی کھلا سکیں تو کیوں نہ کھلائیں ۔ اچھا اب تمہید ختم تقریظ شروع ۔

تمہاری چیز سن کر میری آنکھوں میں کئی بار آنسو امنڈ آئے ۔ ع

اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

الفاظ کا تناسب، مصرعوں کی چستی کی تعریف کر کے کاغذ کیوں سیاہ کروں ۔ اصل بات کیوں نہ کہدوں کہ جو تم کہنا چاہتے تھے اس میں کامیاب ہو گئے ۔ اس سے زیادہ شاعر کے بس میں ہے ہی کیا ۔ واقعی تمہارے دل میں درد ہے ۔ "منوا رے نیّنوا" ابھی ابھی بادشاہ سے سن رہا تھا ۔

دعاگو : محمد علی عفی عنہ ۔ ۱۴ر جنوری ۱۹۴۱ء

مکرّر ۔ ہائے رے ثاقب !

وہی الفت ہے جس کو نشتروں کا کام آتا ہے   لہو دیتی ہے دل کی رگ جو تیرا نام آتا ہے

تم بھی اسی طرح "منوا رے نیّنوا" میں کامیاب ہو گئے ہو ۔ اے لو پھر دل بھر آیا ۔ گو میں بیک مُتنا ہوں ۔ مگر چیز بھی غضب کی ہے ۔ اس بار میں سن رہا تھا بلکہ آخری مصرعہ دل میں آیا تھا ۔

محمد علی عفی عنہ

لہ سیّد کاظم رضا صاحب ۔ چیف چودھری محمد علی صاحب کے بڑے داماد اور سیّد محمد رضا صاحب مرحوم جج کے صاحب زادے ہیں ۔ ایک روز لکھنؤ میں برج کھیل رہے تھے ۔ برج پارٹی سیّد اخلاق حسین صاحب جج کے مکان پر جو سیّد کاظم رضا صاحب کے ہم زلف اور دوست بھی ہیں، جمی ہوئی تھی ۔ سب گھر ہی کے لوگ اکٹھا تھے ۔ البتہ ایک بیگم صاحبہ بھی ان دنوں حیدر آباد دکن سے تشریف لائی تھیں ۔ وہ بھی کھیل میں شریک تھیں ۔ بڑی خوبصورت، پڑھی لکھی تھیں (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

سہ پہر سے کھیل شروع ہوا۔ مجمع دلچسپ اور کھیل عمدہ ہو رہا تھا۔ رات کے گیارہ، بارہ، ایک دو بج گئے۔ نیند کا وقت۔ اور سب کا حال تو بدستور رہا۔ مگر ان بیگم صاحبہ کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں نیند سے ہلکی ہلکی سرخی لئے ہوئے بوجھل ہو رہی تھیں۔ پان کا مسلسل دور ہونٹوں پر دھڑی الگ جما چکا تھا۔ بیچارے کاظم رضا صاحب پر آتی گئی ہو گئی۔ اسی وقت "متوارے نینوا" دل سے برجستہ کہہ ڈالا۔ گانے کے بھی چونکہ کافی شوقین اور بجانے والوں میں سے ہیں اس لئے بعد میں اس کو راگ کھماج میں خود ہی باندھا بھی جس کی داد مندرجہ بالا خط سے ملی تھی۔ (بیگم ہما اخلاق حسین)

بنام سید مسعود حسن رضوی ادیب

(۱)

مکرمی و معظمی! دامت اشفاقکم۔ تسلیمات۔ حاملِ ہذا مسیب[۱] عباس سلمہٗ میرا عزیز قریب ہے۔ اس وجہ سے عزیز تر ہے کہ اس سے میری کچھ امیدیں وابستہ ہیں۔ یہ اردو میں آنرز کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یونیورسٹی میں کام چلا ہی لے گا۔ اگر نجی طور پر بھی اس کی کچھ حوصلہ افزائی کا سامان ہو جاتا تو میری آرزوؤں کے پورے ہونے کا انشاءاللہ تعالیٰ سامان ہو جاتا۔ ان خاص عنایات کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ طالب علم شائستۂ عنایات ہو بھی۔ اگر مسیب سلمہٗ میں قابلیت ہوئی تو یہ خود آپ کے اوپر ثابت کر دیں گے۔ اور اگر خدانخواستہ اسی چیز کی کمی ہوئی تو نہ مجھ کو کوئی شکایت ہو سکتی ہے، نہ اس لڑکے کو۔

نیازکیش: محمد علی عفی عنہ۔ ردولی

(۲)

جنابِ من! تسلیم۔ استشہاد چاہتا ہوں بہ حق اور گواہی چاہتا ہوں بہ صدق، کہ اگر "صلاح کار" نوجوانوں کے لئے مفید ہو تو اپنے اخبار میں تقریظ سے مشکور فرمائیے۔ اگر آپ کے نزدیک مُضر یا بے کار ہو تو کہنے میں باک نہ کیجئے۔ کوئی شکایت نہ ہوگی۔ بَیِّنُوا وَتُوجَرُوا۔ نرخ اشتہار یا نرخ کمیشن جس میں اشتہار کی بھی قیمت شامل ہو، اس سے مطلع فرمائیے۔ جس پرچے میں اس پر تنقید ہو اُس نمبر کا خریدار ہوں۔ جس وقت پرچہ موصول ہوگا ٹکٹ ارسالِ خدمت ہوں گے۔[۲]

محمد علی عفی عنہ، رُدولی۔ اودھ۔ یہی پتا کتاب ملنے کا ہے۔

("خطوطِ مشاہیر بہ نام سید مسعود حسن رضوی ادیب" مرتبۂ نیر مسعود)

---

[۱] ڈاکٹر مسیب عباس شارب ردولوی۔ [۲] یہ خط کسی خوشنویس سے لکھوایا گیا ہے۔ مکتوب الیہ لکھنؤ کے رسالے "ادب" کے مشیروں میں تھے۔ اپنی کتاب "صلاح کار" کے بارے میں یہی خط چودھری صاحب نے غالباً دوسروں کو بھی بھیجا ہوگا۔

"دانشور اقبال"

(آل احمد سرور)

"دانشوز اقبال" اقبال کی فکر اور فن دونوں پر مضامین کا مجموعہ ہے۔ لیکن حصہ فن پر بھی فکر اقبال کے سائے پھیلے ہوئے ہیں۔ فکر اقبال پر لکھی جانے والی اکثر و بیشتر تحریروں میں آسان طریقہ یہ استعمال ہوتا رہا ہے کہ اقبال کے چند معروف تصورات (خودی، عشق، جنوں ......) کے لحاظ سے ان کی نظموں، غزلوں، مثنویوں کے اشعار اور (خطبات سے ہٹ کر) نثری مضامین کے اقتباسات ترتیب دے دیے جائیں۔ مزید یہ کہ ان تصورات کے درمیان ربط کو موجود یا مفقود ثابت کر دیا جائے۔ اس عمل میں اقبال کے فکری "تضادات" پر اکثر قیاس آرائیاں ہوتی رہی ہیں۔ ایسے لکھنے والے ہیں تو، مگر بہت کم، جو اقبال کے موضوعات سے نہ صرف فکری دلچسپی رکھتے ہوں بلکہ ان موضوعات اور موضوعات کے علمی سیاق و سباق پر انھوں نے اپنے طور پر سوچا ہو، ان پر اپنی ایک رائے رکھتے ہوں اور جو اس دلچسپی، سوچ اور رائے کی مدد سے اقبال کے شعری تفکر کو اردو فارسی شعری تناظر اور جنوب ایشائی فکری پھیلاو میں رکھ کر ہماری تحسین کی رسائی میں لا سکیں۔ اس مضمون میں اظہار خیال کتاب میں شامل فکر کا احاطہ کرنے والے مضامین تک محدود ہے۔

آل احمد سرور ان کم یاب دانشوروں میں ہیں جنھیں اقبال سے زیادہ اقبال کے موضوعات سے فکری لگاو ہے۔ اور اسی لیے وہ اقبال سے اختلاف بھی کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ وہ عہد حاضر کے تہذیبی منظر اور ذرائع علم سے آشنا ہیں۔ اقبال کی شاعری اور فکری پہلوؤں پر ان کے بیانات بے محل، مستعمل یا اجنبی الفاظ اور اصطلاحات اور نمائشی اظہارات سے پاک ہوتے ہیں۔ زیر نظر کتاب اقبال کی دانش ورانہ شخصیت پر کوئی منصوبہ بند تجزیے کی حیثیت نہیں رکھتی۔ یہ چند ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۹۷۷ء اور ۱۹۹۰ء کے درمیان مختلف سیمناروں میں پڑھے گئے تھے۔ اسی لیے ان مضامین میں اقبال کے ادبی اور فکری سرمایے پر ان کے بعض خیالات کی تکرار غیر متوقع نہیں۔ سرور صاحب نے اقبال کے معروف بنیادی تصورات جیسے خودی، عشق، خرد، زمان و مکان وغیرہ کو موضوع نہیں بنایا کیونکہ اس کتاب میں مشمولہ مضامین کا مقصد عہد حاضر سے قریب ترین ربط رکھنے والے تصورات کا تجزیہ ہے نہ کہ اقبال کی فکر کی تشکیل جدید۔

کتاب کا عنوان ظاہر کرتا ہے کہ نظم و نثر میں اقبال کی دانشوری پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ دانشوری سے کیا مراد ہے، اس کی تشریح مختلف بیانات کے ذریعے کی گئی ہے۔ ان کی تلخیص یہ ہے [ص ۱۷۔ ۱۸]

"خاص واقعات یا ٹھوس حقائق یا جزئیات میں معنویت تلاش کرنا اور اس کا احساس عام کرنا دانشوری ہے۔ دانشوری نے سائنس کے سہارے ترقی کی ہے۔ یہ غیر عقلی اور من مانی باتوں کو رد کرتی ہے۔ یہ ایک رومانی جذبے سے بھی سرشار رہتی ہے اور اس میں باغیانہ لے بھی در آتی ہے۔ یہ انقلابی افکار کو بھی جنم دیتی ہے اور کسی خدا کی بادشاہت کے خواب بھی دیکھتی ہے۔ یہ عوام کی تخلیقی صلاحیت پر بھی اعتماد کرتی ہے اور عوام کی جنت کی تصویریں بھی بناتی ہے۔ دانشور انسان، سماج، فطرت اور کائنات کے تناظر کو عام لوگوں سے زیادہ علامات اور تجریدی حوالوں سے دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ وہ روایت اور عقیدے کی وضاحت بھی کرتا ہے اور اس میں ترمیم بھی وہ انقلاب نہیں لاتا، وہ انقلاب کے لئے فضا ہموار کرتا ہے۔ برصغیر میں انیسویں صدی کی نشاۃ الثانیہ زیادہ تر ان دانشوروں کی مرہون منت ہے جو مغربی افکار سے متاثر ہوئے تھے۔ قومیت کا احساس عام کرنے میں، سائنس کے فروغ میں، آزادی کی جدوجہد میں، مذہبی اصلاح کی تحریکوں میں، ادب کے چمن میں نئے پھول کھلانے میں دانشوروں کا نیا رول رہا ہے۔"

"دانشور اقبال" پر یہ مضمون کتاب میں اقبال کی فکر کا احاطہ کرنے والے مضامین میں سے صرف تین موضوعات تک محدود ہے۔

(الف) مشرقیت (ب) ہندوستانی مسلمانوں کا تشخص (ج) اسلامی نظام

مغربی فکر (سائنسی نقطہ نظر، عقلیت، تجربیت، جدید کاری وغیرہ) اور مغربی تہذیب نے پچھلے تقریباً دو سو سال سے ایشیائی فکر اور تہذیب پر گہرا اثر مترتب کیا ہے۔ اور کئی شعبوں میں ایشیائی فکر اور تہذیب کو اپنی روایات سے رشتے توڑلینے پر مجبور کیا ہے یا ان رشتوں کو کمزور بنادیا ہے یا پھر ان رشتوں کو مشکوک کر دیا ہے۔ مغرب اور مشرق کی اس مقابلہ آرائی نے جن موضوعات کو ابھارا ان میں روایت اور جدیدیت میں باہمی تعلق، روایت پر مبنی تشخص اور جدید کاری کے تحت اس تشخص میں تبدیلی کے تقاضوں کے درمیان کشمکش، مذہبی عقائد کی ابدیت اور معاشرتی اور تہذیبی تغیر پذیری کے درمیان تفاعلی تناؤ، جیسے موضوعات شامل ہیں۔ اس مقابلہ آرائی نے انیسویں اور بیسویں صدی کے ایشیا، عالم عرب، ایران، ذیلی براعظم ہندو پاک کے مسلمانوں میں متعدد فکری اور تہذیبی تحریکوں کو جنم دیا۔ ان تحریکوں میں مختلف علاقوں کے مفکر، عالم اور دانشور منقسم ہیں۔ مثلاً عرب کے محمد ابن عبدالوہاب (۱۷۰۰ء۔ ۱۷۸۷ء) اور ان کی محمدیہ تحریک (جو اپنے غلط نام "وہابیہ" سے مشہور ہے)، شمالی افریقہ کے سید محمد بن علی السنوسی

(۱۷۸۷ء - ۱۸۵۹ء) اور ان کی سنوسیہ تحریک، شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳ء - ۱۷۶۳ء) کے زیر اثر انیسویں صدی میں ابھرنے والی تحریک مجاہدین اور سید احمد شہید (۱۷۸۶ء - ۱۸۳۱ء)، سید جمال الدین افغانی (۱۸۳۸ء - ۱۸۹۷ء) مصر کے شیخ محمد عبدہ (۱۸۴۹ء - ۱۹۰۵ء) سید رشید رضا (۱۸۸۲ء -) اور ان سے منسوب سلفیہ مکتب خیال، علی عبد الرازق (پ - ۱۸۸۸ء)، عبد الرحمن الکواکبی (۱۸۵۴ء - ۱۹۰۲ء)، ہندوستان کے سید احمد خان (۱۸۱۷ء - ۱۸۹۸)، چراغ علی (وفات ۱۸۹۵ء)، سید امیر علی (۱۸۴۹ء - ۱۹۲۸ء)، شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء - ۱۹۱۴ء)، حالی (۱۸۳۷ء -)، ابو الکلام آزاد (۱۸۸۸ء - ۱۹۵۸ء)، حسن البنا / اخوان المسلمین، ترکی کے نوجوان ترک، انجمن اتحاد و ترقی، ضیا گوک الپ (۱۸۷۵ء - ۱۹۲۴ء)، سید ابو الاعلی مودودی (۱۹۰۳ء - ۱۹۷۹ء) / جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت، ایران میں علی شریعتی (۱۹۳۳ء - ۱۹۷۷ء) اور امام خمینی (۱۸۹۹ء - ۱۹۸۹ء) شامل ہیں۔ ان سوچنے والوں اور تحریکوں کو مختلف اصطلاحوں جیسے قدامت پرست، احیا پسند، روایت پرست، اصطلاح پسند، عقیلت پرست یا جدید کے ذریعے بیان کیا جاتا رہا ہے۔ ان اصطلاحوں کا اطلاق مختلف لوگ اپنے اپنے نقاط نظر سے کرتے ہیں۔ بعض وقت ایک مفکر یا تحریک کسی کے لیے احیا پسند ہوتی ہے اور کسی اور کے لیے قدامت پرست۔

میں نے اپنی بات کی وضاحت کے لیے ایک اور مکتب ساز تصور کا انتخاب کیا ہے.......

"تبدیلی"....... معاشرے کو تبدیل کرنے کا تصور۔ (ا) "تبدیلی" کی طرف دو ہی رویے ہو سکتے ہیں... موافق یا مخالف۔ ان دو رویوں میں اگر سوچنے والوں اور تحریکوں کو بانٹ دیا جائے تو ہم اپنے ماضی اور حال کو نہ صرف زیادہ پر معنی طور پر دیکھ سکتے ہیں بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک بہت معنی خیز ربط بھی قائم کر سکتے ہیں (اور اگر یہ ہو جائے تو مستقبل کے لئے مضبوط بنیادیں فراہم کرنے کا کام بڑی حد تک آسان بنایا جاسکتا ہے) یعنی وہ افراد، تحریکیں اور ادارے جو معاشرے کی موجودہ صورت حال سے مطمئن نہیں ہیں اور اس کو ایک بہتر صورت حال میں بدلنا چاہتے ہیں۔ اور وہ افراد، تحریکیں جو معاشرے کی موجودہ صورت حال سے مطمئن ہیں اور کسی بھی قسم کی تبدیلی کا خطرہ مول لینے تیار نہیں۔

موافق تبدیلی اور مخالف تبدیلی افراد اور مکاتیب.... "مخالف تبدیلی" مکتب میں میں ان علماء اور دانشوروں کو شامل کروں گا جو معاشرے میں مغربی فکر اور تہذیب کے پیدا کردہ نتائج اور تقاضوں کے باوجود اپنے فکری اور تہذیبی نقاط نظر میں اور اپنے معاشرے میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کو ضروری نہیں سمجھتے تھے اور انھیں یقین تھا کہ ان کے پاس عہد وسطی کا جو فکری اور تہذیبی سرمایہ موجود ہے وہ عہد حاضر کے معاشرے کی تمام ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ان میں عالم اسلام کے بیشتر علماء، دینی اداروں اور ان کی تحریکوں کو رکھا جاسکتا ہے۔ اور دوسری طرف وہ "موافق تبدیلی" علماء اور دانشور ہیں جو عہد وسطی میں تعمیر کردہ فکری اور

تہذیبی نظام کو عہد حاضر میں مغربی فکر اور تہذیب کے تقاضوں کا سامنا کرنے کے لیے ناکافی سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عہد وسطیٰ کے علماء نے اپنے عہد کی ضروریات کے مطابق فکری اور سماجی نظام بنائے تھے..... اسی طرح موجودہ دور میں ضروری ہے کہ معاشرے میں ایسی ذہنی اور سماجی تبدیلیاں لائی جائیں کہ وہ (مغرب کے زیر اثر پیدا شدہ) جدید تصورات اور تہذیبی تقاضوں کا متحمل ہونے کی اپنے میں گنجائش پیدا کرنے پر قادر ہو سکے۔ ان "موافق تبدیلی" مفکرین میں (اٹھارویں صدی کے شاہ ولی اللہ دہلوی کے بعد) جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہ، سید احمد خاں، حالی، شبلی، چراغ علی، محسن الملک، ابو الکلام آزاد، اور عبید اللہ سندھی شامل ہیں۔

مخالف تبدیلی اور موافق تبدیلی مکاتیب کے بیچ فرق کی مزید وضاحت "تبدیلی" کے مظہر کو تسلیم کرنے اور اس کی نوعیت کی تعریف سے ہو جائے گی۔ مثلاً ہندوستان میں انیسویں صدی میں، مخالف تبدیلی، مکتب سے تعلق رکھنے والے بیشتر علماء (اور اکبرالہ آبادی) اور مصر میں جامعہ ازہر کے علماء مغربی تہذیب اور اس کی اقدار کی وجہ سے ہندوستانی / مصری معاشرے میں جو تبدیلیاں آرہی تھیں، انھیں دیکھ تو رہے تھے لیکن ان تبدیلیوں کو کلیتہً نہ صرف منفی قرار دیتے تھے بلکہ معاشرے کی صالح اقدار کے لئے تباہ کن سمجھتے تھے۔ انھوں نے تبدیلی پیدا کرنے والے تصورات کو محض ان کے نئے پن کی وجہ سے نقصان رساں سمجھ لیا اور انگریزی زبان، مغربی علوم مغربی لباس، سائنس، عقل، تجربیت کو بہ حیثیت مجموعی رد کر دیا۔ اگر انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں ہندوستان اور مصر پر مغرب کے مکمل غلبے کو ذہن میں رکھا جائے تو یہ مخالف تبدیلی رویہ ایک قسم کا دفاعی رویہ معلوم ہوتا ہے۔ جس میں یہ اعتراف موجود تھا کہ ہم مغرب کے اس ذہنی اور مادی حملے کے دفاع کے لیے تیار نہیں ہیں بلکہ ہم کسی حملہ آوری کو تسلیم نہیں کرتے چنانچہ اس مکتب کے علماء کی تحریروں کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے مغربی حملے کا کوئی تجزیہ نہیں کیا اور نہ علم اور تجربیت کی بنیاد پر اٹھائے گئے سوالوں کو سمجھا۔ بلکہ ان تصورات کو "اسلامی عقائد" کے لیے خطرناک اور ملحدانہ قرار دے کر انھیں یک قلم رد کر دیا گیا۔ جمال الدین افغانی نے انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں ہندوستانی علماء کے علم کی جانب دوہرے رویے پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔ "یہ علماء رات بھر ایک لیمپ کی روشنی میں صدرا اور شمس بازغہ پڑھتے ہیں اور ایک بار بھی نہیں سوچتے کہ جس لیمپ کی روشنی میں وہ پڑھ رہے ہیں، اس کی چمنی ہٹالی جائے تو وہ دھواں دینا کیوں شروع کر دیتا ہے اور چمنی رکھدی جائے تو دھواں دینا بند کیوں کر دیتا ہے!"

اس کے مقابلے میں "موافق تبدیلی" مکتب نے کھلے دل و دماغ سے معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں کی حقیقت کو تسلیم کیا، ان کا تنقیدی تجزیہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ہر حامل تبدیلی تصور اور ہندوستانی معاشرے میں ہونے والی ہر فکری اور تہذیبی تبدیلی نقصان دہ نہیں۔ مثلاً

جدید علوم سیکھنے کا تصور اور جدید علم کی وجہ سے ہندوستان میں جو سیاسی اور طبقاتی شعور بڑھ رہا تھا، دونوں تبدیلی لارہے ہیں..... یہ بات ماننی ہوگی - اس کا تعلق عقیدے سے نہیں ہے - ان تصورات میں سے چند اپنے عہد کے لیے لازمی ہیں اور چند غیر ضروری ہیں - چنانچہ انگریزی زبان اور سائنسی علوم کا سیکھنا، تجربیت اور عقل کو ذرائع علم کے طور پر قبول کرنا ضروری ہے - لیکن اس مکتب خیال نے " مخالف تبدیلی "مکتب سے اختلاف کرتے ہوے مذہب اسلام کی صداقت کا محض اعلان کر دینا کافی نہیں سمجھا بلکہ اس صداقت کی نئے علمی تناظر میں تفسیر و تعبیر پر بھی زور دیا مصر میں جمال الدین افغانی کے شاگرد شیخ محمد عبدہ اور ہندوستان میں سید احمد خاں اس موافق تبدیلی مکتب کے سب سے طاقتور نمائندے گزرے ہیں - سید احمد خاں کے تہذیبی، علمی، تعلیمی اور دانشورانہ تصورات نے اپنے اور اپنے بعد کے دور کے سوچنے والوں کو متاثر کیا -

اقبال میری راے میں، اسی موافق تبدیلی روایت سے تعلق رکھتے ہیں - وہ دنیا کے مسلمانوں اور خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کی سماجی، معاشی اور ذہنی کیفیت سے غیر مطمئن تھے اور اس صورت حال کو ایک بہتر صورت حال میں بدلنے کے لیے مضطرب تھے - فلسفیانہ اور ماورائے سخن باتوں کے علاوہ، ان کی نظم و نثر میں، اس اضطراب کا بھی اظہار ہوا ہے - اگر غور کریں تو ان کی شعری علامات اور استعاروں کا انتخاب بھی اسی تبدیلی کے اضطراب سے مشروط ہے مثلاً شاہین، لالہ، قلندر، مومن، ابلیس وغیرہ حرکت یا مخالف جمود تقاضوں، خصوصیات اور کیفیات کے نمائندہ ہیں - اسی طرح ان کے کلیدی تصورات جیسے خودی، بے خودی، عشق اور جنوں، محض فلسفیانہ catagories نہیں بلکہ وہ ارتقاے انسانی کے سفر کی مختلف منزلیں سر کرنے میں مدد دینے والی سہولتیں بھی فراہم کرتے ہیں -

آل احمد سرور نے فکر اقبال کے جن پہلوؤں کو لیا ہے ان کا تعلق بھی "تبدیلی" سے ہے - اب ہم اس کتاب کے تین موضوعات... اقبال کی نئی مشرقیت، ہندوستانی مسلمانوں کے تشخص اور ان کے اسلامی تصورات پر غور کریں گے -

(الف) اقبال کی نئی مشرقیت

سرور صاحب کی نظر میں اقبال نہ مشرقی ہیں نہ مغربی - بلکہ وہ "نئی مشرقیت" رکھتے ہیں - اسے انھوں نے "پرانی مشرقیت" سے ممتاز کیا ہے - جو عناصر سرور صاحب پرانی مشرقیت، نئی مشرقیت اور مغربیت میں گناتے ہیں وہ یہ ہیں:

پرانی مشرقیت:

مریض روحانیت، مزاج خانقاہی، تقدیر پرستی، بے عملی جو مبنی ہے

تصوف ترک آب و گل پر، آزادی فرد کا فقدان، فرد خاندان اور برادری کے رشتوں میں مقید اور مذہب سے زیادہ رسم و رواج سے وابستہ.... ہر تبدیلی سے خائف... جاگیرداری نظام اخلاق کی پابند۔

ع نئے ابلہ مسجد ہوں، نہ تہذیب کا فرزند

یہاں ابلۂ مسجد پرانی مشرقیت کی علامت ہے۔ تہذیب کا فرزند وہ ہے جو مغربی افکار و عقائد اور اداروں کو بلا تنقید قبول کر لیتا ہے۔ بلکہ ان کی تقلید میں اپنی نجات سمجھتا ہے (ص ۴۴)

مغربیت: اس کے دو پہلو ہیں۔

خیر: جب اس میں علمیت، عقلیت، تسخیر فطرت، انسان دوستی، ارضیت، خدمت خلق اور مساوات ہو۔

شر: جب اس میں مادیت، رومانیت، مشین کی حکومت، انسان کا استحصال، ہوس زر، سماجی ذمہ داریوں سے انکار، بے کاری، میخواری، اپنے تہذیبی اداروں کو دوسروں پر عائد کرنے کی ہوس ہو (ص ۱۴۶)

سرور صاحب شر والے تصورات کو رد کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مغرب میں جمہوری اداروں کے فروغ کے باوجود خیر کے تصور پر مناسب توجہ نہیں دی گئی۔ چنانچہ انفرادیت اور آزادی پر زور کے باوجود آزاد انسانوں کے سماج کو totalitarian ism میں پھنس جانے کا خطرہ ہمیشہ باقی رہے گا۔ (ص ۵۸)

نئی مشرقیت: یہ وہ مشرقیت ہے جو مغربیت کے خیر کے عناصر کو جذب کرنے سے بنتی ہے اقبال کی نئی مشرقیت کے عناصر یہ ہیں: آزادی تحریر، حریت فکر، انسان دوستی، سیکولر فکر، مغربی سائنس، عوامی بہبود، جمہوری طریقۂ کار، سماجی انصاف، مغربی ادب اور فکر کے مطالعے سے ملنے والے نئے معیاروں اور نئے پیمانوں کی مدد سے ماضی کا نیا عرفان، قومی وجود کا احساس، سوشلزم with a human face (ص ۸۰)

یہ نئی مشرقیت ماضی کے صالح عناصر اور اخلاقی اور روحانی بصیرت کے ساتھ جمہوری خیر کے تقاضوں کو قبول کرتی ہے جس کی مغرب میں ایک شاندار داستان ہے، جو سائنس اور ٹکنالوجی کی برکتوں اور لعنتوں دونوں کو پہچانتی ہے جو "اپنی تاریخ، اپنی تہذیب اور اپنے اجتماعی لاشعور کے وسیلے سے ہی انسانیت کے کاروان میں اپنا رول متعین کرتی ہے" (ص ۵۷)

یہ وہ نئی مشرقیت ہے جو "مشرق کو خلاصۂ کائنات نہیں کہتی بلکہ مغربی یا عالمی معیاروں کے ذریعے سے مشرق کو ایک نیا آدم بنانے کی طرف مائل کرتی ہے، جس کی تخلیقی صلاحیتیں لامحدود ہوں، جو انسانیت کے لیے رحمت بن سکے مگر جس کے قدم اپنی دھرتی پر مضبوطی سے جمے ہوں۔" (ص ۱۰۵)

مشرقیت اور مغربیت کی اصطلاحوں کی وضاحت کرتے ہوئے سرور صاحب کہتے ہیں (ص ۷۸-۸۰) کہ مشرقیت (جسے وہ orientalism کا مترادف قرار دیتے ہیں) ایشیائی تہذیب کی آئینہ دار ہے جس میں چینی، ہندوستانی، وسط ایشیائی اور مشرق وسطیٰ کی تہذیبیں شامل ہیں۔ یہ تہذیبیں ثروت مندر رہی ہیں۔ پھر یہ زوال پذیر ہو گئیں۔ ان میں حریت فکر ختم ہو گئی۔ تہذیب بالائی طبقے کی میراث بن گئی جس نے عوام کو غلام بنائے رکھا۔ روایت اور توہمات طاقتور ہو گئے مذہب کے نام پر عوام کا استحصال ہونے لگا۔ تصوف کے نام پر ترک دنیا کو اپنایا گیا۔ افلاطون کے زیر اثر دنیا کے مظاہر خیالی قرار پائے، وغیرہ۔ اس کے مقابلے میں مغرب نے نشاۃ ثانیہ کے بعد حرکت اور تبدیلی کو اپنایا۔ گویا انسانی تہذیب کی قیادت عہد وسطیٰ تک ایشیا نے کی۔ اس کے بعد مغرب قائد بن گیا۔ عہد وسطیٰ کے بعد مغرب نے جاگیرداری کے دور سے نکل کر سرمایہ داری، صنعتی انقلاب، ذہنی بیداری، رومانی فکر، اور سائنسی عقلیت کی منزلیں طے کیں۔ لیکن اس کے بعد اس سرمایہ دارانہ تہذیب کے اندرونی تضادات ابھر آئے،..... جس کا ایک طاقتور واقعہ اشتراکیت کا ظہور ہے۔ سرور صاحب کا کہنا ہے کہ مشرقیت اور مغربیت مکمل طور پر نہ منفی ہیں نہ مثبت۔ دونوں میں اچھے اور برے پہلو موجود ہیں۔

نئی مشرقیت کا ہندوستان میں آغاز، سرور صاحب کے مطابق، انیسویں صدی کے پہلے نصف میں، بنگال میں شروع ہوا جس کا نتیجہ بالآخر آزادی کی شکل میں نکلا۔ یہ مغربیت پر مشرقیت کی نہیں بلکہ نئی مشرقیت ("نئی مغربیت" کتابت کی غلطی ہے ص ۸۰) کی فتح تھی جو خود مغربی افکار کے انجذاب سے پیدا ہوئی تھی۔ سرور صاحب مشرقیت کے دو روپ دکھاتے ہیں۔ پہلا روپ وہ جس میں مشرقیت مذہب کو سب کچھ سمجھتی ہے اور مذہب میں بھی رسم ورواج کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ اخلاق کی اقدار کے سلسلے میں وہ جاگیرداری نظام اخلاق کی قائل ہے۔ اس مشرقیت کی مثال اکبر الہ آبادی ہیں۔ دوسری مشرقیت وہ ہے جو اقبال کے یہاں ملتی ہے۔ یہ نئی مشرقیت ہے جو مغرب کے زیر اثر وجود میں آئی۔ ہندوستان میں اس کی ابتدا راجہ رام موہن رائے سے ہوئی۔ اردو میں اس کا آغاز سرسید تحریک سے ہوا۔ (ص ۸۱-۸۲)

سرور صاحب سرسید تحریک / نئی مشرقیت کے دو پہلوؤں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ایک وہ جس میں سیاسی، سماجی اور تعلیمی مسائل اور اداروں کے مطالعے کے لیے مغرب کے عقلی اور

سائنسی طریقۂ کار سے مدد لی گئی ۔ اس میں مغرب کی ذہنی غلامی زیادہ ہے ۔ دوسرا پہلو وہ جس میں "مغربی فکر ، مغربی ادب کے مطالعے ، نئے معیاروں اور نئے پیمانوں کے علم سے ماضی کا عرفان حاصل ہوتا ہے ۔ قومی وجود کا احساس ہوتا ہے ۔ مغربی سائنس اور سیکولر فکر ، عوامی بہبود ، جمہوری طریقۂ کار اور سماجی انصاف کا جذبہ ابھرتا ہے ۔" (ص ۸۱ ۔ ۸۲) اس نئی مشرقیت کی اقبال نمائندگی کرتے ہیں ۔ وہ نہ خالص مشرقی ہیں نہ خالص مغربی ۔ وہ نیم مشرقی اور نیم مغربی ہیں ۔ سرور صاحب اقبال کے متعدد اشعار کا حوالہ دیتے ہیں جن میں مشرق اور مغرب دونوں سے استفادے پر زور دیا گیا ہے تاکہ انسانی مسائل کے حل دریافت کیے جا سکیں ۔ (ص ۸۵ ۔ ۹۳)

اقبال کی "نئی مشرقیت" پر سرور صاحب کے خیالات کا خلاصہ اوپر پیش کیا گیا ۔ محسوس ہو گا کہ مشرقیت ، مغربیت ، اور نئی مشرقیت کے عناصر کی نشان دہی ان تینوں میں موجود امتیاز کو واضح نہیں کر سکی ہے ۔ سرور صاحب "نئی مشرقیت" کے عناصر میں آزادیٔ تحریر ، حریت فکر ، انسان دوستی ، سیکولر فکر ، مغربی سائنس ، عوامی بہبود ، جمہوریت ، سماجی انصاف ، قومی وجود کا احساس اور سوشلزم with a human face کا ذکر کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ یہ سب مغربیت کے عناصر ہیں ۔ حالانکہ سوائے سائنس کے یہ تمام عناصر ماقبل زوال مشرقی تہذیبوں کا بھی حصہ رہے ہیں ۔ سرور صاحب اپنی "نئی مشرقیت" کے تصور میں مشرقی تہذیب کے ان تصورات اور اقدار کو شامل نہیں سمجھتے ۔ کیا اس بات کو یوں نہیں کہا جا سکتا کہ مغرب کی برتری کے احساس نے ہندوستانی مفکروں کو اپنے تہذیبی ورثے کے مطالعہ نو پر مجبور کیا ہو اور یوں ان تصورات اور اقدار کا احیاء ہوا ہو ۔ اس احیاء کا جواز یوں بھی ملا ہو گا کہ مغرب کی برتری کے عناصر کے ساتھ یہ تصورات اور اجزا میل کھاتے ہیں ۔ سرور صاحب مغرب کے "خیر" کے تصورات کی طاقت کے اس قدر قائل معلوم ہوتے ہیں کہ وہ اقبال کی شاعری میں پائے جانے والے انسان کی عظمت کے اجزا کو بھی مغربی اثر کا نتیجہ قرار دیتے ہیں ۔ "ان کی شاعری میں انسان کی عظمت کا جو رجز ملتا ہے اس میں ہمارے تصوف کی انسان دوستی کے عناصر سے مدد ضرور ملی ہے مگر دراصل یہ مغرب کی دین ہے" (ص ۸۷) اقبال پر مغربی فلسفے اور سائنس کے فیصلہ کن اثر سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا ۔ لیکن میری رائے میں اقبال نے انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کی پہلی دوسری دہائیوں میں یورپ میں رائج تصورات کو بعینہٖ قبول نہیں کیا تھا ۔ بلکہ ان تصورات نے اقبال کو خود اپنے مشرقی اور مسلم ورثے کے مطالعہ نو پر مجبور کیا جہاں سے انھوں نے ان مغربی تصورات سے ہم آہنگ تصورات کو اپنی فکر کی بنیادوں کے طور پر منتخب کر لیا ۔

سرور صاحب سرسید تحریک کو اردو میں نئی مشرقیت کا آغاز قرار دیتے ہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ اس تحریک نے فرد ، سماج ، فطرت اور کائنات کے نئے تناظر سے آشنا کیا ۔ ماضی کی گرفت

سے آزادی دلائی ۔ مذہب، تہذیب، ادب کو نئے زاویوں سے دیکھنا سکھایا۔ جمہوریت، آزادی، قومیت، سماج کی منصفانہ تقسیم کے تصورات کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ۔ مذہبی میدان میں خدا کے قول اور فعل میں مطابقت کی طرف توجہ دلائی اور دنیا اور دین دونوں کی اہمیت پر زور دیا (ص ۱۹)

اس میں کوئی شک نہیں کہ سید احمد خاں نے ایک تحریک چلائی ۔ کسی رجحان کے تحریک میں تبدیل ہونے کے لیے جن باتوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب اس میں موجود تھے ۔ ایک ادارہ تھا، ایک سے زیادہ رسالے اور تنظیمیں تھیں ۔ لیکن کیا اس تحریک نے وہ واقعی سب کچھ کیا جس کا سرور صاحب نے ذکر کیا ہے (اور جو ہماری ادبی، سماجی، علمی اور تہذیبی تاریخ کا حصہ بن چکا ہے) ؟ مجھے شک ہے ۔ اول تو یہ کہ سوائے سرسید کے، ان کے رفقا، یا ان سے متاثر ہونے والے بعد کے دور کے مصنفین میں سے کسی نے بھی ان موضوعات کو نہیں اپنایا ۔ مثلاً ان کے رفقا، میں محسن الملک، چراغ علی، وقار الملک، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، نذیر احمد، ذکاء اللہ، وحید الدین سلیم، وغیرہ نے ادب اور مذہب پر تو لکھا ہے لیکن متذکرہ دوسرے موضوعات کو چھوا بھی نہیں ۔ اردو نظم و نثر کے اسالیب اور موضوعات کو بدلنے اور زندگی اور ادب کے درمیان ایک حرکی اور بامعنی رشتہ قائم کرنے میں سرسید اور ان کے رفقا، نے تاریخی کارنامہ انجام دیا ۔ مذہب کے میدان میں چراغ علی نے سرسید کے معتزلی کلام کو سب سے زیادہ تقویت پہنچائی ۔ لیکن محسن الملک اور حالی نے مذہب کو عقلیانے کی کوشش میں سرسید کے غیر معتدل انداز پر تنقید کی ۔ اس کے علاوہ نہ ان کے دوسرے رفقا، نے اور نہ ان کے بعد سے اب تک سید احمد خاں کی اس مذہبی عقلیت پر کوئی توجہ دی گئی ہے ۔ جمہوریت، آزادی، قومیت پر سید احمد خاں کے زاویہ نظر کا پڑھنے والوں پر کوئی خاص اثر دکھائی نہیں دیتا ۔ سماج کی منصفانہ طبقاتی تقسیم بھی ان کا موضوع نہیں رہا ہے ۔ ان کا اصل مقصد مسلمانان ہند کی سماجی معاشی اور تہذیبی بازآبادکاری تھا ۔ اس کے لیے انھوں نے نظریاتی چوکھٹا فراہم کیا، اس کے حصول کے لیے جدید تعلیم کو واحد ذریعہ قرار دیا اور ام اے او کالج کے قیام کے ذریعے اسی مقصد کے حصول کا آغاز بھی کر دیا ۔ یہ تینوں کام، اس مخصوص مقصد کے لئے کسی اور شخصیت نے انجام نہیں دیے ۔ ایک اعلیٰ درجے کا ذہن ہی انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں بدلتے ہوئے سماجی، سیاسی اور معاشی منظر کا تجزیہ، اس تناظر میں مسلمانوں کے سماجی، سیاسی اور معاشی موقف کا تعین اور ان دونوں کی مدد سے مسلمانوں کی سماجی سیاسی اور معاشی بازآبادکاری کے لیے مغربی جدید علوم اور جدید تعلیمی نظام کو واحد ذریعے کے طور پر استعمال کر سکتا تھا ۔ سرسید کی عظمت سے انکار نہیں ۔ لیکن ان کی عظمت کے اقرار کے لیے یہ لازمی نہیں ہے کہ سرسید کے بعد کے پورے دور کی فکر اور تہذیب کو بھی سرسید / علی گڑھ تحریک کا نتیجہ قرار دیا جائے ۔ (فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، برہمو سماج،

عثمانیہ یونیورسٹی، انجمن پنجاب سے وابستہ تحریکوں کو اس ضمن میں سامنے رکھنا ہوگا)

سرور صاحب سرسید تحریک کے ہمہ گیر احاطے کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ "اقبال اسی تحریک کی پیداوار ہیں" (ص ۱۹) "اگر سرسید اور حالی نہ ہوتے تو اقبال بھی نہ ہوتے" (ص ۱۹) جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا، مجھے سرسید اور ان کی تحریک کے بعد کے فکری رجحانات یا مفکرین پر کسی گہرے اثر کے نشان دکھائی نہیں دیتے۔ بلکہ تعلیم کے میدان کے علاوہ دوسرے میدانوں میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ سرسید کی مذہبی فکر اور ان کی عقلیت پسندی کا کوئی مسلسل اثر بیسویں صدی کے مفکرین پر نہیں ملتا (بجز چند کے جیسے نیاز فتح پوری یا پرویز۔ مولانا آزاد نوجوانی میں سرسید سے متاثر ہوئے مگر بعد میں ان کے دائرہ اثر سے باہر آگئے)۔ خود ان کے رفقاء ان کی مذہبی تعبیرات سے متفق نہیں تھے (مثلاً محسن الملک، حالی) سرسید نے جس سماجی اور تہذیبی حقیقت پسندی کو برتا اور جس کی تلقین کی، آج تک ذیلی برآعظم کے مسلمانوں نے اسے مان کر نہیں دیا۔ سیاست سے الگ رہنے کی ہدایت کو سرسید کی موت کے آٹھ سال کے اندر ہی خود ان کے رفقاء نے خیرباد کہہ دیا اور مسلم لیگ کی داغ بیل ڈال دی۔ البتہ جدید تعلیم خصوصاً ام اے او کالج کا ٹھوس اثر یقیناً پڑا۔ اور یہاں بھی اگر ام اے او کالج، یونیورسٹی نہ بنتا تو شاید دہلی کالج کی طرح جدید تبدیلیوں کو تسلیم کرنے والے ایک ادارے کے طور پر اس کا نام محض تاریخ میں رہ جاتا۔ یونیورسٹی بننے کے بعد بھی اس سے استفادہ کرنے والوں کی غالب اکثریت کا تعلق صرف شمالی ہند تک محدود رہا۔ یہی صورت حال کم و بیش، آج بھی برقرار ہے۔

اقبال کو دیکھیں تو ان کی شاعری اور خصوصاً فکر پر سرسید تحریک، سرسید یا حالی کا بہت کم اثر دکھائی دیتا ہے۔ اگر سرسید اور اقبال کو سامنے رکھیں تو دونوں میں اختلافی عناصر کی تعداد زیادہ ہی نکلے گی۔ مثلاً سرسید مغربی حکمرانی اور مغربی تہذیب کو مکمل طور پر قبول کر چکے تھے۔ اقبال دونوں پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ سرور صاحب خود کہتے ہیں کہ سرسید کے اثر سے مغرب کی ذہنی غلامی نئے ذہن میں عام ہو رہی تھی، اقبال نے اس سے آزاد ہونا سکھایا (ص ۲۰)۔ سرسید کی عقلیت کو سرور صاحب انیسویں صدی کی رعونت پسند عقلیت بتاتے ہیں اس کے برخلاف اقبال پرسوز عقلیت کے قائل تھے (ص ۲۰) سرسید اور اقبال دونوں مغرب کی جمہوریت کو رد کرتے ہیں مگر مختلف وجوہات سے۔ سرسید ایک مخصوص سیاسی صورت حال (مسلمانوں کا عددی اقلیت میں ہونا) کے پیش نظر جمہوری عمل کو ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے سیاسی طور پر نقصان دہ سمجھتے ہیں جبکہ اقبال کو مغربی جمہوریت کے تصور ہی سے اصولی اختلاف ہے۔ پھر سرسید مسلمانوں میں طبقاتی تفریق (اشراف، اجلاف) کے شدت سے قائل ہیں۔ اقبال کے یہاں یہ خیال مفقود ہے۔ جہاں جہاں سرسید اور اقبال میں چند مغربی تصورات کے بارے میں مماثلت دکھائی دیتی ہے وہ اس لئے نہیں کہ اقبال نے سرسید یا ان کے رفقاء سے استفادہ کیا ہے۔ بلکہ اس لیے کہ سرسید کی طرح اقبال

مغرب، مغربی تہذیب اور افکار سے براہ راست واقفیت رکھتے ہیں۔ (سرسید اور اقبال پر مغرب کے اثرات کا تقابلی مطالعہ ایک الگ فکر انگیز موضوع ہے۔)

سید احمد خاں اور اقبال دونوں جدید ہندوستان کی تہذیبی تاریخ کی دو اہم ہستیاں ہیں۔ سید احمد خاں ذیلی براعظم کے ان عظیم مفکروں میں سے ہیں جنھوں نے اس خطہ زمین کی تہذیب کو عہد متوسط سے نکال کر عہد جدید میں داخل ہونے پر توجہ دلای، بلکہ داخل ہونے میں مدد دی اس تاریخی عمل میں وہ تنہا نہیں تھے۔ ان کے علاوہ یہی کام ان کے چند اور مسلم اور غیر مسلم معاصرین اپنے اپنے طور پر انجام دے رہے تھے۔ہاں، اس میں کوی شک نہیں کہ مسلمانوں کو عہد جدید میں فکری اور تہذیبی ہجرت کی جانب ایک پر اعتماد اور جارحانہ انداز میں راغب کرنے کا کام سید احمد خاں نے تن تنہا شروع کیا تھا۔ تعلیمی، معاشرتی، فکری اور مذہبی تجدیدی فکر کے میدانوں میں ان کا کام بے نظیر ہے۔ سوائے مذہبی تجدیدی فکر کے دوسرے تمام میدانوں میں سید احمد خاں کامیاب رہے۔ مسلمان اس عہد میں جس تہذیبی اور فکری پس ماندگی سے گزر رہے تھے اور یوروپ نے جس طاقت کے ساتھ مسلمانوں پر سیاسی، تہذیبی اور علمی حملہ کیا تھا، اگر ان دونوں باتوں کو سید احمد خاں کی تعلیمی اور فکری میدان میں کامیابیوں کے ساتھ رکھا جائے، تب ہی سید احمد خاں کی عظمت کے ابعاد کا اندازہ ہو سکے گا۔ اگر اس تہذیبی اور فکری فضاسازی کو پیش نظر رکھا جائے تو شاید فکر سید احمد سے ہم فکر اقبال کو جوڑ لینے کا جواز فراہم کر لیں۔ ورنہ، سچ تو یہ ہے کہ اقبال کا فکری نظام، ان کے علمی اور شاعرانہ توجہ کے مراکز، تجزیہ و تنقید کے آلات اور ذرائع..... ان سب کا سید احمد خاں کی فکر یا سرسید تحریک سے کوی جوڑ بیٹھتا نہیں۔ پھر اقبال کی لغت، محاورہ، لہجہ، استعارہ، علامت..... سب ان کے اپنے ہیں یا پھر سید احمد خاں کے عظیم ہم عصر غالب کے عطا کردہ۔

(ب) ہندوستانی مسلمانوں کا تشخص

اس موضوع پر کافی گفتگو ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس پر کوی بھی رائے سب کے لیے قابل قبول ہوگی۔ تشخص دنیا کے ہر ملک میں مختلف گروہوں کے مفادات کے تحفظ کی بنیاد بن چکا ہے۔ ذرائع علم میں حیرت ناک اضافے نے اپنے اور دوسروں کے بارے میں معلومات کو سریع الحصول بنادیا ہے۔ اب میں، ہم، تم اور وہ کے درمیان امتیاز از خود واضح سے واضح تر ہوتا جارہا ہے۔ ہر معاشرہ ذرائع علم کے اضافے کے تناسب سے زیادہ سے زیادہ تشخصات میں تقسیم ہورہا ہے اور ان تشخصات / شناختوں کے باہمی ٹکراو کے جاری عمل نے عہد حاضر میں وہ کیفیت پیدا کر دی ہے جسے ہم سہولت کی خاطر" اقدار کا بحران" سے تعبیر

کرتے ہیں۔ آزادی سے پہلے اس مسئلے کی نوعیت اسقدر پیچیدہ نہیں تھی جس قدر آج ہے، ہمیں فی الوقت آزادی سے پہلے ہندوستانی مسلمانوں کے تشخص پر اقبال کے خیالات کا جائزہ لینا ہے۔ موضوع میں بنیادی سوال یہ ہے کہ آیا ہندوستانی مسلمانوں کے تشخص کے مذہبی اور ہندوستانی قومی کردار میں باہمی کوئی رشتہ ہے یا نہیں ہے؟ اگر ہے تو اس رشتے کی نوعیت کیا ہے۔ اسی کے ساتھ مسلمانوں کی قومیت، ملک کی تقسیم اور پاکستان تحریک جیسے پیچیدہ موضوعات جڑے ہوئے ہیں۔ کتاب میں متعدد جگہ دوسرے موضوعات کے ضمن میں ان کا ذکر بھی آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان ضمنی تذکروں پر تفصیلی تبصرہ ممکن نہیں ہے۔ ان تذکروں میں مسلمانوں کے مذہبی، قومی اور تہذیبی تشخص پر ابوالکلام آزاد اور اقبال کے خیالات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی آل احمد سرور صاحب کا خیال ہے کہ آزاد اور اقبال دونوں کے ذہن میں ان تینوں شناختوں کا مسئلہ پوری طرح واضح تھا۔ سیاسی لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہونے کے باوجود ان شناختوں کو دونوں تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ان تینوں کے باہمی تعلق پر دونوں میں اختلاف ہے۔

سرور صاحب کے مطابق اقبال کے یہاں اسلامی تشخص کچھ اسطرح ابھرتا ہے (ص ۶۳۔۶۴) "اسلام اپنے مزاج اور کردار کے اعتبار سے لامقامی ہے۔ اس نے مختلف نسلوں کو ایک اجتماعی شعور دیا ہے ... اقبال نے مدنیت اسلام کے عنوان سے اپنی نظم میں اسلامی تشخص کو روح القدس کے ذوق جمال کے ساتھ عجم کے حسن طبیعت اور عرب کے سوز دروں سے تعبیر کیا ہے۔ جس میں نہ عصر رواں کی حیا سے بیزاری ہے اور نہ عہد کہن کے افسانہ و افسوں ہیں.... ماضی کے عرفان کے معنی ان کے یہاں زندگی کے اخلاقی مشن کے اور سماجی مساوات کے اس تصور کے ہوتے ہیں جس کا خواب اسلام نے دیکھا اور دکھایا.... توحید اور رسول اکرم کی شخصیت بنیادی رہنمائی کا سرچشمہ ہیں۔ فرد کی آزادی، شخصیت کی تکمیل، مرد اور عورت کی مساوات، اس تشخص کے اہم تصورات ہیں۔ اس میں دین و دنیا کی دوئی نہیں..... علماء ارباب کلیسا کا موقف نہیں رکھتے.... عرب کی شہنشاہیت "اس فقر غیور سے ایک انحراف ہے" جس کی مثال رسول اللہ کی شخصیت ہے۔ "یہ تشخص عرب کی شہنشاہیت کو نہیں، عرب کو مرکزی اہمیت دیتا ہے۔" اس تشخص میں علاقائیت بھی ہے اور اس سے ماورا کا تصور بھی ہے۔" اقبال مقام کے خلاف نہیں۔ مقام میں قید ہونے کے خلاف ہیں۔" منزل آفاقیت ہے۔" اقبال وطن پرست نہیں۔ وطن دوست ہیں۔" وہ قومیت (nationalism) کو اسلامی تشخص کے لیے صرف ان ملکوں میں خطرہ سمجھتے ہیں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں کیونکہ ان ممالک میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے قومیت اسلامی تشخص سے برسرپیکار نہیں ہوتی۔ ہاں، ان ممالک میں جہاں وہ اقلیت میں ہیں اسلامی تشخص کے لیے ایک خطرہ ضرور رہتی ہے۔"

اقبال کے اسلامی تشخص کے تصور کے ساتھ سرور صاحب مولانا ابوالکلام آزاد کے

ہندوستانی مسلمان کے "دہرے تشخص" کے تصور کا ذکر کرتے ہیں۔ (ص ۶۳) آزاد کا خیال ہے کہ (غیر منقسم) ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں نہیں ہیں..... اقلیت ہونے کے لیے تعداد کے علاوہ دوسرے عوامل کی موجودگی بھی ضروری ہے.... ہندوستانی مسلمان ایک عظیم گروہ ہے.... وہ ہندوستان کے دوسرے گروہوں کی طرح معاشرتی اور نسلی تقسیموں میں بٹے ہوئے نہیں ہیں۔ مساوات اور اخوت کے اسلامی رشتوں نے انھیں معاشرتی اعتبار سے بٹ جانے سے محفوظ رکھا ہے۔ اس اسلامی تشخص کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کا ایک ہندوستانی تشخص بھی ہے۔ اس طرح مسلمان ہندوستان میں دہرا تشخص رکھتا ہے اور ان دونوں میں کوئی ٹکراو نہیں۔

سرور صاحب ان دونوں نقاط نظر کا مقابلہ کرتے ہیں (ص ۶۴)۔ اسلامی تشخص آزاد اور اقبال دونوں کے پاس حقیقی وجود رکھتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ آزاد اسلامی کے ساتھ ہندوستانی تشخص کے بھی قائل ہیں اور اقبال، بقول آل احمد سرور "اسلام کے روحانی اور اخلاقی مشن کی تکمیل کی خاطر اس ملک یا اس ملک کے علایق یا اس کے سماجی خیر کے تقاضوں کو چنداں اہمیت نہیں دیتے۔" سرور صاحب ان دونوں نقاط نظر کو پوری طرح تشفی بخش قرار نہیں دیتے۔ آزاد کے دہرے تشخص کو وہ پوری طرح قبول کرتے ہیں لیکن آزاد کے اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو اقلیت نہیں کہا جاسکتا... "یہ حقیقت سے بعید بات ہے۔" اس کے علاوہ مولانا نے اس بات کو بھی نظر انداز کیا کہ ہندوستان جیسے مخلوط سماج میں اس کی تہذیب اور قومی سیاسی تقاضے بہرحال اسلامی تشخص کو قدرتی طور پر کم کرنے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اقبال کے نقطہ نظر سے سرور صاحب کو زیادہ اختلاف ہے۔ وہ اقبال کے اس خیال پر تنقید کرتے ہیں کہ جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں قومیت اسلام سے نہیں ٹکراتی مگر جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں اسلامی تشخص کو اس علاقے کی غیر مسلم اکثریت کی قومیت سے خطرہ لگا رہتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "اقلیتی علاقوں میں صرف اسلامی تشخص پر اصرار اور قومی یا علاقائی تشخص سے انکار یا ان کی طرف سے بے زاری یا بے پروائی درست نہیں"...... ایک مشترک قومی تہذیب، قومی سماج اور قومی سیاسی نظام بھی ایک وحدت چاہتا ہے۔ اس وحدت میں کثرت کی جلوہ گری، یکسانیت کی بجائے رنگا رنگی اور ایک اکہرے پن کی بجائے کثیر الابعاد تشخص کا نہ صرف تصور کیا جاسکتا ہے بلکہ یہ عملاً ممکن بھی ہے۔" (ص ۶۶) انھیں اقبال کے اسلامی تشخص پر اصرار سے اختلاف نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اقبال جہاں مسلم اکثریت کے علاقوں میں مسلمانوں کے لئے اسلام کے اخلاقی اور روحانی مشن کی تکمیل کا کام تجویز کرتے ہیں وہاں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ "قومیت کے تقاضے ہر ملک میں ہیں اور ان کی قوت، وسعت، گہرائی اور اثر پذیری سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ نیز صرف اختلاف اور امتیاز پر زور اور مشترک تہذیبی اور سماجی اور علاقائی تقاضوں کو نظر انداز کرنا کسی طرح صحت نظر کی دلیل نہیں ہے۔" (ص ۶۶) اس کے علاوہ سرور صاحب ایک نئے عنصر کا ذکر کر کے تشخص کی

بحث کو بڑھاتے ہیں۔ وہ ہے مغربی کلچر کے ساتھ اسلامی یا ہندوستانی تشخص کا باہمی ٹکراو۔ جب اسلامی یا ہندوستانی تشخص کا سامنا "مغربی یا عالمی، سائنسی، اور سیکولر کلچر" سے ہوگا جس کے اثر کی ہمہ گیری مسلم ہے تو اسلامی تشخص کو کیسے برقرار رکھا جا سکتا ہے" (ص ۶۶-۶۷) اس کے لیے سرور صاحب مولانا آزاد کا قول دہراتے ہیں کہ دین اور شریعت میں فرق کیا جائے۔ (یہ اصلاً شاہ ولی اللہ دہلوی کا تصور ہے۔ (۲) اور اسلامی بنیادی عقائد کو برقرار رکھتے ہوئے "روزمرہ زندگی کے قوانین میں اجتہاد کی اجازت کی روشنی میں حسب ضرورت ترمیم کی جائے۔" (ص ۶۷)۔ اگر اسلامی تشخص کی برقراری کی خاطر قومی زندگی کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو بقول آل احمد سرور (ا) قدامت پسند اور مخالف تبدیلی طبقے کو تقویت پہنچے گی (ب) اکثریت اور اقلیت میں خلیج حائل رہے گی اور (ج) مذہب محض چند رسوم کا نام ہو جائے گا۔ (ص ۶۷)

اسلامی تشخص کی برقراری اور قومی زندگی کے تقاضوں کے درمیان تصادم کے ہونے یا نہ ہونے کا انحصار اس پر ہے کہ اسلامی تشخص اور تقاضوں کی مفصل نشان دہی کی جائے۔ دین اور شریعت میں فرق کرنے کا مشورہ شاہ ولی اللہ نے دیا تھا۔ دونوں میں امتیازی مثالیں بھی دی تھیں لیکن انھوں نے دین اور شریعت کے تمام بنیادی عناصر یا اصول و فروع کی تفصیل نہیں دی تھی۔ یہ نہیں بتایا کہ یہ باتیں دین کی ہیں جن میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ اور یہ وہ شریعت کی باتیں ہیں جن میں (مختلف شرائط کے ساتھ) زمانے کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مناسب رد و بدل ہو سکتا ہے۔ اجتہاد کا تصور بھی دین اور شریعت کے درمیان اسی امتیاز سے جڑا ہوا ہے۔ اجتہاد اصول میں نہیں فروع ہی میں ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر فروع کے حدود ہی واضح نہ ہوں تو اجتہاد کے لیے دائرہ عمل بھی دستیاب نہیں ہو سکتا۔ شاہ ولی اللہ کے بعد بھی کسی نے اس مسئلے کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ بیسیں نہیں دنیا کے کسی مسلم ملک میں بھی اس پر اصولاً کام نہیں ہوا ہے۔ قوانین اسلام میں یقیناً یہ ہوا ہے کہ مختلف ملکوں میں شریعت کے حدود میں رہتے ہوئے بعض قوانین کو (عقائد کو نہیں) معطل رکھا گیا یا ان میں تبدیلی کی گئی یا دوسرے قوانین کی مدد سے ان کی حد بندی کی گئی۔ اس مسئلے کی نزاکت کے پیش نظر علما، اور مسلم حکومتوں کا احتیاط برتنا سمجھ میں آتا ہے۔

ہمارے ملک میں جہاں سنگھ پریوار کی فرقہ پرستی نے مسلم شناخت ہی کو مخالف ملک اور مخالف قوم قرار دے دیا ہے اور ملک کے سیاسی ایجنڈے میں اسے پہلا مقام دے رکھا ہے، وہاں دین اور شریعت، اجتہاد، اور قومی تقاضوں کے تحت قوانین میں ترمیم پر غور و فکر بے محل معلوم ہوتا ہے۔ سرور صاحب نے اس مسئلے کو نظر انداز کرنے کے جن تین نتائج کا ذکر کیا ہے ان پر قوانین میں ترمیم کا بھی کچھ اثر نہیں پڑے گا۔ مخالف مسلم فضا نے قدامت پسند طبقے کو مزید طاقتور کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ دین، شریعت اور اجتہاد جیسے موضوعات کا تعلق اسی طبقے سے

ہے۔ اسے نظرانداز کر کے مسلم دانشور طبقہ اس خصوص میں کیا کر سکے گا؟ دوسری بات یہ کہ فرقہ پرست مسلم دانشوروں کو بھی منفی مسلم شناخت میں شامل کرتے ہیں۔ مسلمانوں پر شک و شبہ کرنے والوں کے لیے یہ کافی نہیں کہ قومی تقاضوں کی اہمیت کو تسلیم کر کے قوانین اسلام میں ترمیم کے لیے مسلمان تیار ہوجائیں۔ وہ اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتے جب تک مسلم قدامت پسند اور دانشور، دونوں طبقے اپنی مذہبی اور تہذیبی شناخت پر اصرار کرتے رہیں گے۔ کینٹول اسمتھ نے ۱۹۵۸ء میں امید ظاہر کی تھی کہ ہندوستان ہی وہ ملک ہے جہاں مستقبل میں اسلام کی نئی تعبیر ممکن ہوسکے گی۔ ہندوستان کے communalise ہوجانے کے بارے میں انھوں نے سوچا بھی نہ ہوگا۔ مسلمانوں سے قطع نظر ہندوستان میں مذہب کو نفرت کی علامت کے طور پر ابھارنے کی پوری ذمہ داری اس فرقہ پرستی پر ہے۔ وہ ہندوستانی عوام کو عصری بننے کی مہلت دینا نہیں چاہتے۔

سوال یہ ہے کہ مذہبی، قومی اور تہذیبی تشخص.... ان میں کیا فرق ہے؟ ان کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

مذہبی تشخص: عقائد اور عقائد میں پیوست تہذیبی اور اخلاقی اقدار سے تشکیل پاتا ہے۔ یہ تشخص آفاقی ہے۔ مسلمان جہاں بھی ہو، ان دونوں سے پہچانا جائے گا۔

تہذیبی تشخص: اس میں مذہبی عقائد اور تہذیبی اقدار کے ساتھ دوسرے عناصر بھی شامل ہوجاتے ہیں۔ جیسے زبان، لباس، فنون لطیفہ، ادب، رسم و رواج۔ یہ عناصر تہذیبی تشخص کو علاقائی بنادیتے ہیں۔ مثلاً ہندوستانی مسلمان، مصری مسلمان سے، مذہبی اور اسلامی تہذیبی اقدار کے اشتراک کے باوجود، مختلف ہے۔

قومی تشخص: یہ بنیادی طور پر سیاسی تشخص ہے، ملکی تشخص ہے۔ یہ مذہبی اور تہذیبی دونوں شناختوں کا احاطہ کرتا ہے۔ لیکن یہ اسقدر سادہ مسئلہ بھی نہیں۔ جو بحث اوپر ہوئی ہے اس کی روشنی میں اقبال کے مطابق ایک ہی ملک ہندوستان میں ایک سے زائد قومیں ہیں۔ اور ان کی قومیت کی بنیاد مذہب پر ہے۔

گویا یہ تینوں تشخص اپنی اساس کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن اپنے پھیلاو کی وجہ سے ایک دوسرے کے تشخص میں درآتے ہیں۔ اگر کسی ایک تشخص کی مداخلت دوسرے تشخص کے مرکزی عناصر کو مجروح کرنے کا تقاضا رکھے تو دونوں تشخصات میں تناو اور ٹکراو کی صورت پیدا ہوسکتی ہے۔ مولانا آزاد کے نزدیک ان تینوں تشخصات میں باہمی کسی ٹکراو کی گنجائش نہیں۔ مذہبی تشخص، تہذیبی اور قومی تشخص کا ایک فطری جزو ہے۔ اس کے برخلاف اقبال کے نزدیک مسلمانوں کی یہ تینوں شناختیں، اس وقت کے ملک کے سیاسی حالات کے تناظر میں، دوسری قوموں یا گروہوں کی شناختوں کے لئے قابل قبول نہیں تھیں۔

ویسے اقبال نے کہیں تشخص کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ وہ قومیت، اسلام اور مسلمانوں کی تہذیب اور تہذیبی روایات کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "قومیت حب وطن کے معنوں میں بلکہ اپنے وطن کے لیے جان قربان کر دینے کے معنوں میں مسلمان کے ایمان کے حصہ ہے۔ قومیت اسلام سے اس وقت متصادم ہوتی ہے جب وہ ایک سیاسی تصور کا کردار ادا کرنا شروع کرتی ہے اور انسانی استحکام (human solidarity) کے ایک ایسے اصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے جس کا مطالبہ ہے کہ اسلام قومی زندگی میں ایک زندہ عنصر کی طرح کام کرنا چھوڑ دے اور محض ایک نجی خیال کے طور پر پس منظر میں چلا جائے۔ (۳)
قومیت اور اسلام کے درمیان تعلق کی نوعیت مسلم اکثریتی اور اقلیتی علاقوں میں الگ الگ ہوتی ہے۔

It becomes a problem for Muslims only in countries where they happen to be in a minority, and nationalism demands their complete self-effacement. In majority countries Islam accomodates nationslim, for there Islam and nationalism are practically identical; in minority countries it is justified in seeking self determination as a cultural unit. In either case it is thoroughly consistent with itself.. (4)

اوپر کے اقتباس میں اقبال اپنے ایک اساسی سیاسی اصول کا ذکر کر رہے ہیں۔ وہ یہ کہ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں وہ ایک تہذیبی وحدت کی طرح خود اختیاری طلب کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ اس خیال کو اصول کے طور پر قبول کرنا مشکل ہے۔ کیا یہ اصول صرف مسلم اقلیتوں سے مخصوص ہے یا ہر مذہبی اقلیت بھی کرے گی؟ اگر صرف مسلمانوں سے مخصوص ہے تو کیا تمام مسلم اقلیتی علاقوں مثلاً یورپ، انگلینڈ، امریکہ، چین میں بھی مسلمانوں کو تہذیبی خود اختیاری کے لیے سیاسی جدوجہد کرنا ہوگا؟ کیا یہ عملاً ممکن ہے؟ پھر یہ جدوجہد تہذیبی خود اختیاری کے لیے کیوں ہو، بطور اسلامی مذہبی خود اختیاری کیوں نہ ہو؟
اقبال کا یہ خیال بھی صحیح معلوم نہیں ہوتا کہ اسلام اور قومیت مسلم اکثریتی علاقوں میں ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔ اول تو اس خیال میں وہ ملکی قومیت کو تسلیم کرتے نظر آتے ہیں حالانکہ وہ علاقائی یا وطن کی بنیاد پر قومیت کے قائل نہیں۔ (اس کا ذکر آگے آئے گا) وہ تو صرف اسلامی قومیت کے قائل ہیں۔ مسلم ملکوں کی تاریخ اور معاصر حالات اس خیال کی تائید نہیں کرتے اگر یہ موقف اختیار کیا جائے کہ اسلام ہی قومیت بھی ہے اور مسلم اکثریتی علاقوں میں قومیت کا

سوال سرے سے اٹھتا ہی نہیں، تو بات کچھ صاف ہو سکتی ہے۔ اقبال کی نظروں میں سب سے محترم مفکروں میں سے ایک سید جمال الدین افغانی کا قول ہے "لاجنسیہ فی الاسلام"۔ لیکن انھوں نے ہر مسلم ملک کے سیاسی وجود کو مان کر ان ملکوں میں کام کیا۔

اس صدی کی تیسری دہائی میں ہندوستانی مسلمانوں کی قومیت کے موضوع پر مولانا حسین احمد مدنی اور اقبال کے درمیان ایک تلخ بحث ہوئی تھی۔ (۵) مولانا حسین احمد مدنی نے ۸ / جنوری ۳۸ء کو دہلی میں ایک تقریر کی۔ اس میں انھوں نے اس خیال کو ظاہر کیا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ اقبال نے اس پر شدید تنقید کی اور ایک قطعہ کہہ دیا:

عجم ہنوز نہ داند رموز دیں ورنہ ز دیوبند حسین احمد این چہ بوالعجبی است
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است

دونوں کے خیالات کی تائید اور مخالفت میں گرم بحث چھڑ گئی۔ اقبال مذہبی قومیت پر ایقان رکھتے تھے یعنی مسلمان اسلام کی بنیاد ہی پر ایک ملت / قوم ہو سکتے ہیں۔ مولانا حسین احمد نے اس خیال کا اظہار برطانوی حکمرانی کے خلاف ہندو مسلم متحدہ جدوجہد آزادی کے تناظر میں کیا تھا۔ انھوں نے کہا۔ "ہماری مراد قومیت متحدہ سے اس جگہ وہی قومیت متحدہ ہے جس کی بنا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ میں ڈالی تھی، یعنی ہندوستان کے باشندے خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، بہ حیثیت ہندوستانی اور متحد الوطن ہونے کے ایک ہو جائیں اور اس پردیسی قوم سے جو کہ وطنی اور مشترک مفاد سے محروم کرتی ہوئی سب کو فنا کر رہی ہے، جنگ کر کے اپنے حقوق حاصل کریں"۔ اور ایسا کرتے ہوئے مسلمان اور دوسری قومیں اپنے اپنے پرسنل لا، کلچر، تہذیب، کو محفوظ رکھیں۔ قومیت کے اس تصور میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جس کی بنا پر مولانا مقام محمدؐ عربی سے بے خبری کے طعنے کے مستحق قرار دیے جائیں۔ بعد میں اقبال نے کہا کہ اگر مولانا کا مقصد محض ایک تاریخی واقعے کا اظہار ہے، مسلمانوں کو اس غیر اسلامی مغربی تصور قومیت کو قبول کرنے پر آمادہ کرنا نہیں ہے تو کوئی اعتراض نہیں۔ پھر مولانا حسین احمد نے وضاحت کی کہ ان کا مقصد زمانے کی ذہنیت کی خبر دینی تھی مشورہ نہ تھا۔"

مسلم قومیت کے بارے میں حسین احمد مدنی اور اقبال کے خیالات میں جو فرق ہے وہ مبنی ہے ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی مفادات کے بارے میں دونوں کے خیالات میں فرق پر۔ حسین احمد مدنی اس مکتب خیال سے تعلق رکھتے تھے جو غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کے مفادات کو محفوظ سمجھتا تھا۔ اقبال کا تعلق اس گروہ سے تھا جو ہندوستانی مسلمانوں کے محفوظ مستقبل کے لیے علٰحدہ سیاسی وحدت / وحدتیں ضروری سمجھتا تھا۔ دونوں نے اپنے اپنے مقصد

کے لیے مسلمانوں کے تشخص اور قومیت کے تصورات پیش کیے ۔ سیاسی طور پر انہیں یہی کرنا چاہیے تھا ۔ آج بھی سوچنے والے یہی کر رہے ہیں ۔ لیکن اِس میں اور پچھلی صورت حال میں فرق ہے ۔ آج سنگھ پریوار کا ہندو قومیت کے بارے میں وہی نقطہ نظر ہے جو اقبال کا مسلم قومیت کے بارے میں تھا ۔ یعنی وہ صرف ہندو قومیت کو مرکزی اہمیت دے رہا ہے اور اسی کے مطابق ملک کا سیاسی اور تہذیبی نقشہ بنانا چاہتا ہے ۔ اور مسلمان ابو الکلام آزاد اور حسین احمد مدنی کی تعبیر پر اصرار کر رہے ہیں ۔

جمہوریت کے بارے میں اقبال کے شکوک و شبہات کے بارے میں بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس عہد کے سیاسی حالات کے پیدا کردہ تھے ۔ سرور صاحب نے ٹامسن کے نام ۱۹۳۰ء کے ایک خط کا حوالہ دیا ہے جس میں اقبال نے لکھا تھا ۔ "آپ جانتے ہیں میں جمہوریت میں ایمان نہیں رکھتا ۔ جمہوریت کی طرف قدم (جو میرے نزدیک ہلاکت خیز ہوگا) بہر حال اٹھایا جاچکا ہے ۔ اب ہمیں مالی تباہی، سیاسی تراج اور ہندوازم سے پارہ پارہ ہونے کے لیے تیار کرنا چاہیے جو اس وسیع، غیر منظم اور فاقہ کش ملک میں جمہوریت کے نفاذ کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے ۔ کوئی قرطاس ابیض ہمیں ہندوستان کے تیز ہوس سیاست دانوں کے طرز عمل کے نتائج سے بچا نہیں سکتا جن کی ہندوستانی حالات کی تصویر نے بہت سے لوگوں کو ہندوستان میں اور اس سے باہر گمراہ کیا ہے ۔" (ص ۱۱۳)

اقبال کے اس موضوع پر خیالات کا تجزیہ کرتے ہوئے سرور صاحب محمد علی جناح کے نام اقبال کے ان خطوط کا ذکر کرتے ہیں جن میں انھوں نے کہا تھا کہ شمالی مغربی صوبوں میں (جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے) مسلمانوں کا علحدہ صوبہ قائم کیا جائے اور ان مسلمانوں کو جو دوسرے صوبوں میں اقلیت میں ہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے ۔ ان کی رائے ہے کہ اقبال نے اپنے آفاقی اسلامی قومیت کے نظریے کے باوجود، مسلم قوم کے لیے ایک علاقائی بنیاد کو بہر حال تسلیم کر لیا ۔ اور "قید مقامی جس کا نتیجہ وہ تباہی سمجھتے تھے بالآخر اس بندہ آفاقی کو بھا گئی ۔" (ص ۱۲۳) یہی تجزیہ عزیز احمد نے بھی ۱۹۶۷ء میں کیا تھا ۔ (۶)

اقبال کی یہ تجویز ظاہر کرتی ہے کہ وہ معاصر سیاسی حالات، خصوصاً ہندو اکثریت کے ممکنہ جمہوری غلبے اور اس کے مسلم اکثریت پر منفی اثرات سے اسقدر مایوس تھے کہ وہ ملک کے ایک دو مسلم اکثریتی صوبوں میں آباد ہندوستانی مسلمانوں کی اقلیت کو بچانے کے لیے ملک کے کئی مسلم اقلیتی صوبوں میں منتشر مسلمانوں کی اکثریت کو ان کے حال پر چھوڑ دینے کے لیے تیار تھے ۔ یہ شاید اس لیے کہ وہ پُر امید تھے کہ ان صوبوں کے مسلمان سیاسی خود اختیاری حاصل کر کے ایک مثالی اسلامی معاشرہ قائم کر لیں گے ۔ پچھلے (۴۵) سال میں جو کچھ ہوا وہ بتاتا ہے کہ اقبال کی یہ امید پوری نہیں ہوئی ۔ اقبال نے مستقبل کو ایک شاعر کی طرح دیکھا ۔ لیکن ابو الکلام آزاد کی سیاسی

پیش گوئی جو انھوں نے ۴۶ء میں کی تھی ، درست ثابت ہوئی کہ پاکستان جلد یا بدیر مختلف قومیتوں میں بٹ جائے گا۔ چنانچہ آج پاکستان اسی مسئلے میں گرفتار ہے ، اس کے علاوہ کیا یہ نکتہ اقبال کی اسلامی فکر کی نظر سے اوجھل رہا کہ پیغمبر اسلام نے اسلامی معاشرہ پہلے قائم کیا اور سیاسی نظام بعد میں؟

آئیے قومیت کے مسئلے پر لوٹ آئیں۔ حسین احمد مدنی اور اقبال کے درمیان جو بحث ہوئی تھی اس بحث کا حوالہ دیتے ہوئے آل احمد سرور اقبال پر تنقید کرتے ہیں کہ اقبال نے لفظ نیشن کے مفہوم کو متعین کرنے کے سلسلے میں دقت نظر سے کام نہیں لیا۔ اقبال کی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے ملت کو "نیشن" کے مترادف قرار دیا۔ جس کا ترجمہ "قوم" نہیں۔ "قوم کا لفظ ہمارے یہاں مذہبی برادری یا ذات ، فرقے کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے۔ اسلامی برادری کے لیے ملت کا لفظ ہے۔ "قوم" کا لفظ جدید معنی میں نیشن کے لیے استعمال ہوتا ہے (ص ۱۲۲) اور نیشن میں علاقائی حدود ، زبان ، تہذیب ، مذہب ، اور یک جنسی کا احساس ضروری ہے (ص ۲۲) مولانا مدنی کی طرح آل احمد سرور بھی یہ سمجھتے ہیں کہ قومیں مذاہب سے نہیں بنتیں۔ مولانا آزاد کی طرح ان کا بھی یہی خیال ہے کہ ہندوستانی قوم کا حصہ ہوتے ہوئے ہندوستانی مسلمان ایک الگ شخصیت رکھتے ہیں۔ ان کا اپنا ایک مخصوص مذہبی اور تہذیبی وجود اور ایک تشخص ہے۔ اس کے باوجود وہ جس ملک میں رہتے ہیں اس سے بھی ان کا گہرا رشتہ ہے۔ اقبال جہاں اسلامی تشخص کی آفاقیت پر زور دے کر علاقائی قومیت سے انکار کرتے ہیں وہاں آل احمد سرور اسلامی تشخص اور علاقائی قومیت میں مولانا مدنی اور مولانا آزاد کی طرح کوئی تعارض نہیں دیکھتے۔ ملت ایک مذہبی شناخت ہے۔ جبکہ قوم کا رشتہ مذہب سے نہیں ملک سے ہوتا ہے۔ سرور صاحب کا خیال ہے کہ اقبال نے ہندوستانی مسلمانوں کو ایک قوم قرار دے کر اور جغرافیائی حدود یا وطنیت یا قومیت کی قوت اور اہمیت سے انکار کر کے غلطی کی (۸۳)

اس بحث پر تبصرہ کرتے ہوئے عام طور پر اس کے سیاسی تناظر کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا (سرور صاحب نے ایسا نہیں کیا) اگر ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے دوران انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے ایک قومی اور دو قومی سیاسی نظریات بحث کا موضوع نہ بنتے تو مسلمانوں کے قومی یا تہذیبی تشخص پر گفتگو بھی شروع نہ ہوئی ہوتی۔ تحریک آزادی میں ان تصورات کے سیاسی مضمرات نے انھیں اہم بنادیا تھا۔ اس سے پہلے اس پر بات نہیں ہوئی تھی۔ ملک کی تقسیم کے بعد بھی یہ تصورات سیاسی اعتبار سے ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں کافی دھماکہ خیز بنے ہوئے ہیں اور ان پر بحث جاری ہے.... مطلب یہ کہ اگر سیاسی مفادات ہٹالیے جائیں تو تشخص کا مسئلہ اپنی اصل میں بہت سادہ ہے۔ تشخص کے خالصتاً مذہبی اور خالصتاً تہذیبی عناصر کی نشان دہی مشکل نہیں۔ ان دونوں عناصر میں کسی قسم کے تصادم کی کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ ان دونوں

کے دائرے ایک دوسرے کو کہیں پر کاٹتے نہیں۔ تہذیب اور تشخص کی دونوں بحثوں میں ضروری ہے کہ اسلامی تشخص / اسلامی تہذیبی صفات۔ اور مسلمانوں کا تشخص / مسلمانوں کی تہذیبیں...... ان دونوں میں فرق کیا جائے۔ اول الذکر آفاقی ہیں، موخرالذکر علاقائی۔ میرا خیال ہے کہ اقبال کو ان دونوں سطحوں کا احساس تھا۔ آل احمد سرور بھی اقبال کے مسلمانوں کی علاقائی قومیت کے تصور کو ہندوستانی مسلمانوں کے فوری سیاسی مفادات کے پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ اقبال نے دیکھا کہ ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں اور ہندو اکثریت میں، اس لیے ہندوستانی نیشنلزم عملاً ہندو نیشنلزم ہوگا۔ اس میں مسلمانوں کا تحفظ ممکن نہیں۔ اقبال ابتداً (۱۹۰۱ تا ۱۹۰۵) ہندوستانی قومیت کے قائل تھے لیکن بعد میں مسلمانوں کی علحدہ قومیت کے تصور کو انھوں نے اپنایا اور آگے بڑھایا۔ ۱۹۳۴ء میں ٹامسن کے نام لکھے گئے خطوط کی بنیاد پر اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ اقبال پاکستان اسکیم کے خالق نہیں تھے بلکہ وہ ہندوستانی فیڈریشن کے اندر مسلمانوں کے لیے شمال مغربی صوبہ چاہتے تھے۔ (ص ۱۲۲) اس کے باوجود، سرور صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ اقبال کے اس تصور نے پاکستان کے لیے راہ ہموار کی۔ اس کے علاوہ اس دور میں ہندو جارحانہ قوم پرستی نے بھی تحریک پاکستان کو طاقتور بنانے میں حصہ لیا۔ سرور صاحب کا خیال ہے کہ بعد کے حالات نے بتایا کہ اقبال کو ہندوستانی نیشنلزم میں مسلمانوں کے لیے جو خطرہ نظر آیا، وہ واقعی تھا۔ (ص ۱۲۲)

سرور صاحب کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ اقبال کے آفاقی اور علاقائی قومیت اور جمہوریت کے بارے میں تصورات کو ہندوستان کے مخصوص سیاسی اور جارح ہندو قوم پرستی کے رجحانات کے پس منظر میں جانچنا ضروری ہے۔ میں یہ اضافہ کروں گا کہ نہ صرف قومیت اور جمہوریت کے بارے میں بلکہ فکر اقبال کے مطالعے کے لیے عام طور پر یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اقبال "تبدیلی" کے مفکر ہیں اور ان کے پاس سوچ کی دو سطحیں ملتی ہیں۔ ایک آفاقی فلسفیانہ سطح اور دوسری ٹھوس، جغرافیائی، علاقائی اور مسلم قومی سطح۔ وہ انسان کو بھی مخاطب کرتے ہیں اور مسلمان کو بھی۔ انسان سے تخاطب میں وہ ہمہ گیر انسانی اقدار کے ایک گونہ فلسفیانہ اور روحانی مطالعے میں محو ہیں اور مسلمان سے تخاطب میں، اس مطالعے کے پس منظر میں، مسلمانوں کے ٹھوس تہذیبی، ذہنی اور معاشرتی مسائل کو لیتے ہیں۔ یہ ذو سطحیت صرف اقبال نہیں ہر اس مفکر کے پاس ملے گی جو اپنی آفاقی فکر کے نتائج ٹھوس تبدیلیوں کی شکل میں پورے معاشرے میں دیکھنے کی تڑپ رکھتا ہو۔ خود ہندوستان میں ایسے "ذو سطح" مفکرین کی ایک پر وقار فہرست موجود ہے۔ راجہ رام موہن رائے، اروبندو گھوش، مہاتما گاندھی، شاہ ولی اللہ، سید احمد بریلوی، سید احمد خاں، ابوالکلام آزاد، عبید اللہ سندھی اور دوسرے کئی۔ ان میں سے ہر ایک نے انسانی اقدار کی بھی بات کی ہے اور ہندو یا مسلم گروہوں میں فکری، روحانی، اخلاقی اور معاشرتی تبدیلی کا مقصد بھی

سامنے رکھا ہے۔ ان مفکرین اور اقبال میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ اقبال شاعر بھی ہیں اس لیے ذو سطحیت کا معاملہ اقبال کے سلسلے میں کچھ اور پہلودار ہو جاتا ہے

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ان دو سطحوں میں باہمی تضاد کی صورت ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان دو سطحوں میں فاصلہ ہے۔ ہر موافق تبدیلی مفکر کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ فکر کی اونچی سطح سے سماجی، معاشی اور تہذیبی حقائق کی کھردری زمین پر اترے اور اس سطح سے پھر وہ معاشرے کو اٹھا کر اپنی منتخبہ اونچی سطح تک لے جانے کی کوشش کرے۔ ان دونوں سطحوں میں خیالات اور تصورات کا جو فرق ہو گا وہ ایک دوسرے کی تائید اور مخالفت دونوں صورتوں میں نکل سکتا ہے۔ بالکل یہی بات اقبال کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ نہ صرف کہی جاسکتی ہے، بلکہ یہ بات انھوں نے وضاحت سے کہی بھی ہے۔ اقبال کے خیالات میں بعض وقت تضادات کی جو بات کہی جاتی ہے، وہ بھی حسب ذیل اقتباس سے واضح ہوتی ہے:

"کسی مقصد اولیٰ (ideal) کو اس کی ارضی حدود سے آزاد کر کے ظاہر کرنا ایک عمل ہے اور یہ بتانا کہ ان اعلیٰ مقاصد کو زندہ حقیقتوں میں کس طرح بدلا جاسکتا ہے، ایک بالکل دوسرا عمل ہے۔ اگر کوئی شخص پہلے عمل کے لیے مزاجاً موزوں ہے تو اس کا کام مقابلتاً آسان ہے کیونکہ اس کا مطلب ان ارضی حد بندیوں کے اوپر سے چھلانگ لگا کر گزر جانا ہے جو ہر قدم پر ایک عملی سیاسی آدمی (politician) کا راستہ روکتی ہیں۔ وہ شخص جو پہلے عمل سے دوسرے عمل پر ہجرت کا حوصلہ رکھتا ہے، اسے انہی حد بندیوں کو مستقلاً اپنی نظر میں رکھنا، بلکہ ان کے آگے سپرانداز ہونا پڑتا ہے جن کو نظر انداز کرنے کا وہ عادی رہا ہے۔ یہ وہ بدقسمت شخص ہے جو مسلسل ایک ذہنی تصادم کی کیفیت سے دوچار رہتا ہے اور بڑی آسانی سے ایسے شخص پر خود تردیدی (self contradiction) کا الزام لگایا جاسکتا ہے۔"(۷)

سبق یہ ملا کہ اقبال کے افکار میں تضادات کا الزام لگاتے وقت اقبال کی اعلیٰ مقاصد نظری اور ٹھوس مسائلی رویے... ان دونوں سطحوں میں فرق اور فاصلے کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

اسی سلسلے کا، اقبال کا ایک اور تصور جس کا ذکر سرور صاحب نے کیا ہے، تہذیب کا تصور ہے۔ سرور صاحب تہذیب کے بارے میں اس نظریے کے قائل ہیں کہ ہر تہذیب چند مخصوص جغرافیائی، تاریخی اور تہذیبی حالات میں تشکیل پاتی ہے۔ اسے اپنی شناخت پر اصرار کرنا ہوتا ہے تاکہ آفاقیت کا حصہ بن سکے (ص ۵۴-۵۵)۔ اقبال کے تصور تہذیب کے سلسلے میں سرور صاحب کا خیال ہے کہ اقبال نے lineer Theory کے مقابلے میں اسپنگلر کی cyclic Theory کو ترجیح دی ہے۔ (ص ۵۴) ایسا نہیں ہے۔ اقبال نے اسپنگلر کے نظریے کو قبول نہیں کیا ہے، رد کیا ہے۔

اقبال وقت (لہٰذا تہذیب) کی حرکت کے cyclic ہونے ہی کو ایک غیر خلاقی

حرکت قرار دیتے ہیں (۸) کیونکہ خلاق (creative) حرکت ایک ہی جگہ مقید نہیں رہ سکتی خلاقیت کا تقاضا ہے کہ وہ مقید نہ ہو، حرکت پزیر رہے۔ انہی معنوں میں اقبال کے نزدیک قرآن کی روح اصلاً یونانی فکری قدامت کے خلاف Anti classical ہے۔ (۹) اقبال کے مطابق اسپنگلر تہذیب کے بارے میں اپنا یہ تھیسس پیش کرتا ہے (۱۰) کہ ہر تہذیب ایک مخصوص ہیت اجتماعی ہے جس کا بعد میں ابھرنے والی تہذیب سے کسی قسم کا کوی ربط نہیں رہتا۔ ہر تہذیب اشیا کو دیکھنے کا اپنا ایک انداز، زاویہ رکھتی ہے جو کسی دوسری تہذیب کے لوگوں کی دسترس سے باہر ہوتا ہے۔ متعدد شواہد کی بنیاد پر اسپنگلر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ یوروپی کلچر کی روح سراسر anti-classical ہے۔ یہ خود یوروپی فطانت کی عطا کردہ ہے اور اس خیال کی کوی گنجائش نہیں ہے کہ یہ چیز اسے اسلامی تہذیب سے حاصل ہوی ہو۔ اسلامی تہذیب، اسپنگلر کی نظر میں، اپنی اصل اور کردار کے لحاظ سے کلیتاً "مجوسی" ہے۔ اقبال کا اختلاف اسپنگلر سے اس بنیادی نکتے پر ہے کہ اسپنگلر یوروپی یا جدید تہذیب کی "مخالف یونانی فکری قدامت" (anti-classical) روح کا سرچشمہ خود یوروپی فطانت کو قرار دیتا ہے۔ اقبال کا کہنا ہے یہ سرچشمہ اسلامی تہذیب کا ہے۔ "مخالف یونانی فکری قدامت روح" یوروپ نے عہد وسطی کی اسلامی تہذیب سے حاصل کی۔ اقبال کہتے ہیں کہ اسپنگلر اسلامی تہذیب سے یوروپی تہذیب میں کسی تصور کے منتقل ہونے کو مان ہی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا کرتا تو اس کا تہذیبوں کا ایک دوسرے سے بے ربط اور آزاد وجود رکھنے کا تھیسس ہی ختم ہوجاتا۔

اقبال اسپنگلر کے برخلاف تہذیبوں کے درمیان باہمی تفاعل، اثر اندازی اور اثر پذیری کے قائل ہیں اور اسی بنیاد پر ان کا خیال ہے کہ یوروپی تہذیب کے حرکی علمی تصور پر قرآن کے حرکی تصور علم کے فیصلہ کن اثر پڑنے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

وٹ فوگل اور ٹوائن بی کے تصورات تہذیب کا ذکر کرتے ہوے سرور صاحب ایشیائی تہذیب کے زوال اور یوروپی تہذیب کے عروج کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ایشیائی (چینی، ہندوستانی، وسط ایشیائی، وسط مشرقی) تہذیب جس میں عظیم سلطنتیں اور علوم وفنون، ادب، فکر مذہب کے میدانوں میں عہد ساز کارنامے شامل ہیں، جب زوال پذیر ہوی تو حریت فکر کھو گئی، معاشرہ طبقات میں تقسیم ہو گیا، صرف بالای طبقے کا اخلاق معیاری اخلاق بنا، عقلیت نظر انداز ہوی، تصوف ترک دینا کا فلسفہ بن گیا، اس کی کچھ ذمہ داری افلاطون پر بھی ہے جس نے دنیا کے مظاہر کو خیالی قرار دیا تھا۔ دوسری طرف یوروپ کی تہذیبوں کو سولھویں صدی عیسوی میں عروج حاصل ہوا۔ نشاۃ ثانیہ، مذہبی اصلاح، انقلاب کے ساتھ سائنسی فکر بڑھی۔ سرمایہ دارانہ نظام قائم ہوا۔ پارلیمانی نظام جمہوریت اپنایا گیا۔ ریاستوں کی قومی تشکیل ہوی۔ اس طاقتور یوروپ نے اپنے عروج کے زمانے میں زوال پذیر ایشیا کو تباہ کیا۔ عہد وسطی میں ایشیا نے عالمی تہذیب کی

قیادت کی تھی۔ اس کے بعد قیادت یوروپ کے ہاتھوں میں آگئی۔

مغرب کی جانب اقبال کے رویے کی وہ یوں وضاحت کرتے ہیں کہ اقبال مغربی تہذیب نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ تہذیب کو ناپسند کرتے ہیں جس میں دولت مند طبقہ سماجی، معاشی اور اخلاقی اعتبار سے غریبوں کا استحصال کرتا ہے۔ سرور صاحب نے ایک اہم نتیجہ یہ اخذ کیا ہے (ص ۳۹) کہ "اقبال نے حقیقت کے ایک انتہاپذیر تصور سے صرف ایک فعال شخصیت ہی کا نہیں بلکہ تغیر پذیر تہذیب، ارتقا پذیر تہذیب و معاشرت کا تصور بھی اخذ کیا۔ "اقبال" ساری زندگی کی بنیاد اسلامی تصور کے مطابق ازلی وابدی ہے اور اپنے آپ کو تنوع اور تغیر کے ذریعے ظاہر کرتی رہتی ہے۔ پس معاشرے کو جو اس طرح کے تصور حقیقت پر مبنی ہو، لازمی طور پر، اپنی زندگی میں دوام و تغیر کی صفات کو سمولینا چاہیے۔" (۱۱)

سرور صاحب نے تہذیب کے مسئلہ کو (جسے میں فکر اقبال کا بنیادی مسئلہ سمجھتا ہوں) (۱۲) اٹھایا ہے، لیکن مختصر طور پر۔ ہندوستان میں، اردو میں، اب تک تہذیب کو بحث کا موضوع نہیں بنایا گیا (سوائے ڈاکٹر عابد حسین کے) حالانکہ خود اردو ایک تہذیب کی پیدا کردہ زبان ہے عہد جدید کے ہندوستان میں روایت اور جدیدیت، عقائد اور بدعات، اصول و فروع، تعبیر و تفسیر، ترجمہ و ترجمانی، ہندوستانی تہذیب کی تعریف اور شناخت، مباحث کے موضوع رہے ہیں۔ مگر اردو میں ان پر گفتگو نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان مباحث میں westernization اور modernization کا حوالہ بھی آتا ہے۔ سرور صاحب ان دونوں میں بجا طور پر امتیاز کرتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں کہ جہاں مغرب زدگی westernization یعنی مغرب کی محض نقالی بے نتیجہ رہتی ہے وہیں جدید کاری modernization عہد حاضر کی ایک تہذیبی ضرورت کے طور پر ناگزیر ہے (اس کی تفصیل بعد میں آرہی ہے)

(ج) اسلام:

اقبال کے اسلامی یا آفاقی شاعر ہونے کے اختلافی مسئلہ پر آل احمد سرور کی رائے یہ ہے کہ اقبال مذہبی فکر کے نہیں مذہبی وژن کے شاعر ہیں۔ "وہ دنیا کو اخلاق، عدل اور مساوات کا درس دینا چاہتے ہیں اور چونکہ ہر عمومی تصور کے لیے مخصوص نظریہ حیات کی مثال سامنے رکھنی ضروری ہوتی ہے۔ اس لئے اس آفاقیت کی تعبیر وہ اسلام اور قرآن کی مدد سے کرتے ہیں (ص ۱۶۴) "پیام مشرق" کے دیباچے میں اقبال کے خیال کا حوالہ دیتے ہیں جس میں اقبال نے اسلام کا نظام اپنانے کی وضاحت کی ہے کہ "اس کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی، مذہبی اور اعلیٰ حقائق کو پیش نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے.... اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک شرقی میں ہر

ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ میں جغرافی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قومی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو قابل احترام ہے" (ص ۱۶۲) سرور صاحب کی رائے ہے کہ "اقبال کے پیام کی آفاقیت اس کی اسلامی تعبیر سے قطعی مجروح نہیں ہوتی بلکہ روشن اور تابناک ہو جاتی ہے۔" (ص ۱۶۴)

اقبال کی اسلامی فکر تو بہت وسیع موضوع ہے جو ان کی شاعری، خطبات اور دوسری نثری تخلیقات میں تفصیل سے زیر بحث آیا ہے۔ سرور صاحب نے اس موضوع کے چند پہلوؤں کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں:

اقبال ایک مصلح بلکہ مجدد ہیں۔ اسلام کے بنیادی تصورات توحید، مساوات، عدل عمل صالح سے عبارت ہیں۔ اسلام کی تعلیم آب و گل سے مجبوری نہیں بلکہ تسخیر خاکی و نوری ہے۔ اسلام جمہوری روح کے نہیں مغربی جمہوری نظام کے خلاف ہے۔ عرب شہنشاہی نے اسلام کی روح کو ابھرنے نہیں دیا۔ خلافت اور جمہوریت ہم آہنگ ہیں، اسلام رہبانیت اور جامد مذہبی ماورائیت کو رد کرتا ہے۔ وحدت الوجود اسلامی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ قطرے کو دریا میں فنا نہیں ہونا چاہیے۔ ہر قطرے کو اپنی انفرادیت برقرار رکھنی چاہیے۔ فرد کی انا سب سے اہم ہے۔ اجتہاد اسلام کی تاریخ میں اصول حرکت ہے۔ قوانین اسلام کے لیے اجتہاد کا استعمال ضروری ہے۔

یہ وہ تمام موضوعات ہیں جن کا اقبال کی اسلامی فکر کے ضمن میں ذکر ناگزیر ہے۔ ان کے علاوہ آل احمد سرور نے بہشت، دوزخ، بقائے دوام پر اقبال کے تصورات کو "معنی خیز" قرار دیتے ہیں جن پر "علماء نے خاموشی اختیار کی۔" سرور صاحب نے ان تصورات پر تبصرہ نہیں کیا اور نہ علماء کی خاموشی کی وضاحت کی۔ اقبال نے اپنے چوتھے خطبے میں (۱۳) حیات بعد الموت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن ظاہر کرتا ہے کہ "بعثت ثانیہ ایک حقیقت ہے۔ یہ نہیں کہ اس کی ماہیت کیا ہے۔ لہٰذا جہاں تک فلسفہ کا تعلق ہے، ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ انسان کے ماضی پر غور کیجے تو یہ امر کچھ غیر اغلب نظر آتا ہے کہ اس کی ہستی کا سلسلہ جسم کی ہلاکت کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔" (۱۴) جنت اور دوزخ کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ جنت اور دوزخ احوال ہیں، مقامات یعنی کسی جگہ کے نام نہیں ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ان کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے اس سے مقصود بھی یہی ہے کہ ایک داخلی حقیقت، یعنی انسان کے اندرونی احوال کا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ جیسا کہ دوزخ کے بارے میں ارشاد ہے، اللہ کی جلائی ہوئی آگ جو دلوں تک پہنچتی ہے (نار اللہ موقدۃ ○ التی تطلع علی الافئدۃ ○ (۱۰۴:۶) بہ الفاظ دیگر وہ انسان کے اندر بہ حیثیت انسان اپنی ناکامی کا دردانگیز احساس ہے، جیسے بہشت کا مطلب ہے فنا اور ہلاکت کی قوتوں پر غلبے اور کامرانی کی مسرت۔" (۱۵) انسان جہنم میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔ اقبال قرآن

مجید کی آیت (۷۸: ۲۳) میں لفظ "خلود" کی اس طرح تشریح کرتے ہیں کہ اس سے مراد محض ایک مدت زمانی ہے۔ "اس لحاظ سے دیکھا جائے تو جہنم بھی کوئی "حاویہ" (۱۰۱: ۱۱-۸) نہیں جسے کسی منتقم خدا نے اس لیے تیار کر رکھا ہے کہ گنہ گار ہمیشہ اس میں گرفتار عذاب رہیں۔ وہ درحقیقت تادیب کا ایک عمل ہے تا کہ جو خودی پتھر کی طرح سخت ہو گئی ہے (۷۴:۲) وہ پھر رحمت خداوندی کی نسیم جاں فزا کا اثر قبول کر سکے۔ لہٰذا جنت بھی لطف و عیش یا آرام و تعطل کی کوئی حالت نہیں۔ زندگی ایک ہے اور مسلسل اور اس لئے انسان بھی اسی ذات لامتناہی کی نو بہ نو تجلیات کے لیے جس کی ہر لحظہ ایک نئی شان ہے، ہمیشہ آگے ہی بڑھتا رہے گا۔" (۱۶) یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مندرجہ بالا اقتباسات میں جو تصورات ملتے ہیں وہ مسلمانوں میں مروجہ عقائد اور تصورات سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ (البتہ اقبال کے بقائے خودی کے تصور کے عین مطابق ہیں۔) جنت اور دوزخ کی اقبال کی یہ تعبیرات سید احمد خاں کی تفسیر میں تقریباً اسی طرح موجود ہیں۔ (۱۷) یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اقبال نے انھیں اس تفسیر سے لیا ہے یا خود اپنے طور پر ان نتائج تک پہنچے ہیں۔ سید احمد خاں تو ایسی تفسیر پر علماء کی بارگاہ سے نکالے گئے لیکن اقبال کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ وجہ صاف ہے کہ اقبال شعر کے فتویٰ شکن حصار میں محفوظ ہیں جو سید احمد خاں کو میسر نہیں۔ (منصور حلاج بھی اگر شعر کو ذریعہ اظہار بناتے تو شاید دار اس اعزاز سے محروم رہتی جو آج تصوف اور ادب میں اسے حاصل ہے)

ویسے بھی بعض اسلامی عقائد اور تصورات کی تعبیر اقبال نے اپنے فلسفہ خودی و عشق کے چوکھٹے میں کی ہے۔ یقیناً اسلام کو اقبال ایک آفاقی اقدار پر مبنی حرکی انسانی نظام معاشرت برقرار دے کر اس پر گفتگو کرتے ہیں۔ کسی ایک قوم یا علاقے سے منسوب اور مشروط اسلام ان کے لئے ناقابل قبول ہے۔ اقبال کی آفاقیت اسلام کے آفاقی پیغام پر مبنی ہے یا اس سے عبارت ہے۔ آفاقیت میں ابدیت بھی لازمی صفت کے دور پر موجود ہوتی ہے۔ آفاقیت اور ابدیت کا مستقل تصادم تغیر یا تبدیلی سے رہتا ہے۔ اگر اسلام ایک آفاقی اور ابدی نظام فکر ہے تو اس میں وقت کی لائی ہوئی تبدیلیوں کو جذب کرنے کی صلاحیت بھی ہونا چاہیے۔ وقت کی لائی ہوئی تبدیلیوں سے میری مراد نئے علم کی وجہ سے اشیا اور واقعات (سماجی، معاشی، تہذیبی اور ذہنی) کی نئی تعبیرات و تفسیرات ہیں۔ (کیونکہ وقت انسانی اصطلاحوں میں کوئی مجرد چیز نہیں۔ وقت کو ہم حواس کے ذریعے ہی شناخت کر سکتے ہیں) اقبال نے اسی لئے اجتہاد کو اسلام میں اصول حرکت قرار دیا۔ اجتہاد ہی کے ذریعے اسلامی، اور آفاقی نظام فکر وقت کی زائیدہ تبدیلیوں کو اپنے میں جذب کر سکتا ہے۔ "نئے علم" ہی نے اقبال کی فکر کی تشکیل کی ہے۔ وہ فکر جو جنت اور دوزخ کو واقعات و مقامات نہیں بلکہ احوال سے تعبیر کرتی ہے۔ سید احمد خاں کے نزدیک بھی نئے علم اور اسلامی آفاقیت وابدیت کے درمیان تصادم سب سے اہم مسئلہ تھا۔ انھوں نے اجتہاد کا ذکر تو نہیں کیا لیکن

فطرت اور عقل کی مدد سے اس تصادم کو ایک قسم کی علمی مفاہمت میں تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی ۔ نئے علم کے بطن سے پیدا ہونے والی معاشرتی اور ذہنی تبدیلیوں کے لیے اب (modernization) تجدد کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے ۔ سرور صاحب نے اس عمل کا ذکر کیا ہے ۔ اس موضوع پر اردو میں بھی لکھا گیا ہے لیکن صرف ادبی تناظر میں ۔ مشرقی اور ایشیائی ملکوں میں مغربی سائنس اور عقلی فکر کے زیر اثر جو تبدیلیاں آتی رہی ہیں انھیں اس اصطلاح کے ذریعے واضح کیا جاتا ہے ۔ چونکہ اس عمل کا سرچشمہ مغربی فکر، مغربی سائنس اور مغربی تہذیب ہے اس لیے اس بحث میں ایک اور اصطلاح westernization بھی استعمال ہوتی ہے ۔ سرور صاحب نے اس کا ترجمہ مغرب زدگی کیا ہے ۔ یعنی اپنی تہذیبی احتیاجات کو نظرانداز کر کے مغرب کی فکر، تہذیب اور اداروں کو اپنانا ۔ سرور صاحب نے تجدد اور مغرب زدگی میں فرق کیا ہے کہ تجدد محض مغرب زدگی نہیں ۔ "اسلامی تجدد اسلامی تشخص کو اس کی اصلی شکل میں پہچاننے اور ہر دور میں اس کی روح کو حالات کے مطابق ڈھالنے کا نام ہے ۔ اسلامی تجدد وقت اور زندگی کا ساتھ دیتا ہے ۔" (ص ۶۸) تجدد "اسلام کے آفاقی مشن کو تکمیل تک پہنچانے اور زندگی کے ہر دور میں انسانیت کو بیدار کرنے اور زندگی کے امکانات کو فرد اور جماعت کے لیے وسیع کرنے کا دوسرا نام ہے ۔" (ص ۶۸)

تجدد کے مخالف فکری رویے کو سرور صاحب fundamentalism کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں ۔ یہ اصطلاح ان معنوں میں غلط طور پر استعمال ہوئی ہے اور ہوتی رہتی ہے ۔ سرور صاحب بھی اس غلطی سے آگاہ ہیں اور عہد حاضر کے ایک اہم عالم فضل الرحمن (مرحوم) کے خیال کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ Fundamentalism کی اصطلاح مغرب کی تاریخ کے سلسلے میں جواز رکھتی ہے مگر اسلام کی احیائی تحریکوں کے سلسلے میں نہیں ۔

یہ اصطلاح اس صدی کی دوسری تیسری دہائیوں میں، امریکہ میں ایک کلیسائی رجحان کے لئے استعمال ہونے لگی جس کے تحت بائبل میں موجود عیسائیت کے عقائد کے علاوہ ہر دوسرے اور ہر نئے تصور کو رد کیا جاتا ہے ۔ یہ اصطلاح اسلام اور مسلمانوں کا مطالعہ کرنے والے عالم اور اس میدان کے صحافی لے اڑے اور ایک سوچے سمجھے مخالف اسلام اور مخالف مسلم سیاسی منصوبے کے ایک جزو کے طور پر اس اصطلاح کو ہر اُس خیال، رجحان یا تحریک کے لیے استعمال کیا جانے لگا جو اسلامی اور مسلم تشخص، اسلامی سیاسی نظام، مغربی اور خصوصاً امریکی سیاسی، تہذیبی اور فکری استعماریت کے خلاف مزاحمت پر زور دیتے ہیں ۔ غالباً یہ واحد اصطلاح ہے جو اپنے معنی کو چھوڑ کر متعدد دوسرے معنوں (جو ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں) کے لئے استعمال ہوتی ہے مثلاً Fundamentalism کا مطلب بیک وقت قدامت پرستی، کٹرپن، احیاپرستی، انتہاپسندی، روایت پرستی، رجعت پسندی، پرتشدد مذہبیت، دہشت پسندی، فلسطینی ہے ۔

عربوں سے فلسطین چھین لینے کے مخالفین، بوسنیا کے مسلمانوں کے قتل عام کے خلاف کام کرنے والی مسلم تنظیمیں، اسلامی عقائد پر مبنی ریاست کے قیام کا مقصد رکھنے والے ایرانی قائدین، یوروپ، انگلینڈ اور امریکہ میں مذہبی عقائد اور اسلامی اخلاقی اطوار کی حفاظت کے لیے قائم کردہ مسلم ادارے اور تنظیمیں، بابری مسجد کی شہادت پر احتجاج کرنے والے، یکساں سیول کوڈ کے نفاذ کے مخالفین، یا مختصراً، مسلم مفادات کے دفاع کی بات کرنے والے سب لوگ بڑی سہولت کے ساتھ Fundamenta lists قرار دیے جارہے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی سارے سیاسی لیڈر، دانشور اور صحافی کسی بھی مذہبی گروہ، تنظیم یا تحریک کے لئے یہ اصطلاح بڑے شوق سے استعمال کرنے لگے ہیں۔ حتیٰ کہ اردو میں بھی اس کا ترجمہ "اساس پسندی" ہوچکا ہے۔ اور اسے بھی منفی معنوں میں استعمال کیا جانے لگا ہے۔ (گویا صحیح عمل فروع پسندی ہے، اساس پسندی نہیں)۔ یہ hermionotics کا مسئلہ نہیں سیاسی اور مذہبی موقع پرستی اور فکری منافقت کا ہے، ہونا تو یہ چاہیے کہ معاشرے میں جو بھی سیاسی، مذہبی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی رویے ظاہر ہوں ان کی شناخت معین کی جائے یعنی ان کے لئے ایسے الفاظ اور ایسی اصطلاحیں استعمال ہوں جو ان رویوں اور رجحانات کی نوعیت کو زیادہ سے زیادہ حد تک معین کرسکیں۔ یہ ہماری مغرب زدگی ہے (تجدد نہیں) کہ ہم مغرب میں مروج ہر اصطلاح پر یوں جھپٹ پڑتے ہیں جیسے بچہ کسی رنگین کھلونے پر۔ اور پھر اس اصطلاح کے لیے اپنے یہاں رویے، رجحان اور افراد تلاش کرتے ہیں۔ ادھر اردو ادب میں بھی بعض حضرات نے یورپین اور امریکی ادبی نظریات، تصورات اور اصطلاحوں کی درآمد کا کام بڑے پیمانے پر شروع کردیا ہے۔ اور اکثر رسالوں میں ان پر مضامین شائع ہورہے ہیں۔ چند مہم جو تو ان مغربی نظریات اور اصطلاحوں کا اطلاق اردو ادب پر بھی کرنے لگے ہیں۔ کیا وہ نظریات اور اقدار جنھیں مغربی ناقدوں نے اپنے اپنے تخلیقی ادب سے اخذ کیا ہے، اردو تخلیقی ادب کی تحسین و تنقید میں کام آسکتے ہیں؟ یقیناً عالمی ادب کے بارے میں اردو میں ہر قسم کی معلومات کا دستیاب رہنا بے حد اہم ہے۔ تقابلی ادب اب ناگزیر ہوچکا ہے۔ لیکن ہم گزوں سے کسی چیز کا وزن تو معلوم نہیں کرسکتے؟ ادب کا حوالہ دینے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ یہاں بھی مغرب زدگی اور تجدد کے درمیان امتیاز نہیں برتا جارہا ہے۔ اگر دیکھیں تو یہ صورت حال ایشیائی فکر کی بھی ہے۔ اقبال نے مسلمانوں کے اور اسلامی زاویے سے اور گاندھی جی نے ہندوؤں کے اور ہندوستانی زاویے سے تجدد یا (میں ترجیح دونگا) تبدیلی کے تفاعل پر سوچنے کی دعوت دی ہے۔ عالمی سطح پر، علم میں ہر لمحہ زبردست اضافوں اور ایک دوسرے سے طبعی اور فکری واقفیت حاصل کرنے میں ٹکنالوجی کے لامحدود امکانات اور ذرائع نے اقوام، ممالک، تہذیب، ادب، تشخص، قومیت، مذہب اور معاشرے کے باہمی رشتے ہر چیز کو بالکل بدل دیا ہے یا بدلنے کے عمل میں ہے۔ جس طرح سے اقبال نے عہد حاضر کی ضروریات کے لیے فلسفہ، مذہب،

معاشیات ، تاریخ سے چند تصورات کو منتخب کیا اور اپنا فکری زاویہ تشکیل دیا ، طرح آج کے سوچنے والوں کو آنے والے نئے دور کے لئے اپنے فکری اور تہذیبی ورثے سے موزوں تصورات منتخب کرنے ہوں گے

برصغیر کے متعدد مفکرین کے افکار کے تجزیے پر اردو میں بہت کام ہوا ہے لیکن فکر کو عصر سے جوڑنے والی کتابیں بہت کم آئی ہیں۔ "دانشور اقبال" اس سلسلے میں ایک اہم کتاب ہے۔ اس لیے نہیں کہ یہ اقبال کی دانشوری کا محض ایک تجزیہ ہے بلکہ اس لیے کہ اس تجزیے میں اقبال کی دانشوری کو عصری حقائق اور مسائل کے تناظر میں جانچا گیا ہے۔ (ادھر اقبال پر جو نئی کتابیں آئی ہیں ان میں حمید نسیم کی پاکستان میں شائع ہونے والی "علامہ اقبال۔ ہمارے عظیم شاعر" اقبال کے کلام کی عصریت پر متعدد قابل فکر نکات پیش کرتی ہے)۔ اس میں اقبال کے کئی اہم اور پیچیدہ تصورات پر سرور صاحب کے تبصرے بہت مختصر مگر بہت بلیغ نوعیت کے موجود ہیں ، اگر ان پر تفصیلی بحث موجود ہوتی تو ہم اعتماد سے کہہ سکتے تھے کہ عابد حسین کی "ہندوستانی تہذیب کا مسئلہ" اور "ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں" جیسی فکر و عصر کو جوڑنے والی کتابوں کا سلسلہ جاری ہے۔

****

حواشی

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے۔ انور معظم۔ "ابوالکلام آزاد: مصنف اور قاری کے درمیان رشتوں کا مطالعہ" کتاب نما۔ دہلی نومبر ۸۸۔

Indian Muslims: Attempts at Self-Definitions" in Christian W Troll (ed.), Islam in India, Vol.II, Delhi, 1985, 22-33

۲۔ حجۃ اللہ البالغہ۔ جلد اول۔ باب ۵۵-۵۶۔ دیوبند، ۱۹۸۶

3. Syed Abdul Vahid, Thoughts and Reflections of Iqbal, Lahore,1973, pp.287-288

4. Reply to questions raised by Pandit Jawahar Lal Nehru, 1936,Ibid., p.288

۵۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ متحدہ قومیت اور اسلام۔ نئی دہلی۔

6. Aziz Ahmad, Islamic Modernism in India and Pakistan, London,1970 pp. 159-60

7. Vahid, Ibid., pp.96

(بقیہ صفحہ ۴۶۱ پر)

انور خان

تین ناول - ایک جائزہ

(۱) خواب خواب سویرا (۲) فائر ایریا (۳) گیان سنگھ شاطر

پریم چند کا ناول "گئودان" تحریک آزادی کے پس منظر میں اور گاندھی کے خیالات کے زیرِ اثر لکھا گیا۔ آگ کا دریا" تقسیم ہند کے المیے پر ہندوستان میں ہندو مسلم فرقوں کی سیکڑوں کے تہذیبی رشتوں اور آپسی یگانگت کے مناظر میں تحریر ہوا۔ "اداس نسلیں" میں ۱۹۰۲ء سے تقسیم تک کی سیاسی تاریخ اور اس کے سیاق و سباق میں عام انسانی زندگی جو اس سارے تماشے میں محض تماش بین رہنے پر مجبور رہا بیان کی گئی۔ یہ ناول آئیڈیل ہے اور بعد کے لکھنے والوں میں یہ خیال زور پکڑ گیا کہ ایسے ہی ناول لکھنے چاہئیں۔

چند سال قبل عبدالصمد کا ناول "دو گز زمین" شائع ہوا۔ یہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ٹھہرا کہ اس میں بہار کے چند خاندانوں کی زندگی پیش کر کے ان ہزاروں خاندانوں کی تصویر کشی کی گئی تھی جن کے کچھ افراد مشرقی بنگال (اب بنگلہ دیش)، کچھ کراچی ہجرت کر گئے اور کچھ بلکہ بیشتر ایسے تھے جنھوں نے اپنا وطن چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ چند اعتراضات کے باوجود اس ناول کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ۱۹۹۴ء میں عبدالصمد کا دوسرا ناول "خواب خواب سویرا" شائع ہوا۔ دو گز زمین میں زبان و بیان کی غلطیوں اور کہیں کہیں زبان کی غیر مانوسیت کے اعتراض ہوئے تھے یہ ناول بڑی حد تک ان غلطیوں سے پاک ہے۔ زبان رواں دواں اور صاف ستھری ہے۔ سیاسیات اور سوشولوجی عبدالصمد کے خاص موضوعات ہیں۔ عصری سیاست کے مختلف پہلوؤں پر ان کی اچھی نظر ہے۔ اس ناول میں ان پہلوؤں کو بڑی ہنرمندی سے اجاگر کیا گیا ہے لیکن اسے بیان کرنے میں وہ ایسے منہمک ہوئے کہ ان کے کردار یک رخے رہ گئے۔ کہانی کا پہلا نصف انوار احمد پر مرکوز ہے جو تقسیم سے قبل کی کانگریس کے ممتاز لیڈر رہیں لیکن موجودہ سیاست میں اپنے لیے کوئی جگہ نہیں پاتے اور نظرانداز کر دیے گئے ہیں۔ دوسرا نصف ان کے لڑکے آفاق پر ہے۔ آفاق ناول کا مرکزی کردار ہے۔ اسے یا تو مصنف کا نمائندہ ہونا چاہیے تھا یا پھر اسے معروضی انداز سے پیش کیا جاتا اور اس کے جذبات و احساسات کو تفصیل سے بیان کیا جاتا۔ عبدالصمد کا سارا زور واقعات پر ہے لیکن واقعات کی محض رپورٹنگ کی گئی ہے۔ منظرنگاری اور فضا کاری کے ذریعے اس طرح نہیں بیان کیا گیا کہ ہم یہ محسوس کریں کہ ہم خود وہاں موجود ہیں اور اس منظر کا حصہ ہیں۔ رپورٹنگ کے درمیان مصنف یا کردار سیاست کے درس پلاتے یا واقعات کے پس

پشت محرکات کی تفہیم کرتے نظر آتے ہیں۔ ناول نگار کی یہ غیر ضروری مداخلت دل چسپی قائم نہیں رہنے دیتی۔ ناول کے آخری سو صفحات میں اچانک کلثوم کا کردار فوقیت حاصل کر لیتا ہے۔ مصنف نے اس کے لیے قاری کو ذہنی طور پر تیار نہیں کیا اس لیے ذہن کو جھٹکا لگتا ہے۔ کلثوم کا کردار بھی شروع میں ایسا بتایا گیا ہے کہ وہ سوشل ایکٹی وسٹ کب بنی کیسے بنی کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کرداروں کی نفسیات اور خیالات خاطر خواہ بیان نہ ہونے سے آفاق کا کردار مجہول اور کنفیوژڈ نوجوان کا ہے جس کی اپنی کوئی سوچ نہیں۔ وہ پوری طرح ناول نگار کی مرضی کے تابع ہے۔

آخر میں کلثوم، آفاق سے شادی پر رضامند ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کی وجہ کسی قسم کا انسانی لگاؤ نہیں بلکہ ایک سماجی یا سیاسی سمجھوتہ ہے جس سے ناول اور بھی غیر فطری ہو جاتا ہے۔ مختصراً عبدالصمد کی تحریروں میں دماغ کی کار فرمائی اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ شاید وہ بھول جاتے ہیں کہ انسان ایک عدد دل بھی رکھتا ہے۔ اس سے یہ ناول ایک سماجی دستاویز تو بن گیا ہے۔ ایک اچھا ناول نہیں بن پایا۔ بہر حال ایک سماجی دستاویز کے طور پر بھی یہ ناول قابلِ قدر ہے۔

فائر ایریا الیاس احمد گدی کا ناول ہے۔ چھوٹا ناگپور کے کوئلے کی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کا کس بے دردی سے کان کے مالکوں، کنٹراکٹروں، مافیا اور سیاست دانوں کے ذریعے استحصال کیا جاتا ہے، ان کی زندگی خاص کر آدی باسیوں کے ساتھ غیر انسانی رویّے یہ ناول کا موضوع ہے۔ الیاس نے اس زندگی کا بڑے قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ ناول کا چھوٹے سے چھوٹا کردار بھی جس طرح کی زندگی جی رہا ہے اس کا ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے۔ بھلے ہی وہ تفصیل میں نہ جائیں لیکن پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے کرداروں کے ایک ایک رگ و ریشے سے بخوبی واقف ہیں۔ یہ واقفیت انھیں ایک جداگانہ شخصیت عطا کرتی ہے۔ جوالا مصر، سہدیو، کالا چند جمدار، رحمت میاں، فتو نیا، سب منفرد کردار ہیں۔ زندگی سے اٹھائے گئے ہیں، کسی کتاب سے نہیں لیے گئے یا ٹائپ نہیں ہیں۔ اس سے ناول میں بڑی قوت آتی ہے۔ کرداروں کی زبان فطری ہے اور اس میں زمین کی بو باس ہے۔ ناول کی زبان ایک طرح کی کارآمد (Functioning) زبان ہوتی ہے۔ یعنی ایسی زبان جو اپنا کام تو انجام دیتی ہے لیکن قاری کا دھیان کہانی سے ہٹا کر زبان و بیان کی طرف جانے نہیں دیتی۔ شفافیت اس کی بڑی خوبی ہوتی ہے۔ ہاں کبھی کبھی کوئی صاحب طرز ادیب اپنے مخصوص اسلوب سے ہل چل مچا دیتا ہے۔ لیکن یہ استثنائی صورت ہوتی ہے۔ الیاس احمد گدی کے یہاں زبان صاف ستھری، شستہ، کارآمد ہے۔ مقامی روزمرہ اور محاورہ حقیقت کے تاثر کو شدت عطا کرتا ہے اور کرداروں سے Rapport قائم کرنے میں سہولت پیدا کرتا ہے۔

کہانی کا پہلا حصہ ایک سو پینتیس (۱۳۵) صفحات کا ہے اور اپنی جگہ مکمل۔ اس میں چھوٹا ناگپور کے کوئلے کی کانوں سے وابستہ تمام افراد کی زندگی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ سہدیو کی اپنی

ایک شخصیت ہے ۔ وہ کالاچند باوڑی کی تذلیل پر مارنے مرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے ۔ اس کا ساتھی رحمت ، کان میں حادثے کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کی لاش کو کان بند کر کے چھپا دیا جاتا ہے تاکہ یہ خبر عام نہ ہو اور کمپنی کو معاوضہ نہ دینا پڑے ۔ سہدیو اس خبر کو باہر لانے اور رحمت کو معاوضہ دلانے کے لیے جان کی بازی لگا دیتا ہے اور پلے ہوئے غنڈوں کے تشدد کا شکار ہوتا ہے۔ ناول کے بقیہ دو حصے یونین کی سیاست پر ہیں ۔ کس طرح انٹک کی یونین لائی جاتی ہے ۔ اور استحصال اسی طرح جاری رہتا ہے ۔ تشدد اسی طرح چلتا رہتا ہے ۔ سہدیو ، جمدار سے قریب ہے جس نے اسے سمجھایا ہے کہ یہ زندگی بدلی بھی جا سکتی ہے ۔ جمدار کمیونسٹ خیالات کا ہے ۔ وہ اس سے بہت کچھ سیکھتا ہے ۔ لیکن جمدار کے ساتھ بہت تھوڑے لوگ ہیں ۔ پہلے تین اور بعد میں محض گیارہ ۔ سہدیو انٹک میں شامل ہو جاتا ہے ۔ اور چوں کہ وہ پڑھا لکھا ہے ، اپنی شخصیت کا مالک ہے اور طاقت ور بھی اس کی طاقت بڑھتی چلی جاتی ہے ۔ انٹک کا لیڈر ، کمپنی کے مالکوں کے ساتھ ساز باز کر کے اسے نکلوا دیتا ہے ۔ پھر ایک موڑ آتا ہے کانیں قومیائی جاتی ہیں ۔ سہدیو اپنے پراویڈنٹ فنڈ کے حصول کے لیے کوشش کرتا ہے ۔ نئے افسران اسے بتاتے ہیں کہ اس کا نام بطور مزدور کہیں درج ہی نہیں ۔ بالآخر وہ دلت مزدور یونین کے لیڈر سے جاکر ملتا ہے یہ یونین نئی قائم ہوئی ہے اور اہنسا پر یقین نہیں رکھتی ۔ اس کی مدد سے سہدیو کا کام ہو جاتا ہے لیکن رفتہ رفتہ وہ ان لیڈروں کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے ۔ اس کی زندگی بدل جاتی ہے ۔ وہ خود ایک اہم لیڈر ہو جاتا ہے ۔ کانوں کے قومیائے جانے کے بعد جمدار کو کام کرنے کا موقع ملتا ہے اور اس کی طاقت بھی بڑھتی ہے ۔ جمدار اور سہدیو کی ملاقات ہوتی ہے ۔ جمدار شکایت کرتا ہے کہ وہ خونیوں کی ٹولی میں شامل ہو گیا ہے ۔ وہ کہتا ہے "تم کو یاد ہے وہ کالاچند باوڑی ؟ جس کی تذلیل پر تم مارنے مرنے پر آمادہ ہو گئے تھے وہ کون تھا تمھارا ؟ پھر وہ رحمت میاں ۔ کیا ہم نے جان کی بازی نہیں لگا دی تھی اس کے لیے اس سے ہمارا کیا رشتہ تھا ؟ بات اتنی سی ہے سہدیو کہ وہ آگ تم میں بجھ چکی ہے جس کو میں نے دہکتے ہوئے دیکھا تھا اور امید تھی کہ یہ آگ کسی دن آتش فشاں کے لاوے کی طرح ابل پڑے گی "

سہدیو اس کی تردید کرتا ہے ۔ جمدار اس سے پوچھتا ہے کہ "اگر نہیں بجھی ہے تو سب کچھ اتنا سرد کیسے ہے ؟ --- تم نے اپنے کو بیچ دیا ہے تم نے اپنی قیمت وصول کی ہے ۔ اس کمرے کو دیکھو ۔ کوئی نہیں کہے گا کہ یہ ایک کولیری مزدور کا کمرہ ہے ۔ یہ ساری آسائش جس نے تم کو مہیا کی ہے اس نے بدلے میں تم سے کیا لیا ہے .... معلوم ہے تمھیں "

وہ رکتا ہے سہدیو کے تپتے اور لال پڑے چہرے کو دیکھتا ، بہت غور سے دیکھتا ہے ، پھر دھیرے سے کہتا ہے ۔

" تمھاری آگ ! "

یہ ناول کا نکتۂ عروج ہے جو پورے ناول کو ایک تناظر، ایک گہرا مفہوم عطا کرتا ہے۔

کسی ناقد نے کہا ہے ناولوں میں غلطیاں تلاش کرنا بہت آسان ہے۔ اچھے سے اچھے ناول میں بھی غلطیاں مل جاتی ہیں۔ لیکن ایک اچھا یا بڑا ناول اپنی تمام خامیوں کے باوصف اچھا ہوتا ہے یہ بات فائر ایریا پر پوری طرح صادق آتی ہے۔

مخمور سعیدی سے بات چیت کے دوران الیاس نے کہا یہ ایک آنچلک (علاقائی) ناول ہے (ایوان اردو جولائی ۹۵ء) یہ بات جزوی طور پر صحیح ہو سکتی ہے لیکن ہماری خانہ بند ذہنیت کے لیے یہ ایک بہت خطرناک کھیل ہے۔ ہم تو تلاش ہی میں رہتے ہیں کہ اچھی سے اچھی چیز کو ایک لیبل، ایک نام دے دیں تاکہ وہ چیز چھوٹی ہو کر ہمارے فوکس میں آجائے۔ ہم کہہ سکیں کہ آفتاب تو آگ کی ایک ٹکیہ ہے۔ ہر تخلیقی تجربہ ایک چیلنج ہوتا ہے جسے ہم قبول نہیں کرنا چاہتے۔ گریز کرتے ہیں اور اس طرح کے لیبل لگ جائیں تو پھر ناول کا مطالعہ بھی کہاں ضروری رہ جاتا ہے؟ آپ یہ کہہ کر بری ہو سکتے ہیں کہ ہاں بھائی سنا ہے کہ بہت اچھا آنچلک ناول ہے۔ چلیے صاحب ثابت ہو گیا کہ آپ بھی بڑے جان کار آدمی ہیں

عبدالصمد کا ناول "خواب سویرا" کا اختتام بھی اس پر ہوتا ہے کہ آفاق، کلثوم کے ساتھ حقوق انسانی کے لیے، ناانصافی کے خلاف جدوجہد میں شریک ہو جاتا ہے۔ ایک وسیع جدوجہد جو پورے کرہ ارض پر جاری ہے۔ دنیا کے تمام حق پرست انسان اپنی اپنی سطح پر، بساط بھر کوشاں ہیں۔ ذہنی معاشی، جسمانی ہر سطح پر یہ جدوجہد جاری ہے۔ الیاس احمد گدی اور عبدالصمد کے ناول اردو داں عوام کو جن کی بڑی تعداد مسلمانوں کی ہے یہ ترغیب دیتے ہیں کہ وہ علاقائی، مذہبی، طبقاتی خانہ بندیوں سے نکل کر ایک وسیع انسانی جدوجہد میں شریک ہوں جو زندگی کو ایک مفہوم عطا کرتی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ ان حقوق کے لیے نہ لڑیں جو بطور مسلمان، بطور ہندوستانی انھیں حاصل ہونے چاہئیں بلکہ انھیں اس وسیع انسانی جدوجہد کا حصہ ہونا چاہیے جس کے دائرے میں یہ حقوق بھی شامل ہیں۔

تیسری کتاب جسے ناول کہا گیا ہے گیان سنگھ شاطر کی دل چسپ سوانح عمری ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے بچپن کے پنجاب، اس کے دیہاتوں، قصبوں کی زندگی اور عام انسانوں کا رہن سہن، ان کے سوچنے کا ڈھنگ بیان کیا ہے۔ گویہ بذات خود اس کتاب کا مقصد نہیں۔ منشا تو شاطر کا یہ ظاہر کرنا ہے کہ اس ماحول میں اپنی شخصیت کو پروان چڑھانا کتنا مشکل تھا۔ تقریباً ناممکن۔ لیکن انھوں نے تمام تر جدوجہد سے اسے ممکن کر دکھایا۔ اس میں زندگی کے جو بھرپور نقشے بیان ہوئے ہیں شاید ہی کسی کتاب میں بیان ہوئے ہوں۔ گفتنی، ناگفتنی ہر بات بے باکی مگر خوب صورت ڈھنگ سے بیان کی گئی ہے۔ نثر میں ایک وفور ہے جو چھلکا پڑتا ہے۔ اسلوب ایک تیز دریا کی طرح ہے۔ پنجابی کہاوتیں، فقرے بڑی برجستگی اور بے ساختگی کے ساتھ اس میں شامل

ہوئے ہیں اور نثر کو چمکا دیا ہے۔ اسلوب انوکھا ہوتے ہوئے بھی کتاب میں الگ سے لشکارے نہیں دیتا بلکہ پورے بیان کا ایک ناقابل امتیاز جزو ہے۔ شاید اس لیے کہ مصنف اس سارے ماحول کو معروضی انداز میں، محض ایک ناظر کے طور پر کسی فلسفیانہ تناظر کے ساتھ بیان نہیں کرتا۔ وہ اپنی تمام تر حسرتوں، آرزوؤں، تمناؤں کے ساتھ اس میں شامل ہے اور اس ماحول میں اس پر کیا بیتی اسے تمام تر کیفیت اور شدت کے ساتھ بیان کرتا ہے اور اس کے لیے اسلوب سے بھرپور مدد لیتا ہے۔ پنجابی کہاوتیں، فقرے، اشعار محض آرائش یا خود نمائی کے لیے نہیں استعمال ہوئے بلکہ اپنا دکھ، اپنا کرب بیان کرنے کے لیے مصنف نے اس کا استعمال ضروری سمجھا ہے۔

راسے ناول کیوں کہا گیا یہ البتہ محل نظر ہے۔ ناول کے فارم کا شعوری یا غیر شعوری احساس مصنف کے یہاں نظر نہیں آتا۔ چھ سو صفحات کے اس ناول سے تقریباً نصف صفحات آسانی سے گھٹائے جا سکتے تھے اور کتاب شاید بہتر ہوتی، ناول کا پورا لطف بھی دیتی۔ بچپن کے بیان میں ایک سے واقعات بار بار آتے ہیں جن سے مصنف کا منشا ایک ہی ہے۔ ماحول اور کرداروں کے سوقیانہ پن کو اجاگر کرنا۔ اس سے مرکزی کردار کا ذہنی کش مکش سے دوچار ہونا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن اس کے باوصف اس میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں جسے Sublime کہا جا سکے۔

کتاب میں تین اہم کردار ہیں۔ بھایا جی (والد) جو بقول مصنف "بُری قسم کے لڑاکے تھے۔ بات بات پر پھاڑ کھانے کو دوڑتے۔ سیدھی بات بھی کرتے تو لتاڑنے لگتے۔ ان کے کڑوے بول گھر میں ایسے بکھرے نظر آتے جیسے تازہ قتل کے بعد خون کے دھبے۔ ان کی موجودگی بھرے گھر میں بولتے رن کا سماں ہوتا تھا۔ اور ہر شے پر موت کا سایہ منڈلاتا دکھائی دیتا تھا۔ میں حیران ہوں کہ زندگی ان کی زد سے کیسے بچ نکلتی تھی اپنے اکھڑپن پر فخر کرتے تھے۔ جیسے کوئی مہذب اپنے تہذیبی ورثے پر۔

دوسرا کردار تایاجی کا ہے جو بالکل متضاد ہے۔ مصنف کے لیے یہ گرو، مرشد، معلّم کا نعم البدل ہے۔ ایک نفیس کاریگر، محبت کرنے والا، ایک شفیق لیکن آزادانہ شخصیت و فکر کا حامل انسان جس کی فکر اپنی دھرتی اور فطرت سے جڑی ہوئی ہے۔ مصنف نے جو سوقیانہ ماحول بیان کیا ہے اس میں یہ شخصیت جوہڑ میں کھلنے والا کنول ہے۔ تایاجی کے خیالات جو خوش بو کی طرح مہکتے ہیں۔

"خیال سے مشاہدہ اور مشاہدے سے عمل خوب صورت ہے"

"انسانی زندگی وہ انوکھا پیڑ ہے جس کے پھول پھل کام کاج ہیں" "سچ وہ نہیں ہے جو میں کہتا ہوں۔ سچ وہ ہے جو میں کرتا ہوں"

"وہ اوتاروں کے اس خیال کی تردید کرتے تھے کہ سنسار ایک سپنا ہے زندگی مکمل حقیقت ہے اور انسان اس حقیقت کا ترجمان۔"

تیسری شخصیت خود مصنف کی ہے جو اپنے ماحول سے متنفر ہے ۔ اور اس کی فطرت مسلسل اپنے ماحول سے تناؤ اور کش مکش کی حالت میں رہتی ہے ۔ مصنف نے اپنی پیدائش سے جوانی کے ابتدائی دنوں تک کی زندگی بیان کی ہے لیکن اس میں کہیں کوئی کلائمکس یا Sublime لمحہ نہیں کتاب کے اختتام پر بھی نہیں کہ اس کے ناول کہلانے کا جواز بن سکے ۔ ناول کہلانے کے لیے تاویلات کا ایک بڑا جھنجٹ کھڑا کرنا پڑے گا ۔ اور سچ پوچھیے تو اس کی ضرورت بھی نہیں ۔ ایک سوانح عمری کی حیثیت سے بھی یہ ایک لاجواب کتاب ہے ۔ وقت گذرنے کے ساتھ اس کی مقبولیت بڑھتی ہی جائے گی ۔ بطور سوانح عمری اسے ،ہم اس کی اصلی حالت میں جیسی بھی ہے قبول کر سکتے ہیں ۔

اردو میں اچھے ناول کم ہیں ۔ ان کی اشاعت کے درمیان وقفہ بھی زیادہ ہوتا ہے اس لیے کہ ایسے اردو پبلشر نہیں ہیں جو باقاعدگی سے کتابیں شائع کرتے ہوں ۔ ایک آدھ ادارہ جیسے مکتبۂ جامعہ ہے بھی تو سال بھر میں کتنی کتابیں شائع کر سکتا ہے؟ اردو میں یہ صورت حال صرف آج کی نہیں ۔ پریم چند کے زمانے سے یہ شکایت چلی آرہی ہے ۔ ناول لکھنے کے لیے طویل فراغت اور وقت درکار ہوتا ہے ۔ سخت محنت ،خاصا وقت صرف کرنے کے بعد مصنف ناول لکھ لے ۔ اسے کوئی معاوضہ ملنے کی امید نہ بھی ہو تو اشاعت کا مسئلہ مزید حوصلہ شکن ہوتا ہے ۔ اس صورت حال کے باوجود اگر آج ایسے ناول شائع ہو رہے ہیں جن کی سطح اوسط سے یقیناً بہتر ہے تو ان ناولوں کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے اور انھیں نظر انداز کرنا بے حسی کے مترادف ہوگا ۔

==== OOOO ====

بازگشت

آلِ احمد سرور

ضیا جالندھری

حمید نسیم

نیّر مسعود

انتظار حسین

ساوی ضمیر الدّین احمد

انور خان

سیّد محمد اشرف

شفیق فاطمہ شعریٰ

شہریار

نجم الثاقب شحنہ

خورشید اکرم

خالد جاوید

جمال اُویسی

سائیں سچا

"اجمل کمال کراچی کا خط دیکھا (شمارہ عشرہ میں) جہاں تک میں سمجھتا ہوں "سوغات" صرف ایک ادبی رسالہ نہیں ہے بلکہ وہ ہماری دانشوری کا ایک نقیب بھی ہے۔ اس لیے اگر "سوغات" میں ادبی مسائل کے علاوہ دانشوری کے موضوعات اور توہم پرستی، غلامی، جہالت، اور افلاس کے خلاف جد و جہد کا تذکرہ ہوتا ہے تو اس پر طنز کیوں؟ ویسے اجمل کمال صاحب نے بعض ایسے سوالات اٹھائے ہیں جنکی اہمیت اور معنویت مسلّم ہے۔ تیسری دنیا، مشرق اور روایت کے سلسلے میں عام طور پر سطحیت یا محدود نقطۂ نظر کا مظاہرہ ملتا ہے۔ جب ہم مشرق کا ذکر کرتے ہیں تو عسکری کی طرح مسلمانوں کی روایت کو مشرقی روایت کے پھیلنے پھولنے یا مرجھانے کے مترادف قرار دیتے ہیں یا مشرق کو ہم مشرق وسطیٰ (Middle East) میں محدود کر دیتے ہیں۔ دراصل مشرق ایشیا، ترکی سے لے کر چین، جاپان تک پھیلا ہوا ہے اور یہ واقعی ایک کوتاہی ہے کہ ہم مشرق پر بحث کرتے ہوئے چین کی عظیم روایت کو نظرانداز کرتے ہیں۔ اسی طرح سے اس روایت کو بھی جو ایشیائی، روس کی ہے۔ سوویت یونین کے زمانے میں بھی یورپی روس اور ایشیائی، روس میں خاصا فرق تھا۔ جب جواہر لال نہرو اپنے روس کے دورے میں خروشچیف کے ساتھ یورال کے پہاڑی علاقے کو عبور کر کے ایشیائی، حصے میں پہنچے تھے تو انہوں نے ادھر اور ادھر کا جو فرق دیکھا اس کا خروشچیف سے شکوہ کیا تھا۔ اس لیے میرے نزدیک ہم اب تک مشرق کی اصطلاح کو جن محدود معنوں میں استعمال کرتے رہے ہیں اس سے آگے جانے کی ضرورت ہے۔ مشرق کا کوئی، تصور مشرق وسطیٰ، ہندوستانی براعظم، وسط ایشیا، انڈونیشیا، چین، جاپان، اور کوریا کے بغیر جامع نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک تیسری دنیا کا سوال ہے یہ اصطلاح جن حالات میں وجود میں آئی انہیں ذہن میں رکھنا چاہیے۔ تیسری دنیا میں ان تمام اقوام کو گڈمڈ کر دیا گیا تھا جو اقتصادی ترقی یا تہذیبی سرمائے کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں ویسے ایک شوخ نے تیسری دنیا کے بیشتر ممالک کے متعلق the wreched of the earth ذلتوں کے مارے لوگ کی پھبتی کہی ہے جو میرے نزدیک خاصی موزوں ہے۔ ہم جس علاقے میں رہتے ہیں وہ ہندوستانی برصغیر ہے۔ اس میں تین عناصر آ کر مل گئے ہیں۔ ایک جنوبی ایشیائی، جو دراوڑی تہذیب میں اپنا جلوہ دکھاتا ہے دوسرا جنوبی مشرقی ایشیائی، South East Asian جو بنگال سے لے کر برما، انڈونیشیا، اور کمبوڈیا تک پھیلا ہوا ہے۔ بنگلہ دیش کے پاکستان سے الگ ہونے میں صرف مغربی پاکستان کے احساس برتری کو ہی دخل نہیں تھا اور یہ صرف زبان کا مسئلہ بھی نہیں تھا بلکہ یہ تہذیبی مسئلہ تھا اور یہاں جنوبی مشرقی ایشیائی، تہذیب کے عناصر مغربی پاکستان کی بالادستی سے آزاد ہونے کی سعی کر رہے تھے۔ تیسرا عنصر وہ ہے جسے وسط ایشیائی، یا مغربی ایشیائی، کہا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں اسلام چند بنیادی عربی افکار کا مرہون منت ہے لیکن اس کو زیادہ تر آب و رنگ عجمی سوز و ساز سے ملا ہے جسے اقبال نے "عجم کا حسن طبیعت" کہا ہے۔ جو مسلمان

فاتحوں کے قافلے ہندوستان آئے وہ افغانستان کے راستے سے آئے۔ افغانستان اور ہندوستان کا بہت پرانا رشتہ ہے اور کئی سو سال قبل مسیح سے ہی افغانستان سیاسی طور پر ہندوستان کا ایک حصّہ سمجھا جاتا تھا ۔ بامیان (افغانستان میں) میں گوتم بدھ کا ایک بہت بڑا مجسّمہ ہے ۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ وسط ایشیا میں اسلام کی اشاعت سے پہلے بدھ مذہب دور دور تک پھیل چکا تھا اور جب ہندوستان سے بدھ مذہب کو نکالا گیا تو اسے پناہ چین میں، جنوبی مغربی ایشیاء میں اور وسط ایشیاء میں ملی۔ ڈاکٹر کنور محمد اشرف مشہور مورّخ مجھ سے کہتے تھے کہ جب وسط ایشیائی اثرات مغلوں اور ترکوں کے ذریعے سے ہندوستان میں آئے تو اسلامی عناصر کے ساتھ اس میں کچھ بدھ مت کے عناصر بھی تھے۔ کہنا یہ ہے کہ جسے ہم برصغیر ہند و پاک کہتے ہیں وہ ایک مشترک تہذیب کا گہوارہ ہے (ویسے بھی کوئی تہذیب خالص نہیں ہوتی۔ مختلف تہذیبوں کا آمیزہ ہوتی ہے۔ یہ بات میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ اب علمی حلقوں میں تسلیم کر لی گئی ہے) چنانچہ برصغیر ہند و پاک ایک ایسی تہذیبی بساط ہے جس میں جنوبی ایشیائی، جنوبی مشرقی ایشیائی، اور وسطی اور مغربی ایشیائی عناصر مل جل کر ایک جلوۂ صد رنگ بن گئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس برصغیر کے شمال مغربی حصّے میں مغربی ایشیائی اور وسط ایشیائی عناصر زیادہ نمایاں ہیں جن پر اسلام کی صدیوں کی تاریخ کا اثر واضح ہے۔ دوسرے علاقوں میں یہ اثرات نسبتاً مدھم ہو کر پہنچے ہیں مگر یقیناً دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں تصوّف کا کارنامہ بہت بڑا ہے۔ اسی لیے کہ میرے نزدیک فتوحات سے زیادہ اس روحانی سرمایے کا جو تصوّف کی دین ہے، رول زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

جب ہم اردو ادیبوں کی بات کرتے ہیں تو ہم کو اس برصغیر ہند و پاک کی بساط کو ملحوظ رکھنا پڑے گا اور پاکستان کی وجہ سے جو تقسیم ہوئی ہے اس کو تھوڑی دیر کے لیے نظر انداز کرنا ہوگا۔ اردو ادیبوں کی پس ماندگی دراصل اردو ادب کی پس ماندگی نہیں ہے بلکہ یہ ایک سیاسی صورت حال کا نتیجہ ہے۔ تقسیم کے بعد برصغیر ہند و پاک میں وسط ایشیائی اور مغربی ایشیائی عناصر کو نظر انداز کرنے کا جو عمل جاری ہے اردو اس کا شکار ہے۔ اسی لیے خواہ مخواہ اردو ادیبوں کی پس ماندگی پر اس قدر واویلا کرنے کی ضرورت نہیں۔ اردو ادب کا جو سرمایہ ہے وہ اس دھرتی کی فضا اور بوباس رکھتا ہے۔ اور صدیوں کی لالہ کاری کا ثمرہ ہے۔ وقت اور حالات کے مطابق اس کے رنگ و آہنگ میں تغیر ہوگا لیکن اردو کے معنی کو ہی اردو سمجھنے والوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اردو صرف انیسویں صدی کی اردو نہیں ہے بلکہ بازار، خانقاہ اور دربار کے تہذیبی سرچشموں سے سیراب ہوتی ہوئی بیسویں صدی کی پرپیچ فضا میں پہنچی ہے اور یہ وہ سورج ہے جو ہماری مشترک تہذیب کی ہر کرن کو اپنے آغوش میں چھپائے ہوئے ہے۔

شمیم حنفی صاحب کے حوالے سے اجمل کمال صاحب نے "اپنا آپ کیا ہے" اس کی معنویت کیا ہے؟ اور

باہر کی دنیا سے اس کا رشتہ کیا ہے" جیسے سوالات کی اہمیت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں میں اجمل کمال صاحب کی توجہ ایڈورڈ سعید کی نئی کتاب (culture and imperialism vintage 1993) کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں۔ ایڈورڈ سعید کی پہلی کتاب on orientalism" اور یہ دوسری کتاب دونوں ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ ایڈورڈ سعید نے اپنے متعلق لکھا ہے کہ وہ اگرچہ لبنان کا ایک عیسائی عرب ہے لیکن اسکی دنیا وسط ایشیا اور شمالی امریکہ دونوں کی دنیا ہے۔
ایڈورڈ سعید اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ شناخت کے مسئلے کو الگ الگ جزیروں کی شکل میں نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ دنیاؤں کے سرے کس طرح ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور لکیریں کس طرح ایک دوسرے کو کاٹتی ہیں۔ ہمیں اپنی جڑوں اور بنیادوں اپنی تاریخ اور اپنے ماحول کا تو احساس رکھنا ہے لیکن اسکے ساتھ یہ بات بھی ملحوظ رکھنا ہے کہ تہذیبوں کی دیواریں نہیں ہوتیں اور اسی وجہ سے چاہے وہ کپلنگ کا مشرق و مغرب کا تصور ہو چاہے عسکری کا اور چاہے ۱۹۴۷ء کے بعد انیسویں صدی کے دانشوروں کی کوششوں کو نوآبادیاتی ذہن کی پیداوار کہنے والوں کا، سب کے یہاں انتہاپسندی ملتی ہے۔ گاندھی جی نے کہا تھا کہ میرا گھر بہت بڑا ہے اور اس میں بہت سی کھڑکیاں ہیں، میں چاہتا ہوں کہ کھڑکیاں کھلی رہیں تاکہ ہر طرف سے مکان میں ہوا آئے لیکن میں یہ نہیں چاہوں گا کہ کوئی طوفان میرے مکان کو جڑ بنیاد سے ہلا دے" مغربی افکار میں بقول برٹرینڈ رسل یونانی افکار، بائبل، اور شیکسپیئر کی بنیادی اہمیت ہے۔
یونانی اثرات سکندر اعظم کے پنجاب کے حملے کے ذریعے ہندوستان تک پہنچے۔ عباسی دورِ خلافت میں ان افکار کا عبرانی کے ذریعے سے عربی میں ترجمہ ہوا اور متکلمین کا ایک پورا گروہ وجود میں آیا۔ کہنا یہ ہے کہ اپنی جڑوں، اپنی تاریخ اور اپنے ماحول کا احساس ضروری ہے مگر آج نہ عالمی میلانات سے یہ کہہ کر آنکھیں چرائی جا سکتی ہیں کہ یہ مغربی استعمار کا عطیہ ہیں اور نہ ہم ہزاروں سال پہلے کی اس دنیا میں واپس جا سکتے ہیں جسکے احیا کی کوشش "ہندوتوا" جیسے نعروں کے ذریعے ہو رہی ہے۔ میں بنیاد پرستی کو چاہے وہ ہندوؤں میں ہو یا مسلمانوں میں ایک فرار سمجھتا ہوں اور اس بصیرت کو اپنانا چاہتا ہوں جس کی طرف اقبال نے ان اشعار میں اشارہ کیا ہے ؎

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک	دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم
مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر	فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اگر تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو ہم قدیم دور، ازمنۂ وسطیٰ (درمیانی دور) اور جدید دور کا تصور کر سکتے ہیں۔ بات اسی وقت معنی خیز ہو گی جب مشرق یا مغرب یا تیسری دنیا کی اصطلاحوں کے جال سے نکل کر اس ارتقاء کا تصور کریں۔ یہاں یہ بات یاد دلانا ضروری ہے کہ ترگنیف اپنے آپ کو روسی نہیں یوروپین کہتا تھا۔ گوئٹے ان جرمن قوم پرستوں سے آگے دیکھتا تھا جو نپولین کی فتح کو جرمنی کی شکست سمجھتے تھے۔ قومی ریاستوں

صرف عالمی تناظر ideal نہیں ہو سکتا۔ آج کا ideal کا تصور آج کا (nation states) ہو سکتاہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس پُر آشوب دور میں بھی اس تناظر کی شمعیں کہیں کہیں مدّھم ہی سہی مگر دکھائی دیتی ہیں۔ (world view

ہندستانی مسلمانوں کا بنیادی مسئلہ " مغرب کی یلغار" ہے نہ "برادرانِ وطن سے پیکار"۔ ان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ برعظم ہند و پاک کی مشترک تہذیب میں اپنے کارنامے کو پہچانیں اور اپنے آئندہ رول کو متعین کریں یعنی اپنی تہذیبی خصوصیات کی بقا اور ترقی کو اپنا آئیڈیل سمجھیں، مرکزی اہمیت دیں۔ اقبال کے الفاظ میں وہ "اپنی فطرت کے تجلّی زار میں آباد ہوں" اپنے آپ کو حاکم یا محکوم کی حیثیت سے نہ دیکھیں بلکہ ہندوستانی سیکولر جمہوریت کے تجربے میں اپنے حقوق اور فرائض دونوں کو پہچانیں۔ ان کا بنیادی مسئلہ اپنی پہچان اور اپنی خودی کی شناخت ہے۔

———— اس کے لیے وقتی سیاست کے بجائے ان کی ساری توجہ تعلیم، تہذیب، ادب، اور سائنس کی طرف مبذول ہونی چاہیئے۔ وہ اس وقت اس لیے پس ماندہ ہیں کہ ابھی تک پرچھائیوں کی پرستش سے نہیں نکلے ہیں اور اپنے اوپر اعتماد کرنا نہیں سیکھا ہے۔ خالص شعر و ادب کی اصطلاح میرے نزدیک گمراہ کن ہے ادیب زندگی کے حقائق سے منہ نہیں موڑ سکتا۔ ادیب دانش ور بھی ہوتا ہے۔ "

———

(۲)

" شمارہ ۶ میں بلونت سنگھ کا گوشہ بہت اچھا رہا۔ آپ کا ادنا موتو پر مضمون بھی۔ عسکری نے استفادہ کیا مگر ذکر نہ کیا۔"

آل احمد سرور، علی گڈھ

———

پرچہ حسبِ روایت بہت عمدہ ہے۔ ایک بات جسے دیکھ کر بہت مسرت ہوئی وہ یہ ہے کہ آپ نے اس میں مختار صدیقی کے لیے کچھ صفحات وقف کیے۔ مختار ہمارے عزیز دوست اور ساتھی تھے۔ ان کی جتنی پذیرائی ہوئی وہ یقیناً اس سے کہیں زیادہ کے مستحق تھے۔ آپ کو یہ تو معلوم ہو گا کہ چند برس پیش تر ان کے بیٹے "ہارون" نے ان کا وہ کلام بھی "آثار" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کروادیا ہے جو ان کی زندگی میں کسی مجموعے کی شکل میں نہیں چھپ سکا تھا۔

ضیا جالندھری۔ اسلام آباد

آج ریڈیو سے واپس آیا تو "سوغات" کا پیکٹ میرے بستر پر پڑا تھا۔ ضیا نے کوئی ہفتہ بھر پہلے اطلاع دی تھی کہ اسے "سوغات" کا شمارہ نمبر ۸ مل گیا ہے۔ میں اس خبر سے تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ سب دوستوں کو ٹیلی فون کیا۔ ہر جگہ سے یہی خبر ملی کہ انھیں بھی پرچہ ابھی تک نہیں ملا۔ آج سب کو مل گیا ہو گا۔ یعنی میرے احباب میں سے مشفق خواجہ صاحب کو اسلم فرخی اور ان کے صاحب ذہن رسا صاحب زادے آصف فرخی کو۔

تازہ شمارہ ہر لحاظ سے ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اور آپ مبارک بادہی کے نہیں اردو زبان کے بہی خواہوں کے سپاس و تشکر کے مستحق بھی ہیں۔ ابھی شام نہیں ہوئی۔ اور میں نے مختار صدیقی مرحوم والا حصہ پڑھ لیا ہے۔ ابتدا اس حصے سے یوں کی کہ مختار صدیقی ریڈیو میں طویل عرصے تک میرے رفیق کار رہے۔ اور میرے ہم تلطف دوست بھی تھے۔ ان کی سی حرفی بہت جاندار اور منفرد تخلیق ہے اور اردو کی صوفیانہ شاعری میں معتبر اضافہ ہے۔ اردو شاعری میں تصوف کی رو مظہر جان جاناں کے کلام میں ابھری اور پھر میر تقی میر (کچھ حد تک مرزا سودا) اور خواجہ میر درد کے کلام میں اپنی سطح کمال پر پہنچ کر تھم گئی۔ غالب نے اپنے کلام میں مسائل تصوف کا ذکر کیا مگر وہ مابعد الطبیعاتی شاعر تھے۔ انگریزی مثال سے شاید بات واضح ہو جائے۔ ولیم بلیک MYSTIC شاعر تھے۔ جان ڈن اور CRASHAW مابعد الطبیعاتی شاعر تھے۔ پھر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ صوفی شاعر ہوئے۔ ان کی شاعری مسیحی تصوف کی ہمہ حسن و جمال دنیا قاری کے سامنے پیش کرتی ہے۔ میرے ہوش سنبھالنے کے بعد بڑی کوچک سطح کی عارفانہ شاعری اصغر گونڈوی نے کی۔ جگر صاحب کے ہاں بس اصغر صاحب ہی کی گونج تھی۔ علامہ اقبال ہماری صدی کے عظیم شاعر ہیں۔ ان کی برتر غزلیں PROFOUND RELIGIOUS تجربہ کی شاعری ہے۔ اسے میں MYSTIC شاعری کہتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ دل یہاں تذبذب کے عالم میں ہے وہ اپنی نہایت شوق میں عارف نظر آتے ہیں۔ یہ بہت نازک سا فرق ہے میں اس سے زیادہ اس ضمن میں کچھ عرض نہیں کروں گا۔ ان کا وجدانی جہان فنافی الرسولؑ کا ہے کہ مطلق کے معاملے میں انھوں نے ہمیشہ فراق کو وصل پر ترجیح دی۔

مختار صدیقی کی سی حرفی جیسی بھی ہے، جدید شاعری میں صرف وہی خالصتاً تصوف کے مراحل کی آئینہ دار ہے۔ یہ تصوف نہ میر تقی اور میر درد کی روایت کی تجدید ہے نہ اس کا عطار و رومی سے کوئی رشتہ ہے۔ اس کا ماخذ پانچ دریاؤں کی سرزمین میں پروان چڑھنے والی روایت تصوف ہے۔ مختار صدیقی کے سامنے اس کی راہ حضرت بلھے شاہ صاحب، سلطان باہو رحمتہ اللہ علیہ اور میاں محمد صاحب کے روشن و تاباں روحانی مشاہدات نے کی۔ مختار صدیقی کی سی حرفی یکی شاعری ہے مگر بڑی شاعری نہیں کہ اس میں محنت زیادہ نظر آتی ہے۔ بے ساختگی اور وجدان کا وفور کم۔ "سوغات" میں ایک صاحب نے مختار صدیقی کی شاعری کا اس کی کلیت میں

جائزہ لیتے ہوئے فرمایا ہے کہ "جدید اردو شعرا میں غالباً مختار صدیقی کی شاعری اردو / ہندی کی پرانی روایت میں سب سے زیادہ رچی ہوئی ہے"۔ مجھے یہ پڑھ کر اپنی بے علمی کا بڑی شدت سے احساس ہوا کہ میں تو اب تک یہ سمجھتا رہا تھا کہ مختار صدیقی کی غزل روایتی غزل کا اسلوب رکھتی ہے اسی کا آہنگ اور لسانی مزاج روش صدیقی، مجروح سلطان پوری اور کہیں کہیں حلقۂ ارباب ذوق کے غزل گو شاعروں سے مماثل ہے۔ سی حرفی میں زبان اور لہجہ عصری اردو شاعری سے بہت مختلف ہے کہ اس میں راوی اور چناب کے دوآبے کی سرزمین کی باس خاص نمایاں ہے۔ اس کا لسانی مزاج میاں محمد صاحب اور سلطان باہو کے لہجے سے متاثر ہے۔ لفظ اردو کے ہیں۔ حفیظ جالندھری اور نظیر اکبرآبادی کی فرہنگ سے قریب تر۔ لیکن باس سرسوں کے کھیتوں، شاداب پھولوں، بیساکھی کی فضا کی سرخوشی اور خودرو چنبیلی اور موگرے کی مہک ہے۔ منزل شب میں وہ "میراجی" کے اس اسلوب کو اپنی روح میں رچانے کی کاوش کرتے نظر آتے ہیں جسے میراجی نے کمالِ مہارت سے اپنی برتر شاعری کا وسیلہ بنایا۔ آپ نے "پانچ جدید شاعر" میں میراجی پر میرے مضمون میں میراجی کے تین الگ الگ اسلوب ملاحظہ فرمالیے ہوں گے۔ ایک وہ جس میں وہ فیض صاحب اور ن۔م۔ راشد سے کہیں زیادہ مفرس اردو والا لہجہ رکھتے ہیں ایک وہ جو ہندی اساطیر والی خالص ہندی زبان کی شاعری ہے۔ شوشنکر، اودھ، شیام، رادھا، اس شاعری کے بڑے کردار ہیں۔ اور ایک وہ اسلوب ہے "جو سمندر کا بلاوا" اور بیش تر بڑی نظموں میں سامنے آتا ہے یہ لہجہ:

بس دیکھا اور پھر بھول گئے
جب حسن نگاہوں میں آیا
من ساگر میں طوفان اٹھا
طوفان کو چنچل دیکھ ڈالی۔ آغوش میں گنگا دودھ بھری
اور چاند چھپا۔ تارے سوئے۔ طوفان مٹا۔ ہر بات گئی
دل بھول گیا پہلی پوجا۔ من مندر کی مورت ٹوٹی
دن لایا باتیں انجانی پھر دن بھی نیا اور رات نئی
پیتم بھی نیا پریمی بھی نیا۔ سکھ سیج نئی۔ ہر بات نئی
اک پل کو آئی نگاہوں میں جھلمل جھلمل کرتی۔ پہلی
سندرتا۔ اور پھر بھول گئے
مت جانو ہمیں تم ہرجائی

اس نظم کو از اول تا آخر پڑھیے اور دیکھیے کہ "منزل شب" والا مختار، میراجی کے اس ہندی / اردو آمیزے والے اسلوب میں غرقاب ہے کہ نہیں؟

آپ نے اس قابلِ لحاظ شاعر کو سوغات میں "گوشہ" عنایت فرمایا۔ شاید اس سے پاکستانی جرائد کے مدیروں اور اردو نقادوں کو خیال آئے کہ اس کا بھی ان پر کچھ حق ہے۔

۲) میں پروفیسر آلِ احمد سرور صاحب کا بتہ دل سے ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھ ایسے گم نام گوشہ گیر کی تحریر کو اتنی توجہ سے پڑھا۔ ان کے کلماتِ توصیف تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح آئے کہ میں تو اپنے ہاں کے اکثر کالم نگاروں کی طنز و تضحیک ہی کا عادی رہا ہوں۔ میں پروفیسر صاحب سے عفو کا طالب ہوں کہ میں نے عصری غزل پر بات کرتے وقت یہ صراحت نہ کی کہ ذکر عظیم شعرا کا نہیں سو علامہ اقبال اس بحث میں شامل نہیں۔ میں نے بات یگانہ اور حسرت موہانی۔ فانی بدایونی۔ فیض احمد فیض۔ حفیظ و جگر۔ ناصر کاظمی اور شکیب جلالی اور دوسرے ہر دل عزیز غزل گو شعرا کے تناظر میں کی تھی۔ فانی اس سارے مطالعے میں یگانۂ روزگار غزل گو تھے۔ اگر وہ یاسیت تک ہی محدود ہو کر نہ رہ جاتے اور غم و اندوہ کے ساتھ انبساط و نشاط کے لمحوں کی بات بھی کرتے تو حالی کے بعد اس صدی میں اردو کو دو برتر سطح کے غزل گو مل جاتے۔ فانی اور مدنی۔ اقبال کی بات میر و غالب عرفی و نظیری، صائب و بیدل کی سطح پر ہو سکتی ہے۔ میں سمجھا کہ ذہین قاری بحث کے مزاج سے خود بہ خود جان لے گا تاکہ بات عالمی سطح کے عظیم شاعروں کی نہیں ہو رہی ہے سو اقبال کا نام نہ لینے سے ان کی اہانت نہیں ہوتی۔

مجھے حیرت ہے کہ سرور صاحب کو مدنی کی غزل کی خوبیوں تک پہنچنے کے لیے میرے ایسے کوتاہ قلم کے مقالے کا انتظار کرنا پڑا۔ میں نے تو چالیس برس کی اردو ادب سے غیر حاضری کے بعد پھر اس دنیا میں قدم رکھا ہے محض اپنے محبوب دوست ضیا جالندھری کی رضا حاصل کرنے کے لیے اور مشفق خواجہ اور اعجاز بٹالوی کی فقیر نوازی کے شکرانے کے لیے۔ میں نہایت ادب سے سرور صاحب سے استدعا کروں گا کہ وہ مدنی کی ان نظموں کو جن پر میں نے تفصیل سے بات کی ہے۔ آپریشن تھیٹر۔ صلیبوں کی اوٹ میں۔ آخری مرام وغیرہ۔ ایک بار پھر پڑھیں۔ شاید انھیں بہت سے تیکھے مصرعے ILLUMINATED LINES بھی ان میں نظر آجائیں۔ "نخلِ گماں" میں ملاوں پر ایک نظم ہے اس میں کتنا COMPASSION ہے زندگی کی اساسی حقیقت کی کیسی کامل آگہی ہے۔ اور بات بہت دھیمے لہجے میں کی ہے کہیں SHRILL نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر آفتاب احمد خان صاحب فیض احمد فیض اور ن۔ م۔ راشد ہر دو کی شخصیت اور شاعری پر بات کرتے ہیں تو ایک کل وقتی محقق اور اسکالر کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ ۱۹۱۹ء میں میں بھی کراچی میں تھا اور ضیا بھی۔ اور راشد صاحب سے میری ملاقات ہفتے میں کم سے کم ایک بار لازماً ہوتی تھی۔ ضیا بھی اکثر و بیشتر میرے ساتھ ہوتا تھا۔ شعر شاعری کی محفلیں بخاری صاحب کے ہاں اور راشد کے ہاں بڑی کثرت سے جمتی تھیں۔ راشد صاحب پاکستان میں ہوتے تو اپنا تازہ کلام ضیا کو اور مجھے بالالتزام سناتے تھے "میرے بھی ہیں کچھ خواب" انھوں نے ہمیں اپنے دو سالہ

قیام کراچی کے دوران ہی میں سنائی تھی۔ "مرگ اسرافیل" سنائی تھی۔ "صحرانورد پیر دل" بھی سنائی تھی۔ "یہ سب سے بڑا اور سب سے نیا اور نایاب شہر" بھی سنائی تھی۔ اگست ۱۹۶۳ء میں میں بھی امریکہ میں تھا۔ ریاست سیاچیرٹس کے قصبے والتھیم میں جو باشندے تین چار کوس کے فاصلے پر واقع برنیڈائیس یونیورسٹی ہے۔ میں نے ریویرنڈ مارٹن لوتھر کنگ کی تقریر ٹیلی وژن پر سنی اور دیکھی تھی۔ ستمبر میں میں دو بار راشد صاحب کا مہمان ہوا۔ انھوں نے وہاں بھی مجھے یہ نظم نہیں سنائی تھی۔ یہ نظم انھوں نے ۶۷ / ۱۹۶۶ء میں دورۂ پاکستان کے دوران میں ضیا کو اور مجھے سنائی تھی جب ہم دونوں ان سے ملنے گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد بہت دلچسپ ہے کہ "اور یہ کہنے کا مجھے یارا نہیں کہ کنگ نے راشد صاحب کا مصرع "میرے بھی ہیں کچھ خواب" کسی سے سن لیا ہو۔ کنگ صاحب یہ مصرع صرف اس صورت میں سن سکتے تھے کہ "ڈاکٹر صاحب کی ڈاکٹر کنگ سے کہیں ملاقات ہو جاتی اور وہ یہ مصرع پہلے پڑھتے پھر اس کا ترجمہ انگریزی میں اس صاحب دل بزرگ کو سناتے۔ افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر صاحب لندن گئے تو انھوں نے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ سے بھی ملاقات کی تھی۔ مجھے یقین ہے انھوں نے ایلیٹ صاحب کو بھی فیض صاحب اور راشد صاحب کے کچھ مصرعے سنائے ہوں گے اور اس سرقے کے عادی شاعر نے ان سے ضرور کسی نہ کسی نظم میں استفادہ کیا ہو گا۔

راشد صاحب کے کلیات میں ان کی نظموں کے نیچے تاریخ تخلیق کہیں نہیں دی گئی۔ میری تجویز ہے کہ جب کبھی راشد صاحب کے کلام کا مغربی زبانوں میں ترجمہ ہو اور مجھے یقین ہے کہ ایسا ہو گا تو یہ التزام بھی ہو اور ڈاکٹر صاحب یہ فرض سرانجام دیں کہ راشد صاحب کے اس خط کا ترجمہ بھی اس نظم کے ساتھ شائع کر دیا جائے۔ لیکن "سباویراں" اور "حسن کوزہ گر" اور "شہر" کے بارے میں خط کہاں سے حاصل کیے جائیں گے۔؟ دیکھیے ماخذ کا ذکر کر دینا راشد کی توہین نہیں صرف Poetic Process سے اور عالمی تاریخ شاعری سے ناواقف لوگ ہی اس سطح پر سوچ سکتے ہیں۔ گوئٹے کی شاہکار تمثیل فاؤسٹ کا سارا خیال اور پلاٹ کا کچھ حصہ کرسٹو فرمارلو کے اسی نام کے ڈرامے سے مستعار ہے۔ تو کیا گوئٹے کے شاہکار کی عظمت میں اس سے کمی واقع ہوئی۔ شکسپیر کی بہت سی تمثیلی کہانیاں مستعار ہیں۔ ہیملٹ بھی رومیو جولیٹ بھی۔ میں نے صراحت سے کہا ہے کہ "حسن کوزہ گر" کے چار کھنڈ مجموعی طور پر براؤننگ کی شہرۂ آفاق نظم اینڈری ول سارتر سے عظیم تر ہیں۔ سباویراں کا خیال جبرانشن سے لیا گیا۔ ایک آدھ مصرع میں ایلیٹ کے الفاظ بھی ہیں۔ مگر نظم عظیم ہے اور نظم راشد کی اپنی تخلیق ہے۔ امید ہے آئندہ ڈاکٹر صاحب ایسے حقائق کی نشان دہی کو جو ایک دیانت دار نقاد پر واجب ہے زیادہ کشادہ دلی سے Receive کیا کریں گے۔ گاندھی کے قتل کی شام کو ریڈیو پاکستان سے جو تعزیتی پروگرام نشر ہوا تھا وہ امتیاز علی نے نہیں لکھا تھا۔ جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے تاج صاحب پر اپنے خاکے میں ارشاد

فرمایا اور تاج صاحب کو خراج تحسین ادا کیا۔ وہ پروگرام اسٹیشن ڈائریکٹر کے کمرے میں سات بجے میں نے سید رشید احمد (سابق ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان)، اعجاز حسین بٹالوی، ضیا جالندھری اور اسٹیشن ڈائریکٹر بی۔ کے۔ فرید (حالیہ مقیم ہوسٹن یو۔ ایس۔ اے) کی موجودگی میں لکھا تھا کہ تاج صاحب نے اور شوکت تھانوی صاحب نے معذوری کا اظہار کر دیا تھا یہ کہہ کر کہ اس عظیم سانحے نے ان کے دماغ کو ماؤف کر دیا ہے۔ ڈائریکٹر صاحب نے نہ جانے یہ اطلاع کہاں سے حاصل کی تھی۔ ایسے محقق کو ایسی بے تحقیق غلط بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔ رشید احمد صاحب کراچی میں ہیں۔ خدا انھیں زندہ سلامت رکھے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد صاحب کبھی کراچی جائیں تو میرے کہے کی تصدیق ان سے کر سکتے ہیں۔ میں نے ایک حرف شکایت نہیں کہا حالاں کہ میں اس واقعے کا ذکر اپنی خود نوشت "ناممکن کی جستجو" میں کر چکا ہوں۔ شکایت اس لیے نہیں کی کہ میں نے اس سہو کو غیر اہم سمجھا تھا۔ ریڈیو کے لیے فوری طور پر ایک اچھا شذرہ لکھنا اور پھر اسے اپنی آواز میں نشر کرنا ایک بہت معمولی بات تھی میرے لیے کہ یہ کام میں پچاس برس سے کرتا چلا آیا ہوں۔

آرہ والے شاہد کلیم صاحب کو میری تحریر سے دکھ پہنچا۔ مجھے اس پر دکھ ہوا۔ میں نے تو اپنی طرف سے ہر بڑی نظم کی عظمت پر فکر و اسلوب کی عظمت کے شواہد پیش کر کے بڑی صراحت سے کہا کہ یہ نظم آفاقی عظمت کی حامل ہے شاید شاہد کلیم صاحب میرے ان معروضات کی روشنی میں وہ مقالہ ایک بار پھر ذرا رک رک کر پڑھیں تو ان کا دل بھی یہ گواہی دے کہ میں نے نہایت دیانت داری سے راشد صاحب کی فکری اور اسلوبی عظمت کی توضیح کی ہے۔ میری مشکل یہ ہے کہ ابھی ہمارے ہاں عام قاری اس نوع کے شعری تجزیے سے آشنا نہیں مانوس تو بہت دنوں بعد ہوں گے، جو میں نے اپنی تنقیدی کتابوں میں اختیار کیا ہے۔

حمید نسیم۔ کراچی

اس شمارے میں سب سے عجیب بات یہ محسوس ہوئی کہ آپ کا اداریہ نہیں ہے۔ اس کا کیا سبب ہے؟ معلوم نہیں کیوں اداریہ نہ ہونے کی وجہ سے پورا شمارہ دھندلا دھندلا معلوم ہو رہا ہے۔ پھر بھی "عذاب دانش حاضر" والا حصہ سب سے اہم معلوم ہوا۔ احمل کمال کا "خدا" بھی بہت اچھا اور بحث انگیز ہے۔

نیر مسعود۔ لکھنو۔

"سوغات" ملا یا ملی - یہ پرچہ بھی اپنی جگہ سوغات ہے - بلونت سنگھ والے خصوصی حصے کو شوق سے پڑھ رہا ہوں

ایک افسانہ بھیج رہا ہوں - ادھر کے ایک رسالے نے بھی اسے اچک رکھا ہے اگر وہاں پہلے چھپ جائے تو معذرت خواہ ہوں مگر اس کی امید کم ہے -

انتظار حسین - لاہور

سوغات "قاری پر اپنی گرفت مضبوط رکھتا ہے - "سوغات" نے اردو جرائد کا کھویا ہوا معیار اور وقار بحال کر دیا ہے اس مرتبہ آپ نے اپنی عمدہ نثر سے کیوں محروم رکھا؟ اداریے کی کمی بہت محسوس ہوئی -

ساوی ضمیر الدین احمد - لندن

"سوغات ۸ ایک اہم دستاویز ہے - مختار صدیقی اور بلونت سنگھ کے لیے مختص کیے گئے صفحات قارئین یقیناً محفوظ کر لیں گے - یہ ایک اہم فریضہ ہے کہ اپنے بہترین فن کاروں کو ہم قارئین کے حافظے سے گم نہ ہونے دیں - "عذابِ دانش حاضر" اس شمارے کا بہترین حصہ ہے - کیا ہی اچھا ہو کہ ایک پورا شمارہ اس موضوع کے لیے آپ مخصوص کریں - یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ سوغات پڑھتے ہوئے اچھی نئی تحریروں کے فقدان کا بڑی شدت سے احساس ہوا - ترقی پسندی اور جدیدیت کی بحثیں پرانی ہو گئیں - تحریکات اور رجحانات کی بحثوں سے اب قارئین اور ادیبوں کو کوئی دل چسپی نہیں رہی - اطراف کی دنیا جس تیزی سے بدل رہی ہے اب اکیڈمک بحثوں سے کوئی فائدہ نہیں - بات تو تب بنے گی جب ایسی معنی خیز تخلیقات شائع ہوں جن کا رشتہ ہمارے عصر، فرد کے گوناگوں مسائل اس کے گہرے کرب اور اضطراب سے ہو - بیدی، منٹو، بلونت سنگھ، مختار صدیقی، جوش اور فیض پر تحریریں ضرور شائع ہونی چاہئیں لیکن ساتھ ہی الیاس احمد گدی کے ناول "فائر ایریا" اور عبدالصمد کے ناول "خوابوں کا سویرا" جیسی کتابوں پر بھی بات ہونی چاہیے ورنہ ہماری تنقید بے مصرف ہو کر رہ جائے گی جس کی درس گاہوں سے باہر کوئی اہمیت نہیں رہے گی -

انور خان - بمبئی

---

(۲)

میں یہ نہیں کہتا کہ "خوابوں کا سویرا" یا "فائر ایریا" کوئی غیر معمولی ناول ہیں۔ لیکن یہ اچھی قابل توجہ تخلیقات ہیں۔ اردو میں سو پچاس اچھے ناول شائع ہوں تو ان میں دو ایک ناول غیر معمولی بھی ہوں گے۔ لیکن یہ ناول تب ہی لکھے جائیں گے جب لکھنے والوں کو یہ احساس ہو کہ جو کچھ ہم لکھتے ہیں اس کا نوٹس لیا جاتا ہے۔ ان پر گفتگو ہوتی ہے۔ وہ ادبی مکالمے کا حصہ بنتے ہیں۔ آپ نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ "ہمارے لکھنے اور پڑھنے والے عجیب بے حسی کا شکار ہو چکے ہیں۔ مصلحتیں، اغراض، مفادات، بے حسی، کم علمی ان سب کا کسی نہ کسی درجے میں دخل ہے"۔ آپ نے یقیناً اس صورتِ حال کو بدلنے کی کوشش کی ہے لیکن ہماری ادبی صورت حال اس وقت تک نہیں بدلے گی جب تک لکھنے پڑھنے والے کھل کر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کریں گے۔ جتنے زیادہ ردعمل سامنے آئیں گے ادبی DISCOURSE زیادہ واضح اور نمایاں ہوگا۔ ادیب وقاری کی رسالے میں، ادب میں دلچسپی بڑھے گی۔ ہمارے جتنے معروف لکھنے والے ہیں ان کی ہر نئی تخلیق خصوصاً ناول پر تنقید ہونی چاہیے۔ اگر پسند نہ آئے تو بھرپور تنقید ہو، خامیاں گنوائی جائیں۔ یہ تنقید کم از کم خاموشی سے تو بہتر ہی ہوگی۔

آپ نے عبدالصمد کے پہلے ناول کی زبان کے بارے میں لکھا ہے۔ زبان و بیان کی اہمیت یقیناً ہے اور بہت ہے۔ مغرب میں ناشر ایسے ماہرین کی خدمات حاصل کرتے ہیں جو زبان و بیان کی غلطیاں درست کرتے ہیں اور ناول کو بہتر بنانے کے مشورے دیتے ہیں۔ بسا اوقات وہ مصنف سے اس کی ضخامت کو کم کرنے کے لیے اصرار کرتے ہیں اور ناول نگار ان مشوروں پر سنجیدگی سے غور کرتا ہے۔ بدقسمتی سے یہ سہولتیں ہمارے ناول نگار کو حاصل نہیں وہ خود اپنی کتاب چھاپتا ہے یا اگر ناشر کتاب شائع کرتا ہے تو ماہرین کی خدمات حاصل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔ ان کتابوں میں وہ فنش کیسے آسکتی ہے جو ہمیں مغربی ناولوں میں نظر آتی ہے؟ جس طرح کہا جاتا ہے کہ اکثر اچھے عروض داں اچھے شاعر نہیں ہوتے اسی طرح ہو سکتا ہے کہ کسی کی نثر نک سک سے درست ہو لیکن کتاب ناقابل مطالعہ ہو۔ اس سے تو بہتر ہوگا کہ زبان و بیان کی اغلاط کے باوجود کتاب پڑھنے کے لائق ہو۔ ویسے مصنف خود کتاب شائع کرنے سے پہلے اپنے دوستوں یا بزرگوں کو دکھالے تو اس کا اسے فائدہ ہی ہوگا، نقصان نہیں ہوگا۔

ادھر کئی ناول، گیان سنگھ شاطر، نادید، فائر ایریا، خوابوں کا سویرا، فرات، خواب رو وغیرہ شائع ہوئے ہیں جو یہ سوچنے کی دعوت دیتے ہیں کہ اشاعتی سہولتیں نہ ہونے کے باوجود ہمارے ادیب ایسے ناول دے رہے ہیں جن پر بات تو کی ہی جاسکتی ہے۔ کم از کم ناولوں کے لیے ضرور۔ ہمارے اشاعتی اداروں جیسے مکتبہ جامعہ، موڈرن پبلشرز وغیرہ کو ایک سازگار ماحول پیدا کرنا چاہیے۔ کاش وہ غور کریں۔

انور خان۔ بمبئی

"سوغات" مل گیا تھا اور اب تک اسے تقریباً مکمل پڑھ چکا ہوں۔ سرور صاحب کی ہدایت مشورہ، کہ صفحات کچھ کم کر دیے جائیں، کو آپ نے بڑی سرعت کے ساتھ نافذ کیا کہ خود اپنی ہی تحریر کم کر دی یعنی اداریہ ہی گم کر دیا۔ اداریے سے رسالے / شمارے کی سمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس پر ایک مرتبہ غور کیجیے۔ سب سے زیادہ مزے دار بات تو یہ ہے کہ شمارے کے صفحات پھر بھی کم نہیں ہوئے۔ اداریہ ہو کہ نہ ہو، اس پر ایک بحث شروع کرائیے۔ غالباً نیر مسعود صاحب نے ایک بار اپنے خط میں اس قسم کا مشورہ بھی دیا تھا۔ اس بحث سے کچھ نئے گوشے سامنے آئیں گے۔

فضیل جعفری صاحب کا مضمون بہت پسند آیا۔ ایک اوسط درجے کے ناول میں انھوں نے بہت کام کی باتیں ڈھونڈ نکالی ہیں۔ اپنے مخصوص ناقدانہ انداز میں انھوں نے "گودنی والا تکیہ" کا ذکر اس ترتیب سے پیش کیا ہے کہ پورا پلاٹ سامنے آگیا ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ پورا پلاٹ جاننے کے باوجود، قاری ناول کی قرأت سے بے نیاز نہیں ہونا چاہتا بلکہ سچ پوچھیے تو ناول دوبارہ پڑھنے کو طبیعت مائل ہوتی ہے۔ میں نے بچپن میں اس ناول کو اپنے دادا کے کتب خانے میں "ماہِ نو" کی جلدوں میں پڑھا تھا۔ قصبات کی سادہ زندگی کے بیان کی وجہ سے برسوں یہ تحریر ذہن پر چھائی رہی۔ بڑے ہو کر اس ناول کے مطالعے کی یاد میں وہ بات نہیں رہی جو بچپن میں محسوس کی تھی۔ لیکن فضیل جعفری کے مضمون کے بعد اب دل پھر چاہ رہا ہے کہ یہ ناول مکمل شکل میں پڑھنے کو ملے۔ فضیل جعفری صاحب کو اس مضمون کے لیے مبارک باد۔

شمارے کی جان بلونت سنگھ کا گوشہ ہے۔ اسے گوشہ کہنا تو زیر بیانی ہوگی۔ آپ نے شمارے کا بڑا حصہ بلونت سنگھ کی نذر کیا ہے جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ شمس الحق عثمانی نے بہت گہری نگاہ سے مطالعہ کیا لیکن مضمون ادھورا کیوں چھوڑ دیا۔ بلونت سنگھ کی دو ایک مزید کہانیاں انتخاب میں پیش کی جا سکتی تھیں۔ لیکن یہ مجبوری تو ہمیشہ رہے گی کہ کسی بھی افسانہ نگار کا کوئی بھی انتخاب ہر قاری کو مکمل نہیں محسوس ہوگا۔

مذہبیات / اخلاقیات والا حصہ اس بار اتنا متاثر کن نہیں تھا حالاں کہ نفسِ موضوع کے اعتبار سے اس سے زیادہ متنازع فیہ معاملات ممکن ہی نہیں ہیں۔ تاثر کی کمی کی ایک وجہ ترجمے کا کھردرا پن بھی ہے۔

سید محمد اشرف۔ بمبئی

اس بار سوغات پڑھتے ہوئے نقشِ اول کی کمی محسوس ہوتی رہی۔ پھر گوشہ۔ "عذابِ دانشِ حاضر" میں آپ کی موجودگی سے اس خسارے کی کچھ تلافی ہوئی۔ بعض عنوانات خطرناک ضرور ہیں اس کے باوجود یہ گوشہ بصیرت افروز مشمولات سے مالا مال ہے۔ مریم زمانی کا ترجمہ اپنی

سلجھی ہوئی متاثر کن نثر کی وجہ سے آج بھی اتنا ہی نیا ہے۔

احمد جاوید نے اپنا معیار برقرار رکھا ہے۔ یہ غزلیں اپنے اندر ایک جداگانہ زمانی مکانی کیفیت رکھتی ہیں۔ مختار صدیقی کی نظم کا ایک بول۔ تیا باندھو رے کنار دریا۔ آس پاس گونجتا رہتا ہے۔ ایک عجیب راحت بخش دکھ کا سراغ ہے اس بول میں۔ گاہے گاہے باز خوانی کے بعد بھی یہ نظمیں اتنی ہی شگفتہ اور تازہ دم ہیں جتنی کہ روز اول تھیں۔

حصہ، نظم کی نگارشات کا تاثر خوش گوار رہا۔ ابھی بلونت سنگھ کے افسانوں کو وقفے وقفے سے پڑھنا ہے۔ تاریخی شعور پر میری نثری کاوش کی نوک پلک درست کرنے میں آپ نے جو زحمت اٹھائی وہ قابل داد ہے۔ داد دینے کی ذمہ داری اس تاریخ پر عاید ہوتی ہے جس سے آپ کا بھی اتنا ہی رشتہ ہے جتنا کہ میرا۔ شکریہ۔

آخر میں وہی میپ کا بند کہ نقش ہیں سب ناتمام اس ("نقش اوّل") کے بغیر جس کی قدر و قیمت ہر شمارے میں (سوغات کے) خون جگر کی رنگ آمیزی سے متعین ہوتی ہے۔

شفیق فاطمہ شعریٰ۔ حیدرآباد

"سوغات کا ہر شمارہ دستاویزی اہمیت رکھتا ہے۔ پڑھنے کے لیے اتنا مواد ہوتا ہے کہ چھے مہینے کا عرصہ طویل نہیں معلوم ہوتا۔

سوغات میں شامل تخلیقات پر الگ الگ اظہار خیال کسی اور وقت کے لیے اٹھائے رکھتا ہوں البتہ حمید نسیم کے مضامین کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

اس بار کا شمارہ اداریے کے بغیر تھوڑا پھیکا گیا۔

شہریار، علی گڑھ

"سوغات" ملتا ہے تو سب سے پہلے اداریہ پڑھتا ہوں اس بار آپ نے اس سے محروم کر دیا۔ اردو میں اب اچھی نثر لکھنے والے بہت کم رہ گئے ہیں۔ پڑھنے والوں کو اس نعمت سے محروم مت کیجئے۔

"جگا" کے پیش لفظ سے شمس الحق عثمانی نے استنباط معنی و مفہوم صحیح طور پر نہیں کیا ہے۔ دراصل وہ بین السطور نہیں پڑھ سکے۔ بلونت سنگھ کی تحریر کو بیدی اور کرشن چندر کے خلاف الزامات کی فہرست میں ڈال دیا ہے۔

عابد حسن منٹو کا مضمون خوب ہے۔ بلونت سنگھ کی کہانیوں اور مختار صدیقی کی نظموں کا انتخاب بہت اچھا ہے۔

احقر کے خیال میں:-

۱) شمس الحق عثمانی کے مضمون کو "ناتمام" ہی رہنے دیا جائے۔
۲) خود نوشت اڑھتیے کا روز نامچہ بن جاتی ہے تو سوغات میں اس کو جگہ نہیں ملنی چاہیے۔
۳) طویل بور کرنے والے خطوط سے قاری کو محفوظ رکھیے۔
۴) اداریے سے سوغات کو محروم نہ رکھیے گا۔

نجم الثاقب شحنہ۔ یادگیر

"بازگشت" شمارہ ۸ ابھی ٹھیک سے پڑھ نہیں پایا ہوں۔ پرچہ دیکھ کر فوری ردِّ عمل تھا کہ "بلونت سنگھ" پر گوشہ بے وقت نکلا۔ یا تو آپ پہلے نکال دیتے یا ذرا ٹھہر جاتے۔ بالخصوص ایسے میں جب کہ آپ کے پاس نئی تحریریں بہت کم تھیں۔ مختار صدیقی والے گوشے میں بھی نئی تحریروں کی کمی کھٹکی۔ مگر میرے لیے اس میں بھی کشش ہے۔ وجہ؟ مختار صدیقی اور یوسف ظفر کا نام اب صرف تنقیدی حوالوں میں رہ گیا ہے۔ ہماری نسل نے ان دونوں شاعروں کو نہیں پڑھا ہے۔ ان کے ساتھ اکثر ایک نام اور آتا ہے جو اس وقت ذہن میں نہیں آرہا۔ ان پر بھی گوشے شائع ہونے چاہئیں۔

تازہ شمارے کے خطوط دیکھے۔ مجھے افسوس ہوا کہ حسن منظر کی کہانی کا نوٹس نہیں لیا گیا کیا اردو کے قارئین اس افسانے کو سمجھ نہیں پائے۔ اس کہانی میں حسن منظر نے کیسی کمال کی کردار نگاری کی ہے۔ اردو میں کردار کے حوالے سے بے شمار اور بعض بہت اچھے افسانے لکھے گئے ہیں لیکن اس افسانے میں بہو کا کردار حیرت انگیز ہے۔ یہ کردار افسانے میں سب سے کم جگہ گھیرتا ہے لیکن رول اس کا اتنا بڑا ہے کہ ایک گھر کی کایا ہی پلٹ دیتا ہے۔ یہ حسن منظر کون ہیں؟ یہ "رہائی" اور "ندیدی" کے مصنف تو نہیں معلوم ہوتے۔ میں نے حسن منظر کے یہ دونوں مجموعے پڑھے ہیں۔ مایوس کن۔ ایک بھی افسانہ ذہن میں نہیں رہا۔ پھر پچھلے دنوں، کوئی چار پانچ برس قبل، ان کا ایک افسانہ "انسان کا دیس" پڑھا تھا۔ وہ اب بھی یاد ہے۔ اور "مگر مچھ" تو یادگار افسانہ ہے۔

خورشید اکرم۔ دلی

اس بار آپ کا اداریہ نہیں تھا تو ایک ناقابلِ تلافی کمی کا احساس ہوا۔ "سوغات" کے اداریے ادب کے طالب علموں کی ایسی تربیت کرتے ہیں جو ادب و تنقید کی موٹی موٹی کتابوں سے نہیں ہوتی۔ اس بار کے شمارے میں آپ نے مجھ جیسے کئی قاریوں کو اس نعمت سے کیوں محروم رکھا؟۔

خالد جاوید۔ بریلی

جناب فضیل جعفری نے ادبی دنیا کے سامنے غلام عباس کی ایک گم شدہ تخلیق رکھی ہے "گوندنی والا تکیہ" کا تفصیلی جائزہ ہر زاویے سے مکمل ہے ۔ البتہ مجھے گوندنی والا تکیہ کا پلاٹ کسی فلمی کہانی سے میل کھاتا ہوا لگا ۔ واقعات کو بھی اسی طرح جوڑا گیا ہے جس طرح فلم میں جوڑا جاتا ہے ۔ مہتاب کی موت بقول جناب فضیل جعفری حالات پر IRONY بن جاتی ہے ۔ لیکن مجھے یہ بات بھی مصنوعی لگی ۔ شاید کسی کو یہ حادثہ متاثر کر سکتا ہے لیکن مجھے لگا کہ یہ واقعہ اگر بہت غیر فطری نہیں تو کچھ نہ کچھ غیر فطری ضرور ہے ۔ پھر ناولٹ کے آخری ابواب میں کلائمکس کا ڈرامائی انداز سے ظہور پذیر ہونا بالکل فلمی سا لگتا ہے ۔ (چھکے والی عورت کو ڈرامائی انداز سے گاؤں سے بھگا دینا ، ناولٹ کے سنجیدہ ٹریٹمنٹ میں کہاں تک صحیح لگتا ہے ؟) یہ لکھنا کہ یہاں پر غلام عباس کا Sense of Humour کام کر گیا غلط ہے ۔ یہ لکھنا زیادہ صحیح ہوگا کہ غلام عباس سے ایک سنجیدہ کہانی سنبھلی نہیں اور انھوں نے غیر فطری انداز سے کہانی کو موڑا ۔ ناول کا اختتام کبھی فلم امراؤ جان کی یاد دلاتا ہے تو کبھی فلم موسم کی ۔

فرانز کافکا کا طویل خط دل چسپی سے پڑھا ۔ کافکا سے متعلق ہر تحریر میں غور سے پڑھتا ہوں ۔ مذکورہ خط نے کافکا کی شخصیت کو پوری طرح کھول دیا ۔ لہٰذا اب جناب نیر مسعود کی ترجمہ کی ہوئی کافکا کی کہانیاں زیادہ آسان ہو گئی ہیں ۔ کافکا کا ناول THE TRIAL بھی اب مطالعے کے لیے آسان ہو گیا ہے ۔

جناب صلاح الدین محمود کی مختصر تحریر بڑی موثر لگی ۔ تاثیر کی شدت اس جگہ پیدا ہو جاتی ہے جہاں چڑیا کے اندھے پن کا ذکر آتا ہے اور شاکر علی بہت بے چین اور مضطرب ہو جاتے ہیں مختار صدیقی کا گوشہ بہت خوب ہے ۔ مختار صدیقی کی نظمیں بہت پیاری لگیں ۔ جناب اختر الایمان کی خود نوشت ، میرے خیال میں اس عہد کی ایک اہم تحریر ہوگی ۔ ان کی نظموں کے خیالات ان کی نثر میں بھی جھانکتے ہیں ۔ جناب خالد علوی اور جناب عشرت ظفر کی نظمیں بہت خوب ہیں ۔ "عذاب دانش حاضر" کا گوشہ ہر لحاظ سے قیمتی ہے ۔ بلکہ اس شمارے کا حاصل یہی گوشہ ہے ۔ میں نے بہت سنجیدگی سے ہر ترجمہ پڑھا اور کسب کیا ۔

جمال اویسی ۔ دربھنگہ

میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں ، "سوغات" کا شدت سے انتظار کیا جاتا ہے کیوں کہ آپ کے پیش کردہ موضوعات ، ان کا مواد اور طرز تحریر دوسرے رسالوں سے بہت ہٹ کر ہے ("سوغات" کو ایک رسالہ کہتے ہوئے بھی عجب محسوس ہوتا ہے)

سائیں سچا ۔ سویڈن

صفحہ ۳۸۰ کا بقیہ :-

انڈے اور گاجر کا حلوا بنانے لگیں۔ کچھ عورتوں کی ضروریات کا بساط خانہ بھی منگوا لیا۔ چکن کورشیا کا بھی ڈھیر ڈالا بیچنے والوں کی کمی نہ تھی۔ ارد گرد کی لڑکیاں اور عورتیں سودا بیچ لاتی تھیں اور حق المحنت سے زیادہ حصہ پاتی تھیں۔ بی مدی کو سوداگری کا سب سے بڑا گر نہیں یاد تھا۔ یعنی جو آدمی بہت سے کام ساتھ ہی کرتا ہے وہ کوئی کام نہیں کر سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خرچ آمدنی سے زیادہ ہی رہا۔ یہاں تک کہ مکان بھی گروی رکھنا پڑا۔

روپیہ جانے کے بعد توقیر میں بھی فرق آجاتا ہے۔ مگر اس کی شائستگی اور رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ پھر بھی لوگوں کی نظر میں ہلکی نہ ہوئی۔ کپڑے اب بھی سلیقے کے پہنتی تھی۔ گاڑھا پردہ کبھی نہیں تھا۔ آج بھی سڑک پر ماری ماری نہیں پھرتی تھی۔ تنخواہ والے نوکر کبھی نہیں تھے۔ آج بھی کام کاج کرنے والے آسانی سے مل جاتے تھے۔ مگر اقبال مندی میں گھن بہت دنوں سے لگ چکا تھا اس لیے چہرے کی آب رخصت ہو چکی تھی۔ زمانہ بدل جانے سے مزاج میں بھی فرق آگیا تھا۔ ایک دن ان کے گھر میں کئی عورتیں جمع تھیں۔ کسی نے کہا" بن مرد کی عورت کس گنتی شمار میں ہے" بی مدی بول اٹھیں" سچ کہتی ہو بہن" ایسی بات ان کے منہ سے کبھی نہیں سنی گئی تھی۔ یہ سن کر بعض نے دوسروں کو اشارہ کیا۔ بعض نے اتفاق کیا۔ دو ایک ایسی بھی تھیں جو مدی کا منہ تعجب سے دیکھنے لگیں۔ یہ وہ تھیں جنھوں نے مدی کے منہ سے مرد کا نام بلا ناک بھوں چڑھائے عمر میں نہیں سنا تھا۔

زمانہ گذرتا گیا۔ مگر بی مدی کے دن نہ پھرنا تھے نہ پھرے۔ کچھ دنوں بعد ایک شاہ صاحب آئے۔ بہت مرجع۔ خلائق تھے۔ عقیدت مندوں کا ہجوم ہر وقت لگا رہتا تھا۔ بی مدی بھی دو تین بار کباب پراٹھے کی نذر نیاز پیش کر چکی تھیں۔ اتنے میں خبر اڑی کہ شاہ صاحب حج کو جائیں گے۔ ہمیشہ مرغ پلاؤ توکّل پر کھایا کیے۔ اب حج بھی توکّل پر کریں گے۔ جس دن شاہ صاحب چلے، لوگوں نے دیکھا مدی بھی دامن سے لگی چلی جارہی ہیں اور لوگوں سے کہا سنا معاف کرا رہی ہیں۔ جو کچھ بچی کھچی پونجی تھی وہ بیچ کر نقد کر لیا۔ باقی کے لیے شاہ صاحب کی ذات اور توکّل کا توشہ کافی ٹھیرا حج سے واپسی پر وطن نہیں آئیں بلکہ شاہ صاحب ہی کے قدموں سے لگی رہیں۔ شاہ صاحب اپنے وقت کے بلعم باعور تھے۔ جی چاہے انگنی پر ڈال دیجیے، چاہے چادر کی طرح کاندھے پر لٹکا لیجیے۔ مدی میں جوانی کی کنی گلنے میں اب بھی دیر تھی۔ مگر شاہ صاحب کو دیکھ کر خواب ل میں بھی آشنائی کا خیال نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اگر غور کیجیے تو پیر بھی ایک طرح کا شوہر ہی ہوتا ہے جس پر مرید اسی طرح تکیہ کرتا ہے جیسے عورت مرد پر۔